یادگار علامۂ عصر آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

فہرستِ مضامین

نمبر ۳

ہمایوں بابت ماہِ مارچ ۱۹۴۲ء

تصویر: سرمائے کی چٹان

چندہ سالانہ ۵ پانچ روپیہ چھ آنے، ششماہی ۳ تین روپے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸

جہاں نما

اُردو ٹائپ

مسٹر ایشور داس گگوؔ نے جولائی پورہ کے ایک بنک میں ملازم ہیں ہمیں ایک نو ایجاد اُردو ٹائپ کا نمونہ بھیجا ہے۔ اردو ٹائپ کا مسئلہ مدت سے اہلِ فن کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے مگر اب تک کوئی تسلی بخش ٹائپ ایجاد نہیں ہوا۔ اردو ٹائپ کی کامیابی کے رستے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دوسری زبانوں کے ٹائپ کے مقابلے میں ہمارے ہاں الفاظ کے بہت زیادہ جوڑ ہیں مثلاً نستعلیق عثمانیہ ٹائپ میں تقریباً چھ سو جوڑ ہیں اور نسخ میں سو تین سو۔ اسی وجہ سے یہ ٹائپ ناکام رہے ہیں۔

مسٹر ایشور داس گگوؔ کی ذہانت قابلِ تعریف ہے کہ انھوں نے اُردو کے لئے ایک بہت اچھا ٹائپ ایجاد کر لیا ہے۔ یہ ٹائپ اردو کے علاوہ عربی اور فارسی کے لئے بھی یکساں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ یہ سن کر گگو صاحب کے کمال کی داد دیں گے کہ اُن کے ایجاد کردہ ٹائپ میں صرف ۳۸ جوڑ ہیں اور اُن کا دعویٰ ہے کہ وہ مزید تخفیف سے اس عدد کو ۲۴ تک پہنچا سکتے ہیں۔

اُردو رسم الخط کی ایک دقت یہ ہے کہ اس کے حروف دوسرے حروف کے ساتھ مل کر اپنی صورت بدلتے رہتے ہیں۔ ایک ایک حرف کئی کئی صورتیں بدلتا ہے۔ اُردو کے حروفِ ہجا ۳۶ ہیں لیکن اس کے ٹائپ میں ۲۵۰ سے لے کر ۵۹۴ تک جوڑ ہو سکتے ہیں۔ ٹائپ کے اس قدر کثیر التعداد ٹکڑوں کے ساتھ کسی عبارت کی تشکیل اس قدر محنت اور وقت کا کام ہے کہ اس سے ٹائپ کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

یہی حالت اُردو ٹائپ رائٹر کی ہے۔ ریمنگٹن کے اردو ٹائپ رائٹر میں حروفِ ابجد کی ستر مختلف صورتیں ہیں۔ ہندسے اور دیگر نشانات جن کی تعداد بائیس ہے ان پر مستزاد ہیں۔ اس ٹائپ کے حروف کی کنجیوں (KEYS) کی تعداد ۴۶ ہے اور ہر کنجی دو حروف (بالائی و زیریں) کی حامل ہے۔ بالائی حروف کے استعمال کے لئے "شفٹ کی" استعمال کرنی پڑتی ہے اور ٹائپ کرتے وقت "شفٹ کی" کو اتنا زیادہ استعمال کرنا پڑتا ہے کہ اس سے ٹائپ کی رفتار بہت سست ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ٹائپ رائٹر کا مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے۔

مذکورۂ بالا وجوہ سے اردو املا میں بھی مشکل پیدا ہوتی ہے۔ حروف کی یہ ہم متغیر صورتیں نوآموزوں کے لئے پریشان کن ہیں۔ اس لئے اردو پڑھنے اور پڑھانے میں نمایاں دقت محسوس ہوتی ہے کیونکہ محض اردو حروفِ ابجد سیکھ کر کوئی شخص اس وقت تک اردو عبارت کو پڑھنے کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ حروف کی متغیر صورتوں سے بھی آشنا نہ ہو جائے۔

اردو ٹائپ، ٹائپ رائٹر اور املا کی ان مشکلات کو پیشِ نظر رکھ کر گگو صاحب نے لکھنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اسی طریقے سے انھوں نے ٹائپ کے لئے حروف بنائے ہیں۔ اور یہ کوشش کی ہے کہ مجوزہ صورت حروف کی موجودہ صورت سے زیادہ سے زیادہ مشابہ رہے۔ اور سب حروف عبارت میں حتی الامکان اپنی اصل صورت قائم رکھیں۔ حروف کو جوڑنے میں آسانی پیدا کرنے کے لئے تمام حروف کی بلندی یکساں رکھی گئی ہے۔ اس ٹائپ کے استعمال سے

اردو فارسی اور عربی عبارت کا چھاپنا ٹائپ کرنا اور لکھنا پڑھنا آسان ہو جائے گا کیونکہ اس میں جوڑوں کی تعداد کم ہے اور حروف کی صورت بدلتی نہیں ۔

مگو صاحب نے ہمیں اپنے ایجاد کردہ ٹائپ کی عبارت کا ایک نمونہ بھی بھیجا ہے جسے ہم سمجھنے سمجھانے کے لئے ذیل میں نقل کرتے ہیں ۔ امید ہے کہ اہل نظر مگو صاحب کی ہر ممکن طریقے سے حوصلہ افزائی فرمائیں گے ۔

نمونہ ہندوستانی ٹائپ

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ

ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ

ل م ن و ہ ھ ی ے ئ ۔

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۰

ہندوستانی ٹائپ میں الفاظ

لکھنے کے لیئے ۔ انگریزی کی طرح ۔

حروف کو اُنکی اصلی شکل میں ملا

دیا جاتا ہے ۔

ایشور داس مگو

دی سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ ۔

لائلپور ۔

، ؟ ( ) ! . : × + ÷

پنجاب یونیورسٹی کے امتحانوں کے مصارف

میاں عبدالحی وزیر تعلیم پنجاب کے بیان کے مطابق ۱۹۴۲ء میں یونیورسٹی کے مختلف امتحانات کے لئے کل ۵۰۴ ممتحن مقرر کئے گئے تھے سوالات کے پرچے تیار کرنے ۔ اور جوابات کے پرچے دیکھنے کی اجرت بابت [illegible] روپے ادا کی گئی سب سے زیادہ اُجرت جو کسی واحد ممتحن کو دی گئی [illegible] روپے ۔ ممتحنوں میں سے ۲۶۴ افراد بیرون پنجاب سے مقرر کئے گئے تھے ۔

پنجاب میں جرائم کا اضافہ

سردار بہادر اُجل سنگھ نے پنجاب اسمبلی میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پنجاب میں جرائم کی رفتار کے متعلق حسب ذیل اعداد و شمار پیش کئے :-

سال	قتل	ڈاکا	لوٹ مار	نقب زنی
۱۹۳۶	۸۹۸	۸۴	۴۵۲	۱۳۴۲۶
۱۹۳۷	۹۳۳	۸۷	۴۸۱	۱۴۰۴۴
۱۹۳۸	۱۰۴۱	۹۲	۵۶۷	۱۵۶۲۱
۱۹۳۹	۱۱۳۲	۱۴۹	۶۷۴	۱۶۷۲۷

جن لوگوں پر قتل کا الزام ثابت ہوا۔ اُن کی تعداد سال وار حسب ذیل ہے :-

سال	تعداد
۱۹۳۶	۷۶۶
۱۹۳۷	۸۰۹
۱۹۳۸	۷۷۴
۱۹۳۹	۸۹۶

سردار صاحب نے کہا کہ "قتل کی وارداتوں کے اضافے کی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہو سکی البتہ مشرقی پنجاب میں ڈاکے اور لوٹ مار کے واقعات کے اضافے کی وجہ اس علاقے میں مفرور مجرموں اور مفرور فوجی ملازموں کی موجودگی ہے۔ نقب زنی کی وارداتوں میں اس لئے اضافہ ہوا ہے کہ مشرقی ضلعوں میں قحط ہے۔ اس کے بعد پارلیمنٹری سکرٹری صاحب نے شاید پنجابیوں کی تسلی کے لئے فرمایا کہ جرائم کی رفتار میں یہ اضافہ پنجاب ہی میں نہیں دوسرے صوبوں میں بھی ہوا ہے مثلاً صوبجات متحدہ میں نقب زنی کی وارداتیں ۱۹۳۶ء کے مقابلے میں ۱۹۳۹ء میں ۴۸۳ سے ۱۴۱۰۹ تک پہنچ گئیں ڈاکے کی وارداتیں ۱۳۱۴ سے ۱۱۶۵- اور قتل کی وارداتیں ۹۴۳ سے ۱۳۴۷ تک پہنچ گئیں صوبجات متوسط بمبئی اور مدراس میں بھی جرائم میں اضافہ ہی ہوا ہے "

دوسرے صوبوں کی جرائم پیشگی کی اطلاع بڑی تسلی بخش ہے۔ اب ہمیں کس بات کا کھٹکا ہے۔ مرگِ انبوہ جشنے دارد۔

ہندوستانی زبان اور سنیما

مسٹر کے۔ اے عباس آئین پاتھ میں سنیما کے ذریعہ سے ہندستانی زبان کی ترقی کے متعلق ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ اگر سنیما کو ہندوستانی زبان [illegible]

تو ہر شخص بہت جلد یہ زبان سیکھ جائے گا۔ مضمون نگار نے بتایا ہے کہ ہندوستانی فلمیں اُن علاقوں میں بھی بہت ہر دل عزیز ہیں جہاں کی زبان ہندوستانی نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں۔

سینما نے زبان کے سلسلے میں دو اہم کام کئے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کے ذریعے سے عوام کے ذخیرۂ الفاظ میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ دوسرا کام جو اس سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ سینما نے اُن علاقوں کو بھی جہاں ہندوستانی نہیں بولی جاتی اس زبان سے کافی آشنا کر دیا ہے۔ دس سال قبل جنوبی ہند کے کسی باشندے سے آسان سے آسان ہندوستانی زبان کا کوئی فقرہ سمجھنے یا ادا کرنے کی بہت کم توقع کی جا سکتی تھی۔ دہلی کے کسی باشندے کے لئے مثلاً حیدرآباد سندھ یا چٹا گانگ کے رہنے والوں پر اپنا مفہوم واضح کرنا تقریباً ناممکن سا تھا۔ آج حالت بہت بدل چکی ہے۔ اب تاگ پور کے بازار میں کوئی پنجابی کسی تامل سے بات چیت کرنے میں دقت محسوس نہیں کرتا۔ یہ سینما کے ذریعے سے اُن علاقوں پر ہندوستانی زبان کی یورش کا اثر ہے۔ جہاں یہ زبان نہیں بولی جاتی کانن بالا، دیویکا رانی اور جگل وغیرہ کے فنّی کمالات اور موسیقی کی ساحرانہ کشش ہر مہینہ ہزاروں ایسے تماشائیوں کو جن کی زبان تامل، تلنگی، کنٹری، سندھی یا پنجابی ہوتی ہے کشاں کشاں مقامی تماشا گاہوں میں لے جاتی ہے جہاں ہندوستانی زبان کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ اس طرح ہندوستانی زبان کی ہر دل عزیزی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس بات کا صحیح اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ مقامی زبانوں کی فلمیں ہندوستانی فلموں کی جگہ نہیں لے سکیں اور جنوبی ہند میں تامل یا تلنگی زبان کی فلموں کے مقابلے میں ہندوستانی فلمیں بہت زیادہ روپیہ پیدا کرتی ہیں۔

والمیکی کی رامائن کا قدیم ترین نسخہ

حکومتِ نیپال نے لاہور کی انٹرنیشنل اکیڈیمی آف انڈین کلچر کو والمیکی کی رامائن کے ایک بہت قدیم نسخے کی ۵۰۰ تصویریں پیش کی ہیں۔ دو خوش رنگ پتّوں پر لکھے ہوئے اس نسخے سے پرانا کوئی نسخہ ہندوستان بھر میں موجود نہیں ہے۔ اس کی کتابت کا سال سمت [illegible] بکرمی مطابق [illegible]ء ہے۔ انٹرنیشنل اکیڈیمی آف انڈین کلچر اس عظیم الشان نظم کا ایک نیا نسخہ مرتب کر رہی ہے جو ان تصویروں سے مزین ہوگا۔

دہلی کا مجوزہ براڈ کاسٹنگ ہاؤس

دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کی ایک بہت بڑی مرکزی نشر گاہ کی تعمیر کی تجویز ہوئی ہے۔ حکومت نے اس کی تعمیر کے مصارف کے لئے جن کا اندازہ نو لاکھ تیس ہزار روپے کیا گیا ہے اپنی منظوری دے دی ہے۔

دہلی کے سٹیشن کے پھیلاؤ اور اس کے مستقبل میں عالمگیر توسیع کی تجویز کے پیشِ نظر اس کے لئے ایسی عمارت اور ضروری ساز و سامان کی ضرورت بہت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔

جدید عمارت میں سٹیشن ڈائرکٹر دہلی کے دفتر کے علاوہ نشر و اطلاعات کا مرکزی ادارہ، صدر دفتر آل انڈیا ریڈیو، تجربہ گاہ اور سٹوڈیو وغیرہ بھی ہوں گے اور [illegible] کے بعد [illegible] کی فہرست [illegible] گا۔

ہندوستان کے محکمۂ تار وڈاک کی آمدنی

سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں محکمۂ تار وڈاک کی بچت ۸۹۵۹۰۰۰ روپے تھی سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء سے جب اس محکمہ کا حساب تجارتی طریق کار کے ماتحت رکھا جانے لگا کبھی اتنی بچت نہ ہوئی تھی۔ ڈائرکٹر جنرل نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس غیر معمولی بچت کی وجہ جنگ کے باعث تار وڈاک اور ٹیلیفون کے استعمال کی کثرت ہے۔

محکمے کی کل آمدنی میں اس سال ۸۰۹۲۰۰۰ کا اضافہ ہوا۔ اس دفعہ کل آمدنی ۱۲۴۸۵۲۰۰۰ روپے ہے۔ گزشتہ سال کل آمدنی ۱۱۶۷۶۰۰۰۰ روپے تھی کل آمدنی کا یہ اضافہ حسب ذیل مدوں پر مشتمل ہے ا۔

ڈاک خانہ	تقریباً ۱۹۰۰۰۰۰	روپے
تار	تقریباً ۴۰۰۰۰۰۰	روپے
ٹیلیفون	تقریباً ۲۱۰۰۰۰۰	روپے
ریڈیو یعنی بے تار برقی ٹیلیگراف	تقریباً ۱۰۰۰۰۰	روپے

یو-پی میں تمباکو کی کاشت

حکومت نے بھراری (بندیلکھنڈ) کے سرکاری فارم میں تمباکو کی کاشت کی منظوری دی ہے جب سے برطانی حکومت نے امریکا سے تمباکو کی درآمد بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے یہ تجویز زیر غور تھی حکومت نے بھراری کے سرکاری فارم میں چار سال تک ورجینیا کے تمباکو کی کاشت کا تجربہ کیا ہے جس سے ثابت ہوا ہے کہ بندیلکھنڈ میں جو پالے اور ژالہ باری وغیرہ سے نسبۃً محفوظ ہے تمباکو کی کاشت کامیاب ثابت ہوگی۔ تجویز یہ ہے کہ تقریباً چار سو ایکڑ زمین میں تمباکو کی کاشت ہو۔ ان میں سے سو ایکڑ زمین سرکاری فارم کی ہوگی۔ جہاں حکومت کا محکمہ تمباکو بوئے گا۔ باقی تین سو ایکڑ کی کاشت کوآپریٹو سوسائیٹیوں کے انتظام کے ماتحت ہوگی۔

کل کاشت کی نگرانی محکمہ زراعت کرے گا۔ اور تمام فصل "انڈین لیف ٹبیکو کمپنی لمیٹڈ" کے پاس فروخت ہوگی۔ جو صلاح و مشورہ سے محکمہ زراعت کی مدد کرے گی +

حامد علی خاں

سرمائے کی چٹان
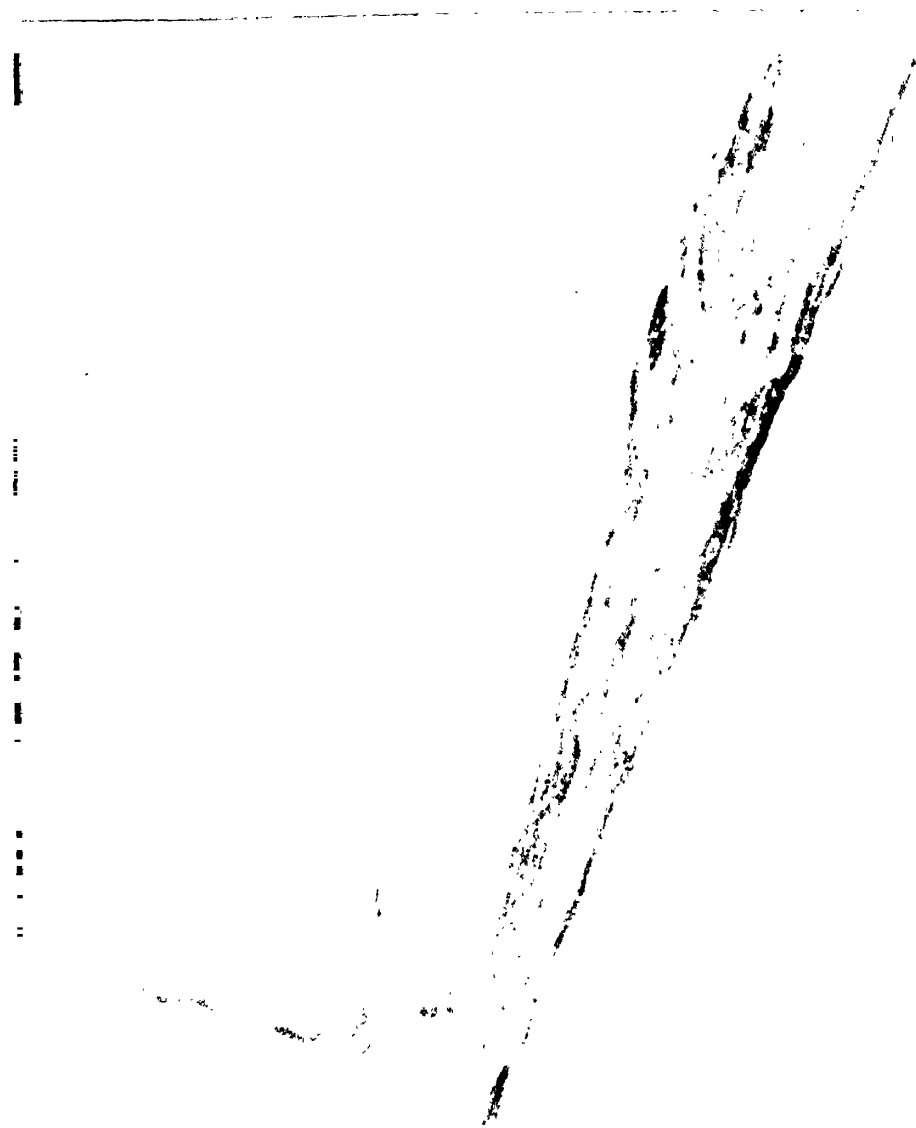
لندنی دوست کے نام خط

ذہنیت انساں ہوتی ہے لیکن ذہنیت ملکوں اور قوموں کی ہوتی ہے۔ یہاں نہ ملک ہے نہ قوم۔ ہندوؤں کے متعلق میں کچھ کہہ نہیں سکتا
لیکن پنجاب کے مسلمان کی یہ حالت ہے کہ صبح اٹھتا ہے تو خالی الذہن ہوتا ہے۔ ناشتے سے قبل اخبار میں جناح کا ہنگامہ خیز بیان پڑھ لیا تو اپنے
آپ کو مسلم لیگی سمجھنے لگتا ہے۔ دوپہر کو صاحب بہادر نے دفتر میں چمکارا تو وفادار رعایا بن جاتا ہے۔ سہ پہر کو بھائی بھائی ٹم کانگرسی دوست سے
بحث کر کے ہارنے کے بعد کانگرس پر ایمان لے آتا ہے اور شام کو موچی دروازہ کے باہر احراری لیڈر کے گرفتار ہونے کے بعد جلسے میں شامل
ہو کر "مولانا زندہ باد" کے نعرے لگاتا ہے۔ رات کو بستر پر لیٹتا ہے تو پھر سب کچھ فراموش کر دیتا ہے اور اتنا بھی نہیں سوچتا کہ دن بھر جو چار پانچ دفعہ
اُس نے اپنا ایمان بدلا ہے اُس سے اُس کو کیا فائدہ یا نقصان ہوا ہے۔ چنانچہ دوسری صبح وہ پھر خالی الذہن ہوتا ہے اور پھر سے اُس کی
زندگی کا وہ چکر چلنے لگتا ہے جس کی تفصیل میں دے چکا ہوں۔ ایسے حالات میں ذہنیت کی تربیت کس طرح ہو سکتی ہے۔ تم بُری ذہنیت
کا ماتم کر رہے ہو لیکن لندن میں چار سال رہ کر ہندوستان کو غالباً بھول چکے ہو۔ یہاں اچھی اور بُری ذہنیت کا سوال ہی نہیں۔ یہاں تو اکثر
یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہماری ذہنیت ہے بھی یا نہیں۔ ہماری زندگی تو سینما ہال کی زندگی ہے۔ زندگی کی فلم پردۂ سیمیں پر چل رہی ہے۔ اور
ہم ذہنی خلا کے ہال میں بیٹھے ہوئے اس کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر اس فلم کے مناظر دلفریب اور قہقہہ انگیز ہیں تو ہم کرسی پر بیٹھے ہوئے لوٹن
کبوتر بن رہے ہیں۔ اگر فلم یاس انگیز ہے اور دردناک مناظر سے لبریز ہے تو ہم آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہے ہیں اور رومال سے آنکھوں
رناک کے قطروں کو پونچھ رہے ہیں۔ فلم ختم ہو جاتی ہے تو ہم تنہا خالی ذہن کے ہال میں رہ جاتے ہیں۔ ہمیں ہیرو بننا آتا ہے لیکن اُسی وقت
تک جب تک کہ ہنگامہ خیز زندگی کی فلم چلتی ہے۔ جب ہنگامہ نہیں ہوتا تو ہم کچھ بھی نہیں ہوتے۔ تم وہاں بیٹھے بیٹھے ہماری ذہنیت کو کوس
رہے ہو اور کہتے ہو کہ ہماری ذہنیت ہی تحصیل آزادی کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہے۔ تم ولایتی باتیں کرتے ہو۔ یہ نہیں سمجھتے
ہمارے ہاں ذہنیت کا لفظ شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ یاد ہے ہم تم دونوں پٹنی ہائی سکول کو دیکھنے گئے تھے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے تھے کہ
ان فرنگی بچوں کے عام مطالعہ کی کتابوں میں ہندوستان کے متعلق کتنی بے سروپا باتیں درج تھیں۔ تم نے تو سکول مسٹرس سے اچھی
بحث بھی چھیڑ دی تھی کہ ہندوستان میں یوں نہیں ہوتا کہ گلی کوچوں میں ہاتھی اور سانپ پھن اٹھائے ہوئے پھر رہے ہوں اور یہ بھی غلط
ہے کہ ہر ایک فرنگی لڑکی کو دیکھ ہندوستانی ٹوکری میں بند کر کے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور یا مار ڈالتے ہیں یا اس کو دیوی بنا کر پوجنا شروع
کر دیتے ہیں۔ تمہارا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں بھی سفید رنگ کے مرد اور عورتیں ہوتی ہیں اور مثال کے طور پر تم نے بارہا اپنے ابھرے
ہوئے سنگولی رخساروں پر انگلی لگائی تھی جن میں سے خون پھوٹ کر نکلنے کے لئے مچل رہا تھا۔ گو اس پر مسٹرس نے جھکا کر آنکھیں نیچی کر

لی تھیں لیکن فرنگی زادی کو تم قائل نہیں کر سکے تھے کیونکہ تمہارے اعتراض کے باوجود وہ کہہ رہی تھی ممکن ہے اب ہندوستان کی حالت مختلف ہو لیکن بہت ممکن ہے کہ جب یہ کتاب لکھی گئی ہو اُس وقت ہندوستان کی یہی کیفیت ہو جو اس کتاب میں درج ہے۔ آخر سفید لوگ اتنی دیر سے وہاں رہیں ان کا کچھ اثر تو پڑا ہوگا" یعنی یہ کہ سفید لوگوں کو دیکھ دیکھ کر ہاتھیوں اور سانپوں نے گلیوں میں آنا چھوڑ دیا ہے سمجھتے ہو اُس کے متمدن ہونے میں کیا اثر تھا۔ یہی وہ چیز تھی جس کو تم ذہنیت کہتے ہو۔ اس سکول مسٹرس اور اُس کی اُستانی اور پھر اُس کی اُستانی سب یہی کتاب پڑھی ہوئی تھیں جس پر ہم معترض تھے اور اس کتاب سے ہر فرنگی بچے نے اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں ہندوستان اور ہندوستانیوں سے نفرت کی ذہنیت پیدا کر لی تھی۔ ذہنیت پیدا کرنے کے لئے ملکی اور قومی سعی کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور فرنگی اس کام کو بطریقِ احسن اپنے ملک میں سرانجام دے رہا تھا۔ یہاں سرے سے یہ کوشش ہی مفقود ہے۔ سکولوں اور کالجوں کے نصاب میں ہر وہ چیز موجود ہے جو قوم یا ملک کی عملی زندگی کو سنوارنے کے لئے مفید نہیں۔ لیکن ہر اُس چیز سے بے اعتنائی برتی گئی ہے جو آدمی کو انسان اور انسان کو مفید شہری بنا سکتی ہے۔ پھر جہاں تربیت کا یہ عالم ہو وہاں ذہنیت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ مانو نہ مانو میں بہرحال اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہاں ذہنیت کا فقدان ہے۔ اس لئے تم اس کے بُرا ہونے کا ماتم نہ کیا کرو۔

ذہنیت کا ذکر کرتے کرتے یہاں کی (Complexes) ذہنی الجھنوں (خدا جانے اردو والوں نے Complex کا کوئی یا فارسی ترجمہ کیا ہے۔ بہرحال میں نے اسے ذہنی اُلجھن کے نام سے پکارا ہے فلسفیوں کو اس پہ اعتراض ہو تو بے شک رد کر دیں بہرحال تم میرا مطلب سمجھ جاؤ گے) کا خیال آ گیا۔ اگر دنیا کی ذہنی الجھنوں کی تاریخ لکھی گئی تو جہاں تمام دنیا کی ذہنی اُلجھنوں کی قسمیں ایک ہی باب میں گنائی جائیں گی وہاں ہندوستان کی ذہنی اُلجھنوں کے لئے ایک علیحدہ باب مخصوص کرنا پڑیگا۔ وہ اس لئے کہ یہاں کی ذہنی الجھنیں دُنیا سے نرالی ہیں۔ دُنیا نے عام طور پر ذہنی اُلجھنوں کو دو طرح کی کیفیتوں سے نامزد کیا ہے۔ یعنی ایک طرح کی اُلجھن کو احساسِ کمتری (Inferiority Complex) کہتے ہیں اور دوسری کو احساسِ برتری (Superiority Complex)۔ یہاں بھی آئے دن اِن "احساسات" کا ذکر ہوتا رہتا ہے اور لوگ دوسرے لوگوں کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے کسی "احساس" کا لیبل اُن پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ مگر مجھ سے پوچھو تو یہ کہوں گا کہ ہندوستان میں میں نے "احساسات" کے شکاروں میں سے ہر کسی کو "احساسِ کمتری" کا شکار پایا۔ فرنگی کے غلام میں "احساسِ برتری" ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ یوں کہنے کو غلاموں اور غلام زادوں میں ہر ایک طرح کا احساس موجود ہے لیکن بیشتر احساسات محض دکھاوے کے ہیں۔ اُن کی اصلیت کوئی نہیں۔ مبادا تم نے تفصیل سُن لو "احساسِ کمتری" کی مثالیں تو تمہیں عام مل جائیں گی۔ مثلاً یہاں کے بیشتر لیڈر اپنے خطابات خود ہی گھڑ کر ان کو مشہور کر دیتے ہیں یہ خطابات مسٹر اور مولوی سے شروع ہو کر قائد، شیخ اور مولانا کی حدوں سے گزرتے ہوئے فخرِ قوم، رہبرِ اعظم اور خدائے ملت تک جا پہنچتے ہیں۔ کسی سے پوچھو کہ بھئی یہ خطابات انہیں کس نے دیئے تھے تو تحقیقات کے بعد پتہ چلیگا کہ انہوں نے سب سے پہلے خود ہی اپنے یا اپنے دوستوں کے اخبار میں اپنا نام ایسے طبع کیا تھا یا کرایا تھا۔ جن لوگوں کی اخباری دنیا تک رسائی نہیں وہ اپنے خط و کتابت کے کاغذات پر اپنے نام کے پہلے یا پیچھے مسٹر یا ڈاکٹر مطبوعہ چھپا لیتے ہیں۔ اور اگر لوگوں سے خط و کتابت نہیں تو گھر کے سامنے چھوٹے بڑے رقبوں کے مختلف بورڈ لگا دیتے ہیں جن پر بابا اُن کے نام کے پہلے [illegible] لکھا

چاہتا ہے۔ ابھی یہاں نہیں بلکہ اگر آقا سے کوئی خطاب لے لیا ہے تو اُس کو اپنی ڈگریوں کے ساتھ ہی لکھ دیں گے۔ اگلے دن ایک دوست کسی خان بہادر کی کتاب دیکھ رہا تھا تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ انہوں نے نام کے بعد اپنی علمی ڈگریوں میں سب سے پہلے K.B. لکھ رکھا تھا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ یہ K.B. کس یونیورسٹی کی ڈگری ہو سکتی ہے آخر دوست سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ کتاب کے مالک خان بہادر بھی ہیں۔ علمی ڈگریوں کی اس بدنامی پر افسوس ظاہر کر کے خاموش ہو رہا۔ خیر یہ تو ایک ذاتی کمزوری ہے اور خطاب گھڑنے والوں یا خطاب یافتہ لوگوں کا کوئی ایسا قصور نہیں جس سے عوام کو کوئی نقصان پہنچتا ہو لیکن یہاں "احساسِ کمتری" کے وہ نادر نمونے بھی دیکھ پاؤ گے جن کو دیکھ کر انسانیت منہ ڈھانپ لیتی ہے۔ یہاں ایک دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب سے اوپر کی منزل میں ملنا تھا۔ سیڑھیوں پر چڑھنے لگا تو ایک جانب لکھا ہوا تھا:۔

یہ راستہ صرف افسروں کے لئے ہے

میں فوراً نیچے اتر آیا کیونکہ ایک تو میں افسر نہیں تھا دوسرے مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں یہ راستہ کسی افسر کے پاس ہی نہ لے جائے اور مجھے تو بحیثیت خود صرف ایک انسان سے ملنا تھا۔ افسر سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اب تم ہنس رہے ہو گے کہ میں نے "افسر" اور "انسان" میں تمیز پیدا کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمیز میری پیدا کی ہوئی نہیں بلکہ یہ سب کچھ یہاں کے غلاموں اور غلام زادوں کا کیا دھرا ہے۔ لگے ہاتھوں غلاموں اور غلام زادوں کی تشریح بھی کر دوں۔ غلام وہ ہیں جو آقا کی خدمت کرتے ہوئے اپنی نصف سے زیادہ عمر گذار چکے ہیں اور اب یا پنشن لینے والے ہیں یا خطاب لے کر مرنے والے ہیں۔ غلام زادے وہ ہیں جنہیں اُن کی دیکھا دیکھی آقا کی خدمت کرنے کا نیا چسکا پڑا ہے اور ہمارے ایک اخبار نویس دوست کی طرح ابھی سے اس دھن میں ہیں کہ فلاں فلاں غلام وزیر کی تعریف کر کے کسی روز خان صاحب ہو جائیں گے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات یہ تھی کہ جب میں "افسروں" کا راستہ چھوڑ کر دوسری سیڑھیوں سے بالائی منزل پر پہنچا تو دیکھا کہ افسروں کا راستہ بھی دوسری سمت سے بل کھا کر وہیں آکر ختم ہو گیا ہے اور اس طرف بھی وہی الفاظ ایک بورڈ پر لکھے ہوئے تھے جن سے نچلی منزل میں افسروں اور انسانوں یا انسانوں اور کیڑوں میں فرق پیدا کیا گیا تھا۔ "کیڑے" کا لفظ تمہیں بُرا لگتا ہوگا لیکن میں اپنے تاثرات بیان کر رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب میں افسروں والے راستے سے لوٹ کر دوسری سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا تو پہلے تو مجھے یہ خیال آیا کہ کیا ہوا اگر میں افسروں والے راستے سے نہیں جا سکا بہر صورت میں انسانوں والے راستے پر تو جا رہا ہوں۔ یہ احساسِ برتری کا کرشمہ تھا لیکن معاً مجھے یہ خیال آیا کہ انسان تو دوسرے راستے سے اوپر چڑھتے تھے اور افسر ہی انسان تھے میں تو اُن کے مقابلے میں صرف ایک کیڑا ہوں۔ جس کے چڑھنے کے لئے یہی سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ اس وقت احساسِ کمتری دامنگیر تھا۔ اس کشمکش میں میں اُن صاحب کے کمرے تک پہنچ گیا جن سے مجھے ملنا تھا کام کی نوعیت "سرکاری" نہ تھی۔ اس لئے میں بلا جھجک آگے بڑھتا چلا گیا لیکن دروازے تک پہنچا تو دربان نے ہاتھ دیکر روک لیا۔ میں اُس سے کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے کیوں روکتا تھا اور وہ اس پر مصر تھا کہ میں اپنے کام کی نوعیت ایک کاغذ پر لکھ کر اندر بھجواؤں اور اجازت ملنے پر اندر جاؤں۔ مجھے شیشے میں سے نظر آ رہا تھا کہ جن صاحب سے مجھے ملنا تھا وہ میز کے اوپر ٹانگیں رکھے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے اس لئے اُن کے قیمتی وقت کے ضائع ہونے کا احتمال نہ تھا۔ اور اسی لئے میرے اندر جانے میں کوئی رکاوٹ نہ ہونی چاہیئے تھی لیکن دربان بہرحال دربان تھا اور اسی کام کے لئے وہاں رکھا گیا تھا کہ وہ "صاحب" کے احساسِ کمتری کی نگہداشت کرے۔ اس لئے مجھے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ اور دربان ایک کاغذ پر میرا نام لکھوا کر اندر لے گیا اور اندر داخل ہوتے ہی اُس نے سامنے کے

شیشوں کے سامنے پردہ چڑھا دیا۔ پانچ منٹ میں منٹ انتظار کیا۔ مبلغ کا نفس کہنے سے بہت گم [illegible] تو بھی [illegible]
سے اندر والے صاحب کا وہی نام لے کر پکارا جس نام سے لندن میں ہم اکثر تم سے پکارا کرتے تھے لیکن احساس کمتری [illegible]
میں دربان صاحب پُرمعنی انداز میں برآمد ہوئے اور کہا:۔

"تم اندر جا سکتے ہو" (گفتگو پنجابی میں ہو رہی تھی کہنے لگا "لنگھ جا")۔

ایک دفعہ لوٹ جانے کو جی چاہا لیکن اب کرکری ہو ہی چکی تھی۔ اس لئے اندر چلا گیا۔ مزاج پرسی کے بعد اندر والے صاحب نے اپنی تمام مصروفیتوں کی طویل داستان سنانے کے بعد جلدی نہ مل سکنے کی معذرت پیش کی ویسے میز پر اخبار اب بھی لکھا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا اور کھسیانا ہو ہو جاتا۔ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا اور چند منٹ بیٹھ کر چلا آیا۔ اس دفعہ احساس کمتری کو مٹانے کے لئے عمداً افسروں کے رستے نیچے اُترا۔ یہ خیر ہوئی کہ نہ کسی نے دیکھا اور نہ کسی نے پوچھا۔

اب تم منتظر ہو گے کہ "احساس برتری" کی کوئی مثال بھی تمہارے سامنے پیش کروں اور سب سے پہلا سوال جو تمہارے دل میں پیدا ہوا ہوگا وہ یہ ہوگا کہ جو مثالیں میں اب تک پیش کر چکا ہوں وہ "احساس کمتری" کی تھیں یا "احساس برتری" کی۔ اگر تم ان کا تجزیہ کرو اور فرائیڈ کی رائے معلوم کرو تو اصطلاحی طور پر یہ ساری مثالیں "احساس برتری" کی تھیں۔ لیکن میں نے عمداً انہیں "احساس کمتری" کے نام سے یاد کیا ہے کیونکہ میں نے ان تمام چیزوں کو دیکھ کر یہ محسوس کیا ہے کہ ان احساسات کی پیدائش کا ذمہ دار حقیقی برتری کا جذبہ نہیں۔ اپنے آپ کو برتر ظاہر کرنے کا جذبہ ضرور کام کر رہا ہے۔ لیکن یہ جذبہ اپنی ذلت اور بیچارگی کے شدید احساس نے پیدا کیا ہے۔ غلام اور غلام زادہ صبح سے لے کر شام تک اس دھن میں رہتا ہے کہ اپنے آپ کو کسی طرح برتر ظاہر کرے۔ لیکن اس کوشش کی تہہ میں ہر وقت اُسے اپنی کمتری کا احساس رہتا ہے۔ پھر کہو اس ملک میں "احساس برتری" پیدا ہی کیسے ہو سکتا ہے۔ زندگی میں کامرانی اور شادمانی کا اطمینان حاصل کرنے کے بعد جب فراغت زیادہ میسر آتی ہے تو آزاد ملکوں کے مرد اونچی ٹوپیاں اور عورتیں سنہری چشمے لگا کر عام آدمیوں سے الگ ہو کر چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ اُس وقت لوگ اُنہیں (High Brows) (اونچی بھووں والے) پکارنے لگتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی بھویں تنی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ان کے دل میں احساس برتری پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن غلام کی زندگی کامرانی سے کب ہمکنار ہوتی ہے اور اس کی کامرانی میں شادمانی کو کیا دخل؟ پھر جب حالت یہ ہو تو "احساس برتری" کا تصور اور بلند ذہنیت کی تحصیل اس کے بس میں کہاں۔ یہ چیزیں اور ملکوں کو راس آتی ہیں۔ تم جب ہندوستان کی بات کیا کرو تو ہندوستانی دل و دماغ کو کام میں لایا کرو ولایتی معیار اور ولایتی خیالات ابھی ہمارے کام کے نہیں۔

محمد باقر

غزل

(والاشان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیعؔ حیدرآباد دکن)

شاید یہ میرے جذبۂ دل کا قصور ہے ۔۔۔ تو دل کے پاس رہ کے بھی نظروں سے دُور ہے

کیوں آج بڑھ چلی ہے تصور کی بیخودی ۔۔۔ وہ آ گئے تو ہوش میں آنا ضرور ہے

مستی میں کس کو یاد ہے توبہ کا ٹوٹنا ۔۔۔ تم نے پلائی تھی ہمیں اتنا شعور ہے

باقی ہیں حسن و عشق میں اب تک نزاکتیں ۔۔۔ اُن کو نگاہ پر ہمیں دل پر غرور ہے

دل مٹ گیا یہ دل کے مقدّر کی بات تھی ۔۔۔ میرا قصور ہے نہ تمہارا قصور ہے

کیا پوچھتے ہو اہلِ محبت کی زندگی ۔۔۔ مرنے کے اعتبار پہ جینا ضرور ہے

جلووں سے اُس کے تاک لو تاب نظر شجیعؔ

وہ دل سے گو رہے نہ نگاہوں سے دُور ہے

زمانۂ حال کے والدین اور اولاد

اس نئے زمانے میں جو حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں اُن میں سے ایک وہ تبدیلی ہے جو آج کل کے والدین میں ہوئی ہے جب سے دنیا شروع ہوئی ہے اس وقت سے والدین کا عقیدہ تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کا ممنون ہونا چاہیے کیونکہ یہی ان کو اس دنیا میں لانے کا باعث ہوئے ہیں، اور انہوں ہی نے شیر خوارگی کے زمانے میں پالا پوسا ہے۔ والدین سے محبت کرنا اولاد کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا فرض سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی اولاد والدین سے محبت نہ کرتی تھی تو ڈنڈے کے زور سے محبت کرنا سکھانے میں والدین حق بجانب خیال کیے جاتے تھے۔ یہ بھی فرض کیا جاتا تھا کہ اگر کوئی ماں شرارت و خباثت کا مجسمہ نہیں تو وہ اپنی اولاد سے اتنی اور ایسی محبت کرتی ہے کہ کسی اور چیز سے نہیں کرتی۔ اس کے علاوہ ماں جبلۃً اور فطرۃً جانتی فرض کی جاتی تھی کہ بچوں کا رکھ رکھاؤ کیسا ہونا چاہیے۔ اگر کوئی بچہ بدتمیزی کرتا ہے تو قصور بچے کی فطرت کا ہے نہ کہ ماں کے رکھ رکھاؤ کا۔ جب تک والدین کے یہ عقیدے قائم اور باقی رہے اس وقت تک بچے پیدا کرنے میں لوگوں کو لطف آتا رہا اور اسی وجہ سے کثرتِ عیال اصول رہا نہ کہ استثناء۔

لیکن آجکل کے والدین بہ حیثیت والدین بدل گئے ہیں۔ اب اکثر لوگ ہستی کو مشتبہ رحمت سمجھتے ہیں۔ یہ اپنی اولاد سے معافی چاہنے کی طرف مائل ہیں۔ کیوں کہ ان ہی کی وجہ سے اولاد پر وہ مصیبتیں پڑتی ہیں جو ان کے خیال میں زندگی کا لازمہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر وقت لعنت ملامت بچوں کے ساتھ رہنا کوئی بڑی نعمت نہیں۔ اگر اولاد ان سے فطری محبت کا اظہار کرتی ہے تو ان کو اوڈیپس مولعہ[1] کا شبہ ہوتا ہے۔ ان کو احساس ہے کہ بچوں کے رکھ رکھاؤ کا کوئی جبلی علم ان کو نہیں۔ لہٰذا وہ ان تمام غلطیوں کے متعلق بڑی بڑی کتابیں پڑھتے ہیں۔ جن کے سرزد ہونے کا ان کو اندیشہ ہوتا ہے لیکن ان تمام مطالعے سے وہ اس قدر دہشت زدہ ہو جاتے ہیں کہ بچوں کی شکل سے ان کو ہول ہونے لگتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو "ماہرین" کے حوالے کر دیتے ہیں "ماہرین" وہ لوگ ہوتے ہیں جنھوں نے اس قسم کی بڑی بڑی کتابیں بہت لکھی ہیں۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے بچے اب والدین کی خوشی کا باعث نہیں رہے ہیں چنانچہ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی پیدائش برابر کم ہو رہی ہے۔

فرائڈ وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے والدین کو یہ بتا کر دہشت زدہ کر دیا کہ والدین سے اولاد کی محبت گناہگارانہ بُری اور نیاہ کن ہوتی ہے۔

---

[1] Oedipus Complex نفسیات کی اصطلاح میں لڑکے یا لڑکی کی اس غیر شعوری خواہش کو کہتے ہیں کہ باپ یا ماں کو کسی طرح ذبح کر کے ماں کو اپنی بیوی یا باپ کو اپنا میاں بنا لیں۔ لڑکوں یا لڑکیوں کو والدین سے زیادہ محبت کا نام ہے جس کے ساتھ شہوانی عنصر شامل ہوتا ہے۔ بعض مصنفین لڑکے کی اس خواہش کو اوڈیپس مولعہ اور لڑکی کی اس خواہش کو الیکٹرا مولعہ کہتے ہیں (مترجم)

واٹسن فرائڈ سے ہر بات میں اختلاف کرتا ہے لیکن اس بات میں وہ اس سے متفق ہے۔ بظاہر اس کی رائے ہے کہ فطرت کا یہ عمل نہایت احمقانہ ہے کہ بچوں کی مائیں ہوتی ہیں لیکن اس کی توقع ہے کہ حکومت بہت جلد فطرت کے اس نقص کو رفع کر دے گی۔[1] ظاہر ہے کہ بچے کو اچھی کھلائی سے بھی اتنی ہی محبت ہو جا سکتی ہے جتنی کہ اس کو اپنی ماں سے ہوتی ہے لیکن یہ صورت بھی اتنی ہی تباہ کن اور خطرناک ہے۔ لہٰذا آیا کو برابر بدلتے رہنا اچھا ہے۔ بچے کو ایک الگ کمرے میں تنہا سونا اور نہایت ہی پاک صاف ماحول میں رہنا چاہئے۔ خیال یہ ہے کہ اس طرح وہ [illegible] زندگی میں [illegible]

میرا اپنا خیال ہے کہ یہ عقیدہ بالکل غلط ہے۔ اس کی تجربی شہادت قریب قریب بالکل صفر ہے اس کی بنیاد محض نظری ہے ایک نفسیاتی قانون ہے کہ ہر محبت شہوانی ہوتی ہے اور ایک اخلاقی قانون ہے کہ ہر شہوانی محبت ناپسندیدہ ہے بہ شرطیکہ یہ شہوانی اجتماع کی طرف مائل نہ ہو۔ میں ان قوانین میں سے کسی سے بھی متفق نہیں لیکن پہلے قانون کی میں خاص طور پر مخالفت کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ والدین کی محبت اولاد سے، اور اولاد کی محبت والدین سے جزاً جسمانی ہوتی ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ جس محبت کے ساتھ جسمانی عنصر نہ ہو وہ محض خواب ہے۔ محبت کرنے والے والدین اپنے بچوں کو سینے سے لگاتے ہیں اور پیار کرتے ہیں۔ اسی طرح بچے بھی خصوصیت کے ساتھ کم عمری میں اپنی ماؤں کے جسموں کی گرمی کو پسند کرتے ہیں۔ اپنی ماؤں کے قریب رہنے کی وجہ سے ان کو محفوظیت کا احساس ہوتا ہے لیکن ان دونوں حسیات کو شہوانی کہنا، میرے نزدیک، بعض اہم تفریقات کو نظر انداز کرنا ہے۔ جو تشفی شیر خوار بچوں کو اپنی ماؤں سے حاصل ہوتی ہے وہ ان تشفیوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو ہم کو گرم پانی کی بوتلوں اور پولیس سے حاصل ہوتی ہیں۔ اولاد کے تعلق سے والدین کی حسیات اس سے زیادہ پیچیدہ ہوتی ہیں۔ اور مجھے اس سے انکار نہیں کہ بعض والدین کی ان حسیات میں شہوانی عنصر شامل ہوتا ہے لیکن جہاں یہ شہوانی عنصر غالب ہو جاتا ہے۔ وہاں والدینی حسیات بگڑ جاتی ہیں، اور ان کی فعلیتوں کا رُخ بدل جاتا ہے۔

اس کے علاوہ میں یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ اگر یہ شہوانی عنصر والدین میں بہت شدید ہوتا ہے تو کچھ عرصے کے بعد یہی عنصر اولاد کی حسیات میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسی مثالوں کو طبعی انسانوں کے فوری جذبات کی طبعی ترقی کی مثال نہ سمجھنا چاہئے۔ اصل میں یہ ان لوگوں کے سقیم رد عمل ہیں جو نامناسب ماحول کے زیر اثر بگڑ چکے ہیں۔ ایک بلی اپنے بچوں کو چاہتی ہے لیکن ان کے ساتھ اس کا سلوک بلاؤ کے ساتھ اس کے سلوک سے مختلف ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ڈاکٹر فرائڈ بلی کی ان حرکتوں کو دیکھے تو اس کو اس بلی میں حرامکاری کا ہیجان نظر آئے گا۔ انسانی ماں کی جبلتیں اگر بگڑی ہوئی نہیں، اور اگر اس کی شہوانی زندگی تشفی بخش ہے تو وہ بھی اپنی اولاد کے تعلق سے اتنی ہی معصوم ہے جتنی کہ یہ بلی۔ پھر اگر خود اس کی حسیات صحیح ہیں تو بچوں کی حسیات بھی لازماً صحیح ہوں گی۔ اوڈیپس کمپلکس اگر پیدا ہوتا ہے تو ماں کی بے ضابطہ [illegible] سے۔ [illegible] اس بات کا تجربہ ہوتا ہے کہ ماں اپنے بچوں سے وہ تشفی حاصل کرنا چاہتی ہے جس کو وہ جوانوں کے ساتھ شہوانی تعلقات پیدا کر کے حاصل کر سکتی ہے۔

---

[1] [illegible] کی تنہا [illegible] کے ذریعے انسانوں کے پیدا کرنے کا [illegible] کہ [illegible] ہوں اور [illegible]

ماں باپ اور بچے کے درمیان جسمانی محبت اگر صحیح قسم کی ہے، تو یہ نہ صرف بے ضرر ہوتی ہے بلکہ بچے کی نشوونما کے لئے ضروری بھی ہے۔ کسی شخص کا اپنے بچے سے خاص طور پر محبت کرنا بچے کے لئے مفید ہوتا ہے اس سے بچہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا ہے اور اس طرح اس میں پُرخطر زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

جس بچے سے کوئی محبت کرنے والا نہیں ہوتا، وہ بزدل اور بالعموم دبلا پتلا ہوتا ہے۔ اس کو دنیا پر ایک طرح کا غصہ آتا ہے۔ اس طرح اس میں غیر معقول غضبناکیوں اور بغاوتوں کا میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بلا ضرورت چوری کرنا شروع کر دے یا اس میں سوتے ہوئے چلنے کی بیماری پیدا ہو جائے۔ واٹسن کا نظریۂ تعلیم تشکیل عادات پر مبنی ہے لیکن اس کے ذہن میں صرف عاداتِ فعل ہیں حالانکہ عاداتِ حسیات بھی اس سلسلے میں اتنی ہی اہم ہوا کرتی ہیں۔ یہ کہنا تو شاید ناانصافی ہوگی کہ اس نے عاداتِ حسیات کو کلیتہً نظر انداز کر دیا ہے۔ چنانچہ عاداتِ خوف کے متعلق اس نے بہت سی اچھی اچھی باتیں بیان کی ہیں۔ وہ اس سے بھی واقف ہے کہ روئیں دار ریچھ سے محبت کرنا بچوں کو کس طرح سکھایا جا سکتا ہے لیکن خبر نہیں کیوں اس نے انسانوں سے محبت کرنے کا ذکر نہیں کیا اس سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ انسانوں سے محبت کرنا اور ان کو دوست رکھنا سب سے زیادہ قیمتی عادتوں میں سے ہے۔ اور اگر ہر جسمانی ملامست کو مشتبہ نظروں سے دیکھا جائے تو پھر اس عادت کی تشکیل مشکل ہو جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس ماں نے اپنے بچوں کو سینے سے لگانا نہیں سیکھا تو بچوں کے ساتھ اس کی محبت رُک جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بھی اس سے محبت کرنا نہیں سیکھتے۔ جب یہ بچے دیکھتے ہیں کہ اوروں کا سلوک اپنے بچوں کے ساتھ زیادہ فطری ہے تو ان میں حسد پیدا ہوتا ہے۔ یہ حسد رفتہ رفتہ اتنا گہرا اور شدید ہو جا سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آخر کار وہ سوسائٹی کے دشمن بن جائیں۔ ان ہی تمام وجوہ سے میں والدینی محبت پر زمانہ حال کے نظریہ سازوں کے تمام حملوں کی مخالفت کرتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے کے متعلق ہمارا علم اس قدر ناکافی ہے کہ اس کو فہم عامہ سے چھین کر سائنس کے حوالے کرنا جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کتابوں کے مصنفوں کے لئے یہ صورتِ حال بہت مبارک ہے کہ جو شخص کوئی بات تفصیل اور زور کے ساتھ بیان کرتا ہے اس پر سب پڑھنے والے ایمان لے آتے ہیں لیکن ارتیابیت اور شک کا ایک درجہ اہل دنیا کے لئے بہت ضروری ہے کتابیں پڑھنا اور ان میں جو کچھ لکھا ہے اس پر یقین نہ کرنا تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہونا چاہئے۔ لیکن اکثر تعلیم و تربیت یافتہ افراد میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ نفسی تحلیل کا علم بڑا صحیح اور اہم ہے۔ لیکن اگر اس کی کتابوں کو آسمانی صحیفہ سمجھ لیا جائے تو اس کے عملی نتائج بہت بُرے ہوتے ہیں۔

میں اس عقیدے کو تسلیم نہیں کرتا کہ والدین لازماً اپنی اولاد کے لئے بُرے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرا خیال ہے کہ بچوں کا اپنے والدین کو بہت دیکھنا بھی آسان نہیں۔ بچے کو دوسرے بچوں کی صحبت کی ضرورت پڑتی ہے یہ صحبت عمر کے دو ابتدائی برسوں ہی میں ضروری نہیں ہوتی، بلکہ جوں جوں عمر ترقی کرتی جاتی ہے یہ ضرورت بھی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ بچوں کا بڑا حصہ [illegible] نہیں۔ اس کے علاوہ والدین کو اپنی ایک خاص زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اگر بچے ہر وقت ان کے ساتھ رہیں تو ان کو بچوں کی خاطر [illegible] کرنی پڑتی ہے۔ آج کل کے مختصر خاندانوں میں والدین کا بچوں کی طرف بہت زیادہ توجہ کرنا بہت مشکل ہے نہ بچوں کی طرف

بہت زیادہ توجہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت تعریف کے خواہش مند رہنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے متعلق والدین کی انتہا ان کو کم زور اور بزدل بنادیتی ہیں یا پھر بار بار کی مداخلت کی وجہ سے وہ زود رنج ہوجاتے ہیں۔

عقلمند والدین بننا یقیناً بہت مشکل ہے۔ والدین کی ناکامی کے پانچ وجوہ میری سمجھ میں آئے ہیں، اول بچے سے محبت کا نہ ہونا یہ وجہ بہت عام ہے، اور اس سے وہ تمام نقص پیدا ہوتے ہیں۔ جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، دوم، محبت جو بچے پر پوری طرح قبضہ جمالے یہ دراصل شہوانی عنصر کے داخل ہونے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی سے اوڈی پس ہولٹ پیدا ہوتا ہے اور وہ تمام بیماریاں رونما ہوتی ہیں جن پر نفسی تحلیل میں بحث ہوتی ہے۔ سوم ضرورت سے زیادہ تحریک بچوں کے رکھ رکھاؤ میں یہ نقص آج کل بہت کثیر الوقوع ہے یہ وجہ اس خواہش کا بھی نتیجہ ہو سکتی ہے کہ بچوں کو بہت زیادہ اور خصوصاً انفعالی قسم کی خوشیاں مثلاً سینما، تھیٹر وغیرہ دیکھنا حاصل ہوں۔ یہ اس طرح بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ ان کے لئے خودنمائی کے بہت زیادہ موقعے پیدا کئے جائیں اور اس طرح بھی کہ جوانوں کی صحبت میں اُن کو داخل کرلیا جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ بمشکل ہی اپنے آپ کو اس صحبت کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ چہارم بہت زیادہ روک تھام قدیم زمانے میں یہ بہت کثیر الوقوع تھی۔ لیکن آجکل اس کا دستور نہیں رہا لیکن اگر ماں یا باپ نازک مزاج ہو یا عصبا کمزور ہو یا اگر آداب محفل پر زور دیا جاتا ہو تو پھر یہ بھی بروئے عمل آجاتی ہے پنجم ماں اور باپ کی اَن بَن اس کا بچوں کے اعصاب پر بہت اثر پڑتا ہے۔ اگر ماں باپ بچوں کے سامنے اس اَن بَن کے اظہار کو روکنے پر قادر نہ ہوں تو مناسب یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے بچوں کو گھر میں نہ رکھا جائے۔ والدین کی ناکامی کے ان پانچ وجوہ پر ایک اور وجہ کا اضافہ ہونا چاہیے یعنی صلاحیتوں پر بے اعتمادی۔ اس کی تلافی بہت ضروری ہے۔ والدین کو چاہیئے کہ بچوں کو اُن کی صلاحیتوں پر اعتماد کرنا سکھائیں۔ اعتماد کے ساتھ صادر کی ہوئی غلط حرکت بے اعتمادی کی صادر کی ہوئی صحیح حرکت کے مقابلے میں اکثر اوقات بہتر ہوتی ہے۔

بچوں کے تعلق سے اگر تمہارا رویہ اور تمہارے جذبات صحیح قسم کے ہیں، تو تم ان کی نفسیاتی نگہداشت میں غلطی نہیں کر سکتے اور اس نگہداشت کے متعلق جو علم بھی تم حاصل کروگے، وہ ان کی بہتری کے لئے ہوگا بہ شرطے کہ وہ حقیقی معنوں میں علم ہو، شتاب کارانہ نظریہ بازی نہ ہو۔ لیکن اگر تمہارے جذبات صحیح قسم کے نہیں، تو تمہارا تمام علم بیکار ہے۔ اگر بدقسمتی سے تم اپنے بچے سے جسمانی اور جبلی طور پر محبت نہیں کر سکتے، تو تمہارے اور بچے، دونوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس بچے کو کسی اور کے حوالے کردو۔ لیکن بچوں کے ساتھ تمہاری محبت اگر والدینی ہے یعنی اگر تم ان سے صرف اس لئے محبت کرتے ہو کہ وہ تمہارے بچے ہیں، نہ اس بدلے کی خاطر جو وہ بڑے ہو کر تمہیں دیں گے، تو پھر تم کو اپنی محبت پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہیئے اور نہ تم کو نظریہ بازوں سے ڈرنا چاہیئے

(برٹرینڈرسل)

معتضد ولی الرحمٰن
حیدرآباد دکن

خود پرست لیڈر

غلط کہتا ہے گو وہ شخص جو تم سے یہ کہتا ہے
کہ بحرِ ہند کی امواج میں گوہر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے یعنی وطن کے نفس کے اندر
نظر میں خیرگی جس سے ہو وہ جوہر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے جس میں یہاں بانی کا سودا ہے
کسی کے دوش پر اس ملک میں وہ سر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے یعنی دیارِ ہند کے اندر
کسی میں جذبۂ تیمور و اسکندر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے ہندوستان والوں کے سینے میں
دلِ شبّیر و زورِ فاتحِ خیبر نہیں ملتا

مگر اس بات سے انکار کی جرأت نہیں ہوتی
کہ اس خطّے میں ڈھونڈے سے بھی کیریکٹر نہیں ملتا

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنے برِّ اعظم میں
جو اپنے کو بھلا سکتا ہے وہ لیڈر نہیں ملتا

اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر گوشے میں ہر گھر میں
خدا تو سیکڑوں ملتے ہیں پیغمبر نہیں ملتا

جوشؔ ملیح آبادی

غائبانہ

(ATTILA VON ORBOK کے ڈرامہ EIN DISKRETER JUNGE سے ماخوذ ہے)

افراد:—

نصیبن	معمر ملازمہ
بیگم سجانہ	سابق ایکٹرس
مرزا شفیق بیگ	انشورنس کمپنی میں ملازم
مقتدر مرزا	شفیق کا دوست اور پڑوسی!
زمانہ	دورِ حاضر

(مرزا شفیق بیگ کے مطالعہ کا کمرہ۔ دائیں اور بائیں جانب دروازے ہیں۔ بائیں جانب سونے کا کمرہ۔ کمرے کے وسط میں لکھنے کی میز۔ میز کی دائیں جانب ایک صوفا۔ اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی میز۔ لکھنے کی میز کے بائیں جانب ایک نیچا سا دو خانے والا ایک شیلف ہے، برابر میں گدے دار آرام کرسی اور ایک کرسی کے پیچھے اونچا لیمپ۔ لکھنے کی میز پر دائیں جانب ٹیبل لیمپ کے نیچے شفیق کی ایک چھوٹی سی تصویر رکھی ہے اور بائیں جانب شیلف سے تین پورٹ کے فریم میں بیگم سجانہ کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو سٹیج خالی ہوتا ہے۔ باہر دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ چند سیکنڈ میں بائیں جانب کے دروازے سے ملازمہ نصیبن داخل ہوتی ہے)

نصیبن — (دائیں طرف کے دروازے کی جانب جاتے ہوئے) میں عرض کیا ہے سا... مہمان کے آنے کا وقت ہو رہا ہے سیاہی چادر تیار کرنی ہے۔۔۔ خبر نہیں کون آگیا۔ اگر مہ جبین کا لڑکا ہوا تو آج ماں کی خیر نہیں ... کان کھینچ کر کہ... کا... یاد آجائے (ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کرتے ہوئے) شی!!! ٹھیر! (ادھر ادھر دیکھ کر لکھنے کی میز پر سے فٹ رول اٹھاتی ہے) آج تم تیری ہی ... رکھ دوں تو میرا نام بھی نصیبن نہیں (باہر چلی جاتی ہے — تھوڑی دیر میں بہت احترام سے موہش قدمی کرتی ہوئی داخل ہوتی ...

خود پرست لیڈر

غلط کہتا ہے گو وہ شخص جو تم سے یہ کہتا ہے
کہ بحرِ ہند کی امواج میں گوہر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے یعنی وطن کے نفس کے اندر
نظر میں خیرگی جس سے ہو وہ جوہر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے جسمیں جہاں بانی کا سودا ہے
کسی کے دوش پر اس ملک میں وہ سر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے یعنی دیارِ ہند کے اندر
کسی میں جذبۂ تیمور و اسکندر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے ہندوستاں والوں کے سینے میں
دلِ شبیر و زورِ فاتحِ خیبر نہیں ملتا

مگر اس بات سے انکار کی جرأت نہیں ہوتی
کہ اس خطے میں ڈھونڈے سے بھی کیریکٹر نہیں ملتا

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اتنے برّاعظم میں
جو اپنے کو بھلا سکتا ہے وہ لیڈر نہیں ملتا

اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر گوشے میں ہر گھر میں
خدا تو سیکڑوں ملتے ہیں پیغمبر نہیں ملتا

جوش ملیح آبادی

غائبانہ

(ATTILA VON ORBOK کے ڈرامہ EIN DISKRETER JUNGE سے ماخوذ ہے)

افراد:—

نصیبن	معمر ملازمہ
بیگم سجانہ	سابق ایکٹرس
مرزا شفیق بیگ	انشورنس کمپنی میں ملازم
نقشدمرزا	شفیق کا دوست اور پڑوسی!
زمانہ	دورِ حاضر

(مرزا شفیق بیگ کے مطالعہ کا کمرہ۔ دائیں اور بائیں جانب دروازے ہیں۔ بائیں جانب سونے کا کمرہ۔ کمرے کے وسط میں لکھنے کی میز۔ میز کی دائیں جانب ایک صوفا۔ اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی میز۔ لکھنے کی میز کے بائیں جانب ایک نیچا سا دو خانے والا بک شیلف ہے برابر میں گدے دار آرام کرسی اور ایک کرسی کے پیچھے اونچا لیمپ۔ لکھنے کی میز پر دائیں جانب ٹیبل لیمپ کے نیچے شفیق کی ایک چھوٹی سی تصویر رکھی ہے اور بائیں جانب دیوار سے تین پوسٹ کے فریم میں بیگم سجانہ کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے آہستہ خالی ہوتا ہے۔ باہر دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ چند سیکنڈ میں بائیں جانب کے دروازے سے ملازمہ نصیبن داخل ہوتی ہے)

نصیبن ۔ (دائیں طرف کے دروازے کی جانب جاتے ہوئے) ال میں دم آگیا ہے۔ ان حضرات کے آنے کا وقت ہو رہا ہے ابھی چائے بھی تیار کرنی ہے۔ . . . خبر نہیں کون آگیا۔ اگر پڑوسن کا لڑکا ہوا تو آج اس کی خیر نہیں ہے کان کھینچ کر کھینچ کا دودھ یاد آجائے (ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کرتے ہوئے) اشی !!! ٹھیر !! ادھر اُدھر دیکھ کر لکھنے کی میز پر سے فٹ رول اٹھاتی ہے) آج تجھ تیری ہی پیالی توڑ کر رکھ دوں تو میرا نام بھی نصیبن نہیں (باہر چلی جاتی ہے — تھوڑی دیر میں بہت احترام سے پیش قدمی کرتی ہوئی داخل ہوتی ہے [illegible]

حقوق، نشر و تمثیل سے قبل اجازت لینی ضروری ہے ۔ ن ۔ مش

کرکے پیچھے چھپائے ہوئے ہے اور نظر بچا کر لکھنے کی میز پر رکھ دیتی ہے ، آیئے آیئے !! تشریف لایئے (بیگم سجانہ داخل ہوتی ہیں بہت خوبصورت اور نہایت قیمتی ساڑھی باندھے ، چہرے پر غصہ جھلک رہا ہے) مجھے آداب طریقے بھلا کہاں آتے ہیں ۔ اگر مجھ سے کوئی بدتمیزی ہو تو معاف کر دیجئے گا . . . . . میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں ؟"

بیگم سجانہ ۔ ہوں ! تو یہاں رہتے ہیں مرزا شفیق بیگ — جو انشورنس کمپنی میں ملازم ہیں ؟

نصیبن ۔ جی ہاں یہ ہی اُن کا غریب خانہ ہے اور میں اُن کی ملازمہ ہوں — مغلانی بھی کیونکہ گھر داری میں ہی کرتی ہوں ۔

بیگم سجانہ ۔ کیا تمہیں کچھ علم ہے کہ شفیق بیگ کسی اخبار وغیرہ کے مضمون نگار بھی ہیں ؟

نصیبن ۔ مجھے تو پتہ نہیں ۔ لیکن اگر مضمون وضمون لکھتے بھی تو کوئی بڑی بات تو ہے نہیں ۔ جسے لکھنا پڑھنا آتا ہو اُس کے لئے کیا مشکل ۔ خط نہ لکھا مضمون لکھ دیا ۔ اور ہاں ان کے پاس ایک رسالہ بھی تو آتا ہے ۔ اس میں تصویریں بھی ہوتی ہیں ۔ ایسی پیاری پیاری شکل کی عورتیں . . . . . .

بیگم سجانہ ۔ وہ واپس گھر کس وقت آتے ہیں ؟

نصیبن ۔ کبھی برسوں کی برسات میں دیر ہو جائے تو ہو جائے ورنہ ٹھیک پانچ بجے گھر پہنچ جاتے ہیں ۔ دم بھر پہلے نہ دم بھر بعد ۔ ان کے آنے کا وقت تو ہو چلا ہے ۔ آتے ہی ہوں گے (بیگم سجانہ کو کھڑا دیکھ کر) آپ تشریف رکھئے نا (آگے بڑھ کر پلو سے صوفے کو جھاڑتی ہے)

بیگم سجانہ ۔ (بیٹھ جاتی ہے) اچھا یہ تو بتاؤ مرزا شفیق کی شادی ہو گئی ہے یا نہیں ؟

نصیبن ۔ نہیں سچ ۔ آپ کے سر کی قسم ۔ [illegible] نہیں ہوئی کنوارے ہی ہیں ابھی تو —

بیگم سجانہ ۔ آخر تم مجھے اس طرح غور سے کیوں دیکھ رہی ہو ؟

نصیبن ۔ نہیں بیگم کچھ نہیں ۔

بیگم سجانہ ۔ بیگم ۔ تم بیگم کسے کہہ رہی ہو ؟

نصیبن ۔ واہ آپ نے خوب کہا ۔ اچھا تو کیا آپ بیگم سجانہ نہیں ہیں ؟

بیگم سجانہ ۔ بیگم سجانہ ۔ بیگم سے اب بیگم سجانہ ہو گئی ہیں ۔ خوب !

نصیبن ۔ آپ کچھ ہی کہا کریں لیکن میں تو آپ کو خوب پہچانتی ہوں ۔

بیگم سجانہ ۔ ہوں ۔ سمجھی ۔ تم نے مجھے فلم میں دیکھا ہوگا

نصیبن ۔ جی ہاں بیگم ! . . . . . بڑھاپا آ گیا ہے ۔ تھک جاتی ہوں کام کرتے کرتے . . . . . آپ کے پیروں میں بیٹھ جاؤں بیگم (بیٹھ جاتی ہے پیروں کو دباتے ہوئے) خدا آپ کو بڑی عمر دے ۔ بہاریں دکھائے ۔ مرادیں پوری کرے ۔

بیگم سجانہ ۔ لیکن میں نے تو شادی کے بعد سے کوئی فلم نہیں بنایا . . . . . اور شادی کو اب تین سال ہونے آئے

نصیبن ۔ تین سال اگر ہونے آئے تو کیا ہوا ۔ میں آپ کو بھول کوئی تھوڑی ہی سکتی ہوں اور آپ جیسی شہرت کسی ایکٹریس کو بھلا کہاں نصیب ہو سکتی ہے ۔ جیسا آپ کا نام چمکا کسی اور کا نہیں چمک سکتا ۔ بچے بچے کی زبان پر آپ کا ہی نام تھا . . . . . کہا کرتے ہیں نا . . . . . کہا طوطی بول گیا . . . . . [illegible]

آپ ہی کا نام ہر وقت ... میں بھی آپ ہی کے فلم دیکھا کرتی تھی۔

بیگم سجانہ۔ اچھا؟

نصیبن۔ ہاں بیگم! ..... میرے بھائی کی بیوی ..
..... یعنی میری بھاوج کی نند ...... لاحول ولا قوۃ ....
نند تو میں خود ہوئی ..... بیگم غلطی ہو گئی ...... میری
بھاوج کی بہن کی نند .... کے بھائی کی چچازاد بہن
جس منڈوے میں آپ کے فلم آیا کرتے تھے۔

بیگم سجانہ۔ یہ منڈوا کیا بلا ہے؟

نصیبن۔ اجی تماشا گھر کو ہم ان پڑھ لوگ منڈوا کہا کرتے
ہیں ...... ہاں تو اس منڈوے میں نوکر تھی ....
وہ ہوتا ہے نا عورتوں کا ڈبہ .... اس کے دروازے پر
کھڑی رہتی تھی ...... اس چچازاد بہن کی سہیلی میرے
پاس اکثر کاڑھنا سیکھنے آتی تھی۔ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ فلم دکھانے
لے جاتی۔ پیسے ویسے تو لگتے ہی نہ تھے اور فلم میں بڑا مزہ آتا
تھا بس یہ سمجھئے۔ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی رنگ چوکھا آئے۔

بیگم سجانہ۔ کیوں کیا ٹکٹ نہیں لینا پڑتا تھا؟

نصیبن۔ ٹکٹ وکٹ تو میں جانتی نہیں اور نا ہی کبھی
لیا بس وہ ویسے ہی بٹھا دیتی تھی۔

بیگم سجانہ۔ اچھا! اور تم تین سال کے عرصے میں مجھے
بھولیں نہیں۔

نصیبن۔ بھلا آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں ... میری
یادداشت بہت خراب ہے لیکن پھر بھی آپ کا ایکٹنگ مجھے
اب بھی یاد ہے ...... اور روز میاں شفیق جو آپ کا نام
جپتے ہیں۔

بیگم سجانہ۔ میرا نام میاں شفیق جپتے رہتے ہیں۔ لیکن کیوں
اچھا ممکن ہے کہیں ملاقات ہوئی ہو۔

نصیبن۔ (ہنس کر) آپ تو چہل کرتی ہیں بھلا کیوں نہ ملاقات
ہوئی ہوا اور پھر ابھی آپ ہی جو پوچھ رہی تھیں ...... ان
کی شادی کی بابت! میں نے دھوپ میں بال کوئی تھوڑی سفید
کئے ہیں۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ نے مجھے نادان سمجھا ہے
ننھی سی بچی جو کچھ بات سمجھتی ہی نہیں۔

بیگم سجانہ۔ تم سمجھیں کیا؟ میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں

نصیبن۔ لیکن میں تو سب سمجھتی ہوں کہ میاں شفیق کیوں
دن رات آپ کا نام جپا کرتے ہیں اور آپ کیوں اُن کی شادی
کی بابت پوچھ رہی تھیں۔

بیگم سجانہ آپ ہی آپ نہ جانے کیا سمجھ لیا تم نے آخر
یہ ہے کیا معما؟

نصیبن۔ (مسکرا کر) بیگم بُرا نہ مانئے گا۔ چور چوری سے
جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ خدا نہ کرے کہ میں آپ کو چور
کہوں لیکن یہ کہ آپ نے ایکٹنگ کرنا چھوڑا نہیں۔ ایکٹنگ
کرے تو ایسا تو کرے کہ بھلے آدمی کو دھوکے میں ڈال دے۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ تو شفیق میاں کو جانتیں ہی نہیں۔

بیگم سجانہ۔ (حیرت میں) کیا بکواس ہے! میں
انہیں نہیں جانتی۔ یہ بھی یاد نہیں کہ انہیں کبھی دیکھا بھی ہے
بہت ممکن ہے کہ کبھی نظر بھی نہ پڑی ہو۔ اور پھر مجھے تیرے سامنے
ایکٹنگ کرنے کی کیا غرض پڑی ہے؟

نصیبن۔ بیگم غرض ورض تو میں جانتی نہیں۔ میں تو
یہ جانتی ہوں کہ یہ کوئی شرمانے کی بات تو ہے نہیں۔ ایسا ہو

ہی جاتا ہے۔

بیگم سجانہ۔ بس۔ کچھ تیز بھی ہے۔ خبر نہیں کیا کہے جا رہی ہے گستاخ کہیں کی۔ آخر تو نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے۔ تو اور تیرے میاں دونوں ایک سے معلوم ہوتے ہیں کہ زبان کو لگام ہی نہیں۔

نصیبن۔ (ہاتھ جوڑ کر) غلطی ہوگئی بیگم۔ معاف کر دیجئے۔ اگر آپ ناراض ہوگئیں تو میں رہونگی کہاں ؟

بیگم سجانہ۔ تیرے سامنے ہی تو میں ایکٹنگ بھی کرتی ..... ڈرتی ہوں نا تجھ سے۔

نصیبن۔ بس بیگم اب معاف کر دیجئے۔ اب میں سمجھ گئی کہ آپ ظاہر کرنا نہیں چاہتیں۔ اچھا نہ بتائیے آپ کی مرضی لیکن مجھے سب پتہ ہے۔ میں ہر وقت یہیں رہتی ہوں۔ مجھ سے بھلا کیا بات چھپی رہ سکتی ہے ؟ شفیق میاں کو تو بڑا فخر ہے آپ کی ایسی ایسی تعریفیں کرتے ہیں ایسے خوش ہوتے ہیں کہ پھولے نہیں سماتے۔

بیگم سجانہ۔ لیکن کس بات کا! پھولے نہ سمانے کی وجہ ؟

نصیبن۔ لیکن فخر نہ کیوں ہو اور پھولے نہ سمائیں تو کیا کریں (اٹھ کر لکھنے کی میز کے پاس جاتی ہے) اچھا یہ دیکھئے یہ ہیں آپ کی تصویریں۔ شفیق میاں ٹکٹکی باندھے میٹھی میٹھی نظروں سے انہیں دیکھا کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بیگم آپ کی صورت ہی ایسی پیاری ہے کہ آنکھیں سیر نہیں ہوتیں ..... ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ سونے کے کمرے میں کس کا کھڑے پاجامے والا جوڑا رکھا ہے۔

بیگم سجانہ۔ (اٹھ کر لکھنے کی میز کے پاس آتی ہے۔ [illegible]) تصویروں کو دیکھتی ہے) کھڑے پاجامے کا جوڑا [illegible] یہ تصویریں ..... یہ تو میری تصویریں نہیں۔

نصیبن۔ جی ہاں (ہنستی ہے) جی [illegible] آپ کی تصویریں ہیں۔

بیگم سجانہ۔ اور یہ جو لیمپ کے نیچے تصویر رکھی ہے ..... کیا یہ مرزا شفیق بیگ کی ہے ؟

نصیبن۔ جی ہاں بیگم ایسی تو بری کھنچی ہوئی بھی نہیں کہ آپ پہچان بھی نہ سکیں۔ لیکن ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ان کی شکل اس تصویر سے زیادہ خوبصورت ہے۔ کیوں ہے نا ؟ بتائیے! اب شرم آ رہی ہے!

بیگم سجانہ۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے نہیں دیکھا (بگڑ کر) میری بلا جانے۔ اچھی شکل ہے یا بری۔ مجھے اس سے کیا واسطہ۔

نصیبن۔ آپ تو خفا ہوگئیں۔

بیگم سجانہ۔ لیکن یہ کیا ؟ میری تصویروں پر یہ لکھا ہوا کیا ہے ؟

نصیبن۔ مجھے تو معلوم نہیں۔ میں [illegible]

بیگم سجانہ۔ (آواز سے پڑھتی ہے) میر[illegible] شفیق۔ اختری (چہرہ پر غصہ نمودار ہوتا ہے۔ دوسری تصویر کی عبارت پڑھتی ہے) عمر بھر تمہارا ہم [illegible] والی [illegible] اختری (چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ تیسری تصویر [illegible] کی مشتاق تمہاری ادنےٰ کنیز ..... ادنےٰ کنیز (غصہ سے کانپتی ہے) مجھے ادنےٰ کنیز تک لکھ دیا۔ اتنی جرأت [illegible]

[illegible] پھرتا ہے کہ وہ رُک جاتی ہے۔ نصیبن سے)
[illegible] سے زیادہ ذلیل آدمی اور کون ہو سکتا ہے۔ بیہودہ
بے غیرت۔

نصیبن (سہمی ہوئی) لیکن بیگم۔ . . . . ہُوا کیا؟ آپ
اس قدر ناراض کیوں ہیں؟

بیگم سجانہ۔ ہُوا کیا؟ تجھے نہیں معلوم میں کیوں
خفا ہو رہی ہوں؟

نصیبن۔ آپ کے سر کی قسم بیگم۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں

بیگم سجانہ۔ تو اُس نے تجھ سے بھی جھوٹ بولا۔ ٹھہر
جاؤ انہیں اس کی پوری پوری سزا ملے گی۔

نصیبن۔ لیکن بیگم ہُوا کیا قصور؟

بیگم سجانہ۔ سب پتہ چل جائیگا۔ آخر انہوں نے سمجھا
کیا تھا؟ کسی پر عیب لگانا آسان تو نہیں۔

نصیبن۔ یہ آپ کیا کہتی ہیں۔ وہ تو نہایت شریف آدمی ہیں
انہوں نے کسی پر عیب نہیں لگایا۔

بیگم سجانہ۔ جی ہاں۔ اگر وہ شریف آدمی ہوتے تو مجھے یہاں
آنا ہی کیوں پڑتا۔ شریف ہی تو ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔

نصیبن۔ کیسی حرکتیں؟

بیگم سجانہ۔ سُن کان کھول کر۔ کبھی بھولے سے بھی
میری اُن کی ملاقات نہیں ہوئی۔

نصیبن۔ کیا سچ آپ ان کو نہیں جانتیں؟

بیگم سجانہ۔ کہہ تو رہی ہوں میں نے انہیں نہیں
دیکھا —— ابھی تھوڑے دنوں سے میرے جاننے والوں میں
[illegible] ہو رہی تھیں۔ ان کا نام لے لے کر مجھے طعنے دیئے
جاتے تھے۔ میری سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا کہ اس نام میں آخر بھید کیا ہے
میں نے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہُوا کہ انشورنس کمپنی میں ملازم ہیں اور
یہاں رہتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ممکن ہے کسی اخبار کے نامہ نگار
ہوں۔ فلم کے زمانے کی جان پہچان ہوگی۔ جب کوئی ایکٹرس
کسی متمول اور معزز خاندان میں شادی کر لیتی ہے تو اس کے
چال چلن کے متعلق افواہیں اڑا ہی کرتی ہیں۔

نصیبن۔ ہاں بیگم۔ بُرا زمانہ آگیا ہے۔ عیب چھپانے کی
بجائے اُلٹا انہیں مشہور کرتے پھرتے ہیں۔

بیگم سجانہ۔ میں چاہتی تھی کہ نواشفیق بیگ سے زبانی
گفتگو کر کے سمجھا دوں کہ نواب صاحب کو نام و ناموس کس
قدر عزیز ہے۔ اور اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ انشورنس کمپنی کا ملازم
مجھے بدنام کرتا پھرتا ہے . . . . .

نصیبن۔ وہ تو آپ کی پرستش کرتے ہیں بیگم سجانہ۔

بیگم سجانہ۔ اچھی پرستش ہوئی۔ کیا خوب! ——
اب میں سمجھی کیا مُعمّا ہے۔ میں انہیں جانتی بھی نہیں اور وہ
ہیں کہ گلی گلی کوچہ کوچہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے
پر فدا ہیں۔ جان دیتے ہیں۔ ایک جان دو قالب ہیں۔

نصیبن۔ گلی گلی کوئی تھوڑی کہتے پھرتے ہیں۔ یہی اپنے
یار دوستوں میں ذکر آجاتا ہے۔

بیگم سجانہ۔ جی ہاں اگر گلی گلی نہ کہتے پھرتے تو مجھے کیسے
پتہ چلتا۔ آج کسے نہیں معلوم ان کی من گھڑت داستان

نصیبن۔ اچھا بیگم۔ . یہ تو برا ہوا

بیگم سجانہ۔ اور خبر نہیں کہاں سے میری تصویریں مل
گئی ہیں۔ ان پر میرے نام سے خبر نہیں کیا کیا لکھا

[illegible] سب ایک ایک کو دکھاتے پھرتے ہیں۔
نصیبن۔ تو کیا آپ نے انہیں تصویریں نہیں دیں؟
بیگم سجانہ۔ میں کیوں دیتی؟ میں نے تصویریں نہیں دیں
نصیبن۔ پھر یہ لکھا ہوا کس کا ہے؟
بیگم سجانہ۔ یہ مرزا شفیق سے پوچھنا۔ میں نے نہیں
[illegible]ا . . . . ادنےٰ کنیز . . . . . . میں یہ ذلت برداشت
[illegible]ں کر سکتی۔ ٹھیر جاؤ اب نواب صاحب ہی اس کا فیصلہ
[illegible]ں گے۔ بھنگاسی جان، چند بدمعاشوں کو اشارہ کرنے کی
[illegible] ہے۔ پتہ بھی نہیں لگے گا کہ میاں کی بوٹیاں گئیں تو کہاں
[illegible]ں۔
نصیبن۔ کیا آپ سچ مچ شفیق میاں کی بوٹیاں کروانا چاہتی
[illegible]؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ شفیق میاں تو آپ کے پیچھے دیوانہ
[illegible] رہے ہیں اور آپ اُن کی جان کے درپے ہیں۔
[illegible]گم سجانہ۔ دیوانہ ہو رہے ہیں؟
[illegible]صیبن۔ ہاں بیگم۔ کبھی تو ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ خوشی
[illegible]کر ناچنے لگتے ہیں۔ کبھی سر پکڑ کر ایسے بیٹھ جاتے ہیں کہ
[illegible]جھے کہ ملک الموت روح قبض کرنے کے لئے ان کی گردن
[illegible] ہے۔ اور یہی نہیں کبھی کبھی تو بالکل مجنوں کی سی باتیں
[illegible]ہیں۔ سُنا ہے نا آپ نے مجنوں لیلےٰ کے کتے کو گلے
[illegible]ر کرتا تھا۔ اس سے باتیں کرتا تھا۔
بیگم سجانہ۔ ہاں ہاں۔
نصیبن۔ شفیق میاں کا بھی یہی حال ہے۔ کچھ دن بھی
[illegible]ہوئے۔ کل ہی تو وہی کھڑے پاجامہ والا جوڑا نکالا،
[illegible] پھر آنکھوں سے لگایا۔ اور پھر اس سے ایسی

میٹھی میٹھی باتیں کیں۔۔۔ مجھے تو [illegible]
بھی آئی کیسے۔ وہ تو ہر وقت ہی مجنوں اور فرہاد کا پاٹ کرتے
ہیں۔
بیگم سجانہ۔ کھڑے پاجامے کے جوڑے سے باتیں
کیں؟ . . . . .
نصیبن۔ جی ہاں بیگم! وہ کہتے تھے کہ جب یہ جوڑا آپ
پہنے ہوئے تھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کا ستارہ زمین
پر اُتر آیا ہے . . . . . وہ آپ کا نام تھوڑی ہی لیتے ہیں
ہمیشہ آپ کو رقاصۂ فلک کہتے ہیں۔ رقاصۂ فلک۔
بیگم سجانہ۔ میں یہ جوڑا پہنے ہوئے تھی؟ . . .
لیکن کب! کیسا جوڑا؟
نصیبن۔ آپ بہتر جان سکتی ہیں۔ مجھے کیا معلوم!
آپ نے ہی تو دیا ہے۔
بیگم سجانہ۔ اچھا تو گویا میں نے اتار کر ان کی نذر
کر دیا . . . . خوب! اب پتہ چل جائے گا کہ کس طرح ستارہ
زمین پر اُترتا ہے۔ ذرا دیکھنا اب۔ اگر دن میں تارے نظر
نہ آجائیں تو میرا نام بھی اختری نہیں۔ نواب صاحب کو نجوم
میں بڑی مہارت ہے۔
نصیبن۔ للہ بیگم نواب صاحب کو خبر نہ کیجئے گا میں
آپ کے پیروں پڑتی ہوں . . . . اگر نواب صاحب کو پتہ چل
گیا تو معلوم نہیں وہ زندہ بھی چھوڑیں یا نہیں۔
بیگم سجانہ۔ زندہ؟ . . . . . نواب صاحب کا غصہ
تم نے دیکھا نہیں ہے۔
نصیبن۔ غضب ہو جائے گا بیگم [illegible]

[illegible] ہاں کا ایک ہی تو بیدہ ہے رحم کیجئے بیگم!

بیگم سجانہ۔ جو شریف بہو بیٹیوں کو بدنام کرتا پھرے اُس کے لئے رحم؟

نصیبن۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر انہیں ہُوا کیا تھا۔ لیکن ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ان کی اس میں کوئی بُری نیت نہیں تھی۔

بیگم سجانہ۔ کیا مطلب؟

نصیبن۔ وہ آپ کو بدنام کرنے کی غرض سے یہ سب کچھ نہیں کہتے پھرتے تھے۔

بیگم سجانہ۔ جی ہاں۔۔۔

نصیبن۔ کسی پر عیب لگانا تو بہت بڑی بات ہے اُن سے تو کسی کو گالی بھی نہیں دی جاتی۔ اگر کوئی فقیر آکر ان کے سر پر بھی سوار ہو جائے تو ان سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے جھڑک دیں اب یہی دیکھئے۔ مجھے ان کے ہاں کام کرتے ہوئے مدتیں گزر گئیں۔ اتنی مدت میں ایک دفعہ بھی فضیحتا کرنا تو کہاں، تو تکار سے بھی بات نہیں کی۔ آدمی ہی ہوں بیگم۔ بہتیری احتیاط کرتی ہوں پھر بھی کوئی نہ کوئی کام بگڑ ہی جاتا ہے۔ خدا انہیں عمر دے۔ کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ نصیبن۔ تیرے منہ میں کے دانت؟

بیگم سجانہ۔ تو کیا میں نوکرانی اور فقیر سے بھی بدتر ہوں کہ ان کا تو لحاظ کریں اور میرا اتنا بھی خیال نہیں۔

نصیبن۔ کیا مطلب؟

بیگم سجانہ۔ انہیں مجھے بدنام کرتے ہوئے خیال نہیں ہُوا کہ میں ناحق کیوں اسے بدنام کر رہا ہوں۔ مجھے ایسی سے کیا غرض کہ وہ زمانے کے ساتھ کیسے ہیں۔ انہیں اس کی سزا ملنی چاہیئے۔

نصیبن۔ میری اچھی بیگم ان سے بدلہ نہ لیجئے۔

بیگم سجانہ۔ نہیں تو ایسی سزا ملنی چاہیئے کہ دوسروں کو بھی نصیحت ہو۔

نصیبن۔ آپ میرا یقین تو کیجئے۔ وہ تو بہت ہی شریف آدمی ہیں۔ خبر نہیں ان کی سمجھ پر کیا پتھر پڑے تھے کہ یہ نہ سوچا کہ میں جو کسی پر عیب لگاؤں گا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور وہ بھی آپ جیسی شریف اور بھولی بھالی عورت پر۔ آپ جیسے نرم دل کی عورت ڈھونڈے سے بھی تو نہیں ملے گی۔

بیگم سجانہ۔ میں یہ وہ کچھ سننا نہیں چاہتی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ آئندہ میرے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا جائے۔

نصیبن۔ جی ہاں۔ آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ واقعی انہوں نے بڑی غلطی کی۔ انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔۔۔ اپنا ہی گھٹنا کھولو۔ اور آپ ہی لاجوں مرو۔

بیگم سجانہ۔ کیوں کیا ابھی کچھ باقی ہے۔

نصیبن۔ آج صبح ہی تو مجھ سے کہا کہ کل رات میں بیگم سجانہ کے ساتھ موٹر میں سیر کرنے گیا تھا۔ پرسوں جوہی کی دو بالیاں رومال میں باندھ کر لے گئے تھے۔

بیگم سجانہ۔ پرسوں لے گئے تھے؟

نصیبن۔ جی ہاں۔ کہتے تھے کہ آپ کو جوہی بہت پسند ہے۔ جب میں جوہی کی بالیاں خرید کر لائی تو میرے چاروں طرف وہ ناچے کہ کیا بتاؤں۔۔۔ پھول کو مات کر رکھا ہے۔

بیگم سجانہ۔ عجیب خبطی ہی ہیں دیوانے کہیں کے۔

نصیبن۔ جی ہاں بیگم۔ بھلا سمجھدار آدمی ایسی باتیں تھوڑی کرتے ہیں۔ لیکن سچ بیگم یہ سب انہوں نے کسی بُری نیت سے نہیں کیا۔ دیکھئے اگر آپ نے نواب صاحب سے کہہ دیا تو کیا ظلم ہوگا؟ دیوانے کی باتوں کو تو درگذر کر دیتے ہیں۔

بیگم سجانہ۔ انہیں روکا نہ جائے تاکہ وہ جو چاہیں کہتے پھریں۔

نصیبن۔ اگر آپ انہیں ایک دفعہ بھی منع کر دیں تو میرا ذمہ، پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کرنے کے۔ جب میں ان کی کسی بات پر خفا ہوتی ہوں تو سچ مچ رو دیتے ہیں۔ جس بات کو ایک مرتبہ منع کر دو پھر کیا مجال کہ دوبارہ کریں۔ جس بات کو کہو فوراً مان لیتے ہیں۔ اللہ میاں نے انہیں ایسی نرم مٹی سے بنایا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بیگم سجانہ۔ اچھا میں ان سے کہہ کر دیکھتی ہوں۔ اگر یونہی مان جائیں تو اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے۔

نصیبن۔ آپ کے کہنے کی دیر ہے۔ وہ ضرور مان جائیں گے۔

بیگم سجانہ۔ لکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میں کل انہیں تنبیہ کا خط لکھوں گی۔ دیکھتی ہوں کیا اثر ہوتا ہے۔ اچھا اب میں جاتی ہوں (کھڑی ہو جاتی ہے) ان کی قسمت ہی اچھی تھی جو تم یہاں مل گئیں۔

نصیبن (پلو چوم کر) میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ خدا آپ کو ہر طرح کا چین دے۔

بیگم سجانہ۔ مرزا شفیق بیگ [illegible] آئی تھی۔ وعدہ کرو۔

نصیبن۔ آپ کے سر کی قسم! بیگم مجال ہے جو ایک لفظ بھی زبان سے نکل جائے۔

بیگم سجانہ۔ ہاں دیکھو انہیں معلوم نہ ہونے پائے۔

(پیروں کی آہٹ)

نصیبن۔ یا اللہ یہ کیا ہوا۔ وہ تو آ گئے ان کے قدموں کی آواز۔

بیگم سجانہ۔ مرزا شفیق گئے؟

نصیبن۔ جی ہاں۔ وہ آ گئے۔

بیگم سجانہ۔ اب میں کیسے جاؤں۔ کوئی دوسرا دروازہ ہے نکلنے کا؟

نصیبن۔ دوسرا دروازہ تو ہے نہیں! اب بیگم کیا ہو؟

بیگم سجانہ۔ (دفعۃً) وہ سونے کا کمرہ کدھر ہے؟

نصیبن۔ (دروازے کی طرف اشارہ کر کے) یہ [illegible] بیگم

بیگم سجانہ۔ خبردار! انہیں پتہ نہ چلے کہ میں یہاں ہوں۔ سمجھیں

نصیبن۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ لیکن بیگم [illegible] تو آپ سونے کے کمرے میں کریں گی کیا؟

بیگم سجانہ۔ دیکھتی جاؤ پتا کیا ہے۔

(بیگم سجانہ سونے کے کمرے میں چلی جاتی ہے)

نصیبن۔ ہوتا کیا ہے! کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔ [illegible] کرے۔

(نصیبن دم لیتی ہے۔ چند لمحوں میں شفیق داخل ہوتا ہے۔ بہت خوش ہے۔)

شفیق۔ کہو۔ بوا نصیبن! کیا حال ہے۔ چہرہ اترا کیوں رہا ہے۔

نصیبن۔ نہیں تو میاں۔

شفیق۔ اوہو سمجھ گیا۔ آج پان کھانے کو نہیں ملا۔

نصیبن۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔ تمہارے دم سے بہتیرے پان۔

شفیق۔ (سونگھتے ہوئے) بہت خوشبو آ رہی ہے! کہو بوا نصیبن۔ خیریت تو ہے۔ یہ تم نے عطر لگانا کب سے شروع کیا؟

نصیبن۔ نہیں میاں۔ بھلا مجھے عطر لگانے کی کیا ضرورت

شفیق۔ مجھے کیا معلوم ضرورت ہے یا نہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ خوشبو آ رہی ہے۔ دیکھنا سنبھل کر رہنا۔ کہیں کوئی بھوت پریت سر پر نہ آ جائے۔

نصیبن۔ آپ تو مذاق کرتے ہیں۔

شفیق۔ مذاق نہیں۔ اچھا ذرا آج رات کو سفید چادر اوڑھ کر چھت پر سو کر تو دیکھو کیا ہوتا ہے۔

نصیبن۔ کیا ہوگا؟

شفیق۔ پلنگ سمیت اڑا کر لے جائیں گے۔ سچ

نصیبن۔ توبہ۔ آپ تو ناک میں دم کر دیتے ہیں۔

شفیق۔ بتاؤ تو ...... آخر تمہیں یہ آج سوجھا کیا۔ عطر بھی لگایا تو اس قدر کہ سارا کمرہ مہک رہا ہے۔

نصیبن۔ آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔ میں نے عطر نہیں لگایا۔ اور میرے پاس عطر آتا کہاں سے۔

شفیق۔ پھر یہ خوشبو آ کہاں سے رہی ہے! (سونگھتے ہوئے) خوشبو تو بہت نفیس ہے۔

نصیبن۔ ماشاء اللہ۔ شگون تو اچھا ہے۔ خدا وہ دن بھی لائے کہ دن رات گھر مہکا کرے۔ گھر میں آبادی اور رونق رہا کرے۔

شفیق۔ کیا مطلب۔

نصیبن۔ مطلب یہ کہ دلہن آئے عطر سے مہکتی ہوئی پھولوں سے لدی ہوئی تاکہ خوشبو سے گھر مہک جائے۔

شفیق۔ لیکن یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟

نصیبن۔ مجھے تو نہیں آ رہی۔

شفیق۔ تمہیں نہیں آ رہی؟ واہ خوشبو ضرور ہے۔

نصیبن۔ آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔

شفیق۔ نہیں نصیبن۔ یوں بات نہیں بنے گی عطر تو تم نے ہی لگایا ہے۔

نصیبن۔ میاں آپ کے سر کی قسم۔ میں نے عطر لگایا ہو تو مجھ پہ خدا کی مار ہی پڑے۔

شفیق۔ تو پھر شاید میری ناک خراب ہو گئی ہے..... اچھا۔ اب تم جلدی جاؤ اور چائے لاؤ۔

(نصیبن جانے لگتی ہے)

شفیق۔ ہاں سننا!

نصیبن۔ کیا میاں۔

شفیق۔ میں آج یہاں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مجھے سات بجے اپنی زفامہ فلک سے ملنے جانا ہے۔ یہ دیکھو ان کا پرچہ آیا ہے۔

(خط جیب سے نکال کر دکھاتا ہے۔ اور میز پر ڈال دیتا ہے۔ اور ٹہل ٹہل کر مزے سے گنگناتا ہے)

نصیبن۔ (خط دیکھتے ہوئے) یہ پرچہ آپ کی رفاصہ فلک کے پاس سے آیا ہے۔ (نام زبان سے ٹھیک نہیں نکلتا۔)

شفیق۔ نصیبن بوا۔ تمہاری زبان پر آخر کب یہ لفظ چڑھے گا جب کہتی ہو غلط کہتی ہو۔

نصیبن۔ میاں بڑا ثقیل لفظ ہے۔۔۔۔ اور پھر میں زبان پر چڑھا کر کیا اوں گی ۔۔۔۔ ہاں میاں میں یہ کہہ رہی تھی۔ کہ آپ تو روز ان کے ساتھ کھانا کھا آتے ہیں، کبھی ان کو بھی تو یہاں لا کر کھانا کھلائیے۔ آخر ایسی بھی کیا بے غیرتی۔

شفیق۔ محبت میں تکلّف نہیں ہوا کرتا۔ اور اگر دیکھا جائے تو محبت ہی بے غیرتی ہے۔ لیکن اس میں بے غیرتی کی کیا بات ہے۔

نصیبن۔ جی ہاں! آپ کے کہنے سے۔

شفیق۔ وہ بھی اپنا پیسہ خرچ نہیں کرتیں۔ اور نواب صاحب کے پاس مُفت کا آتا ہی ہے سب باپ دادا چھوڑ مرے۔ اب بیٹھے توند پھلاتے ہیں۔

نصیبن۔ اس سے کیا غرض پیسہ آتا کہاں سے ہے میں تو یہ جانتی ہوں کہ اگر ایک دفعہ کسی کے ہاں کھائے۔ تو ایک دفعہ اپنے ہاں کی دعوت کرے۔

شفیق۔ میں اگر انہیں بلاؤں بھی تو کھلاؤں کیا؟ وہ پُرتکلّف کھانے آئیں کہاں سے؟ اور پھر ایک دفعہ تو بات بن بھی سکتی ہے۔ روز روز تو نہیں۔

نصیبن۔ ہم تو اپنی حیثیت کے مطابق جو کچھ ہوگا سامنے رکھ دینگے۔

شفیق۔ آخر سامنے رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

نصیبن۔ در اصل میاں میرا ان کے دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔ فلم میں تو ان کو بہت دیکھا ہے۔ مگر ویسے کبھی نہیں دیکھا۔ تصویروں کی طرف خاک تکتے رہو کیسی پیاری شکل ہے۔

شفیق۔ اری تیری ہی نہیں جو ایک بار دیکھ لیتا ہے۔ اس کی طبیعت ڈانواں ڈول ہو جاتی ہے۔

نصیبن۔ تم نے جو ان کی تصویریں یہاں لگا رکھی ہیں ذرا نامناسب سی معلوم ہوتی ہیں۔

شفیق۔ کیوں؟

نصیبن۔ تمہارے ہر دوست کی آتے جاتے نظر پڑتی ہے۔ کیا پتہ کس دن کیا فتنہ اٹھ کھڑا ہو۔

شفیق۔ فتنہ؟ ۔۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا ہوتا بہت تو یہی ہوگا۔ کہ میرے دوست جل مریں گے۔

نصیبن۔ یہی نہیں ممکن ہے کہ جلن میں کچھ کر بیٹھیں۔

شفیق۔ تم کیا جانتی ہو یہ نصیبن جی [illegible]

میرے دوستوں کو معلوم ہے کہ میری بیگم سجانہ سے ملاقات ہی
بس ابھی دن سے میری اتنی عزت کرتے ہیں۔ کہ سر پر بٹھانے
کو تیار ہیں۔ دوست تو دوست، کمپنی کے منیجر صاحب بھی تو
میری بڑی عزت کرتے ہیں۔

نصیبن۔ اگر کوئی نواب سجانہ کو خبر کردے تو۔

شفیق۔ نواب سجانہ؟ ہا ہا (ہنس کر) تو نے بھی بھلی فکر
کی۔ وہ اب بڈھے ہو چلے، ان کی بلا سے کچھ ہی ہوا کرے
اچھا اب جلدی سے چائے لا۔ دیکھوں کتنی جلدی چائے لاتی ہے۔

نصیبن۔ ڈر ہی لگتا رہتا ہے۔ بڑے آدمی ہیں خبر نہیں
کیا ہو جائے۔

شفیق۔ اب جاتی ہے یا نہیں۔ یا باتیں ہی بنائے جائیگی
مجھے بھوک لگ رہی ہے۔

(نصیبن جانے میں پس و پیش کرتی ہے۔)

شفیق۔ نصیبن میں پوچھتا ہوں کہ آخر تجھے کیا ہو گیا ہے

نصیبن۔ کچھ نہیں میاں

شفیق۔ جلدی سے چائے لا۔

نصیبن۔ لائی میاں

(نصیبن سہمی ہوئی سی جلدی سے باہر چلی جاتی ہے
شفیق اپنے شانوں کو جنبش دیتا ہے۔ بالوں میں
انگلیوں سے کھیل کرتا ہے۔ آخر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے
منہ [illegible] سگریٹ سلگائی، بیٹھ ہونے کے
کمرے کی طرف ہے ـــــ تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے
[illegible] بیگم سجانہ [illegible] سونے
کے کمرے کا دروازہ کھول کر چپکے سے کمرے میں آتی
ہیں۔ کھڑے پاجامہ والا جوڑا پہنے ہوتے؟

بیگم سجانہ۔ (شفیق کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر)
آپ آ گئے؟

شفیق۔ (متحیر) ارے..... یہ کیا؟ اون ہوں ناممکن!
وہ نہیں ہو سکتیں۔

بیگم سجانہ۔ کون نہیں ہو سکتیں؟ کیا ناممکن ہے؟

شفیق۔ آپ کون ہیں؟..... یہاں کیونکر آئیں؟

بیگم سجانہ۔ تو کیا تم اپنی ادنٰے کنیز کو نہیں پہچانتے؟
میرا اس طرح اچانک آنا ناگوار گزرا؟

شفیق۔ خدایا خیر! (پہچان کر) بیگم سجانہ!

بیگم سجانہ۔ بیگم؟..... مجھے بیگم کا خطاب کس دن
سے عنایت ہوا۔ میں تو ہوں آپ کی ادنٰی کنیز۔ آپ کے نیاز
کی مشتاق۔

شفیق۔ (ایک دم از راہ احترام کھڑا ہو جاتا ہے) میں پوچھ
سکتا ہوں کہ بیگم سجانہ نے اس غریب خانہ پر تشریف لانے کی
کس لئے زحمت گوارا کی!

بیگم سجانہ۔ زحمت گوارا کی! کس نے؟ پیارے شفیق
تم تو مذاق کر رہے ہو۔

شفیق۔ میں بیگم سجانہ سے مذاق کرنے کی کبھی [illegible]
نہیں کر سکتا۔

بیگم سجانہ۔ کل رات جب ہم تمہارے ہاں سیر کر
رہے تھے اس وقت تمہیں خیال نہ آیا کہ میں تو بیگم [illegible]

پاس آ سکتی ہوں۔ کیوں کیا تم میرے آنے سے ناخوش ہو؟

شفیق۔ آپ کس سیر کا ذکر کر رہی ہیں۔

بیگم سجانہ۔ لیجئے آپ تو بھول بھی گئے۔

شفیق۔ مجھے نہیں یاد۔ آپ کا یہاں آنے سے مطلب؟

بیگم سجانہ۔ یہاں آنے سے مطلب! خوب! کیا اپنی محبوبہ سے ایسے ہی سوال کرتے ہیں؟

شفیق۔ محبوبہ!! اور آپ نے یہ جوڑا پہن رکھا ہے۔ کیا آپ واقعی بیگم سجانہ ہیں؟

بیگم سجانہ۔ بیگم سجانہ ہونے کی بھی ایک ہی رہی! نہیں تو اور کیا ہوں۔

شفیق۔ ہوں۔

بیگم سجانہ۔ کل رات کار میں آپ کیسے پیارے باتیں کر رہے تھے۔ آپ کے الفاظ میں کس قدر چاشنی تھی۔ آپ کے جذبات میں کس قدر نفاست تھی۔ آپ کی زبان میں کس قدر شیرینی۔ آپ کی ہر بات پر میرا دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ آپ کا ایک ایک لفظ میرے اعصاب پر مدہوشی طاری کر رہا تھا۔ میں آپ کی باتوں میں محمور بیٹھی تھی —— آہا۔ وہ لمحے کس قدر پُر کیف تھے۔ ان میں کیسا سرور تھا۔ میں کل کی سیر کبھی نہیں بھول سکتی۔

شفیق۔ کل کی سیر؟

بیگم سجانہ۔ تو کیا واقعی کل کی سیر بھول گئے۔

شفیق۔ معاف کیجئے گا بیگم سجانہ۔ آپ بھول رہی ہیں

بیگم سجانہ۔ لیجئے۔ میں بھول رہی ہوں یا آپ بھول رہے ہیں۔

شفیق۔ آپ کو کسی اور کیف و سرور کی یاد آ رہی ہے میں آپ کے ساتھ نہیں گیا نہ میری آپ کی باتیں ہوئیں۔

بیگم سجانہ۔ جی ہاں۔ آپ کے کہنے سے اچھا کل آپ میرے ساتھ نہ تھے۔ تو کہاں تھے۔

شفیق۔ کل رات تو میں ایک بجے تک اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتا رہا۔

بیگم سجانہ۔ کیوں بنتے ہیں آپ۔ اب آپ کہیں یہ نہ کہدیں۔ کہ مجھے کیا معلوم کس جوہی کی بالیاں میں نے نہیں دیں۔

شفیق۔ جوہی کی بالیاں..... ہاں ہاں..... نے

بیگم سجانہ۔ شکر ہے یہ تو یاد رہیں۔

شفیق۔ نہیں میں نے آپ کو نہیں دیں۔ میں نہیں دیں۔

بیگم سجانہ۔ پرسوں شام ہی کو تو آپ نے مجھے دی ہیں..... واقعی مجھے جوہی کی خوشبو بہت پسند ہے اس پر میری جان جاتی ہے..... اور آپ کی دی ہوئی جوہی کی بالیاں..... میں انکی خوشبو کبھی نہیں بھول سکتی۔ ان میں آپ کی محبت کی خوشبو.........

شفیق۔ آپ پھر بھول رہی ہیں بیگم سجانہ۔ میں نے جوہی کی بالیاں نہیں دیں..... میرا مطلب ہے کہ نہیں دیں۔

بیگم سجانہ۔ پھر بکھیریں [illegible]

شفیق - وہ تو ابھی دفتر کی میز کی دراز میں رکھی ہیں -

بیگم سجانہ - یہ بھی ایک ہی ہوئی ....

شفیق - یقین کیجئے - پرسوں شام تو میں اور میرے دوست مقتدر مرزا بازار کچھ خریدنے گئے تھے -

بیگم سجانہ - خریدنے گئے تھے! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

شفیق - جی ہاں! اور میں نے جوتے کا پالش - کفوں کے بٹن اور ٹوتھ پیسٹ .... اور کیا خریدا تھا؟ ....

بیگم سجانہ - بننے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے - بس ختم کیجئے اسے اب - میں نے آپ کو سات بجے بلایا تھا لیکن اگر خود میں یہاں آگئی تو ایسی کونسی بات ہوگئی جس نے آپ کے دماغ کا توازن درہم برہم کر دیا -

شفیق - دماغ کا توازن ......

بیگم سجانہ - (بات کاٹ کر) اب دیکھئے نا - کہاں نواب صاحب اور کہاں میں - میرے باپ سے بھی تو بڑے ہیں - یہ تو عمر اور پھر مٹکا سی توند اور اس پر بالشت برابر قد ... غضب ہے عجب مینڈک سے واسطہ پڑا ہے - آواز ایسی کہ جیسے مٹکے میں کنکر گڑگڑ بول رہے ہوں - ایک لفظ سمجھ میں نہیں آتا .... یہ موٹی موٹی انگلیاں اور ایک منٹ چین نہیں چہرے پر سے جاتے تھے - میرا ناک میں دم کر دیا مجھ سے سات بجے تک بھی انتظار کرنا مشکل ہوگیا - اب بتائیے میں کرتی بھی تو کیا کرتی -

شفیق - کیا واقعی نواب صاحب اس ہیئت کے ہیں؟

بیگم سجانہ - کیسی ہیئت کے بھی ہوں - اگر بالفرض یوسف بھی ہوں تو کیا کریں - سچ تو یہ ہے کہ مجھے تو سب سے چین نہیں آتا

(شفیق کو دھکیل کر کرسی پر بٹھا دیتی ہے - خود کرسی کے بازو پر بیٹھ جاتی ہے) ہاں تو آپ کو میرا پرچہ مل گیا تھا؟

شفیق - کیسا پرچہ؟ آپ نے لکھا تھا؟ کب؟

بیگم سجانہ - وہی پرچہ جو آج صبح میں نے آپ کو لکھا تھا -

شفیق - آپ نے لکھا تھا؟

بیگم سجانہ - کیوں - کیا ابھی تک نہیں ملا جب ہی آپ اس قدر برہم ہو رہے ہیں - میں نے پہلے ہی اجازت مانگی تھی - بلا اجازت اس کنیز کی یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوتی -

شفیق - (میز پر سے خط اٹھاتے ہوئے) آج صبح تو میرے پاس یہ پرچہ آیا تھا لیکن یہ آپ کا تو نہیں -

بیگم سجانہ - (پرچہ اچک کر سونگھتی ہے) لو سونگھو - میں نے پرچہ پر MISCHIBF سینٹ کی دو بوندیں ڈالی تھیں - سونگھو - ابھی تک خوشبو آ رہی ہے -

(پرچہ شفیق کو دیتی ہے)

شفیق - (سونگھتے ہوئے) اوں ہوں - اس میں سے تو سینٹ کی خوشبو نہیں آ رہی (پھر سونگھتا ہے) اس میں سے تو .... تو ... استری کی راکھ کی ....

بیگم سجانہ - (جلدی سے پرچہ چھین لیتی ہے) واہ - اس میں سے تو MISCHIEF کی خوشبو آ رہی ہے - (سونگھتی ہے) آہا کیسی مست خوشبو ہے .... آخر آپ کی ناک کو کیا ہوگیا ہے؟

شفیق - سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگیا ہے - جب مجھے خوشبو آ رہی تھی تو نصیبن کہتی تھی کہ عطر نہیں لگایا اور اب مجھے خوشبو نہیں آتی تو آپ کہہ رہی ہیں کہ عطر لگایا ہے ... یا اللہ مالک آج کچھ

خراب ہو گئی ہے (ناک کو رگڑتا ہے) لیکن یہ خط آپ نے نہیں لکھا

.... یہ تو میرے درزی.....

بیگم سجانہ (تیوری) میں دیکھتی ہوں میرا نہیں تو بھلا اور کس کا

لکھا ہوا ہے.... ذرا دیکھو تو.....

شفیق۔ میں نے دیکھ رکھا ہے۔

بیگم سجانہ۔ پڑھو تو.....

(خط دینے کو ہاتھ بڑھاتی ہے جب شفیق لینے کو

ہاتھ بڑھاتا ہے تو بیگم سجانہ خط نہیں دیتیں)

بیگم سجانہ۔ اچھا لو میں پڑھتی ہوں (خط پڑھتی ہے۔ ایک

ہاتھ شفیق کی گردن میں حمائل ہے) میرے پیارے شفیق۔ میں آج

شام ٹھیک سات بجے۔ اسی جگہ موٹر میں انتظار کروں گی۔ دیکھو

دیر نہ ہو جائے۔ میرا وہاں زیادہ دیر انتظار کرنا مناسب نہیں۔

نیاز کی طالب ۔ اختری

شفیق۔ یہ آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟

بیگم سجانہ۔ اس میں یہی لکھا ہوا ہے۔

شفیق۔ میں دیکھوں۔

بیگم سجانہ۔ لو تم دیکھ لو میرے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے یا

نہیں۔ ذرا پڑھو تو میرے پیارے ننھے سے ناسمجھ مجنوں۔

شفیق۔ خط میں لکھا ہے "مکرمی تسلیم میں آپ کو آخری دفعہ

متنبہ کئے دیتا ہوں۔ دو سال ہو گئے۔ آپ سے ایک دمڑی بھی

وصول نہیں ہوئی۔ حساب فوراً صاف کر دیجئے۔ ورنہ میں ذمہ دار

نہیں۔ اگر میں سر بازار آپ کی پتلون اتروا لوں تو آپ کی کیا عزت

رہ جائے گی میں اپنی پھوٹی کوڑی بھی نہیں مرنے دینے کا میرے پیسے

پہنچ جائیں" یہ تو میرے درزی کا پرچہ ہے۔ سر بازار پتلون اتروا

لوں گا۔ ہمیشہ کمبخت اسی طرز میں لکھتا ہے سمجھتا ہے کہ چوروں سے

واسطہ پڑا ہے جو اس کے پیسے لے کر بھاگ جائیں گے بدتمیز!

بیگم سجانہ۔ (چیخ چیخ کر روتی ہے۔ اور شفیق کی گردن میں اپنا

منہ چھپا لیتی ہے) میرے پیارے شفیق کیا محبت نے تمہیں اس قدر

وارفتہ کر دیا ہے تم میرا خط بھی نہیں پہچانتے آخر تمہاری آنکھوں

کو کیا ہو گیا ہے

شفیق۔ آپ کو یہ فریب نہیں دیتا۔

بیگم سجانہ۔ جی ہاں اور آپ کو اس طرح پیش آنا بہت

زیب دیتا ہے۔

شفیق۔ اللہ مجھ پر رحم کیجئے۔

بیگم سجانہ۔ رحم کی تو میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔

شفیق۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ رو کیوں رہی ہیں! مجھ سے

کیا خطا سرزد ہو گئی؟ نہیں بتائیں گی تو میں دیواروں سے اپنا سر

پھوڑ لوں گا۔ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالوں گا۔

بیگم سجانہ۔ میں کیوں رو رہی ہوں؟ اپنی قسمت پر رو رہی

ہوں بھلا آپ سے کیا خطا ہو سکتی ہے۔ آپ یہ کہہ کر میرے کانوں

کو کیوں گنہگار کرتے ہیں۔ میں تو آپ کی کنیز ہوں ادنیٰ سی ایک ادنیٰ

کنیز۔

شفیق۔ میری کنیز؟ ادنیٰ کنیز؟ کس کی کنیز؟

بیگم سجانہ۔ (روتے ہوئے) کیسا ظلم ہے۔ میں اسے برداشت

نہیں کر سکتی۔ آپ تو مجھے پہچانتے بھی نہیں۔ اپنی کنیز کو کیا سمجھنے

آپ کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہے؟ آخر آج ہوا کیا آپ کی غیرت

میرے ساتھ رہنے سے کیا اتنی خوشی ہوئی کہ ہوش و حواس بھی جاتے رہے۔

شفیق۔ آپ کے ساتھ رہنے سے؟ آپ کے ساتھ؟

بیگم سجانہ۔ ہاں ہاں، میرے ساتھ!

شفیق۔ میرے ساتھ۔ تمھارے ساتھ۔ اس کے ساتھ ہمارے ساتھ ان کے ساتھ۔

بیگم سجانہ۔ میرے پیارے شفیق۔ خدا را ہوش میں آؤ مجھ پر رحم کرو۔ للہ انسانوں کی سی باتیں کرو۔ اچھا مجھے غور سے دیکھو تو سہی۔

شفیق۔ دیکھ تو رہا ہوں۔

بیگم سجانہ۔ تم ان آنکھوں کو نہیں پہچانتے جن کو تم نرگس شہلا کہا کرتے تھے۔

شفیق۔ نرگس شہلا ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ہاں ۔ ۔ ۔ ۔

بیگم سجانہ۔ اور یہ ہونٹ، انھیں تم یاقوت بتلایا کرتے تھے۔

شفیق۔ میں؟

بیگم سجانہ۔ اس تل کو نہیں پہچانتے جس کے بدلے تم سمرقند و بخارا دینے کو تیار تھے۔ مجھے دیکھو تو سہی۔

شفیق۔ میں دیکھ تو رہا ہوں۔

بیگم سجانہ۔ میں وہی ہوں جسے تم نقاشِ ازل کا بہترین شاہکار کہا کرتے تھے میں وہی ہوں۔ تمھاری ازلی کنیز تمھاری [illegible]۔

شفیق۔ میری کنیز؟ ۔ ۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

بیگم سجانہ۔ آج تمھاری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے جھک کیوں گئی ہے؟ آنکھیں دیکھنے میں تو بالکل صاف ہیں۔ کوئی جالا والا نہیں۔ ان میں وہی چمک ہے لیکن شفیق کیا بات ہے؟ آج محبت کی بجائے جنوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شفیق۔ جنوں؟ محبت کی بجائے؟ لیکن کس کی محبت؟ کیسا جنوں؟

بیگم سجانہ۔ اچھا پیارے شفیق اگر تم مجھے نہیں پہچانتے تو اس جوڑے کو تو پہچانتے ہو۔

شفیق۔ ہاں ہاں۔ یہ وہی جوڑا ہے۔ اسے تو میں پہچانتا ہوں۔

بیگم سجانہ۔ شکر ہے یہ تو پہچانا ۔ ۔ ۔ تمھیں یاد ہے۔ ایک رات نکھری ہوئی چاندنی میں میں اس جوڑے کو پہنے ہوئے تھی۔ یاد ہے تم نے کیا کہا تھا؟ وہ لفظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ مجھے حرف بحرف یاد ہیں۔

شفیق۔ کمال ہے ۔ ۔ ۔ میں نے کیا کہا تھا؟

بیگم سجانہ۔ تم نے کہا تھا "ایسا معلوم ہوتا ہے میری جان، ایک ستارہ زمین پر اتر آیا ہے۔ کوئی معمولی ستارہ نہیں ایک درخشاں ستارہ حسن و رقص کی تکمیل، رقاصۂ فلک!" اس رات پہلی دفعہ تم نے مجھے رقاصۂ فلک کہا تھا۔ اچھا تم مجھے رقاصۂ فلک ہی کہا کرتے ہو نا؟

شفیق۔ جی ہاں ۔ ۔ ۔ رقاصۂ فلک ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔

بیگم سجانہ۔ اور تم نے کہا تھا "تمھارے باریک دوپٹہ پر کا ملانی ۔۔۔ ایک کہکشاں ہے۔ اور یہ پائنچہ کی [illegible]

کا پتھا ——— معلوم ہوتا ہے کہ سارے اجرام فلکی تمہارے پاؤں میں آ کر لوٹ گئے ہیں۔ اختری جس طرح دیوانے کا جنوں چاند کو دیکھ کر اور بڑھتا ہے اسی طرح میرے ہوش و حواس بھی میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں ——— ایک جادو ہے جو آنکھوں میں اترا چلا جا رہا ہے۔

شفیق۔ کیا شک ہے اس میں . . . لیکن یہ میں نے نہیں کہا . . . چاندنی رات میں ؟

بیگم سجانہ۔ تمہیں نے کہا تھا۔ اس پر میں نے عرض کی کہ اگر یہ جوڑا آپ کو پسند ہے تو آپ کی نذر ہے۔ میں ہی آپکی ہو چکی تو بھلا اس جوڑے کی کیا حقیقت ! لیکن آپ کہتے تھے "اس جوڑے کو زینت تم سے ہے" آپ تو لیتے ہی نہ تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے دیا تھا آپ کو۔

شفیق۔ غلط آپ نے نہیں دیا۔

بیگم سجانہ۔ میں نے نہیں دیا ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟

شفیق۔ آپ نے نہیں دیا۔ یہ تو میں نے ایک درزی سے سلوایا تھا۔

بیگم سجانہ۔ واہ۔ یہ تو میں نے دیا تھا آپ کو۔ اچھا کچھ اگر میرا نہ ہوتا تو اس طرح بالکل ٹھیک کیسے آتا . . . کرتہ کیسا چست ہے۔ اور پاجامے کی لمبان کیسی موزوں۔

شفیق۔ میں نے درزی کو صرف اسی بات کی بڑی رقم دی تھی کہ وہ کہیں سے آپ کا ناپ دستیاب کرے۔

بیگم سجانہ۔ غضب ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کی باتیں تو اچھے خاصے آدمی کو دیوانہ کر دیں۔ . . . اس چاندنی رات میں جو آپ میرے ساتھ تھے . . .

شفیق۔ میرے ساتھ ؟

بیگم سجانہ۔ جی ہاں، میرے ساتھ !

شفیق۔ میرے ساتھ، تمہارے ساتھ۔ ان کے ساتھ ہمارے ساتھ۔ ان کے ساتھ۔

بیگم سجانہ۔ آپ کو کیا ہو گیا ؟ دیوانوں کی طرح . . . . .

شفیق۔ آپ کی باتیں دیوانہ کہنے کو کیا کم ہیں ؟

بیگم سجانہ۔ اچھا یہ تصویریں تو میں نے ہی دی ہیں اس سے تو نہیں مکر سکتے۔

شفیق۔ تصویریں ! . . . . نہیں آپ نے نہیں دیں۔

بیگم سجانہ۔ ہر بات پر نہیں . . . نہیں۔ آخر نہیں کبھی ختم بھی ہو گی۔ اچھا پھر تمہارے پاس کہاں سے آئیں۔

شفیق۔ یہ تصویریں تو میں نے ایک سینما والے سے خریدی تھیں . . . . قیمتہً

بیگم سجانہ۔ قیمتہً خریدی تھیں ؟ . . . . اچھا میں تمہاری بات مان لیتی ہوں۔ میں تمہاری طرح سے نہیں ہوں کہ ہر بات پر نہیں نہیں کئے جاؤں۔

شفیق۔ شکریہ۔ آپ کو میرا اعتبار تو ہوا۔

بیگم سجانہ۔ اچھا ان تصویروں پر لکھا تو میں نے ہی ہے۔ دیکھیے میرا ہی خط ہے . . . . اچھا دیکھیے مجھے ابھی تک یاد ہے کہ میں نے ان پر کیا کیا لکھا تھا۔ ٹھہریے میں بتاتی ہوں۔ سامنے ہاتھ کی [illegible]

میں [illegible] میرے پیارے شفیق - اختری ۔ اوپر نیچے
والی پر ۔۔ ہاں ۔ عمر بھر تمھارا نادم ہونے والی تمھاری اختری
[illegible] دیکھو یہی لکھا ہوا نہ ہو۔

(بیگم سجانہ تصویریں اٹھا لاتی ہیں شفیق تصویریں
دیکھ رہا ہے)

بیگم سجانہ - اچھا اگر میرا لکھا ہوا نہ ہوتا تو مجھے معلوم کیسے
ہوتا ۔ [illegible] تمھیں یاد ہے کب دی تھی ؟

شفیق - کب دی تھی ؟

بیگم سجانہ - ہاں ہاں ! —— جس رات میں نے
تمھیں اپنے ہاں بلایا تھا جن دنوں نواب صاحب کلکتہ گئے
ہوئے تھے ۔ دسمبر کی سردیوں میں —— یاد ہے ۔ باہر
بارش ہو رہی تھی ہم تم بخاری کے آگے بیٹھے ہوئے تھے کمرے
میں اندھیرا سا ہو رہا تھا . . . . اسی رات جب میں تمھارے
گھٹنے پر سر رکھے لیٹی تھی ۔ تم نے اپنے بچپن کی کہانیاں سنائی
تھیں ۔ تم نے اپنی بیوہ والدہ کا ذکر کیا تھا کہ تم ان کے بڑھاپے
کا آسرا ہو . . . . اچھا تم اکلوتے ہی ہو نا ؟

شفیق - ہاں میں اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں لیکن
ان تصویروں پر میں نے نصیبن کی بھتیجی سے لکھوایا تھا۔

بیگم سجانہ - نصیبن کی بھتیجی نے لکھا تھا ؟

شفیق - ہاں ، وہ اکثر یہاں آیا کرتی تھی ۔ ایک دن
نصیبن یہاں نہیں تھی ۔ وہ جو آئی ۔ میں نے اس سے لکھوا لیا
اب اس کے میاں کی بدلی ہو گئی ہے نصیبن اس کو میرے
نام ان کے قصے سنایا کرتی تھی ۔

بیگم سجانہ - اس دن تو میں آئی تھی . . ہاں
نصیبن بوا بھی اس دن نہیں تھیں میں نے اپنی تصویروں پر
خود لکھا تھا۔

شفیق - کیا واقعی اس دن آپ آئی تھیں ؟

بیگم سجانہ - جی ہاں ۔

شفیق - میں سمجھ گیا تو آپ ہی نصیبن بوا کی بھتیجی ہیں ؟

بیگم سجانہ - میں کیوں ہوتی نصیبن کی بھتیجی ہو گی کوئی
اور ۔ میں تو ہوں تمھاری ادنیٰ کنیز ۔ تمھارے نیاز کی مشتاق !
اختری

شفیق - لیکن تم کچھ بدل گئی ہو ۔

بیگم سجانہ - (کھڑی ہو جاتی ہے) میں آپ کی محبت
میں مبتلا تھی ۔ نہ کھانے کو طبیعت چاہتی تھی نہ پینے کو ۔ غم اندر
ہی اندر کھائے جاتا تھا۔

شفیق - اب کی بار بالکل ٹھیک سمجھ گیا ۔

بیگم سجانہ - کیا سمجھے ؟

شفیق - آپ نصیبن کی بھتیجی کا روپ بھر کر یہاں آیا
کرتی تھیں بیگم سجانہ ۔

بیگم سجانہ - میں کیوں نصیبن کی بھتیجی بنتی ۔ کیا خوب !
میں تو سمجھی تھی کہ تمھارے ہوش ٹھکانے آ گئے ہیں لیکن پھر
دورہ پڑا ۔ آؤ (صوفے کی طرف کھینچتے ہوئے) تم میرے گھٹنے
پر سر رکھو ۔ میں تمھارا سر دباتی ہوں ممکن ہے دماغ کو کچھ سکون
ملے ۔

شفیق - نہیں نہیں میں نہیں دبواتا ۔ مجھے چھوڑ دیجئے ۔ خدا
کے واسطے یہاں سے جائیے ۔ ورنہ واقعی میرا دماغ خراب
ہو جائے گا۔

بیگم سجانہ۔ اب مجھے [illegible] ہی ہیں (روتے ہوئے) گھر سے باہر دھکیلا جا رہا ہے۔ کبھی وہ دن تھے کہ میری خوشامد ہوتی تھی، میری تعریفیں ہوتی تھیں۔ اور اب میری موجودگی بھی ناگوار گزر رہی ہے، میری صورت سے نفرت ہو گئی ہے۔ لیکن یہ تو قاعدہ ہی ہے۔ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔ ہم سب کچھ ان پر نثار کر دیں۔ اور یہ . . . . جہاں طبیعت بھری پھر گیا . . . وہ ٹھوکریں مارتے ہیں . . . . لیکن میں تو اپنے دل سے مجبور ہوں . . . ٹھوکریں کھاؤں گی . . . .

شفیق۔ یا الٰہی یہ کیا آفت ہے؟ یہ بیگم سجانہ ہیں یا نصیبن کی بھتیجی . . . . یا دونوں . . . . کچھ سمجھ میں نہیں آتا . . . . اگر بیگم سجانہ ہیں تو انھیں یہ سب باتیں کیونکر معلوم ہوئیں۔

بیگم سجانہ۔ معلوم ہوئیں کیسے! آپ ہی نے تو بتائی تھیں۔

شفیق۔ کب؟

بیگم سجانہ۔ جب میں یہاں آئی تھی اور نصیبن باہر گئی ہوئی تھی۔ آپ تو بھول جاتے ہیں۔

شفیق۔ لیکن نصیبن کی بھتیجی بھی نہیں! . . . . نصیبن کی بھتیجی؟ . . . نہیں۔ بیگم سجانہ؟ نہیں۔ تو پھر کیا؟ ضرور کوئی بلا ہے۔ کوئی چڑیل ہے۔

بیگم سجانہ۔ ہاں بس اسی کی کسر رہ گئی تھی۔ بلا، چڑیل اور کچھ، کوئی اور خطاب

شفیق۔ اری نصیبن کی بھتیجی تجھے یہاں آنے کو کس نے کہا تھا؟ مجھے ستانے کی تجھے ہمت کیسے ہوئی؟ ٹھہر، ابھی نصیبن کو بلواتا ہوں وہ تیری خبر لے گی۔

بیگم سجانہ۔ میں لاکھ کہہ چکی میں نصیبن کی بھتیجی نہیں ہوں شفیق آخر آج تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ میں [illegible] تم اپنی اختری کو نہیں پہچانتے۔

شفیق۔ اپنی اختری! اختری۔ ہاں ہاں . . . تم اختری ہو

بیگم سجانہ۔ شکر ہے تم نے پہچان تو لیا میرے پیارے شفیق (شفیق کی گود میں بیٹھنا چاہتی ہے)

شفیق۔ اختری؟ بیگم سجانہ؟ ناممکن . . . بھوت بھوت!!

بیگم سجانہ۔ کہاں ہے بھوت؟

شفیق۔ میرے بلا چمٹ گئی۔ ارے چڑیل آ گئی بچاؤ، بچاؤ، اُف آواز بھی تو نہیں نکلتی۔

بیگم سجانہ۔ میں کیا کروں؟ شفیق تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے

شفیق۔ اری نصیبن! او نصیبن!! جلدی آ، دم گھٹنے لگا، مجھے ایک چڑیل لپٹ گئی ہے

بیگم سجانہ۔ میری اب یہی قدر رہ گئی ہے۔ دھکے لگوا کر نکالا جا رہا ہے۔ میں خود جاتی ہوں۔

شفیق۔ جاتی ہوں! . . . . اری نصیبن اس بلا سے پیچھا چھڑا

بیگم سجانہ۔ میں ابھی گھڑی جا رہی ہوں لیکن یہ یاد رہے کہ اب میں کبھی نہیں آنے کی۔ اور آپ بھی میرا نام کبھی نہ لیجیے گا۔

(بیگم سجانہ سونے کے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ سٹیج پر روشنی زیادہ ہوتی ہے شفیق اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے)

شفیق۔ اف (دامن سے ہوا کرتے ہوئے) یہ کیا بلا تھی نصیبن کی بھتیجی، بیگم سجانہ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کون تھا۔ اف

(نصیبن چائے لے کر آتی ہے)

نصیبن۔ [illegible]

آپ ... آرہی تھی؟

شفیق۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) ہاں۔ ہاں۔

نصیبن۔ آواز میرے کانوں میں آئی تو تھی۔ میں جانا کا سامان لگا رہی تھی۔ کیا کام تھا؟

شفیق۔ کچھ نہیں۔ اُف

نصیبن۔ (شفیق کو غور سے دیکھتے ہوئے) کیا ہو گیا؟ خیر تو ہے۔

شفیق۔ کچھ نہیں

نصیبن۔ جی کیسا ہے؟ کہیں دور پار دشمنوں کی طبیعت تو ناساز نہیں

شفیق۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔

نصیبن۔ واہ۔ دیکھو تو سہی چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی ہے

شفیق۔ (خفگی میں) کچھ نہیں۔

نصیبن۔ تو اس قدر نڈھال پھر کیوں ہیں؟

شفیق۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔

نصیبن۔ کچھ نہیں کچھ نہیں ہر بات پر کچھ نہیں آخر کچھ ہے بھی یا نہیں ... تو پھر آواز کیوں دی تھی؟

شفیق۔ بوا نصیبن میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔

نصیبن۔ پوچھئے تو شکر ہے کچھ نہیں تو ختم ہوا۔

شفیق۔ دیکھو ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔

نصیبن۔ کیا پوچھتے ہیں آپ میں ٹھیک جواب دوں گی۔

شفیق۔ سچ سچ بتانا۔

نصیبن۔ ہائی میری تو کیسی نکل کی سی شرطیں کر رہے ہیں آپ

شفیق۔ مجھے کس سے محبت ہے تمہاری بھتیجی سے یا بیگم سجانہ سے

نصیبن۔ توبہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ وہ تو میری بھتیجی ... کہاں ... آپ ... غریب گھر

کی لڑکی ہے اور پھر اس کا بیاہ بھی ہو چکا ہے۔

شفیق۔ میں پوچھتا ہوں مجھے کس سے محبت ہے تمہاری بھتیجی سے یا بیگم سجانہ سے۔

نصیبن۔ میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں اس کی شکل بھی تو ایسی نہیں کہ رغبت آئے۔ اس سے کیسے محبت ہو سکتی ہے۔ لیکن میاں محبت کے آنکھیں کوئی تھوڑی ہی ہوتی ہیں لیکن وہ یہاں آتی ہی کون سی تھی میں نے تو آپ کے منہ سے اس کا نام بھی نہیں سنا۔ اس سے محبت نہیں ہو سکتی۔

شفیق۔ تو پھر بیگم سجانہ سے محبت ہے نا۔

نصیبن۔ ہونہ ہو انہی سے ہو سکتی ہے اور انکا نام تو آپ روز ہی لیا کرتے ہیں

شفیق۔ تو مجھے بیگم سجانہ سے محبت ہے تیری بھتیجی سے نہیں

نصیبن۔ ہاں میاں بیگم سجانہ سے ہے آپ کو محبت مجھے معلوم ہے

شفیق۔ میرے پیچھے بیگم سجانہ یہاں آیا کرتی تھیں؟

نصیبن۔ نہیں میاں یہاں تو کبھی نہیں آئیں۔ ابھی میں ابھی تو آپ سے کہہ رہی تھی کہ میں نے بیگم سجانہ کو نہیں دیکھا۔

شفیق۔ ہاں کہہ تو رہی تھی۔

نصیبن۔ پھر؟

شفیق۔ اللہ تو نے بیگم سجانہ کو کبھی میرے خاندان کے قصے نہیں سنائے

نصیبن۔ نہیں میاں بھلا میں آخر سناتی تو کہاں سناتی۔

شفیق۔ اچھا آج کل تیری بھتیجی کہاں ہے؟

نصیبن۔ آج کل کہاں ہے؟

شفیق۔ اپنے میاں کے پاس

نصیبن۔ یہاں تو نہیں ہے؟

شفیق۔ یہاں پھر بھلا کیسے ہو سکتی ہے آج آپ کیسی باتیں پوچھ رہے ہیں جن کا نہ کوئی سر نہ پیر۔

شفیق۔ کیا تجھے معلوم ہے سونے کے کمرے میں کون ہے؟

نصیبن۔ ہوتا کون؟ کوئی بھی نہیں۔

شفیق۔ اچھی طرح سے معلوم ہے؟

نصیبن۔ اگر میرے پیچھے آپ نے کسی کو بلا کر اس میں بند کر دیا ہو تو مجھے کیا معلوم

شفیق۔ تو نے بیگم سجانہ کو اندر آتے نہیں دیکھا؟

نصیبن۔ لو اور سنو! بیگم سجانہ یہاں کہاں سے آئیں۔

شفیق۔ بیگم سجانہ یہاں نہیں آئیں؟

نصیبن۔ نہیں میاں! یہاں تو آدمی کی پرچھائیں بھی نہیں آئی۔

شفیق۔ تو پھر ضرور میرے دماغ میں خرابی ہے۔

نصیبن۔ آپ کو یہاں کسی آدمی کا شبہ ہوا تھا؟

شفیق۔ میں نے یہاں کسی کو دیکھا تھا۔

نصیبن۔ میاں آپ کی آنکھ لگ گئی ہو گی اور آپ کو یہ خیال رہا ہو گا کہ میں جاگ رہا ہوں۔

شفیق۔ ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔

نصیبن۔ کبھی کبھی معدے کے بخارات دماغ کو چڑھ جاتے ہیں

شفیق۔ ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ اچھا میں کل جلاب لوں گا..... میرے سر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔

نصیبن۔ میں چاء بناتی ہوں۔ چاء پیجیے۔ ذرا طبیعت سنبھلے گی

شفیق۔ میں خود چاء بنا لوں گا تو جا۔

(نصیبن جانے والی ہوتی ہے کہ بیگم سجانہ سامنے ہی باہر سے داخل ہوتی ہیں)

شفیق۔ نصیبن۔ دیکھتی ہے۔ بتا یہ عورت کون ہے؟

نصیبن۔ مجھے تو کوئی عورت نظر نہیں آ رہی بتاؤں کیسے کہ کون ہے۔

(بیگم سجانہ مسکرا رہی ہیں)

شفیق۔ کیوں [illegible] نظر نہیں آتی؟ [illegible]

نصیبن۔ میاں پتہ نہیں آپ کو کیا نظر آگیا ہے۔ یہاں تو کوئی [illegible]

(نصیبن چلی جاتی ہے)

شفیق۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔

بیگم سجانہ۔ دیوانہ آج ہوئے ہو؟ دوسروں کی عزت سے کھیلنا دیوانہ پن نہیں ہے؟

شفیق۔ (کھڑا ہو جاتا ہے) سمجھا! سمجھا!

بیگم سجانہ۔ مسٹر شفیق نہیں۔ آپ ابھی نہیں سمجھے

شفیق۔ بیگم سجانہ مجھے معاف کر دیجیے میں بڑا قصوروار ہوں مجھ سے بڑا کمینہ پن ہوا۔ واقعی میں نے بڑی بے وقوفی کی لیکن میں پشیمان ہوں یقین کیجیے مجھ سے جس قدر ہو گا اس داغ کو مٹانے کی کوشش کروں گا

(بیگم سجانہ مسکرا کر میٹھی میٹھی نظروں سے شفیق کو دیکھ رہی ہیں)

بیگم سجانہ۔ آپ بھی خوب آدمی ہیں کسی شریف عورت کا نام بدنام کرنا آپ کے نزدیک کھیل ہے بچپن! جیسے بچے ہی [illegible] کیا کرتے ہیں

شفیق۔ آپ مجھے زیادہ شرمندہ نہ کیجیے میں بہت شرمندہ ہوں

بیگم سجانہ۔ واقعی!

شفیق۔ لیکن آپ کو علم کیسے ہوا بیگم سجانہ؟

بیگم سجانہ۔ آپ کو اس سے کیا غرض آپ نے اسے مشہور کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

شفیق۔ آپ میرا اعتبار کریں بیگم سجانہ جیسے ہی [illegible] آئی تھی مجھے تو کبھی اس کا گمان بھی نہ ہو سکا اس کا نام [illegible] ہو گی کہ آپ کے کانوں تک پہنچ سکے [illegible] .....

بیگم سجانہ۔ [illegible]

سمجھتی ہے!

شفیق۔ آپ نے بالکل درست فرمایا آپ کی ہر بات درست ہے لیکن پھر بھی یہ ایک بدنصیب کی روداد ہے۔ ایک ناکام دل کی روداد میں ایک نامراد تمنا ہوں جس پر غم زدہ میری زندگی ایک واہمہ ہے۔ اس کے لئے ایک فرضی محبت بھی کافی ہے۔ آپ کے تصور نے اسے روشن کر دیا۔ آپ کا تصور میری زندگی پر چھا گیا۔ میری زندگی کے جمود میں حرکت پیدا ہو گئی لیکن یہ حرکت ایسی تھی جیسے کالا دانہ شعلے کی نذر کر دیا جائے اور وہ سوختہ جان چٹخا پھرے

بیگم سجانہ۔ اچھا تو آپ کالا دانہ ہیں اور وہ بھی چٹخے ہوئے۔

شفیق۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر آپ مذاق اڑانا چاہتی ہیں تو شوق سے اڑائیے مذاق آپ جو چاہے کیجئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے دل میں آپ کی محبت ایک عرصے سے موجزن ہے۔ روز بروز موجیں بلند ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ میری ہستی بھی ان میں غرق ہو گئی۔ آپ سے ملاقات ناممکن تھی میرے تصور میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ کبھی کوئی لمحہ ایسا بھی آئے گا کہ میں آپ کے دامن کو بوسہ دے سکوں۔ ڈرتے ڈرتے ہوئے بھی زبان سے نکال سکوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے سائل ہوں بھیک چاہتا ہوں میری راتوں کی نیند مجھے واپس کر دیجئے۔ ممکن ہے خواب ہی میں آپ کا دیدار ہو جایا کرے۔ نہ سہی عالم بیداری میں.....

لیکن جب دل نے بہت آہ وزاری کی تو اسے دلاسا دیا کہ آپ کی بارگاہ میں باریابی ناممکن نہیں۔ جب بات کہنے میں دل سے کہا کرتا تھا آہستہ آہستہ یا دراز دستی میں بھی کہنے لگا جب میں آپ کا نام لیتا تو دل میں مسرت کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ یہ تصور ہی میرے لئے جان فزا تھا کہ مجھے آپ سے (گلا صاف کر کے) محبت ہے۔ میں اپنی محبت کے فرضی قصے گھڑ کر دل خوش کر لیتا تھا۔

بیگم سجانہ (بہت متاثر لہجے میں) بیوقوف

شفیق۔ آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں بیگم سجانہ

بیگم سجانہ۔ نہیں مسٹر شفیق آپ بیچارے سے میں کیا ناراض ہوں گی

شفیق۔ میں آپ کی خفگی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔

بیگم سجانہ۔ میں سچ کہتی ہوں..... پتہ نہیں کہ اب کہنا چاہئے بھی یا نہیں..... میں آپ کے احساسات سن کر بہت محظوظ ہوئی۔ کاش میں اس سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو جاتا تو..... (رک جاتی ہے)

بیگم سجانہ۔ آپ مجھے کس قدر ظالم سمجھتے ہوں گے؟

شفیق۔ آپ کہتے کہتے رک کیوں گئیں۔ آپ کیا کہنا چاہتی تھیں؟

بیگم سجانہ۔ نہیں..... کچھ نہیں شفیق۔ (اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے) اب میں اجازت چاہتی ہوں۔

شفیق۔ (ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے) بیگم.....

بیگم سجانہ۔ بہت دیر ہو گئی ہے شفیق۔ مجھے اس وقت جانے دو۔ اچھا رخصت!

(بیگم سجانہ جانے کو مڑتی ہیں شفیق ساکت کھڑا بیگم سجانہ کو دیکھ رہا ہے)

بیگم سجانہ۔ تو کیا آپ مجھے دروازے تک پہنچانے بھی نہیں آئیں گے ایسے خفا ہیں!

شفیق۔ (جلدی سے) نہیں میں خفا نہیں ہوں۔

(بیگم سجانہ اور شفیق جاتے ہیں بیگم سجانہ کے ہنسنے کی آواز آتی ہے شفیق ان کو رخصت کر کے واپس آتا ہے لکھنے کی میز کے کنارے پر بیٹھ کر تصویروں کو دیکھتا ہے..... نصیبن آتی ہے)

شفیق۔ تم نے دیکھا نصیبن کس قدر خوبصورت ہیں معلوم ہوتا ہے خدا نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں بنایا ہے حسن کی تکمیل ہیں۔

نصیبن۔ نہیں میاں میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ ہاں کانوں میں باتوں کی

بیشک یہی تو میں نے بہتیرا گھوم گھوم کے دیکھا۔ مجھے تو کچھ نظر آیا نہیں۔

شفیق۔ کیا کہا تم نے؟ تم نے بیگم سجانہ کو نہیں دیکھا؟

نصیبن۔ نہیں میاں۔

شفیق۔ اس کمرے میں انھیں آتے نہیں دیکھا۔ بیگم سجانہ مجھ سے باتیں کرتی نظر نہیں آئیں؟

نصیبن۔ میاں یہاں تو کوئی نہیں آیا۔ آپ میری بات مانئے تو آپ کے تو دل میں خیال بیٹھ گیا ہے۔

شفیق۔ کیا کوئی نہیں آیا یہاں؟ (ٹھنڈا سانس لے کر) اچھا! کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ ..... کیا پتہ

نصیبن۔ کوئی آ رہا ہے (پاؤں کی آہٹ)

شفیق۔ دیکھ تو سہی کون آ رہا ہے کہیں بیگم سجانہ دوبارہ نہ آ رہی ہوں

نصیبن۔ آپ کے سر پر تو بیگم سجانہ ہی سوار رہتی ہیں۔ یہاں تو مقتدر مرزا آ رہے ہیں۔

مقتدر مرزا۔ (کمرے میں آتا ہے) کہو بھئی شفیق کیسی گزری؟ سلام بوا نصیبن۔

نصیبن۔ سلام میاں۔ خدا تمھیں بڑی عمر دے۔

مقتدر مرزا۔ اس طرح منہ بنائے کیوں بیٹھے ہو۔ استاد اس دفعہ تم پکڑے گئے۔ مجھے تو یقین ہی نہ آتا تھا کہ بیگم سجانہ جیسی حسین اور مشہور عورت سے تمھاری ملاقات ہو سکتی ہے لیکن آج تم کتنا ہی منہ بنا کر بیٹھو کتنا ہی نہیں نہیں کرو میں تمھاری بات نہیں مانوں گا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے بیگم سجانہ کو یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

نصیبن۔ آپ نے دیکھا!

مقتدر مرزا۔ مجھ سے تو صبر بھی نہیں ہوا جلدی سے چپکے چپکے یہاں آ گیا (ہاتھ بڑھاتا ہے) مبارک ہو تمھیں تمھاری بیگم سجانہ

شفیق۔ (ہاتھ پر غصے سے ہاتھ مارتا ہے) تمھاری عقل تو درست ہے؟ کس بیگم سجانہ کو کہہ رہے ہو میں کسی بیگم کو نہیں جانتا یہاں کوئی نہیں آیا۔ اور اگر اب دوبارہ تمھاری زبان پر ان بیگم کا نام آیا تو زبان کھینچ لوں گا۔

مقتدر مرزا۔ (حیران) انھیں ہو کیا گیا؟ یہ کہتے ہیں کہ میں جانتا نہیں اور میں نے خود انھیں یہاں سے جاتے دیکھا ہے۔ ہلکی بادامی ساڑھی تھی اور اس پر چپکلا سا سنہری فیتہ۔ اور پر نہایت خوبصورت سلا ہوا کوٹ .... بھورے رنگ کا بہت خوش معلوم ہوتی تھیں۔ اب میں اپنی آنکھوں کا اعتبار کروں یا ان کی بات کا۔

نصیبن۔ شفیق میاں کچھ ایسی ہی طبیعت کے ہیں کسی عورت کی عزت پر تہمت کی سہار نہیں ہے۔ ان سے ایسا مذاق نہ کیجیے۔

مقتدر مرزا۔ (تصویریں دیکھتے ہوئے) ہاں۔ اگر میرے بھی ان جیسے نصیب ہوتے تو مجھے بھی سہار نہ ہوتی۔

(شفیق تصویریں اٹھا کر غصے کے ساتھ دراز میں بند کر دیتا ہے)

(پردہ)

ناصر الدین شمسی

موضوع کی تلاش

یہ پھول، یہ کلیاں، یہ سبزہ، کچھ دور، یہ شاما کے نغمے
یہ چاند، یہ تارے، یہ بادل، کچھ دور، یہ زہرا کے نغمے
یہ جھیل، یہ چشمہ، یہ وادی، کچھ دور، یہ دریا کے نغمے
ایسے میں جو "منظرِ فطرت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟
یہ آم، یہ جامن، یہ بارش کھیتوں میں کسانوں کے نغمے
بالوں کی گھنی محفل سے پرے یہ نازک دھانوں کے نغمے
کچھ دور، ندی کے پورب میں خاموش مکانوں کے نغمے
—— اور ایسے میں "منظرِ فطرت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟!

یہ چاندنی، یہ سیمیں لمحے، کچھ دور، فضا میں نغمہ سا
یہ وقت، یہ چھت، یہ تنہائی۔ جیسے کہ ہوں میں کھویا کھویا
یہ میز پہ شیلے کی نظمیں اور دھیان میں "کالج کی زہرا"
ایسے میں جو "حسن و محبت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟

مٹی گے یہ گھر، یہ آبادی، یہ سرد مسرت کی دنیا
کچھ دور، منگیتر کا میری- چکّی پہ محبت کا نغمہ
اور میں کہ صدا سے چکّی کی کچھ گھبرایا، کچھ بے پروا
——اور ایسے میں حسن و محبت پر اک نظم لکھوں کیسی ہو؟

یہ مہمانداری کی گھڑیاں، یہ "تاج محل" کا کاشانہ
یہ میز، یہ کرسی، یہ بجلی، یہ موپاساں کا افسانہ
دنیا کے نمایاں حصے میں، دنیا والوں سے بیگانہ
ایسے میں جو "اپنی حالت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟
یہ میرے محلّے کی گلیاں، قصبے کی یہ مبہم رعنائی
یہ شمع، یہ تخت، یہ جاڑے میں سب گھر والوں کی یکجائی
کچھ دور انگیٹھی سے، میرا یہ سوچ، یہ پھیکی انگڑائی
اور ایسے میں "اپنی حالت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟!

سلام (مچھلی شہری)

یادِ رفتگاں

دنیا فانی و گزشتنی ہے مبارک ہیں وہ لوگ جن کا چرچا رہ جائے۔ ورنہ بیشتر واقعات فراموش ہو جایا کرتے ہیں کسی اللہ کی کیا کہوں میں نے ہی جو کچھ دیکھا تھا بہت سا بھول بسر گیا، اور جتنا حافظہ میں رہ گیا ہے، وہ بھی کیونکر گزارش کروں کہ تمام سامعین پر یکساں اثر انداز ہو۔

تاہم چند واقعات نشر کرتا ہوں محترم سامعین نتائج خود اخذ فرما لیں!

(ا)

سردار مائیکل فیلوز صاحب، عالیجاہ بہادر مہاراجہ مہدجی صاحب سیندھیا کے ایک اولوالعزم جرنیل جون بپٹیس کے خاندان میں تھے ہمارے سرگباشی مہاراجہ و معلی سر مادھو راؤ صاحب سیندھیا نے انہیں "بڑے بوا" کے سوائے کسی لفظ سے کبھی مخاطب نہیں کیا، اور یہ وہ لفظ ہے جس سے مرہٹہ اپنے بڑے بوڑھوں کو طلب کیا کرتے ہیں۔

مہاراجہ صاحب موصوف کے دل میں سردار صاحب کی ایسی منزلت تھی کہ جب کبھی آپ ریاست سے باہر تشریف لے جاتے تو راج گھرانے کی نگرانی پر بزرگ ران کے طور پر "بڑے بوا" یعنی سردار مائیکل فیلوز صاحب کو چھوڑ جاتے تھے۔

سردار صاحب سرکار دربار ہی نہیں بلکہ اپنی نیک دلی اور خوش خلقی کے باعث ریاست کے عوام و خواص میں بھی بیحد مقبول تھے۔ چنانچہ آپ کی حلیمی و نرم مزاجی کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

جس وقت گوالیار کے راج گھرانے کا سکونتی محل "جے بلاس" سردار صاحب کی نگرانی میں تعمیر ہو چکا تو سرکار کو بہت پسند خاطر ہوا۔ لہٰذا حیواجی مہاراج باشی باشی نے خوشنود ہو کر ایک لاکھ روپیہ کی گراں بہا رقم صاحب موصوف کو عطا فرمائی۔

سردار صاحب ہدیۂ تشکر پیش کر کے عرض پرداز ہوئے۔

عالی جاہا! مجھ ناچیز کے لئے یہی امر باعث صد افتخار ہے کہ میری خدمات بندگانِ عالی میں بارور ہوئیں۔ باقی رہا محل تو ان ہاتھوں نے ایک اینٹ نہیں چنی۔ بیچارے مصیبتوں کے مارے بھوک کے توڑے مزدوروں نے تپتی جلتی زمین تیز دھوپ اور گرم لوؤں میں نہایت عرق ریزی و جانفشانی سے پتھر ڈھو کر محل تیار کیا ہے۔ دراصل یہ غریب ہی اس انعام کے مستحق ہیں ۔۔۔۔۔۔!!

دیدنی تھا وہ نظارہ، جب اس دریادل سردار مائیکل فیلوز نے کھڑے کھڑے غریب مزدوروں پر روپیہ کی بارش کر دی اور دعاؤں کے ہجوم خالی ہاتھ پلٹنے لگا۔

(۲)

ان ہی سردار صاحب کے چھوٹے بھائی "منا صاحب" ایک شجاع و فاتح سپہدار تھے۔ ان کا شباب خوں ریز معرکوں میں گزرا تھا۔ میں نے ان کا بڑھاپا دیکھا ہے۔ آہ! اب ایسے گل مچھوں والے سبک جسم کے سجیلے انسان کہاں ....

فوجیوں میں بالعموم اکھڑپن ذرا زیادہ ہوا کرتا ہے۔ سو بیشک منا صاحب کے مردانہ تیور اور رعب داب چہرے سے دلیری تو ضرور ٹپکتی تھی لیکن ویسے آپ واقع ہوئے تھے بڑے رنگین مزاج۔ آپ کو موسیقی اور شاعری سے بیحد لگاؤ تھا۔ چھوٹا سا ہونے کی وجہ سے مجھے ان کی پُر لطف مجالس کی شرکت کا موقع نہیں ملا۔ البتہ بارہا ان کی سواری نکلتے دیکھی ہے اور بزرگوں کی زبانی کلام سنتا رہا ہوں۔ غالباً آپ عاصی تخلص کرتے تھے۔ اور سب کچھ تو فراموش ہو چکا۔ حضرت عاصی کا صرف ایک مطلع ابھی تک یاد ہے۔ فرماتے ہیں ؎

محبّت کی ہوئی جب رُو بکاری   کھُلیں زُلفیں، بندھیں مشکیں ہماری

اس ایک ہی مطلع سے صاحب موصوف کی طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم انھوں نے کیا کچھ نہ فرمایا ہوگا۔ اور نہ معلوم اب وہ ان کے خاندان میں محفوظ بھی ہے یا نہیں

سردار صاحب کی ڈیوڑھی پر اکثر رقص و سرود کی محفلیں برپا رہتی تھیں۔ اور معرکۃ الآرا مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔

ایک روز آپ کچھ خاموش خاموش سے رہ کر لگے خود بخود جھومنے۔ مصاحبوں نے دریافت کیا:۔

جی حضور! کیا بات ہے؟

فرمایا۔ بھئی! ایک مصرع ہوا مصرع!!

جی حضور! مصرع .... خوب، تو ذرا زحمت فرمائیے!!

بولے۔ مصرع ہے ؎

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا؟

اے سبحان اللہ، کیا مصرع ہے ....

اہاہا .... اہاہاہا .... حضور کمال کر دیا ...... واہ

سبحان اللہ، کیا تیور ہیں ...... !

واللہ اسے کہتے ہیں مصرع ۔ ع

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا؟

خوب! خوب!!

سردار صاحب نے حکم دیا:۔

ہاں! وہ خواصاں! لونڈا ہمارا صندوقچہ تو اٹھا دو!!!

حاضر الوقت چوب دار نے صندوقچہ حاضر کیا۔ سردار صاحب نے کھول صندوقچہ۔ ایک رومال میں اشرفیاں باندھ وسط نشست کی چھوٹی سی میز پر رکھوا کر فرمایا:۔

لو بھئی! جو صاحب اس مصرع پر سب سے اچھا مصرع لگائیں، یہ رومال اُن کا!!

اب لیجیے جناب! ہر شخص ایک اُدھیڑ بن میں پڑ گیا۔ لگے مصاحبین قلابازیاں کھانے، اندر ہی اندر جوڑ توڑ لگانے۔ اِدھر لالچ۔ اُدھر عزت آبرو کا دھڑکا۔ یہ کہے میں ور رہوں، وہ سوچے میرا بول بالا ہو۔

فرشی مجلس تھی، ان ہی صاحبان میں سے کسی مصاحب کا ایک شاگرد لڑکا بھی موجود تھا مؤدب استادہ ہو کر لگا گزارش کرنے:۔

جی حضور! کیا مجھے بھی گرہ لگانے کی اجازت ہے؟

ہاں! ہاں!! کیوں نہیں، لگاؤ اگر لگا سکتے ہو!!!

لڑکا بولا:۔

جی حضور! پھر میں اشرفیاں لے لوں؟

ضرور، مگر ہو مصرع، لے لینا!

لڑکا اینڈ کر اُٹھا، اٹھلاتا ہوا میز کے اُس طرف پہنچا۔ اور کہنے لگا:۔

جی حضور! مرحمت ہو مصرع!!

ارشاد ہوا ؎

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا؟

مصاحبوں نے مصرع اٹھایا ؎

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا؟

تکرار ختم ہوتے ہی لڑکا کچھ عجب انداز سے کسی قدر ترچھا ہوا، اور ذرا گردن خمیدہ کر کے پُتلیاں گھما کر کہتا کیا ہے ؎

پھیر کر منہ، ہنس کے فرمایا، کہ "ہاں ہو جائے گا"!

پھر فوراً رومال بغل میں مار لگا دونوں دونوں ہاتھوں سے جھُک جھُک کے سلام کرنے۔

آداب عرض.... ذرہ نوازی.... غریب پروری.... حوصلہ افزائی سرکار کی....!

تحسین و آفریں کی دھوم دھام میں سردار صاحب کی آواز گونجی:۔

اُف! اُف!!.... رکھو رومال وہیں.... بیٹھ جا اپنی جگہ آ کر!!!

لڑکے کی صورت اُتر گئی، رنگ اُڑ گیا . . . کہ ہائے قسمت نے پلٹا کھایا . . . مگر چارہ بھی کیا تھا۔ بے بسی سے مری چال اپنی جگہ آ بیٹھا۔

سردار صاحب نے جھوم کر حکم دیا۔

ہاں! پھر کہو اسی طرح . . . . ہاں!!

جی حضور! کیا مجھے بھی گرہ لگانے کی اجازت ہے؟

ہاں! ہاں!! کیوں نہیں، لگاؤ اگر لگا سکتے ہو!!!

لڑکا بولا:-

جی حضور! پھر میں اشرفیاں لے لوں؟

ضرور، مگر ہو مصرع۔ لے لینا!

لڑکا اینڈ کر اٹھا۔ اٹھلاتا ہوا امیر کے اُس طرف پہنچا۔ اور کہنے لگا:-

جی حضور! مرحمت ہو مصرع!!

ارشاد ہوا ؏

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا؟

بدستور سابق مصاحبوں نے مصرع اُٹھایا ؏

وصل بھی تیرا کبھی اے جانِ جاں ہو جائے گا؟

لڑکے نے اُسی ادا سے تڑپ کر جواب دیا ؏

پھیر کر منہ، ہنس کے فرمایا، کہ "ہاں ہو جائے گا"!

اور جلدی سے بغل میں رومال مار، سلام کرتا ہوا چلنے لگا۔

نہیں نہیں، رکھ۔ رومال بیٹھ اپنی جگہ . . . . اور کہو اُسی طرح، سردار صاحب نے بے چین ہو کر حکم دیا۔

غرض اس پرکیف ڈرامے کا "ڈِس ہور" تا دیر اسی شدّ و مد سے جاری رہا، جس کے ایک کردار خود بدولت سردار صاحب تھے۔ جب اچھی طرح جی سیر ہو گیا تو اُن اشرفیوں کے علاوہ ماہانہ وظیفے سے بھی اس لڑکے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

(۳)

ایک بڈھا گوجر المعروف بہ دادا صاحب "موضع سرسودہ کی چوپال پر بیٹھا رتی بٹا کرتا تھا۔ قد میں مجھ سے ذرا کم، چھریرا بدن، سفید براق بال، آنکھیں مشعل کی مانند روشن، بتیسی نہایت خوش نما، صاف اور مضبوط، چہرہ شگفتہ، پھرتی میں آج کل کے نوجوانوں سے کئی قدم آگے۔ میں نے

اس شخص کو ہر وقت بالکل ہشاش بشاش پایا خیال فرمائیے گھٹنی کے پہرے داؤ صاحب کی صحت ایسی قابل رشک تھی تو بھلا جوانی میں کیا چیز ہوں گے۔

ایک دفعہ جب وہ کرتہ اتارے رسّی بٹ رہے تھے مجھ کو اُن کی پیٹھ میں بوری کی سیون کا سا اُبھرا ہوا ایک نشان نظر آیا جو سیدھے کھوے کے سرے سے شروع ہو کر بائیں جانب دھوتی میں غائب ہو گیا تھا۔

چند مہینہ قیام میں بے تکلفی ہو جانے کی وجہ سے میں نے پوچھا۔

داؤ صاحب! معاف کیجئے گا، یہ نشان کیسا ہے؟

بولے۔ جوانی میں ہم ڈاکہ مارا کرتے تھے کسی خدا کے پورے نے پیچھے سے تلوار کا ایک ہاتھ جڑ دیا تھا سو ذرا سُتلی سے سی دئے گئے تھے، اُس کا نشان ہے!

(۴)

شہر گوالیار کے وسط میں ایک بزرگ کی خانقاہ ہے۔ جسے "باباکپور کی درگاہ" کہتے ہیں۔ اس درگاہ میں اگلے زمانے سے نوبت نقارہ اور گھنٹہ چلا آتا ہے۔ نقارچی اور گھنٹہ پانڈے مقررہ وقتوں اور خاص موقعوں پر اپنے فرائض انجام دینے پر مامور ہیں۔

موجودہ مہاراجہ صاحب کے جدِّ امجد سر گباشی جیواجی راؤ صاحب کے عہد تک دستور تھا کہ جب کبھی باباکپور کے درشنوں یا کسی اور وجہ سے مہاراج سواری اس طرف سے گزرتی تو بے وقت بھی باباکپور کی نوبت بجا کرتی تھی۔

اس زمانے میں واصل خاں بانکے نہایت آن بان سے ہتھیار دتیا سجائے کمر کسے، چھوٹے بازار کی ایک دکان پر پڑے رہتے تھے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ دوسرے بانکوں کے خلاف واصل خاں صاحب ظالم و جابر ہونے کے بجائے نہایت وضع دار، صادق القول اور بے حد خلیق واقع ہوئے تھے۔

ایک روز یکایک سوار پیادے نمودار ہوئے اور نقیب کی للکار سنائی دی:-

نذرِ دولت، غریب پرور حضورِ معلّیٰ عالیجاہ بہادر مہاراجہ صاحب سیندھیا سلامت!

ہائیں! واصل خاں صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔ پوچھنے لگے بھئی یہ کیا ہے۔

کسی نے جواب دیا۔

شاید مہاراج سواری آ رہی ہے!

بولے۔ ارے! مہاراج سواری آ رہی ہے، اور نوبت نہ جھڑی باباکپور کی ..... وہ شخص کہنے لگا۔

جی ہاں! تعجب تو مجھے بھی ہے سرکاری سواری آنے پر ہمیشہ نوبت جھڑا کرتی تھی میں تو جانوں آج نقارچی وغیرہ کہیں چلے گئے ہوں گے!!

خوب! کہیں چلے گئے ہوں گے۔ میاں وہ تو آٹھوں پہر باری باری وہیں حاضر رہتے ہیں، بھلا جائیں گے کہاں۔ نہ یہ کچھ اور ہی بات ہے ....

اتنے میں ہجوم قریب آ گیا۔ اور عین کان پر نقیب للکارا:-

نذرِ دولت غریب پرور حضورِ معلّیٰ عالیجاہ بہادر مہاراجہ صاحب سیندھیا سلامت!

بس اب تو بانکے کو تاب نہ رہی۔ خنجر کھینچ کر بولا۔

ہائے یہ زمانہ آگیا کہ حضور معلیٰ کی سواری گزرے اور بابا کپور کی نوبت نہ جھڑے، آہ!!

اب جینے کا مزا نہیں، لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ اور غپ سے سینہ میں خنجر گھونپ لیا۔

اِدھر خاں صاحب تیورا کر گرے۔ اُدھر سواری بالکل نزدیک آپہنچی۔ لوگ بگ زخمی کو گھیرے کھڑے تھے۔ مہاراجہ صاحب نے دریافت فرمایا۔

کیوں کیا معاملہ ہے؟

جواب ملا۔

عالیجاہا! یہ واصل خاں بانکے ہیں خلاف دستور آج سواری کے خیر مقدم میں بابا کپور کی نوبت نہ جھڑنے پر انھوں نے کہا:۔

ہائے۔ یہ زمانہ آگیا کہ حضور معلیٰ کی سواری گزرے اور بابا کپور کی نوبت نہ جھڑے، آہ!۔۔۔۔ اب جینے کا مزہ نہیں لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ اور ایک دم سینے میں خنجر اتار لیا۔ اب ان کا دم نکل رہا ہے۔ اور لوگ تماشا دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔

افسوس! مہاراجہ صاحب نے فرمایا۔۔۔۔۔۔۔ زخمی پر حسرت بھری نگاہ ڈالی۔۔۔۔ چندے خاموش رہے، پھر حکم دیا۔

اچھا جہاں تک ہو ان کی اچھی طرح صاحب سنبھال کی جائے۔ دو سوار جا کر ڈاکٹر صاحب کو لائیں۔ نہ جانے بیچارے نے کیا خیال کیا۔ بچ جائے تو ہم کو بہت خوشی ہو!!

اور ایک سراسیمگی کے عالم میں حضور معلیٰ نو محلے کی راہ گورکھی کو روانہ ہو گئے۔ محلات میں پہنچتے ہی دوسرے ڈاکٹر صاحب کو طلب کر کے فرمایا۔

فوراً گوالیار جائیے! ایک بانکے نے چھوٹے بازار میں خنجر گھونپ لیا ہے۔ نہایت غور سے اس کا معالجہ کیجئے!!

جب تک ڈاکٹر صاحب آئیں آئیں واصل خاں بانکے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

(۵)

ایک صاحب تھے حکیم نذیر الدین صاحب امروہوی حکیم وکیم کاہے کے یونہی تھے سونٹھ سونف۔ چورن پھنکی وغیرہ کے عطائی۔ بیچارے علاقہ "مہنج محل" اور ریاست دتیا کے دو چار گاؤں میں دورہ کیا کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر کے دیہاتوں سے کچھ تھوڑا بہت وصول کر لیتے تو کبھی گوالیار کبھی دتیا بھی ہو آتے تھے جس گاؤں میں حکیم صاحب تشریف لے جاتے لوگ باگ دال دلیے سے تواضع کرتے بلکہ حیثیت بموجب کچھ نذرانہ وذرانہ پیش کرنے میں بھی عذر نہ تھا۔ گزشتہ جنگ عظیم کے آخر میں جو تباہ کن انفلوانزا پھیلا اور مری پڑی، تو ہمارے حکیم نذیر الدین صاحب کی فیس معائنہ چار آنے سے لے کر آٹھ آنے تک مقرر ہو گئی تھی چنانچہ اس سلسلے میں صاحب موصوف کے ہاتھوں کوئی پانچ چھ ایک درجن انسانوں کو اس دکھ بھری دنیا کے مخمصوں سے نجات حاصل ہوئی۔ وہ ایک ہی خوراک میں ٹھنڈے ٹھنڈے سدھار گئے۔

دیرینہ نیاز مندی اور وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر نشست و برخاست کی بنا پر بلا خوف تردید عرض کر سکتا ہوں کہ واللہ حکیم صاحب تھے طرفہ

ـــــــ

[۱] شہر لشکر کے وسط مقام "باڑہ" کے محلات جہاں اس زمانے میں راج گھرانا مقیم تھا۔

سمجھ لیں، یہ اور بات ہے کہ آپ کو طلب سے کوئی واسطہ نہ ہو مگر حضرت کی نیک دلی، زہد، لال بجھکڑ قسم کی سادہ لوحی اور اوٹ پٹانگ باتوں پر دیہاتی ضرور لٹو تھے۔

جب آپ چلتے پھرتے اس نواح میں وارد ہوئے اور علاقے کا دورہ کرنے لگے تو کہیں ریاست دتیا کے ایک جاگیری گاؤں بڑون کی طرف بھی جا نکلے، ایک کائستھ لالہ جگن ناتھ صاحب سے ملاقات ہو گئی اور چند پھیروں میں کچھ ایسا رابطہ بڑھا۔ وہ میزان تھی کہ بایدو شاید۔ وہ کائستھ صاحب اکثر اپنے فرزند جانکی پرشاد سے کہا کرتے تھے :۔

دیکھو بیٹا! میرا اچھا ہو جائے تو حکیم جی کو اپنا بڑا بوڑھا سمجھیو!!

خدا کا کرنا۔ ان لالہ جگن ناتھ صاحب کا ہو گیا انتقال، اب بقول تلسی داس ؎

تلسی بانہہ سپوت کی جو سپنے گہہ جائے ‎ ‎ ‎ آپ نبھا دے، اور لوں لڑکن سوں کہہ جائے ‎ ۔

اے تلسی اگر کسی شریف زادے سے خواب میں بھی مصافحہ ہو جائے، تو وہ خود آخر تک نبھا ہے اور بال بچوں کو بھی نباہ کی وصیت کر دے۔

سعادت مندی برخوردار جانکی پرشاد کی، اس نے اپنے والد آنجہانی کی وصیت پر حرف بحرف عمل کیا حکیم صاحب کو اپنا بزرگ ہی گردانا اور ان کا بھی کہیں اور ٹھور ٹھکانا کہاں تھا۔ اسی گھر کے ہو رہے۔ مذہبی اختلافات چھوت چھات کی پابندی کے باوجود باہم کچھ ایسی یگانگت ہوئی کہ حکیم صاحب کوئی غیر نہیں اسی خاندان کے ایک فرد معلوم ہوتے تھے۔

آخر بیچارے کا انحطاط شروع ہوا۔ سرد و گرم عالم سے گزرتے۔ حوادث زمانہ کے تھپیڑے کھاتے گھاٹ کنارے آ لگے۔ ہاتھ پیر میں سکت نہ رہی۔ نوبت بہ نوبت تمام طاقتیں سلب ہوتی گئیں۔ اکثر علیل رہا کرتے تھے ۱۹۳۴ء ۱۹۳۵ء میں بارہا ان سے ملاقات ہوئی حکیم صاحب میں پہلا سا دم خم نہ تھا۔ قصہ مختصر چند روز صاحب فراش رہ کر راہیٔ عدم ہوئے۔

بڑون کے اِنے گِنے مسلمان اسلام کے معمولی مسائل سے نابلد ہیں انہیں کچھ معلومات نہیں بس نام کے ہی مسلمان ہیں پھر بھلا ایک کائستھ غریب کیا جانے۔ ان لوگوں کی کس طرح تجہیز و تکفین ہوتی ہے۔ واللہ اعلم کیوں کر اس نے حکیم صاحب کے گور گڑھے سے سبکدوشی حاصل کی۔

اب فاتحہ نہ درود سوم نہ ختم کرے تو کیا کرے لیکن والد آنجہانی کی وصیت کانوں میں گونج رہی تھی :۔

دیکھو بیٹا! میرا اچھا ہو جائے تو حکیم صاحب کو اپنا بڑا بوڑھا سمجھیو!

نباہ ضروری تھا لہٰذا جانکی پرشاد نے ہندو رسم اور اپنے عقیدے کے مطابق تیرھویں دن ہندو مسلمان جمع کر کے پکی رسوئی کی بھلے آدمیوں کو خوب ڈٹ ڈٹ کر تر مال کھلایا اور حکیم صاحب کی روح کو شانتی پہنچانے کے خیال سے براہمن بھوجن کرا دیئے ......

میرزا فہیم چغتائی

خاموش محبّت

یہ بنگال کی ایک گم نام شاعرہ سربالا دیوی کی نظم کا منظوم ترجمہ ہے :-

سینے میں ہے رقصاں درد سا کیوں
یہ دل ہے مرا کیوں محوِ جنوں ؟
اظہارِ تمنّا کر نہ سکوں
جو دل میں ہے پنہاں کیسے کہوں ؟
امید ہے باعثِ ناکامی
انسان ہے حاصلِ مجبوری !
قسمت کا لکھا ہوتا ہے سدا
کیونکر نہ ہو وہ چاہے جو خدا
آجائے جو تابِ گویائی
جذبات میں بھر دوں دل کی لگی
لیکن یہ کبھی ہونے کا نہیں
ناچار کا کوئی چارا نہیں
بے آب ہیں آنکھیں مدّت سے
محروم ہوں اشک کی صورت سے
آنکھوں کی تنک ظرفی تُف ہے
دریاؤں کی یہ خشکی تُف ہے
اُف ایسے زمانِ مصیبت میں
اُف ایسے دَورِ اذیت میں
یہ موت بھی کام نہیں دیتی
آنے کا نام نہیں لیتی

امید کی کشتی ڈوب گئی
اظہار کی طاقت سلب ہوئی
یہ کس کی نظر نے لوٹ لیا
یہ کس نے مجھے ناکام کیا
لیکن یہ آہ و بکا کیسی ؟
ہے اس سے تو عشق کی رسوائی
ایسا نہ ہو بھڑکے دل کی لگی
بہتر ہے شعارِ خاموشی

مترجمہ جگر قریشی لدھیانوی

سیاسی اصطلاحات

۱- AMNESTY ایمنسٹی۔ یہ لفظ دراصل جرمن زبان کے لفظ A-MANESTOS ایمنسٹوس سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں بھلا دینا۔ لہٰذا سیاسی اصطلاح میں حکومت کے اس فعل کو کہا جاتا ہے کہ سیاسی قیدیوں کی عام معافی کا اعلان کر دیا جائے اور ایسے مجرموں کے قتل یا ان کو سزا دینے سے باز رکھا جائے۔

۲- AUTOCRACY یہ لفظ بھی جرمن اصل سے تعلق رکھتا ہے جو دو مفرد الفاظ آٹوس AUTOS یعنی ذاتی اور کراتوس KRATOS یعنی قوت سے مرکب ہے۔ انگریزی میں اس کا دوسرا نام DESPOTISM بھی ہے۔ اس لفظ کے اصطلاحی معنی بھی وہی ہیں جو لغوی ہیں یعنی یہ کہ ایک ایسا طریقۂ حکومت جس میں بادشاہ بالکل خود مختار ہو۔ اور اس کی سیاسی قوت غیر محدود ہو مختصر یہ کہ اس کے کسی حکم کی مخالفت یا اس پر کسی قسم کا اعتراض نہ ہو سکے۔ اس حکومت کی بہترین مثال ایران اور افغانستان ہو سکتی ہے۔

۳- BICAMERAL SYSTEM بائی کیمیرل سسٹم اُس طریقۂ حکومت کو کہتے ہیں جو دو ایوانوں پر مشتمل ہو۔ اس طریقۂ حکومت میں قانون سازی اور اس کے نفاذ کے احکام جاری کرنے کے لئے دونوں ایوانوں کا متفق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس حکومت کی مثال انگلستان ہے۔ جہاں دو ایوان یعنی ایوان عام یا دارالعوام اور ایوان خاص یا دارالامرا موجود ہیں۔

۴- BLOC - بلوک اس کی اصل فرانسیسی ہے جس کے معنی ایک جماعت یا مجمع کے ہیں۔ اصطلاح میں قانون ساز جماعت کے ارکان یا مختلف جماعتوں کے ایسے سیاسی نمایندوں کے گروہ کو کہا جاتا ہے۔ جو کسی خاص مسلک یا کسی وزارت کی تائید کرتا ہو۔

۵- BOLSHEVISM - بولشیوزم ہر شخص جانتا ہے کہ یہ لفظ ٹھیٹ روسی زبان کا ہے۔ یہ اصطلاح اس اصول کی وضاحت کرتی ہے کہ مالدار اور غریب طبقے میں فطری طور پر دشمنی کی خلیج حائل ہے۔ اور اس امر پر زور دیتی ہے کہ ان تمام جماعتوں کے خاتمے کے لئے آپس میں جنگ ضروری ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر سب مل کر ایک جماعت ہو جائیں۔ یہی وہ جماعت ہو گی جو آگے چل کر قوم کی فلاح و بہبود کے لئے اشتراکی اصولوں پر حکومت کرے گی۔

۶- BOLSHEVIK - بولشیوک۔ روس کی انتہا پسند اشتراکی جماعت کے رکن کو اس نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہی وہ جماعت ہے جس نے ۱۹۱۷ء میں علم بغاوت بلند کیا اور اپنی غیر معمولی قوت کے بل پر شاہی خاندان کو قتل کر دیا۔ اسی بغاوت کے بعد روس میں ایک نئے طریقے کی حکومت قائم ہوئی۔ جو دنیا میں اپنی طرز کی ایک ہی حکومت ہے۔ اس طریقۂ حکومت میں عام مساوات کے خیال کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے اور امیر و غریب کے سوال کو یکسر مٹا دیا گیا ہے۔

۷- BUREAUCRACY بیوروکریسی ایک ایسی حکومت جو وسیع پیمانے پر مختلف محکموں پر مشتمل ہو۔ گو بظاہر یہ طریقہ کار آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں

عملی دشواریاں بہت زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصول بے ڈھنگے پن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس طریقہ حکومت کی بہت سی [illegible] خرابیاں اس کی سطحی کثرت پرستی اور ناقص طریقہ کار ہے۔ اس قسم کی حکومت میں بھلائی کا پہلو بہت کم نمایاں رہتا ہے۔

۸- کاکس CAUCUS کسی سیاسی جماعت یا ادارے کے ارکان کی طرف سے ایک ایسے جلسے یا کانفرنس کا منعقد کیا جانا جو کسی سیاسی کام یا کسی اور سیاسی مقابلہ کے سلسلے میں امیدوار کے انتخاب پر غور و فکر کرنے کے لئے بنائی گئی ہو۔

۹- CIVIL DISOBEDIENCE سول ڈس اوبی ڈینس یا سول نافرمانی بغیر غیظ و غضب یا بلا تشدد کے حکومت کے ساتھ اشتراک عمل کرنے یا اس کے احکام کی تعمیل سے انکار کرنا۔ ہندوستان کا ہر شخص سابقہ بیس سالہ دور میں اس تحریک سے خوب واقف ہو چکا ہے۔

۱۰- COMMINTERN کمن ٹرن۔ یہ لفظ دو انگریزی الفاظ کمیونسٹ اور انٹرنیشنل کا مخفف مرکب ہے جس کے معنی قومی اشتراکیت کے ہیں۔ اور یہ تمام دنیا کی اشتراکی تحریک پر حاوی ہے۔ اس ادارہ کا صدر مرکز شہر ماسکو واقع ملک روس ہے۔

۱۱- CONTRABAND کونٹرے بینڈ۔ اس لفظ کے لغوی معنی خلاف قانون یا ممنوع کے ہیں لیکن سیاسی اصطلاح میں ایسے فعل کو کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں ایک غیر جانب دار ملک سے کسی برسرپیکار ملک کو فوجی اور بحری استعمال کے لئے اشیاء، ساز و سامان یا اسلحہ جات روانہ کئے جائیں اور سلطنتی قانون کے تحت ایسی چیزوں کو دشمن کے ملک میں یا بین قومی سمندروں میں روک لیا جائے۔ لہذا اس فعل کو کونٹرے بینڈ کہا جائے گا۔

۱۲- CONSCRIPTION کونسکرپشن زمانہ جنگ میں بری یا بحری مقاصد کے لئے جبری بھرتی کو کہا جاتا ہے۔

۱۳- COMMUNISM کمیونزم انقلابی سوشلزم کا دوسرا نام ہے۔ تدریجی ترقی یا اصلاح اور ترقی پذیر سمجھوتہ کے مرادف ہے نیز یہ تحریک اصلاحی سوشلزم کے بھی خلاف ہے۔ اصلاحی سوشلزم پارلیمنٹی اداروں کو قبول کرتے ہوئے اس بات کا حامی ہے کہ ہر شعبے میں تدریجی طور پر تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں اور اس قسم کی اصلاح سے ترقی کے دروازے کھول دئیے جائیں۔ تشدد آمیز سوشلزم کارل مارکس کا نظریہ ہے جو ۱۹۱۷ء کے مشہور عالم روسی یا بولشوک بغاوت کی شکل میں رونما ہوا۔

۱۴- COUPD'ETAT کو دے تا فرانسیسی الفاظ کو اور دے تا سے مرکب ہے جس کے معنی حکومتی ضرب کے ہیں۔ اور اصطلاح میں فوجی قوت کے ذریعے حکومت کی اچانک تبدیلی کو کہا جاتا ہے جیسا کہ ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو فرانس کے شہنشاہ لوئی نپولین نے اپنی قوت کے زور سے ملک کے دستور کو یکایک بدل دیا تھا۔

۱۵- COMMUNIST PARTY کمیونسٹ پارٹی یا اشتراکی جماعت ایک ایسے ادارے کا نام ہے جو کارل مارکس کے اصولوں کا پابند ہو۔ اس مرکزی ادارے سے دنیا کے متعدد ہم خیال ادارے ملحق ہیں۔ اسی مرکزی ادارے کا دوسرا نام کمیونسٹ انٹرنیشنل یا کمن ٹرن ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔

۱۶- DEMOCRACY ڈیموکریسی لنکن کے الفاظ میں اس طریقہ حکومت کا نام ہے کہ "عوام کی حکومت عوام کی جانب سے اور عوام ہی کے لئے ہو"۔ حکومت کا یہ اصول شخصی حکومت سے بالکل مختلف ہے۔

۱۷- EXTRA TERRITORIALITY حدود سلطنت میں رہنے کے باوجود بعض مقامات یا [illegible]

مستثنیات سے استفادہ کرنے کو کہتے ہیں مثلاً ریاست حیدرآباد میں قانون آبکاری کے خلاف شراب تیار کر لینے کی بعض خاندانوں کو اجازت ہے اسی طرح سے بعض اقسام قانون ملک سے بری ہیں۔ یا ایک سکندرآباد کا علاقہ مملکت میں رہنے کے باوجود قانون ملک سے بری ہے۔

۱۸- EMBARGO امبارگو حکومت کے ایک ایسے قانون کا نام ہے جس کی رو سے جہاز بندرگاہ چھوڑ کر بغیر اجازت کے نہیں جا سکتے۔

۱۹- EXTRADITION اکسٹرا ڈیشن۔ ایک حکومت یا ملک کا کسی دوسری حکومت یا ملک کو مجرمین کا حوالے کر دینا۔

۲۰- FASCIST فاسسٹ۔ اٹلی کی قومی جماعت کا نام ہے۔

۲۱- FASCISM فاسزم یا فاشیت۔ اٹلی میں مسولینی کی لیڈری میں ایک سیاسی قومی تحریک شروع ہوئی تھی جو اس کی سرکردگی میں اب تک جاری ہے۔ اس تحریک کے مقاصد اشتراکیت کے بالکل خلاف ہیں۔

۲۲- PROTOCOL پروٹوکول کسی سیاسی دستاویز کا وہ مسودہ جس کے ذریعے کسی سیاسی معاملہ کی ابتدا ہوئی ہو۔

۲۳- POURPARLER پورپارلے مختلف معاملات جماعتوں یا ممالک کے نمایندوں کی وہ غیر رسمی ابتدائی بات چیت جو آپس میں کسی خاص مسئلے کے تصفیہ کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

۲۴- FEDERALISM فیڈریلزم۔ وفاقیت۔ ایک ایسی طرز کی حکومت کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے اسٹیٹ کی سیاسی قوتوں کو دستور ملک کے مطابق قومی حکومت اور مقامی حکومتوں میں منقسم کر دیا جاتا ہے۔ ایسی وفاقی حکومت کے اجزائے سیاسی کو اسٹیٹ اور صوبہ وغیرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۲۵ پکٹنگ PICKETING جو کسی کسی دکان یا کاروباری بازار کے مقابل اس مقصد اور کوشش کے ساتھ پھرتے رہنا کہ عوام اس خاص محل کی سرپرستی نہ کریں یا یہ کہ خود دکان دار ایسے معاملے سے باز رہیں۔

۲۶- WHIP وہپ کسی سیاسی جماعت کے نمایندے کو کہتے ہیں جس کا کام اپنی جماعت کے ارکان پر پورا پورا قابو رکھنا اس کی رائیں حاصل کرنا اور جماعت کی پالیسی کو قائم رکھنے میں مدد دینا ہوتا ہے۔

۲۷- REPUBLIC ری پبلک یا جمہوریت ایک سیاسی برادری کا نام ہے جس کا کوئی خودمختار بادشاہ شہزادہ یا شہنشاہ نہیں ہوتا۔ بلکہ حکومت کا صدر ہوا کرتا ہے۔ اس وقت ممالک متحدہ امریکہ اس کی بہترین مثال ہے۔

۲۸- LITTLE ENTENTE لٹل آں تنت چیکوسلواکیا۔ یوگوسلاویا اور رومانیا کو کہا جاتا ہے۔ یہ تینوں چھوٹی ریاستیں جزیرہ نما بلقان میں واقع ہیں۔ ان کل چیکوسلواکیا جرمنی کی سیادت میں ہے۔

۲۹- NATIONALISATION نیشنلائزیشن۔ تجارتی اور صنعتی خانگی اداروں کو معاوضہ کے ساتھ یا بلا معاوضہ حکومت کی نگرانی میں لے لینا۔

۳۰- [illegible] نازی جرمنی کی قومی سیاسی جماعت جو ہر اڈولف ہٹلر کی بنائی ہوئی ہے۔ اور اب تک ہٹلر ہی کی لیڈری میں کام کر رہی ہے جرمنی کی

حالیہ ترقی اسی جماعت کی رہین منت ہے۔

۳۱۔ NEUTRALITY نیوٹریلیٹی یا غیر جانب داری۔ دو اقوام یا ممالک کے درمیان جنگ ہوتی ہے تو اس کا امکان ہے کہ کوئی ایک ملک یا بعض ممالک کسی ایک شریک جنگ قوم کا ساتھ دیں مثلاً موجودہ جنگ میں (جو ابتدا میں جرمنی اور پولینڈ کے مابین ہوئی) اس وقت جرمنی اور روس ایک طرف تھے اور دوسری جانب برطانیہ اور فرانس کی پوری ہمدردی پولینڈ کے ساتھ تھی۔ اٹلی اس وقت اگرچہ شریک جنگ نہیں تھا تاہم وہ خاموش ہو رہا مگر بعض یورپی ممالک یا سلطنتوں نے کھلم کھلا اس بات کا اعلان کر دیا کہ ان کو شریک جنگ کسی جماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یا جرمنی اور فرانس کی لڑائی کے موقع پر امریکہ نے اعلان کر دیا کہ وہ جنگ میں کسی قوم کی طرف سے حصہ نہیں لے گا۔ لیکن ہر دو برسر پیکار اقوام میں سے جو بھی اس سے معاملت کرے اس کو قیمتاً ہر چیز فروخت کرنے کے لئے تیار ہے بس کسی ملک کے ایسے ارادے یا اعلان کو غیر جانب داری کہا جاتا ہے۔

۳۲۔ PROPORTIONOL REPRESENTATION متناسب نمایندگی (پروپورشنل ری پریزنٹیشن) انتخابات کے دوران میں اس طریقہ کار کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ رائیں اس طرح گنی جاتی ہیں کہ منتخب جماعت میں ہر فرقہ یا جماعت کی نمایندگی کی قوت ایک خاص تناسب کے ساتھ قائم رہے۔

۳۳۔ PLEBISCITE پلی بی سائیٹ کسی ملک کے جملہ افراد کی مرضی کے اظہار کا نام ہے۔ اور یہ عمل اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی طے شدہ مسئلہ کی منظوری یا غیر منظوری کے متعلق عوام کی رائے معلوم کرنی ہو۔ یہ وقت صرف اسی وقت پیش آتی ہے جب کسی جماعت کے نمایندوں کو اس فیصلے سے شدت کے ساتھ اختلاف ہو۔

۳۴۔ PUBLIC UTILITIES مفاد عامہ۔ برقی روشنی گیس ٹیلیفون بس موٹر سروس یا اسی قسم کی مختلف خدمات جن سے سب افراد مساویانہ طور پر مستفید ہوتے ہوں امور مفاد عامہ کہلاتے ہیں۔

۳۵۔ RACKETTER راکٹر کسی شخص یا ادارے کا کسی تجارتی یا صنعتی ادارے کو اس بات کی دھمکیاں دے کر رقمیں حاصل کرتے رہنا کہ اگر مطلوبہ رقم نہ دی جائے تو وہ ان کے کاروبار میں مداخلت کرے گا۔

۳۶۔ REPARATIONS ریپاریشنز جنگی نقصانات کو کہتے ہیں۔

۳۷۔ REFERANDUM کسی مجوزہ قانون کا بعینہ عوام کے سامنے فیصلے کی غرض سے پیش کیا جانا۔

۳۸۔ ROME BERLIN AXIS روم برلن ایکسز یا روم برلن محور یہ ایک اصطلاح ہے جو امور خارجہ کی حد تک اطالوی برلن پیان کو ظاہر کرتی ہے۔ گو یہ معاہدہ بہت پہلے عمل میں آچکا تھا لیکن اس کو استحکام اس وقت حاصل ہوا جب مسولینی ۱۹۳۷ء میں برلن گیا۔ روما برلن محور کا معاہدہ دراصل اطالوی حبشی جنگ کا نتیجہ ہے جب کہ اٹلی کے خلاف حبشہ کو معاشی امداد دینے سے جرمنی نے صریحاً انکار کر دیا تھا یورپ کی متعدد حکومتوں نے حبشہ کی مالی اور معاشی امداد کی تھی۔

۳۹۔ SABOTAGE سباتاژ کسی کارخانے کے مزدوروں کا جھگڑے کے دوران میں نیتی کے ساتھ کارخانہ اور اس کے مال و اسباب کو [illegible]

پہنچانا۔

۴۰- SANCTIONS مجلس اقوام کے رہنمی نامے کی دفعات ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۶ اور خصوصاً ۱۶ میں اس لفظ کی صراحت اس طرح کی گئی ہے کہ اقوام کی وہ تین جو جنگ کے زمانے میں خود کر سکتی ہیں۔ ان قوتوں میں کسی برسرِ پیکار قوم سے تجارت کرنے یا اس کو قرض دینے سے انکار کرنا بھی شامل ہے۔

۴۱- SELF DETERMIN ATION سلف ڈیٹرمینیشن۔ اس اصول کا نام ہے جس کے ذریعہ ہر ایک شخص یا کوئی قوم اپنی آزادی کے مسئلہ کا تصفیہ بطور خود کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی حق حاصل ہوتا ہے کہ اپنے طریقۂ حکمرانی اور سیاسی قسمت کے فیصلہ پر بھی خود غور کرے

۴۲- SOCIALISM سوشلزم۔ ایک ایسے اصول کا نام ہے جس کے ذریعے زمین یا اور کسی پیداوار کو مالک کی ملکیت سے خارج کر کے حکومت کی نگرانی اور اختیار میں دے دیا جائے۔

۴۳- SOVIET سوویٹ۔ روس کے زبردست علاقے کی جمہوریتیں جن پر بحیثیت ڈکٹیٹر مہاراج اسٹالن کا راج ہے سوویٹس کہلاتی ہیں۔ سوویٹ ایک روسی لفظ ہے جس کے معنی کونسل کے ہیں۔ یہ لفظ ۱۹۰۵ء کے انقلاب روس کے بعد مقبول عام ہوا۔ اس انقلاب میں یہ اسکیم تھی کہ حکومت میں ایک نمایندہ جماعت کا اصول قائم کیا جائے اور ایسی جماعت کے انتخاب کے لیے رایوں کا حق صرف مزدوروں کو اور سپاہیوں کو دیا جائے۔ سوویٹ طریقۂ حکومت اس اصول پر مبنی ہے کہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں یا کونسلوں کے نمایندے بڑی کونسلوں میں شرکت کے لیے بھیجے جاتے ہیں اور اسی طرح ہر جماعت یا کونسل درجہ بدرجہ بڑی کونسلوں میں اپنے نمایندے روانہ کرتی ہے۔ یہاں تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک کہ پورے صوبہ کی نمایندگی نہ ہو جائے۔ بالآخر یہ نمایندے کانگرس یا سب سے بڑی حکومت کو بھیجے جاتے ہیں۔

۴۴- STATUTE OF WESTMINSTER ۲۴ نومبر ۱۹۳۱ء کو دار العوام نے پاس کیا تھا جس کے ذریعے ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۰ء کی سیریل کانفرنسوں کی توثیق کا باقاعدہ طور پر اعلان کیا گیا تھا۔ ان کانفرنسوں میں حکومت متحدہ برطانیہ عظمیٰ، شمالی آئرلینڈ، مملکت کینیڈا، آسٹریلیا، یونین آف جنوبی افریقہ، آئرش فری اسٹیٹ اور نیوفونڈلینڈ کے نمائندے اور وزرائے اعظم شریک تھے۔ ۱۹۲۶ء کی کانفرنس نے لفظ ڈومینین کی یہ تعریف کی کہ مختلف جماعتیں یا اقوام جو برطانوی راج میں شامل ہوں اور مرتبہ میں مساویانہ حیثیت رکھتی ہوں۔ اور گھریلو یا باہر کے معاملات میں کسی عنوان بھی ایک دوسرے کی محکوم نہ ہوں لیکن سب کے سب ایک عام اتحادی اصول کے تحت برطانوی دولتِ عالیہ میں شامل ہیں۔

۴۵- MORATORIU M موراٹوریم ایک ایسا دور جس میں نہ تو کسی قسم کا کاروبار ہی انجام دیا جاتا ہے اور نہ قرض وغیرہ جاری یا ادا کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کے عمل کا اعلان حکومت کی جانب سے صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کہ مالیاتی پستی محسوس کی جاتی ہو۔

۴۶- RIGHT AND LEFT رائٹ اینڈ لیفٹ قانون ساز اداروں میں قدامت پرست یا کٹر قسم کی جماعتوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ اسپیکر کی سیدھی جانب بیٹھتی ہیں اور لبرل جماعتیں بائیں جانب۔ اس لیے یہ اصطلاحات قدامت پسند اور لبرل کے لیے سیاسی معاملات میں ان کا نشانِ امتیاز بن گئی ہیں۔ اسی طرح سنٹر کی اصطلاح درمیانی یا بین بین خیالات کی جماعت کے لیے مستعمل ہے۔

۴۷- SYNDICALISM سنڈیکیلزم یہی تحریک کا نام ہے جس کے ذریعے پیداوار اور اس کی تقسیم کو صنعتی کارکنوں کے قبضہ میں منتقل کیا جاتا ہے

GESTA[...] گسٹاپو۔ یہ لفظ دو جرمن الفاظ کے مرکب کا مخفف ہے GEHEIME [...] جس کے معنی ہیں خفیہ [...]

STAATSP[...] اسٹاٹ پولزائی یعنی اسٹیٹ پولیس۔ یہ عام ملکی پولیس سے بالکل مختلف ہے GENDARMERIE [...]

CRIMINAL P[...] کرمنل پولیس وغیرہ سب کے سب تحت ہیں لیکن گسٹاپو کو ان سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ گسٹاپو کا سب سے
[...] اقربول کے خلاف مقدمات کا چالان کرنا اصل اصول کے خلاف تنقید و تبصرہ کرنے والوں کو دریافت کرنا ہوتا ہے جرمنی کی یہی ایک
ظالم فوج ہے۔ یہ فوج جرمنی کی جاسوسی کا مکمل نظام ہے جس کے باعث ہر گھر کا ہر فرد لرزتا رہتا ہے۔

BLACKO[UT] بلیک آوٹ۔ یہ ایک قدیم لفظ ہے جس کا اصل مفہوم تھیٹر کے اسٹیج کی روشنی کو یکدم گل کر دینا ہے۔ اور آج کل اسی مفہوم
[...]ن کے سلسلے میں روشنی گل کر دینے یا روشنی کو سیاہ پردوں کے ذریعے چھپا دینے کو کہتے ہیں۔

PRIZE COU[RT] پرائز کورٹ۔ ایک ایسی عدالت کا نام ہے جس کا قیام جنگ کے زمانے میں محض اس غرض سے عمل میں آتا ہے کہ
[...] تصفیہ کرے کہ بحریہ نے کسی جہاز یا سامان کی لدی ہوئی کشتیوں کو جو گرفتار کیا ہے۔ آیا وہ عمل مطابق قانون ہے یا نہیں اگر یہ عدالت
فیصلہ کر دے کہ سامان یا جہاز جو گرفتار کر لیا گیا ہے وہ در اصل دشمن کی ملک سے ہے یا یہ کہ غیر جانب دار ملک کا ہے لیکن ممنوعہ ہے۔ تو
[...]ے دیا جاتا ہے۔ اور جو آمدنی ہو گی ختم جنگ پر متحدہ بیڑے میں تقسیم کر دی جائے گی۔

U-BO[AT] یو بوٹ۔ بہت ہی عام لفظ ہے سب میرین یا آب دوز کے لئے جرمن لفظ UNTERSEE BOOT انٹرسی بوٹ ہے
[...]سمندر کی تہ والی کشتی کے ہیں۔ اسی لئے UNTERSEE یا انڈرسی UNDERSEA کا مخفف حرف U قرار دیا گیا ہے اور BOOT
[...]تعمل ہے۔

MANDATES COMMISSI[ON] مینڈیٹس کمیشن۔ گیارہ ارکان کی یہ ایک مستقل جماعت ہے۔ اس میں اکثریت ان نمایندوں کو
[...]ن کے ملک محکوم یا زیر نگرانی ہوں۔ یہ جماعت ان محکوم ممالک کی سالانہ روداروں کی جانچ پڑتال کرتی اور ان کے متعلق لیگ کونسل کو ضروری
[...] ہے۔ اگر ایسے ممالک کی رعایا کا کوئی مظلوم شخص فریادی ہو تو اس جماعت کا فرض ہے کہ وہ اس شخص کی درخواست کو لیگ تک پہنچا دے،

INDIRECT TAXATI[ON] ان ڈائرکٹ ٹیکسیشن۔ ٹیکس اشیا پر عائد کیا جاتا ہے نہ کہ اشخاص پر۔ وہ اس طرح کہ ہر وہ شخص جو
[...] ہے در اصل وہ ساتھ ہی ٹیکس بھی ادا کرتا ہے یعنی کسی شے کی قیمت خرید میں اس کا محصول بھی شامل ہے جو تاجر نے حاصل کرتے وقت ادا
[...] طریقہ ادائی کو بالواسطہ محصول کہا جاتا ہے۔ ایسے ٹیکس عائد کرنے کے دو اہم ذرائع کروڑ گیری اور چنگی ہیں۔

RECONNAISSAN[CE] ری کنائے سنس۔ یہ لفظ ان معنی میں مستعمل ہے کہ کسی دشمن کے ملک کی طبعی اور جغرافی حالت [...] یا اس
[...]منی یا اس کی فوجوں کی نقل و حرکت کو معلوم کرنے کی غرض سے فوج کا ایک دستہ یا ہوائی جہاز مقرر کیا جائے جو صرف اس خاص کام
[...]تا رہے۔

CAMOUFLAG[E] کیموفلاژ۔ یہ لفظ صرف جنگ سے مخصوص ہے یعنی یہ کہ جنگ کے زمانے میں سپاہیوں [...] سامان یا [...]

ڈپو کو ایک خاص طریقے سے چھپا تا فن میں شامل ہے۔ سابقہ جنگِ عظیم اور حالیہ جنگ میں بھی جنگ سے متعلق ہر چیز کو اس ڈھب سے چھپایا جاتا ہے کہ دشمن اصل شے کا پتہ نہیں چلا سکتا۔

۵۶- MILITARY ATTACHE ملٹری اٹاشی۔ جنگ کے زمانے میں غیر جانبدار حکومتیں کسی ایک فریقِ جنگ کے پاس اپنے عہدہ دار محض اس غرض سے بھیجتی ہیں کہ وہ جنگ کی صحیح خبریں اپنے ملک کو بھیج سکیں۔

۵۷- BLOCKADE بلاکیڈ۔ قانون بین قومی کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ دشمن کے ملک سے سامان کی برآمد اور درآمد کو روک دیا جائے۔ سمندری بلاکیڈ کے سلسلے میں غیر جانبدار ممالک کو سخت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اگر ان کے جہاز کسی بلاکیڈ کئے ہوئے ملک کو پہنچنے کی کوشش کریں تو یہ جہاز اور ان پر کا پورا سامان بلاکیڈ کرنے والی قوت کی جانب سے ضبط کر دیا جاتا ہے۔

۵۸- PROFITEERING اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ قومی معاشی پستی کے زمانے میں صنعت و حرفت۔ تجارت۔ اشیاء کی خرید و فروخت اور ان کی تقسیم کے سلسلے میں غیر جائز طریقے پر قیمتوں میں ناروا اضافہ کر کے فائدہ اٹھانا۔

۵۹- HABEAS CORPUS ہیبیس کارپس ایک ایسی تحریر جو کسی عدالتِ مجاز کی جانب سے جاری کی جاتی ہو۔ جس شخص کے نام یہ تحریر جاری کی گئی ہو اس کو اس بات کا حکم دیا جاتا ہے کہ مطلوبہ شخص کو یا اس کے جسم کو جس کو حراست میں رکھا گیا ہو عدالت میں پیش کیا جائے۔ یہ لفظ دو لاطینی الفاظ ہابیرے HABERE بمعنی رکھنا اور کارپس CORPUS بمعنی جسم سے مرکب ہے۔ گویا جسم کا رکھنا یعنی اپنی تحویل یا نگرانی میں رکھنا۔ ایسا حکم خاص طور پر کسی جیلر کے نام دیا جاتا ہے جو عموماً مجرموں یا ملزموں کو حراست میں رکھتا ہے۔ اگر وہ شخص جس کے نام ایسا حکم جاری کیا گیا ہو قیدی کی ذات کو عدالت میں حسبِ ہدایت پیش کرنے سے قاصر رہے تو تحقیرِ عدالت کی علت میں اس شخص پر عدالت میں مقدمہ چلایا جا کر سخت سزا تجویز کی جاتی ہے۔

۶۰ FUEHRER فیوہرر۔ اس جرمن لفظ کے معنی سردار۔ لیڈر یا گائیڈ کے ہیں جرمنی میں یہ خطاب فخر قوم ولف ہٹلر ڈکٹیٹر جرمنی کو دیا گیا ہے

۶۱- PROHIBITION پروہبیشن۔ عام لفظ ہے حکومت کا وہ حکم جو مسکرات کی فروخت کے متعلق جاری کیا جائے لیکن اس امتناعی قانون میں اتنی لچک ضرور رہتی ہے کہ ایسی نشی اشیاء ادویات کے استعمال یا مذہبی ضروریات کے لئے حسبِ ہدایت فروخت کی جا سکتی ہیں۔

۶۲- TARIFF ٹیرف یہ لفظ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کسی ملک میں جب بیرون ملک سے اشیاء درآمد کی جاتی ہیں تو ان پر ایک خاص تناسب کے ساتھ محصول عائد کیا جاتا ہے اسی متناسب محصول کا نام ٹیرف ہے۔

۶۳- OSLO POWERS اوسلو پاورز۔ ان میں ہالینڈ۔ بلجیم۔ لکزمبرگ۔ فن لینڈ۔ ڈنمارک۔ ناروے اور سویڈن شامل ہیں۔ چونکہ ناروے کے پایۂ تخت اوسلو میں ان تمام ممالک کی ایک اہم کانفرنس ہوئی تھی۔ اس لئے اس متحدہ جماعت کا نام اوسلو پاورز پڑ گیا۔

جی۔ ایم خان

۲ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء

آج میں ذرا دیر میں اٹھا، پھر بھی دو ایک گھنٹے کام کر لیتا اگر اسمٰعیل نہ آدھمکتا۔ میں آغا سے ملنے گیا۔ لیکن وہ کہیں باہر چلا گیا تھا۔

میں نے ماؤنٹ رائل میں لنچ کھایا۔ ممتاز کے ساتھ میں "سکواش" کھیلا اور اسے ہرایا۔ ۔۔۔۔۔۴ میرے چہرے اور اور پیشانی پر ممتاز کے ریکٹ سے سخت چوٹ آئی۔

چائے میں نے نہیں پی لیکن اسمٰعیل کے ساتھ ہنگیریئن طعام گاہ میں شام کا نہایت نفیس کھانا کھایا اور اس کے بعد ہم سینما دیکھنے چلے گئے۔ ایک بالکل معمولی سی تصویر کے ساتھ ایک نہایت معمولی سا دن ختم ہو گیا۔

میں نے ذرہ برابر بھی کام نہ کیا۔ یہ سستی اب محض مذاق کی حد سے بڑھتی جاتی ہے۔ بہتر ہے کہ کل سے میں دس دن خوب جی لگا کے کام کروں۔

سوا ب سپین میں فاشسٹوں کو فاش شکستیں ہو رہی ہیں جمہوریئے بھی کیسے باکمال لوگ ہیں۔ اور کیسے وہ تین سال تک جان توڑ کر لڑے اور جرمنی اور اٹلی کے متحدہ فوجی دماغوں کی روک تھام کرتے رہے۔ اس پر مجھے حیرت ہوتی ہے اور اس میں یورپ کے لئے مجھے امید کی ایک چنگاری نظر آتی ہے کیونکہ یہ چیزیں کبھی فنا نہیں ہو سکتیں، اپنے وطن کی محبت اور آزادی اور حریت اور خوشی جو پس جاتی ہیں جب بھی کوئی ملک شہنشاہیت کا شکار ہو جائے۔ ممکن ہے کہ سپین اور آزادی کی راہ میں لڑنے والے اس کے بہادر جنگ جو اب بھی دنیا کو فاشیت کے مصائب سے بچا لیں۔ میں اس کے لئے دعا کرتا ہوں۔

(ایک بجے شب)

(ترجمہ از ب)

اصغر بشیر

مطبوعات

ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن کی کتابیں

"ادارۂ ادبیاتِ اُردو" کے قیام کو بہت عرصہ نہیں گزرا۔ لیکن اس قلیل مدت میں اس ادارے کی طرف سے بہت اچھی اچھی اور بلند پایہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ذیل میں چند کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سرگزشتِ ادارۂ ادبیاتِ اُردو:۔ تین سو صفحات سے زاید کی نفیس چھپی ہوئی مجلد و مصور کتاب ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی سرگرمیوں کا نہایت روشن مرقع ہے۔ اس کتاب میں ادارۂ ادبیات کے مختلف شعبوں اور مختلف کارکنوں کے متعلق دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوانانِ دکن کا یہ ادارہ کتنا منظم اور بلند پایہ ہے۔ یہاں ادارہ کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے نقل کی جاتی ہے۔ ادارۂ ادبیات کے ماہوار رسالے "سب رس" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"سب رس کا نام ہی نام جب تک سنتا رہا معنی کچھ سمجھ میں نہ آئے۔ ایک آدھ سے پوچھا کچھا بھی مشکل حل نہ ہوئی جب سب رس خود ہی دیکھنے میں آیا تو معنی کا راز کھل رہا "سب" یعنی کل کا کل سارے کا سارا "رس ہی رس"!۔ واہ کیا مٹھاس ہے اور کیا لطافت، کیا ذائقہ ہے اور کیا حلاوت!

آنکھیں اب کھلیں۔ ادارۂ ادبیات کی مطبوعات لگیں ایک ایک کرکے وصول ہونے، نزول کرنے، آج ایک پیکٹ آیا اور کل دوسرا، اور پرسوں تیسرا، لے لیجئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انبار لگ گیا کتابوں کا، رسالوں کا، مقالوں کا، تاریخ پر، تنقید پر، علوم پر، فنون پر، صنعتوں پر، سائنس کی حکمتوں پر، ادب پر، خلاصہ یہ کہ سب پر! یا الٰہی یہ کوئی ادبی ادارہ ہے کہ کوئی مشینی کارخانہ کہ جب دیکھئے دُھلی ڈھلائی، چھپی چھپائی کتابیں دھڑا دھڑ نکلتی چلی آرہی ہیں۔

کون کہتا ہے کہ قوم کے نوجوان سب کے سب بے عمل ہی ہوتے ہیں کم از کم اس ادارے کے تو غریب کارکنوں پر ہمت اور سرگرمی اور جوشِ عمل ہے کہ پھٹا پڑتا ہے۔ اللہ اس کو قائم رکھے اور ہم لوگوں کو توفیق اس کی عطا ہو کہ تائید نہ کرسکیں جب بھی یہ تو نہ ہو کہ اس کی تخریب کے درپے ہو جائیں"۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی سرگزشت پڑھنے کے قابل ہے اور حوصلہ افزائی اور تقلید کے قابل بھی ہے۔ اہلِ اُردو کو ایسے ادارہ کی دل کھول کر سرپرستی کرنی چاہیئے۔ اس کتاب کی قیمت صرف ۲ روپے۔

شعرائے عثمانیہ:۔ جامعہ عثمانیہ کے چھبیس[26] نوجوان شعراء کے دلآویز کلام کا دلچسپ انتخاب۔ بڑی تقطیع حجم ۱۴۴ صفحات۔ مجلد۔ نفیس کتابت و کاغذ۔ قیمت عمر

رباعیاتِ جذب:۔ جناب محمد رزاق صاحب جذب وکیل عالم پوری کی رباعیات کا مجموعہ۔ دیباچہ حضرت ماہر القادری نے لکھا ہے۔ زیادہ تر

نصیحت آموز اور اخلاقی مضامین ہیں مدارس کے کتب خانوں کے لئے بھی بہت موزوں ہے صفحات ۴۰۔ قیمت ۱۲؍

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم:۔ میمون صاحب ایم اے نے یہ کتاب [illegible] سے لکھی ہے سنہ ۱۸۰۰ء سے لیکر موجودہ دور تک کے تراجم اور مترجموں کا خاصا جامع ذکر ہے۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۱۲؍

مکتوباتِ شاد عظیم آبادی:۔ مرتبہ جناب محی الدین صاحب قادری زور۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ یہ سب خطوط بجز ایک کے سید ہمایوں مرزا مرحوم بیرسٹر حیدرآباد دکن یا ان کی بیگم صاحبہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا کے نام لکھے گئے ہیں جو دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ چھوٹی تقطیع حجم ۳۰۰ صفحات قیمت ۱۲؍

کاغذ کی ناؤ:۔ مختصر نشری تمثیلوں کا مجموعہ از صاحبزادہ میر محمد علی خان صاحب میکش۔ ریڈیو ڈراما لکھنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ لیکن صاحبزادہ صاحب کامیاب ہوئے ہیں۔ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت ۱۲؍

محبت کی چھاؤں:۔ میرزا مظفر الحسن صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ تعارف پروفیسر عبدالقادر سروری، ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے لکھا ہے۔ افسانے نوجوانوں کی دلچسپی کے ہیں۔ حجم ۱۳۲ صفحات۔ قیمت مجلد ۱۲؍

اُردو مثنوی کا ارتقاء:۔ از پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ اُردو مثنوی کے متعلق یہ جامع اور سیر حاصل کتاب لائق تعریف محنت اور کاوش سے لکھی گئی ہے کتاب پُر از معلومات اور پڑھنے کے قابل ہے۔ بڑی تقطیع حجم ۴۴۳ صفحات قیمت ۱۲؍

تذکرِ دکن:۔ مرتبہ سکینہ بانو صاحبہ داعی شعبۂ نسواں و مدیرۂ سب رس۔ اس کتاب میں دکن اور شاہانِ دکن کے متعلق خواتینِ دکن کے دلچسپ اور پُر از معلومات مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ کتاب تصویروں سے مزین ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت مجلد ۱۲؍

تاریخِ گولکنڈہ:۔ از جناب عبدالمجید صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پروفیسر تاریخ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ یہ قطب شاہی سلطنت کی نہایت جامع اور دلچسپ تاریخ، اور اس عہد کے تمدن و معاشرت اور سیاسی حالات کا ایک نہایت کامل اور مدلل مرقع ہے۔ یہ بلند پایہ کتاب اہلِ ذوق کے پڑھنے کے قابل ہے۔ بڑی تقطیع حجم ۳۲۵ صفحات۔ گیارہ تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت مجلد ۸؍

نمودِ زندگی:۔ مقامِ مسرت ہے کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا مجموعہ اس نام سے شائع کیا ہے۔ سید صاحب جدید طرز کے شعراء میں بہت بلند پایہ ہیں ان کا کلام ہمایوں میں چھپتا رہتا ہے ہمارے قارئین نے بارہا اُن کے کلام کو خاص طور پر سراہا ہے۔ حجم ۲۰۷ صفحات قیمت ۱۲؍

پھول بن:۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے قدیم کتابوں کو دیباچوں حواشی اور تشریحات کے ساتھ شائع کرنے کا اہم کام بھی اپنے ذمے لیا ہے۔ یہ کام بہت محنت اور کاوش کا ہے۔ اسی سلسلے میں ابن نشاطی کی اُردو مثنوی پھول بن شائع ہوئی ہے جو آج سے تین سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ کتاب اہلِ ذوق کے مطالعہ کے قابل ہے۔ پھول بن کو پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے بہت قابلیت سے مرتب کیا ہے۔ حجم بڑی تقطیع کے ۱۴۴ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔

مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال:- یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کتاب ہے جس کے فاضل مرتب میر سعادت علی رضوی ایم اے ہیں۔ اس کے مصنف ملا غواصی ہیں یہ بھی آج سے تین سو سال پہلے کی مثنوی ہے جو حواشی اور تشریحات کے ساتھ نہایت عمدگی سے مرتب کی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں۔ حجم بڑی تقطیع کے ۱۷۹ صفحات ۔

کلام الملوک:- قدیم سلاطینِ دکن کے فارسی کلام کا یہ مجموعہ میر سعادت علی صاحب رضوی ایم اے نے مرتب کیا ہے۔ شاعر بادشاہوں کے کلام کے ساتھ ان کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ کتاب مطالعہ کے قابل ہے۔ حجم ۱۱۲ صفحات قیمت درج نہیں ۔

طوطی نامہ:- یہ مثنوی ملا غواصی نے آج سے تین سو سال پہلے اردو زبان میں لکھی تھی اب میر سعادت علی صاحب نے ایک مفصل مقدمے کے ساتھ مع تشریحات اسے مرتب کیا ہے اور ادارۂ ادبیات نے قدیم کتب کے سلسلے میں اسے شائع کیا ہے جس کے لئے اہل اردو کو ادارہ کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ بڑی تقطیع۔ حجم ۲۰۹ صفحات قیمت درج نہیں ۔

قصۂ بے نظیر:- تین سو سال پہلے کی ایک اردو مثنوی۔ از صنعتی مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی۔ سلسلۂ مذکورہ بالا کی یہ کتاب بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۱۱۱ صفحات قیمت درج نہیں ۔

فنِ تقریر:- مرتبہ ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ اس کتاب میں فنِ تقریر کے متعلق معلومات درج ہیں۔ حجم ۹۳ صفحات قیمت ۱۲ ۔

سلکِ گوہر:- (ڈراما) از محمد جلال الدین صاحب انسک بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) شائع کردہ ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ ڈراما معلوم ہے قیمت

محمد حسین آزاد:- شمس العلماء مولوی سید محمد حسین آزاد دہلوی کے حالاتِ زندگی اور تصنیفات و کلام پر تبصرہ از محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی ایم اے (عثمانیہ)۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت عہ ۔

مقدمۂ تاریخ دکن:- از جناب عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ قدیم زمانے سے لیکر موجودہ دور تک کی تاریخِ دکن کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب ایک سرسری خاکے کا کام بوجہ احسن دے سکتی ہے جن لوگوں کے پاس مفصل تاریخیں پڑھنے کا وقت نہ ہو وہ اس کتاب سے قدیم و جدید تاریخِ دکن کے متعلق بہت کچھ واقفیت حاصل کر سکتے ہیں حجم ۱۳۹ صفحات قیمت عہ ۔

اردو دانی کی کتابیں:- (پہلا حصہ) یہ جدید طرز کا ایک قاعدہ ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ اس سے نوعمر پڑھنے والے پرانے قاعدے کے مقابلے میں صرف چوتھائی حصہ وقت میں پڑھنا لکھنا سیکھ سکتے ہیں۔ قاعدہ مفید معلوم ہوتا ہے قیمت ۲ ۔

پتہ:- اوپر کی سب کتابیں ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ خیریت آباد حیدرآباد (دکن) سے ملتی ہیں ۔

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کی کتابیں

حیات کیا ہے:- از جناب محشر عابدی صاحب بی اے ایم ایس سی (عثمانیہ)، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ اردو میں ادبی کتابوں کی

سلیس وبامحاورہ [illegible]
اشاعت کے ساتھ سائنس کے مختلف شعبوں کے متعلق بھی کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ حیاتیات کے متعلق یہ کتاب اُردو زبان میں [illegible]
ہے زندگی کے مظاہر کے متعلق حکمانے اب تک جو مختلف نظریے قائم کئے ہیں ان کا دلچسپ بیان اس کتاب میں ہے بہت سی تصویریں بھی ہیں۔ حجم [illegible] صفحات

قیمت درج نہیں ۰

حکایاتِ رُومی:۔ (پہلا حصہ) ترجمہ از مرزا نظام شاہ و نظرِ ثانی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی۔ مولانائے روم کی حکایات کا نہایت
کامیاب ترجمہ ہے جو لوگ فارسی مثنوی سے مستفید نہیں ہوسکتے ان کے لئے بیش بہا نعمت ہے۔ حجم ۸ ۴ ۱ صفحات قیمت درج نہیں ۰

اخوانُ الصَّفا عربی کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے مولوی اکرام علی مرحوم نے صاف ستھرا ترجمہ کیا ہے اور اب بہت سے نسخوں سے مقابلہ کرنے کے
کے بعد انجمنِ ترقی اُردو نے شائع کیا ہے۔ حجم ۱۵۵ صفحات قیمت درج نہیں ۰

تاریخِ ادبیاتِ ایران (۱۵۰۰ – ۱۹۲۴ء در عہد جدید) مصنفہ پروفیسر براؤن مترجمہ سید وہاج الدین احمد صاحب کنتوری۔ مددگارِ
نائب معینِ امیر جامعہ۔ مؤلفِ "نفسیات ترغیب" وغیرہ ۰

کتاب مشہورِ آفاق ہے اس کا ترجمہ بہت کامیابی سے کیا گیا ہے حجم ۲۷ ۶ صفحات۔ قیمت درج نہیں ۰

اصطلاحاتِ پیشہ وراں:۔ مولفہ مولوی ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی۔ اس کتاب میں ہندوستان کے مختلف فنون اور صنعتوں کے
اصطلاحی الفاظ و محاورات نہایت محنت سے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ کتاب نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے الفاظ سے ہندوستان کے قدیم تمدن پر
بہت کچھ روشنی پڑتی ہے جگہ جگہ خاکوں سے الفاظ و محاورات کا مفہوم سمجھایا گیا ہے۔ حجم ۳۴۷ صفحات قیمت درج نہیں ۰

حیاتِ جاوید:۔ اس کتاب میں مولانا حالی نے سرسید احمد خاں کے حالاتِ زندگی اور اُن کی سرکاری، قومی، ملکی اور مذہبی خدمات کا مفصل ذکر
کیا ہے بڑی تقطیع حجم ۹۵۴ صفحات علاوہ ضمیمہ جات و انڈکس۔ مولانا حالی اور سرسید احمد خاں کی تصاویر سے مزین ہے کتاب جس قابلیت سے لکھی گئی ہے مولانا
حالی کا نام اس کا گواہ ہے۔ قیمت درج نہیں ۰

پتہ:۔ اوپر کی سب کتابیں انجمن ترقی اُردو دہلی سے ملیں گی ۰

سُلطان محمُود غزنوی:۔ از پروفیسر محمد حبیب صاحب بی۔ اے (آکسن) مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ اصل انگریزی کتاب کا ترجمہ سید
جمیل حسین صاحب ایم۔ اے علیگ نے کیا ہے۔ سلطان محمود کے متعلق یہ محققانہ تصنیف پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۱۴۰ صفحات قیمت عار
پتہ:۔ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ۰

جواہرِ سخن (جلد چہارم) ۱۲۰۰ھ سے ۱۳۴۵ھ تک کے شعرا کے کلام کا یہ انتخاب مولوی محمد مبین کیفی چڑیاکوٹی نے کیا اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی
ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی نے اس پر نظرِ ثانی کی۔ انتخاب محنت سے کیا گیا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔ بڑی تقطیع ۲۲۷ صفحات قیمت [illegible]
ناشر:۔ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ۰

جنگ آلودہ دُنیا:۔ مرتبہ وِکیش نارائن صاحب تیواری۔ موجودہ جنگ کی خبروں کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہے کتاب میں اہم نقشے اور متعدد چارٹ شامل ہیں جن سے مضامین کے سمجھنے میں بہت سہولت ہوتی ہے تیواری صاحب کی محنت اور کاوش قابلِ تعریف ہے

حجم ۱۲۰ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ ناشر:۔ انڈین پریس الٰہ آباد ٭

یادِ چکبست:۔ مرتبہ پنڈت آنند نرائن مُلّا صاحب چکبست اُردو کے بلند مرتبہ شاعر تھے۔ اس کتاب میں مُلّا صاحب نے چکبست کے متعلق تقریباً ۴۰ اُدبا و شعراء کے مضامین اور نظمیں جمع کی ہیں لکھنے والوں میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق، نیاز، اثر لکھنوی، ڈاکٹر تاراچند، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ شامل ہیں مضامین اور نظمیں قابلِ مطالعہ ہیں حجم ۱۸۰ صفحات۔ کاغذ کتابت نفیس۔ کتاب مجلد ہے۔ ناشر انڈین پریس الٰہ آباد ٭

افتتاحِ الاندلس:۔ از محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم اے پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی۔ یہ ابن القوطیہ کے رسالے تاریخِ افتتاح الاندلس کا ترجمہ ہے۔ توضیحِ مطالب کے لئے مقدمہ اور حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے ترجمہ اچھا ہے اور کتاب پڑھنے کے قابل ہے قیمت عہ۔ ناشر کتابستان الٰہ آباد ٭

خیال آفرین دماغ:۔ یہ حضرت عرش تیموری مصنف "قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں" کا ایک تجزیاتی و تخیلی ڈراما ہے حضرت عرش کے خیالات کی ندرت قابلِ لحاظ ہے کتاب کا حجم ۷۰ صفحات ہے اور قیمت ۱۲ر۔ ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی ٭

مُسافر کی ڈائری:۔ خواجہ احمد عباس نے جاپان، امریکا، یورپ، ٹرکی اور بغداد وغیرہ کی سیاحت کے بعد یہ دلچسپ اور قابلِ مطالعہ کتاب لکھی ہے۔ لندن کے متعلق خواجہ صاحب کی رائے بہت دلچسپ ہے اس لئے یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

"مجھے لندن آئے پورا ایک مہینہ گزر گیا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ نہ مجھے یہ شہر پسند آیا نہ میں نے اس کو اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کی ممکن ہے کہ اپنے سیاسی عقیدوں کی وجہ سے لندن کے خلاف تعصب میں مبتلا ہوں۔ ممکن ہے لندن میں خوبصورت عمارتیں ہوں مگر میں نے تو فقط دھوئیں سے کالے ہوئے بدصورت مکانوں کی یکساں قطاریں دیکھیں۔ ممکن ہے یہاں بھی دلچسپ، رحمدل، مہمان نواز اور کالے گورے کی تفریق کو نہ ماننے والے انسان بستے ہوں مگر میں ان سے نہیں ملا سوائے مشہور ناول نویس مس ایتھل مینن کے جو آئرش ہے اور سوشلسٹ اس لئے لندن کی نمائندگی نہیں کر سکتی ممکن ہے لندن کی زندگی میں بہت سی دلچسپ خصوصیات ہوں مگر میں اُن کو کیسے دیکھ سکتا جبکہ میں نے زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزارا اور زیادہ باہر اس لئے نہیں نکلا کہ سڑک یا ہوٹل یا تھیئٹر جہاں بھی جاؤں گا کالا رنگ میری تحقیر کرائے گا۔

بہر حال لندن وہ شہر ہے جہاں:۔

دُنیا کا بدترین کھانا ملتا ہے صبح شام سوائے اُبلے ہوئے گوشت اُبلے ہوئے آلو اور اُبلی ہوئی گوبھی کے اور کچھ نہیں نظر آتا تمام شہر میں بمشکل اچھا کھانا ہندوستانی ہوٹلوں میں ملتا ہے جو کافی تعداد میں ہیں ٭

زمین کے نیچے ریلوں کا جال بچھا ہے اس ریل کا انتظام حیرت انگیز ہے بھیک مانگنا جرم ہے مگر جیتے کی دیا سلائی کی ڈبیا خرید نے میں فروخت کی جا سکتی ہے سڑک کے کنارے بیٹھ اور بیٹھ کر اپنی بنائی ہوئی تصویریں آٹھ آٹھ دس دس آنے میں فروخت کرتے ہیں۔

[illegible]

[illegible] بھی سہنے سے انکار کر دیگا ۔ [illegible]

بادشاہ اور ملک کی موٹر جب بازار سے گزرتی ہے تو وہ انتظام نہیں کیا جاتا جو ہمارے ملک میں گورنروں کے لئے کیا جاتا ہے [illegible]

ہائیڈ پارک میں جس کا جی چاہے جا کر تقریر کر سکتا ہے اگر اس کو پانچ چھ سننے والے مل جائیں۔ اس کے بعد وہ اخباروں میں مضمون لکھ سکتا ہے جو لارڈ بیورہ بروک اس کو پڑھوانا چاہتے ہیں اور ریڈیو پر وہ تمام باتیں سن سکتا ہے جو لارڈ ریتھ سنانا چاہتے [illegible] اس کو کہتے ہیں آزادی رائے ۔

"صفائی پسند انگریز دن میں صرف ایک بار منہ دھوتے ہیں اور ہفتے میں ایک بار نہاتے ہیں قمیص کا کالر روز تبدیل کرتے ہیں ۔ مگر [illegible] جب پسینے میں سڑ جائے تب ہی بدلی جاتی ہے ۔ چھ چھ مہینے ایک ہی کالی پتلون میں گزار دیتے ہیں "

متعدد تصاویر زینت کتاب ہیں ۔ حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ ۔ ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی ۔

[illegible]ٹ :۔ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کا ایک مزاحیہ افسانہ ہے جو مرزا صاحب کی خصوصیات تحریر کا جامع ہے ۔ قیمت ۸ر

[illegible]اب مضمون :۔ یہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کے نزدیک ناقابل اشاعت تھے لیکن بعض احباب کے اصرار سے چھپوا دیئے گئے ہیں ۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے بالخصوص نقادوں کیلئے ۔ قیمت ۱۲ر ✦

دونوں کتابیں دفتر کتابت جودھپور سے مل سکتی ہیں ✦

[کل]ام عاصی :۔ مسٹر منوہن ایم ۔ اے قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے کاشتہ اردو سبھا قائم کر کے ایک مفید کام انجام دیا ہے ۔ بقول من موہن صاحب "کاشتہ اردو سبھا دہلی اس لئے قائم کی گئی ہے کہ ان قابل مصنفوں اور شاعروں کے کلام کی اشاعت کرے جنہوں نے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے" اس سلسلہ میں غالب اور ذوق کے ہمعصر اور شاہ نصیر کے مایۂ ناز شاگرد منشی گھنشیام لال عاصی کا کلام ۲۴۴ صفحات پر شائع کیا گیا ہے جو اپنے وقت کی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے ۔ قیمت فی جلد عہ ۔ ناشر کاشتہ اردو سبھا دہلی ✦

[کل]ام رونق :۔ یہ افتخار الشعراء منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی مرحوم کے کلام کا انتخاب ہے جو کاشتہ اردو سبھا دہلی نے شائع کیا ہے ۔ اس کے مرتب جناب پروفیسر بانکے بہاری لال صاحب دہلوی ایم اے ۔ ایم ۔ او ۔ ایل ۔ منشی فاضل ہیں ✦

بہت سی نظمیں ہندوؤں کے مذہبی تہواروں سے اور ہند و بزرگوں کے متعلق ہیں ۔ موضوع نئے نئے ہیں اور نظمیں اچھی ہیں ۔ کتاب قابل قدر ہے ۔ ۱۶۰ صفحات ۔ قیمت ۱۲ر اعلیٰ کاغذ قیمت عہ ۔ ناشر :۔ کاشتہ اردو سبھا دہلی ✦

[پ]ستالوزی :۔ یہ کتاب حکیم پستالوزی کے فلسفۂ تمدن و تعلیم کے متعلق ہے جس کے مصنف ڈاکٹر عبدالحمید صاحب [illegible] (جامعہ ملیہ) ایم اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی ہیں ۔ اشپرانگر نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس میں ایک پستالوزی پیدا نہ ہو" اس کتاب کا مطالعہ اہل ہند کے لئے بے حد ضروری ہے ۔ حجم ۱۹۲ صفحات ۔ کتابت طباعت کاغذ نفیس قیمت مجلد عہ ۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی ✦

[illegible] :۔ جناب عبدالشکور صاحب ایم اے [illegible]

"کالے خان" "حاجی" وغیرہ مصنف کے وہ کردار ہیں جن کی قلمی تصویر مزاحیہ رنگ میں دکھائی گئی ہے حجم ۱۵۱ صفحات قیمت درج نہیں ناشر مکتبۂ شعر و ادب [illegible]

دانہ و دام:۔ یہ نوجوان اور ہونہار افسانہ نویس راجندر سنگھ صاحب بیدی کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے جسے مکتبۂ اُردو لاہور نے [illegible]۔ راجندر سنگھ صاحب افسانہ نویسی کے فن سے خوب واقف ہیں اور ہندوستانی زندگی کی نہایت کامیاب نقاشی کرتے ہیں ان کا یہ مجموعہ قابل قدر ہے کاغذ اور طباعت نفیس ۳۰۳ صفحات۔ قیمت مجلد عہ +

حاجی لق لق کے افسانے:۔ حاجی لق لق اپنی مزاحیہ نظموں کے لئے مشہور ہیں اس کتاب میں مکتبۂ اُردو لاہور نے حاجی صاحب کے ۲۴ مزاحیہ افسانے جمع کئے ہیں۔ جو امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے قیمت مجلد ۱۲/ +

قوم:۔ اُردو بک سٹال لاہور نے ۱۳ صفحات کی ایک قومی نظم نفیس کاغذ و کتابت کے ساتھ اس نام سے شائع کی ہے۔ قیمت ۴/ +

کیلے کا چھلکا:۔ سندباد جہازی ایڈیٹر شیرازہ لاہور اُردو کے مسلّم ادیبوں میں سے ہیں ان کا مزاحیہ انداز تحریر بے حد مقبول ہے اُردو اکیڈیمی بیرون لوہاری دروازہ لاہور نے اس نام سے ان کے چند مضامین کا مجموعہ سلیقے سے شائع کیا ہے مضامین بہت دلچسپ ہیں حجم ۱۷۰ صفحات قیمت مجلد عہ

نمستے علیکم۔ ایم اسلم صاحب مشہور لکھنے والے ہیں یہ ان کے ۱۶ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ ۔

پتہ:۔ اُردو اکیڈیمی بیرون لوہاری دروازہ ۔ لاہور

اندھی دُنیا:۔ حضرت اختر انصاری کے ۴۲ افسانوں کا مجموعہ اس نام سے شائع ہوا ہے۔ بقولِ مصنف "یہ افسانے سماج کے پکے ہوئے پھوڑے اور تہذیب کے سڑے ہوئے اعضاء پر ایک بید رو نشتر کے کچوکے ہیں یہ افسانے ریاست و سیاست کے بے ایمان ٹھیکیداروں کا پول کھولتے ہیں۔ یہ افسانے ایک مظلوم لیکن بیدار ہوتی ہوئی انسانیت کی پکار ہیں"

افسانے پڑھنے کے قابل ہیں۔ قیمت عہ۔ ناشر: مکتبۂ جہاں نما۔ اُردو بازار دہلی +

نازو:۔ یہ حضرت اختر انصاری کے ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے حضرت اختر انصاری بہت کامیاب افسانہ نویس ہیں اُن کے افسانوں کا یہ مجموعہ بھی بہت دلچسپ ہے قیمت مجلد عہ۔ ناشر: مکتبۂ جہاں نما۔ اُردو بازار۔ دہلی۔

صراط الحمید جلد اوّل و جلد دوم۔ حجم جلد اوّل ۳۵۰ صفحات۔ جلد دوم ۴۲۰ صفحات۔ یہ الحاج صلاح الدین محمد الیاس صاحب برنی ایم۔اے۔ ایل ایل۔ بی علیگ کا سفر نامہ ہے پہلا حصہ سفرنامۂ مقامات مقدسہ واقع عراق، شام، فلسطین و حجاز ہے۔ دوسرا حصہ سفرنامۂ حرمین شریفین واقعہ مکہ معظمہ و مدینہ منورہ ہے۔ دونوں جلدیں مشہور مقامات کی تصویروں سے مزین ہیں۔ الیاس برنی صاحب کا انداز بیان بیحد دلآویز اور اُن کا سفرنامہ معلومات کا خزانہ ہے قیمت جلد اوّل عہ۔ جلد دوم عہ

پتہ:۔ پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن +

نئی ریاضت:۔ پانچ ایکٹ کا ایک مزاحیہ ڈرامہ از فضل الرحمٰن صاحب حجم ۱۵۶ صفحات قیمت عہ۔ ناشر مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

[illegible] ناشر مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

عاصمہ :- ایک ناول۔ مصنفہ ابوالظفر مولوی مویدالدین حسن صاحب [illegible] ایک [illegible] کی کنیز کے سبق آموز [illegible] زندگی [illegible] واقعات [illegible] بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت عہ۔ ناشر مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

حج زینب :- یہ لیڈی ایولن کیبلڈ زینب کے سفرنامۂ حج کا اُردو ترجمہ ہے جو حسن شبیر صاحب نے کیا ہے مقدمہ نواب [illegible] جنگ نے لکھا ہے۔ سفرنامہ پڑھنے کے قابل ہے۔ کتابت وطباعت نفیس ۲۶۶ صفحات قیمت مجلد ے۔ ناشر مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

بے انصافی کا انصاف :- یہ ایک اخلاقی ڈراما ہے اس کے مصنف پنڈت دیو دت شرما بی ایس سی ایل ایل بی وکیل امرت سر ہیں۔
حجم ۱۳۴ صفحات قیمت عہ۔ مصنف سے طلب فرمائیے۔

خبطی :- محمد علی صاحب واحدی نے طالب علموں کے متعلق یہ چند افسانے لکھے ہیں۔ ۱۰۰ صفحات قیمت ۸ ر پتہ:- انوار بکڈپو لکھنؤ۔

قیمتی باتیں :- اخلاقی موضوعات پر ایک ایک شعر فیض لدھیانوی نے اس کتاب میں ایسے ایک سو اشعار لکھے ہیں قیمت ۲ر پتہ:- امین بکڈپو محلہ داتا شکوہ لاہور۔

ہندوستان کی صنعت اور تجارت :- یہ پُر از معلومات اور نہایت مفید کتاب ہر ہندوستانی کے مطالعہ کے قابل ہے اور اس کے فاضل مصنف منت اللہ صاحب رحمانی ایم۔ ایل۔ اے قوم کے شکریے کے مستحق ہیں۔ ہندوستان کی اقتصادی تاریخ ۱۴۴ صفحات میں بیان کی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ:- مکتبۂ سیفیہ مونگیر۔

پیامِ رسالت :- ابوالافتخار قاضی محمد رمضان صاحب تبسم قریشی کی یہ تعلیمی نظم ایک خاص رنگ میں لکھی گئی ہے امید ہے کہ اس کی قدر کی جائے گی۔ ۱۴ صفحات۔ حضرت مصنف سے اقبال گنج گجرات (پنجاب) کے پتے سے طلب کیجئے۔

اشکِ خونین :- جناب بسمل دہلوی کی نظموں کا یہ مجموعہ ادارۂ ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔ قیمت مجلد عہ۔

نادر خطوطِ غالب :- مرزا غالب کے ۲۷ غیر مطبوعہ خطوط کا یہ مجموعہ سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی گیاوی ٹریبل ایم۔ اے (گولڈ میڈلسٹ) نے شائع کیا ہے کتاب میں غالب کی ایک تصویر شامل ہے یہ کتاب قابل قدر ہے امید ہے کہ پرستارانِ غالب اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے قیمت ۸ر پتہ کاشانۂ ادب لکھنؤ

حُسن و عشق :- اس کتاب میں حسن و عشق کے متعلق قدیم و جدید شعراء کے سیکڑوں شعر جمع کردئے گئے ہیں۔ محمد صدیق صاحب خیرآبادی نے اسے مرتب کیا ہے کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں نظر آتی ہیں جن کی اصلاح ہونی چاہیئے۔ حجم ۸۰ صفحات قیمت ۸ر۔
پتہ:- محمد صدیق صاحب۔ کارخانۂ عطر محمد زکریا محمد ایوب۔ چوک لکھنؤ۔

سیرتِ بتولؓ :- حضرت فاطمہؓ کی یہ سوانح عمری انجاز الحق صاحب قدوسی نے لکھی ہے مسلمان لڑکیوں کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ہے
قیمت ۶ر۔ پتہ:- سلیم اختر صاحب قدوسی۔ نامپلی جدید۔ مکان ۱۱۰/۱۔ لال ٹیکری حیدرآباد دکن۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا مذہب :- اس کتاب میں ہندومت کی تعریف کے بعد یہ ثابت کیا گیا ہے کہ پنڈت جواہر لال [illegible] آزاد خیال نہیں بلکہ ہندوؤں کا غلبہ چاہتے ہیں اور اسلام کو خطرے کی نظر سے دیکھتے ہیں اس کے مصنف شبیہ الحسنین صاحب [illegible] حجم [illegible]

قیمت ۸ر - پتہ :- محمد ولی الحسنین صاحب - قاضی محلہ - بدایوں - یوپی ۔

مرقعِ بنارس :- شہر بنارس کی مختصر اور صحیح تاریخ مساجد، منادر، مقابر اور دوسری زیارتگاہوں کے حالات کتب معتبرہ سے لکھے گئے ہیں۔ مرتبہ چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ حجم ۳۰۴ صفحات قیمت عہ ۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور مطالعہ کے قابل ہے پتہ سلطانیہ بک ڈپو ۹۵ نظیر آباد لکھنؤ

رہنمائے تاریخِ اُردو - حاجی محمد عبدالقادر صاحب نے اُردو شاعری کے فنِ "تاریخ نگاری" کی اس تاریخ میں اصولِ تاریخ نگاری مع مشہور تمثیلات کے درج کئے ہیں۔ اس کے علاوہ شعرائے اُردو کے حالات بھی بیان کئے ہیں کتاب قابلِ قدر ہے حجم ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۲ر - معارف پریس اعظم گڑھ سے طلب فرمائیے ۔

غیر ملکوں میں ہمارے ہم وطن :- Our Countrymen Abroad اس انگریزی کتاب کے مصنف دھرم یش دیو صاحب ہیں جو کانگریس کے اس شعبے کے معتمد ہیں جس کا تعلق غیر ممالک میں مقیم ہندوستانیوں سے ہے۔ پنڈت جواہر لال صاحب نہرو نے دیباچہ لکھا ہے اس کتاب میں اُن مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کا تعلق غیر ممالک میں مقیم ہندوستانیوں سے ہے کتاب پُر از معلومات اور پڑھنے کے قابل ہے حجم ۹۰ صفحات قیمت ۸ر

پتہ :- دفتر آل انڈیا کانگریس کمیٹی - سوراج بھون - الہ آباد ۔

شمعِ ازل :- حضرت اثر زبیری لکھنوی نے اس کتاب میں تاریخِ اسلام کی مقتدر ہستیوں کے ولولہ انگیز واقعات بیان کئے ہیں۔ حجم ۲۲۶ صفحات قیمت عہ - پتہ :- زبیر منزل پاٹا نالہ لکھنؤ ۔

تذکرۂ بے نظیر - مؤلفہ سید عبدالوہاب "افتخار" بہ ترتیب و تصحیح سید علی منظور صاحب ایم۔ اے یہ فارسی زبان کے شعراء کا مشہور تذکرہ ہے۔ جسے الہ آباد یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ کتاب بہت قابلِ قدر ہے بڑی تقطیع کے تقریباً پونے دو سو صفحات قیمت عہ - پتہ کتابستان - الہ آباد ۔

دولتِ عثمانیہ - مؤلفہ محمد عزیز صاحب ایم۔ اے علیگ - اس کتاب میں سلطنتِ عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ زیرِ نظر اس کتاب کی جلدِ اول ہے جس میں عثمانِ اول ۶۸۷ھ سے مصطفیٰ رابع ۱۲۲۳ھ تک کے حالات درج کئے گئے ہیں فاضل مؤلف کی تحقیق و تفتیش اور تبحر لائقِ تحسین ہے اُردو میں ایسی کتابیں کم نکلتی ہیں۔ اس کتاب کی قدر نہ کرنا ظلم ہے۔ پہلی جلد کا حجم ۹۰۴ صفحات ہے۔ قیمت درج نہیں - پتہ :- دار المصنفین اعظم گڑھ ۔

اُردو رسمِ خط :- محمد سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے کینٹب نے اُردو رسمِ خط کے متعلق نہایت جامع معلومات کتاب لکھی ہے۔ اس میں اُردو - عربی - فارسی کے قدیم بنیادی رسمِ خط کی بہت سی عکسی تصویریں شامل ہیں یہ کتاب اہل الرائے کے مطالعہ کے قابل ہے قیمت ۸ر پتہ - مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن ۔

نشا - ایک دُکھیاری پاپن کی زندگی کا تماشا۔ ڈراما از کشن پرشاد صاحب کول ۱۰۲ صفحے - قیمت عہ - لیڈر پریس الہ آباد ۔

ایثار - ناول از نور الحسن صاحب قیمت ۸ر - پتہ :- انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن ۔

مطالعۂ حافظ :- (اور اس سے کیا مستنبط ہوتا ہے) از جناب حنفی دہلوی ایم اے علیگ - کلامِ حافظ کا تشریحی مطالعہ بڑی تقطیع ۱۶۰ صفحات - قیمت عہ - پتہ :- مکتبہ خانۂ علم و ادب دہلی ۔

طلسمِ عمل :- از سید مجتبیٰ حسن صاحب بی اے اس کتاب میں زندگی بسر کرنے کے سنہرے اصول بیان کئے گئے ہیں حجم ۲۵۸ صفحات نفیس کتابت و طباعت قیمت عہ

صہبائے ہند: حضرت نشور نے مختلف اہم موضوعات پر نظمیں لکھکر قوم کو پیغامِ حیات دیا ہے مجموعہ قابلِ قدر ہے ۱۴۴ صفحات قیمت مجلد عہ پتہ: نامی پریس کانپور

حسرت سیاستدان اور حسرت شاعر: مولانا حسرت کی شاعری کے متعلق حبیب الرحمٰن صاحب پیام بی اے کی یہ کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۱۲ر - پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدر آباد دکن

عقل و جنوں: مجموعہ نظم حضرت برق موسوی قیمت عہ - پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ۔ حیدر آباد دکن

دانائے راز: از حضرت خاموش علامہ اقبال کی یاد میں لکھی گئی ہے امید ہے کہ اس کی قدر کی جائیگی قیمت ۱۲ر۔ پتہ: دائرۂ ادب اُردو لدھیانہ

اساساتِ قومیتِ ملتِ اسلامیہ ہند: خطبۂ صدارت جناب راغب احسن صاحب ایم۔ اے۔ اس کتاب میں بہ اعظم ہند میں قومیتِ اسلام کے اصولِ حیات و داعیۂ استقلال اور اس کے ماضی و حال اور مستقبل پر ایک مومنانہ نظر ڈالی گئی ہے حجم ۱۹۹ صفحات قیمت درج نہیں سیکریٹری صاحب کلکتہ ضلع مسلم لیگ نمبر ۸ زکریا سٹریٹ کلکتہ

بہاراں: یہ حضرت اثر لکھنوی کا مجموعۂ کلام ہے حضرت اثر نغز گو شعراء میں سے ہیں ان کا کلام کسی تبصرے کا محتاج نہیں امید ہے کہ اہلِ ذوق اسے ہاتھوں ہاتھ خریدیں گے۔ حجم ۹۶،۴ صفحات قیمت ے ر۔ پتہ: نظامی پریس لکھنؤ

کلیاتِ بحری: مع مقدمہ و تشریح از ڈاکٹر محمد حفیظ صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ آج سے ڈھائی سو سال پہلے کی شاعری کا ایک نمونہ ہے بحری کے کلام پر فاضلانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور اُس کے حالات پر بہت کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب قابلِ قدر ہے۔ ۱۴۰ صفحات قیمت ۔ پتہ: نولکشور پریس لکھنؤ۔

نغمۂ عندلیب: لالہ گوبند سنگھ صاحب شاہجہان آبادی ۱۲۶۱ھ کی ایک دلآویز مثنوی ہے چودھری نبی احمد صاحب نے اس کتاب کو مرتب کیا ہے اور سلطانیہ بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ نے شائع کیا ہے حجم ۲۳۰ صفحات قیمت درج نہیں

مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی: از محمد مرزا صاحب دہلوی یہ کتاب ہندوستان میں مسلمانوں کی جماعتی زندگی کے اہم مسائل پر حاوی ہے۔ اس کا مطالعہ ہر سوچنے سمجھنے والے مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ قیمت مجلد عہ ۔ پتہ۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی

تجلّی: یہ بحر المعانی ایم حسن اختر لودیانوی کا مجموعۂ کلام ہے۔ اختر صاحب بہت اچھی قومی نظمیں لکھتے ہیں اُن کا کلام زندگی پرور ہے ۱۰۴ صفحات۔ شاعر کی تصویر شامل ہے قیمت غیر مجلد عہ مجلد عا۔ مصنف سے مالی گنج لودھیانہ کے پتے سے مل سکتی ہے

پاکستان اور مسلمان: انیس الرحمٰن صاحب نے یہ کتاب پاکستان کے خلاف لکھی ہے حجم بڑی تقطیع کے ۱۸۸ صفحات قیمت درج نہیں پتہ نامی پریس الٰہ آباد

جاہ و جلال: یہ مشہور ڈرامانگار کارل چپیک کے ایک ڈرامے کا ترجمہ ہے جو صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسم کی مترجمانہ قابلیت کا بین ثبوت ہے۔ ڈراما مصنف اور مترجم کی قابلیت کا گواہ ہے امید ہے کہ اہلِ ذوق اس کی قدر کریں گے حجم ۱۵۲ صفحات قیمت عہ پتہ۔ گورنمنٹ کالج لائبریری لاہور

اُردو شاعری کی مختصر تاریخ: از جناب محمد جمیل صاحب ایم۔ اے۔ قدیم شعراء سے لیکر موجودہ عہد تک کے شعراء کے حالات اور کلام پر سرسری تبصرہ کیا گیا ہے۔ ۲۶۰ صفحات قیمت عہ۔ پتہ: نولکشور پریس۔ لکھنؤ

عہدِ حاضر کے بڑے لوگ (حصۂ اول)۔ از محمد مرزا صاحب دہلوی۔ اس جلد میں مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، مسٹر سی۔ آر۔ داس اور مسٹر محمد علی جناح کے حالات جمع کئے گئے ہیں۔ اندازِ تحریر منصفانہ اور ادیبانہ ہے۔ ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۸؍۔ پتہ دائرہ ادبیہ دریا گنج دہلی۔

جوہرِ تمثیلات:۔ رانگو نندر راؤ صاحب جنب وکیل۔ اہلِ اُردو کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے سنسکرت کے ایک قدیم ترین ادیب کو سم دیو کی "ورشتانت شتک" کا منظوم اُردو ترجمہ کر دیا ہے۔ ترجمہ بہت اچھا ہے قیمت ۴؍ مصنف سے عالم پور پوسٹ کرنول کے پتے سے طلب کیجئے۔

خزینۂ تاریخ:۔ بزمِ تاریخ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کا گلدستۂ مضامین۔ اس میں مختلف تاریخی موضوعات پر طلبہ و اساتذہ کے قابلِ قدر مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ ۱۴۴ صفحات قیمت ۱۲؍۔ پتہ:۔ بزمِ تاریخ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

ہندوستان میں بیکاری و مفلسی اور اس کا علاج:۔ کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ ناشر اپل اینڈ کمپنی مری پنجاب قیمت ۱۲؍۔ ہمایوں کے خریداروں سے ۱۰؍ (مع محصول)۔

یادگارِ نصیر مجموعۂ انتخابِ کلام مولوی محمد نصیر الدین صاحب علوی مرحوم (ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی) مرتبہ سید ظہور الدین صاحب علوی ایم۔ اے (اُردو)، ایم۔ اے (فارسی)، ایل ایل۔ بی علیگ۔ غزلیہ کلام کے شائقین کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے۔ قیمت ۸؍۔ پتہ:۔ شروانی بک ڈپو۔ علی گڑھ۔

پسِ پردہ:۔ یہ جناب چند رہوشن سنگھ صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانے دلچسپ ہیں اور زبان قابلِ تعریف۔ امید ہے کہ اس کتاب کی قدر کی جائے گی۔ قیمت ۱۴؍۔ پتہ: چند رہوشن سنگھ صاحب۔ دفتر زمانہ کانپور۔

افسانۂ پدمنی:۔ از جناب محمد احتشام الدین صاحب دہلوی ایم۔ اے (علیگ) چتوڑ کی رانی پدمنی سے سلطان علاء الدین خلجی کے عشق کی داستان اور اس کی مورخانہ تحقیق۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ ۸۴ صفحات قیمت ۸؍۔ پتہ: کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

الف جینا:۔ مترجمہ ابوالقلم دبیر صاحب۔ یونان قدیم کی ایک دلچسپ و دل آویز داستان ہے ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔ ۷۰ صفحات قیمت مجلد ۱؍۔ پتہ ابوالقلم دبیر صاحب مجوکھیا۔

انمول کہانیاں:۔ از شوکت عثمانی صاحب۔ یہ دس قابلِ قدر کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مصنف کی پہلی کتابیں "روس یاترا" اور "چار مسافر" وغیرہ مقبول ہو چکی ہیں۔ یہ افسانے ایک مخصوص پیغام کی ترجمانی کرتے ہیں اور زبان و بیان کے لحاظ سے بلند پایہ ہیں۔ ۱۳۱ صفحات قیمت ۱۲؍۔ ناشر بھارت پبلشنگ ہاؤس۔ آگرہ۔

پاکستان اور ہندوستان:۔ تحریکِ پاکستان کے متعلق سید عبدالقدوس صاحب ہاشمی نے یہ نہایت پُر از معلومات کتاب شائع کی ہے۔ حجم ۲۳۵ صفحات۔ قیمت مجلد ۱؍۔ ناشر:۔ دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن۔

تاریخ جنوبی ہند:۔ ہندو مسلم سیاسی تعلقات کی ۵۰۰ سالہ تاریخ کے علاوہ زمانۂ قدیم سے لیکر انگریزی قبضہ تک ہندوستان کے حالات۔ اس کے مصنف محمود خاں صاحب محمود کی کتاب تاریخِ سلطنت خداداد میسور اس سے قبل مقبول ہو چکی ہے کتاب متعدد تصاویر سے مزین ہے اندازِ تحریر محققانہ ہے حجم ۴۲۰ صفحات قیمت ۔ پتہ اسلام کلچر پبلشنگ ہاؤس [illegible]

ہندوستانی تہذیب کی تکمیل:۔ از کالیداس صاحب کپور ایم۔ اے ایل ٹی۔ اس کتاب میں ہندوستانی تہذیب کے مختلف عناصر سے دلچسپ تاریخی بحث کی گئی ہے۔ کتاب تصاویر سے مزین ہے۔ ۵۰۰ صفحات قیمت مجلد ۔ ناشر نولکشور پریس لکھنؤ۔

اُردو ٹکٹ، ادارہ اشاعت اُردو لاہور نے دو ٹکٹ شائع کئے ہیں یہ دلچسپ قابلِ قدر اور مفید ٹکٹ [illegible] اُردو کی تصویریں [illegible] کر اُردو کی خدمت [illegible] سکتے ہیں۔ یہ اختراع قابلِ تعریف ہے۔ [illegible] کے ہی خواہوں کو [illegible] سے ٹکٹ منگوا کر استعمال کرنے چاہئیں اس طرح [illegible] تصویریں بھی حاصل ہو جائیں گی۔

اُردو رسائل و جرائد

مشہور: - اُردو کا ادبی و علمی ماہوار رسالہ ہے۔ مضامین اور ظاہری صورت دلکش ہے۔ قیمت عہ سالانہ۔ پتہ: ممتاز منزل فراشخانہ دہلی۔

ندیم کا سالگرہ نمبر ۱۹۴۲ء: - گیا کا یہ مشہور ادبی رسالہ سید ریاست علی صاحب ندوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ زیر نظر اس کا بہار نمبر ہے۔ جو بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ صوبہ بہار نے اُردو کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس نمبر سے اُن کے متعلق پورا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کا حجم ۴۵۲ صفحات ہے۔ اور قیمت عہ ہے۔ پتہ: دفتر رسالہ ندیم۔ گیا۔

انڈیا: - یہ ہفتہ وار اُردو اخبار حضرت ساقی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ فاضل مدیر اس میں ادبی و سیاسی رنگ کے امتزاج کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ فی پرچہ ار۔ سالانہ چندہ للعہ۔ پتہ: - دفتر انڈیا لاہور۔

چمنستان: - یہ رسالہ حضرت آغا شاعر دہلوی مرحوم کے فرزند ارجمند جناب آغا سرخوش قزلباش کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ مضامینِ نظم و نثر لطیف اور ادبی معیار بلند ہے۔ یہ رسالہ حضرت آغا شاعر مرحوم کی یادگار کے طور پر جاری کیا گیا ہے۔ اور ہر طرح قابلِ قدر ہے۔

چندہ سالانہ عہ قیمت فی پرچہ ۳ر۔ پتہ: - دفتر رسالہ "چمنستان" - دہلی

ادبِ مشرق: - جناب آغا بیدار بخت صاحب خدمتِ ادب کے سلسلے میں بہت نام پیدا کر چکے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ عاشق محمد صاحب کی معاونت سے اب اُنہوں نے ایک اچھے ماہوار ادبی رسالے کی ادارت کے فرائض اپنے ذمے لئے ہیں۔ یہ رسالہ بہت ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ ادبی و علمی مضامین اس کا موضوع خاص ہیں۔ چندہ سالانہ للعہ قیمت فی پرچہ ۵ر۔ پتہ: ادبِ مشرق لاہور

زیبُ النساء: - یہ ایک اچھا نسوانی رسالہ ہے جس کی ایڈیٹر محترمہ صغرا ہمایوں مرزا ہیں۔ امید ہے کہ خواتین اس کی قدر کریں گی۔

سالانہ چندہ سے۔ فی پرچہ ۴ر۔ پتہ: - دفتر زیب النساء لاہور۔

الندوہ: - اس رسالے کا مقصد مسلمانوں کی ادبی و تعمیری خدمت ہے۔ اس کے عالمانہ انداز کے مذہبی مضامین قابلِ قدر ہیں۔ جب رسالے کے نگراں علامہ سید سلیمان ندوی ہیں تو اس کی خوبی میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔ فی پرچہ تین آنے۔ سالانہ چندہ دو روپے۔

پتہ: - دفتر الندوہ۔ بادشاہ باغ لکھنؤ

معلُومات: - یہ رسالہ جو احمد الدین صاحب احمد مارہروی کی ادارت میں شائع ہوا ہے اسم بامسمّٰی کہلانے کے قابل ہے۔ مضامین مفید اور پُر از معلومات ہیں فی پرچہ ۴ر۔ سالانہ چندہ سے۔ پتہ: دفتر معلومات۔ اٹاوہ۔

حاذق: - محمد مجید حسن صاحب مالک مدینہ کا یہ طبی رسالہ مفید اور پُر از معلومات ہے۔ فی پرچہ ۲ر۔ سالانہ چندہ عہ۔

پتہ: دفتر حاذق۔ بجنور۔

قرآنی دنیا / مومنہ: یہ دونوں رسائل علی الترتیب ابو محمد مصلح صاحب اور صبیحۃ النساء بیگم صاحبہ کی ادارت میں شائع ہوتے ہیں۔ مقصد ان کے نام سے ظاہر ہے۔ اچھے رسائل ہیں۔ قرآنی دنیا کا چندہ تین روپے اور مومنہ کا ڈیڑھ روپیہ ہے۔ پتہ: تھانہ والا بلڈنگ چکلا سٹریٹ بمبئی۔

سدا جوان رہنے کا آسان طریقہ
موڈرن سائنس کا معجزہ
ہزاروں سال کی تحقیق کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ
دریافت نہ کر سکی۔ لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشفیلڈ ایم ڈی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے
انتہائی جد و جہد اور ریسرچ کے بعد افریقہ کے ایک درخت سے ایسا ایلا منٹ دریافت کیا ہے
جو انسان میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے تجربات سیکسوئیل سائنس انسٹی ٹیوٹ
اوف برلن امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جس سے شاندار اور حیرت انگیز
کامیابی حاصل ہوئی۔
اس جادو اثر آب حیات کا نام اوٹون "Otone" ہے جسے سلور ڈراپ
(SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے۔
اوٹون کے سلور ڈراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار اور دل خوش کن
تبدیلی محسوس کریں گے۔ چہرے کی جھریاں غائب ہو جائیں گی۔ بدن کی جلد پر شباب کی تروتازگی اور
ملائمیت آ جائیگی۔ رخسار کے گوشت خون سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دمکنے لگیں گے۔
حسن و جوانی کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہو جائیگی۔ اور آپ اپنی
اصلی عمر سے بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ پینتالیس سال کے ہیں تو
پچیس سال کے معلوم ہوں گے
اوٹون کے سلور ڈراپ مندرجہ ذیل شکایتوں کا مکمل علاج ہیں۔
خون کی کمی۔ دماغی و جسمانی کمزوری۔ سر چکرانا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا
چڑچڑا پن دل کی دھڑکن۔ بے تکا موٹاپا۔ ذیابیطس۔ دمہ۔ نابینائی۔ بھوک نہ لگنا
دائمی قبض۔ سانس کا پھولنا۔ بالوں کا قبل از وقت سفید ہو جانا یا گرنا۔ کمر
ضعف اعضائے رئیسہ۔ ضعف گردہ و مثانہ۔ عورتوں کی پرسوت کی بیماری۔
ہسٹریا (لیکوریا) سیلان الرحم اور دیگر رحمی شکایتوں کو آناً فاناً دور کر دیتے ہیں۔
اوٹون کی آب حیات تاثیرات کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنا صحیح وزن کرائیں۔ اور ایک فوٹو کھنچوائیں ایک ہفتہ
استعمال کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپ کو اس دوا کی حیرت انگیز
تاثیرات کا اندازہ ہوگا۔
اوٹون کے سلور ڈراپ عورتیں بچے۔ بوڑھے ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں
اس کے لئے کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے۔
15,000 روپیہ کا نقد انعام
tone
An Ideal and Unique Preparation for Rejuvination
Sole Distributor
ARD PHARMACY(H.P)
T BOX 2323 · CALCUTTA
سول ڈسٹری بیوٹرز
میسرز گرانڈ فارمیسی (H.P.) پوسٹ بکس

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

([illegible])

بیادگارِ علامۂ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

جلد ۳۹

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ مئی ۱۹۴۱ء

نمبر ۵

تصویر: چھاؤں گھنی گھنی ہیں

چندہ سالانہ: پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصول) قیمت فی پرچہ: آٹھ آنے

جہاں نما

ہندوستانی یونیورسٹیاں

ہندوستان میں جامعی تعلیم کی بنیاد ۱۸۵۷ء میں پڑی جب کلکتے، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ ان یونیورسٹیوں کے قیام سے متعلق ضروری قوانین کا نفاذ علی الترتیب ۲۴ جنوری، ۱۸ جولائی اور ۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ ابتداء میں کلکتہ یونیورسٹی کا حلقۂ عمل تمام شمالی ہندوستان تھا۔ اس وجہ سے بہت سی انتظامی دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ ان دشواریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دو اور یونیورسٹیاں قائم کی گئیں چنانچہ ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی اور پانچ سال بعد ۱۸۸۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی قائم ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے نظامِ تعلیم میں ایک اہم انقلاب واقع ہوا یعنی یہ فیصلہ کیا گیا کہ انٹرنس کے امتحان تک تمام مضامین کا ذریعۂ تعلیم و امتحان طالب علم کی مادری زبان ہو۔ لڑکیوں کے لئے بھی نصابِ تعلیم میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ اب بنگال میں ذریعۂ تعلیم لازماً طلبہ کی مادری زبان ہے اور انگریزی کو ایک ثانوی زبان کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ یہ انتظام گزشتہ پچھتر سال کی روش سے ایک نہایت اہم انحراف ہے۔ ۱۹۳۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے فوجی تعلیم کا کام بھی اپنے ذمے لے لیا۔ فوجی تربیت کے لئے دو سال کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔

ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ میں لارڈ کرزن کی تعینہ کمیشن (۱۹۰۲ء) کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کمیشن کی سفارشات زیادہ تر یونیورسٹیوں کے انتظامی معاملات میں اصلاح پر مشتمل تھیں۔ حکومت ہند نے ۱۹۰۴ء میں یونیورسٹیوں کے دستور العمل میں ترمیمات کرنے کی منظوری دی۔ ۱۹۰۴ء کے ایکٹ نے یونیورسٹیوں کے اختیارات میں بہت کچھ توسیع کر دی۔ یونیورسٹیوں کو اپنے الگ کتب خانے، معمل اور عجائب خانے قائم کرنے کی اجازت بھی مل گئی، ہر یونیورسٹی کا حلقۂ عمل معین کیا گیا۔ عام کالجوں کے علاوہ خود یونیورسٹیوں کو اعلیٰ تعلیم کے انتظام کے لئے اساتذہ مقرر کرنے کی اجازت مل گئی۔ یونیورسٹیوں کی طرف سے کالجوں کے معائنے کا باقاعدہ بندوبست کیا گیا۔

اب تک تمام یونیورسٹیاں سرکاری سرپرستی کے ماتحت قائم ہوئی تھیں لیکن ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۰ء میں ایک نیا قدم اٹھایا گیا یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کی خاص ضروریات کے لئے دو نئی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں جن کے قیام کے لئے زیادہ تر خود ان دونوں قوموں نے روپے وغیرہ کا انتظام کیا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی ۱۹۱۶ء میں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی۔ معارفِ مشرقیہ اور مذہبی علوم کی تعلیم کا خاص انتظام ان دونوں یونیورسٹیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ صوبۂ بہار و اڑیسہ کے قیام کے بعد ایک اور یونیورسٹی یعنی پٹنہ یونیورسٹی ۱۹۱۷ء میں قائم ہوئی۔ دو اور یونیورسٹیاں ہندوستانی ریاستوں میں بھی قائم ہوئیں۔ میسور میں میسور یونیورسٹی اور حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی علی الترتیب ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۸ء میں قائم ہوئیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بجز انگریزی کے تمام مضامین کے لئے اس کا ذریعۂ تعلیم اردو

ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ میں ایک اور اہم واقعہ ۱۹۱۷-۱۹ء میں سر مائیکل سیڈلر کے زیرِ صدارت کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کا قیام ہے۔ اس کمیشن کی اہم سفارشات میں سے ایک یہ تھی کہ یونیورسٹیوں کو کالجوں کے متعلق بعض ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دینا چاہیے۔ تاکہ وہ حقیقی جامعی تعلیم اور معارفِ عالیہ کی اشاعت پر اپنی توجہ کو پوری طرح مرتکز کر سکیں کمیشن نے سکونتی یونیورسٹیوں کے قیام کے علاوہ ایسی یونیورسٹیوں کے قائم کرنے کی سفارش بھی کی جو خود کالج قائم کر کے اعلےٰ تعلیم کا انتظام کریں۔

اب ہندوستان بھر میں سیڈلر کمیشن کی سفارشات کی مطابقت میں متعدد یونیورسٹیاں قائم ہوئیں سنہ ۱۹۲۰ء میں برما میں رنگون یونیورسٹی قائم ہوئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ۱۸ جولائی سنہ ۱۹۲۱ء کو وجود میں آئی۔ دہلی یونیورسٹی کا قیام سنہ ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ صوبجاتِ متوسط کے لئے الگ۔ ناگ پور یونیورسٹی سنہ ۱۹۲۳ء میں قائم ہوئی۔ آگرہ یونیورسٹی کا قیام جو راجپوتانے اور وسطِ ہند کی ضروریات بھی پوری کرتی ہے سنہ ۱۹۲۷ء میں ہوا۔ علی گڑھ اور بنارس سے قطع نظر صوبجاتِ متحدہ کی تمام یونیورسٹیوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انٹرمیڈیٹ کی تعلیم سے ان کا کوئی سروکار نہیں رہنے دیا گیا۔ اس کے لئے ایک الگ محکمہ قائم کیا گیا ہے جو ہائی سکول اور ایف اے کی تعلیم کی نگرانی کرتا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی نے بھی اپنا الگ انٹرمیڈیٹ بورڈ بنایا ہے۔

سنہ ۱۹۲۶ء احاطہ مدراس میں یونیورسٹیوں کے قیام کے لئے ممتاز ہے۔ اندھرا یونیورسٹی اسی سال اپریل میں قائم ہوئی۔ چدمبرم میں ایک اور یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا نام انامالی یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی کا قیام راجہ سر انامالی چیٹی کے ۲۰ لاکھ روپے کے شاہانہ عطیہ سے ہوا۔ ٹراونکور یونیورسٹی سنہ ۱۹۳۷ء میں قائم ہوئی۔

ہندوستان میں حسبِ ذیل مختلف قسم کی یونیورسٹیاں ہیں:-

(ا) الحاقی یونیورسٹیاں:- یہ اپنے ساتھ بیرونی کالجوں کا الحاق کرتی ہیں اور ان کے نصابِ تعلیم کی نگراں ہوتی ہیں۔

(ب) تعلیمی یونیورسٹیاں:- یہ تعلیم کے تمام یا بعض شعبوں کا انتظام اپنے مقرر کردہ اساتذہ کے ذریعے سے کرتی ہیں۔

(ج) وحدانی یونیورسٹیاں:- یہ کسی ایک ایسے مرکز سے متعلق ہوتی ہیں جس میں ایسے اساتذہ کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے جنھیں یا تو یونیورسٹی خود مقرر کرے یا جو اس کے زیرِ ہدایت کام کریں۔

کلکتہ یونیورسٹی جس میں بہت سی نئی اصلاحات ہوئی ہیں اب بھی ہندوستان کی سب سے بڑی الحاقی یونیورسٹی ہے۔

تعلیم کا سنٹرل ایڈوائزری بورڈ جو سنہ ۱۹۲۳ء میں اقتصادی وجوہ سے توڑ دیا گیا تھا سنہ ۱۹۳۵ء میں حکومت نے پھر قائم کر دیا۔ اس میں تمام صوبوں کے وزرائے تعلیم یا اُن کے ڈائرکٹرز آف پبلک انسٹرکشن۔ انٹر یونیورسٹی بورڈ کے نمایندے لیجسلیٹو اسمبلی۔ کونسل آف سٹیٹ اور حکومت کے نامزد کردہ ارکان شامل ہیں۔

بڑے بڑے تنخواہ دار

ذیل کے نقشے میں یہ امر قابل ملاحظہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا تنخواہ دار دنیا کے سب سے زیادہ غریب ملک میں ہے۔ صدر جمہوریہ امریکا یا وزیر اعظم انگلستان کی تنخواہوں کے متعلق یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان ممالک میں بہ مقابلہ ہندوستان معیار زیست بہت بلند اور ضروریات زندگی بہت گراں ہیں:-

صدر جمہوریہ امریکا	۲۰۲۰۰۰ روپے سالانہ
وزیر اعظم جاپان	۸۰۰۰ ین یعنی ۷۴۸۸ روپے سالانہ
وزیر اعظم انگلستان	۵۰۰۰ پاؤنڈ سالانہ
لارڈ چانسلر انگلستان	۸۰۰۰ پاؤنڈ سالانہ
وائسرائے ہندوستان	۲۵۰۸۰۰۰ روپے سالانہ
فیوہرر اور چانسلر (جرمنی)	۳۷۸۰۰ مارک سالانہ

میسور میں طیارہ سازی کی کمپنی

مسٹر وال چند ہیرا چند حکومت میسور کے اشتراک سے ریاست میں طیارہ سازی کی ایک کمپنی قائم کر رہے ہیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس سے قبل مسٹر وال چند نے حکومت ہند سے بھی ایسی کمپنی کے قیام کی اجازت چاہی تھی لیکن حکومت ہند نے مسٹر وال چند کی حوصلہ افزائی سے انکار کر دیا۔

ہوائی جہازوں کی کمپنی کا قیام حکومت میسور کے درخشاں کارناموں میں ایک اور شاندار اضافہ ہے مسٹر وال چند ہیرا چند نے موٹر سازی کے متعلق بھی اپنی ایک تجویز حکومت ہند کو پیش کی تھی لیکن افسوس کہ وہ بھی منظور نہ ہوئی ہمیں امید ہے کہ مناسب موقع پر حکومت میسور اس باب میں بھی مسٹر وال چند کی حوصلہ افزائی کرے گی۔

میسور میں ہوائی جہازوں کی کمپنی کے قیام کے بعد حکومت ہند نے بھی پچاس ہوائی جہازوں کے لئے فرمائش کی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی قیمت (تقریباً ڈھائی کروڑ روپے) حکومت ہند پیشگی ادا کر دے گی۔ اگر ایسا ہوا تو کمپنی کو بہت سا سرمایہ حاصل ہو جائے گا جس سے اسے اپنا کام چلانے میں بہت مدد ملے گی۔

پہلے سال ہوائی جہازوں کے پرزوں کی درآمد باہر سے ہوگی لیکن آیندہ انجن اور دوسرے پرزے بھی ریاست ہی میں بننے شروع ہو جائیں گے۔ اس کمپنی کا قیام ہندوستان کی صنعتی تجارت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے اگر یہ کمپنی موٹر سازی کا کام بھی جلد شروع کر سکے تو ملک کا بہت سا روپیہ باہر جانے سے محفوظ رہے۔ موجودہ جنگ نے گزشتہ جنگ عظیم کی طرح ہندوستانی تجا

کے لئے ایک ایسا جبری تحفظ پیدا کر دیا ہے جو اسے حکومت سے حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں ملکی تجارت جتنی ترقی کر رہی ہے ۔

جانوروں کی عمریں

ذیل کے نقشے میں مختلف جانوروں کی عمروں کے متعلق حتی الامکان معتبر ذرائع سے معلومات جمع کی گئی ہیں۔ عوام میں بعض جانوروں کی عمروں کے متعلق بہت مبالغہ آمیز اعداد مشہور ہیں۔ جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ اعداد بالکل بے اصل ہیں۔ اس نقشے میں اکثر جانوروں کی عمر کے متعلق دو عدد دئے گئے ہیں۔ چھوٹا عدد عام اوسط عمر ظاہر کرتا ہے۔ اور بڑا عدد متعلقہ جانور کی زیادہ سے زیادہ عمر کے برابر ہے :-

جانور	عمر
اود بلاؤ	۱۰—۱۵ سال
ریچھ	۵۰ سال
اونٹ	۳۵ سال
بلّی	۱۰—۲۵ سال
کارپ مچھلی	۱۵—۳۰ سال
کنیری	۱۵—۲۰ سال
مرغی	۱۵—۲۰ سال
کتا	۱۰—۱۵ سال
فاختہ	۱۵—۳۰ سال
باز	۳۰ سال
کیچوا	۱۰ سال
ہاتھی	۴۰—۸۰ سال
لومڑی	۱۰—۱۲ سال
بکری	۱۲—۱۵ سال
راج ہنس	۲۵—۵۰ سال
خرگوش	۷—۱۲ سال
گھوڑا	۱۵—۳۵ سال

جانور	عمر
شیر ببر	۵۰ سال
چوہا	۲—۳ سال
بن مانس	۴۰ سال
اُلّو	۶—۸ سال
طوطا	۲۰—۵۰ سال
سیپ کا کیڑا	۶۰—۷۰ سال
پائک مچھلی	۱۵—۳۰ سال
بارہ سنگا	۸—۱۵ سال
بھیڑ	۱۰—۱۵ سال
سانپ	۱۰ سال
مینڈک	۵—۱۰ سال
کچھوا	۱۵۰ سال
شیر	۱۵—۲۰ سال
بھیڑیا	۱۰—۱۵ سال
گھوڑا	۱۰—۱۵ سال

پاکستان اور کانگرس

سرفریڈرک جیمز (ایم۔ ایل۔ اے سنٹرل) نے کونور کلب میں یوروپین ایسوسی ایشن (حلقہ نیلگری) کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "آل انڈیا مسلم لیگ دو اقوام کے نظریے کی علم بردار ہے۔ پاکستان اب مسلمانانِ ہند کا سیاسی مطمع نظر بن گیا ہے۔ جو لوگ پاکستان کے مفہوم سے پوری طرح آگاہ نہیں وہ بھی پاکستان کے حامی ہیں۔"

اس کے بعد سرفریڈرک جیمز نے کہا کہ "درصل پاکستان کو کانگریس پارٹی نے پیدا کیا ہے۔ جب یہ پارٹی ملک کے اہم عہدوں پر قابض تھی ان دنوں اس نے تمام ہندوستانیوں سے ملک میں اپنے اقتدار کا لوہا منوانا چاہا۔ چنانچہ اس جماعت نے اپنے جھنڈے کو قومی جھنڈے کے نام سے موسوم

کر دیا۔ اپنی جماعت کے ترانے کو اس نے قومی ترانے کا نام دے دیا اور اس بات پر زور دیا کہ مدارس میں اردو کے بجائے ہندی پڑھائی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان خوف زدہ ہوگئے اور لیگ کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی۔"

سر فریڈرک نے لیگ کی حکمتِ عملی کے متعلق کہا کہ "یہ کم از کم حقیقی صورتِ حالات کو سمجھنے کی ایک کوشش ضرور ہے اور کانگریس کی حیثیت محض ایک بے سمجھ معترض کی سی ہے۔ اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ملک کے سامنے کوئی راہِ عمل پیش نہیں کر سکتی۔ کانگریس کی موجودہ ستیا گرہ کی تحریک بے روح ہے۔ اس تحریک کے پیرو خود اس پر دل سے اعتقاد نہیں رکھتے۔"

ایجادات

ذیل کے نقشے میں مختلف موجدوں کے نام کے سامنے ان کے ملک کے نام کے علاوہ ان کی ایجاد کا نام اور ایجاد کی تاریخ درج کی گئی ہے:-

موجد	ملک	ایجاد	تاریخ ایجاد
فلٹن	(امریکا)	پہلا دخانی جہاز	(۱۸۰۳ء)
کولٹ	(")	کلدار پستول	(۱۸۳۵ء)
مورس	(")	برقی ٹیلی گراف	(۱۸۳۵ء)
بیل	(")	ٹیلیفون	(۱۸۷۵ء)
ایڈیسن	(")	فونوگراف	(۱۸۷۶ء)
"	(")	برقی لیمپ	(۱۸۷۸ء)
"	(")	متحرک تصاویر کی مشین	(۱۸۹۳ء)
رائٹ برادرز	(")	ہوائی جہاز	(۱۹۰۳ء)
گڈ ییئر	(")	ولکنائزڈ ربر	(۱۸۳۹ء)
ڈبلیو ہنٹ	(")	سیفٹی پن	(۱۸۴۹ء)
ویسٹنگ ہاؤس	(")	ہوائی بریک	(۱۸۶۹ء)
ہیئٹ	(")	سلولائڈ	(۱۸۷۰ء)
ولسن	(")	کاسیم کاربائڈ	(۱۸۸۸ء)

موجد	ملک	ایجاد	تاریخ ایجاد
کرٹس	(امریکا)	ہائڈرو ایروپلین	(۱۹۱۱ء)
واٹ	(انگلستان)	سٹیم انجن	(۱۷۶۵ء)
تھمونیئے	(فرانس)	سینے کی مشین	(۱۸۳۰ء)
ڈیگوری اور نائیپگے	(فرانس)	فوٹوگرافی	(۱۸۳۷ء)
نوبیل	(سوئیڈن)	ڈائنا مائٹ	(۱۸۶۷ء)
مارکونی	(اٹلی)	وائرلیس	(۱۸۹۵ء)
روانیٹجن	(جرمنی)	ایکس رے مشین	(۱۸۹۵ء)
ایسٹ مین	(امریکا)	فوٹو فلم	(۱۸۸۴ء)
نامعلوم چینی موجد		پریس	(۵۹۳ء)
مادام کیوری	(فرانس)	ریڈیم	(۱۹۰۳ء)
آئی-ایل-بیبیرڈ	(انگلستان)	ٹیلی وژن	(۱۹۲۶ء)
ڈیزل	(جرمنی)	ڈیزل موٹر	(۱۹۰۰ء)
سٹیفنسن	(انگلستان)	ریلوے انجن	(۱۸۱۴ء)
ٹامسن	(امریکا)	الیکٹرک ویلڈنگ	(۱۸۶۹ء)
ٹاریچلی	(اٹلی)	بیرا میٹر	(۱۶۴۳ء)
پاسچر	(فرانس)	سگ گزیدہ کے لئے ٹیکا	(۱۸۸۵ء)
ہارگریوز	(انگلستان)	کپڑا بننے کی مشین	(۱۷۶۴ء)
بنسن	(جرمنی)	گیس سٹو و برنر	(۱۸۵۵ء)
سمنز	(انگلستان)	برقی چولھا	(۱۸۶۱ء)
جے جے ٹامسن	(〃)	الیکٹران	(۱۸۹۷ء)
راس	(〃)	ملیریا کا سبب	(۱۸۹۸ء)
آئن سٹائن	(جرمنی)	نظریۂ اضافیت	(۱۹۰۵ء)
جے-ای اور جے-ایم مانٹگالفے	(فرانس)	غبارہ	(۱۷۸۳ء)
میکملن	(سکاٹ لینڈ)	بائیسکل	(۱۸۴۰ء)
وائیلے	(فرانس)	بے دُود بارود	(۱۸۸۶ء)
لیومیئر	(〃)	متحرک تصاویر کا پروجیکٹر	(۱۸۹۵ء)
کارن	(جرمنی)	تصویر بذریعۂ تار بھیجی گئی	(۱۹۰۴ء)
مرگینتھلر	(امریکا)	لائنوٹائپ	(۱۸۸۵ء)
فارن ہائٹ	(فرانس)	پارے کا تھرمامیٹر	(۱۷۲۱ء)
گلیلیو ۱۵۶۴-۱۶۴۲ء	(اٹلی)	دوربین	(نامعلوم)
سوآریا	(فرانس)	گندھک کی دیا سلائی	(۱۸۳۱ء)
واٹرمین	(امریکا)	فاؤنٹین پین	(۱۸۸۴ء)
ریڈیو کارپوریشن	(〃)	وائرلیس تصاویر	(۱۹۲۴ء)
جلٹ	(امریکا)	سیفٹی ریزر	(۱۹۰۴ء)

حامد علی خاں
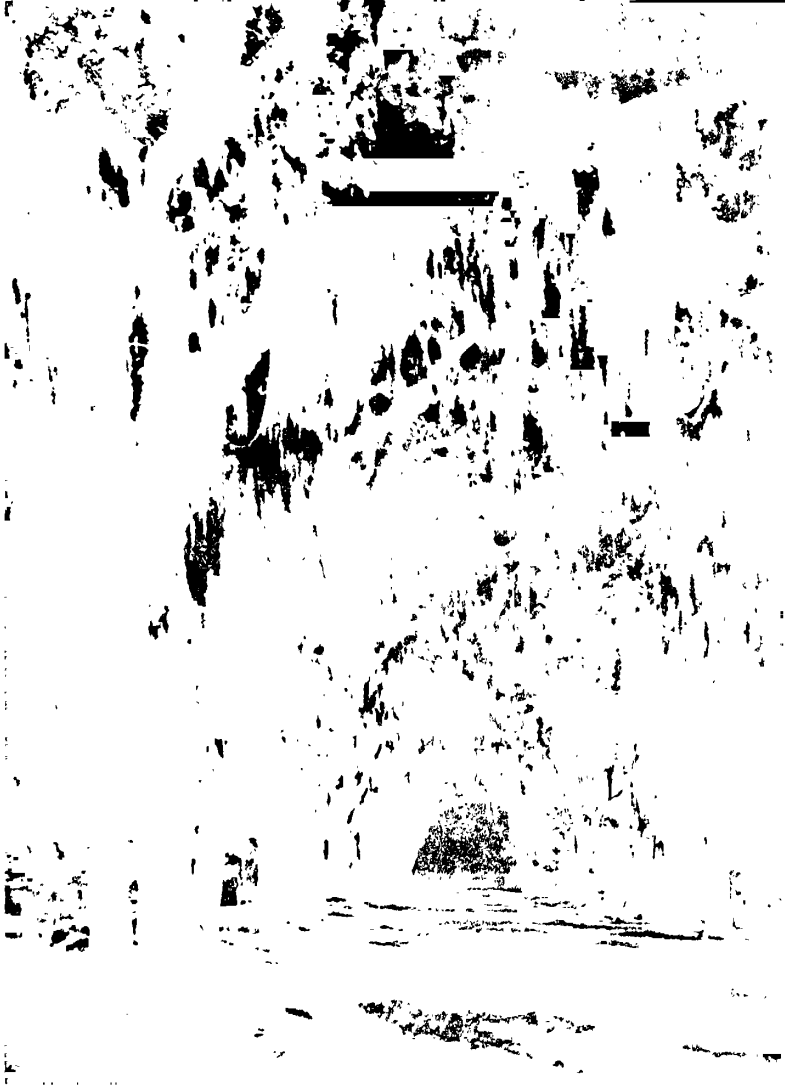
چھاؤں گھنی گھنی کہیں، دھوپ چھنی چھنی کہیں
تیرہ و تار روح میں عِلم کی روشنی ہوئی

پنجاب اور قومی زبان کا مسئلہ

ہندستان میں قومی زبان کے مسئلے سے کونسا تعلیم یافتہ شخص واقف نہیں؟ تقریباً تین چوتھائی صدی سے یہ جھگڑا جاری ہے۔ سو سال سے زائد عرصہ گزر گیا کہ انگریزی حکومت نے فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری و عدالتی زبان قرار دیا۔ اس کے تیس تیس برس بعد پہلے بہار اور پھر یو۔پی میں ہندی کا شاخسانہ کھڑا کیا گیا یہاں تک کہ بیسویں صدی کے شروع میں یو۔پی میں اردو کے ساتھ ہندی کو بھی عدالتوں میں کچھ عمل دخل حاصل ہو گیا۔

۱۹۱۰ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کی بنیاد پڑی اور پہلے مالوی جی اور پھر گاندھی جی کی مسلسل کوششوں سے ہندوستان کے کونے کونے میں ہندی کا پروپگنڈا شروع ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء میں کانگرس نے مسلمانوں کو اطمینان دلانے کے لئے یہ قرارداد منظور کی کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہے جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو اردو اور دیوناگری دونوں خطوں میں لکھی جاتی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں گاندھی جی نے ایک نئی نام نہاد ادبی انجمن "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" بنائی اور اس کی زبان "ہندی الفوا ہندوستانی" قرار دی۔ ۱۹۳۷ء میں کانگرس نے سات صوبوں میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی ہندوستانی کی آڑ میں ہندی رائج کر دی اور یہ کام اس شد و مد سے کیا کہ تھوڑی مدت میں اردو والوں کو اپنی کس مپرسی کا احساس ہونے لگا۔ کہاں ہندو مسلمانوں کی وہ مشترک زبان جو اُن کی مشترک تہذیب کا ایک واضح نشان تھی اور کہاں یہ نئی سنسکرتی ہندی جس سے محض ویدک تہذیب کی یاد تازہ ہونے لگی! ہندوستانی تہذیب کی مشترک زندگی کو سخت دھکا لگا۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنے مشہور مقالے "زبان کا مسئلہ" (مطبوعہ ۱۹۳۷ء) میں لکھا ہے کہ "انیسویں صدی میں پہلے ہندوؤں میں اپنی جداگانہ قومیت کا احساس پیدا ہوا۔ اور انھوں نے ہندی کی طرف رجوع کیا اس کے بعد مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہوا۔ اور وہ اردو کو اپنی خاص ملکیت سمجھنے لگے"۔ یعنی پنڈت نہرو کے نزدیک زبان کی علیحدگی کا آغاز ہندوؤں کی طرف سے ہوا۔

نئی ہندی کے خوفناک نمونوں سے اردو کی دنیا کافی آشنا ہو چکی ہے۔ گاندھی جی کی ۱۹۳۶ء کی پریشدی تقریر کس نے نہیں سنی!

"اس سبھا کا سبھاپتی مجھے رہنے کے کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرینت ہوتے ہیں۔ . . . میری درشٹی میں تو ایسے ہونی چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ"

سبھاش بابو نے فروری ۱۹۳۸ء میں بحیثیتِ صدرِ کانگرس ارشاد فرمایا:

"سبھاپتی مہاشے اور متر و! آپ نے آگامی ورش کے لئے اکھل بھارت ورش راشٹریہ مہاسبھا کا ادھکش نرواچت کر میرا جو سمان کیا ہے وغیرہ وغیرہ"

شری سمپورنانند جی نے اگست ۱۹۳۸ء میں بحیثیتِ وزیرِ تعلیم جو "دیا کھیان" نشر کیا، وہ ان سے کم نہیں!

"آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک لبشستا ہے کہ شکشنڈ شر شمیا کے بہت کا اگر شتر بہت دشدہ اور بیابک ہوگیا ہے وغیرہ وغیرہ"

قلمدانِ وزارت کو بالائے طاق رکھنے کے بعد بھی آپ ساکنانِ خطۂ خاک کو اسی قسم کی علمی زبان میں مخاطب فرماتے ہیں چنانچہ حال میں آپ نے جیل خانے سے جو خطبۂ صدارت لکھ کر ہندی ساہتیہ سمیلن کے انتیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ پونا میں (۲۵ دسمبر ۱۹۴۱ء کو) غائبانہ طور پر پیش کیا۔ اس کے چند جملے تبرکاً یاد رکھنے کے قابل ہیں:-

"سواگت کچش مہودے اور مترو سمیلن کے سبھاپتی پد پر آسین کر کے آپ نے مجھے جو شمان پردان کیا ہے۔ اس کے لئے میں آپ کا رینی ہوں"...... علیٰ ہٰذا القیاس

اور صرف ایسی اعلیٰ ترین چوٹی کی ہستیوں پر ہی موقوف نہیں بلکہ یہ سارا آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ کئی سو سال کی قدیم ہندی نے جو فطری طور پر ترقی کرتے کرتے اردو بنی اور جس کی کھڑی بولی کی بعض صورتیں اب بھی انسانوں کی زبان کہلا سکتی ہیں انیسویں اور بیسویں صدی میں آکر ایک عجیب و غریب بھیانک شکل اختیار کر لی ہے جس کا تصور بھی ہندوستانی دماغ کے لئے سخت پریشان کر دینے والا ہے۔ آسانی، ضروری، اخبار، علاوہ، امید، عمر، شروع، فتح، سپاہی، خوش، تعلیم، آمدنی، ختم، ان الفاظ کو کون بھلا مانس ہندوستان میں نہیں سمجھتا لیکن نہیں یہ معصوم الفاظ اب سرلتا۔ آوشیک۔ سماچار پتر۔ اتریکت۔ آشا۔ آیو۔ آرمبھ۔ وجے سینگ۔ پرسن شکشا۔ انت سماپت کر دئے گئے ہیں خیر یہ تو عرب اور فارس سے آئے تھے۔ ان کا یہ قصور تھا لیکن نہیں یہاں کے سیدھے سادے الفاظ کی بھی بری گت بن رہی ہے، اب برس ورش ہے بسنت وسنت، دکھن۔ دکشن گمنی۔ سنکھیا بھلا مانس۔ سد پرش۔ بھرادرشٹ۔ گھمنڈ۔ ابھمان۔ یہاں تک کہ بیچاری مٹی ماٹی ہوگئی ہے۔ پانی پانڑی اور سمندر سمدر۔ اعوذ برب الناس۔

آخر اس عجوبہ پسندی اور اس جدت طرازی کی کیا وجہ ہے؟ آخر بیٹھے بٹھائے ایک ہوشمند انسان کیوں پانی کو "پانڑی" اور "دکھن" کو "دکشن" کہنے لگے؟ بجائے "خوش" ہونے کے "پرسن" ہو جائے۔ اور بجائے آزادی کے "سوتنترتا" کے لئے لڑنے لگے؟ اس قلا بازی کے کیا معنی ہیں؟ سنئے یہ محض ایک معمولی لفظی یا لسانی کھیل نہیں، بلکہ ایک زبردست تہذیبی اور سیاسی انقلاب ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا عہدِ سلطنت ختم ہونے کے بعد جب انگریزوں نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھالی تو ہندوؤں کی ایک جماعت نے نہیں معلوم کن اسخاروں کے ماتحت پرانی ہندو تہذیب کو از سرِ نو زندہ کرنے کی ٹھان لی۔ اور ساتھ ہی اپنا نصب العین بنایا کہ اپنی زندگی میں سے ہر اس چیز کو نکال باہر کریں جس سے اسلام یا مسلمانیت کی ذرا سی بو بھی آتی ہو۔ اِدھر اسلامی اثرات ملک کے رگ و پے میں اس حد تک سرایت کر چکے تھے کہ ان کا اخراج گویا گوشت سے ناخن کے جدا ہونے کے برابر ہو گیا چیر پھاڑ کرنے والوں نے یہ نہ سوچا کہ وہ اپنے ہی تن من پر کیا ظلم ڈھا رہے ہیں۔ ساہتیہ سمیلن کے پچھلے اجلاس میں سمپورنانند جی نے فرمایا کہ اردو کے متعلق جو کہا جاتا ہے کہ وہ کم از کم یو۔پی کی زبان ہے، یہ بالکل غلط ہے۔ اردو تو فقط ایک مصنوعی زبان ہے جسے ہم ہرگز ہندوستانی تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ہرگز عوام کی زبان نہیں بن سکتی۔ وہ محض

[...]التوں میں گھومنے والے اشخاص کی رائے کا مظہر ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندی ہندوستانی قوم کی آواز ہے جسے کوئی دبا نہیں سکتا۔ وہ ہندو
[...]وایات اور ویدوں سے قبل کی روایات کی حامل ہے۔ اسے چند فرقہ پرست یا اُن کے بعض مددگار جو اُن کے پٹھو بنے ہوئے ہیں تباہ نہیں کر سکتے
[...]یا کہ ہندی میں اکثریت سنسکرت کے الفاظ کی ہوگی۔ ریڈیو والے ان الفاظ کو بگاڑ رہے ہیں مثلاً وہ بجے ماترم کو بجے ماجیت کہتے ہیں۔ نیز
[...]جی اس سے بھی سخت برہم ہوئے کہ ریڈیو والے ہمیشہ آداب عرض کہتے ہیں کبھی نمسکار نہیں کہتے۔ دیکھا آپ نے کس طرح ویدک تہذیب
[...]اور اس پر اصرار ہو رہا ہے۔ کیا کہتے ہیں اس بارے میں وہ لوگ جنھوں نے السلام علیکم چھوڑ کر آداب عرض کی وسطی راہ اختیار کی ؟

اسی طرح پنڈت امرناتھ کاک نے پنجاب ہندی ساہتیہ سمیلن کے تیرھویں سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ۲۸ جنوری
[...]۱۹۴۱ کو لاہور میں کہا کہ بھارت ورش ایک ہے۔ اور اس کی ایک ہی مشترک زبان ہے اور وہ ہندی ہے اور یہ کہ ہندی پرچار ہی سے
[...]ہندو دھرم۔ ہندو تمدن اور ہندو کلچر کی حفاظت تبلیغ اور ترقی ہو سکتی ہے " کاک صاحب کے نزدیک " اردو کوئی خدا گانہ ہستی ہی
[...]" اور ہندی انسانی گفتگو کا ایک ایسا مظہر ہے جو انسان کے اندر ربانیت کی نشانی ہے "

کہئے۔ اس کے بعد کسے گفتگو کا یارا ہے ؟

۵ر فروری ۱۹۴۱ء کو بہار ساہتیہ سمیلن کے سترھویں سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے بابو راجندر پرشاد نے کہا کہ ہندی
[...]زندہ زبان ہے جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ صدرِ استقبالیہ نے کہا کہ ہندی ہی قومی زبان ہے اور ہندی اردو
[...]نے کی کوشش فضول اور مصیبت خیز ثابت ہوگی۔ ۳۰ر مارچ ۱۹۴۱ء کو کاکا کالیلکر صاحب کی کوشش سے سندھ میں راشٹر بھاشا سمیلن
[...]س ہوا جس کے لئے گاندھی جی اور ٹیگور نے خاص پیغامات بھیجے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں مسلمانوں کے ایک وفد نے حکومتِ سندھ کو توجہ دلائی
[...]ہندی کے پرچارک سندھی زبان کو سنسکرت آمیز بنانے کے نیک کام میں مصروف ہیں۔ بنگالی مسلمانوں کو بھی مدت سے اسی قسم
[...]ایت ہو رہی ہے یعنی پراچین بھارت کا پریم بھارت ورش کے کونے کونے میں ایک آفت مچا رہا ہے مسلمانوں کی ہزار سالہ ہندوستانی
[...]کو باقاعدہ طور پر مٹایا جا رہا ہے۔ کیا کوئی انصاف پسند۔ خوددار شخص اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھ سکتا ہے ؟

اس رویّے پر چند برس سے کانگریسی مسلمان تک نالاں ہیں اور قابلِ رحم حد تک نالاں ہیں۔ کیا کریں ان کی متحدہ قومیت کی امیدوں
[...]زبان کے طوفان نے پانی پھیر دیا ہے۔ ڈاکٹر اشرف نے ۲۶ ستمبر ۱۹۳۸ء کو کانگریس کمیٹی میں یہ قرارداد پیش کی کہ کانگریس اپنی ۱۹۲۵ء
[...]ندوستانی والی قرارداد کو دہرائے اور اصرار کرے کہ کانگریس اردو ہندی بحث سے الگ ہے۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔ جولائی ۱۹۴۱ء
[...]دو مسلم کانفرنس والوں نے بھی لکھنؤ میں یہی زبان کا دکھڑا رو دیا۔ مگر بے فضول۔ نومبر میں نیشنلزم کے حامی شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ بھی حکومت
[...]ر کی ہندی نواز پالیسی کے خلاف غرّائے اور دہاڑے مگر نیشنلسٹ حلقوں میں ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ لاہور میں ۹ر دسمبر کو آل پنجاب مسلم
[...]شنلسٹ فیڈریشن نے جس میں کانگریسی اور احراری عنصر کا غلبہ ہے۔ اس امر کا مظاہرہ کیا کہ اردو ہی ملک کی قومی زبان ہے۔ اور اس کی
[...]ت کرنا درحقیقت متحدہ قومیت کی مخالفت کرنا ہے۔ مگر بے سود! ابھی ۲ر اپریل ۱۹۴۲ء کو جمعیت سبھا میں نیشنل کانفرنس والوں نے

بہتیرا شور مچایا کہ برائے خدا اردو ہندی کا جھگڑا شروع کر کے کشمیر میں قومیت کا جنازہ نہ نکالا جائے، مگر کون سنتا ہے طوطی کی نقار خانے میں؟ واقعہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی اس جماعت نے جو اس وقت اپنی قوم میں سب سے زیادہ اثر رکھتی ہے، فیصلہ کر لیا ہے کہ اردو چونکہ مسلمانوں کی زبان ہے اس لئے ہندو اسے چھوڑ کر اپنی اصلی زبان یعنی سنسکرتی ہندی کی طرف رجوع کریں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سر سپرو اور پنڈت کیفی سی انصاف پسند اور بلند نظر ہستیاں موجود ہیں۔ رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری کے سے کئی حق پسند ادیب اب بھی سچ بات کہنے سے نہیں جھجکتے لیکن بدقسمتی سے اکثریت اب ان لوگوں کی ہوتی جاتی ہے جو یا اردو سے منہ پھیر چکے ہیں یا چپ چاپ دبکے بیٹھے ہیں۔

فراق صاحب راقم کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۵ جنوری ۱۹۴۶ء میں لکھتے ہیں "میں اردو کے طرف داروں کا یہ دعویٰ خلوص پر مبنی سمجھتا ہوں کہ اردو اور صرف اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ مجھے اس بات سے بھی دکھ ہوتا ہے کہ ہندی کے طرف دار پانچ سات فی صدی بھی وہ فارسی عربی الفاظ اپنی تحریروں میں نہیں لاتے جو ہندوستان کی زندگی کے اجزا بن گئے ہیں۔ مجھے ہندی والوں کی اس تنگ نظری پر شرم آتی ہے۔ مگر میں مستقبل سے ناامید نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ سو فی صدی ہندو اردو چھوڑنا چاہیں گے۔ اور سو فی صدی مسلمان اردو سیکھنا چاہیں گے، یہی سہی"۔ "کیا کئی کروڑ مسلمان صرف اپنے بل بوتے پر اردو کو زندہ نہیں رکھ سکتے؟" اور اخیر میں یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ "ہندی والے کچھ اردو اور اردو والے کچھ ہندی سیکھ لیں"۔ یہ ہے ایک آزاد خیال دور اندیش ہندو کی رائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صورتِ حال کیسی نازک ہے اور ہماری ذمہ داریاں کس قدر اہم ہو گئی ہیں؟

اس زبان کے مسئلے پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ پہلے نیشنلسٹ پہلو لیجئے۔ ہندوستان سے ملک میں جس میں طرح طرح کے شدید اختلافات ہیں اگر ایک نیشن وجود میں آ سکتی تھی تو وہ شاید اسی طرح کہ یہاں ایک ایسی مشترکہ قومی زبان تسلیم کر لی جاتی جس میں مختلف قوموں کی تہذیب کے عناصر موجود ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ زبان سوائے اردو کے اور کوئی نہ ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سر سپرو سے محبِ وطن اپنے ہم مذہبوں کی تنگ نظری پر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہندوؤں کی اکثریت نے اردو کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے۔

تعلیمی نقطۂ نگاہ سے دیکھئے۔ اب ہندوستان کے اکثر ماہرینِ تعلیم اور کئی یونیورسٹیاں اس بات کا اظہار کر چکی ہیں کہ وقت آ گیا ہے کہ بجائے ایک اجنبی زبان کے ذریعۂ تعلیم اپنی زبان کو بنایا جائے۔ سر عبدالقادر سے سناتن دھرم کالج لاہور نے اپنی گزشتہ کانووکیشن (منعقدہ ۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء) کے موقع پر فرمائش کی کہ وہ اپنا ایڈریس زبانِ انگریزی کی بجائے اردو میں دیں۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور میں کانووکیشن کا ایڈریس اپنی زبان میں دیا گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد پرنس آف ویلز کالج جموں کی کانووکیشن میں پرنسپل صاحب کی تجویز کے مطابق سب کی تمام کارروائی انگریزی کی بجائے اردو میں کی گئی۔ اس موقع پر خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر نے جو ایڈریس دیا وہ قابلِ غور ہے۔ انھوں نے کہا کہ اپنی زبانوں کو چھوڑ کر کسی غیر زبان میں تعلیم حاصل کرنا۔ اور اس کو اپنی روزمرہ کی بات چیت اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنانا ایک تعلیمی حماقت اور ذہنی غلامی ہے۔" اس سے بڑھ کر یوں ادعا م ان لوگوں کے [illegible]

اس ملکی نقصان کے علاوہ ادبی نقصان یہ ہوتا ہے کہ کوا ہنس کی چال چل کر اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن بدقسمتی سے شمالی ہند کے تعلیمی حلقوں میں زبانوں کی رسہ کشی جاری ہے مختلف فرقے اپنی زبان جدا جدا بتاتے ہیں۔ اب مشترک ذریعہ تعلیم ہو تو کونسا ہو؟

اس فرقہ بندی کے ساتھ اپنے اپنے قومی کلچر کا سوال وابستہ ہے۔ شمالی ہند میں کچھ عرصے سے کلچر ایک حد تک مشترک ہو کر ایک مشترک زبان میں ظاہر ہو رہا تھا مسٹر راج گوپال اچاریہ نے پاکستان کے خلاف یہی وجہ پیش کی تھی کہ ہندو مسلمانوں کا ایک کلچر ہے جس کا مظہر اردو ہے لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو اردو کو گڑھے میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس وقت اردو کو ہندوستانی بنا دیا جاتا ہے اور ہندوستانی کو ہندی۔ پھر علاوہ بیچارہ مشترک کلچر بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسے کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ ہندوستانی نیشنلزم اس کس مپرسی پر جتنے آنسو بھی بہائے کم ہیں۔

جداگانہ کلچر اور جداگانہ زبانوں کا تازہ ترین مظاہرہ پنجاب میں ہوا اور ہو رہا ہے۔ ۸ ردسمبر ۱۹۴۲ء کو لاہور میں ایک اردو کانفرنس ہوئی جس کی صدارت کرتے ہوئے مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا "حضرات! آپ کا صوبہ بہت قابلِ مبارک باد ہے کہ یہاں کم سے کم لسانی اتحاد ہے۔ آگے چل کر یہ اتحاد آپ کے بہت کام آئے گا" لیکن اس کے دوسرے ہی روز ۹ ردسمبر کو جب میاں عبدالحی وزیر تعلیم نے پنجاب اسمبلی میں اپنی ایک جوابی تقریر میں کہا کہ پنجاب میں ذریعہ تعلیم اردو ہے تو اس پر اسمبلی میں اور باہر ہندو پریس میں اور پلیٹ فارم پر وہ دھواں دھار تقریریں ہوئیں مقالات لکھے گئے اور دھمکیاں دی گئیں کہ حکومت کو پیچھے بعد دیگرے بہت سے نرم نرم بیانات شائع کرنے پڑے تاکہ غلط فہمی دور ہو لیکن غلط فہمی تو وہاں دور ہو سکتی ہے جہاں دل صاف ہوں اور جہاں دل بدل چکے ہوں، جہاں نیت ڈانواں ڈول ہو چکی ہو وہاں سرکاری بیانات اور صلح کے پیغامات سے کیا بنتا ہے؟ ہندوؤں کا وہ طبقہ جسے ہندوؤں کی قیادت کا دعویٰ ہے مصر ہے کہ ہندوؤں کی زبان ہندی ہے۔ وہ جو کہیں گے ہندی میں اور جو سنیں گے ہندی میں۔ اسی طرح سکھوں کا وہ طبقہ جسے سکھوں کی نمایندگی کا دعویٰ ہے مصر ہے کہ سکھوں کی زبان گورمکھی ہے۔ وہ پڑھیں گے تو گورمکھی میں اور نہ پڑھیں گے تو گورمکھی میں۔ یہ ہے وہ راہ جو ہمارے غیر مسلم پنجابی بھائیوں نے اختیار کی ہے۔ اس پر کوئی سوائے اس بات کے اور کیا کہہ سکتا ہے کہ یہ راہ سیدھی پاکستان کو جاتی ہے:

پنجاب کی تاریخ پر نظر ڈالیے، گزشتہ سال (۱۹۴۲ء) میں اردو کی ابتدائی تاریخ کے متعلق جو تین کتابیں "نظم اردو" "ہندو ادیب" "تاریخ ادب اردو" غیر پنجابی اصحاب نے لکھی ہیں۔ وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی۔ ڈاکٹر گریہم بیلی کی بھی یہی رائے ہے ملاحظہ ہو:- اردو کی بنا جو غالباً اردو کی پہلی صورت تھی ۱۰۲۷ء میں رکھی گئی جب محمود غزنوی نے پنجاب کو اپنی مملکت محروسہ میں شامل کر لیا۔ اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے لازمی طور پر ایک ملی جلی زبان وجود میں آنی شروع ہوئی" "ہماری زبان" ۱۲ر مارچ ۱۹۴۲ء لکھتا ہے: "یہ مانا جائے یا نہ مانا جائے لیکن اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ ان قوموں کا جنھوں نے اردو بنائی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ میل ملاپ پنجاب ہی میں رہا۔ اسی وجہ سے اردو کی پنجاب میں ایک اصل حیثیت قائم ہے۔ "یہاں اردو میں پنجابی کے الفاظ کثرت سے ہیں مثلاً دسنا۔ نسنا۔ ہونٹھی وغیرہ۔ گورو نانک (متوفی ۱۵۳۹ء) کا شعر ہے۔

سانس ماس سب جیو تمہارا ..... تو ہے کھرا پیارا نانک شاعر ہو کہت ہے ..... سچے پروردگارا !

اس زبان کو ہندی کہو۔ ہندوستانی کہو کچھ کہو۔ یہ آج کل کی ہندی سے مختلف اور آج کل کی اردو کے قریب ترین ہے پس ثابت ہوا کہ پنجاب کا اردو سے گہرا اور پرانا اور اٹل تعلق ہے جو نو سو سال سے قائم ہے اور جسے دنیا کی کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۰۲۲ء سے لے کر آٹھ سو سال سے زیادہ عرصے تک فارسی پنجاب کی سرکاری زبان بنی رہی۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے وسط میں جب پنجاب انگریزی عمل داری میں شامل ہوا تو حکومت نے فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری اور تعلیمی زبان قرار دیا۔ ۱۸۵۵ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے لندن سے اپنے ایک مراسلے میں لکھا کہ پنجابی زبان کا برقرار رکھنا یا اس کے انحطاط کو روکنا ٹھیک نہیں پنجاب اور بعض دوسرے صوبوں میں جو کم پایہ مقامی بولیاں ہیں" اردو ہندوستانی" ان پر فوقیت رکھتی ہے۔ لہذا پہلے تعلیم یافتہ لوگوں کو اس سے آشنا کرنا چاہیئے۔ بعد میں عوام الناس پر خود بخود اس کا اثر پڑے گا[51]۔ لارڈ لارنس نے بھی اردو ہی پر زور دیا اور بتایا کہ اردو بڑی تیزی سے عوام میں پھیل رہی ہے[52]۔ ڈائرکٹر آف انسٹرکشن پنجاب نے ۱۸۵۶-۵۷ء کی رپورٹ میں) لکھا کہ یہ شروع ہی میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ سرکاری سکولوں کی زبان اردو اور فقط اردو ہوگی۔ جو فارسی رسم خط میں لکھی جائے گی۔ لوگوں کو ان کی اپنی زبان میں تعلیم دینا ضروری تھا اور اردو ان کی اپنی زبان ہے۔ دیہات کے سکولوں اور تحصیل کے سکولوں میں اردو ہی کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے[53]۔ ۱۸۸۱-۸۲ء میں ڈائرکٹر نے لکھا کہ سکھوں کے زمانے میں صوبے کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ انگریزی حکومت نے اس کی جگہ اردو کو سرکاری زبان بنایا۔ اس لیے شہروں اور دیہات میں ہمیں اسی زبان میں تعلیم دینی چاہیئے جب تک کہ حکومت صوبے کی سرکاری زبان کو بدل نہ دے[54]۔ اس کے بعد اس نے لکھا کہ" اس صوبے میں بہت سی بولیاں ہیں پس اگر ہم لوگوں کی اصلی مادری بولی میں انھیں تعلیم دینا چاہیں تو ہمیں ایک بولی میں نہیں بلکہ کئی بولیوں میں الگ الگ تعلیم دینی پڑے گی"۔ بیس برس ہوئے انگلستان اور سکاٹ لینڈ میں بھی یہی حالت تھی لیکن کبھی کسی نے وہاں یہ تجویز پیش نہیں کی کہ مختلف بولیوں کو برقرار رکھا جائے۔ حالانکہ سکاٹ لینڈ کی زبان میں وہ ادبی خوبیاں ہیں جن سے پنجابی قطعاً محروم ہے[55]۔ آخیر میں وہ لکھتا ہے کہ" یہ جو کہا جاتا ہے کہ پنجابی بچوں کی تعلیم اردو پڑھنے کی وجہ سے ناقص رہ جاتی ہے۔ بالکل غلط ہے صوبے کے بہترین پرائمری مدرسے میں دیہاتی جتنی جلدی اردو پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔ اتنی جلدی خود دہلی کے سکولوں میں بھی طلبہ نہیں سیکھ سکتے[56]۔ یہ درست ہے کہ حکومت نے زبان کے متعلق اپنی اس پالیسی کو زبردستی تمام تعلیمی اداروں پر عائد نہیں کیا۔ اور آریہ سماج کے چند سکولوں میں ہندی میں تعلیم دی جاتی رہی خصوصاً لڑکیوں کے سکولوں میں لیکن وہاں بھی جو ہندی استعمال کی جاتی رہی اس میں فارسی کا خاصا عنصر تھا۔ دسمبر ۱۸۸۳ء میں حکومت نے ایک سرکاری سکول میں گورمکھی کی جماعت کھولنے سے انکار کر دیا۔ اور اس طرح اپنی تعلیمی پالیسی کی پھر تصدیق

---

۵۱ دیکھو پنجاب ایجوکیشن رپورٹ بابت ۱۸۸۱ء صفحہ ۳۷-۳۸ پیرا ۹۱ ۵۲ ایضاً صفحہ ۳۸ پیرا ۹۳ ۵۳ رپورٹ ۱۸۵۶-۵۷ء صفحہ ۱۰ پیرا ۶۹

۵۴ رپورٹ ۱۸۸۱-۸۲ء صفحہ ۳۹ پیرا ۹۶-۹۷ ۵۵ ایضاً پیرا ۹۸

۵۶ ایضاً صفحہ ۴۰ پیرا ۱۰۰ ۔

کردی جس کے مطابق تعلیمی زبان اردو اور صرف اردو رہی ہے[۵۱]۔ ۱۶-۱۹۱۵ء کی رپورٹ مظہر ہے کہ "لڑکوں کے سکولوں میں اردو ہی کو بطور سکول ورنیکلر کے پسند کیا جاتا ہے کہیں کہیں پنجابی بطور ثانوی زبان کے پڑھی جاتی ہے۔ اور ہندی زیادہ تر لڑکیوں کے سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے[۵۲]۔ رپورٹوں میں بار بار جو ورنیکلر کا ذکر آتا ہے اس سے مراد صرف اردو ہی ہے جیسا کئی مثالوں سے واضح[۵۳] ہے۔

"حال کی لسانی شورش" میں کہا گیا ہے کہ پنجاب ایجوکیشن کوڈ بابت ۱۹۱۲ء میں ورنیکلر پرائمری سکولوں کے نصاب کے سلسلے میں ورنیکلر کے لفظ کے سامنے اردو۔ پنجابی یا ہندی تینوں زبانوں کا ذکر ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ پنجاب میں تینوں زبانیں سرکاری طور پر ذریعہ تعلیم مانی گئی ہیں۔ اس سے زیادہ نادانی یا تجاہلِ عارفانہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ پنجاب یونیورسٹی تحقیقاتی کمیٹی (۳۳-۱۹۳۲ء) بھی نہ جانے کیوں اسی مغالطے میں پڑ گئی۔ ۱۸۸۸ء، ۱۸۹۰ء اور ۱۹۰۵ء کے کوڈ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ صرف اردو ہی سرکاری ورنیکلر ہے۔ پہلی جماعت کے تحت میں صرف اردو قاعدے کا ذکر ہے۔ باقی ماندہ جماعتوں میں بھی صرف اردو نصاب مذکور ہے حساب، تاریخ وغیرہ سب کے متعلق اردو کتابوں کا ذکر ہے یعنی ذریعہ تعلیم صرف اردو ہے۔ مہاجنی ابتدائی سکولوں میں بھی ہندی پنجابی کا کہیں ذکر نہیں بلکہ دوسری جماعت میں اردو کا قاعدہ اور پہلی کتاب مذکور ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرکاری یا لوکل باڈیز کے تعلیمی اداروں میں صرف اردو ذریعہ تعلیم رہی ہے اور ورنیکلر کا لفظ اردو کا مرادف ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ۱۹۱۲ء کے کوڈ میں ورنیکلر کے ساتھ (اردو۔ ہندی۔ پنجابی) تینوں زبانوں کا ذکر کیا گیا لیکن اس سے صرف یہ مراد ہے کہ جو پرائیویٹ تعلیمی ادارے ہندی اور پنجابی میں تعلیم دینا چاہیں وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ اگر حکومت خود ذریعہ تعلیم میں کوئی تبدیلی کرنا چاہتی تو سرکاری سکولوں میں اس کا کچھ ثبوت ملتا۔ کم از کم حکومت کوئی اعلان شائع کرتی جس سے اس کی تعلیمی پالیسی میں کسی تبدیلی کا اظہار ہوتا۔ اسی طرح ۱۹۳۴ء کا محکمہ تعلیم کا ایک اعلان ہے کہ طلبہ ورنیکلر فائنل یعنی آٹھویں جماعت کا امتحان اردو ہندی یا پنجابی میں دے سکتے ہیں۔ یہاں بھی صرف امتحان کا ذکر ہے۔ ذریعہ تعلیم کا ذکر نہیں۔ مختلف پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے طلبہ جن کا ذریعہ تعلیم ہندی یا پنجابی ہو۔ اس امتحان میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء کے امتحان میں ۱۴٬۷۶۴ طلبہ نے اردو میں ۱۸۹ طلبہ نے ہندی میں اور ۵ طلبہ نے پنجابی میں جواب دیئے۔ یونیورسٹی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (صفحہ ۲۰۲) سے بھی یہی ثابت ہے کہ پنجاب میں آٹھویں جماعت تک نصاب کی کتابیں بالعموم اردو میں ہوتی ہیں اور آخری امتحان میں پرچوں کے جوابات اردو ہی میں دیئے جاتے ہیں۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ نظام تعلیم میں ذریعہ تعلیم کی موجودہ آسانیاں برقرار رکھی جائیں لیکن کہا کہ مختلف زبانوں کی مختلف جماعتیں بنا کر یوں سکولوں کے حصے بخرے کرنے کو ہم خوف کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے بہت سا زائد خرچ بھی ہو گا۔ اور جو بات اس سے بڑھ کر افسوسناک ہے وہ یہ کہ قومیتوں کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ اور بھی وسیع ہو جائے گی۔ کمیٹی کی یہ بھی رائے تھی کہ اگر ذریعہ تعلیم کی زبان کافی ترقی یافتہ نہ ہو تو وہ غیر ملکی زبان سے بھی زیادہ نقصان رساں ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی رپورٹ میں علامہ یوسف علی نے پنجابی بولیوں پر ایک نوٹ لکھا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:-

---

[۵۱] رپورٹ ۸۸-۱۸۸۷ء صفحہ ۶۶-۶۵ پیراگراف ۹ [۵۲] رپورٹ ۱۶-۱۹۱۵ء صفحہ ۱۶ [۵۳] رپورٹ ۰۶-۱۹۰۵ء صفحہ ۱۱ پیراگراف ۷، اور رپورٹ ۲۴-۱۹۲۳ء بسلسلہ نصاب پرائمری

سرسری طور پر دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کی زبان پنجابی ہے اور اسی کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیئے لیکن فی الحقیقت پنجابی محض ایک جغرافی فقرہ ہے۔ پنجابی کی کئی بولیاں ہیں جن کے بولنے والے ایک دوسرے کی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ سر جارج گریرسن نے اپنی کتاب "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" (جلد ۹ حصہ اوّل صفحات ۶۱۱ تا ۶۴۸) میں اس پر خالص علمی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مغربی پنجاب کی بولیاں آریائی زبانوں کے اس زمرے میں بھی شامل نہیں جس میں مشرقی پنجاب کی بولیاں شامل ہیں۔ ستّر لاکھ اشخاص مغربی بولیاں بولتے ہیں۔ اور ایک کروڑ بیس لاکھ لوگ مشرقی بولیاں۔ گریرسن کی رائے ہے کہ ہندوستانی پنجابی کی جگہ لے رہی ہے۔

غرض پنجاب کی خاص حالت کے پیشِ نظر اگر کوئی زبان یہاں مختلف قسم کے کام سرانجام دے سکتی ہے تو وہ اردو ہے۔ جنوب مشرقی پنجاب کو چھوڑ کر باقی حصے میں پنجابی بولی جاتی ہے لیکن وہ ایک پنجابی درحقیقت کئی قسم کی پنجابیوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ بریں اگر وسطی پنجاب کی بولی کو مستند مان لیا جائے تو بھی وہ اس قابل نہیں کہ ایک ترقی یافتہ زبان کی جگہ لے سکے۔ جدید علمی گورمکھی، جدید ہندی کی طرح ایک سنسکرتی مرکب بن رہی ہے۔ اور کسی طرح اہلِ صوبہ کے لئے قابلِ فہم نہیں رہی۔ لکھنے والی گورمکھی میں صرف کو کیول۔ قابل کو یوگ۔ ذریعہ کو دوارہ۔ آسمان کو آکاش اور کم کاج دا ویلا (کاروبار کا وقت) کو دیپارک سماں لکھتے ہیں۔ حالانکہ بولنے والی پنجابی میں یہ لفظ کبھی استعمال نہیں ہوتے۔ اور بہت کم پنجابی ہیں جو ان الفاظ کو سمجھیں گے۔ سکھ بھی ہندوانہ اثر کے ماتحت عربی۔ فارسی کو چُن چُن کر گورمکھی سے نکال رہے ہیں نہیں معلوم وہ سردار اور گرنتھ صاحب اور بار ھا اور خالصہ اور پنجاب اور پنجابی کے متعلق کیا رویہ اختیار کریں گے؟ ہندی والے بھی اکثر بھول جاتے ہیں کہ ہند عربی کا اور ہندوستان فارسی کا لفظ ہے۔ تنگ نظری آپ اپنی ناک کاٹتی ہے لیکن دیکھ نہیں سکتی کہ کیا ہو رہا ہے؟

یہ پنجابی کی حالت ہے۔ ہندی کا حال اس سے بھی بُرا ہے۔ ہندی کو پنجاب سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ پنجاب میں پریوجن۔ بدھ آدیہ۔ پرفسکار۔ دستاویکار کوئی نہ سمجھے گا لیکن مطلب۔ عقل۔ عزت۔ انعام۔ جیزا اور قبضہ کو دیہات والے بھی آسانی سے سمجھ لیں گے۔ اٹھوا ہندوستانی کو تو صرف یہاں کے پنڈت صاحبان ہی شاید سمجھ سکیں۔

پنجاب کے اٹھارہ روزانہ اخبارات میں سے صرف دو پنجابی میں ہیں اور ایک ہندی میں۔ ان کی اشاعتیں بہت تھوڑی پنجاب کے کل ۸۲۵ اخبارات و رسائل میں سے تقریباً ۵۵۰ اردو میں اور صرف ۶۰ گورمکھی اور ۲۰ ہندی میں نکلتے ہیں تعلیمی دنیا اردو ہی کا بول بالا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں انٹرنس کے امتحان میں ۲۶۹۲۳ نے جغرافیہ اور تاریخ کے پرچوں کے جوابات اردو میں لکھے اور ۲۹۰۸ نے ہندی اور پنجابی میں۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں یہ حالت ہے کہ بقول "ہماری زبان" (مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۴۷ء) کے پنجاب میں اردو کے ہائی اور مڈل سکول تقریباً نو ہزار ہیں۔ خالص ہندی کے ۱۶۸۔ ہندی۔ اردو کے ملے جلے سکول ۱۳۷۔ گورمکھی کا صرف ایک مڈل سکول پرائمری سکول ہیں۔ سرکاری مدارس میں ذریعہ تعلیم صرف اردو ہے۔ اور کل بارڈینگ کے آٹھ ہزار سے زائد سکولوں کے مقابلے میں جن اردو ذریعہ تعلیم ہے صرف ۵۸ ایسے کل بارڈینگ کے سکول ہیں۔ جن میں ذریعہ تعلیم صرف ہندی یا گورمکھی ہے۔ معاصر موصوف لکھتا

اعداد سے صاف ظاہر ہے کہ درحقیقت صوبۂ پنجاب میں ذریعۂ تعلیم اردو ہی ہے۔ اس سے صرف لڑکیوں کے مدرسے مستثنیٰ ہیں۔ جہاں یہ
ون زبانیں ذریعۂ تعلیم ہو سکتی ہیں۔

لیکن باوجود اس حقیقت کے اور باوجود اس امر کے کہ اردو ہی پنجاب کی سرکاری اور عدالتی زبان ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں کی
ض جماعتوں نے گزشتہ چار ماہ سے صوبے بھر میں ایک آفت مچا رکھی ہے۔ انسوس کا مقام ہے کہ یہ لوگ جو نیشنلزم کے علم بردا
یں مشترکِ تہذیب اور مشترک ملکی مفاد کی جڑ کاٹنے میں روز و شب مصروف ہیں۔ اگر واقعی ان کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے جائیں
ور تینوں زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنا دیا جائے تو پنجاب کی تینوں قومیں ایک دوسری سے قطعاً علیحدہ ہو جائیں۔ کوئی مسلمان کسی
ہندو سے۔ اور کوئی سکھ کسی مسلمان سے خط و کتابت نہ کر سکے۔ پھر ان لوگوں کے درمیان کونسی وجہِ اشتراک باقی رہ جائے؟ یہ
صورتِ حال خود ان اقلیتوں کے لئے غایت درجہ ضرر رساں ہے لیکن قومی جوش کو دور اندیشی سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ یہاں
عقل بے اختیار ہے!

حکومتِ پنجاب نے اعلان کیا ہے کہ وہ اس معاملے میں "موجودہ حالت کو برقرار رکھے گی یعنی اس حالت کو جو ۱۹۳۶ء میں
تھی۔ ۱۳ر فروری ۱۹۴۲ء کو پہلے ہندوؤں سکھوں کا ایک وفد اور پھر مسلمانوں کا ایک وفد اربابِ حکومت کی خدمت میں حاضر ہوا
دونوں سے کچھ نہ کچھ کہا گیا۔ کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ لیکن موجودہ حالت کے صحیح معنی پھر بھی ٹھیک سمجھ میں نہ آئے۔

سچ یہ ہے کہ جب سے زبان سیاست کی لپیٹ میں آ گئی ہے، اس کے متعلق بھی زبانی جمع خرچ زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ اور
صحیح عمل بہت کم۔ جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب نے اردو کانفرنس لائل پور (منعقدہ ۲۳ر فروری ۱۹۴۲ء) میں فرمایا: "ہمارے سیاسی
بزرگ سب کچھ کہتے ہیں لیکن ان کی باتوں میں لفظ زیادہ معنی کم ہوتے ہیں۔ صاف بات کبھی نہیں کہتے۔" "خلوت میں کچھ ہے اور جلوت میں
کچھ۔ بالمشافہ ایک بات اور تحریر میں دوسری"۔ "یہ سیاسی ہتھکنڈے کب تک کام دیں گے؟ یقیناً ایک دن ان کا بھرم کھل کے رہے گا۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ پنجاب میں زبان کے معاملے میں "موجودہ حالت" کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ جن علاقوں میں ہندی گورمکھی کا
کبھی کوئی سکول نہیں کھولا گیا۔ وہاں صرف اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ اور آئندہ بھی صرف اردو ہی کو ذریعۂ تعلیم رہنا چاہیئے۔ انصاف پسندی اور
صوبائی یکجہتی کا تقاضا یہی ہے کہ خواہ مخواہ کی تفریق کو تعلیمی معاملات میں دخل نہ دیا جائے۔

یہ سب کچھ صاف ہے اور واضح۔ وہ زبان جو ہندوستان کے طول و عرض میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی اور استعمال کی جاتی ہے
وہ یقیناً اردو ہی ہے۔ اور اردو ہی ہے جس میں مختلف تہذیبوں کا عنصر جو ہندوستان میں آئیں موجود ہے۔ اور اس لئے اردو ہی ہے جو
مختلف قوموں میں ارتباط کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ یہ سب کچھ درست ہے اور واضح لیکن جب یہ کہا جائے کہ نہیں اردو مسلمانوں کی زبان
ہے۔ وہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور ہندو اُسے چھوڑ کر ہندی سیکھیں گے۔ ہندی پڑھیں گے ہندی لکھیں گے اور صرف ہندی
ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں گے اور سکھ صرف اپنے گرو نانک صاحب ہی کی زبان میں لکھیں پڑھیں گے۔ اور اسی میں جئیں مریں گے۔ جب یہ

کہا جائے تو ہمارے پاس اس کا کچھ جواب نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ بہتر ہے آپ کو اپنی راہ مبارک ہو ہمیں اپنی

خدا کا شکر ہے بھلے محبت آپنے کم کی ع

اس حال میں ہم مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ ہماری راہ صاف ہے ہمیں غم و غصے کا اظہار یا احساس نہ کرنا چاہیئے۔ ہم نے اپنی تمدنی زبان فارسی چھوڑ کر ہندوستان کی مشترک زبان اردو اختیار کی۔ اردو ایک نہایت خوش نما۔ ترقی یافتہ اور ترقی پسند زبان ہے۔ اس میں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی خوب صلاحیت موجود ہے۔ اب اگر ہندوؤں نے اس سے بے وفائی کی تو حرج نہیں ہم اس سے نباہ کریں گے۔ اس کا علم و ادب، اس کی مجلسیں، اس کے مشاعرے، ان سب کے دروازے ہندوستان کی سب قوموں کے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ "ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو" لیکن یہ ہمیں خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اب یہ ہماری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

ہمیں اس کے معنی سمجھنے چاہئیں۔ زبان قوم کے تمدن کی علم بردار ہوتی ہے علم بردار گرا تو علم گرا۔ اور علم گرا تو قوم کا نشان گرا۔ اور نام مٹا۔ بے شک ہمارے مصنفین نے اس کے لئے دن رات پسینہ بہایا لیکن ہم لوگوں نے عام طور پر اس کی قدر نہیں جانی۔ سیاست کا پھریرا اڑا کر۔ مذہب کا نام لے کر ہم اپنے عوام و خواص کو جگا سکتے ہیں۔ جوش دلا سکتے ہیں لیکن "زبان" یا "اردو!" اب تک یہی ہوتا رہا ہے کہ ان کا ذکر کرو تو فقط کسی کسی کے کان پر جوں رینگتی ہے۔ لوگ اسے ایک شغل۔ زیادہ سے زیادہ ایک مشاعرے کے برابر سمجھتے ہیں۔ زلف و خال کا ایک قصہ تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم میں سے اگر کوئی شخص "اردو اردو" پکارے تو اکثر لوگ زیادہ دل میں اور کچھ علانیہ بھی مسکرا دیں گے۔ دل میں کہیں گے کہ شاید یہ کسی شاعر کا بچہ ہے اور زبان سے کہیں گے کہ ہاں بھائی! اردو تو خیر لیکن تم کوئی مفید قومی کام بھی کیا کرو۔ برو عقل و تحقیق ہا یدگر لیست۔

واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم نے ابھی اس مسئلے کی اہمیت کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا۔ وقت نہیں آیا کہ ہم سمجھیں کہ زبان کی ہستی ہمارے تمدن کی ہستی ہے۔ یہ سمجھیں کہ ہماری زبان مٹی تو ایک اجنبی فضا میں ہمارا دم گھٹنے لگے گا۔ اور ہماری قومیت نیم مردہ ہو جائے گی؟

غالباً کہا جائے گا کہ یہ خواہ مخواہ ڈرنے ڈرانے کی باتیں ہیں۔ اردو موجود ہے۔ لوگ اسے پڑھتے ہیں اور پڑھاتے ہیں۔ بولتے ہیں اور سنتے ہیں سارے قصہ ختم! لیکن کیا ہم دیکھ نہیں رہے کہ ہندوستان کی دوسری قوموں نے اس بنی بنائی زبان سے منہ پھیرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اسے فقط ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کہہ کر اپنا ڈیڑھ اینٹ کا مندر یا سوا اینٹ کا گردوارہ الگ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ کیا تازہ ترین شورش سے بھی ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا؟ اگر ہم محض حکومت پر تکیہ کر کے بیٹھے رہیں گے تو سخت غلطی کریں گے۔ اردو کے اس میدان میں ہم میں سے ہر ایک کو اردو کے لشکر کا سپاہی بن کر اتر آنا چاہیئے۔ کرنے کے ہزاروں کاموں میں سے کم از کم ایک ایک کام کو سنبھال لینا چاہیئے۔

ہماری سیکڑوں بڑی چھوٹی انجمنیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اردو کا شعبہ قائم کر کے اردو کی ترقی اور اشاعت اور تبلیغ میں ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔ اگر اردو دیر تک گرا تو ہماری قومی زندگی کے ایک ایک شعبے پر برا اثر پڑے گا۔ یہ بات ہماری ہر انجمن کے کارکنوں کو خوب سمجھ لینی چاہیئے۔ انجمن ترقی اردو۔ اردو کا سب سے بڑا مرکزی ادارہ ہے جس کی اس وقت ملک بھر میں تقریباً دو سو شاخیں ہیں لیکن فقط یہ انجمن اردو

ضروریات کا سارا بوجھ برداشت نہیں کرسکتی کیونکہ اردو کی ترقی و حفاظت کا کام اب بہت پھیل گیا ہے اور لازم ہے کہ مختلف قومی جماعتیں اور افراد اس میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں ۔ جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے انجمن حمایت اسلام لاہور کو اس بارے میں اپنی ذمہ داری کا بیش از بیش احساس ہونا چاہئے ۔ سچ یہ ہے کہ اس تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے میں جب کہ ہمارے لئے اجنبی زبان کی مجبوریاں کم ہوتی جارہی ہیں جب ہم کئی قسم کے اختیارات کو خود اپنے ہاتھوں میں سنبھالنے والے ہیں ۔ قومی ترقی اور قومی نشو ونما کا تقاضا ہے کہ شمالی ہند میں جلد سے جلد ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے اور انجمن حمایت اسلام اس کے قیام میں خاص طور پر حصہ لے ۔

۲۴ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء کو لکھنؤ یونیورسٹی کے کورٹ نے یہ قرارداد منظور کی کہ صوبے کی زبان کو جلد از جلد ذریعہ تعلیم و امتحان قرار دیا جائے ۔ پنجاب یونیورسٹی نے بھی چند برس سے اس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کی ہے ۔ اور باوجود اختلاف رائے کے یہ خیال روز بروز تقویت پا رہا ہے کہ بجائے انگریزی کے ذریعہ تعلیم ہندوستانی زبانیں ہوں ۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانی زبانوں سے کیا مراد ہے ؟ ہمارے صوبے کے سکولوں کی تعلیمی زبان عام طور پر اردو رہی ہے ۔ اب تھوڑی دیر سے ہندوؤں اور سکھوں کی ایک منظم جماعت اس بات پر مصر ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ہندی اور گورمکھی میں تعلیم دیں گے ۔ اس کے ساتھ چند نام نہاد نیشنلسٹ اصحاب نے یہ آواز بلند کی ہے کہ یہاں کی تعلیمی زبان ہندوستانی ہونی چاہیئے جو ہندی اور اردو دونوں خطوں میں لکھی جائے ۔ اس ہندوستانی کو معرض وجود میں لانے کیلئے وہ موجودہ اردو نصاب کو یکسر بدل دینا چاہتے ہیں ۔ اسے عام فہم ہندوستانی یا آسان اردو بنانا چاہتے ہیں بلکہ ایک تجویز یہ بھی ہو رہی ہے کہ ایک ڈکشنری مرتب کی جائے جس میں صرف اردو ، ہندی ، پنجابی کے مشترک الفاظ لئے جائیں اور تمام نصابوں میں صرف یہی الفاظ استعمال ہوں ۔ کیا کوئی ہوش مند شخص اس قسم کی لایعنی اور شرارت آمیز تجویز سے اتفاق کرسکتا ہے ؟ سر تیج بہادر سپرو نے خوب کہا ہے کہ "ہندوستانی کوئی زبان نہیں ۔ اس کا کچھ مطلب نہیں ۔ میں اس زبان کے لئے اردو کا لفظ پسند کرتا ہوں ۔ جب کوئی میرے سامنے ہندوستانی کا لفظ کہتا ہے تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے اور سخت صدمہ ہوتا ہے ۔ ہندوستانی کی اصطلاح دھوکے کی ٹٹی ہے ۔ اپنی قومی زبان اردو کو اردو کہنے سے نہ ڈریں اور اعلان کے ساتھ کہیں کہ ہماری زبان اردو ہے ۔" سر سپرو کے نزدیک صحیح قسم کی اردو وہ ہے جو مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں اور جو ان کی مطبوعات میں استعمال ہوتی ہے ۔ لہذا اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم پنجاب میں اردو اور خالص اردو کا جھنڈا بلند کئے رکھیں اور اپنی بنی بنائی ترقی یافتہ زبان کی صورت کو مسخ ہونے سے بچائیں تاکہ اس کا مخصوص ادب اور ہمارا مخصوص تمدن دونوں محفوظ رہیں اور زمانے کی رفتار کے ساتھ مناسب رد و بدل اور اصلاح کے ساتھ دونوں ترقی کرتے چلے جائیں

ہمارے لئے یہاں کی تعلیمی زبان اردو ہے ۔ اور اردو ہی رہے گی ۔ اور اب جب کہ سب مضامین "ہندوستانی" زبانوں میں پڑھانے کی تجویز پیش ہو رہی ہے ہمارا اصرار ہے کہ ذریعہ تعلیم اردو ہی ہو ۔ ہم اردو کے خالص دودھ کو ہندوستانی کی لسّی یا اردو ہندی پنجابی کی ملی جلی کچی لسّی "میں تبدیل کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں ۔ ہم ان ہندوؤں اور سکھوں کو جو اردو سے اجتناب کرنا چاہیں ہرگز مجبور نہیں کرنا چاہتے کہ وہ اس سے محبت کریں لیکن ساتھ ہی ہم ہر سکول ، ہر عدالت اور ہر دفتر کے تین تین ٹکڑے ہوتے دیکھنا کیسے گوارا کرسکتے ہیں لہذا وقت آگیا ہے کہ یا پنجاب یونیورسٹی کو ایک ایسی یونیورسٹی بنایا جائے جس میں اردو کے ذریعے اعلےٰ تعلیم پانے کی بہترین سہولتیں مہیا کی

جائیں اور یا کوئی اور متبادل صورت پیدا کی جائے۔ اس مسئلے پر انجمن حمایت اسلام کو خاص طور پر غور کرنا چاہیئے کیونکہ کم از کم پنجاب کے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں اس کی ذمہ داری غایت درجہ اہم ہے محض فرقہ واری کے الزام سے بچنے کے لئے کچھ نہ کرنا ایک قومی جرم کے برابر ہوگا۔

اس سلسلے میں جب تک کوئی نئی صورت پیدا نہیں ہوتی انجمن کو اپنے تمام اداروں میں اردو کی اشاعت و ترقی کی طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیئے۔ اردو کو تمام سکول اور کالج کے طلبہ کے لئے ایک لازمی مضمون بنا دیا جائے۔ صوبے میں اردو کی ترقی کے لئے انجمن کا ایک خاص محکمہ کھولا جائے محض کبھی کبھی سالانہ اجلاس میں ایک اردو کی مجلس قائم کر دینا کافی نہیں۔ اردو کی طرف ہماری بے اعتنائی کی ایک مثال یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کی ۴۰-۱۹۳۹ء کی رپورٹ کے مطابق ۳۸۶۴ طلبہ نے ہندی کے اعلےٰ امتحانات میں شرکت کی اور صرف ۶۸۵ نے اردو میں اور ۳۰۱۷ لڑکیوں نے ہندی لی اور صرف ۱۵۵ نے اردو۔

ہم اپنی ایک نئی دنیا بننے تک بے کار نہیں رہ سکتے۔ نقطہ انتظار کی گھڑیاں نہیں گن سکتے۔ اردو کے مسائل گوناگوں ہیں اور اس کی ضروریات روز افزوں۔ اس کی لسانی، طباعتی اور ادبی ضروریات کی طرف اردو انجمنوں کو بالخصوص متوجہ ہونا چاہیئے اور اس کی تعلیمی اور اشاعتی ضروریات کے سلسلے میں دوسرے اداروں اور خاص و عام افراد کو بھی حصہ لینا چاہیئے۔

لسانی ضروریات کے ضمن میں زبان کو عام فہم اور سہل الحصول بنانے کا مسئلہ ہے۔ ہمارا موجودہ ادب اور ہماری موجودہ صحافت قابل قدر ہے لیکن اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ کم لکھے پڑھے بالغ لوگوں کے لئے آسان لٹریچر اور عام فہم اخبار مہیا کئے جائیں اور طلبہ کی سہولت کے پیش نظر اردو ادب سے واقفیت پیدا کرنے کیلئے مختصر کتابیں لکھی جائیں۔

طباعتی مسائل میں ٹائپ کا مسئلہ فوری توجہ کا محتاج ہے۔ امید ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند اس بارے میں جلد کسی فیصلے پر پہنچے گی۔

ہمارے ادب میں دنیا کا بہترین لٹریچر منتقل کرنے کی ضرورت ہے جس میں موجودہ ہندوستانی زبانوں کی کتابیں بھی شامل ہوں۔ نیز ضرورت ہے کہ ہماری بہترین کتابوں کے مختلف ارزاں ایڈیشن شائع کئے جائیں اور مفید موضوعات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھوائے جائیں تاکہ مختلف قسم کی معلومات آسانی سے حاصل ہو سکیں۔ یاس انگیز جذبات سے ہم مدتوں متاثر ہو چکے۔ اب ہمیں امید افزا زندگی بخش خیالات درکار ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ادب کا رُخ اب اسی سمت کو ہے۔

ہمیں تعلیم پھیلانے کی طرف خاص طور سے متوجہ ہونا چاہیئے ہمیں اپنی پوری قوم کو تعلیم دینی ہے۔ ہمیں سارے ملک کو اردو زبان و ادب سے آشنا کرنا ہے۔ اس کے لئے مطالعہ گھر۔ عام اور گشتی کتب خانے، شبینہ مدارس، بالغوں کی تعلیم، عام اور خاص جلسے جن میں اردو میں تقریریں، مقالے اور مناظرے ہوں۔ اصلاح شدہ مشاعرے، اردو کتب کی اشاعت کے لئے مشترک سرمایہ کی کمپنیاں، مصنفین و مؤلفین کی حوصلہ افزائی۔ ریلوے، ڈاک خانہ، ریڈیو اور سینما کے محکموں میں اردو کا تحفظ۔ یونیورسٹیوں میں اردو کی ترقی۔ ان کی طرف ہماری انجمنوں اور قومی کارکنوں کو باقاعدہ طور پر متوجہ ہونا چاہیئے۔ ہر چند آج کل پروپگنڈا زندگی کا ایک ضروری جزو بن گیا ہے۔ مگر محض

کبھی کبھی جلسے کر کے اخبارات میں ان کی روئدادیں چھپوا دینے سے قومی فرائض پوری طرح ادا نہیں ہو جاتے ہیں ٹھوس اور باقاعدہ اور مسلسل کام کی زیادہ حاجت ہے۔

عام طور پر ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اردو کی نگہداشت اور ترقی اردو انجمنوں کے ذمے ہے۔ یہ ایک طرح اُن کا پیشہ ہے اور وہ اگر کبھی کبھی ان کے جلسوں میں چلا جائے۔ یا کسی کے اصرار پر ان کی رکنیت قبول کر لے یا انھیں چندہ یا کچھ عطیہ دے دے تو اپنے خیال میں وہ قوم پر احسان کرتا ہے۔ یا کم از کم اپنا فرض ادا کر دیتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ خود ہماری قومی ضروریات اور ان نازک حالات کے پیشِ نظر جن سے آج کل ہم دوچار ہو رہے ہیں اس طور پر اپنے دل کی تسلی کر لینا بڑی غلطی بلکہ قومی گناہ ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے گوالیار اردو کانفرنس منعقدہ ۲۷ جنوری ۱۹۴۱ء میں اپنے خطبۂ صدارت میں خوب لکھا ہے کہ "زبان کا جانا زندگی کا جانا ہے" اگر آپ کو اپنی زندگی اور تہذیب عزیز ہے تو اسے بچانے کی فکر کیجئے۔" پھر یہ کہہ کر کہ ہم بالطبع کاہل واقع ہوئے ہیں۔ اور کام سے جی چراتے ہیں لکھتے ہیں کہ افراد اور قوموں نے اپنی زبان اور تہذیب کے بچانے کے لئے جانیں کھپا دی ہیں ہم آپ سے یہ نہیں چاہتے کہ جانیں دیں یا بڑی بڑی قربانیاں کریں۔ ہم تو آپ سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ زیادہ نہیں تو تھوڑی سی توجہ اس طرف بھی فرمائیے۔ یاد رکھئے کہ یہی ذرا سی توجہ۔ یہی تھوڑی سی ہمت اور آپ کی کمائی کا یہی قلیل اور حقیر حصہ آپ کی نجات کا باعث ہوگا" پھر وہ بعض معمولی کام گنواتے ہیں جو ہر شخص اپنی جگہ آسانی سے کر سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ خطوں کے لفافوں پر پتہ اردو میں لکھیں جلسوں میں تقریریں اردو میں کریں۔ اپنے جلسوں کی روئدادیں اردو میں لکھیں، اپنے سائن بورڈ۔ اپنے نام کی تختیاں اردو میں ہوں۔ منی آرڈر اور رجسٹری کے فارم ڈاکخانے سے اردو میں طلب کریں۔ اور اردو ہی میں خانہ پری کریں۔ اپنے گھروں میں اور عام بول چال میں اردو استعمال کریں۔ باہم خط و کتابت اردو میں کی جائے۔ اردو اخبار اور رسالوں کی سرپرستی کریں۔ اردو کتابوں کا مطالعہ کریں۔ حساب کتاب اردو میں لکھیں۔"

یہ کیسی معمولی باتیں ہیں لیکن یہ واقعہ کہ ہمارے "قائدِ اردو" کو ان معمولی باتوں کی طرف ہمیں متوجہ کرنا پڑا صاف ظاہر کرتا ہے کہ ہماری قوم کس قدر غافل اور کاہل اور بے حس ہے۔

ہاں ہم غافل اور کاہل ہیں لیکن زمانے کے حالات ہمارے گرد و پیش کے نازک اور خطرناک واقعات اب ہمیں جگا اور اکسا رہے ہیں سب ہمیں کاہلی اور بیزاری میں مزا نہ آئے گا۔ اب دوسری قوموں کی روز افزوں ترقی ہمیں پیش قدمی کرنے پر مجبور کر دے گی۔ تھوڑی مدت ہوئی کہ ہماری قومی ہستی مٹتی نظر آتی تھی۔ آج بھی کچھ ظاہری اور بہت سے چھپے ہوئے خطرے ہم پر رہ رہ کر حملہ آور ہو رہے ہیں ہم پر ہر طرف سے ایک طوفانِ بے تمیزی ٹوٹ رہا ہے لیکن اب ہم اپنی خودی کو پہچان رہے ہیں۔ اب خوف ہمیں خوف زدہ نہیں کر سکتا - اب ترجمانِ حقیقت کی یہ پکار دن رات ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے ؎

سفینۂ برگِ گل بنائے گا قافلہ مورِ ناتواں کا ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا!

بشیر احمد

غزل

والا شان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیعؔ (حیدر آباد دکن)

عاشقی ہوش ہوئی جاتی ہے
حشر بر دوش ہوئی جاتی ہے

دل میں جو شمع جلا کرتی تھی
آج خاموش ہوئی جاتی ہے

رفتہ رفتہ ترے آغوش کی یاد
خواب آغوش ہوئی جاتی ہے

کس کی فریاد پہ ساری دُنیا
ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے

اب خبر لے کہ مری بیخبری
حاصلِ ہوش ہوئی جاتی ہے

تم جو آئے تو کہانی دل کی
سب فراموش ہوئی جاتی ہے

بے خودی فیضِ محبّت سے شجیعؔ
ہوش ہی ہوش ہوئی جاتی ہے

روحانی سرمایہ

کسی زمانے میں چین میں چند بزرگ تھے (شاید اب بھی ہوں) جن کا عقیدہ یہ تھا کہ روزانہ طلوعِ آفتاب محض اُن کی پے درپے شبانہ
کا نتیجہ ہے اور اگر یہ دعائیں (جن کے لئے حکومت ان بزرگوں کو وافر انعام عطا کرتے تھے) کسی وجہ سے رُک جائیں تو عجب نہیں کہ شاید شرق کبھی منہ

بچپن میں لاہور میں یہ بھی سنا کہ انگریزی حکومت محض ایک مجذوب درویش کی نگاہِ سلطنت نواز کا کرشمہ ہے۔ ماننے والے یہاں تک
تھے کہ اگر یہ سائیں ایک منٹ کے لئے آنکھیں بدل لیں تو نظامِ عالم تہ و بالا ہو جائے۔ خدائی کارخانے میں انھیں بے انتہا دخل تھا۔

دروغ برگردنِ راوی مگر یہ معتبر ذرائع سے سنا کہ جب حجرہ نشینوں کے بارِ گراں کو حضرت اتاترک نے اپنی سیاست سے ترک کندہ
اُتار پھینکا تو بہت چرچے گوئیاں ہوئیں کہ خلیفۃ الاسلام سے باغی ہونا اور بات ہے فقیروں کے منہ آنا ہنسی ٹھٹھہ نہیں۔ طوفانِ نوح آجائے گا

گنگا اشنان کرنے والوں سے بیسیوں دفعہ سنا کہ گنگا کے کنارے وہ وہ یوگی ریاضت میں مشغول ہیں کہ زندہ دفن کر دو ان کا بال بیکا نہ
ایک کیا کئی انگریزوں نے ان کے کمالات کی داستانوں سے خوب روپیہ کمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجہ صاحب کی مشہور زیارت گاہ کے لاکھوں
تصے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ حسن ابدال ایک درویش نے آزمائش کے طور پر ایک پہاڑ اٹھا کر گرو صاحب کی طرف پھینک مارا۔ گرو صاحب نے
کا نام لے کر یہ پہاڑ اپنے دستِ مبارک سے روک لیا۔ جسے باور نہ ہو وہ اپنی آنکھوں سے جا کر پہاڑ پر گرو کے پنجہ کا نشان دیکھ لے اگر اس
کے یوگی انگریزوں سے خراجِ تحسین لیتے ہیں تو آج سے چار سو سال پہلے کے گرو اور فقیر کیا کیا نہ کرتے ہوں گے۔ اکبر بادشاہ کئی دفعہ پا پیادہ خواجہ خواجگاں
مزار شریف کی زیارت کیلئے اجمیر شریف گیا۔ اور ہزاروں کیا لاکھوں لوگوں کا اب تک اعتقاد ہے کہ ہمایوں کے بیٹے بابر کے پوتے کی فقیر پرستی ہی
کے لئے چغتائیوں کو وہ بادشاہی دے گئی کہ بایدوشاید فقیروں کیلئے بادشاہی بخش دینا کوئی غیر معمولی بخشش نہیں۔ جو لوگ آفتاب کا چلنا پھرنا بند کر
ہیں وہ اگر بادشاہی بخش دیں تو کیا بڑی بات ہے فقیروں کی دنیا میں سینہ بہ سینہ بصیغۂ راز یہ بات چلی آتی ہے کہ انگریز گاندھی جی سے اس لئے ڈرتے
کہیں گاندھی جی بھی پا پیادہ اجمیر شریف کی طرف رُخ نہ کریں اور گاندھی جی سے یہ بات کچھ بعید بھی نہیں۔ یوں تو اُن کی طبیعت اس قدر کو
ہے کہ وہ کبھی تنگ آمد بجنگ آمد والا قصہ نہ کریں گے مگر جو کسی آنا دے دے فقیروں کی بھی ذاتیں ہوتی ہیں مثلاً غوث، قطب، ابدال۔ نانا
ایک ذات ہے جو ہندو سنیاسی کے مماثل ہے) آہ کی تو تعجب نہیں کہ سٹر چرچل کا "ننگا فقیر" دارودھا سے اجمیر شریف وارد ہو۔ پاؤں۔ پاؤں
گاندھی جی کے لئے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔

ہندوستان کا روحانی سرمایہ مندروں، مزاروں، گوردواروں میں مقفل بند ہے۔ کنجی اگر ملی تو یمنا کے کنارے کسی یوگی سے

فقیر دوست عقل دشمن

رباعیات

اَمَّن یُجیبُ المُضطر

اے خالقِ دو جہاں خدائے اکبر
از بہرِ کرم بحالِ زارم بنگر
در حالتِ اضطرار عبدِ بے کس
یا رب بسوالِ کَامَّن یُجیبُ المُضطر

سعیِ لاحاصل

دارم ہمہ تلاشِش او صدا بہ ہر در
درویش مثال در دویدم در در
جایش در چشم و جستجویش بسویش نگراں
او در بر و من بانتظارش بر در

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ

قائم بعبادت تو کہسار بہ پشت
مصروفِ رکوع و سجدہ اشجار بدشت
دریا ز حباب سبحہ در کف دارد
مشغولِ شمارِ دست ہر خار بدشت

الواحد فی الکل و فی الکل واحد

از چشمِ حقیقت بنگر اندر شئے
گر ہست نظر بکن نظر اندر شئے
در کل ہمہ واحد است و او واحدِ کل
شئے ہست اندر شئے شئے اندر شئے

سید احمد حسین امجد

۱ے اے رب تیرے سوا بے قرار کو کون تسکین دینے والا ہے ۱۲ ۲ے یعنی دنیا میں ہر ایک اپنی عبادت اور تسبیح کے طریقے سے واقف ہے ۱۲

یادِ رفتگاں

(میری زندگی پر کن کا اثر پڑا)

انسان کی سیرت اور زندگی کو بہت سی چیزیں بناتی یا بگاڑتی ہیں عزیزوں اور دوستوں کی صحبت جن کے ساتھ اس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ گذرا ہے۔ کتابیں جو اس نے پڑھی ہیں۔ وہ کام جو اس نے انجام دیئے ہیں۔ سیاسی یا سماجی ماحول جس میں اس نے تربیت پائی ہے۔ ان تمام اثرات کے میل جول سے اس کی سیرت کا مخصوص سانچہ تیار ہوتا ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم وہ ذاتی اثرات ہیں جو دوسرے لوگوں کے اس پر پڑتے ہیں۔ اگر زندگی کے کٹھن سفر میں اس کو بعض ایسے رہنما یا دوست مل جائیں جن کی سیرت کے پرتو سے یہ تاریک راستہ روشن ہو جائے تو اس کی بڑی خوش نصیبی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ خوش نصیبی میرے حصے میں آئی اور مجھے اپنے عزیزوں اور دوستوں ہی میں ایسی ہستیوں کی صحبت نصیب ہوئی جن کے صفائے باطن نے مجھ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔

سب سے پہلا اور سب سے زیادہ دیرپا اثر جس نے میری سیرت کی تشکیل میں حصہ لیا۔ میری والدۂ مرحومہ کا اثر تھا۔ یوں تو ہر شخص قدرتہً اپنی ماں کی ذات اور سیرت کو ایک مثالی کی شکل میں دیکھتا ہے لیکن جذباتی تعلق کو چھوڑ کر اور ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کرنے کے بعد بھی میرا خیال ہے کہ کم سے کم میں نے کسی اور شخص کی سیرت میں محبت، خلوص اور دل سوزی کی اس قدر فراوانی نہیں دیکھی۔ وہ مولانا حالی کی پوتی تھیں اور انھوں نے یہ تمام صفات جو شریف ہندوستانی بی بیوں کا مخصوص سرمایہ ہیں اپنے دادا سے ورثے میں پائی تھیں۔ اولاد کی محبت تو ہر ماں کے دل میں ہوتی ہے لیکن ان کی یہ محبت اور شفقت وسیع اور عام ہو کر اپنی پوری دنیا پر چھا گئی تھی۔ وہ ہر غریب اور محتاج کی امداد، ہر بیمار کی تیمارداری، ہر ستم رسیدہ کی دل جوئی کے لئے ہر وقت تیار رہتیں۔ ان کی خیرات کا یہ عالم تھا کہ باوجود دولتمند نہ ہونے کے ضرورت مندوں کے لئے ان کا دستِ کرم ہمیشہ دراز رہتا اور اس شان کے ساتھ کہ دائیں ہاتھ سے جو دیتیں اس کی خبر بائیں ہاتھ کو نہ ہوتی۔ اگر خاندان میں یا شہر والوں میں کوئی باہمی جھگڑے یا اختلافات ہوتے تو وہ ہمیشہ ان کو صلح و آشتی کے ساتھ طے کرانے کی کوشش کرتیں۔ عورتیں آتیں اور اپنے دکھ درد اور پریشانیوں کا بار ان پر ڈال دیتیں اور یہ نہایت خندہ پیشانی اور عالی ظرفی کے ساتھ اس بار کو اٹھا لیتیں۔ ان کی ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ مظلوم اور کمزور کی حمایت اور سرپرستی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتیں۔ ان کا جذبۂ انصاف اس قدر شدید تھا کہ اگر کسی معاملے میں غیر حق پر ہوتے تو وہ اپنوں کے مقابلے میں ان کی حمایت کرتیں۔ اور اس حق پرستی کے تلخ نتائج کی پروا نہ کرتیں۔ یہ صفت لوگوں میں بہت کم ہوتی ہے کیونکہ وہ عام طور پر حق اور ناحق کو پرکھنے کے بجائے اپنے اور پرائے کی بھول بھلیوں میں سیدھے راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ ان کی زندگی سے مجھ کو یہ سبق ملا کہ انسان میں بغیر علی

رسمی تعلیم کے محض دل ودماغ کی فراخی اور شرافت کی بدولت غیر شعوری طور پر وہ بیدار مغزی اور اخلاقی صفات پیدا ہو سکتی ہیں جن کی مختلف تفسیر میں دنیا کے بہترین مفکروں نے اپنی عمریں تمام کی ہیں۔ ان کے عمل سے میں نے یہ انمول حقیقت بھی سیکھی کہ خدا کی رضا جوئی کا بہترین ذریعہ اس کے بندوں کی خدمت ہے۔

دوسرا زبردست اثر مجھ پر میرے والد آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا پڑا۔ ہندوستان میں اب بھی ان کے لاکھوں جاننے والے موجود ہیں۔ اور انھوں نے مقرر، مصنف، سوشل ریفارمر اور ممبر کونسل کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیں۔ وہ ان سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن ان کے کاموں سے بھی زیادہ قابل قدر ان کی غیر معمولی شخصیت اور سیرت تھی جس نے ان کو اپنے معاصرین میں ممتاز کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی تمام عمر قومی خدمت اور صحیح اصولوں کی اشاعت میں بسر کی لیکن ان کا کمال یہ تھا کہ باوجود اس دشوار گزار راستے کو اختیار کرنے کے وہ ان تمام آلودگیوں اور تعصبوں سے بلند اور بے نیاز رہے جو ہماری پبلک لائف کو خراب کرتی ہیں۔ ان میں ایک خاص فقیری اور بے نیازی کی شان تھی۔ قومی کام کے سلسلے میں انھیں کبھی ذاتی وجاہت، عزت یا ناموری حاصل کرنے کا خیال پیدا ہی نہیں ہوا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان محض اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اور اس کو چاہیئے کہ انتہائی ایثار اور بے نفسی کے ساتھ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے جد وجہد کرے۔ اس لئے ذریعہ کو مقصد پر اہمیت دینے کے کیا معنی؟ ان کی طبیعت میں ایک خاص وصف تھا جس کے لئے یونانی فلاسفہ نے BALANCE یعنی توازن کا لفظ اختیار کیا ہے۔ اور جس کے لئے اسلامی فلاسفہ عدل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ... ان کے عقیدے اور عمل میں۔ دل اور دماغ میں خیالات اور جذبات میں ایک خاص ہم آہنگی تھی۔ جس کی بدولت وہ اپنے ہر کام کو جرأت، استقلال اور ایمان کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ وہ ہر معاملے میں سوچ بچار اور گہرے مطالعے کے بعد اپنی رائے قائم کرتے اور ایمان داری اور آزادی کے ساتھ اس کا اظہار کرتے۔ اور باوجود مخالفت کے سختی کے ساتھ اس پر قائم رہتے۔ اسی وجہ سے ان کی زندگی میں کئی دفعہ ایسے مواقع پیش آئے کہ کبھی ہندو کبھی مسلمان کبھی سنی کبھی شیعہ کبھی حکومت کبھی آزاد خیال طبقہ ان کے طرز عمل سے ناخوش ہوئے لیکن بعد کے واقعات نے نہ صرف ان کے خلوص نیت بلکہ ان کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی کی تائید کی۔ وہ تمام عمر طالب علم رہے۔ ان کا مطالعہ غیر معمولی طور پر وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ مشرق ومغرب کا ادب اور فلسفہ۔ تاریخ اور سیاست منطق اور اخلاقیات۔ مذہب اور فقہ۔ غرض علم کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ تھا جس کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ نہ کیا ہو لیکن اس علمی شغف نے ان کی قوت عمل کو کم زور نہیں کیا۔ یہ بھی ان کی طبیعت کے توازن کا ایک مظاہرہ تھا۔ انھوں نے جس کام کو اٹھایا خواہ وہ تعلیم نسواں تھا۔ اصلاح معاشرت، رسود کی شرح بندی۔ اس کو جرأت، استقلال اور سمجھ داری کے ساتھ نبھایا۔ ان کی زندگی اور ان کی تصانیف کے مطالعے سے میں نے یہ سبق سیکھا انسان کو سب لوگوں کے ساتھ رواداری اور انصاف کے ساتھ پیش آنا چاہیئے لیکن جہاں حق کی حمایت کا مسئلہ ہو وہاں رائے عامہ کے ساتھ چلنا اور اس طرح سستی ہردلعزیزی حاصل کرنا وقار انسانیت کے منافی ہے۔ اور زندگی انسان کی اپنی ملکیت نہیں جس کو وہ ذاتی تفریح اور آرام میں بسر کرے۔ بلکہ خدا کی امانت ہے جس کو بلند ترین مقاصد کی خدمت میں صرف کرنا اس کا فرض ہے۔

ایک اور بزرگ جن کا میں ہمیشہ احسان مند رہوں گا میرے چچا خواجہ غلام الحسنین مرحوم تھے جن کی حیثیت علم مصنف مترجم، مذہبی عالم اور واعظ کے ہندوستان کے مختلف حصوں میں کافی شہرت ہے لیکن میری زندگی کی ساخت میں ان کی شخصیت کی یہ اہمیت ہے کہ میں نے اس میں ایک حقیقی مذہبی آدمی اور ایک سچے طالب علم کی مکمل ترین تصویر دیکھی۔ ان کی زندگی کے صرف دو مرکز تھے علم اور مذہب۔ ان کے علاوہ انھیں اور تمام چیزیں بے حقیقت معلوم ہوتی تھیں۔ مذہبی خدمت۔ مطالعہ تحریر و تقریر یہی ان کی زندگی تھی۔ ان کے سامنے انھیں کبھی اپنے آرام و راحت کا خیال پیدا ہی نہیں ہوا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر مستغرق رہتے کہ گرمی، سردی، روشنی، اندھیرا، گھر کا شور و غل، دنیا کے پریشان کرنے والے واقعات ان کی توجہ کو نہیں ہٹا سکتے تھے۔ بارہا دیکھا کہ وہ کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں یا مضمون لکھ رہے ہیں اور سورج ڈھلتے ڈھلتے شام ہوگئی ہے کمرے میں اندھیرا چھا گیا ہے لیکن انھیں اس کا احساس نہیں۔ وہ کتاب یا کاغذ پر اور جھکتے جاتے تاکہ پڑھنے میں سہولت ہو یہاں تک کہ یا تو کوئی شخص کمرے میں روشنی کر دیتا۔ یا اس قدر اندھیرا ہو جاتا کہ پڑھنا ناممکن ہوتا! وہ جس علمی یا مذہبی کام کو ہاتھ میں لیتے اس قدر خلوص اور انہماک کے ساتھ اس کو انجام دیتے گویا عالم کائنات کے توازن کا دار و مدار اس کی صحیح تکمیل پر ہے۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں انھوں نے ہربرٹ سپنسر کی مشہور تعلیمی تصنیف کا ترجمہ کیا تھا جس کو انجمن ترقی اردو نے "فلسفۂ تعلیم" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس وقت زبان کے ماہرین کی یہ رائے تھی کہ اردو میں اس کے ترجمہ کا بار اٹھانے کی صلاحیت نہیں لیکن انھوں نے اپنی قابلیت اور ان تھک محنت سے اردو کی علمی حیثیت میں ایک نئی وسعت پیدا کر دی۔ ان کی ہر تحریر میں ایک مخصوص سلاست اور روانی ہوتی تھی کیونکہ ان کا ادبی عقیدہ یہ تھا کہ ہر خیال کو اس وضاحت کے ساتھ ادا کرنا چاہئے کہ معمولی تعلیم اور سمجھ بوجھ کا آدمی بھی اس کو سمجھ سکے۔ وہ تقریباً تمام عمر پانی پت کے مسلم ہائی اسکول میں معلم رہے اور اس حیثیت سے انھوں نے ہزاروں طلبہ کی سیرت کو بنایا اور سنوارا۔ اور معلمی کی اس قدیم شان کو زندہ کر دکھایا جو اس زمانے میں تقریباً ناپید ہو چکی ہے۔ اُن کی زندگی سے مجھ پر یہ حقیقت بھی کھلی کہ انسان باوجود ایک معمولی سا شغل اختیار کرنے اور ایک محدود ماحول میں زندگی بسر کرنے کے اپنے خلوص، محنت، یک سوئی اور خدا شناسی کی بدولت عظیم الشان علمی اور مذہبی خدمت انجام دے سکتا ہے۔

مشاہیر میں سے دو بزرگوں کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ ایک ڈاکٹر سر محمد اقبال، دوسرے سر سید راس مسعود۔ اقبال کی عقیدت مندی میں ہندوستان کے ہزاروں، لاکھوں آدمی میرے شریک ہیں کیونکہ ان کی صحبت ایک فیض جاری تھی جس میں ہر قسم کے لوگ آتے اور اپنی صلاحیت کے مطابق مستفید ہوتے تھے طالب علمی کے زمانے میں مجھے اقبال کی ذات سے بالواسطہ یعنی ان کے کلام کی وجہ سے عقیدت تھی لیکن جب ان کی ملاقات کی نعمت نصیب ہوئی تو مجھے اس حقیقت کا از سر نو احساس ہوا کہ جو انسان واقعاً بڑے ہوتے ہیں وہ اپنے کارناموں سے بھی کہیں زیادہ بلند ہوتے ہیں۔ ان کا دکش دماغ ایک فوارۂ نور تھا جو ایک متحرک لائٹ ہاؤس کی طرح چاروں طرف کے اندھیرے کو روشن کر دیتا تھا۔ ان کے خیالات میں جدت اور شگفتگی اور اظہار خیال میں ایک خاص ندرت تھی۔ وہ جس مسئلے کو بیان کرتے جیسے حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتے، اس میں ان کا معنی آفریں دماغ عجیب عجیب اور نئے نکتے پیدا کرتا اور ان کی لطیف ظرافت خشک سے خشک مسئلے میں دلچسپی کی ایک لہر دوڑا دیتی۔ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے لیکن برخلاف عام شعرائے کلام کے جو خود کو براہ راست

خدا کا شاگرد سمجھتے ہیں اور مطالعے اور غور کو اپنی شان کے خلاف جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنا مطالعہ تمام عمر نہایت سنجیدگی کے ساتھ جاری رکھا اور اس کی بدولت ان کا علم وعرفان زیادہ وسیع اور گہرا اور متنوع ہوتا گیا۔ اور ان کی شاعری ایک آلۂ تفریح کے بجائے ہدایت اور معرفت کا سرچشمہ بن گئی۔ ان کی شاعری اور فلسفے میں بھی ان کی زندگی کی طرح ایک عالمگیر وسعت اور رواداری تھی۔ اس میں جبریل اور ابلیس۔ رومی اور نیٹشے، غالب اور گوئٹے، بھرتری ہری اور قرۃ العین سب کے لئے گنجائش تھی کیونکہ یہ تمام شخصیتیں حقیقت کے مختلف پہلو بے نقاب کرتی ہیں۔ ان کے دل و دماغ کا مرکز اسلام کی تعلیم کی صحیح اور بصیرانہ تفسیر تھی لیکن انھوں نے کبھی عام مولویوں کی طرح دنیا کے گوناگوں علوم اور مشاہدات اور تجربات سے روگردانی نہیں کی بلکہ ہر طرف کی روشنی سے اپنے مرکزی مقصد کو منور کیا۔ عمر کے آخری دور میں ان کی شانِ فقر بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ دنیا کی جھوٹی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے۔ اور انسان دوستی کے راستے خدا شناسی کی منزل تک پہنچ گئے تھے ؎

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر　　　　میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو!

ان کا دربار امیروں اور رئیسوں کے دربار سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں نہ پاسبان کی حاجت تھی نہ اجازت طلبی کی ضرورت۔ ان کا دروازہ امیر و غریب، عالم و جاہل۔ دیسی بدیسی سب کے لئے کھلا تھا اور ہر طرح کے لوگ ان کے پاس آتے۔ علمی، سیاسی، مذہبی مسائل پر بحث کرتے مقامی معاملات پر مشورہ کرتے۔ ان کے لطیفے اور چٹکلے سنتے، حقہ پیتے بعض محض زیارت کرتے اور اس بندۂ خدا کے دل میں سب کے لئے جگہ تھی۔ ہر ایک سے اس کی سمجھ اور مذاق کے مطابق مخاطب ہوتے اور انسانیت کے رشتۂ مشترک کا پورا احترام کرتے۔ جب کوئی صلاحیت رکھنے والا شخص ان کی صحبت سے اٹھتا تو اسے یہ محسوس ہوتا کہ اس کی زندگی میں ایک نئی گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ قدرت بہت کم لوگوں کو اس قدر روشن دل و دماغ بخشتی ہے!

ڈاکٹر اقبال کی طرح سر سید راس مسعود کے بھی لاکھوں دیکھنے اور جاننے والے موجود ہیں۔ مگر اس وقت میں ان کی شاداب اور ہمہ گیر شخصیت کے صرف دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کروں گا۔ ایک تو ان کا مجلسی پہلو تھا۔ جو پہلی ہی ملاقات میں ہر شخص کو اپنا گرویدہ کر لیتا تھا ان کی گفتگو میں ایک ایسا جادو تھا جس کا توڑ ممکن نہ تھا۔ ذہانت، بذلہ سنجی، ظرافت اور مذاقِ شعر و سخن کی بدولت ان کی صحبت اس صدی کی بہترین مجلس ہوا کرتی تھی۔ وہ جہاں کہیں پہنچ جاتے نسیم بہار کی طرح افسردہ دلوں کو کھلا دیتے تھے لیکن ان کے قریب کے دیکھنے والے جن کو ان کی دوستی محبت اور اعتماد کی دولت حاصل تھی جانتے تھے کہ اس تبسم سطح کے نیچے ان کے پہلو میں ایک نہایت حساس اور درد بھرا دل ہے جو اپنے دوستوں اور عزیزوں کے دکھ درد اور اپنی قوم اور ملک کی بہبود کے لئے بے چین رہتا ہے۔ یہ تڑپ۔ یہ پیہم تپش اکثر اوقات ان کی شگفتگی کو ایک یاس اور افسردگی کی کیفیت میں بدل دیتی تھی۔ ان کی زبان پر اکثر یہ شعر رہتا تھا جو ان کے دل کی چغلی کھاتا تھا ؎

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں　　　　دل محیطِ گریہ ولب آشنائے خندہ ہے!

ان کا دل ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھا اور ان کے دوستوں میں ہندو مسلمان، چھوٹے بڑے، امیر غریب، بچے بوڑھے، ہندوستانی انگریز سب شامل تھے۔ وہ کم درجے کے لوگوں سے جھک کر ملتے اور ان کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتے تھے لیکن دماغ دار سربلندوں سے سربلندی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ انھیں مغرور اور خود پسند لوگوں سے نفرت تھی اور جب کبھی موقع ملتا ان کو اپنی بے لاگ ظرافت کا شکار بناتے تھے کیونکہ ان کے مذہب اور تہذیب کی رو سے خدا کے بندوں میں ان کی دنیاوی تہذیب کی بنا پر امتیاز کرنا خود کو ان سے بلند اور برتر سمجھنا ایک گناہِ کبیرہ تھا۔

میرا یہ مضمون ادھورا رہ جائے گا، اگر آخر میں اپنے ایک عزیز دوست اور رفیقِ کار سید تجمل حسین مرحوم کا ذکر نہ کروں جو بارہ سال کے قریب میرے ساتھ علی گڑھ کے ٹریننگ کالج میں پروفیسر رہے۔ ریاست پٹیالہ میں سامانہ سیدوں کی ایک بستی ہے۔ مرحوم وہیں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے کچھ عرصے صوبۂ متوسط میں مدرسی کی۔ اس کے بعد چند سال گجرات کے زمیندار ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ پھر صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی تحریک پر علی گڑھ میں پروفیسر مقرر ہوئے اور یہیں وفات پائی۔ دنیاوی اعتبار سے بظاہر یہ زندگی معمولی اور بے ہنگام معلوم ہوتی ہے لیکن ان کی ذات اس بات کا بیّن ثبوت تھی کہ اگر کسی انسان کی سیرت میں شرافت، خلوص اور پختگی ہو تو وہ اپنی حدود کو توڑ کر ان عالم گیر اثرات کا جزو بن جاتی ہے۔ جو دوسروں کی زندگی کو بناتے ہیں۔ وہ ایک حقیقی معلّم تھے۔ ان کی صحبت اور ذاتی مثال سے ان کے شاگردوں کو زندگی کے ایک بہتر تصور کی جھلک نظر آتی تھی اور ان کے دل میں عارضی طور پر ہی سہی وہ عین بلندی ابھر آتی ہوجاتی تھی جس کی چنگاری قدرت نے سب انسانوں کے سینے میں رکھی ہے لیکن وہ اکثر ناساز حالات کی وجہ سے افسردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ بات چیت میں، لین دین، معاملات میں، دوستی اور مخالفت میں اس قدر کھرے اور بے لاگ تھے کہ ان کے خلوص اور سچائی کے سامنے دنیا داروں کی ریاکاری شرمندہ ہو جاتی تھی۔ ان میں جرأت اس قدر تھی کہ سوائے حق کے دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی انسان ان کو مرعوب نہ کر سکتا تھا۔ ہمدردی اور ایثار کا یہ عالم تھا کہ وہ ہمیشہ بغیر کسی تامل کے اپنے دوست عزیزوں، اجنبی لوگوں اور ہر قسم کے مصیبت زدوں کا بوجھ اپنے مضبوط شانوں پر اٹھا لیتے تھے۔ جہاں دوسروں کی ہمدردی زبانی ہوتی ان کی خاموش اور عملی ہوتی تھی۔ جہاں لوگ یہ سوچتے کہ اس بار کو اٹھانے سے کس طرح بچیں انھیں یہ فکر ہوتی کہ کس طرح دوسرے کے کندھے سے اس رنج اور فکر کے بار کو اٹھا لیں لیکن شرافت، مروّت اور وضع داری کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ درجے کے مدبر، معاملہ فہم اور مردم شناس آدمی تھے۔ اور چالاک یا سازشی لوگ اپنے گھٹیا اور اوچھے ہتھیاروں سے انھیں دھوکا یا شکست دے سکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر معلّمی کا پیشہ اختیار کرنے کے بجائے وہ سیاست یا تجارت یا وکالت یا کوئی اور عملی میدان لیے پسند کرتے تو اس میں بھی اپنا سکہ بٹھا سکتے تھے لیکن مشیتِ الٰہی یہ تھی کہ وہ معلّم بنیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ قدرت کی نکتہ شناس نظر میں ایک [illegible] معلّم کی قدر جو لوگوں کے دل و دماغ بناتا اور سنوارتا ہے۔ ان لوگوں سے کم ہے جو ملکوں کی سیاست اور حکومت میں انقلاب پیدا کرتے ہیں؟

میں نے اس تقریر کے دوران میں، اپنے محترم بزرگ سر عبد القادر کی مثال کی پیروی کر کے صرف "نیک نام رفتگان" کا
ا ہے کسی زندہ مرشد کا ذکر نہیں کیا۔ آپ شاید یہ پوچھیں کہ ان تمام لوگوں میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے، کوئی قدر مشترک بھی
؟ ہاں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے ان کی انسانیت یعنی تنگی، تنگ نظری اور خود غرضی سے پاک ہونا۔ اور کام اور خدمت خلق
ذات سے زیادہ اہم سمجھنا۔ ان کی خودی اپنی تنگ حدود کو توڑ کر وسیع ہو گئی تھی۔ اور وہ دریا کے جہان بخش پانی کی طرح اپنی دنیا
راب اور زرخیز بناتی تھی یہی بات ہے جو آدمی کو سچے معنی میں انسان بناتی ہے۔ اور ایسے ہی انسانوں کے متعلق ڈاکٹر اقبال نے
ہے ؎

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

خواجہ غلام السیدین

برسات میں نہر کے کنارے

یہ گھٹا یہ سبز ماحول یہ ساون کی رُت
پڑ رہی ہیں نہر کے پانی پہ لہریں اس طرح
دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کوئی دیہاتی پری
اوڑھنی اپنی سکھاتی ہو فضا میں جس طرح

شاکر عروجی

محبّت کے کرشمے!

(۱)

ستاروں کو میں نے محبّت سے دیکھا — ستاروں نے اپنی مجھے روشنی دی

جو پھیلا دیا میں نے اُلفت کا دامن — چمک مہر نے، چاند نے چاندنی دی

(۲)

سحر کے لئے میں نے اِک گیت گایا — سحر نے مجھے اپنی پاکیزگی دی

جو پھولوں کو چوما تو پھولوں نے ہنس کر — مجھے اپنی مستی بھری تازگی دی

(۳)

نظر بھر کے دیکھا جو روئے شفق کو — شفق نے مجھے اپنی رنگینیاں دیں

جو جنگل میں گھوما تو خاموشیوں نے — مجھے اپنی پُر کیف شیرینیاں دیں

(۴)

محبت سے میں نے کیا ایک سجدہ — گِرا پائے یزداں پہ بے ہوش ہو کر

اُٹھا کر محبت سے یزداں نے مجھ کو — جگہ عرش پر دی ہم آغوش ہو کر

آثر صہبائی

اُردو پر ہندی کا جارحانہ حملہ

(وہ خطبۂ صدارت جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو ہند نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے باونویں سالانہ اجلاس میں بتاریخ ۱۲ اپریل ۱۹۴۱ء پڑھا)

آپ کی انجمن نے چند سال سے اپنے سالانہ جلسے کے پروگرام میں اردو کے لئے بھی ایک دن رکھا ہے۔ یہ بہت مبارک خیال ہے۔ آپ کا صوبہ تقریباً سو سال سے اردو زبان کی پرورش اور خدمت کر رہا ہے۔ اور اُن کے ذریعے سے اس نے وہ کام کیا ہے جو ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے کو نصیب نہیں ہوا یعنی اس نے اپنی وسیع قلمرو میں لسانی اتحاد پیدا کر دیا ہے۔ اس کی سچی قدر ہمیں اب ہوئی ہے۔ جب کہ دوسرے صوبے اختلاف اور افتراق بڑھا رہے تھے آپ اختلاف مٹا کر اتحاد پھیلا رہے تھے۔ جب کہ دوسرے صوبے ہماری تہذیب اور زبان کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے، آپ ان کی بنیاد اور مستحکم کر رہے تھے۔ یہ معمولی کام نہ تھا۔ آپ نے اور آپ کے اسلاف نے اس مہم کے سر کرنے میں جو محنت و مشقت اور جانکاہی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جو قربانیاں کی ہیں وہ کسی حال میں بھلائی نہیں جا سکتیں۔

لیکن بدقسمتی سے اب ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ اب اس کی ترقی کا اتنا فکر نہیں جتنا اس کی حفاظت اور مدافعت کا ہے۔ ہمارا حال اس دقت اس شخص کا سا ہے جسے کتابوں کے نادر اور قلمی نسخوں کے جمع کرنے کی دُھن ہوتی ہے۔ وہ جگہ جگہ مارا مارا پھرتا ہے اور طرح طرح کی صعوبتیں جھیلتا ہے اور جہاں کہیں کسی نادر نسخے کا سراغ لگتا ہے فوراً وہاں پہنچتا ہے خوشامد سے، حیلے سے، روپیہ پیسہ صرف کر کے اسے حاصل کرتا ہے۔ اس طرح زندگی کا بڑا حصہ اور عمر بھر کی کمائی اس میں لگا دیتا ہے جب ایک مدت کے بعد ایک بیش بہا اور بڑا ذخیرہ جمع کر لیتا ہے تو اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور پھولا نہیں سماتا لیکن معاً اسے ایک دوسرا فکر لاحق ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس اَن مول خزانے کا جمع کرنا بے شک بہت کٹھن اور دشوار تھا۔ اور میں اس دشواری پر غالب آ گیا لیکن اب اس کی حفاظت اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ گرد و غبار، آب و ہوا کے اثر، کیڑوں اور دیمک کی یورش اور شریف چوروں کی نظرِ بد سے اس کا بچانا آسان نہیں۔ اب باقی عمر ان سب کے مقابلے اور مدافعت میں بسر کرنی ہوگی۔ اس خیال سے اس کی خوشی آدھی رہ جاتی ہے۔ یہی حال اب ہمارا ہے۔ سالہا سال نسلاً بعد نسلٍ ہم نے اپنی زبان کی نشو و نما اور اشاعت و ترقی میں کوشش کی اور عین اس وقت جب کہ ہم اسے علم و ادب سے اور زیادہ مالا مال کرنا چاہتے تھے ہمیں اس کے بچاؤ کی پڑ گئی۔ بچاؤ بھی کس سے؟ ان سے جو اس کی پرورش اور ترقی میں برابر کے شریک تھے۔ غیر سے مقابلہ اتنا مشکل نہیں جتنا اپنوں سے اور یہ سخت سانحہ ہے۔ اس سے ملک میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ تعلقات میں فرق آ گیا ہے اور اختلاف کا ایک ایسا سوتا کھل گیا ہے جو بند ہوتا نظر نہیں آتا۔

اے اہلِ پنجاب! ہم آپ کی طرف سے مطمئن تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اور صوبوں میں کچھ بھی ہو مگر آپ اس غیر معقول شورش سے محفوظ ہیں۔

کیونکہ آپ نے مدت مدید کی کوشش سے ایسا لسانی اتحاد پیدا کر لیا ہے کہ وہ معمولی مخالفتوں سے نہیں ٹوٹ سکتا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ وہ آندھی جو آپ کے پڑوسی صوبوں میں زور و شور سے چل رہی ہے اس کی سرسراہٹ یہاں بھی محسوس ہو رہی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے فطری استقلال و ہمت سے اس کے روکنے کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے اور اس طوفان بے تمیزی کو اپنے صوبے میں داخل نہ ہونے دیں گے

اس مہینے کے ایک مشہور ہندی رسالے میں جو بنارس سے شائع ہوتا ہے۔ ایک مضمون پنجاب کے ہندی اردو جھگڑے کے متعلق نکلا ہے۔ پنجاب کے متعلق اس میں وہی باتیں ہیں جو آپ بار بار اخباروں میں پڑھ چکے ہیں اور ان کا اعادہ فضول ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پنجاب میں ہندی کوئی زبان ہی نہیں اور اس لئے اس پر بحث کرنا ہی غیر ضروری ہے۔ ریاست ٹراونکور میں بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ وہاں بھی ہندوؤں نے حکومت پر زور ڈالا کہ ہندی مدارس میں رائج کی جائے حکومت نے صاف جواب دے دیا کہ ہندی یہاں کی زبان نہیں اس لئے داخل نصاب نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو ہوا پنجاب کے متعلق لیکن اس مضمون میں مضمون نگار نے عجیب منطق سے کام لیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی نو کروڑ بتائی جاتی ہے۔ ان میں اردو بولنے والوں کی تعداد صرف لاکھوں کے اندر ہے کیونکہ عربی، فارسی یا اردو پڑھے لکھے مسلمان زیادہ تر شہروں ہی میں رہتے ہیں اور دیہات کے مسلمان سب ہندی بولتے ہیں۔ اس سے کئی نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ دوسرا یہ کہ صرف شہروں کے مسلمانوں کی زبان ہے تیسرا یہ کہ باقی تمام آبادی کی زبان جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں ہندی ہے۔

ہندی والوں نے عجب تماشا کر رکھا ہے۔ پہلے تو انھوں نے یہ الزام دینا شروع کیا کہ مسلمان اردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں اور اس پر بہت غم و غصے کا اظہار کیا۔ چونکہ یہ سراسر بہتان تھا اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد دوسری چال یہ چلی کہ خود ہی یہ کہنا شروع کیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی۔ چنانچہ اس رسالے کے اس مضمون میں لکھا ہے کہ بدقسمتی سے ہندی ہندوؤں کی اور اردو مسلمانوں کی زبان سمجھی جانے لگی ہے۔ جب یہ بھی کافی نہ ہوا تو ایک نیا شگوفہ یہ چھوڑا گیا ہے کہ اردو صرف شہروں کے چند لاکھ مسلمانوں کی زبان ہے۔ باقی ملک کی زبان ہندی ہے۔ آج کل پراپیگنڈے کا زمانہ ہے اور پروپیگنڈے میں ہر قسم کی غلط بیانی جائز سمجھی گئی ہے۔ ان باتوں کی تردید کرنا تضیع اوقات ہے۔ میں ان سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ جب انگریزی عہد میں فارسی کی جگہ اردو، عدالتی، دفتری اور تعلیمی زبان قرار دی گئی تو اس وقت یہ صاحبزادی (ہندی) کہاں تھیں؟ اس وقت کوئی منہ سے نہ پھوٹا کہ اردو نہیں ہندی ہونی چاہئے۔ اور کہتا کس منہ سے کوئی زبان ہوتی بھی۔

اب آپ ہندی کی حقیقت سنئے۔ ہندی کوئی ایک زبان نہیں۔ ہر صوبے اور علاقے اور مختلف اضلاع میں الگ الگ ہے میرٹھ اور دہلی کے دیہات کا آدمی اودھ کے دیہات کی بولی نہیں سمجھ سکتا۔ اور اودھ کے دیہات والے کے لئے بہار کے دیہات کی بولی ناقابل فہم ہے۔ بہار کے ایک علاقے کا دیہاتی دوسرے علاقے کے دیہاتی کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے۔ غرض آگرہ اور متھرا کے دیہات کی بولی سمجھنے کے لئے برج بھاشا، اودھ کے دیہات کے لئے اودھی یا پوربی حصار، رہتک کے لئے ہریانی، بنگیل کھنڈ (سنٹرل انڈیا)

سکندرپور، بیگیلی، بکان پور، فتح گڑھ، اٹاوہ، بریلی، علی گڑھ کے دیہات کے لئے قنوجی۔ بنارس، غازی پور، آرہ کے لئے بھوج پوری، بگھیل کھنڈ کے لئے بندیلی کھنڈی۔ مالوہ کے لئے ہردولی، اجین کے لئے اجینی۔ مارواڑ کے لئے مارواڑی۔ بیکانیر کے لئے بیکانیری۔ بہار اور پٹنہ کے دیہات کے لئے مگدھی۔ اودے پور کے لئے اودے پوری۔ جے پور کے لئے جے پوری۔ بھٹانیر کے لئے بھٹانیری۔ ترہت، پورنیا، بھاگل پور، مونگیر کے لئے ترہتی اور میتھلی جاننے کی، اب اس پر یہ دعوے کہاں تک معقول ہو سکتا ہے کہ ہندی سب دیہات میں سمجھی جاتی ہے اور اردو کہیں نہیں سمجھی جاتی۔ ان کی مراد کون سی ہندی ہے؟ غالباً ان کی مراد اس نئی مصنوعی ہندی سے ہے جو حال ہی میں گھڑی گئی ہے اور وہ بھی اردو کے طفیل میں اور اسی کے قالب پر ڈھال کر۔ اور بنی تو ایسی کہ وہ نہ دیہاتی رہی نہ شہری۔ گاندھی جی نے اس ہندی کی بہت صحیح تعریف کی ہے کہ "یہ وہ زبان ہے جو کتابوں میں ہے اور بول چال میں نہیں"۔ اب اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ وہ کہاں تک سمجھی جا سکتی ہے برخلاف اس کے اردو کتابی زبان بھی ہے اور بول چال کی بھی اور اس لئے ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے ہم نے ان دیہاتی جلسوں کو بھی دیکھا ہے۔ جہاں اردو اور اس نئی ہندی دونوں کے مقرر تھے جب ہندی مقرر نے اپنی ہندی میں تقریر شروع کی تو دیہاتیوں نے حقے گڑگڑانے شروع کر دئیے۔ برخلاف اس کے اردو کی تقریر انھوں نے خاصی توجہ سے سنی ہم نے اردو اور ہندی کے مشاعرے بھی دیکھے ہیں۔ اور جن صاحبوں کو ان کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے انھیں معلوم ہے کہ اردو مشاعروں میں جتنی رونق اور چہل پہل ہوتی ہے۔ کوی سمیلنوں میں اتنی ہی بے رونقی اور اداسی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ہندی اور اردو کے مشہور ادیب پنڈت پدم سنگھ شرما مرحوم نے اپنی آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن مظفر پور کی صدارتی تقریر میں بیان کی ہے جو یہ ہے:۔

> "اردو شعرا نے حالی کے رنگ کو اپنا لیا ہے بلکہ اسے اور چمکا دیا ہے۔ اردو اخبارات میں دیس بھگتی (حب وطن) اور معرفت کی جو نظمیں نکلتی ہیں وہ پڑھنے والے ..... کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ دل پر اثر کرتی ہیں۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ہندی کی نئی رچناؤں (نظموں) میں یہ بات ابھی نہیں آئی ..... اردو والے شعروں میں جذبات و خیالات کا نیا پن بھرتے ہیں"۔

خیر سے اس پر یہ دعوے ہے کہ ہندی سارے ملک کی زبان ہے۔ اور اس کے حامی اسے پنجاب، صوبۂ سرحد، سندھ، ملیبار وغیرہ میں پھیلانے کا دم خم رکھتے ہیں۔ ہندی اردو کی بحث میں صرف ایک بات کا یاد رکھنا کافی ہے۔ ہندی بیسیوں ہیں اور اردو ایک ہے جو ہندوستان کے ہر علاقے میں بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ ہندوستان کے باہر بھی اس کے قدردان موجود ہیں۔ اس نے براعظم ہندوستان کو جو ٹکڑیوں میں بٹا ہوا تھا ایک کر دیا۔ اور سب سے پہلے ایک قومیت کی بنیا دڈالی اور ہندی کی بھونڈی بولیوں کو ملا کر جھاڑ جھنکاڑ کو چھانٹا مشترک حصے کو قائم رکھا اور باہر کے خوب صورت، ضروری اور تمدنی الفاظ کا اس میں اضافہ کیا جس سے ایک ایسی مہذب اور پاکیزہ زبان وجود میں آگئی۔ جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک عجیب واقعہ ہے۔ ایک ایسی شائستہ ایک دار، پر لطف اور بھرپور زبان کو چھوڑ کر ایک نئی گھڑی گھڑت، بے لطف اور ملغوبا بولی کے اختیار کرنے کی رائے دینا سراسر ناعاقبت اندیشی

اور مجنونانہ فعل ہے۔

یہ سب جانتے ہیں اور واقف، مخالف غیر جانب دار سبھی نے اسے تسلیم کیا ہے کہ اردو زبان ہندو مسلمانوں کے میل جول سے بنی اور ہمارے ملک کی مشترکہ زبان ہے لیکن اب ہمارے قوم پرست اس سے برا مانتے ہیں چنانچہ پنڈت سمپورنانند جی اپنے پونا والے صدارتی خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں :-

"بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ کم سے کم یکت پرانت (صوبہ متحدہ) کی تو ماتر بھاشا (مادری زبان) تو اردو ہے۔ میں اسے نہیں مان سکتا۔ ہمارے سامنے کچھ ہندو مورتیاں کھڑی کردی جاتی ہیں اور ان کے منہ سے یہ کہلا دیا جاتا ہے کہ ان کے گھروں کی بھاشا اردو ہے۔"

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ پنڈت جی نے ان نیک نفس اور سچے لوگوں کی جو باوجود مخالفت اور سوسائٹی کے دباؤ کے سچ بولنے میں دریغ نہیں کرتے، نہایت رکیک الفاظ میں تحقیر اور توہین کی ہے اور ان کو ریاکار اور منافق ہونے کا الزام دیا ہے۔ حالانکہ ان میں ایسے ایسے بزرگ ہیں جو اخلاقی جرأت، علم و فضل اور شرافتِ نفس میں سمپورنانند جی سے کہیں برتر و افضل ہیں۔ پنڈت جی کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ گو ان کے باپ دادا اردو بولتے آئے ہوں۔ اور گو ان کے گھروں میں اردو بولی جاتی ہو۔ اور خود اردو بولتے ہوں لیکن کہنے کو یہی کہیں کہ ہماری "ماتر بھاشا" ہندی ہے۔ اردو نہیں۔ ریاکاری یہ ہے یا وہ۔ کون نہیں جانتا کہ ہزاروں نہیں لاکھوں ہندوؤں کے گھروں میں اردو بولی جاتی ہے لیکن سمپورنانند جی اور ان کے ہم خیال اصحاب کو ہرگز یہ گوارا نہیں کہ کوئی ہندو یہ کہے کہ میری مادری زبان اردو ہے یا میرے گھر میں اردو بولی جاتی ہے۔ یہ اس شخص کا قول ہے جو ہمارے ملک کا ممتاز لیڈر رہا ہے، انڈین نیشنل کانگرس کا رکنِ رکین ہے، صاحب علم ہے اور کچھ دنوں پہلے وزیر تعلیم رہ چکا ہے۔ وہ اوروں کو بھی اپنا ہی سا سمجھتا ہے ؎

انھوں نے خود غرض شکلیں کبھی دیکھیں نہیں شاید وہ جب آئینہ دیکھیں گے تو ہم بتلائیں گے ان کو

آپ نے ہندی کی حقیقت سن لی اور اس کے حامیوں کے دعوے بھی سن لئے۔ اصل یہ ہے کہ یہ ہندی بولیاں گیتوں، بھجنوں عشقیہ بیتوں کے لئے خوب تھیں۔ تہذیب و تمدن کی ضروریات ان سے پوری نہیں ہوسکتی تھیں۔ ایک ایسی تہذیب اور تمدن کی ضروریات کے لئے جو دونوں قوموں کی یک جائی اور یگانگت، محبت اور خلوص سے پیدا ہوا تھا، ایک ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی جو دونوں کی زبانوں اور دونوں کی تہذیبوں سے مل کر بنی ہو۔ چنانچہ وہی ہوا جو فطرت کا تقاضا تھا اور اس زبان کا چلن اب تک ہے لیکن ملک کی بدقسمتی کہ انگریزی تسلط کے بعد بعض اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں، ہندی والوں کو ایک نئی قومیت کی سوجھی جس کی بنیاد قدیم تہذیب اور قدیم مذہب اور زبان پر تھی۔ اس نئی قومیت کے لئے نئی زبان کی ضرورت داعی ہوئی کیونکہ قومیت کا رشتہ زبان ہی سے مضبوط ہوتا ہے۔ اب انھوں نے ان علاقوں میں جہاں ہندی بولیاں رائج تھیں۔ ایک نئی مصنوعی ہندی کو رفتہ رفتہ داخل کرنا شروع کیا۔ اور اردو کو وہاں سے نکالنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ ملک میں تفرقہ پردازی بلکہ خانہ براندازی کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

اوّل اوّل یہ مخالفت یوپی اور بہار تک محدود رہی کیونکہ ہندی بولیاں صرف یہیں بولی جاتی تھیں۔ دوسرے علاقوں اور صوبوں

میں نہ کہیں بولی جاتی تھیں اور نہ کہیں سمجھی جاتی تھیں۔ شروع شروع میں یہ مخالفت کچھ زیادہ کارگر نہیں ہوئی۔ یوں سمجھئے کہ جیسے کسی تالاب پر ہوا چلتی ہے تو کچھ لہریں اور بلبلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تلاطم بھی آیا پر وہ بھی کچھ دیر کے بعد ہوا ہو گیا لیکن کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوتا کہ اس میدانِ کارزار میں ایک مقدس ہستی نمودار ہوئی جس نے صورتِ حال کی کایا پلٹ کر دی۔

ملک پر اس بزرگوار کے بہت احسان ہیں۔ اس نے سیاسیات، معاشرت، اقتصادیات میں بڑا انقلاب کر دیا۔ قدرت نے اسے خاص قسم کا دماغ عطا کیا ہے۔ اس کا ذہن رسا۔ اس کی نظر دوربیں اور اس کا ارادہ اٹل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کی فکر کا رستہ گو بظاہر صاف اور سیدھا ہے لیکن بباطن پیچ در پیچ ہے وہ اتفاق آباد جانے کا عزم کرتا ہے تو چلتے چلتے نفاق نگر پر جا نکلتا ہے۔ وہ وصل کا طالب ہے لیکن داخل ہوتا ہے فصل کے دروازے سے۔ وہ ایکے کا آرزومند ہے لیکن وہاں تک پہنچتا ہے پھوٹ کے توسّل سے۔ میں کسی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں چاہتا۔ دلوں کا جاننے والا خدا ہے لیکن جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ انسان اپنے اعمال سے جانا جاتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آیا کہ سالہا سال کی گتھیاں اور پیچیدہ مسائل فریقین نے باہمی مشورے اور مصالحت سے سلجھا لئے اور یہ امید بندھ گئی کہ اب نفاق کی گھٹا چھٹنے والی ہے اور آفتابِ اتحاد افق سے طلوع ہونے والا ہے تو تنت پر اس مقدس ہستی نے سر ہلا کر برسوں کی محنت خاک میں ملادی ہے پھر بہتیرا اسر مارا، ہزار جتن کئے، نہ ماننا تھا نہ مانا۔

ہمارے ملک میں تین ہٹیں مشہور ہیں۔ راج ہٹ، تریا ہٹ، اور بالک ہٹ۔ لیکن حضرات ایک چوتھی ہٹ اور بھی ہے، اور وہ ہے لیڈر ہٹ وہ لیڈر ہی کیا جو دوسرے کی مان جائے۔ مرزا داغ نے اپنے خاص انداز میں ایک بہت ہی پُر لطف اور صاف ستھرا شعر کہا ہے۔ کہا تو ہے اپنے محبوب کی شان میں لیکن صادق آتا ہے ہمارے ملک کے سب سے محبوب ڈکٹیٹر لیڈر پر ؎

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں
کہنا نہیں مانتے کسی کا

مشکل یہ آپڑی ہے کہ وہ ہر مسئلے کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے جس سے ایک ہی رُخ نظر آتا ہے۔ دوسرا رُخ نہ وہ دیکھتا ہے۔ اور نہ اس کی پروا ہے۔ اگر کوئی شخص کانا ہو اور وہ ایک آنکھ سے دیکھے تو وہ قابلِ الزام نہیں لیکن جس کی اچھی خاصی دو آنکھیں ہوں اور وہ ایک ہی آنکھ سے دیکھے تو وہ بلاشبہ قابلِ الزام ہے

اس طرزِ عمل سے ملک کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اور باتوں سے تو خیر مجھے کچھ غرض نہیں وہ بڑی طولانی داستان ہے لیکن ہماری زبان پر جو کاری ضرب اس نے لگائی ہے۔ اس کا زخم ایسا گہرا ہے کہ اس کا بھرنا اب خود اس کے بس کی بات نہیں رہی۔ آج تک کسی نے ہماری زبان پر ایسا بے جا۔ غلط اور بے دل آزار حملہ نہیں کیا تھا جیسا اس مقدس بزرگ نے کیا۔ اس کی دوربین نظر نے بہت پہلے یہ دیکھ لیا تھا کہ ہندستان کی موجودہ حکومت رہنے والی نہیں ہے اور رہی تو اس کی یہ صورت نہیں ہوگی۔ وہ رام راج کے میٹھے سپنے دیکھ رہا تھا اور ظاہر ہے کہ رام راج کی زبان ہندی ہی ہو سکتی ہے اردو نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس نے ہندی کی اشاعت کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس مسئلے میں اس کا ہاتھ ڈالنا تھا کہ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ہلچل مچ گئی اور ایک ایسے نئے فساد کی بنیاد قائم ہو گئی جو دن بدن بڑھتا

اور پھیلایا جاتا ہے۔ سیاسی مسائل جن کو آج کل اس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے سیاسیات سے ایک کو دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہر شخص سیاسی مسائل کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن زبان کی بات اور ہے۔ اس کا تعلق چھوٹے بڑے امیر غریب، عالم عامی سب سے یکساں ہے۔ وہ ان کے جسم وجان کا جزو ہے جو کسی حال میں ان سے جدا نہیں ہو سکتا۔ زبان پر جو چوٹ ہے وہ زبان پر نہیں پڑتی، دلوں پر پڑتی ہے اور چوٹ کھائے ہوئے دلوں سے ڈرنا چاہئے۔

حذر کر مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

سیاسی مسائل خواہ کتنے ہی اہم اور کیسے ہی ضروری کیوں نہ ہوں کبھی خاطر خواہ حل نہ ہوں گے جب تک زبان کا مسئلہ حل نہ ہوگا۔ افسوس اس ہے کہ یہ فساد وہاں سے پھوٹا جہاں ملک بھر کے مسائل طے ہوتے ہیں اور یہ زہر اس زبان سے نکلا ہے جو سب سے زیادہ نرم اور سب سے زیادہ دل لبھانے والی ہے۔

حضرات! آج کل ہندوستان کی تقسیم کے متعلق اخباروں میں بڑی گرم اور تند و تلخ بحثیں ہو رہی ہیں۔ میں نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں دیا۔ اور نہ میں اس کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ اس لئے مجھے اس کے عیب وصواب پر بحث کرنے کا کوئی حق نہیں لیکن حیرت اس پر ہے کہ جو لوگ جغرافی تقسیم پر اس قدر غم وغصہ کا اظہار فرماتے ہیں۔ انھوں نے کبھی دلوں کی تقسیم کا بھی خیال کیا؟ دلوں کو توڑ کر انھیں جغرافی حدود سے جوڑنا کیا حاصل ہے۔ کیا وہ دل جن میں پھوٹ پڑ چکی ہے۔ پہاڑوں۔ دریاؤں اور جنگلوں سے گھیر کر ایک کئے جا سکتے ہیں؟ دل ایک ہیں تو ایک نہیں بیسیوں تقسیمیں بھی نقصان نہیں پہنچا سکتیں لیکن اگر دل ایک نہیں تو جغرافی حدود کے تعین کی بہتر سے بہتر تجویز بھی انھیں ایک نہیں کر سکتی۔ اس لئے جو لوگ ملک کے سچے بہی خواہ ہیں انھیں ملک کی تقسیم پر بحث کرنے سے پہلے دلوں کی تقسیم پر بھی غور کر لینا چاہئے اور اس پر غور کرتے وقت سب سے پہلے زبان کے مسئلے پر غور کرنا پڑے گا۔

جو شخص کسی ملک یا قوم میں پھوٹ ڈالتا ہے وہ بڑا ظالم ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے وہ ذہین اور تیز فہم بھی ہے تو ملک وقوم کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ زبان کی پھوٹ سب سے بڑی پھوٹ ہے۔ اور اس لئے سب سے بڑا ظلم ہے۔ یہ وہ قہر ہے جو خدا کی طرف سے اہل بابل پر نازل ہوا تھا اور آج ہندوستان پر نازل کیا گیا ہے۔

دوستو! زبان اپنے بولنے والوں سے اس طرح وابستہ ہے کہ وہ کسی وقت اور کسی حال میں ان سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اٹھتے بیٹھتے جاگتے، ہر وقت ان کی ہمدم ہے۔ ان کی تہذیب اور تعلیم و تربیت کا یہی ذریعہ ہے۔ زبان کا حشر وہی ہوگا جو اس کے بولنے والوں کا ہوگا۔ اس کا بنانا اور بگاڑنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ گزشتہ زمانے میں جیسا ہم نے اسے بنانا چاہا۔ ویسی ہی بنی اور آئندہ بھی جب اسے بنانا چاہیں گے بنتی رہے گی۔ اس کے بگڑنے میں ہمارا بگڑنا اور اس کے بننے میں ہمارا بننا ہے اس لئے آپ سب سے پہلے اس کی خبر لیجئے۔ اور اسے مخالفوں کی زد سے بچائیے اور سچے دل سے عہد کیجئے کہ آپ اس پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ ہماری زبان کے خلاف خفیہ اور علانیہ۔ دانستہ یا نادانستہ جو ریشہ دوانیاں اور منظم سازشیں ہو رہی ہیں۔ اس کا علم شاید آپ کو ہو یا نہ ہو لیکن بدنصیبی سے میں کچھ کچھ جانتا ہوں۔

پس اب تو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ نے اپنی زبان کی حفاظت اور ترقی میں اسی مستعدی اور سرگرمی اسی جوش اور ہمت اور اخلاص اور ایثار سے کام نہ لیا جو آپ کے حریف کر رہے ہیں تو یاد رکھئے کہ ہماری قسمت میں ذلت و غلامی کا ایک ایسا طوق رکھا ہے جس کے بوجھ سے ہماری گردنوں کے منکے ٹوٹ جائیں گے۔ اور ہمارے دل و دماغ پاش پاش ہو جائیں گے۔

پھر نہ کہنا کہ کون کہتا تھا

عبدالحق

بڑھاپے سے بچنے کے طریقے

۱ - ہمیشہ نوجوانوں کی صحبت میں رہنا چاہئے۔

۲ - اپنے دماغ میں ایسی دھن رکھو جس سے تمہارے چہرے پر ہر وقت اشتیاق اور سرگرمی کی چمک موجود رہے۔

۳ - غصے اور رنج سے پرہیز کرو۔

۴ - زیادہ ہنسنے تیوری چڑھائے رہنے اور گہرے غور و فکر سے احتیاط رکھو۔ اس سے چہرے پر جھریاں پڑجاتی ہیں اور بڑھاپے کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔

۵ - چلتے وقت سینے کو آگے نکال کر جوانوں کی طرح تیز چلا کرو۔

۶ - جوانوں کا سا لباس پہنو۔ اور جوانوں کے سے خیالات دل میں رکھو جس سے احساس جوانی قائم رہے۔

۷ - آنکھوں کو پورے طور پر کھلا رکھا کرو۔ تاکہ بڈھوں کی طرح پپوٹے لٹکنے نہ پائیں۔

۸ - اداسی۔ مایوسی۔ فکر۔ غم سے پرہیز کرو۔

۹ - یہ خیال نہ کرو کہ بڑھاپا آگیا بلکہ یہ خیال رکھو کہ ابھی جوان ہیں اور جوان رہیں گے۔

۱۰ - غصہ اور بحث مت کرو۔

۱۱ - سختی کا جواب نرمی سے دو۔ مزاج کو اعتدال پر رکھو۔

۱۱ - خوب نیند بھر کر سوؤ کھلی ہوا میں چہل قدمی کرو۔ اور تھوڑی ورزش کیا کرو۔

۱ - جسم و لباس کو صاف رکھو۔

۱ - موٹاپے سے بچو۔ موٹاپے سے بچنے کے لئے دوڑ لگایا کرو۔

- ہنسی خوشی کے کاموں میں جوانی کے ایام کی طرح شریک رہا کرو۔

حکیم غلام رضا خاں
"چشمہ حیات"

وطن سے دُور

(کراچی میں میری سب سے پہلی نظم)

ہر طرف اک اجنبیت سی برستی ہے یہاں
آنکھ بیگانوں میں اپنوں کو ترستی ہے یہاں

آہ! ان جلووں میں وہ مانوس تنویریں کہاں
آرزوؤں کے حسیں خوابوں کی تعبیریں کہاں

آہ! اس ماحول میں درد آشنا ملتا نہیں
زندگی کو زندگی کا آسرا ملتا نہیں

موت کی بستی میں زندوں کی بھلا سنتا ہے کون؟
زندگی کے گیت کی تانوں پہ سر دھنتا ہے کون؟

لحظہ لحظہ نو بنو عالم گزرتے ہیں یہاں!
لمحہ لمحہ دل میں سو طوفاں ابھرتے ہیں یہاں

آہ! ان بے تابیوں کی دوستوں کو کیا خبر
میری ان بے خوابیوں کی دوستوں کو کیا خبر

دور ہے مجھ سے وطن اور میں وطن سے دور ہوں
ایک طائر ہوں مگر اپنے چمن سے دور ہوں

مضطرب سی موج ہوں رہتی ہو جو ساحل سے دور
ایک درماندہ مسافر ہوں جو ہو منزل سے دور

اک سفینہ ہوں جو ہو گرداب میں آیا ہوا
پھول ہوں جو یادِ گلشن میں ہو مرجھایا ہوا

جب وطن کا نام آتا ہے تو رو لیتا ہوں میں
زخمہائے دل کو یوں اشکوں سے دھو لیتا ہوں میں

مسکراتی ہیں نگاہوں میں وفائیں اے مجید
آنسوؤں کا سیل بنتی ہیں، دعائیں اے مجید

میں یہ کہتا ہوں الٰہی! دوستوں کی خیر ہو
یاالٰہی گاؤں کی پگڈنڈیوں کی خیر ہو

اے خدا قائم رہیں پن گھٹ کی سب آبادیاں
اے خدا زندہ رہیں تا حشر دہقاں زادیاں

اے خدا پھولی ہوئی سرسوں کے کھیت آباد ہوں
گاؤں کے سب رہنے والے بامراد و شاد ہوں

اے مرے مالک! مری ننھی سی ماں جائی کی خیر
والدہ کی خیر میرے چاند سے بھائی کی خیر

یاالٰہی ان پھلے پھولے چمن زاروں کی خیر
خطۂ پنجاب کے شاداب نظاروں کی خیر

دل یہ کہتا ہے کہ جب سوئے وطن جاؤں گا میں
دیس کی رونق کو پہلے سے فزوں پاؤں گا میں

مجید لاہوری

بیوہ

خزاں کا دور دورہ تھا۔ بارشیں معمول سے بہت زیادہ ہوئیں۔ درختوں کے زرد پتے پاؤں تلے روندے جانے کی بجائے بارش کے پانی کے
ے ساتھ گڑھوں میں پڑے ہوئے تھے۔ رات کے وقت ہم اکثر شطرنج کھیلتے۔ ایک رات یہ فیصلہ ہوا کہ سب اپنی اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنائیں
ن میں سے بعض نے اپنی شجاعت، جرأت اور بہادری کے کارہائے نمایاں سنائے لیکن کوئی واقعہ ایسا نہ تھا جس میں سب نے دلچسپی لی ہو۔ ہم
لاؤ کا یہ طریقہ ترک کرنے ہی والے تھے کہ ایک نوجوان لڑکی نے جو اپنی غیر شادی شدہ بوڑھی پھوپھی کے ہاتھ سے کھیل رہی تھی اپنی پھوپھی کی انگلی پہ
ہری گھنگریالے بال لپیٹے ہوئے دیکھے، نہایت نرمی سے اس نے ان پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں ان بالوں کی داستان سنائیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بچے کے بال ہیں۔"

بوڑھی عورت کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا —— سرخ اور پھر یک دم زرد —— گہرا زرد! اداس نے کانپتے ہوئے
ل سے کہا "یہ ایک حسرت خیز داستان ہے۔ اتنی الم انگیز کہ میں نے اس کا ذکر کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی کروں گی —— یہ میری زندگی
م ناکامیوں اور حسرتوں کا مرکز ہے —— یہ جب کی بات ہے کہ میں ایک حسین دوشیزہ تھی لیکن اس جاں کاہ واقعے کی یاد اتنی
یز اور غم خیز ہے کہ جب کبھی میں اس کا خیال کرتی ہوں مجھے آنسو پونچھنے پڑتے ہیں۔"

حاضرین نے یہ واقعہ سننے کی بہت کوشش کی لیکن بوڑھی عورت نہ مانی۔ آخر حاضرین کے اصرار سے مجبور ہو کر یوں گویا ہوئی۔

"آپ سب نے سینٹیئر خاندان کے متعلق جس کا اب ایک فرد بھی باقی نہیں رہا اکثر کہانیاں سنی ہوں گی۔ میں اس خاندان کے آخری تین
و جانتی ہوں لیکن تینوں چند ماہ کے اندر اندر مر گئے۔ یہ حسین سنہرے بال ان تینوں میں سے آخری کے ہیں —— اس کی عمر صرف
سال کی تھی۔ جب اس نے اپنے آپ کو میرے لئے ہلاک کر دیا۔ آپ یہ سن کر بہت حیران ہوئے ہوں گے لیکن سچ مانیئے کہ وہ غیر معمولی
کے انسان تھے —— بے وقوف لیکن محبت کے لئے۔ باپ اور بیٹے —— تمام کے تمام محبت کے روگ میں مبتلا تھے
اتی —— آہ! سب نے اپنی جانیں محبت کی دیوی کی بھینٹ چڑھا دیں۔ اپنے رشتہ دار مل اور گرد و نواح کے لوگوں میں وہ پروانے مشہور
ان کے بال گھنگریالے اور سنہرے تھے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں —— بے قرار کرنے والی آنکھیں دل کو فگار کر کے رہتی تھیں۔ نہ جانے
ں کیسی جاذبیت اور غیر معمولی کشش تھی۔

جس لڑکے کا میں ذکر کر رہی ہوں اس کے دادا کو پینسٹھ سال کی عمر میں اپنے ایک مزارع کی نوجوان لڑکی سے عشق ہو گیا اور اس خیال سے

شادی کر لی لیکن تمام خاندان میں سے کسی نے بھی اس بات پر اعتراض نہ کیا۔ کیونکہ وہ سب محبت کو ایک فطری جذبہ سمجھتے تھے۔ ایک رات ایک شخص جسے اس نے شکار کے لئے بلایا تھا۔ خود اس کی نوجوان بیوی کو شکار کر کے لے گیا۔ دوسرے دن بوڑھا عاشق مردہ پایا گیا۔

اسی طرح اس لڑکے یعنی میرے محبوب کا باپ ۱۸۶۸ء میں پیرس کے ایک ہوٹل میں مردہ پایا گیا۔ کیونکہ اس کی محبوبہ ——— ایک ایکٹریس نے اسے دھوکا دیا تھا۔ جب میرے محبوب نے خودکشی کی اس کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ اس کی بیوہ ماں اسے لے کر ہمارے ہاں آئی تھی۔ اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی۔

آپ اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ اس کی فطرت میں محبت کا عنصر کتنا زیادہ تھا۔ وہ ہمیشہ ایک خواب کے سے عالم میں رہتا۔ میں اکثر اس جذباتی نوجوان کو اپنی کھڑکی میں سے اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھتی۔ وہ ہر وقت خیالات میں ڈوبا رہتا تھا۔

شام کو کھانا کھانے کے بعد وہ کہتا ——— "آؤ خواب دیکھنے چلیں" ہم دونوں اکٹھے سیر کو جاتے۔ کسی صاف میدان میں وہ چلتے چلتے رک جاتا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتا: "دیکھو! چاند کی طرف دیکھو! آہ! تم نے میرا مفہوم نہیں سمجھا، اگر تم میرا مطلب سمجھ جاؤ تو تمہیں ایک سرمدی اور جاودانی راحت نصیب ہو لیکن جس نے محبت نہ کی ہو، وہ ایسی باتیں نہیں سمجھ سکتا" میں ہنس دیتی اور اسے اپنے آغوش میں لے لیتی ——— اس ننھے سے بچے کو جو یہ ظاہر کرتا کہ وہ میری محبت میں پھنستا جا رہا ہے۔

اکثر وہ میری ماں کے پاس بیٹھ جاتا اور کہتا "مجھے کوئی داستانِ محبت سنائیے" اور میری ماں اسے اس کے باپ دادا کے دلچسپ اور جوان خون کو کھولانے والے واقعات سناتی۔ چھوٹا لڑکا یہ باتیں سن کر جوش میں آجاتا اور اکثر کہہ اٹھتا: "میں بھی ——— ہاں میں بھی محبت کرنا جانتا ہوں ——— ان سب سے زیادہ!"

آہستہ آہستہ اس نے صاف طور پر مجھ سے محبت کا اظہار شروع کیا۔ ہم سب اس کی باتوں پر خوب ہنستے۔ ہر صبح وہ مجھے تازہ پھول دیتا ——— آہ! وہ حسین پھول، اور ہر شام وہ اپنی خواب گاہ میں جانے سے پہلے میرے ہاتھ کو چوم کر کہتا ——— "میری جان! مجھے تم سے محبت ہے"

آہ! میں گنہگار ہوں گنہگار! اسی لئے میں نے آج تک شادی نہیں کی ——— میں اس کی طفلانہ محبت سے بہت خوش ہوتی۔ میرے لئے یہ ایک تفریح کا سامان تھا۔ اور ہماری ماؤں کے لئے بھی۔ وہ صرف بارہ سال کا تھا ——— آپ ہی کہئے کون کہہ سکتا تھا کہ اس کی محبت آگے چل کر کیا رنگ لائے گی۔ میں اسے جتنے وہ چاہتا بوسے دیتی ——— آہ وہ بھول! میں اسے محبت آمیز خطوط لکھتی اور وہ مجھے، جو ہماری مائیں پڑھ لیتی تھیں ——— آہ اس کے خطوط! محبت کا سوز ان کے ایک ایک لفظ سے نمایاں تھا۔ اور ایک ایک حرف الفت کی داستان سناتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہماری محبت اور ہمارے خطوط کا راز صرف ہمیں تک محدود ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو ایک مرد سمجھتا تھا ——— آہ! ہم کتنی سنگین غلطی ہوئی۔ ہم بھول چکے تھے کہ وہ خاندان سنٹیئیز سے تعلق رکھتا ہے۔

اسی طرح ایک سال گزر گیا ——— ایک شام اس نے اپنے آپ کو میرے قدموں میں گرا دیا۔ اور میرے پاؤں پر بے حد بوسے دیئے

وہ بار بار کہتا تھا: "میں تم سے محبت کرتا ہوں مجھے تم سے عشق ہے۔ تمہاری محبت مجھے جلائے دیتی ہے۔ یہ مانو! اگر تم نے مجھے دھوکا
—— اور تم نے مجھے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ رشتۂ محبت جوڑا تو میں وہی کچھ کروں گا جو میرے باپ نے کیا تھا —— " اور بہت
آہستہ سے کہتا "تم جانتی ہو! میرے باپ نے کیا کیا تھا"

پھر اس نے اُٹھ کر میرے کان میں کہا "گنی ویو" (یہ میرا پہلا نام تھا) —— آہ! اس کی آواز میں کتنی نرمی تھی کتنی محبت اور کتنی مٹھاس
میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔

"آ —— آؤ۔ ہم گھ ..... گھر واپس چلیں" میری آواز میں لکنت آگئی۔ وہ خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ گھر کے نزدیک
اس نے میرا بازو پکڑ لیا —— "میری جان! تم جانتی ہو کہ اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو میں خودکشی کروں گا"

میں خاموش ہو گئی، آہ! اب مجھے معلوم ہوا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اب میں اس سے کچھ سرد مہری سے پیش آئی۔ دوسرے
اس نے آہِ سرد بھر کر مجھ سے کہا —— "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے دھوکا دو گی" ——

میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا "اب تم کافی بڑے ہو گئے ہو۔ اس لئے اب ہمیں یہ کھیل ختم کرنا چاہیئے" وہ خاموش ہو گیا۔ میں سمجھی
کہ اب وہ میرا خیال چھوڑ دے گا۔ تھوڑے دنوں بعد وہ اپنے سکول چلا گیا۔ اگلے موسم گرما میں جب وہ گھر واپس آیا تو میری منگنی ہو چکی تھی
دن اس کو میری نسبت کی خبر ہوئی۔ اب وہ حد درجہ غمگین معلوم ہوتا تھا۔ چند دنوں میں اس کا چہرہ بالکل اتر گیا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے
حسرت برس رہی تھی۔ ساتویں روز جب میں صبح سو کر اٹھی تو دروازے میں کاغذ کا ایک پرزہ پڑا ہوا دیکھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور پڑھا۔

"تم نے مجھے دغا دی —— تم نے وفا کی لاج نہ رکھی —— آہ تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ تمہیں معلوم ہے میں نے تم سے کہ
کہا تھا، تم نے میری موت کا حکم دیا ہے۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں —— سرِ تسلیم خم ہے! کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم ہی سب سے پہلے مجھے د
اس لئے باغ کے اُسی گوشے میں آؤ، جہاں میں نے گزشتہ سال اظہارِ محبت کیا تھا۔

مجھ پر جنوں کی سی حالت طاری ہو گئی، میں جلد جلد کپڑے پہن کر اس جگہ پہنچی۔ اس کی چھوٹی سی ٹوپی زمین پر بھیگی پڑی تھی۔ رات بارش ہوتی رہ
تھی، میں نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور درخت کے پتوں میں کچھ دیکھا —— اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کیا ہوا جب مجھے ہوش آیا تو میں فو
گھر واپس آئی اور سب کو بتایا لیکن پھر بیہوش ہو گئی۔

کافی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میری ماں میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلے میں نے سمجھا کہ میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ "اور گانٹرن
—— ؟" میں نے پوچھا لیکن میری ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ مجھے اس کو دوبارہ دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی لیکن میں نے اپنی ماں سے کہہ کر اُس کے چند بال لے لئے
یہ ہیں وہ بال —— بوڑھی عورت نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "آہ! اُس کے بال" اس کے بعد بوڑھی عورت نے کئی مرتبہ رومال سے اپنے آنسو
پونچھے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر کہا "میں نے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اس وقت سے بیوہ ہوں —— اس ۱۲ سالہ بچے کی بیوہ! اتنا کہا اور
زار و قطار رونا شروع کر دیا —— ایک شخص نے دوسرے کے کان میں آہستہ سے کہا "آہ! جذباتی ہونا بھی کتنی بدقسمتی ہے"

"ناکام آرزو"

غزل

ہر دم جو ذکرِ دوست کئے جا رہی ہوں میں
یہ شربِ زندگی ہے جئے جا رہی ہوں میں

ہمدم نہ پوچھ لذتِ صہبائے معرفت
فطرت پلا رہی ہے، پئے جا رہی ہوں میں

زور و قدر سے دیکھئے انسان کی بے بسی
ناکردنی بھی ہو تو کئے جا رہی ہوں میں

دار العمل میں لطفِ مکافات دیکھئے
لیتی ہوں یاں وہی جو دئے جا رہی ہوں میں

دنیائے دوں ہے شاطر و مکار بالیقین
کیوں اس بلا پہ جان دیئے جا رہی ہوں میں

سب رہ گیا اثاثہ، مال و منال یاں
کیا چیز اپنے ساتھ لئے جا رہی ہوں میں

انیسہ ہارون بیگم شروانیہ
حیدرآباد دکن

دردِ جاوداں

مری فرقت میں تجھ کو سرگرانی اب بھی ہوتی ہے
محبت میں مصیبت زندگانی اب بھی ہوتی ہے

تجھے کیونکر گماں ہوگا کہ اتنی تلخ کامی ہے
تمناؤں کی سینے میں روانی اب بھی ہوتی ہے

سنا ہے حسن کی بزمِ طرب میں ہم نشیں اک
مری مایوس آہوں کی کہانی اب بھی ہوتی ہے

زمانہ قیدِ محسوسات سے چھوٹے ہوئے ایک
خزاں بر دوشِ فصلِ زندگانی اب بھی ہوتی ہے

تمنا مسکراتی ہے نہ ارماں جگمگاتے ہیں
فضا عکسِ شفق سے ارغوانی اب بھی ہوتی ہے

خرابِ زیست ہوں یادِ محبت میں مگر ہم
مری ہر سانس عمرِ جاودانی اب بھی ہوتی ہے

زمانہ ہو گیا گزرے مگر بزمِ ادیباں
شمیمِ نکتہ داں کی نوحہ خوانی اب بھی ہوتی ہے

صفیہ شمیم ملیح آبادی

بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

کچھ عرصہ ہوا شبرؔ نے مجھے ایک تھیلا دکھایا —— صرف دور سے! میں نے پوچھا بھئی اس میں کیا چیز ہے؟ کہنے لگے ؎

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط

اس کے بعد اس میں سے خط نکال نکال کر دور ہی سے مجھے دکھانے شروع کر دیئے ان خیالی حسینوں کے متعلق مجھے جو حسنِ ظن پیدا ہوا تھا وہ تو یہ دیکھ کر جاتا رہا کہ عمرو عیار کی اس زنبیل میں سب سے زیادہ خط غالباً میرے ہی لکھے ہوئے تھے البتہ "بتوں" کی تصویریں دیکھنے کا اشتیاق ابھی تک باقی ہے لیکن آج تک اس خواہش کو محض اس خیال سے دبائے بیٹھا ہوں کہ کہیں اس تھیلے میں میری ہی وہ منحوس تصویر نہ ہو جو مال کے ایک نالائق فوٹوگرافر نے کھینچی تھی اور جس کے متعلق اس کا اپنا فتویٰ یہ تھا کہ "اسے دیوار پر ٹانگنا زیادہ بہتر رہے گا" اور ہمارا خیال یہ تھا کہ اسے سوٹ کیس میں کپڑوں کی تہ کے نیچے رکھنا موزوں ہوگا۔ اصل قصہ یوں ہے کہ دو تین سال ادھر میں نے اور امجد نے ان فوٹوگرافر صاحب سے تین تصویریں اتروائیں ایک تصویر میں انھوں نے اپنے کمالِ فن کا یوں مظاہرہ کیا کہ دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم تارکول کے پیپے میں کھڑے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت آپ نے یہ کیا حرکت کی؟ فرمانے لگے کہ یہ تو فوٹوگرافک آرٹ ہے! آرٹ کے متعلق میری معلومات اتنی ہی پست ہیں جتنی بین الاقوامی سیاست کے متعلق اردو کے کسی روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی۔ اس لئے میں آرٹ کا لفظ سن کر سہم گیا۔ انھوں نے مجھے زیادہ مرعوب کرنے کی خاطر ایک اور تصویر لا دکھائی ہمیں تو صرف تارکول کے پیپے میں کھڑا دکھایا گیا تھا۔ یہاں صاحبِ تصویر پر شبہ ہوتا تھا کہ تارکول کے حوض میں کافی عرصہ داد شناوری دینے کے بعد ابھی ابھی باہر تشریف لائے۔ میں نے کہا "ہاں یہ صاحب ہم سے بھی زیادہ مظلوم ہیں!" اسپر فوٹوگرافر صاحب کو ذرا غصہ سا آیا اور فرمانے لگے "آپ آرٹ کی توہین کر رہے ہیں" میں نے کہا "آرٹ وارٹ سے تو میں بالکل ناواقف ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کوئی شریف آدمی اس تصویر کو اپنی میز پر رکھنا گوارا نہ کرے گا" فرمانے لگے "میز پر ایسی تصویروں کو رکھتا کون ہے؟ اسے تو دیوار پر ٹانگنا زیادہ بہتر رہے گا" میں نے عرض کیا "اور سوٹ کیس میں رکھنا اس سے بھی بہتر"۔ . . . میرے اس فقرے کی داد انھوں نے کچھ اس انداز میں دی کہ اس کی منظر کشی میرے لئے نہ آسان ہے اور نہ خوش گوار!

ایک دن میں نے دیکھا کہ میرے اپنے سوٹ کیس میں شبرؔ کے تھیلے کی طرح بے شمار کاغذ بھرے پڑے ہیں۔ ان میں زیادہ تر دوستوں کے وہ خط ہیں جو میں پھاڑا نہیں کرتا۔ کچھ ایسے بھی خط ہیں جو میرے دوستوں نے میرے بجائے کسی اور کو لکھے یا کسی اور نے ان کو لکھے اور اب وہ نہ کاتب کے پاس ہیں نہ مکتوب الیہ کے پاس بلکہ میرے سوٹ کیس میں بند ہیں بعض خط میرے دوستوں نے اپنی رضامندی سے

مجھے دیئے۔ بعض میں نے ان سے زبردستی چھینے۔ بعض ان کی عدم موجودگی میں چرائے —— اور بعد میں انھیں اس چوری کی اطلاع دیدی۔ ایسا کوئی خط میں نے نہیں چرایا جس کی اطلاع چوری کے بعد مالک کو نہ دی ہو۔ ان میں سے اکثر خط اردو میں ہیں۔ کچھ انگریزی میں کچھ فارسی میں اور کچھ ایک ایسی زبان میں جو اردو ہے نہ انگریزی۔ بعض خط تو اردو میں ہیں لیکن نیچے دستخط ہندی میں ہیں۔ دو خط ایسے بھی ہیں جو ایک مختصر سی ڈاڑھی اور بڑے وزنی ڈنڈے والے مولوی صاحب نے اپنے ایک دوست کو لکھے تھے۔ اور "تبرک" کے طور پر ان کی ایک ایک نقل مجھے بھی بھیج دی تھی۔ ان خطوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی جب جلال میں آتا ہے تو قانون اور اخلاق دونوں کی حدیں پھلانگ جاتا ہے۔

ان خطوں کے علاوہ بعض نامکمل مضمون ہیں جو میں نے لکھنے شروع کئے تھے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے مکمل نہ ہو سکے۔ کچھ مسودے ہیں۔ دوستوں کے مضمونوں کے کچھ تقریروں کے نوٹ ہیں۔ بعض تقریریں خود میں نے لکھیں بعض میرے دوستوں نے۔ ان کی تقریروں کے نوٹ بھی اسی طرح میرے پاس پہنچے ہیں جس طرح ان کے خطوط اور بعض ایسی تحریریں ہیں جن کے متعلق اب کوشش کے باوجود مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کس چیز کے متعلق ہیں؟

آپ کہیں گے کہ ان خطوں اور مضمونوں اور تقریروں کا تذکرہ ایک ایسے مضمون میں جو ایک ادبی رسالے میں چھپ رہا ہے اگر حماقت نہیں تو نامعقولیت ضرور ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ اگر کوئی شخص محض معقول باتیں ہی کرتا رہے۔ یا کم از کم محض معقول باتیں ہی کرتے رہنے کی کوشش کرے تو اس کا انجام لازمی طور پر یہ ہوگا کہ وہ یا تو پاگل خانے میں رہے گا یا جیل خانے میں اور میں نہ نبوت کا دعویٰ کرنا چاہتا ہوں نہ لیڈری کا۔ اس لئے کبھی کبھار دانستہ اور اکثر اوقات نادانستہ نامعقول حرکتیں کرتا رہتا ہوں اور پھر ان تحریروں میں بعض ایسی دلچسپ ہیں کہ انھیں محض اپنے آپ تک محدود رکھنا ان کے لکھنے والوں سے بے انصافی کرنا ہے۔ میں داد دینے کے معاملے میں بخیل ہوں اور وہ بیچارے ابھی تک جائز داد سے محروم رہے ہیں۔ شاید اسی صورت میں ان کی حق رسی کا کوئی سامان پیدا ہو جائے۔

زرد رنگ کے دو کاغذوں پر ایک آشنا اور محبوب طرز تحریر میں ایک تقریر کے نوٹ ہیں جو آج سے چار سال اُدھر لاہور کے لاجپت رائے ہال میں کی گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جسے کرنے کی کوشش کی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نوٹ بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں۔

۱۔ سر سید۔ ہندوستان ایک خوبصورت دلھن ہے۔ ہندو مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔

(ا) ایک آنکھ اگر پھوڑ دی جائے۔ کانی۔ بدشکل اور ناپسند

(ب) اگر دونوں آنکھیں دو مختلف سمتوں میں دیکھیں بھینگی۔ ناپسند عیب دار ہو جائیں گی۔ ہندوستان کی حالت اس وقت یہی ہے

(ج) صحیح نظر دونوں آنکھوں کا مل کر کام کرنا۔

(د) بھینگے پن کا علاج . . . . . .

(یہ امر قابل ذکر ہے کہ میرے مقرر دوست ان دنوں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے اور غالباً "فسٹ ایئر" میں!)

اس کے بعد یہ لکھا ہے۔

۲۔ ہم نوجوانوں میں۔حرارت، قوت، ہمت ہے۔ بوجھ ہمیں کو سنبھالنا ہے۔

حالیؔ کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا

کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

اس کے بعد یہ سلسلہ نمبر ۸ تک جاتا ہے اور ہر نمبر کے ماتحت ا۔ب۔ ج۔د ضرور ہیں۔

آخر میں یہ شعر لکھا ہے

اقبالؔ تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس تقریر کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے میرے دوست غالباً ان دنوں مستقبل کا راشٹر پتی ابوالکلام آزاد بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اور میں اس کوشش میں تھا کہ بڑا ہو کر اور کچھ نہیں تو کم از کم "فخر الملت والدین" ضرور بن جاؤں۔ میں مسلمان طلبہ کی ایک "فرقہ پرست" جماعت کا قائد اعظم تھا اور وہ بخیال خویش ہندو مسلم طلبہ کی ایک دیش بھگت جماعت کے پردھان تھے! لاجپت رائے ہال میں ہماری مذمت کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد کیا گیا لیکن دیش بھگت ابھی اپنے اپنے ہوسٹلوں میں تھے کہ فرقہ پرستوں نے لاجپت رائے ہال پر قبضہ کر لیا۔

میرے دوست اور ان کے ساتھی جب جلسہ گاہ میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف فرقہ پرست چھائے ہوئے ہیں خیر جلسہ شروع ہوا لیکن ہماری "فوج ظفر موج" نے وہ شور مچایا کہ کارروائی جاری رکھنا مشکل ہو گئی۔ کوئی بلی کی آوازیں نکال رہا ہے۔ کوئی گھوڑوں کی طرح ہنہنا رہا ہے۔ کوئی باجا بجا رہا ہے۔ کوئی بھیرویں الاپ رہا ہے۔ کوئی صاحب پاؤں سے طبلے کی آواز پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ اس نقار خانے میں بے چارے قوم پرست مقررین کی آوازوں کو وہ وقعت بھی حاصل نہ تھی جس سے روایتی طوطی کو بھی محروم نہیں رکھا گیا۔

یکایک ہمارے دوست سٹیج پر تشریف لائے۔ چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ غالباً انھوں نے صدر کو "کامریڈ پریذیڈنٹ" کہہ کر مخاطب کیا اور اس کے بعد فرمانے لگے "یہ وہ لوگ بیٹھے ہیں جنھیں دیکھ کر مجھے شرم آرہی ہے" یہ اشارہ ہم ناخلفوں کی طرف تھا! مجمع میں سے کسی نے آوازہ کسا "شرم آتی ہے تو نقاب اوڑھ لیجئے"۔ مقرر کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔ انھوں نے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلانے کی کوشش کی مگر اب انھیں کون بولنے دیتا تھا۔ آخر ڈاکٹر سیف الدین کچلو ان کی مدد کو آئے اور فرمانے لگے "زندہ دلانِ پنجاب اپنی مہمان نوازی کے لئے مشہور ہیں۔ آپ کے یہ بھائی علی گڑھ سے تشریف لائے ہیں ......" ابھی انھوں نے اپنا فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ ہم میں سے ایک مجاہد نے نعرہ لگایا "یہ تو پچھلے سال یہیں اناٹومی میں فیل ہوئے تھے۔ اگرچہ ہمارے یہ بھائی کبھی فیل نہیں ہوئے تھے لیکن یہ نعرہ کام کر گیا اور ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ جا بیٹھے۔ اس کے بعد ہم نے اپنے دوست کی آواز تو نہیں سنی۔ البتہ ان کے ہونٹ ضرور آدھ گھنٹے تک ہلتے رہے۔ بعد میں ان کی زبانی معلوم ہوا کہ انھوں نے ان نوٹوں کے مطابق اپنی پوری تقریر ارشاد فرمائی یہ علیحدہ بات ہے

کہاں کی ہا، ایک آواز "بیٹھ جاؤ" "ہم نہیں سننا چاہتے" "غدار ہے" "شرم دی کرو، کھڑا جھنڈ" - اوڈ سی بسی" کے بے پناہ طوفان میں دب کر رہ گئی -

اب وہ منظر یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے میرے دوست نے راشٹر یہ پتی بننے کا ارادہ چھوڑ دیا اور میں نے ملت کی قیادت سے توبہ کرلی - اب ہم صرف دوست ہیں اور یہ دوستی " راشٹر یہ پتی شپ" اور ملت کی قیادت سے بہرحال بہتر ہے - کیونکہ راشٹر یہ پتی کو بعض اوقات پدھان کے سنگھاسن سے اتار کر چار آنے کی ممبری سے محروم کر دیا جاتا ہے - اور ملت کی قیادت کا تو کچھ اعتبار ہی نہیں صبح کو پھولوں کی بارش اور زندہ باد کے نعرے - شام کو کانوں میں مردہ باد کی آوازیں اور گلے میں جوتیوں کے ہار!

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جب کبھی میں اس جلسے کا ذکر کرتا ہوں - میرے دوست چڑ سے جاتے ہیں -

---

ایک نوٹس ہے سیاہ حاشیے میں غالباً اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی -

" ۱۴ - اکتوبر ۱۹۳۵ء کا دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا - اس دن کان پور کے ایک مٹھائی والے نے ایک زندہ دل - خوش ذوق کلرک کو یہ چیلنج دیا کہ وہ ایک نشست میں پانچ سیر رس گلے کھا کر دکھائے - غیرت مند کلرک نے اس کا یہ چیلنج منظور کرلیا - اور پانچ سیر رس گلے کھا کر شرط جیت لی لیکن اس کے دو گھنٹے بعد ہی یہ عاشق صادق راہئ ملکِ بقا ہو گیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

آرٹ کے لئے اس طرح زندگی قربان کر دینا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال کم از کم اس زمانے میں بالکل ناپید ہے ...."

اس کے بعد اس کلرک کی یادگار قائم کرنے کے متعلق بعض تجویزیں ہیں جن پر افسوس ہے کہ کبھی عمل نہیں ہوا -

---

ایک خط ہے "تم لوگ ہندوستان میں بیٹھے ہوئے یہ سمجھتے ہو کہ بس انگلستان میں لوگوں کو اور خاص طور پر ہندوستانی طالب علموں کو سوائے عشق بازی کے اور کوئی کام نہیں - اور یہاں یہ حالت ہے کہ باوجود سر توڑ کوششوں کے کوئی لڑکی اول تو اس قابل نظر نہیں آتی کہ اسے تحفہ دل پیش کیا جائے - اور اگر کہیں سو میں سے ایک دو لڑکیاں نظر چڑھیں بھی تو ان تک رسائی مشکل ہے - اب تم ہی بتاؤ کہ اگر ان حالات میں تم ایک غیر ملکی بھابی جان سے محروم رہ جاؤ تو قصور کس کا ہے ؟"

اس کے دو مہینے بعد کا لکھا ہوا ایک خط ہے - یہ بھی بھابی جان ہی کے سلسلے میں ہے " انگریز لڑکی سے شادی کرنے کے متعلق واقعی تمہارا کیا خیال ہے ؟ کیا تم اس کے سخت مخالف ہو اور کسی صورت میں بھی یہ پسند نہ کرو گے کہ میں انگریز بیوی کے ساتھ ہندوستان واپس آؤں یہ تو تم ضرور مانو گے کہ ہر انگریز لڑکی بدمعاش نہیں ہوتی اور محبت کیے جانے کے قابل بھی ہو سکتی ہے - اور اگر کوئی ایسی لڑکی مل جائے جو ....."

معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں میرے یہ دوست کسی سے دل لگا بیٹھے تھے۔ میں نے کہا کہیں پھنس تو نہیں گئے؟ جواب میں لکھ بھیجا "ابھی ابھی میں پھنسا تو نہیں مگر سوچ رہا ہوں کہ اگر پھنس جاؤں تو کیا حرج ہے؟ . . . . اور کسی خاص لڑکی کا تصور ذہن میں نہیں واقفیت دو چار سے ضرور ہے لیکن مجرمانہ نہیں بلکہ محض یہی دوستی ہے۔ جسے یہاں PLATONIC FRIENDSHIP کے نام سے پکارتے ہیں پچھلی خصتوں میں ٹارکی میں بھی دو چار سے ملاقات ہوئی۔ مگر کوئی اس عزت افزائی کے قابل نظر نہ آئی "

ایک اور خط ہے: "میرے حسن ذوق کی بلندی سے تم واقف ہو۔ اس کا تعلق شادی سے نہیں۔ بلکہ اس کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی لڑکی کو INFERIORITY — COMPLEX (خبط کمتری) نہ ہونے پائے اور وہ یہ نہ سمجھنے لگے کہ اس میں جنسی کشش موجود نہیں۔ اس لئے میں کسی عورت کو برا نہیں سمجھتا۔ ہاں شادی کا سوال دوسرا ہے۔ ممکن ہے بیوی کے اوصاف کے متعلق تمہارا نظریہ بالکل مختلف ہو لیکن میرا خیال ہے کہ میں انتہائی بدذوقی کا ثبوت نہیں دوں گا۔ اب رہا انگریز لڑکیوں کا قصہ جیسا میں نے پہلے بھی لکھا تھا فی الحال کوئی خاص لڑکی سامنے نہیں البتہ تلاش کرنے کا ارادہ ضرور تھا۔ اب وہ بھی ترک کر دیا ہے۔ اس کی ذمہ داری تم پر ہے اور تمہیں پر رہے گی۔ اگر مجھے پنجاب میں اچھی بیوی نہ ملی تو ساری عمر تمہیں بددعا دوں گا کہ مجھے انگریز لڑکی سے شادی نہ کرنے دی۔ ہاں اگر انگریز لڑکی خراب ثابت ہوتی تو بھی تمہارا ہی قصور ہوتا کیونکہ میں نے تمہاری رائے اور رضامندی سے شادی کی ہوتی۔ بہرحال اب وقت گزر گیا ہے۔ میں نے انگریز بیوی کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ اور تم اس ذمہ داری سے چھوٹ نہیں سکتے۔

جس لڑکی کے متعلق تم پوچھتے ہو وہ کافی خوب صورت ہے اور شریف معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تصویر تمہیں ہندوستان پہنچ کر دکھا دوں گا۔ میں نے یہ تصویر دیکھی ہے۔ اگر خوب صورتی کا معیار یہی ہے تو دنیا میں سبھی عورتیں خوب صورت ہیں لیکن خوب صورتی تو اضافی چیز ہے۔ یہ مس صاحبہ ہمارے دوست کو پسند آ گئیں اور ہم نے بھی "مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے کتے سے بھی محبت کرو" کے پیش نظر ان کے حسن جہاں سوز کی تعریف کر دی!) وہ مجھے اس لئے شادی کے لئے موزوں نہیں معلوم ہوتی کہ وہ روپے پر مرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ میں بہت امیر ہوں جو طالب علمی کے زمانے میں کار میں رکھتا ہوں۔ خدا معلوم ہندوستان میں رولز رائیس سے کم بات ہی نہیں کروں گا۔ اور میں بھی اس کے نظریئے کو خوب سمجھتا ہوں۔ اور اب تو اس سے ملاقات ہی کم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ میری طرف سے مایوس ہو گئی ہے اور کسی اور "خاوند" کی تلاش میں ہے۔ یہ ایک کیا اس کے علاوہ اور بیسیوں ہندوستان کی دلدادہ پھرتی ہیں لیکن تمہاری نصیحت اور مخالفت (اے کاش یہ سطریں میرے دوست کی والدہ کی نظر سے گزر جائیں تاکہ میں اپنی شرافت کے متعلق اپنی والدہ سے ایک سرٹیفکیٹ مانگنے کی زحمت سے بچ جاؤں) کی وجہ سے میں ان سب حسینانِ فرنگ کو دھوکا دینے پر مجبور ہوں۔ تین چار مہینے اور یہاں ہوں۔ آخر یہی ہو گا کہ ان کے نازک دلوں کو توڑتا ہوا۔ ان کی امیدوں اور آرزوں کو خاک میں ملاتا ہوا واپس حمید نظامی سے جا ملوں گا اور وہ یہ کہہ سکیں گے کہ "شکر ہے تیری جوانی رہی بے داغ!"

ایک اور خط ہے "یہ تم نے شراب کے متعلق جو سوال کیا ہے بہت ٹیڑھا اور مشکل ہے۔ تم سے پہلے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اور اب بھی نہیں بولوں گا لیکن مشکل یہ ہے کہ . . . . . " بہتر ہے کہ یہ اعلائے کلمۃ الحق مجھی تک محدود رہے۔

ایک تحصیل دار صاحب کا خط ہے "آج کل میرا شغل ریڈیو سننا ہے۔ روزانہ کے پروگرام میں دس گھنٹے ریڈیو سننا۔ دو گھنٹے سیر۔ اور ایک گھنٹہ شیخ بوڑھا کی لغو باتیں"

اگر یہ مضمون شیخ صاحب کی نظر سے گزرا تو نہ میری خیر ہوگی نہ تحصیل دار صاحب کی!

یہی حضرت ایک اور خط میں لکھتے ہیں "یہ سید دوں کا گاؤں ہے کھانے پینے کی سخت تکلیف ہے۔ آج کل محض مرغیاں اور انڈوں پر گزارہ کر رہا ہوں"

ایک خط ہے "میں تمھاری وابستہ مزاجیوں سے اب اس حد تک واقف ہو چکا ہوں کہ وہ حرکتیں جو تمھارا روزمرہ کا معمول ہیں۔ مجھے ناگوار نہیں ہو سکتیں۔ البتہ تمھارا گزشتہ خط اس قدر مہمل اور غیر متعلق تھا کہ اس کا جواب دینے کی کوئی صورت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ میں نے کوشش بھی کی کہ اس کے جواب میں تمھیں کچھ لکھوں مگر جب اسے دوبارہ پڑھا تو دیکھا کہ اس کا تو سر ہے نہ پیر۔ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو جواب کی متحمل ہوتی ناچار اسے یونہی اسی طرح رکھ دیا اور کسی الہامی لمحے کا انتظار کرنے لگا۔ اب تمھارا دوسرا خط آیا تو شکر کیا کہ کوئی بات تو ہاتھ آئی جس پر زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور ممکن ہے"

نیلے رنگ کے ایک کاغذ پر یہ تحریر ہے:-

30 . 11 . 1940

SATURDAY

9: 30 . P. M

خواجہ شبیر حسن صاحب نے وہ کارنامہ کیا جس پر آنے والی نسلیں بھی فخر کریں گی۔ یہ چند حروف بطور سند لکھے گئے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئیں" آنے والی نسلیں خواجہ صاحب کے اس کارنامے پر ہرگز فخر نہیں کریں گی کیونکہ اس کی حقیقت انھیں کبھی معلوم نہیں ہوگی۔ البتہ میں اور خواجہ صاحب کبھی کبھی اس کارنامہ کا ذکر چھیڑ کر ذرا خوش ہو لیتے ہیں۔

اسی طرح کی ایک تحریر اور ہے۔

"میں انوار الحق بلا جبر و اکراہ۔ برضا مندیٔ خویش۔ اور بہ قیام ہوش و حواس خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں مسٹر اے۔ ایچ۔ نظامی کو اپنے تازہ ترین فوٹو کی ایک کاپی دوں گا۔

انوار الحق

مورخہ ۲ر جولائی [illegible]ء"

ایک محبوب ہستی کا خط ہے: "میرا مقصد تقدیر یا تدبیر پر بحث کرنا نہیں۔ شاید دونوں لفظ بے معنی ہیں۔ شاید تدبیر کامیاب نہ ہو سکے۔ اور شاید تقدیر کا دنیا میں وجود ہی نہ ہو لیکن مجھے اس بات کا یقین ہے کہ صرف انسان کچھ نہیں کر سکتا۔

ایک غیبی طاقت اس کی مدد (یا مخالفت) ضرور کرتی ہے۔ اور میں اس امر کے لئے دعا کرتا ہوں کہ یہ غیبی طاقت خواہ اسے خدا کہیں یا نیچر کے نام سے پکاریں یا دیوتاؤں کے لقب سے بلائیں۔ یہ غیبی طاقت میری مدد کرے۔ اور مجھے اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ یہ مقصد کوئی بہت اعلیٰ و ارفع مقصد نہیں محض خودغرضی پر مبنی ہے۔ یہ میرا "مقصد" ہے۔ اس لئے "میں" اس کو حاصل کرنا چاہتا ہوں آپ میری اس ذہنیت کو ذلیل سمجھیں۔ اس پر تعجب کریں۔ یا لعنت بھیجیں۔ اسے میری کم فہمی پر محمول کریں یا میری یاس انگیزی و قنوطیت پر۔ بہر حال آپ جو کچھ چاہیں سمجھیں اور سمجھتے رہیں (اف رے جلال!) مجھے اس کا چنداں خیال نہیں۔ ہاں مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ میری قسمت اچھی ہے۔ اور میں دنیا میں بڑا آدمی (خواہ کسی معنی میں) بننے سے کسی صورت میں باز نہیں رہ سکتا۔ یہی میری قسمت ہے" خدا کرے کہ ایسا ہی ہو!

اس کے بعد ایک کاغذ ہے۔ اس پر یہ تحریر ہے۔

"جگا ڈاکو ——— عرف پنجاب کا شیر

ہیملٹ ——— عرف خون کا خون

کنگ جان ——— عرف صید ہوس

اب یہ عرف ملاحظہ فرمائیے!

مہاتما گاندھی	عرف	میں نہ مانوں!	
سبھاش بابو	عرف	دنیا نہ مانے	
مولوی عبدالحق	عرف	اردو	
میاں بشیر احمد	عرف	ہماری قومی زبان	
نواب مظفر خاں	عرف	عفی عنہ	
سر سکندر حیات	عرف	اسلام کی آنکھوں کا تارا	(صرف پانی پت سے آگے)
چودھری چھوٹو رام	عرف	آبیل مجھے مار	
نواب ممدوٹ	عرف	انارکلی	
مولانا ظفر علی خاں	عرف	زندہ باد	
سر محمد شفیع	عرف	یوم اقبال	

چودہ برس بعد

ابھی اگلے ہی دن کی بات ہے۔ میں میکسیم گورکی کی آپ بیتی کا دوسرا باب پڑھ رہا تھا۔

"مدت دراز کے بعد آج جو میں ماضی کی ورق گردانی کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ حقیقت یہی ہے۔ اور بار ہا جی چاہتا ہے کہ میں اس کی تردید یا تاویل کروں۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر میں آپ بیتی نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اس تنگ و تاریک ماحول کا مرقع پیش کر رہا ہوں جس میں اس طبقے کا ایک عام روسی رہتا تھا۔ اور اب بھی رہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ رنگریز کس آسانی سے مختلف چیزوں کے رنگ بدل دیتے ہیں۔ کسی پیلی چیز کو اٹھا کر وہ کالے رنگ میں ڈبوتے تو وہ نیلی ہو کر نکلتی۔ کسی بھوری چیز کو سرخ پانی میں ڈالتے تو وہ ارغوانی ہو جاتی۔ یہ تھا تو آسان لیکن میرے لئے یہ جادو کا کھیل تھا۔ میرا جی بہت چاہتا تھا کہ کوئی چیز اپنے ہاتھ سے رنگوں۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ایک بھاری سی میز کی چادر نکالی اور آنگن میں پہنچ کر اس کا کونا نیلی ناند میں ڈالا ہی تھا کہ کہیں سے سگنوک مجھ پر جھپٹ پڑا۔ ۔ ۔ ۔ نانا نے مجھے اتنا پیٹا کہ میں بیہوش ہو گیا۔ میں کئی دن بیمار رہا۔ ۔ ۔ ۔ اس غم انگیز زمانے نے میری زندگی کی کایا پلٹ کر دی۔ میری طبیعت میں ایک عجیب انقلاب ہو گیا اور میں خود اپنے میں ایک حیرت انگیز تغیر محسوس کرنے لگا۔ میرے دل میں دوسروں کی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اور میں اپنے اور ان کے دکھ درد کا اتنا خیال کرنے لگا۔ گویا میرے دل کو چیر کر کسی نے اس میں سوز و غم کا جہان بسا دیا ہے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ نانا کے ہاتھوں بری طرح پٹ کر گورکی کی طبیعت اسی طرح بدل گئی تھی جیسے بھوری چیز سرخ پانی میں ڈالنے سے ارغوانی ہو جاتی ہے۔

پچھلے دو ماہ سے میں نے یہ مکان کرایہ پر لے رکھا ہے۔ اس نسبت روڈ کو میں بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ لاہور کی یہ سڑک کبھی سنسان نظر نہیں آتی۔ کبھی کبھی تو سوچتا ہوں کہ سارے شہر کے تانگے ادھر ہی امڈے چلے آ رہے ہیں۔ موٹر گاڑیوں کے ہارن اور خوانچے والوں کے نعرے الگ کان کھایا کرتے ہیں۔ شروع کے تین چار دن تو بہت مشکل سے گزرے۔ پھر میں اس مکان سے مانوس ہو گیا۔ اب تو یہ وہم ہو چلا ہے کہ یہ کمرہ، جو دوسری منزل پر واقع ہے۔ ایسی فضا رکھتا ہے کہ خواہ مخواہ کام میں دل لگتا ہے۔ یہیں بیٹھ کر کئی دلچسپ چیزیں لکھ چکا ہوں۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ابھی تک بہت سے دوستوں کو یہ خبر نہیں ہوئی کہ میں یہاں رہتا ہوں۔

ہاں تو اس روز کی بات تو میں بھول ہی رہا ہوں۔ ایک صاحب، جو انگریزی وضع کا سوٹ پہنے ہوئے تھے، یہاں تشریف لائے۔ میں ان کی شکل سے واقف نہ تھا۔ ادب سے میں نے انہیں چارپائی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ مگر وہ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر جہاں بیٹھ کر میں اکثر

لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں آ بیٹھیے۔

ابھی تک میں نے ان کا نام نہ پوچھا تھا۔ ان کی آنکھیں جو اتنی شفاف تھیں کہ ان میں ان کے جذبات صاف جھلکتے تھے کہہ رہی تھیں۔ اگر یہاں میز کرسیاں نہیں تو کیا حرج ہے ؟

میں نے پوچھا "کیسے آنا ہوا ؟"

"اس مضمون کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں جو آپ نے اس ماہ کے "ہمایوں" میں لکھا ہے"

"شوق سے پوچھیے"

"بس اتنا ہی پوچھنا ہے کہ اس کی کچھ تفصیل آپ بھول تو نہیں گئے ؟"

"میری آپ بیتی کا یہ ورق آج سے چودہ سال پہلے کا ہے۔ بہت ممکن ہے۔ میری یادداشت میں پوری تفصیل قائم نہ رہ پائی ہو بہرحال مجھے یہ واقعہ اسی صورت میں یاد ہے۔ اور بغیر خاص ادبی نمک مرچ کے میں نے اسے بیان کر دیا ہے"

"آپ نے لکھا ہے کہ رات کا وقت تھا زیادہ گہماگہمی نہ تھی، آپ نیلے گنبد کے چوک میں آکھڑے ہوئے۔ آپ کے دل میں خودکشی کے جذبات اُمڈ رہے تھے۔ انارکلی کی طرف سے ایک نوجوان آتا دکھائی دیا۔ وہ آپ کے پاس سے گزر گیا۔ مگر وہ پھر لوٹ آیا۔ جیسے اس نے آپ کا راز بھانپ لیا ہو۔ وہ بولا کیا بات ہے ؟ آپ نے کہا کچھ نہیں۔ اور پھر جب آپ نے بتلایا کہ آپ کا کوئی دوست نہیں غمگسار نہیں تو وہ بولا "میں تو ہوں ..... مگر میں اس شخص کو جانتا ہوں جو اس رات آپ کو شاہ عالمی کے گھر لے گیا تھا۔ اس کی زبانی مجھے پتہ چلا ہے کہ جب وہ نیلے گنبد میں آپ سے ملا تو وہ اکیلا نہ تھا"

"مگر اپنی یادداشت پر جھٹلانے کے سوا چارہ نہیں۔ اس شخص کا پتہ مجھے ضرور دیجیے گا۔ اس سے مل کر مجھے بےحد خوشی ہوگی"

"سنیئے تو اس نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ نیلے گنبد کی سڑک پر اس وقت بہت رونق تھی۔ اپنے ایک دوست کے ہمراہ۔ وہ ایف سی کالج ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا۔ اس رات چراغوں کا میلہ تھا"

"مجھے یاد نہیں"

"سنیئے تو جب وہ اپنے دوست کے ہمراہ خوش خوش جا رہا تھا آپ لپک کر اس کے قریب آ گئے۔ اور آپ نے سوال کیا۔ کیوں صاحب میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ اس زندگی کا مقصد کیا ہے ؟ اس نے آپ کا بازو کھینچ لیا۔ اور ملال پیلے ہو کر پوچھا ——— تو کیا تم خودکشی کرنا چاہتے ہو ؟ آپ نے جھجکتے ہوئے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا ——— ابھی میں تمہیں پولیس کے حوالے کیے دیتا ہوں۔ خودکشی کا خیال بھی جرم میں شامل ہے ..... مگر پھر وہ جھٹ آپ سے بغل گیر ہو گیا۔ اس نے نفسیات کا بہت مطالعہ کر رکھا تھا چراغوں کے میلے کی رات ہو اور کوئی کسی سے زندگی کا مقصد پوچھے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ خودکشی کرنے جا رہا ہے۔ پہلے اس نے آپ پر خوف طاری کر دیا۔ اور پھر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اور پھر جب وہ بولا ——— ہمارے ساتھ آؤ گے ؟ تو آپ اُن دونوں اصحاب کے پیچھے ہو لیے .....

بھی غلط ہے کہ آپ کو وہ سیدھا سیالکوٹ روڈ کی طرف لے گیا۔ پہلے آپ اُن کے ساتھ گوالمنڈی کی طرف گئے۔ جہاں اس کا دوسرا ساتھی ہو گیا۔۔۔۔ شاعر اقبال کے ساتھ جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل آپ نے ٹھیک ٹھیک لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے خوب یاد ہے کہ کس طرح ۔۔۔ نے آپ کے اپنے عقیدے کے مطابق مسئلہ تناسخ کی دلیل سے آپ کے دل پر یہ بات نقش کر دی تھی کہ جب مرنے کے بعد تین ہی حالتیں ہو سکتی ۔۔۔ اس صورت سے بہتر صورت بالکل ایسی ہے۔ اور یا پھر اس سے بھی خراب ۔۔۔ اور اس طرح بہتر زندگی پانے کی صرف ایک تہائی امید ہی رہ ۔۔۔ ہے تو خودکشی کا خیال سرے سے غلط فہمی پر مبنی ہے۔۔۔۔ مگر ایک بات اور بھی ہے۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد اس شخص نے اخبار میں ۔۔۔ کہ ٹری ماسے۔ ۔۔۔ وی کالج لاہور کے ایک طالب علم نے راوی میں کود کر خودکشی کر لی تو اسے یقین ہو گیا کہ ضرور وہ وہی طالب علم ہو گا جسے وہ شاعر اقبال کے روبرو لے گیا تھا۔۔۔۔۔ اور اب جب اسے آپ کا مضمون پڑھنے کو ملا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ مردہ زندہ ہو گیا۔۔۔
۔۔۔ عجیب بات اور بھی ہے کسی رسالے میں اس نے آپ کا فوٹو دیکھا تھا۔ اور بعدازاں دیال سنگھ لائبریری میں ایک ڈاڑھی والے عمر رسیدہ صاحب کو دیکھ کر اس نے یوں ہی یہ سمجھ لیا کہ وہی دیوندر ستیارتھی ہیں۔ یہ مضمون پڑھ کر وہ جھلایا کہ اگر وہی نوجوان جسے اس نے آج سے چودہ سال پیشتر شاعر اقبال سے ملایا تھا۔ دیوندر ستیارتھی ہیں تو وہ یقیناً عمر میں اس سے ایک آدھ سال چھوٹے ہونے چاہئیں۔۔۔۔۔"

میں بُت بنا یہ تقریر سنتا رہا تھا ایک ایک بات میں نے بڑی دلچسپی سے سنی تھی جب وہ بولتا تھا تو اس کی رس بھری آنکھوں کی پتلیاں ایک عجیب دلکشی سے پھیلتی اور سکڑ جاتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اب یہ شخص میری یادداشت میں ہو بہو قائم رہے گا۔

میں نے کہا "آپ کا نام؟"

"عاشق حسین بٹالوی"

"خوب۔ آپ کے افسانے تو بہت دلچسپ ہوتے ہیں"

"شکریہ۔۔۔۔ ہاں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ آپ کی یادداشت پر۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس شخص نے نیلے گنبد میں آپ کو بری طرح جھنجھوڑا۔ اور پولیس کے سپرد کر دینے کی دھمکی دی۔ مگر اپنے ساتھ بیتی ہوئی بات ہی آپ بھول جائیں یہ تو بہت ستم ہے"

گورکی کی آپ بیتی کے الفاظ میرے ذہن میں پھیلنے لگے "مدت دراز کے بعد آج جو میں ماضی کی ورق گردانی کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ حقیقت یہی ہے اور بار بار جی چاہتا ہے کہ اس کی تردید یا تاویل کروں۔۔۔۔ "میں سوچنے لگا کہ پیلی چیز کو اٹھا کر کالے رنگ میں ڈبو دیں تو وہ نیلی ہو کر نکلتی ہے بھوری چیز کو سرخ پانی میں ڈال دیں تو وہ ارغوانی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف واقعات زندگی کے مختلف رنگوں میں پڑ جانے سے اپنا اصلی رنگ کھو بیٹھتے ہیں۔

میں نے کہا "بات یہ ہے کہ اس واقعہ کے فوراً بعد میں نے اپنی خانہ بدوشی شروع کر دی تھی اور شروع شروع میں جن تکلیفوں میں سے گزرنا پڑا اُن کی وجہ سے میری جسمانی پرورش پوری طرح سے نہیں ہو پائی۔ یادداشت کا تو میں سمجھتا ہوں جسمانی صحت سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔۔۔ بہرحال اس شخص سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہو گی"

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا "وہ شخص میں ہی ہوں"

دیوندر ستیارتھی

اصغر کا روزنامچہ

بدھ ۴ جنوری ۱۹۳۹ء

آج صبح مجھے ک کا ایک نہایت طویل اور دلچسپ خط ملا۔ میں تقریباً دو گھنٹے مطالعہ کرتا رہا۔ م کے ساتھ میں سکواش کھیلا اور اسے میں نے خاصی آسانی سے ہرا لیا۔ پھر میں اور وہ چند ریکارڈ سننے گئے جو وہ خریدنا چاہتا تھا۔ کالج کی ٹرم شروع ہونے میں آج تقریباً ایک ہفتہ باقی ہے۔ میں نے کچھ زیادہ کام نہیں کیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کیا ہی نہیں۔ تاہم مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں نے کام کیا ہے: میں پیٹرن کو ٹیلیفون کرنا بھول گیا۔ کل میں ضرور کروں گا۔ آج کے دن بھی کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا، سو آج بھی کسی شے کی بابت کوئی کہنے سننے کی بات نہیں ہے۔ مجھے تو اس کا شدید انتظار ہے کہ میرا کالج کھلے لندن سے میں تنگ آ گیا ہوں۔

مح کا ایک خط میری طرف آیا۔ مجھے اس کی توقع نہ تھی۔ لیکن اس کے خط میں کوئی نئی خبر بھی نہ تھی۔ اُس کا خیال ہے کہ ف اور ز پر یورپ کی تعلیم کا کچھ خراب ہی اثر ہوا ہے۔ ر نے مجھے لکھا ہے کہ م کے دل کے اندر ف کے لئے کچھ چاہت پیدا ہوئی ہے۔ یہ بات اتنی پُر اسرار کیوں ہے؟ کیا م کا خیال ہے کہ میں ف کو چاہتا ہوں۔ غالباً میں اسے لکھ دوں گا کہ وہ شوق سے بغیر کسی جھجک کے ف کو اپنے لئے حاصل کر لے۔ یہ بےوقوف اپنے امتحان میں کامیاب نہ ہوا۔ میری رائے میں ملاقات کے وقت ایک سکول کی لڑکی کی طرح اسے شرم آگئی ہوگی۔ خیر مجھے یقین ہے کہ آئندہ دفعہ ضرور وہ کامیاب ہو کے رہے گا۔ لاہور میں آج کل خوب رونق ہوگی۔ ر ف وہاں بعینہ وہی فلمیں دیکھ رہی ہے جو یہاں لندن میں دکھائی جا رہی ہیں۔

(ترجمہ از م ب)

اصغر بشیر

محفلِ ادب

کارلائل کی "بلومین"

حیدرآباد میں ریذیڈنسی کے قریب موٹر بس کا ایک اسٹینڈ ہے۔ جس کا نام پتلی باؤلی ہے۔ کیونکہ یہاں اس نام کی ایک خوش نما باؤلی تھی جس میں لوگ سیڑھیوں کے ذریعے سے اتر سکتے تھے۔ یہ باؤلی جو ایک صدی سے زیادہ عرصے تک لوگوں کو فائدہ پہنچاتی رہی۔ اب بند کردی گئی ہے اور آج کسی دیکھنے والے کے لئے اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ شہر سے آنے والی سڑک کا ایک حصہ اسی کے نام سے موسوم ہے ایک کتبے کے مطابق اس باؤلی کو حیدرآباد کے مشہور ریذیڈنٹ میجر کلیس کرک پٹرک نے ۱۸۰۲ء میں تعمیر کیا تھا۔ اور یہ اس تقریب کی یادگار میں کہ اسے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ یہ بچی بعد کو اس قدر حسین نکلی کہ خود انگریزی ادب میں اس نے اپنے لئے جگہ پیدا کرلی۔ چنانچہ اسے کارلائل نے اپنے مشہور ناول ریمی نی سنس" مس کٹی کرک پٹرک" اور سارٹر رسارٹس "مس بلومین" کے نام سے پیش کیا ہے۔ مشہور مصنف اسکاٹ نے اس لڑکی کو ایک جگہ ان الفاظ میں یاد کیا ہے: "وہ نصف بیگم تھی اور اس میں ایک تخیلی انگریز عورت کا حسن بھی جھلکتا تھا" وہ کس طرح کارلائل کی دوست بن گئی اور کس طرح اس کردار نگار نے اس کی تصویر پیش کی۔ اس کا مطالعہ آج بڑی دلچسپی رکھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمارا ذہن اس زمانے تک پہنچ جاتا ہے جب کہ ہندستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج تھا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اہل یورپ ہندستان کے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں سے آزادی کے ساتھ میل جول بڑھاتے تھے۔

خیر النساء اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں حیدرآباد کے ریذیڈنٹ میجر جیمس کلیس کرک پٹرک تھے۔ اور یہ حضور نظام علی خاں کا عہد حکومت تھا۔ ان کے لائق اور تجربہ کار مدار المہام ارسطو جاہ بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ میجر کرک پٹرک نے بڑے اچھے تعلقات قائم کرلئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی آٹھ سال کی مدتِ ملازمت میں حیدرآباد کے ساتھ تین معاہدے بھی طے کئے ان ہی میں ایک وہ معاہدہ بھی تھا جس کی رو سے حضور نظام نے فرانسیسی فوجی دستے کو اپنی ملازمت سے نکال دیا اور انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدۂ اتحاد طے کیا۔ میجر کرک پٹرک جو حشمت جنگ کے خطاب سے سرفراز کئے گئے تھے، قدیم تزک و احتشام کے ساتھ رہتے تھے اور انھوں نے خیر النساء نامی ایک مسلمان لڑکی سے شادی بھی کرلی تھی خیر النساء سید گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور ایک اچھے ایرانی خاندان کی لڑکی تھی اور اس کے نانا انگریزی فوجی دستے کے بخشی تھے۔ اس عہدے کی وجہ سے بہت سے انگریزان کے گھر آیا کرتے اور ان کی

دعوتیں بھی ہوتی رہتیں میجر کرک پٹرک بھی ان آنے جانے والوں میں شامل تھے اور چونکہ وہ نوجوان اور خوب رو تھے ان کے
چرچے گھر کی عورتوں میں بھی ہونے لگے تھے جب خیرالنسا ر نے ان کو پہلی مرتبہ پردے کے پیچھے سے دیکھا تو وہ ان سے محبت
ایک بڑھیا کو پیام سلام کے لئے مقرر کیا۔ کرک پٹرک نے اپنے بڑے بھائی کے نام جو خط لکھے ہیں۔ ان میں اس امر کا
ایک مرتبہ اپنے مکان میں تنہا بیٹھا تھا کہ ایک بڑھیا آئی اور اس سے کہنے لگی کہ ایک مرتبہ خیرالنساء نے تمھیں دیکھ لیا ہے۔
کرنے لگی ہے۔ بڑھیا نے اس سے یہ بھی التجا کی کہ تم اس کی درخواست کو منظور کرلو لیکن کرک پٹرک نے اسے ٹکا سا جواب
میں وہ دو تین مرتبہ پھر آئی اور اسی طرح واپس کردی گئی۔

بالآخر ایک رات کو خود خیرالنسا کرک پٹرک کے پاس آئی اور اس نے بذاتِ خود اپنی درخواست پیش کی کرک پٹرک نے
حسینہ سے بحث تمحیص کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر آخر میں اسے ناکام ہونا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی اصول کے مطابق
نکاح طے پا گیا۔ حضور نظام نے بھی جنھوں نے اس شادی کی اجازت دی تھی اپنی طرف سے نوشہ کو بہت سے قیمتی جہیز دیا اور
اسے "فرزندِ محبت پیوند" کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔ لیکن اس شادی کے بعد شہر حیدرآباد میں ایک ہل چل مچ گئی۔ اہل
کو یہ پسند نہ تھا کہ اس کے ملازم ہندستانی عورتوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کریں کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ ہندستا
زیر اثر نہ ہو جائیں۔ حیدرآباد میں میجر کرک پٹرک کے بہت سے دشمن بھی تھے۔ انھوں نے گورنر جنرل کے پاس یہ رپورٹ کی
بداخلاقیوں کا مرتکب ہے لیکن جب گورنر نے تحقیقات کی اور کرک پٹرک کے خلاف جو الزامات لگائے گئے تھے ان
پایا تو اس نے کرک پٹرک کو بحال کردیا اور اس کی بہت ستائش بھی کی کہ وہ اس کے مسلک کے مطابق بہت کامیابی سے
کر رہا ہے۔

ان کے بچے حیدرآباد میں ریزیڈنسی کی عالی شان عمارت کے نقشے کی ترتیب اور اس کی تعمیر کرک پٹرک ہی کے
اس وسیع رقبے میں اپنی بیوی کے لئے ایک زنانہ حصے کی بھی تعمیر کی تھی اور اس میں مصنوعی چشمے بنوا کر اسے بہت فرحت بخش بنا
کے اس زنانہ حصے کی دیواروں پر رنگ برنگ کے پھول، میوے، پودے، پرند اور دیگر جانور اتارے گئے تھے۔ اور یہ حصہ
ہو گیا تھا کہ اس کا نام رنگ محل رکھا گیا۔ مگر یہ عمارت ۱۸۶۰ء میں گرادی گئی۔

خیرالنسا ر سے کرک پٹرک کو دو بچے ہوئے جن میں سے ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ ان دونوں کو جب کہ ان کی عمر
سال کی تھیں ان کی ماں کی رضامندی سے انگلستان بھجوا دیا گیا۔ تاکہ وہاں ان کی تعلیم و تربیت ہو۔ یہ بچے انگلستان میں ا
ساتھ رہنے لگے لیکن جب اس کا انتقال ہو گیا۔ تو پھر یہ اپنی چچازاد بہن کے زیر نگرانی رکھے گئے۔ لیکن انگلستان جانے کے
کو پھر اپنے ماں باپ سے ملنا نصیب نہ ہوا کیونکہ ان کی روانگی کے تھوڑے ہی عرصے بعد یعنی ۱۸۰۵ء میں میجر کرک پٹرک
انتقال ہو گیا۔ اور خیرالنسا ر حیدرآباد میں واپس آگئی۔ ہندستانی ماں نے اپنی لاڈلی بچی کا نام صاحب بیگم بی بی صاحبہ رکھا

نام بدل گیا اور کتھرین آرورا یا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے کٹی کرک پیٹرک کے نام سے موسوم ہوگئی۔ اس نے ۸۸ برس عمر پائی۔ اور اس کے کئی بچے بھی ہوئے لیکن اس کا بھائی جوان مرگیا۔ اس کی ایک بیوہ اور تین لڑکیاں تھیں۔

کارلائل سے دوستی | جب کارلائل نے اپنی جامعہ کی زندگی ختم کی تو اس کے سامنے بہت سی شکلیں تھیں چنانچہ اسی کا اثر ہے کہ اس نے چرچ، مدرسہ اور قانون سب کو چھوڑ دیا۔ ۱۸۲۲ء میں اس نے اپنے دوست ایڈورڈ ارونگ کے توسط سے مسٹر بلر تک رسائی حاصل کرلی اور ان کے بچوں کا اتالیق ہوگیا۔ موصوف جو بہت مال دار آدمی تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمۂ مال گزاری میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے اور اب انھوں نے وظیفہ حاصل کرلیا تھا۔ بلر خاندان کی بدولت کارلائل سماج کے ایک ایسے دولتمند، مہذب اور متمدن طبقے سے روشناس ہوا جس کے ساتھ ملنے جلنے کا اسے اب تک اتفاق نہ ہوا تھا جب وہ اپنے وارڈز کے ساتھ لندن آیا تو یہاں مسز بلر نے اس کو اپنی بہن مسز اسٹراچی سے ملا دیا۔ اور یہی لڑکی ہے جس کے متعلق بعد میں کارلائل نے "عورتوں میں ہیرا" کے الفاظ استعمال کئے۔ یہ دونوں بہنیں ولیم کرک پیٹرک کی لڑکیاں تھیں جو کٹی کا چچا تھا۔ کارلائل نے کٹی سے پہلی مرتبہ ایڈورڈ ارونگ کے مکان پر ملاقات کی اور اس "نازک سیاہ آنکھوں اور بھورے بالوں والی ساحرہ سے بہت متاثر ہوا" کٹی اپنے دلفریب حسن کے لحاظ سے اپنا آپ جواب تھی۔ اس کا چھوٹا سا قد تھا۔ سیاہ آنکھیں تھیں، بھورے بال تھے۔ گندمی رنگ تھا۔ یہ پیکر محبت بہت خوش مزاج بھی تھی اور میرا خیال ہے کہ وہ زندگی میں کسی دوسرے پر کبھی خفا نہ ہوئی تھی۔ وہ خودمختار تھی اور پچاس ہزار پونڈ کی دولت کے ساتھ دولتِ حسن کی بھی مالک تھی لیکن اس کے باوجود اس میں غرور و تمکنت نام کو نہ تھی بلکہ وہ بہت منکسر المزاج واقع ہوئی تھی۔" چند روز بعد جب کارلائل اور کٹی زیادہ ملنے جلنے لگے تو یہ ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئے۔ چنانچہ ۱۸۲۴ء میں یہ دونوں پندرہ دن کے لئے پیرس بھی ہو آئے لیکن اسی زمانے میں کارلائل نے یہ سنا کہ مسز اسٹراچی اپنی بہن کے لئے ایک اچھے بر کی تلاش کر رہی ہیں۔ اس سے کارلائل بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اپنی کبرسنی میں اس نے لکھا ہے: "مجھے یہ چیز اب زیادہ تکلیف دیتی ہے گو اس وقت بھی میں اس سے متاثر تھا۔ مسز اسٹراچی چاہتیں تو وہ آسانی سے اپنی بہن کے لئے میرا انتخاب کرسکتیں اور پھر ہم دونوں ہمیشہ ان ہی کے ساتھ رہتے۔" لیکن حالات ناموافق ہوگئے اور دونوں نے مختلف راہیں اختیار کیں۔ پیرس سے واپس آنے کے چند ہی مہینے بعد کارلائل کی شادی جین ولش سے ٹھیر گئی۔ جو ایک تیز طرار اور چرب زبان دوشیزہ تھی۔" اسی طرح کٹی کے لئے بھی جیمس فلپس کا انتخاب ہوگیا جو ساتویں ہسار کا کپتان تھا۔ کارلائل نے اس شادی کے بعد کٹی کے فوجی شوہر پر جس نے ہندوستان میں خدمت انجام دی تھی۔ اس طرح چوٹ کی ہے: "کٹی سپاہیوں کے کسی سابق کپتان کو انعام میں دے دی گئی۔"

کارلائل کی تصانیف میں اس کا تذکرہ | کٹی کا کوئی خاکہ پیش کرنے میں کہ اس کے مشرقی حسن و جمال کا کیا عالم تھا ان الفاظ کا حوالہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے جن میں کارلائل نے اس کی تصویر کھینچی ہے۔ اس نے اس کی تصویر یوں پیش کی ہے: "وہ ایک لودھی رنگت کی دوشیزہ تھی۔ اس کی بھوری آنکھیں تھیں، وہ بہت خوب صورت تھی، اور اس کے حسن میں ایک دل کشی تھی۔ اس کے انداز میں ترنم

اور موسیقیت تھی اور وہ واقعی سنز امٹراچی کی بہن معلوم ہوتی تھی"۔ ایک جگہ یوں لکھا ہے: "اس حسینہ کے چرچے ہر جگہ ہوتے تھے۔ اس کا حسن۔ اس کے اوصاف اور اس کی طبیعت کی رنگینیاں ہر محفل میں بار بار دہرائے جاتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نور تھا اور اس کے عارضِ گلگوں پر ایک طرف کاکلِ سیاہ سے پرچھائیں پڑتیں تو دوسری طرف تبسم شعاعیں لٹاتی تھیں"۔ ایک اور موقع پر کارلائل کے جذبات ان الفاظ میں پھوٹ پڑتے ہیں: "جب کبھی بلومین اپنی معصومیت کے ساتھ چھوٹی بڑی عورتوں کی صف میں کھڑی ہو جاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا کے ٹمٹماتی شمعوں میں ایک آسمانی تارا ٹوٹ آیا ہے"۔ اپنی پہلی ملاقاتوں کی یاد میں کارلائل لکھتا ہے: "اس کے تبسم میں ایک جادو تھا۔ اور اس کی ہر بات ہنسی کا پہلو لئے ہوئے ہوتی تھی۔ اس کے لبِ نازک کا داہنا گوشہ خم کھایا ہوا تھا۔ اس کے سر اور آنکھوں کی حرکت میں ایک دل ربائی تھی۔ جب وہ اپنے لبِ نازک کو جنبش دیتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ دھیمے سروں میں نغمے نکل رہے ہیں جو اپنے ساتھ تبسم لئے ہوئے ہیں۔ وہ بہت ملنسار اور محبت آگیں تھی۔ وہ ایک پیکرِ لطافت اور اس کے ساتھ ساتھ جاذبِ نظر بھی تھی۔ اس کی زیرِ لب سریلی آواز دل میں اتر جاتی تھی اور اس کی ہر آواز لطیف و معنی خیز ہوتی تھی"۔

غرض کارلائل نے اپنے خاص جوشیلے انداز میں ایک ایسی لڑکی کے متعلق اپنے اندرونی جذبات اور احساسات کا اظہار کیا ہے جس کی ماں حیدرآباد کی ایک مسلمان خاتون تھی۔ وہ کبھی "بلومین" کی دل ربا شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی "کٹی کرک پیٹرک" کے نام سے ہمارے سامنے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کے لئے جو انگریزی ادب کے دلدادہ ہیں بڑی دلچسپی کا سرمایہ ہے"۔

نیلم راجہ رام
(مترجمہ حفیظ صدیقی)

"سب رس"

مجلسِ لطیفہ گوئی

ایک آواز:۔ صاحبِ صدر! وقار صاحب بڑی دیر سے کیوں خاموش ہیں؟

صاحبِ صدر:۔ (توجہ دلاتے ہوئے) ہاں وقار صاحب! ؎

کچھ تو کہئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

مولانا وقار:۔ طوائف کے تذکرے میں ایک لطیفہ مجھ سے بھی سن لیجئے۔ مولانا سلیم پانی پتی نے ایک دفعہ مکان تبدیل کیا۔ اور سوءِ اتفاق سے ایک ایسا مکان کرایہ پر لیا جو ایک دو ہی دن پہلے کسی طوائف نے خالی کیا تھا۔ جب مولانا پہلے روز اس مکان میں آئے تو مولانا حالی ان کے مہمان تھے۔ دونوں بزرگ رات کو دیر تک باتیں کرتے رہے جب سونے کی تیاریاں کرنے لگے تو باہر سے

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولانا سلیم نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک دیدار وجوان سیڑھیوں میں کھڑا تھا۔ اور طوائف کی تلاش میں وہاں آیا تھا۔ وہ مولانا کو جانتا نہ تھا۔ ایک طوائف کے مکان پر ایک سفید ریش بزرگ کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا۔ اور آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ مولانا نے واپس جا کر مولانا حالی سے بیان کیا۔ وہ آئے تو نوجوان نے انھیں پہچان لیا کیونکہ ادھر اُدھر جلسوں میں کئی بار انھیں تقریریں کرتے اور نظمیں پڑھتے دیکھ چکا تھا۔ توبہ توبہ کرکے کہنے لگا "مولانا۔ آپ اور یہاں؟ خدا کی پناہ!"

مولانا نے کواڑ کھولتے ہوئے کہا "ہاں ہاں بھئی۔ آؤ۔ اندر آجاؤ۔ کچھ کہو تو کیا کام ہے"؟

لیکن نوجوان کہنے لگا "نا صاحب! مجھے معاف فرمائیے۔ جہاں آپ جیسے بزرگوں نے قبضہ کر رکھا ہے وہاں ہمیں کون پوچھے گا؟" (قہقہہ)

مولانا کہتے ہی رہے۔ اور بڑھ کر اس کا دامن بھی پکڑ لیا مگر وہ دامن چھڑا کر بھاگ گیا +

قاضی ظہیر الدین:- بات سے بات پیدا ہوتی ہے۔ بٹ صاحب کے لطیفے میں ایک تو فوجی بھرتی کا ذکر تھا اور ایک پٹھانوں کا اس پر مجھے دو لطیفے یاد آئے۔ ایک بنگالی بابوؤں کی بھرتی کے متعلق جو آپ نے سن لیا۔ دوسرا پٹھانوں کے متعلق بھی سن لیجئے۔ کسی شخص کو پٹھانوں کے ایک گاؤں میں رات ہوگئی۔ اس نے مسجد میں قیام کیا۔ سرِ شام ہی ایک پٹھان نے مسجد میں آکر اس سے پوچھا۔ "خو تم مسافر ہے؟"

"ہاں مسافر ہوں" اس نے جواب دیا۔

"خو کانا کائے گا" پٹھان نے پوچھا۔

"جی ہاں کھاؤں گا" مسافر نے کہا۔

یہ سن کر پٹھان کھانا لینے چلا گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک اور پٹھان آگیا۔ اس نے بھی مسافر سے وہی باتیں پوچھیں جو پہلے مسافر نے پوچھی تھیں۔ اور پھر وہ بھی کھانا لینے چلا گیا۔ اتفاق کی بات کہ جو پٹھان بعد میں آیا تھا۔ اس کا گھر پہلے پٹھان کے گھر کی نسبت مسجد کے نزدیک تھا۔ چنانچہ وہ کھانا لے کر جلد ہی واپس آگیا۔ مسافر بیچارے کو کیا معلوم کہ پہلے کون آیا اور بعد کون؟ اور پھر اس نے اس سے غرض بھی کیا تھی۔ اس کو تو رات گزارنی تھی چنانچہ اس نے کھانا شروع کر دیا اور پٹھان واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پہلا پٹھان کھانا لے کر آ پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ مسافر بیٹھا مزے سے کھانا کھا رہا ہے یہ دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ کھانا وہیں رکھ دیا اور چھرا نکال کر یہ کہتا ہوا مسافر پر جھپٹا کہ "خو ام کو کہتا ہے کانا کائے گا۔ اور اُدھر کانا کاتا ہے"۔

مسافر یہ طرفہ نظارہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ مسجد کے احاطے کی دیوار پھلانگ کر اس طرف بھاگا جدھر پٹھان کھانا دے کر گیا تھا۔ پٹھان بھی ہاتھ میں چھرا لئے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ گلی کے نکڑ پر وہ پٹھان جا رہا تھا جو کھانا دے کر گیا تھا۔ مسافر نے اسے آواز دے کر کہا

"خان - او خان - اِدھر دیکھو - یہ خان مجھے مارتا ہے - کہتا ہے - میں نے تمھارا کھانا کیوں کھایا ؟"

آگے جاتے ہوئے پٹھان نے ٹرک کراس کی طرف دیکھا اور پھر نہایت متانت سے کہنے لگا " خو - شور کیوں مچاتا ہے -

مارتا ہے تو مر جاؤ - اَم تمھارے بدلے میں اس کا سو مہمان ماریں گا" (قہقہہ)

باری صاحب :- میں بھی ایک لطیفہ سنانا چاہتا ہوں - اگرچہ یہ سرتاپا یار لوگوں کی گھڑنت معلوم ہوتا ہے تاہم لطیفہ ہے اور دلچسپ ہے اس لئے سن لیجئے - کہتے ہیں کہ پچھلے دنوں مسلمانان بمبئی قائداعظم مسٹر محمد علی جناح کو نماز کے لئے مسجد میں گھسیٹ لے گئے - نماز باجماعت کوئی مشکل چیز نہیں - ناواقف سے ناواقف آدمی بھی اپنے ساتھیوں کی حرکات کی پیروی کرتا ہوا ادا کر سکتا ہے چنانچہ قائداعظم بھی نقل مطابق اصل کا فرض انجام دیتے رہے لیکن اخیر پر جب امام نے کہا " السلام علیکم و رحمتہ اللہ" تو مسٹر جناح اوّلیت کا ثواب حاصل کرنے کی غرض سے بول پڑے " وعلیکم السلام یا مولوی" (قہقہہ)

وقار صاحب :- خاکساروں کے متعلق تازہ ترین لطیفہ سن لیجئے :-

۱۵ رمارچ کو خاکسار شہیدوں کا دن منایا گیا ہے - اس موقع پر مختلف شہروں سے جلسوں کی کارروائیاں موصول ہوئی ہیں لیکن سب سے دلچسپ کارروائی دہلی سے موصول ہوئی ہے - وہاں میاں احمد شاہ خاکسار لیڈر کی سرگردگی میں جلسہ ہوا - کارروائی میں لکھا ہے کہ "آخر میں" شہیدان مئی" کے لئے دعا کی گئی " (قہقہہ)

صاحب صدر :- ایک مولوی صاحب کسی عطار کی دکان پر گئے اور "ر" کو گول کر کے صحیح مخرج سے ادا کرتے ہوئے عطار سے کہنے لگے ،

"آپ کے پاس شی ..... رَا (شیرہ) ہے ؟"

عطار نے جواب دیا " ہے تو سہی مگر اتنا گاڑھا نہیں " (قہقہہ)

قاضی ظہیرالدین :- مولوی حضرات کے متعلق بے شمار لطیفے مشہور ہیں - ایک عرض کرتا ہوں :- ایک سیلانی شخص پھرتا پھراتا شام کے وقت کسی گاؤں میں پہنچا - نماز کا وقت تھا - سوچا پہلے نماز پڑھ لوں - مسجد میں پہنچا تو نماز ہو رہی تھی - اور ایک لڑکا قرآن اٹھائے مولوی صاحب کے سامنے کھڑا تھا - جوں جوں مولوی صاحب قرأت کرتے شاگرد ورق الٹتا جاتا - نووارد یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا اور سوچنے لگا " یہ بھی کیسا کم بخت مولوی ہے کہ دو چار رکوع زبانی یاد نہیں کر سکتا -

نماز ختم ہونے کے بعد اس شخص نے سبب پوچھا تو مولوی صاحب نے کہا " بھئی احتیاط لازم ہے - میں اس لئے قرآن مجید سامنے رکھتا ہوں کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے "

نووارد نے محض تفریح طبع کے لئے مسکراتے ہوئے کہا " سبحان اللہ کیا تقوےٰ ہے - خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آپ کی امامت میں نمازیں پڑھتے ہیں مگر حضرت آپ نے یہ کمال اور یہ علم کہاں سے حاصل کیا ؟"

مولوی صاحب نے کہا " میرے استاد یہاں سے قریب ہی فلاں قصبے میں رہتے ہیں - ماشاءاللہ بڑے صاحب کمال

بزرگ ہیں۔

نووارد وہاں سے رخصت ہو کر مولوی صاحب کے بتائے ہوئے گاؤں میں آیا۔ اور سیدھا مسجد میں گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص ایک ہاتھ میں ایک کتاب اٹھائے اس میں سے پڑھ پڑھ کر اذان دے رہا ہے۔ اس نے سمجھ لیا ہو نہ ہو یہی بزرگ ان مولوی صاحب کے استاد ہیں۔

نماز کے بعد وہ شخص مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے شاگرد اور اس کے علم و فضل کا ذکر کیا۔ اور ان سے عقیدت ظاہر کر کے پوچھا: "آپ نے یہ کمال کہاں سے حاصل کیا؟"

مولوی صاحب نے کہا: "میرے استاد اسی قصبے کے فلاں محلّے میں رہتے ہیں اور اگر تم چاہو تو ان سے مل سکتے ہو۔"

نووارد نے کہا: "میں ضرور ملوں گا۔ اور پھر ان کے بتائے ہوئے پتے پر گیا۔ ایک بوسیدہ سے مکان میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تھے چند عقیدت مند بھی جمع تھے۔ نووارد نے مکان میں قدم رکھتے ہوئے کہا: "السلام علیکم"

مولوی صاحب نے فوراً دایاں ہاتھ اپنی تھان بھر کی پگڑی پر رکھا۔ وہاں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔ اسے کھول کر غور سے دیکھا اور پھر بولے "وعلیکم السلام"

نووارد بے اختیار پکار اٹھا: "آمنّا و صدّقنا۔ آپ استادوں کے استاد ہیں۔"

مولانا عزیز ہم نے یہ لطیفہ ایک اور طرح سنا ہے۔ اور وہ یوں کہ :-

ایک شخص کسی گاؤں میں گیا۔ نماز کے وقت اس نے ایک شخص کو اذان میں یہ کہتے ہوئے سنا: "نحن نشہد ان لا محمد رسول اللہ"

وہ شخص یہ سن کر بہت حیران ہوا اور مسجد میں پہنچ کر مؤذن سے اس کا سبب پوچھا۔ مؤذن نے بتایا کہ "یہ گاؤں مسلمانوں کا ہے۔ وہ سب اپنے باغوں اور کھیتوں میں کام کرتے رہتے ہیں۔ گاؤں میں چند گھر یہودیوں کے ہیں ان سے مسلمان یہ کام لیتے ہیں کہ وہ نماز کے وقت اذان دیا کریں میں بھی چونکہ یہودی ہی ہوں اور چونکہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول نہیں مانتے اس لیے کہتا ہوں "نحن نشہد ان لا محمد رسول اللہ"

نووارد شخص یہ سن کر بہت حیران ہوا اور وہاں کے مسلمانوں کی جدّت سے خوش بھی۔ وہ ابھی وہیں بیٹھا تھا کہ مسلمان نماز کے لیے جمع ہونے شروع ہو گئے امام صاحب نے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر نماز پڑھائی۔ نووارد پہلے ہی حیران تھا۔ اب اور بھی حیران ہوا۔ اور دل میں عزم کر لیا کہ مولوی صاحب سے ان باتوں کا سبب ضرور پوچھوں گا۔ نماز ختم ہونے کے بعد وہ شخص مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "السلام علیکم"

مولوی صاحب بھاگ کر اندر گئے الماری سے ایک کتاب نکالی۔ اس کے ورق الٹنے شروع کیے۔ بالآخر ایک صفحے پر کچھ دیکھ کر باہر آئے اور کہنے لگے "وعلیکم السلام" نووارد کی حیرت میں اب اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے مولوی صاحب سے ان تینوں باتوں کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ہم لوگ دین کے بہت زیادہ پابند ہیں جب تم نے کہا "السلام علیکم" تو میں نے کتاب میں دیکھا۔ وہاں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص السلام علیکم کہے تو جواب میں وعلیکم السلام کہو۔ اور ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر نماز اس لیے پڑھی کہ باغ سے آتے ہوئے رستے میں میرا پاؤں گوبر میں بھر گیا تھا اگرچہ میں نے دھو لیا مگر شک تھا کہ شاید پاک نہ ہوا ہو چنانچہ اسے نماز میں شریک نہیں کیا۔ اور باقی رہا یہودیوں سے اذان دلانا تو یہ محض پابندی وقت کے لیے ہے ہم تمام اہلِ دین مصروف رہتے ہیں ممکن ہے کام میں اذان یا نماز کا دھیان ہی نہ رہے اس لیے یہ کام یہودیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ [illegible]

مطبوعات

زباں دانی: فضل الٰہی صاحب عارف نے یہ کتاب لکھ کر صحیح اردو زبان سیکھنے والوں کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری کی۔ کتاب کے عنوانات کی اس سرسری فہرست سے اس کی جامعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے :۔

(۱) تحقیقِ الفاظ (۲) املائی غلطیاں (۳) تذکیر و تانیث (۴) تابع مہمل اور تابع موضوع (۵) عورتوں کے ملبوسات زیورات (۶) مختلف کھانے (۷) پھول درخت پودے (۸) پانی کے جانور حشرات الارض حیوانات (۹) بیماریاں (۱۰) رسوم و اوہام وغیرہ عنوان کے ماتحت بہت سی مفید معلومات جمع کی گئی ہیں بعض معمولی لغزشوں سے قطع نظر کتاب بہت مفید ہے۔ اور ہر اردو جاننے والے کی نظر سے گزرنی چاہیئے۔ اردو میں اس موضوع پر اب تک ایسی جامع کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

اردو اکیڈیمی لاہور

اردو رسم الخط: مؤلفہ جناب محمد سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے (کینٹب) پرنسپل اسلامیہ ٹریننگ کالج " حیدرآباد دکن۔ اردو رسم الخط ٹائپ کے متعلق یہ مفید اور جامع معلومات کتاب اہلِ اردو کی خاص توجہ کی مستحق ہے۔ قدیم رسم الخط کے کئی ہاف ٹون بلاک سے مطالعہ کئے گئے ہیں، ٹائپ کے لئے ایک بہت اچھا خط تجویز کیا گیا ہے جس سے ٹائپ کی بہت مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ قیمت آٹھ آنے

پتہ :۔ مکتبہ جامعۂ ملیہ۔ قرول باغ۔ نئی دہلی۔

فیضانِ حسین معروف بہ جذباتِ مخفی: محترمہ صالحہ بیگم صاحبہ مخفی بنگال کی ایک مسلمان شاعرہ ہیں۔ اس کتاب میں حضرت امام حسین شہادت کے متعلق ان کی نظمیں اور مراثی وغیرہ جمع ہیں مخفی صاحبہ کا کلام اپنی پختگی، روانی اور تاثیر کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے قیمت چار آنے

پتہ :۔ نمبرا۔ سید اسمٰعیل لین۔ ڈاک خانہ پارک اسٹریٹ کلکتہ

پسِ پردہ: حضرت اختر بریلوی کا مجموعۂ کلام ہے حضرتِ اختر کی نظموں میں اصلاحی عنصر زیادہ ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ قیمت ۱۲/ پتہ :۔ میزان الادب بریلی (یو۔ پی)

نئے مسائل: محمد مرغوب الدین صاحب بی۔ اے بی ٹی نے اس کتاب میں چند موجودہ مسائل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بعض موضوعات یہ ہیں :۔ امیر و غریب، حکومت، جنگ وغیرہ قیمت ۸/ پتہ :۔ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد دکن

سائنس کے کرشمے: میر حسن صاحب ایم۔ اے کی یہ تالیف حیدرآباد دکن کے ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کی ہے۔ اس میں سائنس کے متعدد موضوعات کے متعلق مختلف حضرات کے آٹھ مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ کتاب مطالعہ کے قابل ہے قیمت مجلد ۱۲/ ۔ اوپر کے پتے سے طلب

راہِ آزادی (حصۂ اول) از صولت علی خاں صاحب رام پوری قیمت ۱ر مطبوعہ بریلی الیکٹرک پریس - بریلی

اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اقوامِ ہند کی جداگانہ حکومتوں کا قیام ہندوستان کی آزادی کے لئے پہلا قدم اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔

کاروانِ ادب:- یہ کتاب ڈاکٹر عبدالوحید صاحب بی۔اے آنرز) پی۔ ایچ ڈی لنڈن کی نگرانی میں تالیف کی گئی ہے۔ اور فیروز سنز لاہور نے شائع کی ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اردو میں یہ اپنی طرز کا پہلا کارنامہ ہے۔ اس میں فورٹ ولیم کالج کے زمانے سے لے کر ناشر کے عہد تک کے نثر نگاروں اور ان کی کتابوں کے متعلق مفید معلومات جمع کی گئی ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ مشہور تصانیف کے خلاصے (حتی الامکان خود مصنف کی زبان میں) درج کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اردو کی بہت سی مشہور تصانیف سے واقفیت ہو سکتی ہے اور خلاصوں کی وجہ سے مطالعہ پر وقت بھی کم صرف ہوگا۔ بعض عنوان ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

باغ و بہار۔ گل بکاؤلی۔ فسانۂ عجائب۔ خطوطِ غالب۔ خطباتِ احمدیہ۔ حیاتِ سعدی۔ الفاروق۔ افاداتِ مہدی۔ توبۃ النصوح۔ حاجی بغلول۔ طوفانِ حیات (ڈرامے) اندر سبھا۔ اکبر۔ خوابِ ہستی وغیرہ۔

ہماری رائے میں یہ کتاب اس قابل ہے کہ سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کے لئے منظور کی جائے۔ کاغذ اور طباعت نفیس ہے۔ حجم ۸۴۳ صفحات۔ قیمت مجلد ؏ ۸ر۔ فیروز سنز لاہور سے طلب فرمائیے۔

تعلیم و تربیت:- بچوں کا یہ ماہوار رسالہ فیروز سنز لاہور کے اہتمام میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ مضامین۔ تصاویر و نقشے۔ پرانہ معلومات اور دلچسپ ہیں۔ یہ رسالہ بچوں کے لئے بہت مفید ہے۔ حجم ۳۲ صفحات۔ سالانہ چندہ دو روپے۔ پتہ اوپر درج ہے۔

یادِ انوار:- از محمد امین صاحب زبیری مارہروی۔ یہ مولوی حاجی انوار احمد صاحب زبیری مارہروی کی سوانح عمری ہے۔ حجم ۹۹ صفحات، قیمت درج نہیں۔ پتہ: منیجر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ۔

انتخابِ جداگانہ کا تاریخی خلاصہ:- مولوی محمد امین صاحب زبیری نے یہ کتاب لکھ کر مسلمانوں کی ایک بہت بڑی سیاسی ضرورت پوری کی ہے۔ موجودہ سیاسیات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ اس کی فروخت کا منافع مسلم لیگ کو دیا جائے گا۔ پانچ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دفتر مسلم لیگ آگرہ سے طلب فرمائیے۔

کہکشاں:- یہ نیمی اجمیری مرحوم کے ادبی مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے جسے حضرت قیسی رام پوری نے شائع کیا ہے۔ کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ اندازِ تحریر شگفتہ اور دلکش ہے۔ اور کتابت و طباعت نفیس۔ حجم ۱۸۳ صفحات۔ قیمت دو روپے۔
پتہ: حضرت قیسی رام پوری۔ آڈٹ آفس اجمیر۔

شہرِ خموشاں اور دوسرے افسانے:- از سید محمود مرتضیٰ صاحب بی۔ اے حجم ۱۱۴ صفحات قیمت ؏ پتہ: گلفروش پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ مرتضیٰ صاحب ایک مشہور اخبار نویس اور ادیب ہیں۔ ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ قابلِ قدر ہے۔

رہبر املا:- جناب پو کرمل صاحب گپتا وکیل ہائی کورٹ اور (راجپوتانہ) نے یہ کتاب لکھ کر اردو املا سیکھنے والوں کے لئے بہم پیدا کر دی ہے۔ اکثر مقامات پر حکایات اور قصاوید سے مطالب کی تشریح کر کے کتاب دلچسپ بنا دی گئی ہے طلبہ اور شائقین کے لئے یکساں مفید ہے حجم ۸۰ صفحات قیمت ۵ ر مصنف سے مل سکتی ہے۔

مذاہب عالم:- پروفیسر پریتم سنگھ صاحب ایم۔ اے کی اس مختصر کتاب کے مطالعے سے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے متعلق بہم پہنچ سکتی ہیں ہر شخص اس ضروری کتاب کے مطالعہ کے لئے وقت نکال سکتا ہے۔ یہ کتاب قابلِ قدر ہے حجم ۱۰۶ صفحات قیمت ۱۲ ۲۹ چمپل روڈ لاہور کے پتے سے طلب فرمائیے۔

ریاضِ روح:- یہ حضرت روحی آمبوری کا مجموعۂ کلام ہے جو زیادہ تر حمد، نعت اور قومی نظموں پر مشتمل ہے۔ آمبور مدراس میں ہمیں مسرت ہے کہ ایسے دور دراز علاقوں میں بھی اردو شاعری کا یہ چرچا ہے ہا امید ہے کہ اہلِ ذوق اس کتاب کو خرید کر روحی صاحب افزائی کریں گے حجم ۵۰ صفحات۔

پتہ:- مولانا محمد عزیز الدین صاحب روحی سابق منشی مدرسہ مظہر العلوم ہائی سکول سوداگر پان۔ آمبور۔ علاقہ مدراس

مخزن التاریخ / **جامع التاریخ**:- یہ جناب دلدار حسین صاحب اظہر الہ آبادی کی کہی ہوئی منظوم تاریخوں کے دو مجموعے ہیں شعر اچھے ہیں ۱۶۴ و ۸۴ صفحات قیمت درج نہیں۔

پتہ:- جہانگیر بک ڈپو لاہور

سوگوارِ شباب:- حضرتِ مجنوں گورکھپوری اردو کے ایک اچھے نقاد اور افسانہ نگار ہیں بقولِ خود وہ عشقیہ افسانے لکھتے ہیں کہ عشق اپنے مرعوب کن اور پر اسرار نام کی نقاب اتار کر سیدھے سادے جنسی جذبے کی صورت میں عوام کے سامنے اسی مقصد کے لئے انھوں نے اپنے افسانے وقف کر رکھے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس باب میں اظہارِ حقیقت نوجوانوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ یا یہ مقصد کہاں تک قابلِ حصول ہے لیکن بہر حال مجنوں صاحب کے افسانے دلچسپ اور ان کا انداز دلکش ہوتا ہے۔ سوگوارِ شباب ۱۶۴ صفحات کا ایک المیہ ناول ہے جو ہارڈی سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے قیمت مجلد

پتہ:- ایوانِ اشاعت گورکھپور

اسمٰعیل بیگ محمد ہائی سکول میگزین:- بمبئی کے اسمٰعیل بیگ محمد ہائی سکول کا رسالہ ہے۔ اس کا ایک حصہ اردو اور ایک حصہ انگریزی کے لئے وقف ہے طالبہ کے مضامین اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں قابلِ تعریف ہیں۔ کاغذ کتابت اور تصاویر دلکش ہیں سکول کے پتے سے

حور:- عورتوں کے لئے یہ رسالہ ایک عرصے سے شائع ہو رہا ہے محترمہ جہاں بانو بیگم نقوی ایم۔ اے اور زینب عثمانیہ صاحبہ سیانی اس کی اعزازی ایڈیٹر ہیں۔ رسالے کا معیار اچھا ہے جس کے لئے محترمہ امۃ اللہ قریشی مدیر مسئول اور دونوں ایڈیٹر مستحقِ مبارک باد ہیں سالانہ چندہ ۵ پتہ دفتر حور لاہور

سائنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

اپریل ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱- انسان نما بندر

۲- کیا دنیا پر چھت ہے ؟

۳- اضافیت (خاص نظریہ)

۴- دم دار تارے

۵- نیا دم دار تارہ

مارچ ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

یاہ ہیرا یعنی پتھر کا کوئلہ

ائنس کی ابتدائی تعلیم کا نصاب

ینٹ کی تیاری

راثت

نسانی جسم میں پیوندکاری

یہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے جس میں مختلف مضامین کے علاوہ ہر ماہ معلومات، سائنس سے متعلق سوال و جواب، سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ رسالہ میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ شائقین اور اردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے۔

اشتہارات کے نرخ طلب فرمائے جا سکتے ہیں۔

ندہ سالانہ پانچ روپے سکہ انگریزی، نمونہ کا پرچہ آٹھ آنہ

معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

R. L. No. 1363.

قواعد

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳- لارنس روڈ لاہور

The Title Page and Pictures Printed at Half-Tone Press,
Dev Samaj Road, Ram Nagar, Lahore.

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

بیادگار علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خان، بی۔ اے

جلد ۱۹ — نمبر ۶

فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ جون ۱۹۴۱ء

تصویر - بہ حبیباں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

چندہ سالانہ عہ ششماہی عہ (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸/

جہاں نما

ممالکِ عالم پر ایک سرسری نظر

سطورِ ذیل میں دنیا کے مختلف ملکوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ موجودہ جنگ نے بعض ملکوں کی سیاسی و جغرافیائی حالت بہت کچھ بدل دی ہے۔ مگر ممالکِ عالم کی آئندہ مستقل حیثیت کا فیصلہ اس جنگ کے خاتمہ پر ہوگا۔ سطورِ ذیل جنگ سے پہلے کی حالت کا نقشہ پیش کرتی ہیں لیکن کہیں کہیں موجودہ اہم سیاسی انقلابات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔

حبشہ۔ شمالی و مشرقی افریقہ کی ایک سلطنت۔ رقبہ تین لاکھ پچاس ہزار مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ دس لاکھ۔ صدر مقام عدیس ابابا۔ اٹلی نے ۱۹۳۶ء میں اسے فتح کر لیا تھا۔ اور حبشی بادشاہ یہاں سے بھاگ گیا تھا مگر اب پھر انگریزوں کی مدد سے حبشہ میں داخل ہو کر سلطنت کی فکر کر رہا ہے۔

افغانستان۔ ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ رقبہ دو لاکھ پینتالیس ہزار مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ ۲ لاکھ۔ صدر مقام کابل۔ حکومت بادشاہی ہے۔ وضعِ قوانین کی ذمہ دار پارلیمنٹ ہے جو بادشاہ کے علاوہ چالیس ارکان کی ایک سینیٹ اور ایک سو چھیس ارکان کی ایک منتخب قومی مجلس پر مشتمل ہے۔

البانیہ۔ ایک بلقانی ریاست ہے۔ رقبہ دس ہزار چھ سو مربع میل۔ آبادی دس لاکھ تین ہزار اڑسٹھ۔ یہاں پہلے شاہ زوغو کی حکومت تھی ۱۹۳۹ء میں اٹلی نے اس پر قبضہ کر لیا۔

ارجنٹائنا۔ جنوبی امریکا کی جمہوریہ۔ رقبہ دس لاکھ اٹھتر ہزار دو سو اٹھہتر مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ پچیس لاکھ اکسٹھ ہزار تین سو اکسٹھ مربع میل۔ صدر مقام بونس ایرز۔

آسٹریلیا۔ سلطنت برطانیہ کی وفاقی دولتِ متحدہ۔ رقبہ تیس لاکھ مربع میل۔ آبادی چھیاسٹھ لاکھ تیس ہزار تین سو [illegible]۔ یہ پانچواں براعظم ہے۔

آسٹریا۔ پہلے جمہوریت تھی اب جرمنی سے ملحق ہو چکی ہے۔ رقبہ ۳۲ ہزار مربع میل۔ آبادی پینسٹھ لاکھ تیس ہزار۔ صدر مقام ویئنا۔

بلجیم۔ جنگ سے پہلے یہاں انگریزی ریاست نے ایک بادشاہی قائم کر رکھی تھی اب اسے جرمنی نے فتح کر لیا ہے۔ رقبہ گیارہ ہزار سات سو [illegible] مربع میل۔ آبادی [illegible] یہاں فی مربع میل [illegible] آباد ہیں یہ چھوٹی سی سلطنت [illegible] گنجان آبادی [illegible]

[illegible]

[illegible] پیرس موجودہ جنگ میں جرمنی نے فرانس کو شکست دی ہے اور حسب منشا اس کے بیشتر حصے پر قابض ہے اب فرانس اور جرمنی [illegible]

جرمنی - وسطی یورپ، آمریت، رقبہ دو لاکھ پچیس ہزار مربع میل - آبادی سات کروڑ اٹھاسی لاکھ - آسٹریا اور سوڈیٹن لینڈ وغیرہ کے الحاق سے حال ہی میں یہ سلطنت وسیع کی گئی ہے۔ موجودہ جنگ میں جرمنی کو حیرت انگیز فتوحات حاصل ہوئی ہیں تقریباً تمام یورپ اس کی سیادت تسلیم کر چکا ہے اب صرف برطانیہ باقی ہے۔

یونان۔ جنوبی یورپ میں واقع ہے۔ اسے جرمنی نے فتح کر لیا ہے۔ رقبہ پچاس ہزار مربع میل۔ آبادی باسٹھ لاکھ پانچ ہزار۔

ہنگری۔ پہلے یہ آسٹریا ہنگری کا ایک حصہ تھا اب جرمنی کے زیر نگین ہے رقبہ پینتیس ہزار نو سو مربع میل۔ آبادی پچاسی لاکھ۔ صدر مقام بڈاپسٹ۔

آئس لینڈ۔ شمالی بحر اوقیانوس میں ایک جزیرہ ہے۔ اس پر ڈنمارک کی سیادت تھی۔ کہا جاتا ہے اب اس پر جرمنی کا قبضہ ہے۔ رقبہ انتالیس ہزار سات سو مربع میل۔ آبادی ایک لاکھ تین ہزار دو سو ستر۔ صدر مقام ریکجاویک۔

ہندوستان۔ یہ غلام ملک برطانوی سلطنت کا اہم ترین حصہ ہے رقبہ سترہ لاکھ مربع میل سے زائد۔ آبادی پینتیس کروڑ انتیس لاکھ چھیاسی ہزار آٹھ سو چھہتر۔ دارالحکومت دہلی۔

ایران۔ رقبہ چھ لاکھ اٹھائیس ہزار مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ۔ صدر مقام طہران۔

عراق۔ یورپین پہلے اسے میسوپوٹیمیا کہتے تھے۔ یہ عرب اور ایران کی درمیانی ریاستوں میں سے ہے۔ یہ ریاست بھی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے پیدا کی۔ اب یہاں جرمنی کی مدد سے بغاوت ہو رہی ہے۔ رقبہ ایک لاکھ سولہ ہزار چھ سو مربع میل۔ آبادی تیس لاکھ۔ صدر مقام بغداد۔

اٹلی۔ رقبہ ایک لاکھ انتیس ہزار مربع میل۔ آبادی چار کروڑ پچیس لاکھ ستائیس ہزار پانسو اکسٹھ۔ یہاں کی حکومت میں بادشاہ بھی موجود ہے اور ڈکٹیٹر بھی جسے عملاً بادشاہ پر فوقیت حاصل ہے۔

جاپان۔ ایشیائی جزیروں کی سلطنت۔ چین اور سائبیریا کے کناروں سے پرے شمالی بحرالکاہل میں واقع ہے۔ رقبہ دو لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل۔ آبادی چار کروڑ پچیس لاکھ ستائیس ہزار پانسو اکسٹھ۔ صدر مقام ٹوکیو۔ شہنشاہ قانونی اور انتظامی معاملات میں اپنے وزراء اور عوام اور امراء کے نمائندوں کے مشورے سے حکومت کرتا ہے۔ اس ملک کو موجودہ جنگ سے قبل انگریزوں کی دوستی حاصل تھی۔ اب یہ بدقسمتی سے اس نعمت سے محروم ہے۔

لیٹویا۔ بالٹک کی جمہوریت۔ رقبہ چالیس ہزار آٹھ سو پچاس مربع میل۔ صدر مقام ریگا۔

لکسمبرگ۔ بیلجیک گرینڈ ڈچی تھی۔ اب جرمنی کے زیر نگین ہے۔ اس کا رقبہ نو سو ننانوے مربع میل ہے۔

لتھوانیا۔ بالٹک کی ایک ریاست ہے۔ رقبہ بیس ہزار پانسو مربع میل۔ آبادی پچیس لاکھ [illegible] ہزار۔ صدر مقام کونو۔

لبنان۔ [illegible] میں فرانس کے تحت یہ "آزاد" ریاست قائم ہوئی تھی۔ صدر مقام بیروت ہے۔

[illegible]

...یہاں کے تحت ریاست قائم ہوئی۔

میکسیکو۔ شمالی اور جنوبی امریکا کی جمہوریہ۔ رقبہ سات لاکھ ساٹھ ہزار تین سو مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ سینتالیس لاکھ دس ہزار۔ صدر مقام میکسیکو شہر۔

مراکو۔ شمالی افریقہ کی اسلامی سلطنت جس پر فرانس قابض ہو چکا ہے۔ رقبہ دو لاکھ اکتیس ہزار پانسو مربع میل۔ آبادی پچاس لاکھ۔ صدر مقام فیض۔

ہالینڈ (نیدرلینڈ)۔ شمالی مغربی یورپ کی یہ ریاست جرمنی کے قبضے میں آچکی ہے۔ رقبہ بارہ ہزار پانسو نو مربع میل۔ آبادی .... صدر مقام ایمسٹرڈم۔

نیو فاؤنڈلینڈ۔ شمالی امریکا کی برطانوی نو آبادی۔ رقبہ بیالیس ہزار سات سو چونتیس مربع میل۔ آبادی دو لاکھ پینسٹھ ہزار۔

نیوزی لینڈ۔ جنوبی بحر الکاہل میں برطانوی نو آبادی۔ رقبہ ایک لاکھ چار ہزار مربع میل۔ آبادی چودہ لاکھ دس ہزار۔ صدر مقام ولنگٹن۔

نادرن آئرلینڈ۔ یہ السٹر کے نو ملکوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ایک الگ پارلیمنٹ ہے۔ رقبہ پانچ ہزار دو سو سینتیس مربع میل۔ صدر مقام بیلفاسٹ۔

ناروے۔ شمالی یورپ کی مملکت۔ رقبہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نو سو چونسٹھ مربع میل۔ آبادی اٹھائیس لاکھ۔ صدر مقام اوسلو۔ اب اس پر جرمنی کا قبضہ ہے۔

فلسطین۔ پہلے اس پر ٹرکی کی حکومت تھی۔ جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اس پر قابض ہو گیا۔ رقبہ دس ہزار مربع میل۔ آبادی دس لاکھ پینتیس ہزار۔ صدر مقام یروشلم۔

جمہوریۂ پاناما۔ رقبہ تینتیس ہزار چھ سو سڑسٹھ مربع میل۔ صدر مقام پاناما۔

پیرو۔ جنوبی امریکا کی جمہوریہ۔ رقبہ پچپن ہزار مربع میل۔ آبادی پچپن لاکھ۔ صدر مقام لیما۔

نیپال۔ ہمالیہ کے جنوبی نشیب پر واقع ایک آزاد ریاست۔ یہ ہندوؤں کی تنہا خود مختار مملکت ہے۔ رقبہ چوّن ہزار مربع میل۔ آبادی چوّن لاکھ انتالیس ہزار بانوے۔ صدر مقام کھٹمنڈو۔ اگرچہ یہاں بادشاہ ہے مگر حقیقی حاکم کمانڈر انچیف ہے۔

پولینڈ۔ یہ جنگ سے پہلے مشرقی یورپ کا آزاد ملک سمجھا جاتا تھا۔ اب اس پر جرمنی اور روس کا قبضہ ہے۔ رقبہ ایک لاکھ پچاس ہزار مربع میل۔ آبادی تین کروڑ تیس لاکھ سینتالیس ہزار تین سو۔ صدر مقام وارسا۔

پرتگال۔ جنوبی مغربی یورپ کی جمہوریہ۔ رقبہ پینتالیس ہزار چار سو نوے مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ پچاس لاکھ۔ صدر مقام لزبن۔

رومانیہ۔ جنوبی مغربی یورپ کی خود مختار مملکت۔ اب یہ جرمنی کے زیر اثر ہے۔ رقبہ ایک لاکھ انیس ہزار دو سو اسی مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ چوہتر لاکھ۔ صدر مقام بخارسٹ۔

سوویٹ روس۔ یہ ملک سوویٹ جمہوریتوں کے اتحاد سے بنا ہے۔ اس کا صدر مقام ماسکو ہے۔ رقبہ اکیاسی لاکھ چوالیس ہزار مربع میل۔ آبادی سولہ کروڑ اٹھاسی لاکھ۔

سیلواڈور۔ وسطی امریکا کی جمہوریت۔ رقبہ تیرہ ہزار ایک سو تراسی مربع میل۔ آبادی ستر لاکھ۔ صدر مقام سان سلواڈور۔

سان میرینو۔ یہ اڑتیس مربع میل کے رقبہ کی ایک جمہوریت ہے۔ آبادی تیرہ ہزار نو سو اڑتالیس مربع میل۔ [illegible]
یہ یورپ کی سب سے قدیم سلطنت ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد چوتھی صدی عیسوی میں پڑی تھی۔

سکاٹ لینڈ۔ یہ برطانیہ کلاں کا شمالی حصہ ہے۔ رقبہ تیس ہزار چار سو ساٹھ مربع میل آبادی اڑتالیس لاکھ بیالیس ہزار پانسو چون۔ صدر مقام ایڈنبرا۔

سیام۔ جنوبی مشرقی ایشیائی سلطنت۔ رقبہ دو لاکھ ایک سو پچاس مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ۔ صدر مقام بنکاک ۱۹۳۲ء میں یہاں آئینی بادشاہت اور پارلیمنٹ قائم ہوئی۔ اب اسے تھائی لینڈ کہتے ہیں۔

جنوبی افریقہ کی یونین۔ یہ برطانی نو آبادی ہے۔ رقبہ چار لاکھ بہتر ہزار تین سو پچاس مربع میل۔ آبادی ستر لاکھ۔ صدر مقام کیپ ٹاؤن اور پریٹوریا

سپین۔ جنوبی مغربی یورپ کی جمہوریت۔ رقبہ ایک لاکھ چورانوے ہزار مربع میل۔ آبادی دو کروڑ اٹھائیس لاکھ۔ صدر مقام میڈرڈ۔ پہلے یہاں بادشاہی حکومت تھی ۱۹۳۱ء میں جمہوریت بنی۔

سعودی عرب۔ اس میں حجاز اور نجد شامل ہے۔ یہ انگریزوں کے زیر اثر ایک خود مختار سلطنت ہے۔ صدر مقام مکہ اور ریاض۔

سویڈن۔ شمالی یورپ کی ایک مملکت۔ رقبہ ایک لاکھ تہتر ہزار ایک سو پچاس مربع میل۔ آبادی ساٹھ لاکھ۔ صدر مقام سٹاک ہالم۔ بادشاہت آئینی ہے۔

شام اور لبنان۔ فرانسیسی قبضہ میں ہیں۔ رقبہ ستاون ہزار نو سو مربع میل شام کا صدر مقام دمشق۔ لبنان کا صدر مقام بیروت۔ جنگ عظیم سے پہلے یہاں ترکی کی حکومت تھی۔ اتحادیوں نے معاہدہ سیورے کی رو سے ۱۹۲۰ء میں انہیں خود مختار قرار دیکر فرانس کے حوالے کر دیا۔

سوئٹزرلینڈ۔ یورپ وفاقی ریاست۔ رقبہ پندرہ ہزار نو سو اسی مربع میل۔ آبادی چالیس لاکھ۔ صدر مقام برن۔

ترکی۔ یورپ اور ایشیا کی جمہوریت۔ رقبہ دو لاکھ چورانوے ہزار چار سو بانوے مربع میل۔ آبادی ایک کروڑ اکسٹھ لاکھ اٹھاون ہزار دس۔ صدر مقام انقرہ

ریاستہائے متحدہ امریکا۔ شمالی امریکا کی وفاقی جمہوریت۔ رقبہ تیس لاکھ پچاس ہزار مربع میل۔ آبادی بارہ کروڑ ستائیس لاکھ پچھتر ہزار۔ صدر مقام نیویارک

یوروگوئے۔ جنوبی امریکا کی جمہوریت۔ رقبہ بہتر ہزار ایک سو پچاس مربع میل۔ آبادی اٹھارہ لاکھ۔ صدر مقام مونٹی ویڈیو۔ یہ جنوبی امریکا کی سب سے چھوٹی جمہوریت ہے۔

ویٹیکن سٹی۔ روم میں ایک نئی ریاست جس پر پوپ کو پورے اختیارات حاصل ہیں۔ رقبہ ایک سو آٹھ ایکڑ۔ آبادی آٹھ سو۔

وینزویلا۔ جنوبی امریکا کی جمہوریت۔ رقبہ چار لاکھ مربع میل۔ آبادی تیس لاکھ پچیس ہزار۔ صدر مقام کاراکاس۔

ویلز۔ برطانیہ کلاں کا ایک حصہ۔ رقبہ سات ہزار چار سو پچاس مربع میل۔

یوگوسلاویا۔ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد آسٹریا اور بلغاریہ سے کچھ علاقے لے کر یہ سلطنت بنائی گئی تھی۔ اب اس پر جرمنی کا قبضہ ہے۔ رقبہ چھیانوے ہزار ایک سو پچاس مربع میل آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ۔ صدر مقام بلغراد۔

(ماخوذ) حامد علی خاں

بہ اُمید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

غزل

والاشان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیع حیدرآباد (دکن)

دے کے دل جان دیئے جاتے ہیں
ہم تو اپنی سی کئے جاتے ہیں

دل جو روتا ہے محبت میں کبھی
خون کے گھونٹ پیئے جاتے ہیں

زندگی کٹ گئی آہیں کرتے
زخمِ دل آج سئے جاتے ہیں

تم بھی انجامِ وفا کو رو لو
آج ہم ساتھ لئے جاتے ہیں

یہ خلاصہ ہے محبت کا شجیع
زندگی ہے تو جئے جاتے ہیں

دیال باغ

اس ماہ کے آغاز میں بھوپال کے مشہور نوخیز اور اعلیٰ تعلیم یافتہ درویش۔ اعلیٰ حضرت شہزادہ قاسمی مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے میں دہلی گیا تھا جہاں ممدوح بیمار تھے اور خواجہ حسن نظامی صاحب کے مہمان خانے میں فروکش۔ ممدوح کا خیال ایک عرصہ دراز سے یہ رہا ہے کہ ایک اسلامی نوآبادی قائم کی جائے جس میں ایک جامعہ اسلامیہ بھی ہو جو عثمانیہ یونیورسٹی سے ملحق رہے لیکن شہروں کی مصنوعی زندگی سے دور کسی خوش منظر صحرا میں اس کا قیام عمل میں آئے لیکن اب تک یہ خیال شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کیونکہ اکناف ہند کی سیاحت فرمانے کے بعد اب آئندہ آپ صوبجاتِ متوسط کا دورہ فرمانے والے ہیں اور بعد ازاں موزوں مقام پر اپنی جامعہ اور اپنی نوآبادی کا سنگِ بنیاد رکھیں گے۔ اسی سلسلے میں مجھے حکم ہوا تھا کہ واپسی کے وقت آگرہ اتروں اور دیال باغ کو بنظرِ غائر دیکھوں چنانچہ واپس آتے وقت آگرہ اتر کر دیال باغ دیکھنے گیا تھا +

دیال باغ کے بانی

صبح صبح ان کے ہفتہ وار اخبار پریم پرچارک کے ایڈیٹر پروفیسر ہرچرن لال ایم۔ اے کے مکان پر میں نے حاضری دی۔ ایک سادگی پسند دبلا پتلا انسان جو سادہ لباس پہنے ہوئے تھا سادہ مگر صاف ستھرے مکان سے برآمد ہوا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے سلام کیا یہی تھے پروفیسر ہرچرن لال پندرہ منٹ تک ہم دونوں ایک سادہ چارپائی پر بیٹھ کر بات چیت کرتے رہے پھر وہ اندر گئے اور اپنا کوٹ پہنکر میرے ہمراہ روانہ ہوئے۔ وہ ایک نہ تھکنے والے آدمی کی طرح مستعدی سے تین گھنٹے تک میرے ساتھ رہے۔ جتنی دلچسپی اور مستعدی سے میں سوال کرتا تھا اتنی ہی وضاحت سے وہ بلا اکراہ مجھے جواب دیتے۔ وہاں کی ایک ایک عمارت، ایک ایک ادارہ، کارخانے، ڈیری فارم، عبادت گاہ گودام، نہر، باغات۔ سب دکھاتے اور سمجھاتے تھے۔ وہاں کے ہر ایک کارخانہ اور ادارے کے مہتممین سے میرا تعارف کراتے تھے اور ان سے اجازت حاصل کرنے کے بعد اندر کی سیر کراتے تھے۔ اس موقع پر خود مہتمم صاحبان یا ان کے اسٹاف کا ذمہ دار رکن سمجھانے اور صراحت کرنے کے لئے موجود رہتا تھا۔

تسلیم کرنا چاہیئے کہ دیال باغ ایسی نوآبادی ہے جس کی نظیر ہندوستان کیا تمام ایشیا میں نہیں ملے گی۔ اس کے بانی ان کے سب سے پہلے گرو رادھا سوامی تھے جنہیں ان کے ہاں عرفِ عام میں سرکار صاحب کہتے ہیں۔ یہ غازی پور کے رہنے والے تھے۔ ان کے معتقد حضور مہاراج تھے جو پوسٹ ماسٹر جنرل رہ چکے تھے اور اپنے گرو کی پالکی کو اپنے کندھوں پر رکھ کر [illegible] پھرتے تھے۔ وہ سب سے پہلی مرتبہ اپنے حضور مہاراج کو ان کے ایما کے مطابق اس جگہ لائے تھے جہاں [illegible] دیال باغ [illegible] ماہ فروری [illegible]

نمونے کی صنعتی اور سماجی بستی بھی ہے، جس میں چھ ہزار آدمی نمونے کی سادہ، پاک، روحانی اور صنعتی اور عملی زندگی گزار رہے ہیں۔ جمنا ندی کے کنارے پر جہاں پہلے گھنا جنگل تھا۔ چیتے اور جنگلی جانور رہتے تھے وہاں آج انجن ہیں، کلیں ہیں، صاف ستھری سڑکیں ہیں، باغات ہیں۔ مکانات ہیں، اور چھ ہزار ہم خیال، ہم عقیدہ آدمی ہیں۔

اس دن جب کہ میں وہاں موجود تھا، شہتوت کے اس درخت پر برقی قمقموں کو آویزاں کیا جا رہا تھا جس کے نیچے بیٹھ کر ان کے سرپرست صاحب نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور اسی کے نیچے بیٹھ کر پاس کی ایک قدیم ترین باؤلی سے پانی منگا کر پیا تھا جو شہنشاہ اکبر سے منسوب کی جاتی ہے اور پھر اپنے ارادت مند پوسٹ ماسٹر جنرل کو ہدایت کی تھی کہ اسی جگہ ہماری ساد ھی بنا دو۔ اسی جگہ تم دیکھو گے کہ زبردست آبادی ہو جائے گی، کارخانوں کی چمنیوں سے دھوئیں کے بادل اٹھا کریں گے، کلیں جاری ہوں گی صنعتیں زندہ کی جائیں گی اور پھر تمام ہندوستان اسی خاص جگہ کے سامنے عقیدت اور احترام سے اپنی گردن خم کر دے گا۔ یہ تھی پیشینگوئی جو اس فرقے کے سب سے پہلے گرو نے کی تھی۔ ان میں روحانیت تھی، اور پیش بینی کی قوت۔

ان کا عقیدہ

میں نے پروفیسر ہرچرن لال سے کہا کہ آپ کی تحریک اشتراکیت کا پہلو لئے ہوئے ہے اور بولشویت کے بالکل قریب ہے کیونکہ آپ لوگ ہیئت اجتماعیہ کو ایک ہی سرحد پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور دولت کی مساویانہ تقسیم کے اصول پر کاربند ہیں۔ تو پروفیسر نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ہم اشتراکی اور بولشویک نہیں ہیں، نہ ہم دولت کی مساویانہ تقسیم پر کاربند ہیں جو لوگ یہاں آباد ہیں ان کے لئے میدان عمل موجود ہے، وہ اپنی سرگرمی اور جدوجہد سے جتنا رزق کما سکتے ہوں کمائیں۔ البتہ ان کی سہولت کے لئے ہم نے مصنوعات کی فروخت اور ان کی محنتوں کا ثمرہ انہیں تقسیم کر دینے کا کام اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے ہم ان کی عبادت گاہ دیکھنے گئے جو ایک وسیع ہال کی شکل میں ہے اسے دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لئے چلمیں پردہ جو قد آدم سے کچھ زیادہ ہے ایستادہ کیا گیا ہے پردے دار حصے میں خواتین قریب جمع ہو جاتی ہیں اور کھلے حصے میں مرد۔ ان کے مرجودہ گرو صبح اور شام کو چند گیتوں کے بعد اپنی تقریر کرتے ہیں پروفیسر صاحب نے مجھے بتایا کہ یہاں مسجد ہے نہ مندر ہے، نہ گرجا نہ شوالہ بس یہی ایک ہال ہے جسے آپ عبادت گاہ سے تعبیر کریجئے اور یہاں دن نکلنے کے وقت سب کا آنا لازمی ہے۔ اور دن ختم کر کے یہاں آنا لازمی ہے، وہ کہنے لگے کہ اس طرح ہم خدا کے نام کے ساتھ اپنا دن نکالتے ہیں خدا کے نام کے ساتھ دن ختم ہے۔

ان کے عقائد میں (۱) رادھا سوامی ایک خاص طاقت ہے اسے ماننا چاہیئے (۲) تمام مسکرات سے پرہیز رکھنا چاہیئے (۳) گوشت سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ (۴) ہر ایک کی روزی اپنے ہاتھوں کو کام میں لا کر حاصل کر کے اس پر قناعت کرنا چاہیئے۔

مسکرات اور گوشت کی نسبت پروفیسر ہر چرن لال صاحب نے بتایا کہ ممکن ہے کہ یہ چیزیں جسمانی طاقت پیدا کر دیں، لیکن چونکہ ہمارا مطمح نظر خالص روحانیات ہے لہذا روحانی ارتقا کے لئے غیر مفید ہیں چنانچہ خود آپ کے ہاں جدکشی کے وقت ترکِ حیوانات کی ہدایت کی جاتی ہے۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس پر ان سے بحث کروں اور انہیں سمجھاؤں کہ لوگ جو دودھ دہی اور گھی کھاتے ہیں، سائنس کے جدید نظریات کے اعتبار سے وہ خون اور گوشت ہی سے بنتے ہیں بہرحال ہمیں ان کے عقائد سے بحث نہیں ہے۔ پروفیسر ہر چرن لال نے یہ بھی بتایا کہ ہمارا عقیدہ تمام عالم کے اکابر اور بزرگوں کی عظمت کا اعتراف ہے اور ان کے اقوال سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں چنانچہ دیوانِ حافظ، مثنوی مولانا روم، اور صوفی سرمد کا کلام بھی ہمارے پروگرام میں ہمیشہ بہترین جگہ پاتا ہے۔

لیگ آف سروس

مجھے تعجب تھا کہ پروفیسر ہر چرن لال، کالج میں درس دینے کے ساتھ ہی ساتھ اخبار پریم پرچارک کے تین ایڈیشن یعنی اُردو، ہندی، اور انگریزی کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دیال باغ والوں کی ایک لیگ آف سروس (انجمنِ خدام) ہے۔ وہ بھی اس لیگ کے ممبر ہیں۔ ہر ممبر کے لئے لازم ہے کہ جہاں بھیجا جائے وہ جائے اور اسے جو کام کہا جائے بطیبِ خاطر انجام دے۔ اس لیگ کے ممبر اگر ادائے فرض کے دوران میں مر جائیں تو ان کے ورثا کو پنشن ملا کرتی ہے۔ وہاں کے سب کارکن لیگ آف سروس کے رکن ہیں اور ان سے اس لیگ کے اغراض کی نسبت پہلے ہی حلف نامہ لیا جاتا ہے۔ لیگ آف سروس کے ممبروں کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ماہانہ ہوتی ہے۔ چنانچہ وہاں کے پروفیسر، پرنسپل، منیجر، انسپکٹر، کلرک، پولیسمین، پوسٹ ماسٹر، انجینئر، وغیرہ سب اس لیگ کے ممبر ہیں، اور اس کے اقتدار کے ماتحت کام کرتے ہیں۔

کوتوالی اور جرائم

ان کی بھی کوتوالی، ڈاک خانہ، اور میونسپلٹی ہے۔ پولیس کی وردی یو۔پی میں خاکی یونیفارم اور سرخ صافہ ہوتی ہے۔ دیال باغ کی بھی پولیس کا خاکی یونیفارم اور خاکی صافہ ہے۔ جب میں نے جرائم کی نسبت وہاں جا کر چارٹ دیکھے اور استفسار کیا تو حیرت ہوئی کہ نہ وہاں قتل ہوتے ہیں نہ ڈکیتی، نہ مار پیٹ، نہ دست اندازی پولیس کے دیگر جرائم فہرست میں ہر جگہ ہر سال کی نسبت صفر ہی لگا رہتا ہے، البتہ باہر کے جو خانگی ملازم رکھے جاتے ہیں وہ کبھی کبھی معمولی سرقے کے جرم کا ارتکاب کر کے فرار ہو جاتے ہیں۔ جرائم کو پوشیدہ نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ بقول ہر چرن لال صاحب چونکہ تمام آبادی ہم خیال، ہم مشرب، فارغ البال اور باکار ہے اس لئے جرائم سرے سے معرضِ ظہور ہی میں نہیں آتے۔ اس معاملے میں خاص کر دیال باغ قابلِ تحسین ہے۔

وہاں کے پولیس والے باقاعدہ ڈریس لگائے رہتے ہیں۔ مستعدی سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف نظر آتے [illegible] پولیس کو کیوں [illegible] باقاعدہ کھنڈ بھی بجتا ہے۔

دیال باغ بینک

اس بینک میں وہاں کے تمام رہنے والوں کو اپنا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ اور بینک کی حالت بہت اچھی ہے۔ کیونکہ ایک خاص تحریک اور وہاں شروع کی گئی ہے کہ مختلف حصص ہند میں ان کے ایک سو اسٹور کھل چکے ہیں اور کھلتے جاتے ہیں ان اسٹوروں میں دیال باغ کی ساختہ مصنوعات فروخت ہوتی ہیں، نہ محض یہ بلکہ ملکی صنعتوں کو اپنانے کا کام بھی بڑی سرگرمی سے اس بینک کے ذریعہ جاری ہے چنانچہ فیروز آباد چوڑیاں بنانے کا مرکز ہے، دیال باغ بینک نے وہاں کے کارخانوں اور وہاں کے صناعوں کو زر امداد دے کر چوڑیوں کے کاروبار پر اپنا تصرف جما لیا ہے اور اپنے مقامی اسٹور کے ذریعہ چوڑیاں بنا کر اور بنوا کر تمام دیگر اسٹوروں کے ذریعہ بیچنا شروع کیا ہے اور اس طریقے سے فیروز آباد کی چوڑیوں کی صنعت پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ آئندہ بتدریج وہ تمام ہندوستانی صنعتوں پر اپنا اقتدار قائم کریں۔

مکانات و دفاتر

آبادی کئی محلوں میں تقسیم ہے۔ اور ہر محلے کو نگر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مثلاً پریم نگر وغیرہ ہر نگر میں مقررہ رقم لگا کر مکان بنوا دیئے جاتے ہیں۔ مکانات کا نقشہ ان کی پلیننگ کمیٹی تجویز و منظور کرتی ہے جتنے دن تک صاحب مکان رہنا چاہیں رہیں ورنہ اپنے مکان کی لاگت کی رقم لے کر بحق صاحب جی مہاراج اس سے دست بردار ہو جانا پڑتا ہے۔

ہر مکان میں برقی روشنی کا انتظام ہے۔ ٹیلیفون ان کا بھی ہے، جو ہر جگہ موجود ہے۔ تمام دفاتر اور مکانات میں جو دیوار گیر گھڑیاں لگی ہیں وہ سب برق کی حکمبردار ہیں اور برق کے ذریعہ چلتی ہیں۔ نہ انہیں چابی دینے کی ضرورت ہے، نہ کانٹے گھمانے کی حاجت۔ اچھی قسم کے مکانات کے ساتھ چھوٹے چھوٹے چمن بھی ہیں۔

مکانات کے علاوہ ان کے دفاتر بہت عالی شان ہیں، سیکرٹریٹ آفس ہے۔ کابینہ کے مہتمم کا دفتر ہے، انتظامیہ کمیٹی کا دفتر ہے، اور اسی طرح تمام صیغوں کے افسروں کے دفاتر ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو میل کے رقبے میں ایک چھوٹی سی ہم خیال انسانوں کی حکومت قائم ہے، جہاں اسی کا راج ہے، جہاں انسان اس تدین مقولے کو عملی طور پر برتتا ہے اور دنیا کو سبق دیتا ہے کہ "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند"

تعلیمی ادارے

دیال باغ میں درجہ دوم تک کنڈر گارٹن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے بعد پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے بندوبست ہے۔ اس کے علاوہ لیگ آف سروس کے ارکان کا ایک ٹیکنیکل کالج ہے جہاں صنعتی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک نئی درسگاہ اور قائم ہوئی ہے جسے انسپکٹرز ٹریننگ اسکول کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان مختلف اسٹوروں کے لئے جن کی تعداد سو تک پہنچ چکی ہے اطراف ہند میں پھیلے ہیں قابل لڑکوں کو تیار کیا

نیچر تیار کیے جائیں۔ نیز مزید اسکول جہاں جہاں کھلیں ان کے لئے امیدوار تیار ہوں ۔

ایڈیٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ اب ہم لوگوں کو مکانات کے متعلق بڑی مشکلات پیش آرہی ہیں کیونکہ یہاں کی تعلیمی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر بڑے بڑے لوگ اپنے بچوں کے مستقبل کے فکر میں یہاں مکان بنا کر رہنا چاہتے ہیں اور تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہونا چاہتے ہیں ۔

صبح کے وقت جب میں وہاں پہنچ رہا تھا دیال باغ کے نظر آنے والے حدود میں طلبہ اور چھوٹی طالبات اپنے اپنے حلقوں میں مختلف قسم کی ورزشوں اور کھیل کود میں مصروف تھیں۔ وہ سب بے حد خوش دل تھے اور ان کی جسمانی صحت عمدہ نظر آتی تھی ۔

وہاں کا ایک وسیع ہال جسے ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ ہال کہتے ہیں بالکل سادہ عمارت ہے اس میں فرش بچھا ہے۔ اور ڈیسک بھی رکھے ہیں۔ دیواروں پر اس نو آبادی کے بانیوں کی مقدس تصاویر آویزاں ہیں۔ دیواروں پر ایک جانب مشہور فلسفی رسکن کے اقوال لکھے ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں دیال باغ کے بانی کے اقوال درج ہیں چنانچہ یہ تقابل خالی از دلچسپی

رسکن	سوامی جی
وفاداری	انصاف
انکسار	حوصلہ
حسن	اعتدال
فرض	خرد مندی

ممکن ہے کہ سوامی جی کے اقوال ایک قسم کی ایزادیوں مثلاً جہاں رسکن کہتا ہے وفاداری تو سوامی جی نے کہا ہو۔ "وفاداری انصاف کے ساتھ" وقس علیٰ ہذا بہرحال وہاں کے علمی ادارے درس و تدریس کے کارہائے اہم کے ساتھ ایک نئی امت بنا رہے ہیں جو ہندوستان کی تعمیر جدید میں کار آمد ثابت ہوگی ۔

صنعتیں اور کارخانے

وہاں لوہے کی فاؤنڈری ہے فولاد اور لوہے کے چمکدار سائنٹیفک اور طبی آلات بنانے کے کارخانے ہیں۔ گراموفون اور دیگر مشینری بنانے کے کارخانے، اور بٹن، پنسل ہولڈر، اور اسٹیشنری کا سامان بنانے کے کارخانے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب پریم پرچارک نے بیان کیا کہ جنگ عظیم کے دوران میں ہمیں چمڑے کے بٹن بنانے کا بہت فوجی آرڈر ملا تھا جس کے طفیل ہم نے پچاس ہزار روپیہ کا منافع حاصل کیا تھا۔ اور اس وقت سے ہماری ترقی کے دروازے مفتوح

[illegible] انہوں نے مجلا اور کارخانوں کے فاؤنٹین پین بنانے کے کارخانے کا ذکر بھی کیا مگر اسے بتانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ا[illegible]
[illegible] صنعت ہے۔ اسی طرح چمڑے کی ٹینری میں دباغت کا کام ہوتا ہے، پھر اعلیٰ قسم کا چرمی سامان اور جوتے۔ سوٹ
کیس اس طرح طرح کے بکس تیار ہوتے ہیں جو کاریگری کے بے مثال نمونے کہلانے کے مستحق ہیں۔ ریشمی اور اونی پارچہ بافی، سوتی پارچہ
سازیاں اور اچھی قسم کے کپڑے کے کارخانے اگرچہ بہت چھوٹی چھوٹی عمارتوں میں قائم ہیں لیکن قابلِ دید ہیں۔ اور ان میں بنے
والا کپڑا ہماری تعریف کا استحقاق رکھتا ہے۔ ان کارخانوں کا نام اور ان کا کام ماڈل انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام سے موسوم ہے۔ موزہ
اور بنیان بننے کا کام بھی بہت اچھا ہوتا ہے، اور جب پروفیسر ہر جیون لال مجھے ان مصنوعات کے شوروم میں لے گئے جہاں تیار
ساختہ اشیاء کے نمونے باقاعدہ کانچ کی الماریوں اور کیسوں میں لگے ہیں تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں یورپ کے کسی بڑے شہر کے
بڑے تاجر کی دکان میں مختلف چیزوں کی زیبائش کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ چونکہ انہوں نے فاؤنٹین پین کا کارخانہ دکھانے سے انکار
کیا تھا اس لئے قدرتاً مجھے سب سے پہلے ان کے ہاں کے فاؤنٹین پین دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے ان کی اس مرموز صنعت کار
کو دیکھ کر بے حد تعریف کی یعنی یقین نہیں ہوتا تھا کہ ہم اس وقت دیال باغ میں ہیں جو آگرہ جیسی غلیظ، تنگ راستوں اور سڑکوں
پھگڈے اور خنازیر اور غلاظت کے انبار والی سرزمین میں واقع ہے۔ وہ شہر جہاں عام گذرگاہوں پر بھی اور سینکڑوں پھوس کے جھونپڑے
نظر آتے ہیں، جہاں قدم قدم پر افلاس اپنی بھیانک صورت میں نظر آتا ہے، جسے اگر فردوسِ بریں کہہ کر عزیز لکھنوی نے یاد کیا ہے
محض تاج محل، اور اعتماد الدولہ اور سکندرہ اور فتح پور سیکری، اور قلعۂ اکبری کے سبب سے یاد کیا ہوگا۔ مجھ سے جیسے نو وارد کو جنگی
کی باعظمت اور جدید آبادی سے لوٹ کر اُدھر گیا ہو، آگرہ کبھی نہیں جچ سکتا۔ اسی آگرے سے صرف چار میل کے فاصلے پر صاف اور جدید
نمونے کے گاؤں کے باشندوں نے پارکر، سوان، راجا، اور ٹرانسو مینک، والوں کے ہم پلّہ تین روپے سے لے کر تیس روپے تک
کے نہایت دیدہ زیب، کارآمد، فاؤنٹین پین بنائے ہیں۔

ایڈیٹر پریم پرچارک نے یہ بھی بتایا کہ آج کل چونکہ ہمیں فوجی ضروریات کے لئے موزہ بافی کا بہت بڑا آرڈر ملا ہے اس۔
تمام آبادی کا نصفِ بہتر بالخصوص اس کی تکمیل میں مصروفِ عمل ہے چنانچہ خواتین ایک جگہ جمع ہو کر اس کام کو انجام دے ر[illegible]
ہیں اور بچے والیاں اپنے اپنے گھروں میں کام کر رہی ہیں، انہیں دس سے لے کر بیس روپے ماہانہ کی آمدنی ہونے لگی ہے ا[illegible]
واسطے وہ گھر کے کام دھندوں، اور بچوں کے پڑھنے کے لئے نوکر رکھ لینا پسند کرتی ہیں، اور خود موزہ بافی سے پیسہ کما رہی ہیں
دیال باغ میں مسلمانوں کے پچاس خاندان آباد ہیں اور وہ سب صنعتی اداروں سے اپنا رزق کماتے ہیں۔

ڈیری فارم

یہ ہری ڈیری فارم ہے جس کا افتتاح ملک کے سربرآوردہ اصحاب کی موجودگی میں کئی سال ہوئے سر اکبر حیدری اس زمانے [illegible]
[illegible] ہوا تھا۔ [illegible] پچاس فٹ عریض حوض ہیں جو صرف دودھ ہی دودھ سے بھرا گیا تھا

ین طلائی ونقرئی فوارہ لگایا گیا تھا، فوارے کو سونے کی کنجی سے کھول کر کیا تھا اور کہا تھا کہ ایشیا بھر میں اتنا شاہ دودھ اور مکھن کا
نہ نہیں ہے، وہ حوض اب بھی موجود ہے، مگر اسے لڑکوں کے تیرنے کا مصنوعی تالاب بنا دیا گیا ہے۔ امریکہ کا ایک سانڈ ہم
یکھا جس کا کوہان ایک طرف لٹک گیا تھا اور یہ سیاہ فام عجیب وغریب جانور اپنی نوعیت میں یکتا پایا۔ ایڈیٹر پریم پرچارک نے
ہم نے اس سانڈ کے ذریعے سے جو نسل کشی کی ہے وہ ایک جدید نسل ہے اور اس نسل کی گائیں بیس سیر یومیہ دودھ دیتی ہیں
رخانہ کئی میل کے احاطے میں ہے، جس طویل سائبان میں مویشی باندھے جاتے ہیں اس کے بالکل بیچ میں ریل کی پٹری بچھائی
ہے، اور چھوٹی سی ریل گاڑی مویشیوں کے واسطے چارہ دانہ اور پانی لا کر ان کے برتنوں میں بھرتی ہے اور گوبر وغیرہ صاف
ے جاتی ہے جمنا کی سرکاری نہر سے ایک شاخ لے کر اپنی خاص نہر نکالی گئی ہے اس کا جال میلوں تک پھیلایا گیا ہے جہاں
یوں کے واسطے اناج، سبزیاں اور گھاس اگائی جاتی ہے۔ انہوں نے ایک گھاس دکھائی جس کا تخم افریقہ سے منگایا گیا ہے
ے افریقہ کی یہ سیاہی مائل گھاس سال بھر برابر سرسبز وشاداب رہتی ہے اور جانور اسے بڑی رغبت سے کھاتے ہیں ۔

فی الحال سات من دودھ روزانہ ہوتا ہے۔ دودھ کی مشینری ایک عظیم الشان عمارت میں واقع ہے، اسی عمارت میں ارباب
ام اور عملے کے خوبصورت، کشادہ اور شفاف فرش والے دفاتر ہیں، بجلی کے ذریعہ سب کام ہوتا ہے، اور مشہور فقرہ "ہاتھ سے
ا نہیں گیا" وہاں صادق آتا ہے۔ سفید اینمیل کی بہت بڑی بڑی ٹنکیوں میں دودھ ڈالا جاتا ہے۔ نلوں کے ذریعہ چھن چھن کر
سری ٹنکیوں میں پہنچتا ہے، وہاں سے منتقل ہو کر گرم ٹنکیوں میں جاتا ہے جہاں اندر کچھ ایسے پر نصب ہیں کہ گرم ہونے کے
ان میں دودھ ہلتا رہے تاکہ اس پر بالائی نہ جمنے پائے نہ اندر بالائی کے ذرّات دودھ سے الگ ہو سکیں اس کے بعد نلوں ہی
توسط سے بالاخانے پر دودھ جاتا ہے اور ریفریجریٹر ٹینکوں میں سرد کیا جاتا ہے، پھر دوسرے کمروں میں منتقل ہو کر یا تو کریم الگ
تی ہے یا ان بوتلوں میں دودھ خود بخود بھر جاتا ہے جو طول طویل پٹے پر قطار در قطار رکھی رہتی ہیں، اور سر بمہر ہو جاتی ہیں۔ اس دودھ
نے میں صفائی کا معقول بندوبست ہے۔ کیا مجال ایک کیڑا ایک مکھی وہاں نظر آئے ۔

قومی لباس

آخر میں ہم پریم پرچارک کے چھوٹے سے دفتر میں واپس آئے۔ ایڈیٹر صاحب نے "کچھ جل پان کئے بغیر جانے نہ دوں گا" کہکر
نے کی قلاقند، برفی، حلوا، اور دال موٹ منگائی اور مسکرا کر فرمانے لگے کہ "لکھنوی نزاکت کی امید نہیں رکھتا ہوں" جس پر ان کے
ے نوجوان معاون مدیر صاحبزادے، اور لکھنؤ کے باشندے ان کے کاتب مسکرانے لگے میں نے کہا آپ اطمینان رکھئے لکھنؤ
رسے جل پور سے بمقابلہ آگرہ نزدیک نہیں ہے۔

اس وقت میں نے ان سے اظہار رائے کیا کہ آپ کے دیال باغ میں ایک بات کی کمی ہے اور امید ہے کہ پوری ہو جائیگی
ہندوستان میں صنعتی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرنے کے درپے ہیں اس لئے قومی لباس کی طرف بھی آپ کا توجہ ہونا چاہیئے آپ کے

دیال باغ میں کم از کم ایک قومی لباس ہونا چاہیئے جو سر دست نہیں ہے۔ وہ پوچھنے لگے کہ قومی لباس کیا ہونا چاہیئے میں نے بتایا کہ ساڑی اور بلاؤز کو ہماری خواتین نے اپنا لیا ہے۔ اور یہ ہر مذہب و ملت کے ہندوستانی گھروں میں برتا جاتا ہے۔ اس لئے عورتوں کا قومی لباس یہی ہونا چاہیئے اور مردوں کے لئے تنگ مُہری کا پاجامہ، شیروانی اور رنگین صافہ قومی لباس بنایا جائے کیونکہ مشرق کی قدیم روایات کے حامل ابھی ہمارے والیان ریاست ہیں اور وہ سب اسی لباس کو پسند کرتے ہیں اور بھلے لگتے ہیں۔ اس لئے یہی ہمارا بھی قومی لباس بننا چاہیئے۔ خود فرنگی ہمیں اس شیروانی اور صافے والے لباس میں دیکھ کر پسند کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب یہ سن کر بہت محظوظ ہوئے اور نہایت پسند کیا پھر یہ وعدہ کیا کہ حسن عزیز کی اس تجویز کو اپنے اخبار پریم پرچارک میں شائع کریں گے اور ساتھ ہی دیال باغ کی مجلس شوریٰ میں پیش کر کے منظور کرائیں گے۔

ان سے رخصت ہونے کے بعد میں تانگے میں اپنے ہوٹل واپس آنے لگا اور جب دیال باغ کی آخری حد نظر آئی پھر نظر سے غائب ہونے لگی تو میں نے کہا:—

"اے دیال باغ! اپنے دل کی سچی عقیدت کے ساتھ میں تمہیں الوداع کہتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو کبھی نہ بھولوں گا۔ کیونکہ ہمارے پسماندہ وطن کی تم لاج رکھ رہے ہو۔"

حسن عزیز جاوید

محبت

محبت کے ترانے گونجتے ہیں کوہساروں میں
محبت نغمہ زن ہے وادیوں میں آبشاروں میں

محبت چاندنی راتوں میں سایوں سے لپٹتی ہے
محبت پردۂ ظلمت میں تاروں سے چمٹتی ہے

محبت تتلیوں کا روپ بھر کر گل کترتی ہے
محبت جگنوؤں کی شکل پا کر رقص کرتی ہے

محبت طفلک بے ارث کی معصوم باتوں میں
محبت شاہد بیدرد کی رنگین گھاتوں میں

محبت کو جہاں کی نعمتوں سے بے نیازی ہے
محبت کے لئے پامال رہنا سرفرازی ہے

محبت ملگجی چادر میں خوش ہو ہو کے سوتی ہے
محبت مخملیں قالین کو اشکوں سے دھوتی ہے

محبت جھونپڑوں میں کیف سے مخمور رہتی ہے
محبت اونچے اونچے مندروں سے دور رہتی ہے

پرشوتم لال ضیاء

ایک سجدہ

سجدہ کرتے ہی جبیں کا داغ لَو دینے لگا
دل میں شوقِ جستجو انگڑائیاں لینے لگا

کالی راتیں جگمگا اُٹھیں سنہرے نور سے
اور منزل کے ہیولے جھلملائے دُور سے

ذہن پر پگڈنڈیوں کے جال لہرانے لگے
ہر طرف چرواہیوں کے گیت بل کھانے لگے

کھیتیوں سے پار۔ مرلی کی صدا آنے لگی
نیم مُردہ ولولوں میں روح دوڑانے لگی

ڈار اِک، کونجوں کی پربت سے کماں بن کر اُڑی
اور "کرلاتی" اُفق کی دھند میں گُم ہوگئی

برق پانی پر مری حیراں کھڑے تھے کوہ و دشت
دم بخود تھیں جھاڑیاں، انگشت بہ لب تھے درخت

اِک بگولا قاب سے اُبھرا، فضا پر چھا گیا
سامنے سے اِک فرشتہ شمع تھامے آگیا

چلبلی آنکھوں سے جھڑتے تھے وہ پُرانوار پھول
جن کو یزداں بھی کرے اپنے لئے ہنس کر قبول

وہ شفق آلود عارض۔ وہ شراب آلود لب
بے اِرادہ لڑکھڑانا۔ مسکرانا بے سبب

وہ پروں پر رنگتیں قوسِ قزح کی جلوہ زن
وہ ملائم گیسوؤں میں بوئے ریحان و سمن

اِس قدر شفاف اُس کی گوری گوری جلد تھی
اک نظر میں مَیں نے اُس کے دل کی دھڑکن دیکھ لی

دِل تھا یا سیماب کا ٹکڑا تھا وقفِ اضطراب
دل تھا یا لہروں کی زد میں ناتواں سا اک حباب

دل تھا یا کچلا ہُوا غنچہ تھا باغِ دہر کا
دل تھا یا بے خانماں باسی تھا اُجڑے شہر کا

دل تھا یا ٹوٹے ہوئے اک آبگینے کا نشاں
دل تھا یا سیپی تھی اِک، آغوشِ دریا میں نہاں

الغرض یہ دل تھا یا بجھتا ہُوا انگارہ تھا
مضطرب تھا۔ چور تھا زخموں سے، پارہ پارہ تھا

میں نے پوچھا: اے ترے قدموں پہ دو عالم نثار
انقلابِ دہر سے کیا تو بھی رہتا ہے دوچار

کیا ترے دل میں بھی چبھتی ہے غم و حرماں کی پھانس
درد کی شدت سے کیا تیری بھی رُک جاتی ہے سانس

کیا تجھے بھی رات کی بیداریوں سے کام ہے؟
تو بھی کیا رونے رُلانے کے لئے بدنام ہے؟

کیا ہے وحشت کا تبسم ترے دل کا اضطراب؟
کس لئے مجموعۂ اضداد ہے تیرا شباب؟"

یوں سنبھل کر وہ مسکرایا درد سے
گر پڑے ہوں جیسے ہر جانب شگوفے زرد سے

اور کہا اُس نے شدتِ احساس سے کانپتے ہوئے ۔۔۔ اے جنوں پر اپنے عقل و آگہی وارے ہوئے

آہ اے بھٹکے ہوئے جذبات کے ناداں اسیر ۔۔۔ تو اگر سمجھے تو تیرا قلب ہے مہرِ منیر

تو اگر دیکھے تو تیرے بس میں ہیں دونوں جہاں ۔۔۔ تو اگر چاہے تو چھو آئے اچک کر آسماں

ہائے کیوں دل کے نگینے کو خزف سمجھا ہے تو ۔۔۔ خاک اڑانے کو ہی انساں کا شرف سمجھا ہے تو

گل کو کیوں کانٹا سمجھ کر محوِ پیچ و تاب ہے ۔۔۔ آنکھ کیوں بےخواب ہے دل کس لئے بےتاب ہے

تو جسے منزل سمجھتا ہے وہ کوئی شے نہیں ۔۔۔ یعنی تیری روح کا نغمہ رہینِ نے نہیں

تو اگر چاہے تو ہر ذرے میں منزل دیکھ لے ۔۔۔ اپنے سینے میں وہ سر دھنتا ہوا دل دیکھ لے

بےخبر اس دل میں پوشیدہ ہے ساری کائنات ۔۔۔ بےخبر اس پر ترے محبوب کا رہتا ہے ہات

اِس کی دھڑکن اُس کے قدموں کی دھمک ہے بےخبر ۔۔۔ اِس کا شعلہ اُس کے عارض کی چمک ہے بےخبر

پوچھتا کیوں ہے تعجب سے مرا نام و نشاں ۔۔۔ کس لئے ٹھنڈی ہوئی جاتی ہیں تیری انگلیاں

مسکراتا ہوں کہ تیرا دل بہت بےتاب ہے ۔۔۔ آنکھ تیری مدتوں سے بےنیازِ خواب ہے

مسکراتا ہوں کہ تیرے زخم کا مرہم ہے یہ ۔۔۔ التہابِ روح کی خاطر خنک شبنم ہے یہ

دیکھتا ہوں وہ جب تیری خیال آرائیاں ۔۔۔ رقص کرتی ہر طرف موہوم سی پرچھائیاں

بےمحل جذبات کی زد میں ترا سنگیں شباب ۔۔۔ اور خیالی دیویوں کی دھن میں تیرا اضطراب

میرے دل میں ہوک اٹھتی ہے۔ لرز جاتا ہوں میں ۔۔۔ شمع لے کر خود ترے دل سے نکل آتا ہوں میں

جانتا ہوں تیری آوارہ مزاجی کا مآل ہے ۔۔۔ جانتا ہوں تیری آنکھوں پر ہیں امیدوں کے جال

جانتا ہوں ہے سفر تیرا تمناؤں کا کھیل ۔۔۔ دیکھتا ہوں ہر طرف ناکامیوں کی ریل پیل

جانتا ہوں یہ، کہ تو معصوم ہے ناداں ہے، ۔۔۔ پھر بھی تجھ کو راہ دکھلانا مرا ایمان ہے

شمع تھامے سر جھکائے یہ کھڑا ہے تیرے پاس ۔۔۔ تجھ کو اک مدت سے جس نورِ مجسم کی ہے آس"

تھرتھرا کر میں نے سجدے سے اٹھایا اپنا سر ۔۔۔ ہر طرف پھیلے ہوئے تھے رات کی دیوی کے پر

اک ستارہ نور کی اک دھار بن کر بہہ گیا

اور دل رکنے کی کوشش میں دھڑکتا رہ گیا

احمد ندیم قاسمی

فلاسفر

آخر اُس گرم سی شام کو میں نے گھر میں کہہ ہی دیا کہ مجھ سے ایسی تپش میں نہیں پڑھا جاتا۔ پھر ایسی گرمیاں بھی نہیں شروع ہوئی تھیں۔ بات کچھ یہ بھی تھی کہ امتحان نزدیک تھا اور تیاری اچھی طرح نہ ہوئی تھی اور یہ ایک قسم کا بہانہ تھا۔ گھر بھر میں صرف مجھے ہی امتحان دینا تھا حامد میاں امتحان سے فرصت ہو چکے تھے کہ اگلے سال دیں گے۔ ننھی عفّت کو خواہ مخواہ زبردستی اگلی جماعت میں چڑھا دیا گیا تھا۔ باقی جو تھے وہ سب کے سب امتحان دے کر پاس فیل ہو چکے تھے ؛

لازمی طور پر میری ناز برداریاں سب سے زیادہ ہوتیں۔ طرح طرح کے ناشتے، منٹ منٹ کے بعد پینے کی سرد چیزیں، اور ادھر اُدھر کے کمروں میں مکمّل خاموشی! بچوں کو ڈرایا جاتا "خبردار جوان سے بات کی ہے تو، خبردار جوان کے کمرے کے نزدیک سے گزرے، خبردار جو یہ کیا۔ جو وہ کیا۔ بھیّا امتحان دے رہے ہیں۔"

اُدھر امتحان کمبخت ایسا عظیم الشان سا تھا کہ کسی طرح کتابیں قابو ہی میں نہ آتی تھیں۔

خیر! تو میں کہہ رہا تھا کہ تنگ آ کر میں نے کہہ ہی دیا کہ مجھ سے یہاں نہیں پڑھا جاتا، مطلب صاف ظاہر تھا کہ پہاڑ پر جاؤں گا۔ کئی دنوں تک گھر میں یہی ذکر ہوتا رہا۔ پہاڑ پر سارا کنبہ جا رہا تھا لیکن ابّا کی چھٹیوں میں ابھی ڈیڑھ دو مہینے باقی تھے اور نائلہ چھٹیاں محض میری وجہ سے لی بھی نہیں جا سکتی تھیں۔ ویسے ابھی پہاڑوں پر جانے کا موسم بھی نہیں آیا تھا۔

آخر ایک دن مجھ سے تیّار ہونے کو کہا گیا۔ ابّا کے کوئی خاں صاحب یا خان بہادر، کی قسم کے عزیز دوست ایک مہینے سے پہاڑ پر جا چکے تھے، وہاں تار دیا گیا اور انہوں نے مجھے بلا لیا۔ گھر میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں میری ہم عمر ایک لڑکی بھی ہے" اس پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ چنانچہ تقریباً سارے گرم سوٹ ڈرائی کلین کرانے کے لئے دے دیئے گئے لیکن دوسرے دن ہی پتہ چلا کہ وہ فلسفہ پڑھتی ہیں اور عینک لگاتی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ! چلو یہ بات بھی ختم ہوئی۔ اب مزے سے پڑھیں گے لیکن عجیب بدمزگی سی پیدا ہو گئی فلسفی لڑکی! اس پر طرّہ یہ کہ عینک لگاتی ہے۔

میں وہاں پہنچا! ایک صاحب مجھے لینے آئے، میری ہی عمر کے ہوں گے بوٹے بھٹی میں بھون لو (؟) لیکن مجھے رقعہ دیا گیا تھا وہ جگہ آٹھ دس میل تھی۔ ساتھ کار لائے تھے۔ ہم نے کار بھیج دی اور کہا کہ مزے مزے سے پیدل چلیں گے۔ راستے میں خوب باتیں ہوئیں۔ پتہ چلا کہ وہ بھی کسی امتحان کے پھیر میں ہیں۔ وہ خان صاحب (یا خان بہادر) کے کچھ چچا کے ماموں کی بھتیجی کی خالہ کے رشتے کے چچا تایا دیماتی (؟) کی قسم کے عزیز تھے۔ کافی دیر حساب لگانے کے بعد پتہ چلا کہ وہ تو رشتے میں کچھ بھائی ہوتے تھے۔ پھر ان فلاسفر

صاحبہ [illegible] اور ہم دونوں سے عمر میں وہ تین سال بڑی تھیں اور فلسفے کی کوئی لمبی سی ڈگری لینے کی اہل تھیں۔
ہمیں چلتے چلتے کافی دیر ہوگئی تھی رفو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولے بس یہ موڑ اور رہ گیا ہے۔
ہمارے سامنے بادل ہی بادل چھائے ہوئے تھے۔ آگے راستہ نظر نہ آتا تھا۔ رفو بولے ایک عجیب بات ہے یہاں ہمیشہ
یا تو بادل ہوتے ہیں یا دھند۔ ابھی ہم دھند میں سے گزر رہے تھے، آہستہ آہستہ دھند صاف ہوئی اور ہم نے آخری موڑ کو طے کیا
ہی تھا کہ ان کی کوٹھی یکلخت سامنے آگئی بس ایک گہرا سا کھڈ تھا بیچ میں لیکن ابھی آدھ میل کا چکر اور تھا ہم نے دیکھا
کہ کوٹھی کے ساتھ ہی باغ میں ایک پتھر پر کوئی خاتون کھڑی تھیں ہم سے بالکل نزدیک۔ لمبا چھریرا قد، لہراتے ہوئے پریشان
بال، ہلکا ہلکا گلابی چہرہ، اور ناک پر کالے فریم کی ایک عینک۔
"یہی ہیں شکیلہ" رفو بولے ——— میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا، انہوں نے سر کی جنبش
سے جواب دیا۔ اتنی بری نہیں تھیں جتنا میں تصور کئے بیٹھا تھا، اگر وہ موٹی سی عینک نہ ہوتی تو شاید حسین کہہ سکتے تھے، یا
کم از کم وہ بھدا سا سیاہ فریم نہ ہوتا۔
میں کنبے میں بہت جلد گھل مل گیا۔ رفو اور میں تو بالکل بے تکلف ہو گئے لیکن شکیلہ تھیں کہ لی نہ پڑتی تھیں نہ کبھی ہماری
باتوں میں دلچسپی لیتیں نہ کبھی شریک ہوتیں، ہم دونوں ان کے سامنے بہتیرے ٹامک ٹوئیے مارتے، اوٹ پٹانگ باتیں کرتے خوشامدیں
کرتے، لیکن ان کی ناک ہمیشہ چڑھی رہتی۔
اور ان کا کام کیا تھا۔ صبح سے شام تک دس دس پندرہ پندرہ سیر کی کتابیں پڑھ رہی ہیں۔ رات کو انگیٹھی کے سامنے
بیٹھی سوچ رہی ہیں۔ اتنی سنجیدگی سے جیسے دنیا کے نظام کا دار و مدار ان ہی کے سوچ بچار پر ہے، کبھی انگلیوں سے ہوا میں
لکھنے لگتی ہیں، کبھی کرسی پر طبلہ بجنے لگتا ہے، کبھی جھنجھلا جھنجھلا پڑتی ہیں، پھر یکلخت ایک مسکراہٹ لبوں پر دوڑ جاتی ہے
اور سر ہلنے لگتا ہے جیسے سب کچھ سمجھ میں آگیا دفعتہ مٹھیاں بھینچ لی جاتی ہیں اور غریب صوفے کو دو تین مکے رسید کئے
جاتے ہیں۔ ادھر ہم انہیں دیکھ کر جھنجھلا اٹھتے۔ یہ تو نیم پاگل ہیں بالکل!
خان صاحب (یا خان بہادر) اور بیگم صاحبہ کا تو معاملہ ہی اور تھا۔ وہ باتیں سیاسیات، معاشیات، فسادیات، اور
نہ جانے کیا کیا "یات" کی کرتے، جن میں ہمیں ذرہ بھر دلچسپی نہ ہوتی۔ باقی تھے نوکر وہ پہلے ہی احمق تھے یا خاص طور پر احمق
بنائے گئے تھے۔ اب بھلا ہم کس سے باتیں کرتے۔ لے دے کر یہی ایک ہم عمر تھیں۔ ویسے تھیں کچھ بڑی ہی بہی بے حد
تنہائی پسند اور خشک مزاج واقع ہوئی تھیں اور ماشاء اللہ اپنی ہی دنیا میں بستی تھیں۔
کبھی شکیلہ سے کہا "ہمارے ساتھ بیڈ منٹن کھیل لیجئے" جواب ملا "عینک ہے" عینک پر چوٹ لگے گی۔"
کہا "نہیں ہم نہیں لگنے دیں گے، شاٹ نہیں ماریں گے، بس اچھال اچھال کر کھیلیں گے۔"

کھیلنے لگیں تو پھر وہ کھیل ہی کیا ہوا جو بے دلی سے کھیلا جائے۔ ویسے آپ دونوں تو سنگل بھی کھیل سکتے ہیں بھلا میں [illegible] کیا کروں گی؟"۔

پھر کسی دن خوشامد کے لہجے میں کہا "ہمارے ساتھ سیر کو چلئے" ——— بولیں "ابھی تو مجھے فرصت نہیں۔ بالکل فرصت نہیں۔ جب تک میں یہ تھیوری نہیں سمجھ لیتی"

پُوچھا "تو کب تک سمجھ لیں گی آپ یہ تھیوری"؟ ——— جواب ملا "کیا پتہ۔ شاید پانچ منٹ میں سمجھ لوں اور سمجھ میں نہ آئے تو مہینے تک نہ آئے"۔

اور جو کسی دن بہت خوش ہوئیں تو بولیں "بس ابھی چلتے ہیں سیر کو۔ ذرا بچوں سے کہہ دیجئے کہ تیار ہو جائیں"۔
بچوں کے نام پر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اور بات یہیں ختم ہو جاتی۔ اور عموماً میں اور رفو دونوں ہی سیر کو جایا کرتے۔
کچھ دنوں تک تو یونہی ہوتا رہا۔ پھر ایک دن ہم نے تنگ آکر بغاوت کر دی، آخر کیوں نہیں شریک ہوتیں یہ ہمارے ساتھ۔ جب ایک ہم عمر موجود ہیں تو پھر ہم اُن کی شرکت سے کیوں محروم کئے جائیں۔ آئیں بڑی فلاسفر کہیں سے ہمارے پروگرام کا ستیاناس کر رکھا ہے۔

پہلے تو طے ہوا کہ ایک رات چپکے سے ان کی ساری کتابیں جلا دی جائیں یا کسی ندی میں پھینک دی جائیں، لیکن پھر سوچا کہ دو تین روز تک اور کتابیں آجائیں گی، کافی دیر کے سوچ بچار کے بعد ایک تجویز رفو کے دماغ میں آئی۔ بولے "تو تمہیں سزا ہی دینا ہے نہ انہیں؟ ——— یقیناً!" میں نے سر ہلا کر کہا۔

"تو کیوں نہ ان سے محبّت کی جائے!" وہ میرے کان میں بولے۔

آہا ہا ہا! ——— میں چونک پڑا۔ کتنی اچھی تجویز تھی۔ محبت کے آگے تو بھوت بھی ناچتے ہیں یہ تو ہیں محض فلاسفر! ہم دونوں نے ہاتھ ملائے۔ یہ بہترین تجویز تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ محبت کون کرے؟ ہم میں سے کوئی بھی اس ذمّہ داری کو سر لینا نہیں چاہتا تھا۔ ایسی ویسی محبت ہوتی تو کر بھی لیتے۔ فلاسفر سے محبت کرنا تھی۔ معاملہ خطرناک تھا۔

میں نے رفو سے بڑی عاجزی سے کہا "بھئی اب تم ہی کرلو" کیونکہ وہ ذرا دُبلے پتلے سے تھے اور ان کی صحت محبت کرنے کے لئے بہترین تھی۔ وہ قریب قریب گڑگڑا کر بولے "نہیں بھئی! مجھے تو معاف ہی کردو تو بہتر ہوگا، اول تو میں نے ابھی تک کچھ پڑھا نہیں اور دوسرے یہ کہ مجھے کچھ زکام سا رہتا ہے ہر وقت۔ پھر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے عینک سے بھی ڈر لگتا ہے"!

میں نے بھی بڑے بڑے بہانے پیش کئے۔ مگر ایک نہ چلی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ میں اسی اتوار سے محبّت شروع کردوں۔ پروگرام مکمل بنائے جائیں۔ اور ریہرسل بھی باقاعدہ کئے جائیں۔

... چھوٹا سا رومانی افسانہ ٹھیک ٹھیک آنے لگا۔ پہلے تو وہ سنتی ہی رہیں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے مجھے دس منٹ دیے
میں نے افسانہ شروع کیا کہ کس طرح چلتی ریل میں سے ایک لڑکی دریا میں گر پڑی جو پیچھے بہہ رہا تھا۔ پل کے نیچے ہیرو نے جو کشتی چلا رہا تھا اور
خوبصورت نوجوان بھی تھا اور کرکٹ کا زبردست کھلاڑی تھا۔ لپک کر لڑکی کو کرکٹ کی گیند کی طرح کیچ کر لیا۔ اور چیخ کر بولا "ہاؤ زدا"
ریل کے گارڈ نے جو خوش قسمتی سے یہ سارا کھیل دیکھ رہا تھا، امپائر کی طرح انگلی اٹھائی اور چلا کر کہا۔ "آؤٹ!" ۔ پھر ہیرو اور ہیروئن
کی آنکھیں چار ہوئیں ۔!

"آنکھیں چار ہوئیں ۔!" انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"جی نہیں! معاف کیجئے ۔ آنکھیں چھ ہوئیں۔ (میں نے ان کی عینک کی طرف اشارہ کرکے کہا ۔ اور اگر ہیرو نے بھی کہیں
سیاہ چشمہ لگا رکھا ہو تو ۔ تو پھر آنکھیں آٹھ ہوئیں (میری ناک پر سیاہ چشمہ رکھا تھا) ۔ اور نگاہیں شیشوں کو آر پار کرکے ایک دوسرے
میں الجھ گئیں ۔ اور ۔!" "بھئی تم تو یونہی فضول باتیں کرتے ہو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں "جاؤ ہم نہیں سنتے!"

سہ پہر کو وہ کوٹھی کے پرے ایک چھوٹے سے جھرنے کے پاس بیٹھی فلاسفی کی ایک فربہ اور تندرست کتاب پڑھ رہی تھیں
عینک اتار رکھی تھی۔ میں بھی ایک مریل سی کتاب لے کر پاس بیٹھ گیا۔ وہ بدستور چپ بیٹھی رہیں۔

جلدی سے میں نے ایک دور کی ننھی سی جھیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آہاہا! کیا نظارہ ہے! جھیل کا پانی یوں
چمک رہا ہے۔ جیسے چاندی کا ۔ یعنی چاندی کا ۔ چاندی کا شیشہ! اور اس پر پیاری پیاری اجلی مرغابیوں کا عکس کیسا بھلا

"کیا۔؟" انہوں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا ۔ عینک کے لئے، جو غالباً وہاں نہ تھی۔

"آہاہا ۔ ہاہا!" میں نے پھر کہا۔

"تو خوبصورت نظارہ ہے ۔ اچھا ۔ (وہ کوٹ کی جیبیں تلاش کر رہی تھیں) ۔ ابھی دیکھتی ہوں ۔ یہ کمبخت عینک
مر گئی ۔ تو گویا مرغابیاں بھی ہیں ۔ اچھا ۔!"

وہ بدستور عینک ڈھونڈ رہی تھیں ۔ "ارے! وہاں رہ گئی ۔!" انہوں نے ایک دور پڑے ہوئے پتھر
اشارہ کیا "ذرا لا دیجئے گا وہاں سے عینک ۔!"

میں عینک لے آیا۔ انہوں نے صاف کرکے لگائی۔ "بہت خوب! ۔ بہت اچھا نظارہ ہے! ۔ لیکن وہ مرغابیاں کہاں"
"بھلا وہ آپ کی عینک کا انتظار کرتیں۔ کبھی کی اڑ گئیں ۔!" ۔ دراصل وہاں مرغابیاں تھیں ہی نہیں
"اچھا تو اڑ گئیں ۔ پھر دیکھ لیں گے کبھی ۔!" انہوں نے پھر پڑھنا شروع کر دیا۔

اگلے روز شام کو میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "ذرا آج میرے ساتھ سیر کو چلئے ۔!"
بولیں "کیوں آج کوئی خاص بات ہے؟"

[illegible]
ہیں یہ وہ اس طرف [illegible] کرتے ہیں ... ایک نیا راستہ دیکھا ہے جو پہاڑ کی دوسری طرف لہراتا ہوا اترتا ہے ... وہاں [illegible]
[illegible] کیا کہنا۔ وہاں چلیں گے۔"
"بھئی! ایک تو تمہارے ان دلفریب نظاروں نے تنگ کر دیا۔ خیر! ... وہ سوچنے لگیں ہو گویا نیا راستہ ہے۔ نظارے بھی
... اور وہ بھی دلفریب ... اچھا ... چلتے ہیں۔" ... اب اگلا سوال اُن کا پچوں کے متعلق ہوتا میں نے
... سے پیش بندی کر دی۔ پتہ نہیں یہ بچے کہاں چلے گئے ... بڑی دیر تلاش کی لیکن ایک بھی تو نہیں ملا۔"
اسی دوپہر کو میں نے اُن کی عینک کہیں چھپا دی تھی چنانچہ وہ بغیر عینک کے تھیں۔ جو راستہ پہاڑ کے دوسری طرف اُترتا
... بالکل خشک اور فضول سا تھا ہم دونوں کالے کالے پتھروں اور اُلجھے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ میں سے گزر رہے تھے
دیکھئے تو ... کیسے رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں ... اور پھر تختے کے تختے دُور تک پھیلتے چلے گئے ہیں ... جیسے قالین بچھے
... میں نے چند اُکھڑے ہوئے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔
"کہاں ہیں؟ اُس طرف ... ہاں! ... بڑے پیارے پھول ہیں! ... اتنا تو مجھے عینک کے بغیر بھی نظر آ جاتا ہے۔" وہ اپنی
... کی چھپا رہی تھیں۔
"اور یہ اس طرف تو آپ نے دیکھا ہی نہیں ... اس وقت کیمرہ ہوتا تو تصویر لیتے ... ایک پتلی سی جھلمل جھلمل کرتی ہوئی آبشار ہے
... کی بوندیں موتیوں جیسے چمکیلے قطرے پتھروں پر ناچ رہے ہیں۔" میں نے ایک بھدے سے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"واقعی بہت ہی پیاری آبشار ہے ... اور آواز بھی تو بڑی مدّھم اور بھلی ہے۔" ... یہ آواز انہوں نے خواہ مخواہ سننا
... شروع کر دی۔ "اوہ ... آہیں" جیسے چونک کر بولا "یہ قوسِ قزح! ... یہ قوسِ قزح اس پہاڑی سے اُس پہاڑی تک چلی گئی ہے ... ایک
... سا پُل بن گیا ہے ...!" "اور پھر رنگ کیسے نمایاں ہیں۔ خاص کر سبز رنگ! کل میں ضرور یہاں عینک لگا کر آؤں گی۔ تاکہ ذرا اچھی طرح
... نہیں۔ بس یونہی عینک لگاؤں گی ... اور اگر نہ بھی لگاؤں تو کون سا فرق پڑتا ہے۔ ویسے دیکھنے کو تو مجھے اب بھی سب کچھ نظر
آتا ہے ...!"
دوسرے روز وہ اکیلی عینک لگا کر اُسی راستے سے گئیں جب واپس آئیں تو بُرا سا منہ بنا ہوا تھا اور مجھ سے اگلے
... بات ... کی صلح آئی جس دن مجھے محبت شروع کرنا تھی سارا دن موقع ہی نہ ملا۔ رات ہوئی اور چاندنی کھلی پہاڑوں
... ان کے کمرے میں گیا۔ کچھ دیر تمہید باندھی۔ چاندنی رات کے رومانی فضا کی تعریفیں کیں، فوائد بتلائے پھر
کاش آپ اس وقت میرے ساتھ سیر کو چلتیں ...!"
وہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر پنسل سے ناک کھجا کر بولیں "آپ نے ایک بے معنی سی بات کہی ہے ... بالکل بے معنی ... [illegible] ... ہیں وہ
... میرا ... ساتھ ... اگر میسر نہیں ... ہے تو اکیلے پھرنا بہتر ہو گا کیونکہ جہاں تک چاندنی رات کی لطافت اور رومانیت

[illegible] نہیں۔ اگر میں ساتھ ہوتی تو آپ کبھی مجھ سے باتیں کر سکتے [illegible]
کہ آپ مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں تو [illegible] منٹ سے زیادہ فالتو وقت نہیں۔ اس دوران میں آپ [illegible]
کر لیجئے۔ اور پھر خواہ چاندنی میں پھریئے یا اندھیرے میں ۔۔!

میں منہ بنائے چلا آیا ۔۔ بسم اللہ ہی غلط نکلی ۔

پھر ایک دفعہ میں نے ان کی انگلیاں چھو کر کہا "کتنی پیاری انگلیاں ہیں ؟"

"آپ کا فقرہ سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ انگلیاں ہیں ہی پیاری، یا صرف آپ کو پیاری لگتی ہیں ۔۔؟" انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد کہا۔ "مجھے پیاری لگتی ہیں!" میں ذرا سہم کر بولا ۔

"بھلا پیارا لگنے کی بات ہی کون سی ہے، ایک لمبی سی پتلی چیز، اوپر معمولی کھال، نیچے گوشت اور ہڈی۔ بس اسی قسم کی بالکل یہی بناوٹ کی انگلیاں آپ کو ہر ایک کی ملیں گی۔ آپ کی انگلیاں بھی ایسی ہی ہیں۔ آپ انہیں بھی تو پیار کر سکتے ہیں۔۔!"

میں جھنجھلا اٹھا۔ بات بات میں فلسفہ! کیا مصیبت ہے؟ رفو سے مشورہ لیا گیا وہ بولے "گھبرانے کی کوئی بات نہیں آج ایک چھوٹی سی تقریر بناؤں گا، تم اس کی ریہرسل کر لینا میں تمہیں خوب مشق کرا دوں گا۔ میں کالج میں خطاب کرتا رہا ہوں!"

پورا ایک دن اسی ریہرسل میں ضائع ہو گیا۔

میں نے انہیں باغ میں جا پکڑا۔ وہ بدستور اکیلی بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کتاب بند کر دی اور گھور دیکھنے لگیں۔ گویا کہتی تھیں کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کرو گے اب ۔ ۔۔۔۔۔ میں نے تقریر شروع کر دی کہ کس طرح کوئی کسی کے دل میں آ کر بس جاتا ہے اور پھر نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ہر دم اُسی کا خیال ستانے لگتا ہے ۔

"خوب! تو یوں بھی ہو جاتا ہے کبھی ۔؟" وہ مسکرا کر بولیں ۔

"جی ہاں! کئی مرتبہ ہوا۔ ہوتا رہا ہے۔ ہوا کرتا ہے۔ اور۔۔ اور ابھی ہوا بھی ہے۔!"

"مثلاً۔۔۔!"

"مثلاً یہی کہ مجھے۔ دلیری کر۔ یعنی میرے دل میں ہر وقت آپ کا خیال رہتا ہے ۔!" میں جرأت کر کے کہہ ہی گیا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا وہ بدستور مسکرا رہی تھیں ۔

"غلط! بالکل غلط! دل میں کسی کا خیال رہ ہی نہیں سکتا۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ اعصابی نظام کے ذریعے دماغ میں جاتا ہے جب ہم سوچتے ہیں تو دماغ ہی میں سوچتے ہیں۔ دل کا سوچنے سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ دل میں خیال وہاں بسنے کی جگہ ہے۔ وہاں تو بمشکل خون رہ سکتا ہے ۔!"

"اچھا تو یوں سہی۔ کہ دماغ میں ہر وقت آپ کا خیال رہتا ہے!" ۔۔۔ میں نے [illegible] کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو یہ آپ کی دماغی کمزوری ہے کہ ایک معمولی سی چیز کا اخراج دماغ کے مختلف حصوں پر اس قدر حاوی ہو جائے
سی وقت پیچھا نہ چھوڑے ـ!"

"کمزوری ہی سہی ـ لیکن مجھے ہر وقت" ـ

"آپ ہر وقت، نہیں استعمال کر سکتے ـ کیونکہ جب آپ سوتے ہونگے تو یقیناً بھول جاتے ہونگے، لہٰذا آپ نیند کے
لمحوں کو چوبیس گھنٹے سے نکال کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے اتنے گھنٹے آپ کا خیال رہتا ہے ـ مگر یہ بھی اُسی صورت میں ہو سکتا ہے
ب آپ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ایک ہی بات سوچتے رہیں!"

"خیر کچھ بھی ہو ـ!" میں نے جھلا کر کہا (میں تقریر کے الفاظ بھولتا جا رہا تھا)، "میں سوچتا ہوں، خواہ دل میں سوچوں، یا پھر لو
یں یا جگر میں، دن بھر سوچوں یا رات بھر ـ مگر میں سوچتا ہوں اور خوب سوچوں گا، کبھی باز نہیں آؤں گا۔ آپ کی فلاسفی مجھے
تاثر نہیں کر سکتی ـ میں آپ کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں ـ اگر آپ چاہیں تو میں نہ جانے کیا کیا کر بیٹھوں ـ (میں پھر بھول گیا) ـ
آپ چاہیں تو میں سر کے بل اس ندی میں چھلانگ لگا دوں ـ اور (پر جوش لہجے میں) آپ چاہیں تو یہ بھاری پتھر وہاں رکھ آؤں ـ
اور ذرا بلند آواز سے، اگر آپ کہیں تو میں اس پودے کو جڑ سے اکھیڑ دوں ـ اور ـ!"

"پھر آپ کی دماغی کمزوری ظاہر ہو رہی ہے ـ بھلا مجھے کیا پڑی جو درخت اُکھڑواتی پھروں یا پتھروں کو اُن کی جگہ
سے ہلواؤں، ایسے خیالات محض آپ کے دماغ کا اختراع ہیں اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات تندرست دماغ میں کبھی نہیں آ سکتے" ـ

انہوں نے اپنی عینک اُتار دی اور صاف کرنے لگیں ـ میں تقریباً ساری تقریر بھول چکا تھا ـ یکایک مجھے ایک دورہ سا اٹھا ـ
"دیکھئے اگر آپ چاہیں تو میں پل بھر میں عینک کے دونوں شیشے صاف کر دوں، یا اس عینک کو توڑ کر ایک نئی عینک لا دوں"
"چچ ـ چچ ـ اُفوہ! دماغی کمزوری کے مزید ثبوت مل رہے ہیں، عینک کے شیشے صاف کرنا ایک معمولی سا کام ہے ـ
ور پھر ایک ثابت چیز کو ضائع کر کے ویسی ہی نئی لانے میں کہاں کی عقلمندی ہے، یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اس
وقت آپ کے دماغ میں کسی عجیب جذبے کے ماتحت عجیب خیالات کا عجیب طوفان بپا ہے"

اور میں نے رو کے سے آکر کہہ دیا کہ بھئی مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا ـ قیامت تک نہیں ہو سکتا ـ بات بات میں مین میخ نکلتی ہے
یک ایک فقرے کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے ـ بات کچھ کرنے جاؤ اور سن کے آؤ کچھ! میں ان فلاسفر صاحبہ سے کبھی نہیں جیت سکتا ـ
مگر رفو صاحب کہہ رہے تھے "گھبراؤ مت! آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا" ایک تو ان کی اس آہستہ آہستہ نے
[illegible] جب جا کر شکایت کرو ـ یہی جواب ملتا کہ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا ـ دراصل ناامید وہ بھی ہو چلے تھے ـ
[illegible] بار مجبور کرنے پر میں ہر روز دو چار باتیں شکیلہ سے ایسی کر جاتا جن پر مجھے دیر تک فلسفہ [illegible] ـ مگر
[illegible] بال بے سنوارے جاتے تھے، کپڑوں کا خاص خیال رکھا جاتا ـ عینک [illegible]

[illegible] کی ان بہروں میں کمی آگئی تھی جن سے ان کے چہرے کی خوبصورتی میں کوئی فرق پڑتا تھا۔ ایک بات مجھے رفو [illegible] کہ اب ان کے لباس کا رنگ عموماً میرے سوٹوں کے رنگ کے مطابق ہوتا مگر ان کی باتیں بدستور ویسی ہی تھیں۔

"آخر ایک دن میں نے پھر ہمت کی اور سر پر کفن باندھ کر اظہارِ محبت کے لئے تیار ہو گیا، جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ ایک آدھ تھپڑ پڑ جائے گا۔" بڑی محنت اور مختلف کتابوں کی مدد سے ایک رومانی تقریر تیار کی گئی۔ کئی دفعہ اس کی ریہرسل کرنے کے بعد میں آخری حملے کے لئے تیار ہو گیا۔ اظہار کے لئے شام کا طرب وقت چنا گیا جب شفق سے سارا آسمان جگمگا رہا ہو اور ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوا کے جھونکوں سے شکیلہ کے بال لہرا رہے ہوں۔

پہلے دن تو شام کو بارش ہو گئی۔ اس لئے سب کچھ ملتوی کرنا پڑا۔ دوسرے دن صبح سے رفو نے مجھے طرح طرح کی چیزیں لا کر دیں۔ میں پیتے پیتے تنگ آ گیا، ہارلکس کا دودھ۔ سیناٹوجن۔ بادی رول۔ لوہے کا ٹانک۔ چند چمچے مچھلی کا تیل۔ دوپہر کو ماء اللحم پلایا گیا۔ سارا دن وہ مجھے تسلی دیتے رہے کہ شاباش گھبرانا مت، معمولی سی بات ہے اور پھر کوئی روز روز تھوڑا ہی ہو گی۔ خیر شام ہوئی۔ میں نے شکیلہ کو حسبِ معمول باغ میں ایک پتھر پر بیٹھے پایا۔ بغیر کسی تمہید کے میں نے تقریر شروع کر دی۔

"آج کی باتیں شاید آپ کو بری لگیں۔ اگر لگتی ہیں تو لگا کریں۔ لیکن میں کہوں گا۔ ضرور کہوں گا۔" میں ایک گھٹنے کے بل جھکا اور ایک ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"آپ نہیں جانتیں کہ میری زندگی کس قدر اداس اور تنہا ہے۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ جیسے کہتی ہوں کہ نہیں جانتی۔ "میں اندھیرے میں بھٹکتا رہا ہوں۔ میں نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ لیکن اب زندگی کے اس بے پایاں سمندر میں میری تنہا کشتی کا کوئی بادبان بن گیا۔ تاریک افق پر ایک روشن ستارہ طلوع ہوا۔ اور۔۔ آ۔"

"یہ تو واقعی بڑی خوشی کی بات ہے۔" وہ پنسل کو بالوں میں پھیرتے ہوئے بولیں۔

"اور۔ اور میرے مرجھائے ہوئے پژمردہ دل میں۔"

"غالباً مرجھائے ہوئے اور پژمردہ کا ایک ہی مطلب ہے۔ ہے نا؟ بہتر ہوتا اگر آپ ان میں سے ایک ہی استعمال کرتے۔"

"اچھا! چلئے پژمردہ ہی۔ تو میرے پژمردہ دل میں پھر زندہ رہنے کی تمنا پیدا ہوئی۔"

"یہ کب کا ذکر ہے؟"

"ابھی کا ذکر ہے۔ حال ہی کا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یاد کئے ہوئے فقرے نہ بھول جاؤں، [illegible] جیسے کسی نے میرا انتقام لیا ہو۔

"یہ آپ کس سے کہہ رہے ہیں؟ — آپ نے نیا مضمون لکھا ہے کیا؟"

"آپ سے کہہ رہا ہوں۔ لاحول ولا قوۃ! آپ سنتی رہیے۔ ٹوکیے مت — ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"جیسے آپ نے کسی کا ہاتھ تھام لیا ہے۔" انہوں نے لقمہ دیا۔

"شکریہ! — میں نے نہیں بلکہ کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے — اور میں بھٹکتے بھٹکتے پھر راستے پر آگیا ہوں —"

"لیکن جہاں آپ بھٹک رہے تھے اُسے بھی تو ہم راستہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ راستہ وہ جگہ ہے جہاں سے گزرا جائے۔ بھٹکنے وٹکنے کی کوئی شرط نہیں ہے بیچ میں — آپ کا فقرہ غلط ہے۔ اسے یوں کہئے کہ آپ بھٹکتے بھٹکتے راہِ راست پر آگئے ہیں —"

"خیر! یوں سہی — میں راہِ راست پر آگیا ہوں۔ اور اب میری زندگی —"

"مگر وہ ہے کون جس نے یہ سب حرکتیں آپ کے ساتھ کی ہیں؟"

"نہیں بتاتے —" میں نے بچوں کی طرح منہ بنا کر کہا۔

"ہم تو ضرور سنیں گے کہ وہ کون ہے!" وہ بولیں۔

"وہ کون ہیں؟ — آپ سچ مچ نہیں جانتیں کیا؟ وہ یہاں ہیں" میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ دیا، "— یہاں بستی ہیں نہیں نہیں، میرا مطلب ہے وہ (سر پکڑ کر) یہاں بستی ہیں —"

"جبھی کچھ اتا پتا بھی تو معلوم ہو اُن کا —"

میں گھبرا گیا۔ میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ حلق خشک تھا۔ میں نے سو گز کی دوڑ لگانے کی تیاری کی اور چھلانگ لگاتے ہوئے بولا۔ "وہ — آپ — ہیں —" اور قلانچ مار کر بھاگا۔ کچھ دور جا کر مجھے چند الفاظ یاد آگئے جنہیں میں بھول گیا تھا۔ میں بھاگتے بھاگتے رک گیا اور پیچھے مڑ کر زور سے بولا۔ "ذرا سن لیجئے — آپ بالکل شگفتہ درخت — نہیں نہیں شگفتہ پودے کی طرح لگتی ہیں — آپ کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح ہے — اور —" میں آگے بھول گیا۔

واپس آتے ہی میرے سر میں سخت درد شروع ہو گیا۔ نہ جانے دن میں رقّو نے کیا کیا الا بلا کھلا دی تھی۔ اس کا نتیجہ نکلا سات شدید درد تھا کہ کمبخت اسپرین وغیرہ سے بھی قابو میں نہ آیا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ سب کے سب میری خرابی کی کسک بیا چکے تھے۔ رقّو میاں کو اُن کے کسی دوست نے باہر مدعو کر رکھا تھا اور وہ وہیں تھے۔ میں کمرے میں اکیلا لیٹا کھڑکی میں سے پہاڑ کی چوٹی کو دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے اُجلی اُجلی روشنی اس بات کی غماز تھی کہ ابھی ابھی چاند نکلنے کا [illegible] ایک جھونکا آیا اور [illegible] کی سرسراہٹ سنائی دی۔ ایک خوبصورت [illegible] [illegible] [illegible] شروع ہو گیا — اب [illegible] میں نے [illegible]

لیکن وہ بیٹھی نہیں پیچھے سے میرے سرہانے بیٹھ گئیں اور ملائم ہاتھوں سے میرے سر کو آہستہ آہستہ دبانے لگیں میں نے سوچا تھی یا شاید بیماری ہو یہی ملائم ہاتھ ذرا سی دیر میں کانوں تک پہنچا چاہتے ہیں۔ مذرا؟ ناکہ کھولی اور شامت آجائے گی۔

اُنہوں نے میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور بولیں "کیا واقعی بہت درد ہے؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ گویا نگاہوں ہی نگاہوں میں پوچھ رہا تھا کہ "کہیں خفا تو نہیں ہوئیں آپ؟"

وہ مسکرا کر بولیں۔ "خیر پھر کبھی سہی۔ اب جگنو شرارتوں کے نتیجے!" ــــــــ میں نے پھر سہمے سہمے دیکھا دراصل مجھے اعتبار اب بھی نہ آیا تھا۔ انہوں نے چپکے سے میری اُنگلی میں کچھ پہنا دیا۔ ایک سنہری انگوٹھی ہلکی پھلکی سی!۔

میں چونک پڑا۔

"مگر ــ یہ انگوٹھی ــ ذرا وہ ــ دیکھئے نا ــ!" میں انہیں واپس دینے لگا۔

"چپ!" وہ میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولیں "جب سر میں درد ہو تو بولا نہیں کرتے۔"

میں چپ ہو گیا۔ وہ بدستور بیٹھی میرا سر دبا رہی تھیں۔ چاند نکل آیا تھا، کچھ شعاعیں کھڑکی میں سے گزرتی ہوئی اُن کے چہرے سے کھیلنے لگیں۔ اُن کا چہرہ جگمگانے لگا۔ میں نے کن آنکھیوں سے دیکھا، اُن کی بڑی بڑی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ سفیشوں کا چمکارا ہوگا! میں نے دل میں سوچا اور جب وہ شب بخیر کہہ کر چلی گئیں تو دفعتہً مجھے یوں لگا جیسے سر کا درد جو کچھ دیر کے لئے غائب ہو چکا تھا پھر سے شروع ہو گیا۔ دیر تک میں انگوٹھی کے سفید جگمگاتے ہوئے نگ کو دیکھتا رہا۔

اگلے روز صبح صبح گھر سے تار آ گیا۔ ایک مہربان پروفیسر صاحب نے مجھے دو ہفتے پہلے ہی واپس آنے کی تاکید کی تھی ــ امتحان کی مدد کے لئے نہایت ضروری کام تھا۔ شام تک تیاری کرنا پڑی۔ دوسرے دن علی الصباح جانا تھا۔

اگلی صبح میں اور رفو پیدل جا رہے تھے۔ نیچے اُترتی ہوئی سڑک مُڑتی تڑتی شکیلہ کی کوٹھی کے بالکل پاس سے گزرتی تھی۔ ابھی ہم اُس موڑ سے ذرا دور تھے جہاں سے اُن کا باغ بالکل سامنے آ جاتا تھا۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں میری ان لگاتار حماقتوں پر وہ بُرا نہ مان گئی ہوں۔ مگر اُن کے پتھریلے فلسفی دل پر کیا اثر ہوا ہوگا؟ لیکن وہ بغیر فریم کی عینک! ــ میرے سوالوں سے ہر رنگ ملبوس! ــ اور یہ انگوٹھی! ــ کیا ان کا مطلب کچھ نہیں؟ نہیں غالباً کوئی مطلب نہیں! اور پھر میں ہی کون سا سچ مچ کہا کرتا، جو رفو بتاتے وہی کہہ دیتا۔ یونہی تفریح تھی۔ اچھا خاصا وقت گزر گیا۔

"بھئی ہم دونوں عجب احمق بنے رہے۔" رفو بولے "مجھے تو ہر دم یہی ڈر رہا کرتا کہ کہیں تمہیں دھکا نہ دیا جائے۔ بعض لمحات تو ہم نے بہت زیادتی کی ــ!"

میں چونک پڑا — "ایں! — کیا؟"

"اور پھر جس دن تم نے وہ اظہارِ محبت والا ریہرسل کیا، اُس دن تو میں بہت ڈرا۔ یہ فلاسفی بھی عجیب مصیبت ہے — اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو یا تو اچھی طرح تمہارے کان کھینچتی یا تم سے محبت کرنے لگتی۔ — لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا — !
بس خیریت یہی رہی کہ کان نہیں مروڑے گئے، ورنہ وقت بڑا ہی گزرتا —!" میں بولا۔

"مگر پھر بھی — کچھ اندیشہ سا ہے میرے دل میں" وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "اگر انہیں تم سے محبت ہو گئی ہو — تو —؟"

"ہشت! محبت اور نہیں! — لاحول ولا قوۃ! — بھلا فلاسفر بھی محبت کرتے ہیں کہیں؟ — اور پھر عینک والی کا فر!"

ہم دونوں ہنس دیئے۔ انہوں نے جیب سے اخبار نکالا اور پڑھنے لگے۔

ہم دونوں اُسی موڑ سے گزر رہے تھے۔ ہمارے سامنے اُن کا باغ تھا۔ بالکل نزدیک — بس بیچ میں ایک کھڈ تھا!
یکایک میری نگاہ سامنے کے پتھر پر گئی جہاں شکیلہ کھڑی تھی۔ سبزی مائل ملبوس میں (میں بھی سبز سوٹ پہنے ہوئے تھا)، بالکل ایک شاداب پودے کی طرح لگ رہی تھیں، اُن کا گلابی چہرہ پھول کی طرح چمک رہا تھا۔ بغیر فریم کی عینک کے اِن سے دو بڑی بڑی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کتنی اچھی دکھائی دے رہی تھیں۔

نقوی بدستور اخبار میں مصروف تھے۔ میں نے شکیلہ کو سلام کیا۔ انہوں نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ نہ جانے اُن کے چہرہ پر اتنی افسردگی کیوں تھی۔ — میں نے دیکھا کہ شیشوں کے پیچھے اُن کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔
کہیں یہ آنسو تو نہیں؟ — نہیں! — ویسے ہی شیشوں کا چمکارا ہوگا — یونہی دھوکا ہوا — لیکن یہ دھوکا نہیں تھا۔ دیکھتے دیکھتے موتی جیسے قطرے اُن کی پلکوں سے پھسل کر رخساروں پر بہنے لگے۔

اب ہم موڑ کو طے کر رہے تھے — دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ دو چار اُجلے اُجلے بادلوں کے ٹکڑے ہماری طرف بھاگے آ رہے تھے۔ میں شکیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے آنسو پونچھے نہیں یونہی رہنے دیئے۔ دھند بڑھتی گئی۔ بادل کے ٹکڑے ہمارے سامنے آ گئے اور سب کچھ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

"کیا تھا —؟" نقوی چونک کر بولے۔

"کچھ نہیں —!" میں نے یونہی جواب دیا۔

پھر راستے میں ہم نے ایک قوسِ قزح دیکھی جو نیچے وادی میں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک چلی گئی تھی۔ بادلوں کی شعاعیں جھلکنے لگیں۔ اور قوسِ قزح میں بے شمار پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ ہم ایک آبشار کے پاس سے گزرے جس کا پانی ... تک پھیل رہا تھا۔ پتھر پر ہم نے ننھے ننھے قطرے دیکھے جو بڑی سرعت ...

ایک تنگ سے راستے میں سے گزرتے ہوئے میری کہنی ایک جنگلی گلاب کو چھو گئی ——————
ٹپ — ٹپ —! شبنم کے چند قطرے میرے کوٹ پر آگرے۔ گلاب کے پھول پر شبنم کے قطرے جمع تھے۔ جن سے پھول کچھ اداس سا لگتا تھا۔ میں نے قطروں کو کوٹ سے جھاڑا نہیں۔ یونہی رہنے دیا۔ پھر میری نگاہ اپنی انگلی کی انگوٹھی پر جا پڑی جو شکیلہ نے مجھے دی تھی۔ اس کا جگمگ جگمگ کرتا ہوا سفید نگ! مجھے یوں لگا جیسے کسی کا آنسو جم گیا ہو —! مجھے نگ کی جھلملاہٹ میں آنسو کی لرزش دکھائی دی ———— میں نے جلدی سے ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لئے۔
شاید رفو کا اخبار ختم ہو چکا تھا — انہوں نے پھر باتیں شروع کر دیں *

شفیق الرحمٰن

تاریخِ وفات مہاراجہ رنجیت سنگھ

کچھ دن ہوئے اپنے پرانے فارسی کتب خانے میں ایک قدیم قلمی نسخے کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے اتفاقاً ایک صفحہ پر اپنے دادا صاحب مرحوم جناب رائے بھاگ سنگھ صاحب بھنڈاری رئیسِ اعظم و آنریری مجسٹریٹ بٹالہ سابق وکیل دربارِ لاہور کا بقلمِ خود لکھا ہوا مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخِ وفات سرکار حضور مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب بہادر سابق والئے پنجاب۔ نظر پڑا — چونکہ یہ ایک تاریخی حیثیت کی چیز ہے۔ لہٰذا فارسی دان اربابِ ذوق کی ضیافتِ طبع کی خاطر اسے ہمایوں میں شائع کرا رہا ہوں یہ اُس زمانے کی یادگار ہے جب زبان کے جھگڑے پیدا نہ ہوئے تھے۔

مادۂ تاریخِ انتقال مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر

چوں مہاراجہ بہادر شیر دل رنجیت سنگھ — کوچ کرد از مُلکِ دُنیا جانبِ دارالبقا
سال و تاریخش عطا از راہ و رسمِ لغمہ — زد رقم بر تختۂ اندوہ یا درد و عنا

بے سر و پا گشت آہ از مرگِ او در روزگار
فضل و خیرات و شجاعت ثروت و مہر و سخا

سمت ۱۸۹۶ بکرمی

واضح رہے کہ دادا صاحب مرحوم کا اپنا سالِ وفات سمت ۱۹۴۷ بکرمی مطابق ۱۸۸۹ء ہے۔ سمت ۱۸۹۶ بکرمی میں اُن کی اپنی عمر صرف ۱۹ برس کی تھی اور اسی سن و سال میں وہ سرکارِ لاہور کی طرف سے بمقام لدھیانہ اپنے والد رائے کشن چند صاحب بہادر [illegible] کی غیر حاضری میں بطور قائم مقام وکیل تقریباً ایک سال تک کام کرتے رہے تھے۔

[illegible]

ٹھنڈی آگ

اب دید کی حسرت کا وہ انداز نہیں ہے
پرواز بجز حسرتِ پرواز نہیں ہے
یہ ہجرِ مسلسل ہے کہ ہے تلخیٔ انجام
اب روح میں وہ آتشِ آغاز نہیں ہے
آشفتگیٔ ہیبتِ شاہینِ خرد سے
اب مرغِ جنوں زمزمہ پرداز نہیں ہے
اللہ رے افسردگیٔ شوقِ حقائق
اب آرزوئے خلوتیٔ راز نہیں ہے
کل جس سے رگ و پے میں خروشاں تھا تلاطم
گونجی ہوئی اب دل میں وہ آواز نہیں ہے
بایں ہمہ دل میں خلشِ درد ہے باقی
کیا جوشؔ محبت کا یہ اعجاز نہیں ہے

جوش ملیح آبادی

حیات

میری نوا میں سُن اسرارِ کائنات نہ پوچھ　　کلام دیکھ مرا معنیٔ حیات نہ پوچھ

تو آکے سامنے دل کے تاثرات نہ پوچھ　　جو ہو سکے نہ زباں سے ادا وہ بات نہ پوچھ

مری نوا سے محبت کا سوز حاصل کر　　نجوم و حکمت و قانون کے نکات نہ پوچھ

دلِ حزیں کے لئے دردِ عشق پیدا کر　　جو یہ نہیں تو علاجِ غمِ حیات نہ پوچھ

شبابِ حُسنِ دل افزا کا اعتبار نہ کر　　کمالِ مہرِ جہاں تاب کا ثبات نہ پوچھ

ضرور دیکھ تماشائے ہاؤ ہو دن بھر　　مگر فقیہ کے عشرت کدہ کی رات نہ پوچھ

نہ پوچھ رسمِ وفا سے ہے کون کون آگاہ　　دیارِ عشق میں اے دل کسی کی ذات نہ پوچھ

کسی کو راہگذر میں تو بیٹھ جانے دے　　تو پوچھتا نہیں گر بے نوا کی بات نہ پوچھ

یہ دیکھ دردِ سکوں بخش مل گیا کس کو　　ہے کون بزم میں محرومِ التفات نہ پوچھ

یہی سے ہے باعثِ آرامِ جاوداں مجھ کو
نظیرؔ لطفِ غمِ کشتۂ فرات نہ پوچھ

اصغر حسین خاں نظیر

لندنی دوست کے نام خط

تمہارا تقاضا درست لیکن میں اگر لاکھ بار بھی تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں تو تم اس کو نہیں سمجھ سکو گے، کیونکہ یہ یہاں کی سیاست تم کو گلہ ہے کہ ہمارے قومی پیشوا اور سیاست دان کبھی کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ لیکن لندن میں بیٹھے ہوئے تم اس ڈرامے کا آخری منظر تو بالکل نہیں دیکھ سکتے تمہیں تو ہمارے پیشواؤں اور رہنماؤں کی دورُوئی کی شکایت ہے۔ اور یہاں یہ رونا ہے کہ یہ حضرات کبھی کچھ کہتے اور کبھی کچھ اور کہنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ جب کرنے پر آتے ہیں تو کچھ اور ہی کر ڈالتے ہیں۔ اور جب قوم کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو کچھ کہا ہی نہیں تھا۔ اور اگر ان کی حرکات کا عملی ثبوت پیش کر دیا جائے تو اپنے کئے ہوئے سے بھی منکر ہو جاتے ہیں تم کہ رہے ہو گے کہ ایسے رہنماؤں کو عہدِ بربریت کی سزائیں دے کر مار دینا چاہئیے یعنی یا تو اُبلتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں زندہ پھینک دینا چاہئیے یا بیل کی کھال میں زندہ بند کر کے پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکا دینا چاہئیے لیکن تمہارے تخیل کی مقصد آفرینی سے کیا ہوتا ہے یہاں ان رہنماؤں کے حاشیہ بردار چھوٹے چھوٹے لاتعداد رہنما ہیں جو دن رات اپنی دُون ہمتی کی وجہ سے اور اپنی نااہلی کے پیشِ نظر ان رہنماؤں سے خود آ لڑتے رہتے ہیں لیکن جہاں قوم کی طرف سے بڑے رہنما کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی وہیں یہ سب چھوٹے بڑے رہنما ایک ہو کر قوم پر پل پڑتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے تم ایک دفعہ یہاں ہمارے گاؤں میں ہم سے ملنے آئے تھے اور گاؤں کی چاردیواری کے باہر کتوں نے تمہارا کتنا شاندار استقبال کیا تھا یہاں تک کہ تم اپنی چھڑی کھیتوں ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ اور پھٹی ہوئی شلوار کو سیتے ہوئے تم نے ہمارے گاؤں کے تاثرات میں سے سب سے پہلے جس چیز کا ذکر کیا تھا وہ ہمارے گاؤں کے کتوں کے قومی اتحاد کا مظاہرہ تھا۔ لیکن شام کو محو میں بیٹھے ہوئے جب ہم نے کھانا کھانے کے بعد ہڈیاں چند کتوں کی طرف پھینکیں تو یہ دیکھ کر تمہاری حیرت کی انتہا نہ تھی کہ وہ کتے جو دن کو تمہیں اجنبی سمجھتے ہوئے یک جان ہو کر تمہاری تکا بوٹی کرنے پر آمادہ ہو رہے تھے وہی کتے رات کو چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو تقسیم کرنے کے لئے ایک دوسرے کے گلے پھاڑ رہے تھے میں جب اپنی قوم اور اپنے رہنماؤں کو دیکھتا ہوں تو معاً مجھے تمہارا اپنے گاؤں میں آنا یاد آ جاتا ہے۔ اور اس منظر کی تمام جزئیات ایک مستقل حقیقت بن کر ایک عرصے تک میری آنکھوں کے سامنے ناچتی رہتی ہیں۔ قوم اجنبی قوم ہے جس سے رہنما تنہی بیگانہ ہیں جتنے ہمارے گاؤں کے کتے تم سے تھے پھر یہ قوم تمہاری طرح اپنے قدم اپنی منزل کی طرف بڑھانا چاہتی ہے لیکن قومی رہنما یک جان ہو کر اس کے جیب و دامن سے عزم و ہمت کے دانت کھول کر لپٹ جاتے ہیں تم باس [illegible] قوم کے پاس [illegible] نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر بار جب قوم پر رہنماؤں کا حملہ ہوتا ہے تو قوم [illegible] [illegible] ہے اور قوم کے لئے تماشا سوگی کا زمانہ صرف وہی ہوتا ہے جب رہنماؤں کا اتفاق [illegible]

[illegible] یہ نا خوش آمدید کہنے والے حیوانوں کی طرح پھر ایک دوسرے کے گلے پر لپکتے ہیں لیکن اُن کی اس دھینگا مشتی سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان کے زخموں سے جو خون کی ندیاں بہ رہی ہوتی ہیں اُن کا اندمال ان سے ممکن نہیں۔ تم کہہ دو گے قوم کیوں اپنے آپ میں یہ طاقت پیدا نہیں کرتی کہ ان بھیڑیوں سے نجات پالے لیکن ذرا اس بیچارگی اور بے بسی کا بھی تصور کرو جو اس وقت قوم پر مستولی ہے۔ اس قوم کا ایک شہباز دین کھڑا ہوا قوم کے سامنے کہہ رہا تھا "مجھے قوم صرف چند ہزار روپے ماہوار دیتی ہے اور یہ حقیقت بالکل نظر انداز کر دیتی ہے کہ میرے پانچ بچے ہیں ان کے مصارف کس طرح پورے کر سکتا ہوں" لیکن قوم کے اسی مجمع میں ایک فاقہ کش انسان پیٹ پر پتھر باندھ کر کھڑا ہوا یہ سب کچھ سن رہا تھا اور جی میں کہہ رہا تھا کاش کہ مجھے چند پیسے ہی روز مل جایا کریں جن سے میں اُن درجنوں بچوں اور عورتوں کا پیٹ پال سکوں جن کا بوجھ میرے کندھوں پر پڑا ہوا ہے اس انسان کی آرزو ہزاروں روپے ماہوار کمانے کی نہ تھی۔ اُسے صرف چند ہزار پیسے بھی ماہوار درکار نہ تھے لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ اُسے چند سو پیسے ماہوار بھی میسّر نہ آرہے تھے۔ غور کرو ایسا آدمی کس بل بوتے پر اپنی بیچارگی کو قومی رہنما کی گرسنگی سے لڑا سکتا تھا۔ اُسے غصہ بھی آتا تھا تو وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے رہا تھا کہ وہ قومی رہنما کا یہ بیان قبر میں اپنے ساتھ لے جائے گا اور خدا کو جا کر دکھائے گا کہ دیکھ :-

تیرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے؟ — بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم! — بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے!

تم کہو گے میں اقبالی ہونے کی وجہ سے ایسے خیالات کی اشاعت کرتا رہتا ہوں لیکن تم بھی حقیقت کو کیسے پس پشت ڈال سکتے ہو۔ حقیقت تلخ سہی لیکن اُس کے وجود سے کیسے منکر ہو سکتے ہو؟ اقبال نے اسی قوم اور ایسے ہی لیڈروں کو دیکھ کر کہا تھا:-

مسلم این کشور از خود نا امید — قرن ہا شد با خدا مردے ندید

بندۂ رد کردۂ مولا ست او — مفلس و قلاش و بے پرواست او

نے بکف مالے کہ سلطانے برد — نے بدل نورے کہ شیطانے برد

شیخ او لرد فرنگی را مرید — گرچہ گوید از مقامِ بایزید

گفت دیں را رونق از محکومی است

زندگانی از خودی محرومی است

کون سا دل ہے جو یہ بات سُن کر قوم کی حالت پر آٹھ آٹھ آنسو نہ روئے گا لیکن تم پھر کہہ دو گے کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ ضرورت عمل اور قوتِ عمل پیدا کرنے کی ہے مگر تم یہ نہیں سوچتے کہ یہاں لندن کی آزاد سیاسی فضا میں پلا ہوا ہمارا ضمیر بھی گھٹ گھٹ کر نیم جان حالت تک پہنچ جاتا ہے۔ میں کل ڈیلی ٹیلیگراف کا وہ تراشہ دیکھ رہا تھا جس میں ملی وحدت کا دعویٰ داروں کی تصویر چھپی ہوئی ہے

جو ایک ریڈیو کے کمبے پر چڑھ کر چیمبرلین آنجہانی کے خلاف نعرے لگا رہے تھے ہمیں یاد ہے اس واقعہ کی تفصیل اخباروں میں دیکھ کر ہم سب حیران ہوئے تھے کہ مقدمہ کا فیصلہ سننے گئے تھے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے تھے کہ وزیراعظم پر پھبتیاں کسنے والوں کو پانچ پانچ شلنگ جرمانہ ہو گیا تھا۔ اور ہم نے جب فلس سے اس کا ذکر کیا تھا تو وہ کہتی تھی "ہم انصاف پسند لوگ ہیں اگر ہم میں سے کسی کو وزیراعظم کا چہرہ بھلا معلوم نہیں ہوتا تو ہم کیوں نہ اس کے متعلق اظہار خیالات کریں"۔ اور تم نے فوراً ہی طنزیہ طور پر اُس سے کہ دیا تھا "ہاں ہاں تمہاری کیا بات ہے تمہیں تو بادشاہ پسند نہ ہو تو تم اُس کو بھی ملک سے نکال دیتے ہو۔ وزیر بیچارہ کس کھیت کی مولی ہے" ۔ اور پھر ایک لمبا قہقہہ ہم سب نے لگایا تھا بھئی یہ سب باتیں فلس کے ملک میں ہی مبارک ہیں۔ یہاں اِن خیالات کا تصور کرنا بھی سیاسی گناہ اور تصور کرنے والا گردن زدنی سمجھا جاتا ہے۔

خیر یہ قصہ چھوڑو تمہیں ایک بات سناتے ہیں میں اور بیگم موچی دروازے کے اندر جا رہے تھے جب اُس دکان کے قریب پہنچے جہاں ہم تم دونوں کباب کھانے جایا کرتے تھے تو اُس کے قریب ہی مچھلی فروش کی دوکان پر تختے سے نیچے گری ہوئی غلاظت سے ایک نوجوان لڑکی کچھ چن چن کر ایک برتن میں ڈال رہی تھی بیگم اور میں معیارِ زندگی پر گفتگو کر رہے تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ غلام ملک میں غلام لوگوں کو کوئی معیارِ زندگی رکھنے کا حق نہیں ہوتا۔ بیگم مجھ سے ناراض ہو رہی تھیں میں نے اُس لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "آپ اس ملک میں معیارِ زندگی قائم رکھنا چاہتی ہیں جہاں ایسے مناظر بھی کثرت سے آپ کے مشاہدے میں آتے ہیں"۔ بیگم کہنے لگیں "آپ کو کیا معلوم یہ لڑکی مچھلیوں کے غلیظ ٹکڑے کس لئے چن رہی ہے؟" میں نے کہا "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے"۔ اتنے میں ہم دکان کے سامنے پہنچ چکے تھے میں نے بڑھ کر لڑکی سے پوچھا۔

"کیوں بی بی اسے کیا کرو گی؟"

"مچھلی والا ہلال نما چھرے سے بدستور مچھلی صاف کر رہا تھا۔ لڑکی اور لڑکی کا فعل اور ہمارا استعجاب اُس کے لئے سب کچھ بے معنی تھا۔ لڑکی مچھلی کی سی موٹی موٹی آنکھیں ہاتھوں میں مسلتی ہوئی اپنے کام سے رُک گئی۔ وہ حیران ہو کر سوچ رہی تھی کہ ان کو کیا جواب دوں۔ یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں کہ میں یہ غلاظت کیوں چھان رہی ہوں لیکن یہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بالآخر اُس نے کہا:۔

"آپ مچھلی کو کیا کرتے ہیں؟"

"ہم تو پکاتے ہیں"

"میں اس کو پکاؤں گی"

"اس میں پکانے والی کون سی چیز ہے؟" بیگم نے پوچھا۔

"بی بی جی ہم مچھلی تو نہیں خرید سکتے یہی چند ٹکڑے میں کبھی کبھی جمع کر کے لے جاتی ہوں اور پکا لیتی ہوں میری ماں اور بھائی سب خوش ہو کر کھا لیتے ہیں"

[illegible] مچھلی کی موٹی موٹی آنکھیں ہاتھوں میں دبا رہی تھی بیگم خاموش ہو گئی پھر [illegible] میں

[illegible] بہرحال بیدار ہوئے۔ یہ ثابت ہو چکا تھا اس لیے میں نے پھر اسی موضوع کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا
کہ ہماری قوم معیارِ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے ملکوں کا منہ نہیں چڑاتی تو کیا کیا کرتی ہے۔

بیگم نے اپنا نظریہ تبدیل کر لیا تھا۔ کہنے لگیں "ممکن ہے آپ درست کہہ رہے ہوں لیکن میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ نے
قوم کے معیارِ زندگی پر بحث چھیڑی ہے وہ قوم کہیں ہے بھی یا نہیں؟"

میں نے کہا "قوم تو ہے"

بیگم بولیں "آپ کے تخیل میں ہو گی لیکن حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ قوم کے مختلف عناصر میں ایک یگانگی ایک
ہم آہنگی ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں یہ بالکل مفقود ہے۔ نہ صرف قوم کے مختلف افراد ایک دوسرے سے ہر لحاظ سے بالکل مختلف
ہیں بلکہ اُن کا قومیت کا تصور بھی مختلف ہے۔ اور پُرلطف بات یہ ہے کہ وہ اپنے تصور کو بھی حقیقت میں تبدیل کرنے کے
لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ ایک آدمی کہتا ہے کہ اس کا مذہب اس کی قومیت ہے۔ دوسرا چلاّتا ہے اُس کا وطن اُس کی قومیت ہے
لیکن نہ یہ کسی مذہب کا پابند ہے نہ وہ کسی وطن کا مالک ہے۔ کہیئے ان حالات میں قوم کہاں موجود ہے۔ اگر قوم موجود ہوتی تو
اس کے مختلف افراد کم از کم یہ دیکھتے کہ جہاں چند آدمیوں کی میز پر پانچ چھ قسم کے کھانے ہر کھانے کے وقت موجود ہوتے ہیں،
وہاں اس غریب لڑکی کی ہنڈیا میں ہر وقت ایک کھانے کا سامان تو پہنچ جایا کرتا۔ آپ کو یاد ہو گا خالدہ ادیب خانم نے جامعہ
ملیہ کے ایک لیکچر میں کہا تھا "سچ ہے کہ انسان صرف پیٹ کا بندہ نہیں ہے مگر جب تک پیٹ نہ بھرے وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا
اور زندگی کی ضروریات میں پیٹ کی روٹی کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی داخل ہیں۔ ایک خاص معیارِ زندگی سے نیچے اتر کر انسان کولہو
کا بیل بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ زندگی کا چکر کسی نہ کسی طرح اس اُمید پر کاٹتا رہتا ہے کہ دوسری دنیا میں اُسے آرام ملے گا لیکن ایسے
شخص کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ کوئی خاص سرزمین اس کا وطن ہے۔"

بیگم خاموش ہو گئیں میں گہرے سوچ میں پڑ گیا۔ خالدہ کے الفاظ مجھے بار بار یہ محسوس کرا رہے تھے کہ میرا کوئی وطن نہیں میری کوئی
قوم نہیں۔ قوم اور وطن کے تصور کے ساتھ جو آسودگیاں اور تحفظ دوسرے ممالک میں انسان محسوس کرتا ہے وہ یہاں بالکل مفقود تھے۔
میں سوچنے کے باوجود کوئی دو آدمی ایسے جمع نہ کر سکا جو اپنے آپ کو ہم قوم کہتے ہوئے اپنے سامنے ایک ہی مقصدِ زندگی بھی رکھتے
ہوں۔ مقصدِ زندگی تو خیر بڑی بات تھی کوئی دو ایسے آدمی بھی ذہن میں نہ آئے جو ایک ہی طرح کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ قومیت کی
بنیادیں مذہب، نسل اور زبان پر رکھی جاتی ہیں۔ دوسرے لوگوں کے حالات تو میں اچھی طرح جانتا نہیں لیکن نو کروڑ کلمہ گو اور اسلام کے
نام پر بنا بہ جان دے دینے والے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اُن کا مذہب اسلام ہے یا وہ سنی اور شیعہ ہیں۔ اور مسلمان ہونا تو یا وہ اہم
ہے یا سنی اور شیعہ ہونا۔ یہ مذہب کی کیفیت ہے نسلی امتیاز کی حدود تو کسی اندازے میں نہیں سما سکتیں۔ خدا نے ایک مرتبہ نہیں
بار بار قرآن میں کہا [illegible] کوئی فوقیت نہیں لیکن یہاں کئی کئی ہزار صفحوں کی ضخامت کی کتابیں ہر سال ذاتوں اور گوتوں پر

ئع ہوتی ہیں۔ اور ان کو پڑھنے والے جب اپنی ذات کی تعریف ان کتابوں میں دیکھتے ہیں تو اپنا غلام ہونا کہ خود ...
تم ہی کہو غلام ابنِ غلام اگر سیّد بھی ہو تو کس بات پر ناز کر سکتا ہے۔ اور زبان کے سلسلے میں تو ہم نے کمال ہی کر دیا ہے ...
ل پہ شاید اتنی مختلف آوازیں سنائی نہیں دیتی ہوں گی جتنی ہندوستان کا مسلمان بول رہا ہے۔ پھر ایک قوم ہونے کا شور مچاتا ہے
نہ جانے کیا سمجھ کر ایک وطن بنانے کی فکر میں بھی ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ پاکستان کے تمام لیڈر جب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو
لی کی زبان کے سوا اور کسی زبان میں گفتگو نہیں کر سکتے۔ کہو اُن مسلمانوں کا کیا ہوگا جو ہندوستان میں ۹۵ فیصدی سے زیادہ تعداد
یں فرنگی کی زبان کے کبھی قریب بھی نہیں آئے۔ ان بے زبانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے جب ان کی زبان ہی نہیں سمجھتے
اس پراگندہ مجمع کو وہ ایک قوم بنا کر کیسے ایک جگہ لا کھڑا کریں گے، اور جب تک یہ نہیں ہوگا وہ پاکستان کی تکمیل کہاں سے
ریں گے یہی ہیں جب یہ سوچتا ہوں تو میرا ذہن معموں کے دریا میں تیرنے لگتا ہے اور عقل اُلجھنوں کے سمندر میں کھو جاتی ہے۔
شاید تم وہاں سے ان مسائل کا کوئی حل تجویز کر سکو۔

محمد باقر

میری محبّت

اُس گھاس کی طرح ہے۔
جو اونچے پہاڑوں کی گہری گھاٹیوں میں اُگتی ہے۔
اور روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے
مگر جس کا کسی کو علم نہیں۔

جاپانی — انور خاں انور

جوانی کا گیت

اے خدا اے ابنِ آدم کی تمناؤں کے خواب
آج ملنا چاہیئے شاعر کی باتوں کا جواب

میں نے مانا تو نے بخشا مجھ کو وہ قلبِ حزیں
کانپتا ہے جس کی سرحد میں دلِ روح الامیں!!

میں نے مانا تو نے دی مجھ کو وہ روحِ بیقرار
جس کی ہر جنبش سے پیدا نغمۂ سازِ بہار!

میں نے مانا آنکھ کو اشکوں کی شادابی بھی دی
میں نے مانا دل دیا اور دل کو بیتابی بھی دی

میں نے مانا تو نے دی مجھ کو جوانی کی بہار
جس کی ہر لغزش حریفِ گردشِ لیل و نہار

میں نے مانا نطق کو بخشا وہ حسنِ لاجواب
جس کی ہر دلکش ادا آئینہ دارِ انقلاب

اور مجھ کو جوہرِ قابل بنانے کے لئے
آسمانی گیت دنیا کو سنانے کے لئے

میرے نغموں میں سمو دیں رات کی رنگینیاں
بربطِ ناہید کی خاموش لرزش کا سماں

مشتری کو حکم، سازِ دل کو میرے چھیڑ دے!
چاند کا یہ فرض، مجھ کو رات بھر تکتا رہے

اور پھر موجِ صبا کا اولیں یہ کام ہے
مجھ سے کہہ دے کتنا دلکش صبح کا ہنگام ہے

سب بجا یہ "التفاتِ خاص" لیکر کیا کروں؟
سچ بتا ہم اس سے ملا کرتا ہے کیا دل کا سکوں

وہ مسرت کیا جو دل کا شعلہ پھر بیتاب ہو!
اے خدا وہ ساز کیا جو تشنۂ مضراب ہو

ہی میری صدا پر جھومنے والا نہیں ‌ ‌ ‌ ‌ کیوں دل میں چپکے چپکے گھومنے والا نہیں
ہی معصوم بیچینی سے گھونگھٹ کھولکر ‌ ‌ ‌ ‌ مجھ سے کہتا ہی نہیں کیوں چھپ ہو آج اتنے نظر
ہی ایسا نہیں میں جس کو دل نذر دوں ‌ ‌ ‌ ‌ کوئی بھی ایسا نہیں میں پاؤں جس کے چوم لوں
ہی سہمے ہوئے اب باغ میں آتا نہیں ‌ ‌ ‌ ‌ پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے بھی گھبراتا نہیں
ھی ندی کنارے مجھ کو تڑپاتا نہیں ‌ ‌ ‌ ‌ چاند کی بیباک نظروں سے بھی شرماتا نہیں
یا ظلم ہے اے رحمتِ پروردگار ‌ ‌ ‌ ‌ تیرا بندہ اور یوں بے چینیوں کا ہو شکار
نہیں ممکن کہ میرے گیت سننے کیلئے ‌ ‌ ‌ ‌ میرے اشکوں کے انوکھے پھول چننے کے لئے
ں لیلی کرے پنگھٹ پہ میرا انتظار ‌ ‌ ‌ ‌ جس کے سینے میں مچلتے ہوں محبت کے شرار
ں سلمی میرے باغِ زندگی میں مسکرائے ‌ ‌ ‌ ‌ کوئی عذرا میرے غم میں اپنا دل آنکھوں میں لائے
ں شیریں دے مجھے چھپ چھپ کے الفت کا پیام ‌ ‌ ‌ ‌ کوئی لیلی ہو مری دیوانگی سے ہمکلام
ں رادھا بانسری کی لے میں کھو جایا کرے ‌ ‌ ‌ ‌ شیام کی خود رو جواں سالی کو بہلایا کرے

یہ نہیں ممکن تو مجھ سے نوجوانی چھین لے!

نوجوانی کیا، مذاقِ زندگانی چھین لے!!

نظر حیدرآبادی

ناشر

کردار

محمود ــــــــــــ ناشر

جمیل ــــــــــــ مصنف

اختر ــــــــــــ ایک دوسرا مصنف

عقیل ــــــــــــ جمیل کا بیٹا

ظفر ــــــــــــ مطبع کا منیجر

محمود کا کمرہ ــ ایرانی قالین بچھا ہوا ہے۔ دیواروں پر زیادہ تر عورتوں کی تصویریں آویزاں ہیں میز، کرسیاں، صوفے اور بنچیں پڑی ہوئی ہیں۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی اپنی مخصوص زبان میں ٹک۔ ٹک کر رہی ہے۔ برقی پنکھا اپنی پوری رفتار سے چل رہا ہے۔ ایک طرف کچھ نیچے ریڈیو پر گانا سن رہے ہیں۔ محمود آرام کرسی پر دراز ہے۔ اسی وقت ملازم کسی کے آنے کی خبر دیتا ہے۔ محمود کی اجازت سے اجنبی داخل ہوتا ہے ۔

اجنبی (دبلا پتلا، پھٹے پرانے کپڑے۔ ادب سے سلام کرتا ہے) ناشر صاحب کئی بار حاضر ہوا تھا لیکن بدقسمتی سے نیاز حاصل نہ ہو سکا۔

محمود۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ کیا کام ہے؟

اجنبی ــ مجھے جمیل کہتے ہیں میں نے علیگڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا ہے اردو ادب سے خاص دلچسپی ہے۔ دو ایک کتابیں بھی لکھی ہیں۔ آپ اس صوبے کے بہت بڑے ناشر ہیں میری استدعا ہے کہ آپ مجھے بھی کچھ کام دیدیں ــ

محمود (ٹکٹکی باندھ کر سگریٹ پیتے ہوئے) او۔۔۔۔ آپ

کتاب وتاب لکھا کرتے ہیں؟ مصنف ہیں؟ مصنفوں ـ
ناک میں دم کر رکھا ہے۔ خیر۔ بیٹھئے (بنچ کی طرف اشارہ کر
جمیل (بنچ کے ایک کونے پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور بڑی ہی لجا
سے کہتا ہے) کیا کیا جائے۔ نوکری تو ملتی ہی نہیں۔ تجا
کے لئے روپیہ چاہیئے بغیر ٹکوں کے تو گھر میں جو ہے
پیلنے ہیں۔ بال بچے والے آدمی کریں تو کیا کریں۔ بڑی تبا
آپ پچاسوں مصنفین کو کام دیتے ہیں مجھے بھی ممنون
محمود (غرور سے) ارے صاحب کس کس کو کام دیں؟ آ
نے کوئی یتیم خانہ تو کھول نہیں رکھا۔ جانے آپ جیسے
مصنف آتے رہتے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ۔
جمیل ــ (گڑگڑا کر) ہاں آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ جو کوئی
تو آپ کو بڑا سمجھ کر ہی آتا ہے۔ میں بھی حاضر ہوا ہوں۔
نہ کیجیے۔
محمود (فخر سے) اجی حضرت۔ آپ کیا پوچھتے ہیں میری
بہت پھیل گئی ہے ہر سال نئی نئی کتابیں چھپوا تا رہتا
نہ جانے اس گھر کی بدولت کتنوں کی زندگی بسر ہو رہی۔

جمیل۔ہاں صاحب۔اس میں کیا شک ہے۔اسی لئے تو میں نے آپ کا دامن تھاما ہے۔

(اسی وقت نوکر ناشتہ اور کچھ پھل لے کر آتا ہے اور محمود کے آگے چھوٹی میز پر رکھ دیتا ہے۔محمود مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیتا ہے۔ساتھ ہی بڑی بے پروائی سے باتیں بھی کرتا ہے)

محمود۔ہاں تو آپ کس قسم کی کتابیں لکھتے ہیں؟

جمیل۔مجھے تاریخ سے اچھا لگاؤ ہے۔بی۔اے میں یہ میرا مضمون بھی تھا۔اسی لئے میں تاریخی کتابیں اچھی لکھ سکوں گا۔

(اختر کا ورود۔عمر تقریباً ۲۵ سال، سفید شیروانی، پاؤں میں چپل اور ایک معمولی رومی ٹوپی پہنے ہوئے ہے)

محمود۔(اختر کی طرف دیکھ کر بڑے ہی تپاک سے) اخاہ آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔بڑی مدت سے دید نہ ہوئی تشریف رکھئے (اختر کرسی پر بیٹھنا چاہتا ہے لیکن محمود اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو والے صوفے پر بٹھا لیتا ہے) کہئے اور تو سب خیریت؟

اختر۔(بڑی اداسی سے) خدا کا فضل ہے۔کھانے کو روکھی سوکھی مل ہی جاتی ہے لیکن آج کل گھر چلانا بڑا ہی مشکل کام ہے۔

(خوشامد کے لہجہ میں) سچ تو یہ ہے صاحب آپ نے اردو ادب کی جیسی خدمت کی ہے ویسی نہ تو مولوی عبدالحق صاحب نے کی اور نہ اقبال ہی نے چھوٹے موٹے لوگوں کا ذکر ہی کیا۔ایک دو نہیں پچاسوں اردو کی کتابیں شائع کرانا کیا کوئی بچوں کا کھیل ہے؟

محمود۔(خوش ہو کر) پچاسوں نہیں جناب سیکڑوں کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں [illegible] تو یہ تعداد دگنی ہی ہو جائیگی۔

اختر۔ہاں [illegible] آپ کی زندگی [illegible] ادبی خدمت کے

[illegible]

جیسے بچے ادبی محسن زندہ ہیں ہمارا ادب [illegible] ترقی کرتا رہے گا [illegible] کی بھی اور پرخلوص خدمت کی کرسکیں گی۔ہاں سامنے [illegible] مجھے ایک بات یاد آ گئی کچھ دن پہلے۔یہی کوئی پانچ چھ مہینے ہوئے ہوں گے آپ نے سائنس اور تجارت پر ایک کتاب لکھنے کے لئے مجھ سے کہا تھا مگر اس وقت میں ذرا عدیم الفرصت تھا۔اب آپ جس قسم کی کتابیں چاہیں میں لکھ سکتا ہوں۔

محمود۔آپ تو بڑے قابل آدمی ہیں! غالباً اب تو آپ ہر شعبہ کی کتاب لکھ سکیں گے۔

اختر۔(بڑے اطمینان سے) ریاضی، قواعد، فلسفہ، منطق، جغرافیہ، تاریخ، جس پر بھی آپ فرمائیں بہت جلد کتابیں تیار کر لوں گا۔

جمیل۔(حیرت سے اختر کی طرف منہ کر کے) اوہو آپ اتنے شعبوں پر حاوی ہیں، تب تو.......

اختر۔(محمود کی طرف دیکھتے ہوئے) ارے صاحب۔آپ ہیں کون؟ ان کا اس طرح ہماری باتوں میں مخل ہونا ٹھیک نہیں۔آخر ان کی تعریف؟

محمود۔(بڑی بے پروائی سے) کوئی نہیں۔یونہی چلے آئے ہیں۔کتاب وتاب لکھا کرتے ہیں۔

اختر۔(جمیل کی طرف منہ کر کے) ارے بھئی تم ابھی بچے ہو۔تیل کی دھار دیکھو۔کبھی جنرل مرچنٹ کی دکان پر گئے؟ اسے الف سے لے کر یے تک سبھی رکھنا پڑتا ہے۔

جمیل۔معاف فرمائیے۔ایک مصنف اور جنرل مرچنٹ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ [illegible] آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

اختر۔جناب آپ کو اس شعبہ کی ابھی معلومات نہیں۔آپ [illegible] جنرل مرچنٹ [illegible]

[illegible] ... ۱۲ ... نہیں ... کی بات نہیں سمجھا
آپ ... ...

محمود۔ بیٹھے بھی رہیئے۔ (جمیل کی طرف مخاطب ہوکر) ہاں جناب ضرورت تو دتھی مگر جب آپ کئی بار آئے ہیں۔ جیسا آپ نے خود کہا ہے، تو ہم آپ کو ایک کام دیئے دیتے ہیں ٹھیک ٹھیک انجام دینا ہوگا۔ گڑبڑ نہ ہونے پائے۔

جمیل۔ تشویش سے بڑی مہربانی ہوگی میں بڑے اہتمام سے انجام دوں گا۔ آپ بہت خوش ہوں گے۔

محمود۔ ہاں تو آپ بہار کی قدیم تاریخ لکھ لائیے۔ ڈھائی سو صفحے سے زیادہ نہ ہو پسند آنے پر پینتیس (۳۵) روپے معاوضہ دیا جائیگا۔

جمیل۔ (تعجب سے) اتنے بڑے کام کے لئے صرف پینتیس روپے! جناب تین مہینے سے کم میں یہ تاریخ مکمل نہ ہوسکیگی۔ ذرا محنت کا تو اندازہ لگایا ہوتا۔

(تین مہینے سن کر اختر بڑے زور کا قہقہہ لگاتا ہے اور محمود بھی مسکراتا ہے)

محمود۔ بھئی آپ نئے آدمی ہیں۔ اتنے معمولی کام کے لئے کوئی پینتیس روپے نہیں دیگا۔ میں نے تو آپ کی سادہ لوحی پر ترس کھاکر اتنی رقم کہدی ہے۔

جمیل۔ (لجاجت سے) میں غریب آدمی ہوں۔ کئی بچے ہیں۔ یہی ہے مہربانی فرماکر کچھ اور بڑھا دیجئے۔

محمود۔ خیر، جب آپ اتنا کہہ رہے ہیں تو پندرہ روپے اور یعنی کل پچاس روپے ملیں گے۔ پندرہ کتاب چھپنے کے بعد پینتیس [illegible] ... میں ... [illegible]

[illegible]

[illegible] ... ت ... تو

شائع ہو جائیگی میں ایک مؤرخ کی حیثیت سے روشناس ہو جاؤنگا۔

جمیل۔ آپ کی مرضی پوری ہے التجا ہے کہ پینتیس روپے کتاب لکھتے ہی دلا دیئے اور وہ چھپنے پر۔ اس سے میرا بہت کام چل جائیگا بڑا احسان ہوگا۔

محمود۔ (چڑکر) آپ بکواس بہت کرتے ہیں۔ آپ جیسے مصنفوں سے رفیع پالا پڑے تو ناک میں دم ہو جائے۔ اچھا اب مجھے دوسرا کام کرنے ہیں۔ آپ جا سکتے ہیں۔

(جمیل محمود کے کمرے سے باہر آتا ہے اور دروازہ پر کھڑے کھڑے بڑے ہی انہماک سے کچھ سوچنے لگتا ہے)

اختر۔ (محمود سے) اجازت دیجئے میں بھی چلوں۔ کہئے۔ کس کتاب کے لئے فرماتے ہیں۔ اب کی بار میں "ڈائیلی گیتا" پسند کروں گا۔

محمود۔ آپ کے لئے کیا بتاؤں! جو لکھ دیں وہی کام کی چیز ہوگی اچھا یہ تو فرمایئے۔ کوئی منظوم کتاب لکھ سکیں گے۔

اختر۔ (ہنستے ہوئے) یہ بھی خوب کہی! شاعری تو میرے گھر کی لونڈی ہے۔ آپ کہیں تو مہینے میں بیس دیوان تیار کرسکتا ہوں عرش سے فرش تک ساری چیزوں پر ہر صنف میں طبع آزمائی کرسکتا ہوں۔

محمود۔ اوہو! آپ تو واقعی بڑے لائق ہیں۔ اچھا تو آپ ایک "مرثیۂ کربلا" لکھ لائیے۔ تین سو صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔

اختر۔ بس ایک ہی کتاب۔ اور کچھ نہیں؟

محمود۔ یہ تو میں نے اپنی طرف سے کہا ہے۔ اور بھی دو چار کتابیں آپ لکھ لائیں گے انہیں بھی خوشی سے چھپوا دونگا۔ اور دوسری کتابیں تو جب آپ چاہیں دیجئے لیکن مرثیہ والی کتاب دو ڈھائی مہینوں میں دے جائیے۔

اختر۔ حیرت سے دو ڈھائی مہینے ہاں کیا آپ نے مجھے ایسا ہی سمجھ رکھا ہے۔ جو اس معمولی سی کتاب کے لئے دو ڈھائی مہینے لگا دوں گا؟ ....

ارے حضرت! وہ تو یہی احمق ہے جو اتنی سی معمولی بات کے لئے تین مہینے کا وقت مانگ رہا تھا! مجھ سے کہیں تو اتنے دنوں میں تیرہ تاریخیں مرتب کر ڈالوں۔ خیر میرے اس مرثیہ پر آپ رائلٹی کیا دیں گے؟

محمود۔ دوسروں کو اٹھارہ لیکن آپ کو بائیس فیصد۔ اتنی رائلٹی بہت کم کتابوں پر دی جاتی ہے۔ لیکن آپ سے تو ہمارے خاص تعلقات ہیں۔

اختر۔ نہیں صاحب پچیس[25] فیصد دیجئے۔ پھر دیکھئے کیا لاجواب کتاب لکھتا ہوں۔ بولنے لگیگی ۔ بولنے۔

محمود۔ خیر لکھ تو ڈالئے آپ سے پچیس[25] روپیہ کچھ بڑھ کر نہیں۔

(معمولی سوچ بچار کے بعد اختر اپنے گھر جاتا ہے۔ اور محمود آرام کرسی سے اٹھ کر دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر انگڑائیاں لیتا ہوا دفتر کی طرف بڑھتا ہے)

(۲)

(اختر مکان کے باہر آتا ہے۔ دروازہ پر جمیل گہرے سوچ میں کھڑا ہے)

اختر۔ کہئے جمیل صاحب آپ ابھی یہیں کھڑے ہیں کس سوچ میں پڑ گئے؟

جمیل۔ کیا بتاؤں حضرت تاریخ مرتب کرنے کا کام تو لے لیا ہے لیکن اس کے لئے واقعات کی ضرورت ہوگی [illegible] [illegible] [illegible] کرنی ہوگی۔

اختر۔ آپ تو بالکل ناتجربہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ ان ناشروں کی رگ رگ تو میں خوب پہچانتا ہوں۔ یہ لوگ بڑے عیار ہوتے ہیں۔ مصنفوں کی چڑیا گھوستا نہیں خوب آتا ہے۔ آخر ان کے سارے ٹھاٹ باٹ ہمارے دم قدم سے تو ہیں ہم لوگ اپنے دماغ کا سیروں خون خشک کر کے کوئی کتاب لکھتے ہیں اور یہ اسے کوڑیوں میں ٹھگ لیتے ہیں۔ پہلے میں بھی کتابوں پر بڑی محنت کرتا تھا لیکن اب تو یوں ہی لڑھا دیتا ہوں۔

جمیل۔ مولانا میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ میں ابھی نوآموز ہوں کہیں کوئی کتاب الٹ پلٹ لکھ دی تو میری بدنامی ہوگی۔ پھر کوئی کوڑیوں کا بھی کام نہ دیگا۔

اختر۔ ارے بھائی۔ اگر تم نے ان ناشروں کی کتابیں اس طرح لکھیں تو بس ہو چکا بال بچوں کا۔ یہ لوگ دیتے ہی کیا ہیں جو اتنا سر کھپائیں آج کل تو وہی مصنف اچھے ہیں جو ایک ہفتہ میں دو دو کتابیں لکھ دیتے ہیں تم لکھو گے تین مہینے میں ایک تاریخ ملیں گے کل پچاس پینتیس پہلے اور کتاب کے فروخت ہونے پر پندرہ بھلا سوچو تو ایسی حالت میں خود کیا کھاؤ گے اور بال بچوں کو کیا کھلاؤ گے۔

(اختر ناشر کے دروازہ پر سے چلنے کا ارادہ کرتا ہے اور دونوں مل کر باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں)

جمیل۔ تو آپ ہی بتائیے۔ کیا کیا جائے جو اتنی جلدی کوئی کتاب لکھنا تو مجھے آتا نہیں۔

اختر۔ ارے اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ [illegible] قینچی اور گوند پاس رکھو پھر سینکڑوں چیپیاں جمع ہو جائیں گی۔

جمیل۔ [illegible]

[illegible]

اختر۔ [illegible] ساری [illegible] آسکی تحقیق نہیں
کی جا سکتی کہ [illegible] مختلف رسالوں میں کافی مضامین بھی
نقل کئے ہوں گے۔ ان میں سے جو آپ کو معلوم ہوں انہیں سرخ
پنسل سے نشان کرکے قینچی سے کاٹ لو اور ایک کاغذ پر چپکا
دو بس بن گئی کتاب۔ کوئی چٹپٹا سا چلتا ہوا نام لکھ دینا۔

جمیل۔ واہ کاٹ کی ایسی چھپی ہوئی چیپیاں دیکھ کر تو ناشر
اعتراض کرے گا کہ یہ تم نے نہیں لکھی تب کیا کیا جائے؟

اختر۔ بھئی تم بچے ہی ہو بالکل۔ اُلجھتے ہو۔ پہلے بات تو سن لی ہوتی۔
جب ساری چیپیاں چپکا لو۔ تو اپنے ہاتھ سے ان کی نقل کرکے
ناشر کے حوالے کر دینا۔ ناشر کیا جانچ پڑتال کرتا پھرے گا کہ تم نے
کہاں سے کونسا مواد لیا ہے؟

جمیل۔ یہ تو آپ نے بڑی اچھی ترکیب بتائی! اس طرح تو دس
پانچ ہی دن میں کتاب تیار ہو سکے گی لیکن میں اپنی پہلی کتاب
کے لیے ایسا نہیں کروں گا۔ اسے تو خود ہی لکھنے کا خیال ہے۔

اختر۔ خیر جب چاہو اس ترکیب سے کام لے سکتے ہو۔ کتاب کے
شروع میں بڑے بڑے مورخین کے حوالے ضرور دے دینا۔ اس سے
ناشر پر تمہاری قابلیت کی دھاک بیٹھ جائے گی۔

جمیل۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ آپ جیسے محسن کہاں ملتے
ہیں۔

اختر۔ اس میں کیا احسان ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے تمہاری
سادگی اور غربت دیکھ کر یہ ترکیب بتائی ہے۔ ورنہ ہم ایسے تجربہ
[illegible] اشاعت تھوڑی ہی کرتے ہیں؟ تم نے سنا ہے۔ ہم اپنے ان
ہی ہتھکنڈوں کی بدولت [illegible] مشہور [illegible] جاتے
[illegible]
[illegible]

کیا ہے!
(جمیل بڑے ہی تپاک سے اختر سے مصافحہ کرتا ہے اور پھر
دونوں اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہیں)

(ختم)

(محمود کا خاص کمرہ۔ وہی آرائش اور ویسے ہی ٹھاٹ باٹ
حمیدیہ پریس کے منیجر ظفر کی آمد۔ منیجر کا حلیہ۔ معمولی ٹوپی۔
کھدر کا پاجامہ سفید شیروانی۔ گلے میں مفلر۔ ناک کے سرے
پر چشمہ۔ عمر پچاس کے قریب)

محمود۔ (آرام کرسی پر لیٹے ہوئے) آئیے منیجر صاحب! آپ نے
تو دونوں کتابوں کا بڑا لمبا چوڑا بل بنایا۔ اس میں کافی کانٹ
چھانٹ کی جائیگی۔ آپ بہت اُجرت لینے لگے ہیں۔

ظفر۔ سارے صاحب، کیا پوچھتے ہو، جنگ نے ساری چیزیں
گراں کردی ہیں۔ لیکن ہم تو وہی چھپائی لیتے ہیں جو دس
سال پہلے لی جاتی تھی۔ آپ فرماتے ہیں بہت ہے۔

محمود۔ (بے پروائی سے) بہت نہیں بالکل بیجا۔ اب اتنے زیادہ
چھاپے خانے ہوگئے ہیں کہ انہیں کام ملنا مشکل ہوگیا ہے۔
ظفر صاحب! پچھلے دس سال میں چھپائی کی اُجرت پچیس[25]
فیصد گھٹ گئی ہے لیکن آپ وہی پرانی لکیر کے فقیر۔ جس
نرخ سے میں اور چھاپے خانوں کو دیتا ہوں اُسی حساب سے
آپ کو بھی دیا جائیگا۔

ظفر۔ (گھبراہٹ سے) نہیں صاحب آپ چاہیں تو بل میں دو چار
روپے کم کرسکتے ہیں۔ پچیس[25] فیصدی کمی سے تو سارا معاملہ چوپٹ
ہو جائے گا۔

محمود۔ خیر۔ اب کی دفعہ تو ہم کوئی [illegible] نہیں کرتے
[illegible]

ہوتے ہیں۔ بابا بلکتے اور لجاجت کرنے پر بھی محنت
کی اجرت نہیں ملتی اور آپ لوگ مذاق کرتے ہیں دیر ہو رہا تھا
مجھا حرج ہو گیا۔

(جمیل کے بیٹے عقیل کی آمد۔ چودہ پندرہ برس کا لڑکا۔
نیم آستین کی قمیص اور پاجامہ پہنے ہوئے، پاؤں میں چپل
سر ننگا۔ گھبرایا ہوا)

محمود۔ (عقیل کی طرف مخاطب ہو کر ترش روئی سے) تم سے تو
پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ابھی تاریخ کی لکھائی کا معاوضہ نہیں
دیا جائیگا پھر کیسے آئے؟ چکر کاٹنے سے فائدہ؟ کبھی جمیل
چلے آتے ہیں اور کبھی تم کبھی چٹھی بھیجتے رہیں۔ آخر ہمیں کوئی
اور کام نہیں ہے تمہاری باتیں سنتے رہیں کتاب کیا لکھائی
آفت مول لی۔ واقعی یہ مصنف ذرا بھی احسان کے قابل
نہیں۔ سچ کہہ دینا اس وقت ایک پیسہ بھی نہیں مہینوں میں
کتاب مرتب کی اور پھر "لاؤ، لاؤ" بھلا کوئی بات ہے۔

عقیل۔ (بڑے ملتجیانہ لہجہ میں) جناب، میرے والد سخت بیمار
ہیں انہیں ڈبل نمونیا ہو گیا ہے بیہوشی طاری ہے آپ
ناراض نہ ہوں یہ غصے کا وقت نہیں ہماری تو جان پر آ بنی ہے
آپ پہچانتے ہیں ہم نے کہا ہے کہ ناشر صاحب نے آج
تک ایک پائی بھی نہیں دی ہے۔ اگر معاوضہ نہیں دینا چاہتے
تو خیرات سمجھ کر ہی کچھ دیدیں کسی طرح دوا پانی کا خرچ تو چلے،
ہمارے پاس تو پھر کھانے تک کے لئے کوڑی نہیں ہے ناشر
صاحب رحم کیجئے مہربانی فرمایئے بڑا احسان ہوگا میں آپ
سے بیکسی [illegible] وقت [illegible] نہیں ہوتا (عقیل
[illegible]

منہ پھٹ معلوم ہوتے ہو تمہارے والد صاحب آ کر
کہیں؟ اُن کی دوا دارو کا کیا ہم نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا
ہے؟ یا ان کا ہم پر کوئی قرض ہے؟ کتاب شائع کر دی
یہ کیا کم ہے آج کل مصنفوں کو پوچھتا کون ہے؟ صبح
سے شام تک پچاسوں ادیب جھک مارتے رہتے ہیں۔
خبردار ایسی باتیں کیں تو! جاؤ میری دکان پر رونے دھونے
کا کام نہیں۔

(لڑکا انتہائی مغموم و محزون گھر لوٹتا ہے)

(۵)

(محمود کا خاص کمرہ۔ محمود صوفہ پر دراز اخبار پڑھ رہا ہے
اسی وقت اس کا ایک کلرک آتا ہے)

کلرک۔ (فرشی سلام کے بعد) صاحب، معاف فرمایئے آج
آنے میں کچھ دیر ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ رات ہمارے پڑوس
میں جمیل نامی ایک گریجویٹ کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ بڑے
اچھے آدمی تھے، بیچارے۔ ان کی بیوی اور چھوٹے چھوٹے
بچے رات بھر روتے رہے۔ ان کی آہ و بکا سن کر کلیجہ منہ کو
آتا ہے۔ ایک اور بڑی مصیبت ہوئی۔

محمود۔ (تشویش سے) وہ کیا؟

کلرک۔ (بڑے ہی درد سے) ان کے پاس کفن تک کے لئے
کچھ نہ نکلا۔ محلے والوں کو ہی سارا انتظام کرنا پڑا ہم دس
بارہ آدمی صبح کے کوئی چار بجے اس کی تجہیز و تکفین کر کے
آئے ہیں۔ نہ جانے اب ان کے ستم رسیدہ بیوی بچوں کا کیا حال
ہوگا۔ چھوٹے بچوں کو دیکھ کر بڑا ہی ترس آتا ہے

محمود۔ (ظاہری رنج و افسوس کے ساتھ) [illegible] جمیل صاحب
[illegible]

ہوگئے ان کا ہوا تھا اس نے تو کوئی ایسی بات نہیں
بتائی تھی مگر اس سے کیا۔ یہ تو دنیا ہے حیات کا مقصد
ہی یہی ہے پیدائش کا لازمی انجام مرنا ہے۔ خوب یاد
آیا۔ جمیل صاحب کی ایک تاریخ بھی تو ہے۔ ایسے میں کیوں نہ
اشتہار دیدیں۔ خوب فروخت ہوگی۔ ابھی ایک مسودہ تیار

کرو میں کہتا ہوں تم لکھو یہ اشتہار آج ہی سب بڑے بڑے
اخباروں میں دیدو اور شہر میں بھی ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کراؤ۔
کلرک۔ (کاغذ، قلم اور دوات لے کر بیٹھ جاتا ہے) فرمائیے صاحب
کیا مضمون ہوگا۔ آج ہی چھاپ کر سب جگہ بھیجدیا جائیگا۔
محمود۔ ہاں۔ لکھو۔ پہلے عنوان لکھو:۔

قلمروئے عادل شاہی

"اُردو کے مایۂ ناز ادیب اور مشہور مورخ جناب مولانا جمیل احمد صاحب بی اے کو ہم نے بیش قرار معاوضہ دے کر خاص طور پر عادل شاہی دور کی تاریخ مرتب کرائی ہے۔ اس کے دو ایڈیشن تو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوچکے۔ یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ افسوس صد افسوس کہ حال ہی میں مولانا جمیل احمد صاحب رحلت کر گئے۔ انکے اہل و عیال کی امداد ہمارا عین فریضہ ہے۔ ناشر کی حیثیت سے ہم ان کے مظلوم خاندان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ جمیل صاحب کی نادر تاریخ جتنی زیادہ فروخت ہوگی اتنا ہی ہم ان کے ورثا کی زیادہ خدمت کرسکیں گے۔ اس تاریخ کا خریدنا مرحوم کی روح کو خوش کرنا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثواب ہوسکتا ہے۔ امید ہے کہ دردمند اور اہلِ ذوق حضرات خاص توجہ فرمائیں گے۔ اس کتاب پر کسی قسم کا کمیشن نہیں دیا جائے گا کیونکہ اس کی فروخت تجارت کی خاطر نہیں ہورہی ہے بلکہ مرحوم کی خوشنودی اور ان کے ورثاء کی امداد مطلوب ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔ عہ

پتہ۔ مکتبۂ محمودیہ دام نگر۔ ضلع جبل پور

محمد عبدالقادر فاروقی (حمایت نگری)

رات

آؤ تمہیں سنائیں بات   رات ہے اور آدمی رات
سوتی ہے ساری کائنات   جاگتی ہے فقط وہ ذات

کیسی حسین رات ہے

چھٹکی ہے صاف چاندنی   لگتی ہے کیا بھلی بھلی
چارطرف ہے خامشی   صبح ہو جیسے سو رہی

کیسی حسین رات ہے

صحن فلک پہ جلوہ گر   چودھویں رات کا قمر
تارے ادھر ہیں اور اُدھر   کوئی سجا ہے چرخ پر

کیسی حسین رات ہے

نرم و سبک ہے کیا ہوا   چال ہے اس کی دلربا
جھونکے نسیم کے ہیں یا   در ہے بہشت کا کھلا

کیسی حسین رات ہے

وقت یہ ہے نماز کا   عجز کا اور نیاز کا
سوز کا اور ساز کا   خلوتیانِ راز کا

کیسی حسین رات ہے

تخت نشیں ہے ذوالجلال   دیکھئے ہر طرف جمال
کرلے جو کرنا ہو سوال   لطف سے اس کے ہو نہال

کیسی حسین رات ہے

کھول دے اپنے دل کا در   اب تو نکال بال و پَر
بیٹھے ہی بیٹھے کر سفر   آتا ہے دیکھ کیا نظر

کیسی حسین رات ہے

کون و مکاں کا وہ حسیں   روح و روانِ عاشقیں
خانۂ دل کا وہ مکیں   ڈھونڈ لے ہے یہیں کہیں

کیسی حسین رات ہے

سید نذیر حسین [illegible]

غزل

رہ و رسمِ عاشقی سے جو وہ بدگماں نہیں ہے
تو مری یہ جاں فروشی کبھی رائیگاں نہیں ہے

دمِ تازہ لے کے میں نے جو نظر شجر پہ ڈالی
سرِ شاخ آہ دیکھا۔ مرا آشیاں نہیں ہے

مرے تن میں جان آئی۔ میرے جی کو چین آیا
مرے حق میں ہے یہ جنت ترا آستاں نہیں ہے

چلو بلبلو، چمن میں، کریں شور مل کے باہم
ہیں شگفتہ پھول ہر سُو، کوئی باغباں نہیں ہے

تجھے کیا خبر ہے ناصح، کہ خیالِ زُلفِ شبگوں،
ہے رفیقِ شامِ ہجراں، یہ بلائے جاں نہیں ہے

سرِ بزم میرا قصہ کوئی کیا سمجھ سکے گا
مری گفتگو نئی ہے، کوئی ترجماں نہیں ہے

جو نہ دل ہو اس کا جُویا، اُسے ڈھونڈنا ہے بے جا
وہ کہیں نہیں ہے لیکن یہ کہو کہاں نہیں ہے

یہ نہال، آرزو کے تجھے ٹھنڈی چھاؤں دینگے
کہ ترے چمن پہ مخفی ستمِ خزاں نہیں ہے

صالحہ بیگم مغنی از کلکتہ

کھلونے

"ننھا بیمار ہے۔"

"ننھا بیمار ہے" بوڑھے ڈپٹی صاحب چونکے: "ننھا بیمار ہے۔" وہ کرسی سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ خدا جانے اُن میں پھرتی کہاں سے آگئی اور وہ فوراً زنانے میں جا پہنچے۔

"بہو! ننھے کو کیا ہو گیا ہے؟" انہوں نے ایک دم پوچھا۔

"اباجان! نہ جانے اس کا رنگ کیوں زرد ہو گیا ہے۔" بہو کی آنکھیں پُرنم تھیں۔

گھر میں ایک ہلچل مچ گئی۔ خادم، مامائیں اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ ڈپٹی صاحب اپنی پیرانہ سالی کے باوجود جوانوں سے زیادہ بیتاب تھے۔ اُن کی بے تابی نے سارے گھر کو اور پریشان کر دیا۔ دم بھر میں ڈاکٹر اور نرس حاضر ہو گئے۔

ڈاکٹر نے بچے کو دیکھا۔ نسخہ تجویز کیا اور نرس کو ضروری ہدایات دیکر چلا گیا۔ دو دن یہی حال رہا۔ تیسرے دن ننھے کو کچھ افاقہ ہوا اور سب کی جان میں جان آئی۔

ڈپٹی صاحب آج پھر برآمدے میں آرام کرسی پر دراز اخبار پڑھ رہے تھے۔ پنشن یافتہ بڈھوں کا سب سے اہم کام اخبار پڑھنا ہی ہوتا ہے۔ ایک صفحہ پر کھلونوں کا اشتہار تھا۔ اُن کی نگاہیں وہیں جم گئیں لیکن دماغ کہیں اور بھٹکا سا تھا۔

"خدا نے مجھے دیا تو بہت دیا ہے" وہ سوچ رہے تھے۔ "گھر میں بچہ نہ تھا میں نے چاہا خدا نے مجھے بیٹا دے کھیلنے کے لئے ... لیکن خدا نے مجھے کھیلنے کی بجائے اتنا نیک ...

... کھیلنے ... آپ ... کی ... پہلا

کھلونا۔ اس وقت وہ تو انسپکٹر پولیس بنا امنِ عامہ کا نگہبا[illegible] اس کا ایک ایک حکم کتنا رعب دار ہوتا ہے۔ لیکن کسی زمانے [illegible] اس کی باتیں میرے لئے کتنی روح افزا تھیں۔

پڑوس میں بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے کہ گلی آکر ڈپٹی صاحب [illegible] برآمدے میں گری۔ آواز سے اُن کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ شوخ و شریر بچہ گلی اٹھانے کے لئے اُن کے بنگلے میں داخل ہونا چاہ[illegible] مگر برآمدے میں انہیں بیٹھا دیکھ کر واپس کھسکنے لگا۔ بالکل رشید کی [illegible] انہیں وہ بچہ بالکل رشید دکھائی دیا۔ تاو دیکر اُسے بلا یا [illegible] لے جانے کو کہا۔ اب بھی لوگ اُن سے ڈرتے تھے۔ گزری ہو[illegible] کے دن پھر اُن کے سامنے آگئے۔ اُن کا سینہ خود بخود تن گیا۔

"میں جوانی میں کتنا سخت دل مشہور تھا۔ جہاں میں گیا اور چوروں نے میرا علاقہ چھوڑ دیا۔ بڑے بڑے خطرناک [illegible] سے میرا مقابلہ ہوا لیکن میں کبھی نہ ہارا۔ جوانی میں میری حالت چیتے کی طرح تھی جسے شکار کو دبوچنے کی بجائے اس پر [illegible] زیادہ لطف آتا ہے۔

میں افسر ہونے کے لحاظ سے تو بڑا کامیاب تھا لیکن [illegible] کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ کوتوالی کی ہاؤ ہو کے بعد جب گھر پہنچتا [illegible] بالکل سونا سونا نظر آتا۔ کوئی دل بہلانے کا سامان نہ تھا۔ آخر [illegible] تیری آس ملی اور مجھے بھی ایک پیارا بچہ عطا کیا، کھلونا،

ایک تھانیدار بھی انسان ہو سکتا ہے، میرے دل میں [illegible] کا چشمہ پھوٹ پڑا۔

میں باہر سے آتا تو ننھا رشید ... کی ...

[illegible] سدی جہاں ایک دنیا کے لئے ہیبت کا نشان
تھی میرے بچے کے لئے کھیل تھی، مذاق میں ٹی کی یہ پہلی زنجیریں اس کی
دلچسپی کا سامان تھیں۔ میرے سینے پر ٹھا تھا کہ وہ جاتا تھا میرا دل —
یہ ایک جبت کا [illegible] بن کر بلنے لگتا اور اس کا ننھا منا ہاتھ ہمیشہ
میری مونچھوں پر پڑتا۔

زمانے میں ایک شخص کے دل میں پیار تھا۔ وہ بچے کو اٹھا کر لے
جاتا اور دن بھر اُسے کھلاتا رہتا، اس کے لئے میرے دل میں کس قدر
عزت تھی میں نے ہمیشہ اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس کی اکثر خطا
کو نظر انداز کیا حالانکہ یہ میرے اصول کے خلاف تھا۔ اس کی محبت
کا اثر بچے پر بھی تھا۔ جب اُس نے بولنا سیکھا تو وہ دو الفاظ تھے۔
جنہیں وہ بار بار دہراتا تھا۔ "ابا" اور "کان" (میرے سپاہی کا نام
خان محمد تھا)، جب وہ یہ الفاظ توتلی زبان میں کہتا تو مجھے ایسا معلوم
ہوتا گویا دونوں جہان کی دولت مجھے مل گئی ہے۔

"حضور کھانا تیار ہے"۔ خادم نے آکر اطلاع کی۔ ڈپٹی صاحب
ذرا چونکے۔ "آتا ہوں" انہوں نے جواب دیا۔ اچانک اُن کی نگاہ سامنے
لٹکی ہوئی تصویر پر جا پڑی۔ وہ اس موقع کی تصویر تھی جب انہیں
ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدہ پر ترقی ملی تھی۔ نگاہیں اٹھیں لیکن پھر
اخبار پڑھتے میں کھلونوں کے اشتہار میں ایک ننھا سا بچہ باپ کو انگلی
سے بتا رہا تھا کہ وہ فلاں کھلونا لیگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ مچل رہا ہے

رشید بھی تو اکثر مچل جایا کرتا تھا۔ جب مجھے کنگز پولیس میڈل
ملا۔ تو میں [illegible] گھر پہنچا۔ گھر میں مہمان مبارکباد دینے کے لئے
[illegible] مجھے [illegible] سے بچا لیا تھا اور اس بہادری کے
[illegible] مجھے سب سے [illegible] رشید بھی [illegible] پہنا [illegible]
[illegible] میرے سینے
[illegible]

اُس نے اس وقت تک مجھے نہ چھوڑا جب تک میں نے تمغے کو اس
کے سینے پر آویزاں نہ کر دیا۔ پھر وہ خوش ہو کر میری نقل اتارنے لگا اور
کمرے میں لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ کرتا کبھی ادھر جاتا کبھی اُدھر

ساری تقریب کا مزہ رشید کی اس معصوم ادا اور دلآویز حرکت
کے سامنے ہیچ تھا۔ میں نے فرط مسرت سے اُسے اٹھا کر سینے سے لگا
لیا۔ میں کتنا خوش تھا۔ شاید اگر میرا سینہ ایسے تمغوں سے بھر دیا جاتا
اور تمام دنیا کی حکومت مجھے دے دی جاتی تو اس قدر خوشی نہ ہوتی
جتنی رشید کی معصوم شرارتیں مجھے خوش کرتی تھیں۔ مہمانوں کے
چہروں پر خوشی کے آثار تھے اور ماں۔ میری زندگی کا معیار میرا رشید تھا۔

کھلونوں کا بیاہ بھی تو ہوتا ہے۔ بچے اکثر یہ کھیل کھیلتے ہیں۔
ایک بار انہوں نے بھی رشید سے پوچھا تھا کہ وہ کس سے بیاہ کریگا۔
رشید نے کہا امی جان سے، اور پھر وہ دوڑ کر ماں کے گلے سے چمٹ
گیا تھا۔

"نا بیٹا نا" انہوں نے اس سے کہا تھا۔ "تم گڑیا سے بیاہ کرنا"۔
مگر وہ پھر مچل گیا۔ اُسے تو امی جان سے بیاہ کرنا تھا۔ ماں سے اُسے
کس قدر پیار تھا۔

اور ماں، اس کے لئے رشید جوان ہو کر بھی بچہ ہی تھا۔
وہ جب بھی رشید کا نام لیتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا
گویا وہ دس بارہ سال کے بچے کا ذکر کر رہی ہے۔ میں اب بوڑھا
ہوں، میری زندگی کا سہارا بھی تو یہی کھلونے ہیں۔ زندگی ایک مسلسل
دکھ کا نام ہے۔ مگر یہ کھلونے اسی دکھ کو راحت میں تبدیل کر دیتے ہیں
مجھے [illegible] انہیں کھلونوں سے [illegible] ہے [illegible] زندگی کے بغیر دنیا خراب
رہتا [illegible] ایک سے [illegible] چھن جائے۔

رشید کی ماں کو ہر وقت اس کی شادی کا خیال [illegible]
[illegible]

... دل مسرت وشادمانی سے لبریز تھا۔ خدا نے مجھے ایک کھلونا دیا۔

لیکن اگر ... خدایا! امینہ نے جب بچے کو پیار کر کے مجھ سے کہا تھا۔ ابا جان دیکھئے اس کا رنگ کیوں زرد ہو گیا ہے تو اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔ ان میں ایک خطرہ تھا۔ میں اس کی تاب نہ لا سکا۔

تین دن اور تین راتیں میں نے خدا سے دعائیں مانگیں نمازوں کے سجدوں میں رگڑ رگڑ کر نیم شب کو بیدار ہو کر میں بھول گیا تھا کہ میں بوڑھا ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔

مجھے دوڑتے ہوئے نوکر سست دکھائی دیتے تھے۔ ڈاکٹر کے لئے میری گاڑی بھی زیادہ تیزی سے چلتی ہوئی معلوم نہ ہوتی تھی میرا کھلونا۔ اگر۔ او خدایا پھر کیا ہوتا۔ میرے رشید کے دل میں جو چشمہ ابلنے والا تھا وہ خشک ہو جاتا۔

اچانک ڈپٹی صاحب کے ہاتھ سے اخبار گر پڑا۔ ان کی آنکھیں پرنم ہو گئی تھیں۔ اندر سے انہیں آمنہ کی نحیف آواز سنائی دے رہی تھی۔ "ابا جان سے کہو کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

(مرسلہ سکرٹری حلقۂ اربابِ ذوق)

شیر محمد اختر

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبح گاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تیری پادشاہی

اقبال

اصغر کا روزنامچہ

اتوار۔ ۸ ؍ جنوری ۱۹۳۹ء

جیسا اتوار کا معمول ہوتا ہے دوپہر تک میں نے سستی میں وقت گزار دیا اور دو بجے تک کپڑے بھی نہ بدلے۔ دن بھر مجھ پر سستی
ائی رہی اور گویا ابد تک چھائی رہتی اگر میں ایک اعلیٰ درجے کے کانسرٹ (محفلِ سرود) میں چلا نہ جاتا۔ بیچم والا گیت خوب تھا،
وزر والا افتتاحی نغمہ اتنا اچھا نہ تھا جتنا میرے ریکارڈ میں ہے لیکن بیٹھوون کی دوسری سمفنی (نغمہ) پر تو میں بالکل مست ہو گیا۔
ہ نے خیال کیا کہ اس کی دوسری "حرکت" واقعی شاندار ہے۔ ویلاں اور واگنر کے دو چھوٹے افتتاحی نغمے خوب ادا کئے گئے۔
طور پر پہلا بیچم نے نغمہ سازوں کے خیال کو خوب قلم بند کیا ہے۔ اس کے بعد بیٹھوون کی ساتویں سمفنی تھی جو بلاشبہ اپنے فن
ں بے نظیر چیز ہے۔ اس کا آخری حصّہ انتہا درجہ دلفریب تھا۔ یہ سہ پہر نہایت لطف سے کٹی۔ کاش میں ٹرم شروع ہونے سے
ندا ور ایسی محفلوں میں شریک ہو سکوں لیکن اب تو میرے لئے صرف تین دن رہ گئے ہیں ؛

رات میں بہت دیر میں سویا کہ میں موسیقی پر ایک اعلیٰ درجے کی کتاب کا مطالعہ کرتا رہا۔ جتنے بھی زیادہ "پکّے" اور گہرے راگ
نتا ہوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی اور دنیا میں جا نکلتا ہوں ایک حسین اور پاک و صاف دنیا، دنیا "جیسی کہ ہونی چاہیئے"
ل اس کے جیسی کہ ہے"۔ رشید کا مجھے ایک خط ملا وہ سکواش کے کھیل سے خوب دلچسپی لینے لگا ہے اور یہ باوجود اپنے
ہ!

(ترجمہ ۔۔۔)

اصغر بشیر

محفل ادب

تو اگر واپس نہ آتی

(۱)

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اُٹھتا بطونِ خاک سے
ہات آجاتا اگر تیرا نہ میرے ہات میں
دل پہ کیا کچھ بیت جاتی اس اندھیری رات میں
اُف وہ طوفاں، وہ بھیانک تیرگی، وہ ابر و باد
وہ ہوائے تند بلاں، وہ خروشِ برق رعد
دفعۃً وہ روشنی کے سلسلے کا ٹوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھوٹنا
وہ اُبالو کے کلیجے کو مچلتی "مان سون"
وہ سمندر کے تھپیڑے، وہ ہواؤں کا جنوں
اور اس طوفان میں اے زندگی کی روشنی!
کود پڑنا وہ سمندر میں ترا ایک بارگی

(۲)

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اُٹھتا بطونِ خاک سے
اس دلِ سوزاں میں آتے اس بلا کے زلزلے
آسماں روتا، زمیں ہلتی، ستارے کانپتے
موت اور پھر موت تیری، الحفیظ و الاماں!
ہڈیوں سے آنچ اٹھتی اور بالوں سے دھواں
لیکن اک لمحے کے بعد اے پیکرِ حسن و حیات
جوش کو بھی کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات
پہلے ہوتا اک تلاطم ایک طوفاں، ایک جوش
بعد ازاں تموّج میں اور بحر و باراں کا خروش
اتّصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں
آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

(۳)

بحر کے سینے کو جب طوفان میں لاتی ہوا
پے بہ پے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا
جب گھٹائیں رقص کرتیں اور پپیہے کوکتے
نور میں لپٹے ہوئے دونوں اُبھرتے بحر سے
رات جب کچھ بھیگ جاتی اور جھک جاتا قمر
سیر کرتے رقص ہم باہیں گلوں میں ڈال کر
کوئلیں جب کوکنے لگتیں اندھیری رات میں
صبح تک دھومیں مچاتے ہم بھری برسات میں
چھوڑتا جب کوئی ساحل پہ ہماری داستاں
پڑنے لگتیں بحر پر ہلکی سی دو پرچھائیاں

زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم — سانس لیتے سازِ حسن و عشق کے تاروں میں ہم
وقف ہو جاتے محبت کے فسانے کے لئے — سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لئے

جوش ملیح آبادی

جوش کی اس نظم کی کیفیت ایک تیرہ و تار خلا کی سی ہے یہ خلا ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہمارے قدموں کے نیچے ہے۔ اس خلاء کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے ہمیں شبہ سا ہوتا ہے کہ مفہوم کا اجالا دکھائی دینے کو ہے۔ اور پھر جوں جوں ہم مصرعوں کے زینے طے کرتے جاتے ہیں اور قصے کی گہرائی میں اترتے جاتے ہیں، مفہوم کا وہ چمکتا ہوا جو سر چوٹی میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ ساتھ رکھا ہوا ہے ہمیں پہلے جھلملاتا اور پھر چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہمیں زینوں کا احساس نہیں رہتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم فضا میں معلق ہیں اور نیچے اترتے چلے جا رہے ہیں، بلند و پست کا احساس ہے دگر و پیش کا، خون کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ متضاد کیفیت بھی قائم ہے کہ ہر سمت کا شعور بیدار ہو رہا ہے، یوں سمجھئے کہ اس نظم کے الفاظ سے مفہوم تک پہنچنے کی کیفیت اس ہوا باز کے احساس سے ملتی جلتی ہے جو طیارے سے چھتری لے کر کود پڑا ہو اسی کی طرح زمین پر پہنچ کر قصہ قائم ہوتا ہے قصہ یوں ہے:۔

شاعر ساحلِ بحر پر ایک عورت کو ڈوبنے سے بچا لیتا ہے بس لیکن اس مختصر سی بات سے بھی کئی باتیں نکلتی ہیں۔ سب سے پہلے تو اسی کا تعین کیجئے کہ شاعر کون ہے؟ وہ عورت کون ہے۔ کئی مفروضے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ ساحل پر ایک شاعر اس نظم کا شاعر بیٹھا ہوا ہے۔ اچانک وہ سنتا ہے کہ نہاتے ہوئے کوئی عورت ڈوب گئی۔ شاعر کو اس خبر سے تحریکِ شعری ہوتی ہے یا وہ سنتا ہے کہ کسی عورت نے خودکشی کے ارادے سے اپنے جسم کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا لیکن بچالی گئی۔ شاعر کو اس خبر سے تحریکِ شعری ہوتی ہے یا شاعر بھی ساحل پر نہانے والوں میں سے ایک تھا نہاتے ہوئے اچانک اس کے ہاتھ میں کسی عورت کا ہاتھ آگیا اور اسے صرف یہ خیال آیا۔ شاید کوئی لہر اس کے ہاتھ سے یوں چھو گئی گویا کسی ڈوبتی ہوئی عورت کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ تحریکِ شعری کی صورت تو اسی طرح کے مختلف نقشوں میں سے معین کی جا سکتی ہے لیکن ہمارا استفسار ابھی تک قائم ہے۔ شاعر کون ہے؟ — وہ عورت کون ہے؟ شاعر ایک عاشق ہے اور وہ عورت اس کی محبوبہ اب ایک اور ہی رنگ میں قصہ قائم ہو جاتا ہے۔ شاعر اور اس کی محبوبہ ایک ساحل پر بیٹھے ہیں۔ ہوا تند و تیز ہے اخروشِ برق و رعد ہے۔ بارش کا سلسلہ جاری ہے سمندر کے تھپیڑے ایک وحشیانہ انداز میں ساحل سے ٹکرا رہے ہیں۔ اس ہیبت ناک ماحول میں یہ دونوں ساحل کے کنارے پر کیوں بیٹھے ہوئے ہیں نہ جانے کس طرح کس مشکل سے یکجائی کا حاصل ہوا ہے۔ اتصالِ روح اتصالِ موت کے گرداب میں ہے۔ ابھی اتصالِ روح نہیں ہو پایا آتشِ غم سرد ہو جاتی کتنا یا بھی ہے۔ کوئی غم نہیں لاحق ہے مستقل طور پر ہم آہنگ نہ ہو سکے [illegible] میسر نہیں ہو سکے کے بعد میسر کرنے۔ اور دونوں چاہتے [illegible]
[illegible] اس بات [illegible] حاصل نہیں ہے۔ شاید [illegible]
[illegible] وہ موقع سے [illegible] اچانک [illegible]

[illegible] نے کہا "میں ... کو دیا ہے" ایک بجلی چمکتی ہے اور اس روشنی کے سلسلے میں محبوبہ کا ہات شاعر کے ہات میں [illegible] ... سے پہلے کہ ... آتا ہے اب اسے تحریک شعری ہوتی ہے ابھی اس کے اعصاب اس ہنگامے، اس [illegible] المناک واقعے کے اثرات سے رہائی نہیں پا سکے، ڈھیلے نہیں ہوئے کسی حد تک تنے ہوئے ہیں وہ سوچتا ہے کہ اگر وہ اپنی محبوبہ کو بچا نہ سکتا تو کیا ہوتا۔ ہونا کیا تھا، وہ بھی اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیتا اور پھر اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں ... یوں مرنے کے بعد ان کی داستان ہی ساحل پر باقی رہ جاتی اور غم کے پرستار محبت کے اس افسانے کو دہرا دہرا کے گریاں کرتے۔ اور یوں سرد ہو کر یہ دونوں عاشق "زمانے کے لئے آگ بن جاتے"۔

لیکن کیا یہ نظم فراق کے بعد محبوبہ سے دوبارہ ملنے کا استعارہ تو نہیں ہے کیا فراق کی کیفیت ایک بحرِ ہیبت ناک نہیں ہو سکتی؟ اس صورت میں قصہ یوں ہو جائے گا کہ کچھ مدت جدا رہنے کے بعد شاعر کو اپنی محبوبہ سے ملنا میسّر ہوتا ہے۔ وہ ایک تسکین کے ساتھ اس کا ہات اپنے ہات میں تھام لیتا ہے۔ اس لمحے میں اُسے یوں محسوس ہوتا ہے گویا اُس نے کسی بحرِ ہیبت ناک کے قہر و غضب سے رہائی پائی ہے۔ اور پھر اس کا تخیل باقی تمام نظم کھڑی کر دیتا ہے۔

قصے کی اشاراتی کیفیتوں کا ذکر تو ہو چکا۔ اس کے علاوہ جس فن کارانہ بانکپن سے جوش نے اس نظم میں ہیرو کی ذہنی کیفیت کی مطابقت میں ماحول قائم کیا ہے وہ بھی لائقِ تحسین ہے۔ ذاتی طور پر میرے ذہن میں اسے پڑھ کر ایک ویسی ہی اجاڑ، المناک اور سنجیدہ کیفیت طاری ہو گئی تھی جو مغربی ناول نویس اور شاعرہ ایملی برونٹی کی بعض نظموں سے پیدا ہوتی ہے اور خصوصاً اس کے مشہور ناول "وُدَرِنگ ہائٹس" کے جذبۂ محبت کا گھنا، گرم جادو تو اس تاثر سے بہت ہی ملتا جلتا ہے۔

"میراجی"

"ادبی دنیا"

اقبال کے آخری چوبیس گھنٹے

اقبال کے انتقال کو آج پورے تین سال ہوتے ہیں۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو پانچ بجنے میں ابھی چار پانچ منٹ تھے کہ حضرت علامہ نے فرمایا مجھے فروٹ سالٹ دو۔ میں نے فروٹ سالٹ کا گلاس [illegible] ان کی خدمت میں پیش کیا۔ بھرا ہوا گلاس دیکھ کر فرمایا۔ "لیکن میں یہ گلاس کیسے پی سکتا ہوں" [illegible] ایک لمحے کے توقف کے [illegible] سے [illegible] بیٹھ جائے گا۔ اس کے بعد آپ فروٹ [illegible]

[illegible] اپنے دل کے نزدیک ہاتھ رکھ کر ہائے کہا۔ علی بخش نے انہیں اپنے بازوؤں میں تھام کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ لمحہ بھر سکون ہونے پر آپ نے کہا "مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے میرے دل میں چھری بھونک دی ہو" پھر آنکھیں اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا ان کی زبان پر آخری لفظ "اللہ" تھا۔ علی بخش نے اپنے زانو اٹھا لئے اور حضرت علامہ قبلہ رخ ہو کر لیٹ گئے۔ ابھی ان کا سر تکیے سے لگا ہی تھا کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس طرح [illegible] سال کی عمر میں [illegible] زندگی کی مسافت [illegible]

[illegible]

خصوصیات جس کے متعلق دوست دشمن سب کا اتفاق ہے کہ [illegible]
علوم اسلامی [illegible] مفکرین کی صفِ اول میں جگہ پانے
کے قابل ہے اور جن کا امیر شکیب ارسلان نے اپنے ایک خط میں لکھا
کہ گذشتہ پانچ سو برس میں اسلامی دنیا میں آپ کے پایہ کا کوئی واقفِ
اسرارِ دین نہیں پیدا ہوا۔

---

۲۰ اپریل کی صبح کو انہوں نے حسبِ عادت چائے کی ایک پیالی
نوش کی پھر اخبارات پڑھوا کر سنے اور حجام کو بلوا کر حجامت بنوائی۔
ان کی ظاہری شکل و صورت میں کوئی غیر معمولی تبدیلی آج بھی نہیں
تھی لیکن میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے پڑ گئے
تھے اور آنکھوں کے گرد کچھ سوجن بھی نمودار ہو رہی تھی۔
جاوید منزل کے ڈرائنگ روم سے ملحقہ کمرہ میں وہ ایک چارپائی
پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے تھے۔ گاؤ تکیہ کو کبھی کبھی آگے رکھ کر
اس پر بھی ٹیک دیتے تھے۔ خادم باری باری ان کے جسم کو دباتے
تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو کھانسی بہت شدید ہوتی تھی۔ آج تو کھانستے
کھانستے وہ ہلکان ہی ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ جو انہیں کھانسی
آئی تو انہوں نے بلغم تھوکا تو اس میں خون بھی شامل تھا۔ اس کے
بعد وہ جب بھی بلغم تھوکتے تھے اس میں خون کی آمیزش ہوتی تھی۔
۱۰ بجے کے قریب ڈاک آئی۔ اس میں نظام کے ایک انگریزی اخبار
کا تراشہ بھی موصول ہوا جس کا مضمون یہ تھا کہ نظام کے مسلمانوں نے
[illegible] اقبال کی
[illegible]
[illegible]

تمہاری عمر کے لئے تو اب [illegible] انہیں [illegible]
میں تو اپنی زندگی کا کام ختم کر چکا ہوں اب تو مسلمانوں کو [illegible]
جناح کی ضرورت ہے۔ اس لئے انہیں ان کے لئے زندہ رہنا چاہئے
ساڑھے چار بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب کے ایک پرانے
جرمن دوست بیرن فان والتھیم ملنے کے لئے آئے۔ یہ گاؤ تکیہ پر
سر ٹیکے بیٹھے تھے۔ جونہی ان کے دوست نے کمرے میں قدم رکھا۔
انہوں نے اس شیر کی طرح جو بڑھاپے میں بھی اپنا وقار قائم رکھتا ہے
گردن اٹھائی اور استفہامیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ بیرن
نے اپنا تعارف کرایا کہ ہم طالب علمی میں میونخ یونیورسٹی میں دوست
ہوا کرتے تھے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کے چہرہ پر بشاشت کی لہر
دوڑ گئی۔ اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور ان سے اپنی لینڈ لیڈی،
اس کی بیٹی اس زمانے کے دوستوں اور رفیقوں کے متعلق سوالات
کرتے رہے ان کی اس گفتگو سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ نووارد
جرمنی کے بہت بڑے "نواب" ہیں۔ اور اب مشرقی ممالک کی سیاحت
کی غرض سے گھر سے نکلے ہیں۔
ڈاکٹر صاحب میں یہ بات بڑی تعجب انگیز تھی کہ ادھر تو وہ ابھی
درد کی شدت سے تلملا رہے تھے۔ ادھر جونہی کوئی ایسا ملاقاتی
آتا جو اپنی باتوں سے ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ سکتا۔ آپ
گفتگو میں ایسے محو ہو جاتے گویا انہیں کوئی تکلیف تھی ہی نہیں
اب بھی وہ اسی انہماک سے بیرن سے گفتگو کرتے رہے [illegible]
میں موسم کیسا ہوگا۔ وہاں کس قسم کے پھل [illegible]
کیسا ہوتا ہے [illegible]
[illegible]
جب [illegible]

[illegible] بہت دلچسپ
باتیں کیا کرتے تھے اس وقت بھی اگرچہ انہیں بولنے میں دقت
ہوتی تھی تاہم وہ بڑی گرم جوشی سے باتیں کئے جاتے تھے۔
[illegible] آپ سے [illegible] فلسفوں پر گفتگو شروع
ہو گئی جرمن فلاسفی کے متعلق ان رجحانات پر بھی انہوں نے اظہار
خیال فرمایا۔

بین الاقوامی سیاسیات کا ذکر آنے پر آپ نے یہ فقرہ کہا۔

These things are not to be talked of openly.

میں محسوس کر رہا تھا کہ میرن بوڑھے شاعر کی نازک صحت کے
پیش نظر گفتگو کو طول نہیں دینا چاہتا۔ اس نے کہا بھی کہ میری
موجودگی سے شاید آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب
نے فرمایا۔

It is just the other way. your breath is like balm to me.

بالآخر کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد میرن والتھیم صاحب نے اجازت
طلب کی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا۔

یہاں میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں، کہ ڈاکٹر صاحب آنے جانے
والوں سے شاذ و نادر ہی ہاتھ ملایا کرتے تھے صرف زبان سے سلام
کا جواب دے دیا کرتے تھے مگر انتقال سے چار پانچ روز پہلے میں نے
[illegible] حیرت سے دیکھا کہ جب کوئی آدمی اُن کے پاس سے اُٹھ کر جاتا
[illegible] ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیتے تھے۔ شاید انہیں
معلوم ہو چکا تھا کہ اب چند ہی دنوں میں سب سے رخصت ہونا ہے
[illegible]
[illegible]

تھی اور خاموشی سے اُن کے پہلو میں بیٹھ جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب
کی قوت بینائی بہت کمزور ہو چکی تھی اس لئے وہ آواز سن کر ہی
دوسروں کو پہچان سکتے تھے۔ منیرہ بانو جب اُن کے پاس بیٹھ جاتی
تھی تو بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے
تھے۔ تو بانو ہے۔

ایک بار جب وہ اُٹھ کر گئی تو انہوں نے انگریزی میں فرمایا۔

She instinctively realises that father's death is near at hand.

منیرہ بانو عام طور پر ڈاکٹر صاحب کے پاس دن میں صرف دو تین مرتبہ ہی
آیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ سکول جانے سے پہلے پھر سکول سے واپس آنے پر
اور شام کو سونے سے پہلے جب بھی وہ اُن کے پاس آتی تھی تو یہ بلا ناغہ اس سے پوچھتے
تھے کہ آج کیا کھایا ہے؟ کتنا کھایا ہے؟ وہ معصومانہ انداز
سے ہاتھوں کے اشارہ سے بتایا کرتی تھی کہ آج میں نے اتنے
چاول کھائے یا اتنی روٹیاں کھائیں۔ یہ سن کر آپ کہتے کہ بس صرف
اتنا ہی کھایا۔ ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ بچوں کو صرف کھانے
پینے کا شوق ہوتا ہے۔ اس لئے اُن سے صرف کھانے پینے کی
باتیں کرنی چاہئیں۔ اسی سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ ایسی باتیں کرنے
کے بعد وہ خود ہی اُٹھ کر کھیلنے یا پڑھنے چلی جاتی تھی۔ مگر آج وہ ڈاکٹر
صاحب کے پاس سے اُس وقت تک نہ اُٹھی تھی جب تک وہ
خود اس سے نہ کہتے تھے کہ بانو اب تم اپنی مُنّی جان (منیرہ اپنی جرمن
گورنس کو مُنّی جان کہہ کر پکارتی تھی) کے پاس جاؤ۔

اب سُورج غروب ہو چکا تھا اور دالان کی چارپائی ڈرائنگ روم
میں منتقل ہو گئی۔ اسی وقت فاطمہ بیگم صاحبہ پرنسپل جناح اسلامیہ
[illegible] ڈاکٹر صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ
اُن کے سکول میں لڑکیوں کو قرآن پڑھانے کا کیا انتظام ہے [illegible]

بعد انہوں نے ان سے منیو کو قرآن پڑھانے کے لئے ایک اچھا ٹیوٹر مہیا کرنے کے لئے کہا۔

ڈاکٹر صاحب کے عقیدتمندوں میں سے اس وقت چودھری محمد حسین، سید نذیر نیازی، سید سلامت اللہ شاہ، حکیم محمد حسن قرشی اور راجہ حسن اختر موجود تھے۔ ان کے ایک رشتہ دار ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب بھی موجود تھے۔

یہ سب اصحاب محسوس کر رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی صحت کی حالت نازک ہو چکی ہے اور وہ اس کے متعلق آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب غصہ میں آ گئے اور فرمایا کہ تم اونچی آواز میں گفتگو کیوں نہیں کرتے۔ اسی وقت کمرہ میں ڈاکٹر صاحب کا چھوٹا صاحبزادہ جاوید داخل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "یہ کون ہے؟" اس نے کہا "میں جاوید ہوں" اس پر انہوں نے فرمایا "ادھر آؤ اور میرے پاس آ کر بیٹھو" پھر کہا "میں یہی چاہتا ہوں کہ تم جاوید بن سکو۔ اور اس کا ایک گر یہ ہے کہ تم میری آنکھوں کے سامنے رہا کرو۔" اس کے بعد چودھری محمد حسین کو مخاطب کر کے فرمایا "آپ کو یاد ہوگا کہ میں اس کی پیدائش پر اسے مجدد صاحب کے دربار میں لے گیا تھا۔ اور وہاں اس کے حق میں یہ دعا کی تھی کہ اللہ اسے موجودہ دور کی مادیت اور دہریت سے محفوظ رکھے۔"

اب ان کی چارپائی کوٹھی کے باہر میدان میں ڈال دی گئی اور کرنل امیر چند، میجر الٰہی بخش اور ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے ان کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ رات گزر جانے کے بعد علی الصباح ٹیکے لگائیں گے۔

ساڑھے دس بجے ڈاکٹر صاحبان تشریف لے گئے۔

اب ہوا میں کچھ خنکی آ گئی تھی اور چارپائی کو دوبارہ ڈرائنگ روم میں نکالا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے الٰہی بخش کو جو بہت [illegible] تھا اپنے پاس بلایا [illegible] کرنے کے لئے [illegible] بیٹھے ہوئے چودھری محمد حسین نے کہا "دیکھئے نا چودھری صاحب یہ چالیس سال کی رفاقت کا معاملہ ہے۔"

ساڑھے گیارہ بجے انہیں کھانسی کی دوا دی گئی جس سے انہیں متلی شروع ہو گئی اور فرمانے لگے۔ "کہ ڈاکٹروں کی دوائیاں (،،،،) نہیں ہوتیں۔" گزشتہ چار پانچ روز میں ڈاکٹر صاحب کا علاج کئی بار بدلا گیا تھا۔ پہلے شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی کا علاج ہو رہا تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے منع کرنے کے باوجود حکیم صاحب کے دوست انہیں طبّی بورڈ کے سلسلہ میں راولپنڈی کھینچ کر لے گئے تھے۔ جس کا ڈاکٹر صاحب کو بہت صدمہ تھا۔ اور ناچار انہیں ایلوپیتھی طریق علاج اختیار کرنا پڑا۔

متلی بند کرنے کے لئے انہیں الائچی اور کوزہ مصری دی گئی۔ اس سے ان کی طبیعت میں قدرے سکون پیدا ہو گیا۔ ان کی عادت تھی کہ ہر موقع اور موضوع کو (،،،،) کیا کرتے تھے چنانچہ اپنے علاج کے متعلق بھی فرمایا کہ نہیں تو یہی پتہ ہے کہ جو نسخہ ڈاکٹر یار محمد نے تجویز کیا تھا اسے کپتان (اب میجر) الٰہی بخش نے منسوخ کر دیا اور جو نسخہ کپتان الٰہی بخش نے تجویز کیا اسے کرنل امیر چند نے منسوخ کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ چونکہ ابھی تک انسانی زندگی کے متعلق حکما کو پوری واقفیت نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ سائنس بھی جو انسانی امراض کا دفعیہ کرے لازمی طور پر مکمل نہیں ہو سکتی۔

ڈاکٹر صاحب کے دوستوں نے بڑی کوشش کی کہ وہ خواب آور دوا کی ایک خوراک پی لیں۔ ان کا اصرار بڑھتے دیکھ کر انہوں نے کہا "اچھا چکھ کر مجھے دوائی کا ذائقہ بتاؤ۔" ذائقہ نمکین بتایا گیا تو آپ نے دوا پینے سے قطعاً انکار کر دیا۔

اب رات کے بارہ بج چکے تھے اور سب دوست شب بخیر کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اس وقت آپ کی [illegible] ایک

ایک گھنٹہ تک سوتے رہتے ... پھر آپ کو بے چینی شروع ہو گئی۔ شانوں کے درمیان شدید درد کی شکایت کرتے تھے۔

بار بار پوچھتے تھے۔ اب کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نے دوا کی ایک خوراک پینے کا مشورہ دیا۔ میں نے بھی عرض کیا کہ آپ پی لیں۔ تاکہ نیند آجائے۔ اس پر وہ ناراض ہو گئے اور غصہ سے کہا جب میں تم سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میں یہ دوا نہیں پیوں گا پھر تم اصرار کیوں کرتے ہو؟

اس کے بعد نرم لہجہ میں فرمایا۔ بات یہ ہے کہ اس دوا میں افیون کا جزو ہے اور میں بے ہوشی میں مرنے کو تیار نہیں ہوں۔

رات ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی ان کی طبیعت زیادہ بے چین ہو جاتی تھی اور کبھی قدرے سکون پذیر۔ اس کے بعد پھر درد کا دورہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس رات انہوں نے حقہ بالکل نہیں پیا۔ بار بار وقفوں کے بعد پوچھتے تھے کہ اب کیا وقت ہے؟ سب سے یہی تقاضا کرتے تھے کہ میرے پاس ہو کر بیٹھو اور اگر کوئی سونے کا ارادہ کرتا تھا تو فرماتے تھے کہ آج کی رات اور جاگ لو۔

ہوشیارپور کا ایک شخص دیوان علی ان کا ملازم تھا۔ وہ گانے کا شوقین بھی تھا۔ مگر پنجابی کے چند دوہوں اور دو ایک گھٹیا اُردو غزلوں کے سوا اُسے اور کچھ یاد نہ تھا۔ اردو الفاظ کا تلفظ اس طرح بگاڑتا تھا کہ ذوقِ سلیم کو سخت گراں گزرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اسے پنجابی کے دوہے گانے کے لئے کہا کرتے تھے۔ آج رات بھی انہوں نے اسے گانے کے لئے کہا۔ اس نے بلھے شاہ کی یہ کافی گانی شروع کی جس کا ایک بیت یہ ہے

بلھیا مل دوستی سیانا ... اِدھر ول جُھنا گھر لانا

یہ بیت سن کر ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے ... کتنی سچی بات ہے۔

پھر یا پچھلا یا ڈاکٹر عبدالقیوم، علی بخش، دیوان علی اور میں انہیں باری باری دباتے رہتے۔

تین بجے کے قریب اُن کی طبیعت بہت بڑھ گئی۔ مجھ سے فرمایا کہ جاکر حکیم محمد حسن قرشی کو بلا لاؤ۔ راجہ حسن اختر صاحب جو اب شیخوپورہ میں افسر مال ہیں کوٹھی کے باہر صحن میں سو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انہیں میرے پاس بھیج دو مجھ سے باتیں کریں۔

میں نے حکیم صاحب کے مطب پر جا کر آوازیں دیں مگر وہ اوپر کی منزل میں سو رہے تھے۔ لہٰذا میری آواز اُن تک نہ پہنچ سکی۔ اُن کے مکان کے سامنے ایک آدمی سو رہا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اُن کا ملازم تھا اور اُس کے پاس ... لیکن آہ! میری لاعلمی میں ناکام واپس لوٹ آیا۔ جب ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ حکیم صاحب مجھے نہیں مل سکے تو فرمایا۔ "دیکھئے! قرشی صاحب بھی نہیں آ سکتے۔" اب ...

آپ نے ڈاکٹر عبدالقیوم سے پوچھا کہ طبی طب بیماری کی موجودہ کیفیت کا کیا نام ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے کہا کہ اسے Insomnia اور Restlessness کہتے ہیں اور اس کا علاج [illegible] ٹیکا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ایسے علاج سے میں برداشت کرنا پسند کرتا ہوں۔

اب پھر انہیں قدرے سکون ہو گیا تھا۔ راجہ صاحب والے کمرے میں جا کر لیٹ رہے تھے۔ ... اس وقت اور ... کی مشہور رباعی سنائی ... شعر پڑھ کر ...

سرِ ... فیصلہ ... کنا

... آئیگا

تھوڑی دیر بعد طبیعت پھر خراب ہونا شروع ہو گئی اور انہوں نے راجہ حسن اختر سے حکیم محمد حسن قرشی کو بلانے کے لئے کہا۔ اس وقت پو پھٹ چکی تھی اور اُجالا نمودار ہو رہا تھا۔ راجہ صاحب کو گئے ابھی چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا میری چارپائی اُٹھا کر دوسرے کمرے میں لے چلو۔ اس کے بعد انہوں نے فروٹ سالٹ پیا اور جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں اللہ کا نام ان کی زبان پر تھا جب انہوں نے فرشتۂ اجل کو لبیک کہا۔

انتقال سے ایک ہفتہ پہلے انہوں نے اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب سے جن کا حال ہی انتقال ہوا ہے کہا تھا کہ میں موت کو تبسم ہو کر خوش آمدید کہوں گا اور پھر انہیں اپنا یہ شعر پڑھ کر سنایا تھا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

ان کی موت اس شعر کی تفسیر تھی۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کا آخری دیدار کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کے لبوں پر تبسم رقصاں تھا۔

آج اس جانکاہ حادثہ کو تین سال ہوتے ہیں مگر مجھے یہ کل کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگرچہ موت اقبال کے جسم کو مٹانے میں کامیاب ہو گئی مگر اس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اس کی خودی کو تباہ کر سکتی۔

انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میں دوائیں اس لئے استعمال نہیں کرتا کہ میں اس دنیا میں زیادہ عرصے کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ بلکہ محض اس لئے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا ego بیماری کے حملے سے کمزور ہو جائے۔ اگر اس مرحلہ پر میرا انا ego کمزور ہو گیا تو مرنے کے بعد مجھے دوبارہ جی اُٹھنے میں بہت وقت لگے گا۔ لیکن اگر میں نے اس کو اسی طرح مضبوط رکھا تو مرنے کے بعد جلد جی اُٹھوں گا۔

خدا جانے وہ اس وقت کس زمان و مکان اور کس صورت میں ہیں لیکن میرا ایمان ہے کہ اقبال کہیں بھی ہو وہ مصروفِ تخلیق ہو گا۔ ارمغانِ حجاز کا آخری شعر اس ضمن میں بہت نمایاں ہے ؎

اگر مقصود کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے مرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے

محمد شفیع ایم۔ اے
(نوائے وقت لاہور)

صحت الفاظ

اس عنوان سے حال ہی میں ایک مضمون رسالہ العزمانہ میں شائع ہوا ہے جس میں لوگوں کے طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ "فارسی عربی جانے بغیر اردو نہیں آسکتی۔ بالفاظِ دیگر عربی فارسی کی مدد کے بغیر صحیح اردو بولنا لکھنا ناممکن ہے" یہ الزام نہیں بہتان ہے ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو بہت اچھی اردو بولتے اور لکھتے ہیں حالانکہ وہ فارسی عربی مطلق نہیں جانتے۔ اس کے خلاف بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو عربی فارسی کے فاضل ہیں اُردو نہیں لکھ سکتے۔ بات یہ ہے [illegible] کامل [illegible] نہیں [illegible] زبانوں کی احتیاج [illegible] دوسری زبانوں کی محتاج نہیں رہتیں۔ اگر اُردو کا کوئی ادیب عربی فارسی یا ہندی سنسکرت یا انگریزی جانتا ہے تو یہ خوبی کی بات ہے۔ وہ اپنی زبان کو ان زبانوں کے علم سے بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اُردو کے لئے دوسری زبانیں لازمی طور پر حاصل کرے لیکن اگر وہ جانتا ہے تو یہ اس کے لئے فوقیت کی بات ہے۔ اسی طرح اگر ہندی کا ادیب اُردو فارسی یا سنسکرت یا انگریزی کا بھی عالم ہے تو یہ موجبِ فضیلت ہے چنانچہ ہندی کے اچھے ادیب اکثر وہی ہوتے ہیں جو اُردو یا فارسی بھی جانتے تھے۔ مولانا حالی نے اُردو کے اچھے شاعر کے لئے ہندی بھاشا کا جاننا بھی ایسا ہی ضروری قرار دیا ہے جیسا فارسی عربی کا جاننا [illegible]

بلکہ حقیقت اس کے جدید ہندی میں مشکل پسندی شروع ہوگئی ہے اس لئے کہ جدید ہندی والوں نے صرف مروجہ عربی فارسی لفظ ہی ترک نہیں کئے بلکہ آسان ہندی الفاظ بھی برتش، کو بھی زبان سے خارج کر دیا اور ان کی بجائے اصل سنسکرت لفظ استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ اردو بول چال کی زبان سے بنی اور اب تک بول چال کے لفظ اس میں داخل ہوتے رہتے ہیں اسی لئے اس میں زیادہ وسعت پیدا ہوگئی اور اس کے مقبول ہونے کی یہی ہی وجہ ہوئی۔

اُردو میں سینکڑوں عربی فارسی سنسکرت کے ایسے لفظ ہیں جن کی صورت کچھ سے کچھ ہوگئی ہے اور بہت سوں کے معنے تک بدل گئے ہیں۔ اب چونکہ وہ اسی صورت سے استعمال میں آگئے ہیں اور عام و خاص اسی طرح بولتے اور لکھتے ہیں اس لیے یہی مستند خیال کئے جاتے ہیں اگرچہ وہ اصل کے خلاف ہیں۔ ایک بار سرسید نے مشکور کا لفظ ممنون کے معنوں میں لکھ دیا تھا مولانا شرر مرحوم نے اعتراض کیا۔ اس پر سرسید نے فرمایا کہ شرر صاحب کو اعتراض کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ میرے لکھے سے انہیں سند لینی چاہیئے تھی۔ غرض یہ کہ اُردو کے کسی اعلیٰ ادیب یا ماہر لسانیات نے کسی ایسا خیال ظاہر نہیں کیا کہ اُردو کے فارسی عربی لفظ جن کی صورت شکل بدل گئی ہے اصل زبان کے الفاظ کی طرح لکھے اور بولے جائیں۔ یہ خیال بعض اُن صحت مآبوں کا ہے جو لسانیات کے اصول سے واقف نہیں۔ اس بارے میں ہم مولانا حالی کا قول نقل کرتے ہیں جسے قولِ فیصل سمجھنا چاہیئے۔

"فی الحقیقت یہ ایک غلطی ہے جو اکثر ہمارے عربی دانوں کو علم لسان کی ناواقفیت سے پیش آتی ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہو کر کسی طرح اپنی اصلی صورت پر قائم نہیں رہ سکتے [illegible] دیکھیں جو ہماری اُردو ہی میں بہت سے لفظ سنسکرت [illegible] اصل میں سمجھ سکے نہ فقط وہی ایسے الفاظ [illegible] [illegible] ہندی لفظ

دیکر اُن کی اصل بتائی ہے پھر لکھتے ہیں اسی طرح پراکرت اور بھاشا کے صدہا لفظ اپنی اصل کے خلاف ہماری زبان میں مستعمل ہیں مگر چونکہ ان کی اصلیت سے واقف نہیں اس لئے انکو صحیح سمجھ کر بے تکلف بولتے اور برتتے ہیں لیکن عربی یا فارسی جس سے اُن کو فی الجملہ واقفیت ہے جہاں اس کا کوئی لفظ اصل زبان کے خلاف کسی کی اُردو نظم یا نثر میں دیکھا اور فوراً ناک چڑھائی، حالانکہ خود عربی کے بہت سے الفاظ اصل وضع کے خلاف استعمال کرتے ہیں"۔ اسکے بعد لکھا ہے کہ "علیٰ ہذا القیاس فارسی کے الفاظ بھی اکثر اُردو میں غلط بولے جاتے ہیں۔ اہل ایران عربی کے صدہا لفظ غلط تلفظ کے ساتھ یا غلط معنوں میں استعمال کرتے ہیں مثلاً حوز بجائے حوزہ، حضوری بجائے حضور وغیرہ۔ انگریزی میں تمام دنیا کی زبانوں سے الفاظ لئے گئے ہیں مگر کسی لفظ کو اصلی صورت میں قائم نہیں رکھا۔ مثلاً کیلف، خلیفہ، میگزین، مخزن وغیرہ۔

اسی طرح جہاں تک استقرا کیا جاتا ہے کسی زبان کے الفاظ دوسری زبان میں جا کر اپنی اصلی وضع پر قائم نہیں رہتے پس جبکہ موسم یا میت یا نشا وغیرہ الفاظ ہمارے خاص و عام سب کی زبان پر جاری ہیں تو اُردو نظم و نثر میں کیوں نہ استعمال کئے جائیں۔ بات یہ ہے کہ ایسے لفظوں کو جو عربی یا فارسی یا انگریزی سے اُردو میں لئے گئے ہیں اور اصل وضع کے خلاف عموماً مستعمل ہوتے ہیں یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ موجودہ صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے الفاظ ہیں نہیں بلکہ ان کو اُردو کے الفاظ سمجھنا چاہیئے جو اصل کے لحاظ سے عربی یا فارسی یا انگریزی سے ماخوذ ہیں ایسے لفظوں کو غلط سمجھ کر ترک کرنا اور انکو اصل کے موافق استعمال کرنے پر مجبور کرنا بعینہ ایسی بات ہے کہ لالٹین کے بولنے سے لوگوں کو منع کیا جائے اور لینٹرن بولنے پر مجبور کیا جائے یا کمرہ بولنے سے روکا جائے اور کیمرہ بولنے کی تاکید کی جائے۔

یہ قول پچاس برس پہلے کا ہے اور انشا کا قول تو اس سے بھی قدیم ہے۔ اب کسی اخبار نویس یا کسی مدعی ادب کے لکھنے پر برہم ہو کر ان [illegible] پر خامہ فرسائی کرنا اور تمام اُردو کے ادیبوں کو ملزم ٹھہرانا یا تو ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے یا اس کی تہ میں کوئی خاص [illegible]

ایک ۱۰۰ سو

برس کی عمر کا راز

جو ۱۸۳۹ء سے ۱۹۳۹ء تک پہنچ کر

کارخانہ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

نے

حاصل کیا

مال کی عمدگی دیانتداری اور خوش معاملگی

اشتہار

باجلاس جناب سید تفضل حسین شاہ صاحب منصف درجہ اوّل چشتیاں

رجسٹرڈ فرم موسومہ برہم پال برہم دت واقعہ منڈی چشتیاں بنام
مالکان فرم کیشور چند ولد گوجر مل ایسر داس دیمن مل خوشحال چند
ولد سکھ رام دہرم پال ولد مکند لال برہم دت ولد بھیال اگروال
بانیہ سکنہ منڈی چشتیاں بذریعہ ایشر داس مدعی

خادم حسین ولد سردار محمد قوم جٹ سکنہ چک ۲۷ نہر گھیانی وغیرہ
تلسی رام پسران ہرگوپال مل و سادہ رام ... پسران تلسی رام
اگروال سکنائے منڈی چشتیاں ... امر سین
پسران ... قوم اگروال سکنائے ... مدعا علیہ

دعوے دلایانے مبلغ [illegible] اصل معہ سود بربنائے بیعانہ

اندریں مقدمہ مسمی خادم حسین ولد سردار محمد جٹ سکنہ چک ۲۷ نہر گھیانی مدعا علیہم عمداً تعمیل سمن سے گریز کرتا ہے اور روپوش ہو گیا ہے۔ لہذا بذریعہ اشتہار ہذا مشتہر کیا جاتا ہے کہ مدعا علیہ بتاریخ پیشی ۱۲ جون ۱۹۴۱ء کو حاضر عدالت ہذا ہو کر جوابدہی مقدمہ مذکورہ کرے۔ ورنہ اس کے خلاف کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جائے گی۔ تحریر ۱۴ مئی ۱۹۴۱ء۔

دستخط حاکم — مہر عدالت

اردو انسائیکلوپیڈیا

ادارۂ ادبیات اردو جس کو ملک کے ذی علم حضرات کی قلمی اعانت اور ذی مرتبت افراد کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے کم و بیش دس سال سے زبان اور ادب کی مسلسل خدمت کر رہا ہے اس کا کام مختلف علوم و فنون کے بارہ شعبوں میں پھیلا ہوا ہے جس کے زیر نگرانی اب تک بہتر (۷۲) کتابیں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔

بہت غور اور متعدد صاحبان علم و فضل سے تبادلۂ خیال کے بعد اس نے گزشتہ سال اردو انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا تصفیہ کیا چونکہ اس کی ترتیب و تالیف متعدد علوم و فنون کے ماہرین کے اشتراک کی ضرورت تھی اس لئے سب سے پہلے اس نے ہندوستان کے متعدد ماہرین علوم و فنون کو قلمی اعانت پر آمادہ کیا۔

انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تالیف میں اس کا خاص طور پر خیال رکھا جا رہا ہے کہ مختلف علوم و فنون کے الفاظ ماہرین ہی سے لکھوائے جائیں اس سلسلہ میں ساری انسائیکلوپیڈیا کو مختلف علوم و فنون کے متعدد شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر شعبہ کی نگرانی ایک ماہر کے تفویض کر دی گئی ہے جو معاونین کی مدد اور مجلس انتظامی کی عام نگرانی میں اس شعبے کے جملہ الفاظ پر نوٹ مرتب کر رہا ہے۔

فی الوقت حسب ذیل ماہرین اور علما اپنی نگرانی میں مضامین متعلقہ کا کام شروع کر چکے ہیں:۔

شعبہ	نگران	شعبہ	نگران
معاشیات	پروفیسر ڈاکٹر انور اقبال قریشی ایم اے پی ایچ ڈی صدر معاشیات جامعہ عثمانیہ	تاریخ	پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی ایم اے (آکسن) بار ایٹ لا صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ
تہذیب و ثقافت	ڈاکٹر ایکو ناتھ صاحب لوپا ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر انڈین کلچر جامعہ عثمانیہ	ریاضی	ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی
فلسفہ	ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی	السنہ قدیم و جدید	ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی مہتمم کتب خانہ آصفیہ
تعلیمات و تدریسیات	مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے پرنسپل ٹریننگ کالج	طب	ڈاکٹر منور علی صاحب ایف آر سی ایس و ڈاکٹر قاسم حسین صاحب ایم آر سی ایس ایل آر سی پی (لندن) [illegible]
نسائیات	مس عیسیٰ نندی بی اے آنرز (آکسن)	کھیل	ایس ایم ہادی بی اے (کیمبرج)
اردو زبان و ادب	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی و پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی		

انڈکس کی ترتیب اور مقالے لکھوائے جانے کا کام تیزی کے ساتھ جاری ہے ان کے علاوہ بہت سے مشاہیر علماء و فضلا ہندوستان کے گوشے گوشے سے دوسرے علوم و فنون کے ضمن میں قلمی اعانت فرما رہے ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں
ڈاکٹر محمد باقر ایم اے پی ایچ ڈی لاہور۔ [illegible] بہار [illegible] پروفیسر مسعود حسین رضوی ایم اے لکھنؤ۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی پونہ۔ وغیرہ وغیرہ۔
[illegible] اردو انسائیکلوپیڈیا [illegible] علوم و فنون [illegible] ترتیب و تدوین [illegible] قلمی اعانت [illegible]
[illegible] سے کیا ہے تاکہ ہم ان کی قابلیتوں سے استفادہ کر سکیں۔

مہتمم انسائیکلوپیڈیا - ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

عشق و محبت کے پامال راستے سے ہٹ کر

ایک نیا راستہ

ہندوستان کے واحد ترقی پسند فلم ڈائرکٹر

شانتا رام

نے چنا ہے

اور

پڑوسی

تیار کیا ہے

جو کہ

دو بُڈھے مردوں کی جوان دوستی کی داستان ہے

اداکار: مظہر۔ انیس جاگیردار۔ بلونت۔ شانتا۔ معظم دار وغیرہ

بہت جلد آپ کے شہر میں اس کی نمائش شروع ہوگی

نمائش کار: فیمس پکچرز لمیٹڈ۔ دہلی۔ مدراس۔ بمبئی

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں

R. L. No. 1363

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلاف تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

The Title Page and Pictures Printed at Half-Tone Press,
Ram Nagar, Dev Samaj Road, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

([illegible])

بیادگارِ علامۂ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

جلد (۱۴) — "ہمایوں" بابت ماہِ جولائی ۱۹۴۱ء — نمبر (۱)

تصویر:- وادیٔ کشمیر کا ایک منظر[1]

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸ ر

[1] اس تصویر کے لئے ہم جناب ادریس حسن لطیف صاحب حیدرآبادی کے ممنون ہیں جنہوں نے از راہِ عنایت اصل فوٹو بھیجا۔ "ہمایوں"

جہاں نما

قیصر ولیم ثانی

۴ جون ۱۹۴۱ء کو ڈورن میں ولیم ثانی سابق قیصر جرمنی کا انتقال ہو گیا۔ آخری وقت قیصر کے پاس اُس کی بی بی پرنسس ہرائن کے علاوہ صرف اُس کی بیٹی ڈچس آف برنزوک، اُس کے پوتے پرنس فرانسس جوزف، کی بی بی پرنسس ہنیریٹا اور اُس کا پوتا پرنس لوئی فرڈینینڈ موجود تھے کیونکہ مرنے سے چند دن قبل جب قیصر روبصحت نظر آتا تھا اُس کے بیٹے اور بہت سے قریبی رشتہ دار مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔

قیصر نے اپنی وصیت میں ڈورن ہی میں دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی جہاں وہ گزشتہ ۲۳ سال سے مقیم تھا۔ اُس کی وصیت یہ بھی تھی کہ اُس کی تدفین کے موقع پر صرف اُس کے خاندان ہی کے لوگ موجود ہوں۔ چنانچہ اہلِ خاندان کے علاوہ صرف جرمن حکومت کے نمائندوں نے اِس رسم میں شرکت کی۔ جرمنی کے آخری قیصر ولیم ثانی کے انتقال سے دنیا ایک ایسے شخص سے محروم ہو گئی ہے جو سابق جنگِ عظیم کے ذمہ دار کی حیثیت سے گزشتہ پچیس سال سے مؤرخین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور جس کی سیرت اور اعمال کے متعلق وہ اب تک کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ جہاں اُس سے شدید نفرت کرنے والوں کی کمی نہ تھی وہاں اُس کا انتہائی احترام کرنے والے بھی موجود تھے۔ یہ سوال بہت سے مباحثوں کی بنیاد بنا رہا ہے کہ قیصر خود گزشتہ جنگِ عظیم کا ذمہ دار تھا یا وہ اور لوگوں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔

بعض لوگ یہ عجیب و غریب خیال پیش کرتے ہیں کہ قیصر خبطِ کمتری کا شکار تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں ایک حادثے کے باعث اس کا بایاں بازو بیکار ہو گیا تھا۔ یہ لوگ اُس کی جنگجوئی کی خواہش کا تجزیہ اِسی خبطِ کمتری کی بنیاد پر کرتے ہیں۔

ولیم ۲۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایک قطعاً خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرے گا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کا نتیجہ اُس کے لئے غیر متوقع تھا۔ اُسے آخری لمحوں تک یہی یقین رہا کہ جنگ میں جرمنی کو ضرور فتح حاصل ہوگی۔

جرمنی کی شکست کے بعد ۱۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو قیصر جلاوطن ہو کر ہالینڈ چلا گیا۔ ڈورن (ہالینڈ) میں اُس کی زندگی ایک امیر زمیندار اور ایک شہنشاہ کی زندگی کا عجیب و غریب مجموعہ تھی۔ وہ درخت کاٹتا تھا۔ کثرت سے مطالعہ کرتا تھا۔ اور روز اپنی سوانح عمری لکھنے میں گھنٹوں مصروف رہتا تھا۔

قیصر نازی جرمنی کی ترقی کو بہت غائر نظروں سے دیکھتا تھا اور اگرچہ اُس نے کبھی اپنی رائے ظاہر نہ کی تھی مگر یہ سمجھا جاتا

ہے کہ وہ نازیوں کو جرمنی کا نجات دہندہ سمجھتا تھا صرف یہودیوں کے معاملے میں اُسے نازیوں سے اختلاف تھا۔

جب جرمنی نے ہالینڈ پر قبضہ کر لیا تو اُن دنوں اس قسم کی اطلاعات پھیلی تھیں کہ قیصر واپس جرمنی چلا گیا ہے لیکن ان اطلاعات میں مطلق صداقت نہ تھی۔ قیصر آخری وقت تک ڈورن میں رہا جہاں اُسے اپنی جاگیر میں آزادانہ نقل و حرکت کا اختیار رہا۔

مختصر سوانح عمری

فریڈرک ولیم وکٹر البرٹ سابق شہنشاہِ جرمنی و شاہ پرشیا ۲۷ جنوری ۱۸۵۹ء کو برلن میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ فریڈرک سوم تھا جو بعد میں قیصر بنا اور ماں انگلستان کی شہزادی وکٹوریا جو ملکۂ وکٹوریہ کی بیٹی تھی۔ اس کی تعلیم کاسل جمنیزیم اور بون یونیورسٹی میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ ایک فوجی عہدے پر مامور ہوا نیز اُسے حکومت کے مختلف شعبوں کے متعلق تعلیم دی گئی۔

اپنے باپ کے انتقال پر ۱۵ جون ۱۸۸۸ء کو ولیم ثانی تخت نشین ہوا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں خدا کی طرف سے جرمنی کی حکومت پر مامور ہوا اور مجھے اختیار ہے کہ دوسروں کی رائے سے بے پروا ہو کر صرف اپنی رائے پر عمل کروں۔ اُس کے نزدیک خدا جرمنی کا آسمانی حلیف تھا۔ اُس کی مذہبی ذہنیت اور اقتدار و قوت کی خواہش میں ایک عجیب تضاد معلوم ہوتا تھا۔ ولیم ثانی کو مختلف فنون میں دلچسپی تھی مصوری، بت تراشی، موسیقی، شاعری، ڈراما، سیاسیات، فنِ خطابت، فنِ حرب غرض کہ اُس نے ہر فن کو سیکھنے کی کوشش کی۔

اس کے عہدِ حکومت کا سب سے پہلا اہم واقعہ یہ ہے کہ اس نے ۱۸ مارچ ۱۸۹۰ء کو اپنے قابل مشیر پرنس بسمارک کو معزول کر دیا۔ معزول کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ پرنس بسمارک کی رائے کے مطابق اشتراکیوں کے خلاف تعزیری قانون کی تجدید نہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے نہایت زوردار الفاظ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ میں ہر قسم کی انقلابی شورشوں کو سختی سے دبا دوں گا۔

ولیم ثانی کے عہد میں جرمنی کی سلطنت میں بہت کچھ توسیع ہوئی اور کئی دور دور کے علاقے اس میں شامل کئے گئے اس دوران میں اس نے جرمنی کی فوج اور بحری بیڑے کو بہت کچھ طاقتور بنا دیا۔ فوج میں آخری سب سے بڑا اضافہ ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں کیل کینال کھولی گئی۔ ۱۸۹۶ء اور ۱۹۱۶ء کے درمیان بغداد ریلوے بنائی گئی اور قیصر نے ٹرکی سے دوستی پیدا کی۔ ٹرکی اور جرمنی کی یہ پرانی دوستی اب تک قائم ہے۔

قیصر کے عہدِ حکومت میں مزدوروں کے حقوق کی طرف بھی توجہ کی گئی اور مزدوروں کی حفاظت کے لئے بیمہ کی ایک عظیم الشان سکیم بنائی گئی لیکن اس قسم کی اصلاحات کے لئے قیصر کو زیادہ وقت نہ ملا اور جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ قیصر نے ان الفاظ کے ساتھ جنگ کا اعلان کیا کہ "میں جنگ نہ چاہتا تھا۔ میں امن قائم رکھنے کے لئے جو کام کرتا رہا وہ آج بالکل ضائع ہو گیا" کہا جاتا ہے کہ اگر قیصر واقعی امن پسند تھا تو بھی اُس کی خواہشِ امن پسندی اپنے مشیروں کی رائے سے مغلوب ہو گئی۔ جوں جوں جنگ بڑھتی گئی قیصر کی شخصیت پس منظر میں غائب ہوتی گئی۔ اس دوران میں اُس کے صرف دو نمایاں کام نظر کے سامنے آتے ہیں (۱) ۱۹۱۶ء میں صلح کی پیشکش اور (۲) ۱۹۱۷ء میں پیشنہاد

کی قرارداد متعلقۂ صلح کی مخالفت جنگ میں امریکہ کے شمول نے جرمنی کی حالت کمزور کردی۔ اس پر پریزیڈنٹ ولسن کا یہ اعلان قیصر کی حکومت کے لئے بہت مضر ثابت ہُوا کہ وہ جرمنی کی موجودہ حکومت سے کسی قسم کا سمجھوتا نہیں کر سکتا۔ اس پر قیصر نے آئینی وزارت قائم کی مگر یہ قدم بہت بعد از وقت اٹھایا گیا۔ چنانچہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو قیصر فوج میں پناہ لینے کے لئے برلن سے رخصت ہوگیا۔ اس کے بعد انقلاب آیا۔ ۳ نومبر ۱۹۱۸ء کو اشتراکی وزراء نے قیصر کی سلطنت سے دست برداری کا مطالبہ کیا۔ ۹ نومبر کو ہنڈنبرگ نے قیصر کو بتایا کہ فوج بھی اُس کی حمایت نہیں کرے گی۔ ولیم ثانی نے اعلان کیا کہ وہ قیصریت سے تو دست بردار ہوتا ہے لیکن وہ پرشیا کا بادشاہ رہے گا۔ اس پر اُس کو اطلاع دی گئی کہ اُس کا ہر دو حیثیتوں سے معزول ہونا ضروری ہے اور اُس کے لئے دوسرا کوئی چارہ کار نہیں۔ اس پر اُس کے مشیروں نے اُسے ملک بدر ہونے کی رائے دی لیکن اُس نے ابتداء میں اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ آخر جب اسے یہ معلوم ہُوا کہ فوج بھی جمہوری حکومت کی حمایت کر رہی ہے تو وہ ہالینڈ کو روانہ ہوگیا جس کی سرحد پر پہنچ کر اُس نے اپنی تلوار ان الفاظ کے ساتھ ولندیزی پہرے دار کے حوالے کردی کہ "میں جرمن قیصر ہوں"۔ امیرانجن (ہالینڈ) میں وہ کچھ عرصہ کاونٹ بینٹنک کا مہمان رہا۔ اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں اُس نے ڈورن میں ایک چھوٹا سا محل خرید لیا۔ اس سے قبل اتحادیوں نے ہالینڈ کی حکومت سے قیصر پر مقدمہ چلانے کے لئے اُس کی تحویل کا مطالبہ کیا تھا لیکن حکومت نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ چنانچہ اُس زمانے سے لے کر اب تک قیصر ڈورن ہی میں مقیم رہا۔ ابتدا میں اُس نے دوبارہ بادشاہت حاصل کرنے کے لئے منصوبے بنائے لیکن جب اُسے یہ معلوم ہُوا کہ شاہ پسند بھی اُس کی حمایت کے لئے تیار نہیں تو اس نے یہ خیال چھوڑ دیا۔

۱۱ اپریل ۱۹۲۱ء کو قیصر کی ملکہ کا انتقال ہوگیا اور ۵ نومبر ۱۹۲۲ء کو اُس نے پرنسس ہرمائن سے شادی کر لی۔ کہا جاتا ہے اُس کی سابق رعایا کو اس پر افسوس ہُوا۔

پرنسس ہرمائن اپنی کتاب "ڈورن کی زندگی" میں لکھتی ہے کہ قیصر نہایت اعلیٰ درجے کا شوہر اور دنیا کا سب سے زیادہ روشن دماغ انسان ہے۔ اپنی شادی کے تذکرے میں وہ لکھتی ہے کہ شادی کا باعث ایک ایسا خط ہُوا جو میرے ننھے بیٹے نے جلاوطن قیصر کو ازراہِ ہمدردی لکھا تھا۔ اس خط کے وصول ہونے کے بعد قیصر نے ہمیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ یوں میں وہاں گئی اور وہاں سے رخصت ہونے سے قبل قیصر نے مجھے شادی کا پیغام دیا۔ چنانچہ میں نے اُس کی جلاوطنی اور رنج و غم میں حصہ دار بننے کے لئے اُس سے شادی کر لی۔ میرے دل کے کسی عمیق سے عمیق کونے میں بھی یہ امید نہ تھی کہ میں کسی دن آگسٹا وکٹوریا کا تاج زیبِ سر کروں گی۔

ایک اور مقام پر وہ لکھتی ہے کہ "شہنشاہ کی شخصیت عظیم الشان اور مسحور کن ہے۔ اُس کی برق پاش ہستی چکا چوند پیدا

کردیتی ہے۔ اُس کا دل گہرا لیکن پیچیدگی سے پاک ہے۔ اُس کی سیرت پہاڑ کی چوٹی پر کی جھیل کی طرح درخشاں ہے۔ تیمیر جس ظرافت سے بھرپور ہونے کے علاوہ نہایت تیز فہم اور نکتہ سنج ہے۔ وہ ایک ہی نظر میں ہر مسئلہ کی تہ تک پہنچ جاتا ہے اور ایک لفظ میں اُس کا حل بیان کرسکتا ہے۔

خود پرنسس ہرمائن کے متعلق تیمیر اپنی یادداشت میں لکھتا ہے۔ کہ اُس نے اپنی پیشرو (آگسٹا وکٹوریا) کی اس خواہش کو بے مثال طور پر پورا کردیا ہے کہ "تمہیں ایک اور بیوی مل جائے جو تم سے محبت کرے اور تم پر مہربان ہو"۔

دنیا کے سمندر

	رقبہ مربع میلوں میں	اوسط گہرائی	زیادہ سے زیادہ گہرائی
بحر اوقیانوس	۳۴۰۰۰۰۰۰	۱۲۶۶۰ فٹ	۴۰۰۰۰ فٹ
بحر الکاہل	۷۱۰۰۰۰۰۰	۱۳۴۴۰ فٹ	۳۵۴۰۰ فٹ
بحر ہند	۲۸۰۰۰۰۰۰	۱۲۸۸۸ فٹ	۲۲۹۶۸ فٹ
بحر منجمد شمالی	۴۰۰۰۰۰۰	۳۸۴۰ فٹ	۱۳۱۲۰ فٹ
بحر منجمد جنوبی	۶۰۰۰۰۰۰		۱۳۹۳۲ فٹ

برِّ اعظم

	رقبہ مربع میلوں میں	اوسط بلندی	زیادہ سے زیادہ بلندی
یورپ	۳۰۰۰۰۰۰	۹۳۹ فٹ	۱۸۴۶۵ فٹ (کوہ البرز روس)
ایشیا	۱۷۲۰۰۰۰۰	۳۱۸۹ فٹ	۲۹۰۰۲ (ایورسٹ)
افریقہ	۱۱۵۰۰۰۰۰	۲۰۲۱ فٹ	۲۹۰۰۰ (کلمین جارو)
آسٹریلیشیا	۳۰۰۰۰۰۰	۸۵۰	۱۲۱۲۰ (مونٹ بکوزیا)
شمالی امریکہ	۸۰۰۰۰۰۰	۱۸۸۸	۲۰۴۶۴ (مونٹ میکنلے)
جنوبی امریکہ	۷۵۰۰۴۴	۲۰۷۸	۲۳۰۸۰ (مونٹ ایکان کیگوا)
خطۂ زمہریری جنوبی	۲۴۰۰۰۰۰		۱۲۷۶۰ (مونٹ ایری بس)

بیگم اکرام اللہ پی۔ایچ۔ڈی

ہمیں اس اطلاع سے دلی مسرت ہوئی ہے کہ محترمہ شائستہ اختر بانو صاحبہ کو جو سر حسان سہروردی کی صاحبزادی اور اکرام اللہ صاحب آئی سی ایس ڈپٹی سکرٹری سپلائی ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کی بیگم ہیں لنڈن یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی ہے۔ کچھ عرصہ ممدوحہ لنڈن میں سکول آف اورینٹل سٹڈیز (ادارۂ علوم مشرقیہ) میں مشہور مستشرق ڈاکٹر گریہم بیلی کے زیر نگرانی مطالعہ کرتی رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے انگریزی میں اُردو ناول اور مختصر افسانہ کے ارتقا پر ۵۹۴ صفحات کا ایک بسیط مقالہ لکھا جس پر اُن کو یہ بلند پایہ ڈگری ملی۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ پہلی خاتون ہیں جن کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ کچھ عرصہ قبل ممدوحہ نے ہم سے ہمایوں کے گزشتہ پرچے نیز اُردو افسانوں اور تنقیدی ادب کی فہرستِ کتب منگائی تھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت کے غائر مطالعے کے بعد انہوں نے اپنا وہ علمی مقالہ تحریر فرمایا جس پر اُن کو یہ ڈگری ملی۔

بیگم صاحبہ کی خدمت میں اہلِ اُردو کی طرف سے دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ وہ یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع کر کے اربابِ ذوق کو اُس سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔

شیخ محمد اکرام کی رحلت

شیخ احمد اکرام صاحب کے خط سے ہمیں یہ افسوسناک اطلاع ملی ہے کہ شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹرایٹ لاء ایڈیٹر "انیسِ نسواں" دہلی چار مہینے کی علالت کے بعد ۲۸ مئی ۱۹۴۱ء کو انتقال فرما گئے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔

چالیس سال قبل جب شیخ عبدالقادر صاحب نے مخزن جاری کیا مرحوم اُس کی ادارت اور دیگر انتظامات میں شیخ صاحب کے دستِ راست تھے۔ شیخ عبدالقادر صاحب جب بیرسٹری کیلئے انگلستان تشریف لے گئے اس کے بعد شیخ محمد اکرام ایک عرصے تک "مخزن" کی مختارِ جزو وکل رہے اس عرصے میں انہوں نے مخزن کا معیار بہت خوبی سے قائم رکھا۔

مُلّا واحدی صاحب رسالۂ "ادیب" دہلی میں شیخ محمد اکرام مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اب مخزن سے زیادہ شاندار رسالے نکلتے ہیں لیکن مخزن سے پہلے مخزن جیسا رسالہ کوئی نہیں تھا موجودہ طرز کے رسالوں کی ابتدا مخزن نے کی تھی۔ مخزن کے بعد جتنے رسالے نکلے ہیں حقیقۃً سب مخزن کے مقلد ہیں مخزن کی بنیاد شیخ عبدالقادر کے ہاتھوں پڑی تھی لیکن اُس کی عمارت کی تکمیل شیخ محمد اکرام صاحب کے ہاتھوں ہوئی اس لحاظ سے اُردو کے ہر رسالے کو شیخ محمد اکرام صاحب کا فہم کرنا چاہیے کہ اُردو کے ہر رسالے کو شیخ محمد اکرام صاحب سے ناقابلِ فراموش نسبت ہے...... شیخ عبدالقادر صاحب اور شیخ محمد اکرام صاحب ہم سب رسالے والوں کے استاد ہیں۔"

اُردو دنیا کو شیخ محمد اکرام صاحب کے انتقال سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اُن کا رسالہ "انیسِ نسواں" جو ظاہری و معنوی محاسن کا مرقع تھا چن… سال سے مسلمان خواتین کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا تھا ہمیں مرحوم کی بیگم صاحبہ اُن کے صاحبزادوں اور دیگر متعلقین سے دلی ہمدردی ہے۔

حامد علی خاں

وادی کشمیر کا ایک منظر

"تاریخِ اودھ اور نوّاب بہو بیگم"

جتنی دیر میں نے اودھ کے قدیم دارالسلطنت فیض آباد میں قیام کیا، مجھے وہاں کے تاریخی حالات معلوم کرنے کا بے حد شوق رہا۔ چنانچہ اس تجسس کے دوران میں مجھے اس قابل خاتون کے حالات بہت دلچسپ معلوم ہوئے۔ افسوس ہے کہ اودھ کے علاوہ ہندوستان کے طول و عرض میں نواب بہو بیگم کو وہ شہرت حاصل نہیں، جس کی وہ مستحق ہیں۔ سچ پوچھئے تو اردو شاعری اور ادب کی سرپرستی کرنے اور مملکتِ اودھ نیز اردو علم و ادب کی تاریخ بنانے میں "بہو بیگم" کا بہت حصہ ہے +

بعض قارئین اس عجیب و غریب نسوانی نام (نواب بہو بیگم) پر متعجب ہونگے، اور اُن کا یہ استعجاب درست بھی ہوگا کیونکہ دراصل یہ نام نہیں، بلکہ مملکتِ اودھ کی ایک ملکہ کا خطاب تھا +

اگلے وقتوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اودھ دراصل اجودھیا کی بگڑی ہوئی یا مختصر شکل ہے جہاں پہلے سورج بنسی خاندان کے راجا راج کرتے تھے۔ غالباً یہ وسط ایشیا کے وہی آریا لوگ ہیں جو پہلے ہستناپور وغیرہ مقامات میں آباد تھے، اور پھر اُن کی اولاد نے آہستہ آہستہ جنوبی ہند کی جانب بڑھنا شروع کیا، ہندوستان کے اس حصّہ کا نام اُس زمانہ میں کوشل کے نام سے مشہور تھا شہر اجودھیا بھی اسی مملکت کی راجدھانی تھا، اور اب اس شہر کے کھنڈر فیض آباد سے دو تین میل کے فاصلے پر دریائے گھاگرا کے کنارے پائے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا آغاز راجہ اکشواکو نام سے ہوا تھا، اور کوئی ساٹھ راجاؤں کے حکومت کرنے کے بعد راجہ رام چندر جی کا باپ راجہ دسرتھ نام تخت پر بیٹھا۔

ایک انگریز مؤرخ نے رام چندر جی کے زمانے کو ایک ہزار سال قبلِ مسیح بتایا ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو، اودھ کا علاقہ وہی قدیم مردم خیز خطّہ ہے، جس نے قدیم زمانے میں راجہ رام چندر ایسی برگزیدہ ہستیاں پیدا کیں، اور پھر مسلم شاہانِ اودھ کے زمانے میں شاعرانِ باکمال اور مدبرانِ بلند اقبال پیدا کئے +

مثل مشہور ہے کہ زمانہ ایک حالت پر کبھی قائم نہیں رہتا۔ جہاں پہلے اجودھیا میں شاہی محلات تھے، وہاں صدیاں گزر جانے کے بعد اُن کی ٹوٹی پھوٹی نشانیاں یعنی کھنڈر باقی رہ گئے، جو اُس رفتہ و گذشتہ زمانے کی یاد اب بھی تازہ کرتے ہیں۔ دہلی میں جب سلطنتِ مغلیہ کا جنازہ اُٹھنے کو تھا، تو تیموری خاندان کی شام ہوتے ہی تاریخ نے اپنے واقعات کو پھر دُہرانا چاہا، اور وہ یوں کہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں سلطنتِ مغلیہ کے حصّے بخرے جو ہونے شروع ہوئے، تو جہاں دکن میں نظام الملک آصف جاہ نے ۱۷۲۲ء میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی، وہاں اودھ میں نواب سعادت علی خاں نے بھی نادر شاہ کی لوٹ

مار کے بعد ۱۷۳۲ء میں اپنی خود مختار "حکومتِ اودھ" کا اعلان کر دیا۔ اور اس طرح گویا وہ اودھ کے نوابوں کے خاندان کے بانی ہوئے
درحقیقت یہ بھی شہنشاہِ دہلی کے وزیرِ اعظم تھے، مگر جب وہاں کا رنگ بگڑتا دیکھا، تو وزارتِ عظمیٰ کو چھوڑ کر اپنی سلطنت کی عمارت
الگ جا بنائی۔ اور اپنا دارالحکومت فیض آباد قرار دیا۔ اگرچہ اب یہ اپنی ریاست کے سیاہ و سفید کے مالک تھے، لیکن پھر بھی
انہوں نے اصالتہً بادشاہ کا لقب اختیار نہ کیا تھا، اور فرمانروایانِ اودھ صرف نواب وزیر ہی کہلایا کرتے تھے نیز دہلی کے
برائے نام بادشاہ کی طرف سے اُن کے لئے خطاب اور خلعتِ وزارت آیا کرتا تھا +

اودھ کے سب سے پہلے نواب وزیر سعادت علی خاں فی الحقیقت ایران کے ایک شیعہ مذہب کے تاجر تھے، اور اپنی ذاتی
محنت اور قابلیت کے زور سے سلطنتِ مغلیہ کی وزارتِ عظمیٰ کے جلیل القدر عہدہ تک پہنچے تھے، اور جب وہ ایک مرتبہ
صوبۂ اودھ کے زرخیز علاقہ کے صوبہ دار (گورنر) مقرر کئے گئے، تو انہوں نے مستقل طور پر نہ صرف خود وہیں سکونت اختیار
کرنے کا ارادہ کر لیا، بلکہ آئندہ نسل کے لئے بھی سلطنتِ اودھ کی بنیاد رکھدی۔ بالفاظِ دیگر اُن کے بعد اودھ کی صوبہ
داری موروثی ہو کر رہ گئی۔ بایں ہمہ قانونی طور پر ایک صوبہ دار گویا شہنشاہِ دہلی کا نائب ہوتا تھا، اور ہر صوبہ دار کے اختیارات
گویا شاہِ دہلی کے تفویض کئے ہوئے ہوتے تھے +

اِس مختصر تمہید کے بعد اب ہم اِس مقالہ کی ہیروئن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ نواب بہو بیگم کا اصلی نام امتہ الزہرا بیگم
تھا، یہ مؤتمن الدولہ نواب محمد اسحاق خاں شوستری کی بیٹی تھیں۔ اُس وقت دہلی میں روشن اختر محمد شاہ کے لقب سے سریر
آرائے سلطنت تھے اور اُن دنوں ننھی نواب زادی امتہ الزہرا "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق بہت ذہین اور
عقلمند تھی۔ اور بادشاہ محمد شاہ اِس ننھی بچی کی عقل و فراست دیکھکر بہت خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو اپنی
منہ بولی دختر یا لے پالک بیٹی بنا لیا تھا، اور جوان ہونے پر اس کی شادی نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ سے کرا دی۔ ظاہر ہے
کہ اُسے جہیز میں وہ کچھ ملا جو ہندوستان کے شہنشاہ کی بیٹی کے شایانِ شان ہو سکتا تھا، اور جب وہ سسرال یعنی
فیض آباد پہنچی، تو اُس کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔ اب چونکہ یہ رواج عام ہے کہ جب سسرال کے گھر نئی دلہن آتی ہے؛
تو اُس کے میکے کے نام کے علاوہ سسرال کی طرف سے دلہن کی خوبیوں اور صفات کے مطابق اُسے نئے خطاب سے
موسوم کیا جاتا ہے۔ اِس لئے امتہ الزہرا کو بھی سسرال کی طرف سے "بہو بیگم" اور "خاص محل" کے جلیل القدر خطابات ملے
اپنی فرزانگی اور دانشمندی کی بدولت اُس نے بہت جلد سب لوگوں کے دل میں گھر کر لیا +

اُدھر دہلی کی حالت روز بروز بگڑ رہی تھی۔ محمد شاہ کا رنگیلا پن تو مشہور ہی ہے، بقولِ آزاد" ملک کا انتظام اُس نے
امیروں اور وزیروں پر چھوڑا، اور خود نلچ رنگ اور شراب و کباب کی بدولت ایسا عیش و عشرت کے دریا میں ڈوبا
کہ کسی بات کی بھی خبر نہ رہی۔ رعیت بھی پشتوں سے انعام و اکرام سے مالا مال ہوتی چلی آتی تھی۔ گھر گھر عیش و عشرت سے
[illegible] شبِ برات ہو گئی یہ مہتاب باغ" اور حیات بخش" کے باغوں کو سجا کر طلسمات کا نمونہ کر دیا [illegible]

لڑاڑے پڑے رہتے۔ بادشاہ اُن میں بیٹھتے۔ ناچ رنگ کے جلسے جمتے اور شراب کے دور چلتے۔ جب برسات آتی تو اُن کے ہاں بہار آتی۔ قطب صاحب کے جنگل سبزے سے ہرے بھرے ہو جاتے، اور یہ شہر کو چھوڑ کر وہاں جا بستے۔ حکم تھا کہ ابرِ سیاہ ہمارا نقیب ہے۔ جب گرجنے کی آواز آیا کرے، اُس وقت کمربندی ہو جایا کرے"۔ ظاہر ہے کہ جہاں اہلِ دربار ایسے ایسے خیالات و حالات میں ہوں، وہاں مُلک کے انتظام کا کیا ٹھکانا۔ اور تازہ گُل یہ کھلا کہ نادر شاہی لُوٹ اور قتلِ عام نے دربارِ مغلیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس کی جڑیں کھوکھلی کر کے رکھدیں۔ چنانچہ اس عالمِ بے کسی میں بہو بیگم کے بھائی بند، رشتہ دار وغیرہ جو دہلی میں تھے وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور فیض آباد کا رُخ کیا۔ بہو بیگم نے ان کی نہ صرف خوب آؤ بھگت کی بلکہ اپنے دربار میں اعلیٰ ملازمتیں بھی دلوائیں۔ رفتہ رفتہ دہلی کے سب مصیبت زدہ لوگوں کا معمول ہو گیا کہ جب وہاں کے حالات پیچیدہ ہو جاتے تو وہ فیض آباد کا رُخ کرتے اور بہو بیگم کے دربار سے فیضیاب ہوتے۔ نیز بہو بیگم سب سے بھائیوں کی مانند سلوک کرتی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اُس کی فیّاضی اور سخاوت ضرب المثل بن گئی، اور آدھی دہلی اُٹھکر وہاں آگئی۔ بقول شخصے فیض آباد دہلی کا ایک محلّہ بن کر رہ گیا +

اِس کے تھوڑی دیر بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بالکل ہی بکھر گیا۔ آئے دن لُوٹ مار ہوتی رہتی۔ احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں نے شمالی ہندوستان کے لوگوں کا الگ ناک میں دم کر رکھا تھا۔ محمد شاہ کے بعد اُس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہُوا، مگر اُس کے وزیر نے اُسے اندھا کر دیا، اور جہاندار شاہ کا بیٹا عالمگیر ثانی کے خطاب سے ۱۷۵۴ء میں تخت پر بیٹھا، مگر ۱۷۵۹ء میں اُسی وزیر نے عالمگیر ثانی کو بھی قتل کر دیا۔ اور اس کے بعد اُسکا بیٹا عالی گوہر شاہ عالم ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا، اور اس زمانہ میں بادشاہت صرف نام کو رہ گئی۔ بادشاہ کبھی تو انگریزوں کے قبضہ میں تھا اور کبھی مرہٹوں کے اشاروں پر چلتا تھا۔ اس کس مپرسی کے عالم میں بھلا دہلی میں عوام الناس کا کون پرسانِ حال ہوتا۔ چنانچہ سب اہلِ کمال کا مجمع منتشر ہو گیا، اور بڑے بڑے نامی گرامی شعرائے کرام افکارِ معاش میں دہلی سے نکل کھڑے ہوئے اور اُن میں سے کئی فیض آباد پہنچ گئے۔ بہو بیگم کے بھائی نواب میرزا علی خاں اور اشرف علی خاں فغاں (جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے) اور علامہ سراج الدین خاں آرزو، میر غلام حسین ضاحک۔ میرزا محمد رفیع سودا، میر سوز، میر ضیاءالدین ضیا، میر غلام حسن حسن، شیخ قلندر بخش جرأت وغیرہ فیض آباد آبسے۔ اور پھر فیض آباد کی سرزمین سے شیخ امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش، نواب سید محمد خاں رند اور (میر حسن کے بیٹے) میر مستحسن خلیق (جن کے بیٹے میر انیس مشہور مرثیہ گو ہیں) میر سلمان اور اُن کے بیٹے میر علی اوسط رشک، امیر اللہ تسلیم وغیرہ پیدا ہوئے یا اُن آباد اجداد وغیرہ کی پیدائش اور نشو و نما فیض آباد میں ہوئی، مگر پھر دار السلطنت کے فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو جانے کے بعد سب اہلِ دربار اور شعرائے نامدار نے لکھنؤ آکر بود و باش اختیار کر لی۔ اِس ضمن میں فیض آباد سے لکھنؤ میں دار السلطنت کے تبدیل ہونے کے اسباب و علل بعد میں بیان کئے جائیں گے۔ پہلے نواب صوبہ اودھ شجاع الدولہ کے زمانہ کے (جبکہ فیض آباد

پایہ تخت تھا) واقعات مندرج کئے جاتے ہیں +

اُس زمانہ میں لکھنؤ کی حیثیت ایک معمولی قصبہ سے زیادہ نہیں تھی، اور فیض آباد میں سخنورانِ باکمال کا جمگھٹا تھا۔ مغلیہ خاندان کی سکونت کے باعث ایک محلّہ مغلپورہ کہلانے لگا، جس میں شاعرِ باکمال خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے تھے۔ اور ہاں یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نواب بہو بیگم کے شوہرِ عالی قدر نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کے بھی کچھ حالات بیان کر دیئے جائیں جو تاریخِ ہند میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں +

ہندوستان کی تاریخ میں شجاع الدولہ کا نام سب سے پہلی مرتبہ اُس سلسلہ میں آتا ہے، جبکہ دہلی کے تخت پر عالمگیر ثانی متمکن تھا۔ اُن دنوں بنگالہ کے صوبہ سے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی خبریں شاہی دربار میں پہنچیں تو ۱۷۵۵ء میں بادشاہ کے سب سے بڑے لڑکے عالی گوہر نے (جو بعد میں شاہ عالم کے نام سے مشہور ہُوا) شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کو ساتھ لے کر بنگال پر حملہ کر دیا۔ وہاں پہنچ کر جب اُنکو معلوم ہُوا کہ میر جعفر اپنے ضمیر کے ساتھ اپنا وطن اور آقا شہنشاہ دہلی کا مفاد بھی انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے نیز انگریز اُس کے پشت پناہ ہیں، تو نواب وزیر شجاع الدولہ تو چپکے سے اودھ آ گئے، اور شاہزادہ عالی گوہر انگریزوں کے افسر کلائیو سے مِلا، جو شاہزادہ کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آیا اور کہتے ہیں کہ شاہزادہ کو کچھ تحائف بھی دیے جس سے شاہزادہ بہت خوش ہُوا اور کلائیو کے حُسنِ اخلاق کی تعریف کرتا ہُوا واپس دہلی چلا گیا۔ میر جعفر کے بعد پھر میر قاسم بنگال کا نواب بنا۔ اور ۱۷۶۳ء میں پٹنہ کے مقام پر انگریزوں پر دھاوا بول دیا۔ جس میں کئی انگریز مارے گئے۔ اُدھر انگریز انتقام لینے کی غرض سے اس کی طرف بڑھے، مگر اب وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کے پاس جا کر پناہ گزیں ہُوا۔ اب شاہزادہ عالی گوہر دہلی کے تخت پر شاہ عالم ثانی کے لقب سے متمکن ہو چکا تھا چنانچہ اس مرتبہ شجاع الدولہ، میر قاسم اور شاہ عالم تینوں مل کر ۱۷۶۴ء میں انگریزوں پر حملہ آور ہوئے اور بکسر کے مقام پر ان مختلف طاقتوں کا مقابلہ ہُوا۔ اور انگریزوں کو فتح حاصل ہو گئی۔ میر قاسم تو فرار ہو گیا، مگر شجاع الدولہ اور شاہ عالم انگریزوں سے صُلح کے طالب ہوئے۔ چنانچہ یکم اگست ۱۷۶۵ء کو صُلحنامۂ الہ آباد مرتب ہُوا، جس کی رُو سے شجاع الدولہ کو پچاس لاکھ روپے تاوانِ جنگ انگریزوں کو دینے پڑے اور کوڑا اور الہ آباد کے ضلع جات اودھ سے نکال کر شاہ عالم کو دیئے گئے اور شاہ عالم ثانی سے انگریزوں نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی مالگذاری وصول کرنے کا استحقاق لے لیا۔ بالفاظ دیگر وہاں کے دیوان تو انگریز مقرر ہو گئے مگر برائے نام بادشاہ شاہ عالم ہی رہا، اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے قدم مستقل طور پر جم گئے جو آج بھی بدستور قائم ہیں +

اِس عہدنامہ کی رُو سے یہ بھی قرار پایا تھا کہ اگر اودھ پر مرہٹے یا کوئی دُوسری طاقت حملہ کرے تو انگریز نواب [illegible] کی مدد کریں گے۔ اب ۱۷۷۲ء سے وارن ہیسٹنگز انگریزوں کا گورنر مقرر ہُوا۔ اُن دنوں انگریز اپنی بدنظمیوں کے [illegible] مالی مشکلات میں مبتلا تھے، اسلئے وارن ہیسٹنگز نے شاہ عالم ثانی سے کوڑا اور الہ آباد کے اضلاع [illegible]

اودھ شجاع الدولہ کے ہاتھ پچاس لاکھ روپے کے عوض فروخت کر دیئے اور ساتھ ہی شجاع الدولہ نے وارن ہیسٹنگز سے یہ وعدہ کیا کہ اگر نواب وزیر اودھ کو علاقہ روہیلکھنڈ کے روہیلوں سے لڑنے کی نوبت آئی تو وارن ہیسٹنگز اپنی انگریزی فوج سے اُس کی مدد کرے ۔

روہیلکھنڈ کا علاقہ اودھ کے شمال مغرب میں کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے، جس میں بریلی، نینی تال، مراد آباد الموڑا وغیرہ کے اضلاع شامل ہیں۔ اِس علاقہ کا رقبہ تقریباً بارہ ہزار مربع میل ہے اور آبادی ساٹھ لاکھ سے اوپر ہوگی۔ مجھے اِس علاقہ کے مختلف مقامات مثلاً بریلی، مراد آباد، ہلدوانی اور کاٹھ گودام وغیرہ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ یہ علاقہ زیادہ تر پہاڑی ہے اور اس کا باقی حصہ بھی پہاڑ کی قدمبوسی کرتا ہے۔ اور بہت زرخیز اور صحت افزا واقع ہُوا ہے۔ انگریزی صوبجات متحدہ کا گرمائی مستقر اسی علاقہ کا ایک شہر نینی تال ہے۔ اور بہت سے نشیب و فراز ہونے کے سبب یہاں چھوٹی پٹڑی کی ریلوے ہے۔ جو روہیلکھنڈ کمایوں ریلوے کے نام سے مشہور ہے۔ اِس علاقہ میں بے حد گھنے جنگل پائے جاتے ہیں جن کے سبب سے اب یہ علاقہ لکڑی مہیا کرنے کے لئے بہت مشہور ہے۔ اور تو اور کاٹھ گودام اور ہلدوانی جیسے شہروں کی وجہ تسمیہ ہی اِس امر کو ظاہر کرتی ہے یعنی ہلدوانی کے گرد و نواح میں ہلدو لکڑی بہت پائی جاتی ہے اور کاٹھ گودام لکڑی کا گودام ہے ۔

اِس علاقہ کے باشندے روہیلے دراصل کوہ سلیمان کے افغانوں کی نسل سے ہیں، اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کیساتھ یہ بھی اِس علاقہ پر آکر قابض ہو گئے۔ یہ ایک بہت جری اور تند خو قوم کے فرد تھے۔ پورے علاقہ کا کوئی ایک حاکم نہ تھا، بلکہ کئی سردار مختلف حصّوں پر گویا دھرنا مارے بیٹھے تھے۔ اِنہی روہیلوں کے ایک فرد غلام قادر (روہیلہ) نے شاہ عالم ثانی پر بے حد مظالم توڑے تھے۔ اُس نے اپنی تلوار کی نوک سے بادشاہ کی آنکھیں نکال کر اُسے اندھا کر دیا، اور حرم سرا کی بیگمات اور شاہزادیوں کو بھی بہت اذیتیں پہنچائیں، اور اُن کی بے انتہا بے حُرمتی کی۔ المختصر کونسے جَور و ستم تھے جو اُس نے نہ ڈھائے اور پھر وہاں سے بھاگ نکلا۔ مگر بالآخر راستہ میں گرفتار کر لیا گیا اور اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے اور بڑے عذاب سے اُسے جہنم رسید کیا گیا۔ مگر اِس سے کیا ہوتا تھا، جو ہونا تھا سو ہو چکا تھا۔ شاہ عالم چونکہ خود شاعر تھا اور آفتاب تخلص تھا۔ اس لئے اس واقعہ کو ایک فارسی قطعہ میں نظم کیا جو نہایت درد انگیز ہے۔ اِس کا ترجمہ اردو اشعار میں بھی کیا گیا ہے، جس میں سے کچھ اشعار یہ ہیں :-

وہ حادثہ کی اُٹھی آندھی جو مری خواری کو، دَم میں برباد کیا میری جہانداری کو

آنکھیں نکلیں تو ہُوا خوب کہ دیکھوں گا نہیں، غیر کے قبضہ میں اورنگِ جہانداری کو

کی اُس افغان بچہ نے شوکتِ شاہی برباد۔ کون پہنچے گا خدا چھٹ مری اب یاری کو

تھا جس افغان بچہ کو دُودھ پلا کر پلا، بدلے اِس حق کے وُہ آیا مری غم خواری کو

نازنینیں مری ہمدم جو تھیں یاں ایک نہیں، جز مبارک محل اِس میری پرستاری کو

کوئی پہنچا دو خبر حال کی میرے کہ نظام
شاید آ نکلے محبّت سے خبر داری کو
آفتاب آج فلک نے کیا گر بے سر و پا،
بخشے گا کل تجھے حق پھر تری سرداری کو"

ہمارے ترجمانِ حقیقت علامہ سر محمّد اقبال مرحوم و مغفور نے بھی اِسی غلام قادر روہیلہ پر اپنے سفرِ یورپ کے بعد ایک نہایت درد انگیز نظم لکھی تھی، جس میں اِس اندوہناک واقعہ کا نقشہ آنکھوں کے آگے پوری طرح کھنچ جاتا ہے دل نہیں چاہتا کہ ایسے موزوں اور برمحل موقع پر اُس مشہور و معروف نظم کے چند اشعار یہاں درج نہ کئے جائیں۔

رُہیلہ کِس قدر ظالم، جفاجُو، کینہ پرور تھا،
نکالیں شاہِ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے،
دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستم گر نے
یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے،
بھلا تعمیل اِس فرمانِ غیرت کُش کی ممکن تھی!
شہنشاہی حرم کی نازنینانِ سمن بر سے!
لرزتے تھے دِلِ نازک، قدم مجبورِ جنبش تھے
رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدۂ تر سے
یونہی کچھ دیر تک محوِ نظر آنکھیں رہیں اُس کی،
کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بارِ مغفر سے،
کمر سے اُٹھ کے تیغِ جانستاں آتش فشاں کھولی،
سبق آموزِ تابانی ہوں انجم جس کے جوہر سے،
رکھا خنجر کو آگے، اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا،
تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشمِ اخگر سے
بُجھائے خواب کے پانی نے اخگر اُس کی آنکھوں کے
نظر شرما گئی ظالم کی دردانگیز منظر سے،
پھر اُٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے،
"شکایت چاہیئے تم کو نہ کچھ اپنے مقدّر سے
"مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی تکلف تھا
کہ غفلت دُور ہے شانِ صف آرایانِ لشکر سے،

"یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی،
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے،
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے"

اُدھر قلعۂ دہلی میں تو ایک روہیلہ کی بدولت یہ حال ہُوا اور اِدھر روہیلکھنڈ میں اِس قوم کے بڑھتے ہوئے حوصلے مرہٹوں کے لئے خطرہ کا موجب بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ وُہ بھی اُن کو تباہ کرنے کی غرض سے وقتاً فوقتاً اُن پر حملے کردیا کرتے تھے۔ چنانچہ مرہٹوں کی دستبرد سے بچنے کیلئے روہیلوں کا ایک سرگروہ حافظ رحمت خاں نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ سے مدد کا خواستگار ہُوا۔ اور ۱۷۷۲ء میں دونوں میں یہ عہدنامہ ہوگیا جس سے طے پایا کہ اگر مرہٹے روہیلکھنڈ پر حملہ کریں تو نواب اودھ ان کی امداد کرے۔ اور اگر وہ مرہٹوں کو روہیلکھنڈ سے نکال دے، تو روہیلے نواب وزیر کو چالیس لاکھ روپے دیں۔ ۱۷۷۳ء کے آغاز میں مرہٹوں نے روہیلکھنڈ پر حملہ کرہی دیا، اور روہیلوں نے معاہدہ کے مطابق نواب وزیر سے امداد مانگی، اور اُس نے بھی مدد کے لئے فوج بھیجدی۔ مگر مرہٹے نواب وزیر کی فوج پہنچنے سے قبل ہی کسی وجہ سے بغیر لڑائی کئے واپس چلے گئے۔ مگر نواب وزیر نے حسبِ معاہدہ روہیلوں سے چالیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ میں نے اپنا فرض ادا کردیا ہے۔ مگر اب روہیلے ٹال مٹول کرنے لگے کہ روہیلے تو نواب وزیر کی فوج کی آمد سے قبل ہی واپس لوٹ گئے تھے۔ اِس لئے اب روپیہ کا مطالبہ کیسا؟۔ اِس پر نواب شجاع الدولہ کو بہت غصہ آیا۔ اور روہیلوں کو تباہ کرنے کے ارادہ سے انگریزوں سے فوجی امداد طلب کی، اور وعدہ کیا کہ وہی چالیس لاکھ روپے جو مجھے روہیلوں سے لینے ہیں، تم کو دے دوں گا۔ چنانچہ ۱۷۷۴ء میں انگریزی فوج کی مدد سے نواب شجاع الدولہ نے روہیلوں پر دھاوا بول دیا۔ اور بالآخر روہیلوں کو میراں پور کٹرہ کے مقام پر شکستِ فاش ہوئی۔ کئی ہزار روہیلے جلاوطن کردیئے گئے۔ اور روہیلکھنڈ کا علاقہ مُلکِ اودھ کے ساتھ شامل کردیا گیا جو آج بھی بدستور قائم ہے۔ صرف تھوڑا سا علاقہ روہیلوں کے ایک وفادار سردار کو دیا گیا جو ریاست رامپور کے نام سے مشہور ہے۔ اِس جنگ میں روہیلوں کا بہادر سردار حافظ رحمت خاں مارا گیا۔ اور کہتے ہیں کہ اِس فتح کے بعد نواب وزیر کی فوج نے روہیلوں پر بڑے مظالم کئے اور خوب لُوٹ مار مچائی۔ کئی گاؤں کے گاؤں جلا کر خاک سیاہ کردیئے گئے۔ اِن بے پناہ مظالم میں انگریزی فوج کے سپاہی بھی بدنام ہونے سے نہ بچے، کیونکہ انہی کی بدولت روہیلوں پر یہ آفت آئی تھی۔ اِس واقعہ کی بابت مؤرخین کی رائیں بہت مختلف ہیں بعض تو یہ کہتے ہیں کہ نواب شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خاں کے بیٹوں کو اپنے پاس رکھا، جن میں ایک نواب محبت خاں بھی تھے، اور دربار لکھنؤ سے اِن کا وظیفہ بھی مقرر ہوگیا تھا، اور وُہ ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر اور ادیب تھے، اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے اُنہیں نے سسّی پنّوں کا قصہ نظم کرکے اِس کا نام "اسرارِ محبت" رکھا تھا۔ اور اُن کے کلام کا دیوان بھی موجود ہے۔

۱۷۷۵ء مطابق ۱۱۸۷ھ میں نوّاب شجاع الدولہ کا انتقال ہوگیا، اور یہ نامی گرامی ہستی فیض آباد میں گلاب باڑی نام کے ایک عظیم الشان باغ میں مدفون ہوئی، اور آج تک بدستور چاندی کے قدِآدم کٹہرے میں فرمانروائے اودھ محوِخواب ہے۔ اللہ اللہ۔ یہ انجامِ ہستی اور بس ہمیشہ رہے نام اللہ کا ؛

شجاع الدولہ کی وفات کے بعد آصف الدولہ یحییٰ علی خاں ہزبر جنگ نوّاب اودھ ہُوئے، یہ امۃ الزہرا نواب بہو بیگم کے بطن سے تھے۔ اودھ اور روہیلکھنڈ نیز الہ آباد وغیرہ کا زرخیز علاقہ ترکہ میں پایا تھا۔ مگر اُن میں باپ کا سا منچلا پن اور ذہانت و تدبر نیز والدہ کی سی فرزانگی تو کیا ہوتا تھی، بلکہ ناقابلیّت کے ساتھ ساتھ اُن کے مزاج میں عیش پرستی بھی تھی۔ اور والدہ کی فیّاضی ہی ترکہ میں آئی تھی۔ چنانچہ دن رات اندھا دھند دولت لٹانے لگے۔ زمامِ حکومت خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں دے دی اور زمانہ شناس حریفوں نے اِس کا فائدہ اُٹھایا۔ نیز انگریزوں نے برضا و رغبت جونپور، بنارس، اور غازی پور کے تین سرسبز و شاداب اضلاع لے لئے۔ اب قدرتی طور پر اُن کی والدہ بہو بیگم صاحبہ اُن کی اِن خفیف حرکات پر بہت ناخوش ہوئیں، اور اُن کے کاموں میں روک ٹوک کرنے لگیں۔ اب بھلا رنگیلے نوجوان نوّاب صاحب اِن پابندیوں کو کب برداشت کر سکتے تھے کیونکہ اُن کو دل کھول کر اپنے ارمان نکالنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ چنانچہ اس وجہ سے سات برس وہاں رہنے کے بعد بالآخر تنگ آ کر ایک روز شکار کا بہانہ کرکے فیض آباد سے لکھنؤ آگئے، اور یہاں ہی مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اب لکھنؤ کے نصیب بھی جاگے۔ اودھ کا دارالخلافہ بجائے فیض آباد کے لکھنؤ بنایا۔ اور نئے محلسرا اور باغات اور بازار وغیرہ تعمیر کرائے چونکہ خود شیعہ تھے، اِسلئے لکھنؤ میں اُن کے زمانے کی عمارتوں میں وہاں کا عالی شان امام باڑہ اب تک قائم ہے جو لکھنؤ میں فنِ تعمیر کے اعتبار سے لاثانی عمارت ہے اور اسے لوگ بہت دُور دُور سے دیکھنے کیلئے آتے ہیں۔ اِسے دہلی کے مشہور مہندس (انجینئر) کفایت اللہ خاں نے تعمیر کیا تھا۔ علاوہ ازیں اِس کا رومی دروازہ۔ باؤلی مسجد۔ امام باڑہ کی لداؤ کی تین چھتیں اور بھول بھلیاں وغیرہ دنیا کی عجیب و غریب عمارتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ اور ان سب کی تعمیر کا سہرا آصف الدولہ کے سر ہی ہے اور سچ پوچھئے تو موجودہ لکھنؤ کا سنگِ بنیاد انہی کا رکھا ہُوا ہے ؛

جیسا پہلے عرض کیا جاچکا ہے آصف الدولہ میں ناقابلیّت، عیش پرستی۔ اور دیگر بُری عادات تھیں۔ لیکن اُس میں ایک خوبی بھی تھی کہ اپنی والدہ بہو بیگم کی مانند وُہ بہت فیّاض و مخیّر بھی تھا۔ اس واسطے ملک کے سب لوگ اُس سے بہت خوش تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ آج تک بھی لکھنؤ کے بازاروں کے دُکاندار نیک شگون کے طور پر آصف الدولہ کا نام لے کر صبح دُکان کھولتے ہیں، اور وہاں یہ فقرہ عام کہاوت بن کر رہ گیا ہے کہ "جس کو نہ دلائے مولا، اُس کو کیا دیں آصف الدولہ"۔

الغرض اُس نے لکھنؤ کے امام باڑہ اور دیگر عمارتوں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ کُل لاگت کا تخمینہ پچاس لاکھ کیا جاتا ہے مزید یہی نہیں، بلکہ نجف اشرف (ملکِ عراق) میں بھی ایک نہر جاری کرائی جو اُن کے نام پر نہر آصفی کہلاتی ہے۔ اور اِس کی سخاوت نہ صرف اودھ ہندوستان ہی میں زبان زدِ عام ہے بلکہ ملکِ عراق میں بھی اُن کی یادگار قائم ہے ؛

آصف الدولہ کے عہدِ حکومت کی ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ وہ دن رات عیش و آرام ہی میں ڈوبے رہتے تھے مگر چونکہ خود شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، اسلئے اپنے مذہبی خیالات وعقائد کی بہت تبلیغ واشاعت کرتے رہتے تھے۔ اُس زمانہ میں ہندوستان میں ابھی بہت کم اہل تشیّع تھے، لیکن اب چونکہ ایک ملک کے فرمانروا ہی شیعہ تھے، اس لئے لوگ کچھ تو "جیسا راجہ ویسی پرجا" کے مصداق، اور دوسرے آصف الدولہ کی سخاوت سے متأثر ہو کر، اور تیسرے اُن کی تبلیغ واشاعت کی مساعی کے سبب ہزاروں کی تعداد میں شیعہ ہونے شروع ہو گئے۔ نواب آصف الدولہ کے نائب حسن رضا خاں بھی بہت مذہبی آدمی تھے۔ اور دوسرے اپنے آقا کو خوش کرنے کی غرض سے انہوں نے بھی لاکھوں آدمی شیعہ بنائے۔ شیعہ ہو جانیوالوں کو اعلیٰ منصب اور جاگیریں عطا ہوئیں۔ اور جنہوں نے باوجود ان تمام باتوں کے شیعہ مذہب قبول نہ کیا، اور جنکی جاگیریں اور منصب مُغلیہ حکومت کے وقت سے بدستور چلے آتے تھے ضبط کر لئے گئے۔ اس سے پہلے سب مسلمانوں کی نمازِ جمعہ اور جماعت اکٹھی ہوتی تھی۔ مگر اب نواب آصف الدولہ نے شاہ علیؒ اکبر چشتی مودودی کے مشورہ اور مُلا محمد علیؒ فیض آبادی کی تحریک سے اپنی الگ نماز و جماعت قائم کی۔ اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ ہجری کو سید دیدار علیؒ نصیر آبادی کی اقتدا میں شیعوں کی الگ نماز ہوئی، جو اس کے بعد آج تک قائم ہے۔ مجتہدین کے ہاتھوں میں نائب امام کی حیثیت سے زمامِ مذہب دے دی گئی۔ اب اُن کی دیکھا دیکھی لوگوں نے اور بھی امام باڑے بنانے شروع کئے اور مذہبِ تشیّع کو بہت فروغ حاصل ہُوا ؎

نواب آصف الدولہ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی تھے اور دُوسرے شعراء واُدباء کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔ جیسا پہلے لکھا جا چکا ہے، اُن کے والد بزرگوار شجاع الدولہ بھی فیض آباد میں شعرائے کرام کی حتی الامکان بہت قدردانی کرتے تھے۔ چنانچہ دہلی سے بہت سے شاعر نقلِ مکان کر کے فیض آباد مقیم ہو گئے تھے۔ مگر اب چونکہ حاکمِ وقت نواب آصف الدولہ لکھنؤ تشریف لے آئے تھے، اسلئے لازمی طور پر سب سخنورانِ ادب بھی لکھنؤ آ گئے۔ علاوہ ازیں دہلی کے بہت سے اور شعراء بھی مثلاً خدائے سخن میر محمد تقی میرؔ۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، میر انشاء اللہ خاں انشاؔ۔ جعفر علی حسرتؔ۔ سعادت یار خاں رنگینؔ، شاہ نصیر الدین نصیرؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، میر ولی اللہ محبؔ، میر غلام حسین برشتہؔ وغیرہ سینکڑوں شاعرانِ باکمال نے لکھنؤ آکر سکونت اختیار کر لی۔ اور صرف اِسی پر اکتفا نہیں، بلکہ شاہ عالم ثانی کے ولی عہد میرزا جوان بخت بھی لکھنؤ آ گئے گو کچھ دنوں رہ کر بنارس چلے گئے۔ پھر ان کے بھائی میرزا سلیمان شکوہ آئے اور یہیں پڑے رہے۔ اُن کی وجہ سے بھی دہلی کے کئی بھولے بھٹکے لوگ دہاں آکر جمع ہو گئے۔ اب ذرا سوچئے کہ جہاں ایسے ایسے باکمال لوگ ایک جگہ مجتمع ہوتے ہوں گے، تو آسمان کو بھی اِس زمین پر رشک آتا ہو گا۔ علم و فضل کے دریا گھر گھر بہنے لگے۔ ہر جگہ شعر و شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ دولت کی کچھ کمی نہ تھی۔ ہر طرف سے عیش وعشرت کی موجیں اُٹھنے لگیں اور گھر گھر شادیانے بجنے لگے بقول سحرؔ ؎

"خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو، ہر اِک گھر خانۂ شادی ہے ہر کوچہ ہے عشرت کا"

"بے فکری اور شاعری" مثل مشہور ہے۔ مگر ان اربابِ فضل وکمال کی جدت پسند طبائع نے قدم اور بھی آگے بڑھا
اردو زبان کی تراش خراش کر کے بدمزہ اور ناگوار الفاظ (جو پہلے زمانہ میں رائج تھے) حرفِ غلط کی طرح اُڑا دیئے گئے۔ بہت سی تراکیب
اور جملے غیر فصیح قرار دیئے گئے، جسے آخر دہلی والوں کو بھی تسلیم کرنا پڑا۔ اس طرح آہستہ آہستہ لکھنؤ کی زباندانی کا سکہ چار دانگ
عالم میں بیٹھ گیا، اور اہلِ لکھنؤ نے دہلی والوں کی تقلید سے مکمّل آزادی حاصل کر لی۔ جس کے سبب آج تک دہلی اور لکھنؤ کی
زبانوں کا باہمی مناقشہ چلا آتا ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ لکھنؤ جلد ہی اپنی بلند پردازی کے زور میں ایسے اوج پر پہنچ
گیا جہاں آفتاب تارا بن گیا۔

صرف ایک زبان ہی پر کیا اکتفا ہے لکھنؤ کے بانکوں نے اُس زمانہ میں وضع قطع، لباس، پوشاک، خورد و نوش
اور ماند و بود غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ میں تراش خراش کے نئے نئے انداز پیدا کر دیئے۔ گنبد نما دستار کی جگہ ہلکی اور نکیلی ٹوپی، جامہ
دنیمہ کی جگہ چُست شلوکہ۔ اور انگرکھے اور شلوار کی جگہ کلی دار غرارہ یا چوڑی دار پاجامہ۔ سلیم شاہی کی جگہ انی دار کفش یا بے ناک
کا (لکھنوی) جوتا —— اسی طرح ہر چیز کو قیاس کرو۔ ع ہر شے نئی، زمیں نئی، آسماں نیا؛ کل دنیا نئی ہو گئی۔

اُس زمانہ کے شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنے سے دربارِ لکھنؤ کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ بانکے ٹیڑھے
جوان طبیعتوں میں شوخی و رنگینی کیسا تھ زبانوں میں طرآری اور ایجادوں میں انوکھے پن کے سبب عجیب و غریب مشاغل
میں مبتلا تھے۔ مثلاً میر محمد تقی میر کے کلیات میں ایک مثنوی ہے جس میں اہل لکھنؤ کی مرغ بازی کا خاکہ اُڑایا ہے۔ نواب
آصف الدولہ اُن دنوں سریر آرائے سلطنت تھے۔ اور اُن کو خود مرغ بازی کا بے حد شوق تھا، اسلئے لکھنؤ بھر میں گھر گھر اِس
کا چرچا تھا، اور ہفتہ میں دوبار شہر میں پالیاں ہوتی تھیں۔ چند شعر اب اِس مثنوی ہی کے ملاحظہ ہوں:-

"جمعہ منگل کو پالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روزِ حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جسکو دیکھو مرغ در آغوش
ایک کے مُنہ میں مرغ کی منقار — ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
مرغ کی ایک پرفشانی ہے، — اُن کی صد رنگ بد زبانی ہے
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے — بعد نصف النہار رُخصت ہے"

قصہ مختصر، شاعروں کی قدردانی میں آصف الدولہ اپنے والدِ ماجد نواب شجاع الدولہ سے بھی چند قدم بڑھ کر تھے
میر سوز ان کے استاد تھے۔ اُن کی خدمت جو کچھ کرتے ہوں گے وہ تو معلوم نہیں۔ مگر مرزا محمد رفیع سودا کو چھ ہزار روپیہ سالانہ
کی جاگیر دی تھی۔ میر تقی میر کو تین سو روپے ماہوار دیتے تھے۔ علاوہ اس کے داد و دہش میں جب ادنی ادنی لغزوں کو ہزار روپیہ
کا خلعت ملتا تھا تو ان کا کیا پوچھنا۔

اِس تمام اثنا میں آصف الدولہ کی والدۂ ماجدہ یعنی نواب بہو بیگم کا قیام فیض آباد ہی میں رہا۔ اُن کی ا

جاگیر بہت بڑی تھی جو بجائے خود ایک ریاست تھی۔ علاوہ ازیں اُن کے پاس جواہرات کا ذخیرہ بھی بہت تھا۔ اور بہت سا مال نقد بھی تھا۔ ادھر آصف الدولہ تو غفلت و عیش پرستی اور فضول خرچی کے نشہ میں سرشار تھے۔ اور انگریزوں کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ اب گورنر جنرل (وارن ہیسٹنگز) کو روپے کی ضرورت جو پیش آئی تو جھٹ نواب آصف الدولہ سے طلب کیا۔ مگر انہوں نے جواب دیا کہ "میرے پاس کیا رکھا ہے۔ میں تو بالکل مجبور ہوں کیونکہ خزانہ کا تمام مال و دولت میری والدہ اور دادی بیگمات کے قبضہ میں فیض آباد پڑا ہے۔ اِس لئے پہلے اُن سے وہ تمام جاگیر و جائداد اور مال و زر مجھے دلایا جائے"۔

انگریزوں کو اِتنا معلوم ہُوا تو بس پھر کیا تھا۔ گورنر جنرل نے یہ تمام بے بہا دولت حاصل کرنے کی دُھن میں پہلے تو بیگمات کو حکم دیا کہ وہ تمام مال و دولت اُن کے حوالہ کر دیں۔ لیکن بیگمات نے قدرتی طور پر اِس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انگریزوں کو اُن سے یہ مال و متاع حاصل کرنے کا کوئی استحقاق نہ تھا۔ اب وارن ہیسٹنگز نے بیگماتِ اودھ پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے راجہ بنارس رجیت سنگھ کی بغاوت میں امداد کی ہے۔ اِسی الزام کی بنا پر انگریزی فوج نے بیگمات کے محل سرا پر دھاوا بول دیا، اور بیگمات پر طرح طرح کی سختیاں کی گئیں، اور اُن کے خواجہ سراؤں کو (جنکے سپرد خزانہ تھا) سخت سے سخت ایذائیں دی گئیں اور اُن پر بے حد ظلم کئے گئے اور آخر کار اُن سے خزانہ چھین لیا گیا۔ اِس جابرانہ سلوک کا نتیجہ وارن ہیسٹنگز کے حق میں بہت بُرا ثابت ہُوا۔ چنانچہ جب وہ ۱۷۸۵ء میں اپنے وطن انگلستان پہنچا تو اُس پر پارلیمنٹ نے اِن مظالم و جرائم کی بنا پر بڑے زور و شور سے مقدمہ چلایا جو پورے سات سال تک چلتا رہا۔ انگلستان کی تاریخ میں یہ مقدمہ بہت مشہور و معروف ہے۔ وہاں کے جادو بیان وکیلوں اور بیرسٹروں۔ مثلاً ایڈمنڈ برک، فاکس، اور شیریڈن نے اپنی پوری قوت وارن ہیسٹنگز کے خلاف مقدمہ کی پیروی کرنے میں صرف کی مندرجہ بالا شدید جرم کے علاوہ اور کئی سنگین الزامات و اتہامات اُس پر عائد کئے گئے۔ کہتے ہیں کہ عدالت میں اِن الزامات کی پوری فہرست صرف پڑھ کر سنائے جانے میں پورے دس دن صرف ہوئے۔ اور پھر جب انگلستان کے مایۂ ناز وکیل مسٹر برک کی باری آئی، تو اُس نے وارن ہیسٹنگز کو جھوٹا ثابت کرنے میں انتہائی کوشش صرف کر دی۔ اور کئی دن تک لگاتار اُسکے خلاف بڑے زور و شور سے مقدمہ کی پیروی کرتا رہا۔ سحر طرازی، مبالغہ آمیزی اور فصاحت و بلاغت کی اُس نے خوب داد دی۔ اُس کے جواب میں مخالف وُکلاء منہ دیکھتے رہ گئے اور بقول کسے "اُن کی زبانیں گونگی ہوگئیں"۔ سامعین کے انبوہ کے علاوہ خود ملزم یعنی وارن ہیسٹنگز پر مسٹر برک کی جادو بیانی کا اس قدر اثر ہُوا کہ اُسے بھی تسلیم کرنا پڑا کہ اگر برک کے پُر زور اور لاجواب دلائل کو صحیح مان لیا جائے تو وہ واقعی مجرم ہے۔ مقدمہ کی کارروائی سُننے کے لئے عدالت کے وسیع کمرہ میں عام لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ کہتے ہیں کہ کئی انگریز عورتیں (جو اِس مقدمہ کی کارروائی دیکھنے کے لئے آئی ہوئی تھیں) برک کی ہنگامہ خیز اور محشر انگیز تقریر سُنکر ضبط نہ کر سکیں۔ اکثر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور متعدد عورتیں چیخ مار کر بیہوش

ہوگئیں۔ یہاں تک کہ مسٹر شیریڈن کی میم صاحبہ کو غشی کی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا۔ آخر کار برک نے اپنی آتش خیز تقریر کے خاتمہ پر اپنی پوری قوت سے اِسقدر چلّا چلّا کر کہا کہ دیوانِ عام کی چھت تک گونج اُٹھی۔ اُس کی تقریر کے آخری ٹکڑے کے چند فقروں کا ترجمہ ذیل میں ہے :-

"میں مذکورہ سنگین و شدید جرائم کی بنا پر ملزم مسمّی وارن ہیسٹنگز کے خلاف استغاثہ دائر کرتا ہوں، کہ اُس نے حکومتِ برطانیہ سے غدّاری کی، اور انگریزوں کی عزّت خاک میں ملادی۔ نیز ہندوستان کے بے گناہ لوگوں پر بے پناہ مظالم توڑے۔ اُن غریبوں کے جائز حقوق کو پامال کیا۔ اُن کے گھروں کو تباہ و برباد کردیا ۔۔۔۔ پس حق و انصاف اور صداقت و عدالت، عزت و آبرو اور شرافت و انسانیت کے نام پر میں دُہائی دیتا ہوں۔ کہ یہ شخص (مسمی وارن ہیسٹنگز) صرف ظالم و جابر اور غدار و دغاباز نیز سفّاک و خونخوار ہی نہیں، بلکہ ہمارا شدید ترین دشمن بھی ہے"!

دنیا جہان میں اِس انقلاب انگیز مقدمہ کے عظیم الشان ولائل کی مثال ملنا دُشوار ہے ۔۔۔۔ وارن ہیسٹنگز پر بے قصور و بے گناہ" نواب بہو بیگم" کا صبر بُری طرح پڑا۔ اور اِس استغاثہ سے اُس کا ناک میں دم آگیا۔ مقدمہ کے اخراجات میں اُس کی تمام کمائی ہوئی دولت تباہ ہوگئی۔ بالآخر ایک ایک پائی اور کوڑی تک کے لئے محتاج ہوکر مرا، اور اس کی زندگی کے آخری ایّام نہایت تلخی و پریشانی اور ذلت و خواری میں گزرے ؛

بہو بیگم کی حیات ہی میں اُن کے بیٹے نواب آصف الدولہ ۱۷۹۷ء مطابق ۱۲۱۲ھ ہجری میں استسقا کی بیماری سے انتقال کرگئے۔ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں ایک کنیز کے لڑکے وزیر علیؔ کو اپنا جانشین مقرر کردیا تھا۔ چنانچہ ان کی وفات پر وُہ تخت نشین ہوگیا۔ مگر وُہ قطعاً حکومت کے قابل نہ تھا۔ اِس لئے جلد ہی مُلک کا انتظام بگڑنے لگا۔ انگریزوں کے نئے گورنر جنرل کو جب یہ معلوم ہُوا نیز یہ سُنا کہ وزیر علی نواب آصف الدولہ کا بیٹا ہی نہیں ہے تو اُس نے فوج بھیجکر اُسے گدّی سے اُتار دیا۔ اور نواب مرحوم کے ایک اور عزیز سعادت علی خاں کو اِس شرط پر تخت نشین کرادیا کہ وُہ الہ آباد کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کردے اور چھہتر لاکھ روپے اُنکو سالانہ خراج دے ؛

نواب سعادت علیؔ خاں کی تخت نشین ہوتے ہی ہوسِ زر بڑھ گئی۔ اُس کی یہ آرزو تھی کہ اگر بہو بیگم جلدی سے مر جائیں تو اُن کی باقی ماندہ ساری دولت بھی اُس کے قبضہ میں آجائے۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ بہو بیگم کا انتقال نواب سعادت علی خاں کے مرجانے کے بعد ہُوا، اور مرتے وقت وُہ ایک کروڑ روپے اور کچھ اوپر چھپن لاکھ کا وثیقہ کمپنی کی تحویل میں دے کر دستاویز کرگئیں، کہ اُن کے اعزّہ اور متوسلین کی جو تنخواہیں انہوں نے مقرر کر رکھی تھیں، وہ ہمیشہ جاری رہیں۔ چنانچہ اُن لوگوں کی اولاد اب تک اُس سے فائدہ اُٹھا رہی ہے ؛

اب مملکتِ اودھ کی طاقت روز بروز کمزور ہونے لگی، اور نواب سعادت علی خاں کی مزید نااہلیت و نااہلیت سے

فائدہ اٹھاکر انگریزوں نے اُسکا آدھا ملک جس میں گنگا جمنا کی وادی کے اضلاع اور سرحدی علاقہ روہیلکھنڈ وغیرہ شامل تھا حاصل لیا بعد میں یہی علاقہ مُغلیہ حکومت کے بقیہ اضلاع کے ساتھ ملاکر صُوبۂ متحدہ (یوپی) بنا دیا گیا، اور اودھ کی شمالی سرحد میں کوہ ہمالیہ کی پہاڑیوں پر انگریزی فوج بٹھا دی گئی جو آج تک رانی باغ اور الموڑہ وغیرہ میں بدستور قائم ہے۔ اب سلطنتِ اودھ میں باقی کیا رہ گیا بچا کھچا علاقہ آخری تاجدارِ اودھ واجد علیؒ شاہ کے زمانہ میں لارڈ ڈلہوزی نے انگریزی سلطنت سے ملحق کر لیا، اور واجد علیؒ شاہ کو کلکتہ بھیج دیا ◆

عبدالحیُ ایم۔اے

غزل

مضطر ہے بہت میری طبیعت کئی دن سے
وُہ آئے نہیں بر سرِ تربت کئی دن سے

پھر حُسن کے جلووں نے اثر مجھ پہ کیا ہے
غالب ہے مرے دل پہ محبت کئی دن سے

پھر تیری جفاؤں کا گلہ چھوڑ دیا ہے
کرتا تھا مرا دل بھی ملامت کئی دن سے

ہاں باغ میں دیکھی تھی کبھی پھول کی پتیؔ
تکتی ہوں ترے لب کی نزاکت کئی دن سے

پھر چاک گریباں کو کیا میں نے خدایا!
پھر عشق ہے آمادۂ وحشت کئی دن سے

پھر آج درِ یار پہ سر جُھک گیا میرا
اُن کو بھی تھی شیریںؔ یہی حسرت کئی دن سے

(سیّدہ شیریںؔ نقوی

جہانِ بہتریں

عالمِ بالا سے ایک آواز:

اہلِ پستی! عرش سے پائندگی حاصل کرو!
آؤ مہر و ماہ سے تابندگی حاصل کرو!
عرصۂ عالم کی رزم آرائیوں کو چھوڑ کر!
بزمِ قدرت سے سکونِ زندگی حاصل کرو!

فطرت کا پیام شاعر کے نام

اے امینِ راز ہائے خاکدان و آسماں! — مجھ سے حاصل کر نشاطِ روح و اطمینانِ جاں!
تیرا مسکن وادی و کہسار کے دامن میں ہے — بجلیوں کی جلوہ گہ ہیں، رعد کے دامن میں ہے
کُنجِ عزلت سے نکل، پھیلے ہوئے میدان دیکھ — مرغزاروں میں خراماں ندیوں کی شان دیکھ
ذرّے ذرّے کی نگاہیں جانبِ افلاک ہیں — مدعائے شوق کے اظہار میں بیباک ہیں
یہ سماں، یہ ابر، یہ کالی گھٹا برسات کی — وہ پھٹے بادل سے ظاہر روشنی توراتؑ[1] کی
گھر سے باہر چل کے میدانوں کا عالم دیکھ لے، — اِس جہاں سے اُس جہاں کا ربطِ باہم دیکھ لے
آنکھوں آنکھوں میں بلاتے ہیں ستارے رات کے — دیکھ لے نکھرے ہوئے بادل بھری برسات کے

دیکھ لے شاعر بہارِ باغِ ہستی دیکھ لے
پتّے پتّے پر ہجومِ کیف و مستی دیکھ لے!

---

[1] عقیدۂ یہود کہ نزولِ تورات کے وقت آسمان تیرہ و تار تھا۔ وحی آئی تو گھٹائیں چھٹ گئیں اور ماہِ کامل نمودار ہوا۔

شاعر

دوستی اور دشمنی کے سارے رشتے توڑ کر،
شہر سے باہر چلا ہوں اپنا مسکن چھوڑ کر

جنگلوں میں جا کے اپنے دل کو بہلاؤں گا میں
جستجوئے شاہدِ مقصود کو جاؤں گا میں!

گھر سے نکلوں گا ترے ارشاد کی تعمیل کو
عشق کے نغمے سنانے جاؤں گا جبریل کو

لے کے نکلوں گا شبِ مہ میں جگر کے داغ کو،
اس سے روشن تر کروں گا دشت و کوہ و راغ کو

اُس طرف پیشِ نظر ہوں گے مناظر طور کے
میری پیشانی سے بہ نکلیں گے چشمے نور کے

فخر ہوگا چاند کو اپنی جبیں کے داغ پر
اور مجھ کو اپنے سینے کے انوکھے باغ پر

چشمِ حیرت سے جہاں کو دیکھتا جاؤں گا میں
پائے استحقار سے ہر شے کو ٹھکراؤں گا میں

بحر طوفاں لے کے اُٹھتا ہے شبِ مہتاب میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے گردشِ گرداب میں

صبح کے تاروں کی دُنیا رعشہ بر اندام ہے
روشنی ہی روشنی کو موت کا پیغام ہے

جس کی تابانی کے آگے روئے انجم ماند تھا
صبح تک بادل کا اک ٹکڑا ہے شب بھر چاند تھا

خاک اُڑتی دیکھتا ہوں کہکشاں کی راہ میں
صبح تک یہ بھی نہ ہوگی دیدۂ آگاہ میں،

گل سراپا چاک ہیں، بلبل سراپا داغ ہے
یہ کوئی بزمِ عزا ہے یا بہارِ باغ ہے؟

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ نہ کہنے دے مجھے،
رہنے دے اپنے خیالستاں میں رہنے دے مجھے

سروش

پائے استغنا سے زنجیرِ تعلق توڑ دے
اے مرے شاعر جہانِ رنج و غم کو چھوڑ دے

تیری دنیا گلشنِ رنگ و نوا سے دُور ہے
تیری فطرت کی بلندی جلوہ گاہِ طور ہے

تیری دنیا آسمانِ حسن کے تاروں میں ہے
اس جہاں سے دُور اُس دنیا کے نظاروں میں ہے

تیرے ارمانوں کی بستی لالہ زاروں کی سی ہے
تیرے میخانوں کی مستی آبشاروں کی سی ہے

تیرے دم سے مسکراتے ہیں ستارے رات کے
پھول ہیں بکھرے ہوئے یہ گلشنِ ظلمات کے

آسمانوں سے بھی ہے کچھ دور تیری سرزمین
تیری دنیا میں فرشتے بھی پھٹک سکتے نہیں

مہرومہ کی روشنی ہے تیری عشرت گاہ میں
بچھ رہا ہے کہکشاں کا فرش تیری راہ میں

کیوں گرا ہے پستیوں میں، آہ یہ کیا طور ہے
اے فلک پیما تری دنیا تو کوئی اور ہے

"اور بھی ہے اک جہاں خوابوں کی منزل کے قریب
اس جہاں سے دور آنکھوں سے نہاں دل کے قریب

اُس جہاں میں ایک ذرہ بھی فنا ہوتا نہیں،
ایک پتہ بھی خزاں سے آشنا ہوتا نہیں

وہ جہانِ خاص اک دنیائے بے آزار ہے
ذرہ ذرہ جس زمیں کا مطلع الانوار ہے

پھول کھلتے ہیں وہاں شاداب رہنے کیلئے
ندیوں کی رو میں گوہر بن کے بہنے کے لئے

عشق یکسر بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
حسن بے پروا ہے شوقِ گرمیٔ بازار سے

بلبلوں کو خوفِ صیاد و خزاں ہوتا نہیں
باغ کے لٹنے سے خائف باغباں ہوتا نہیں

ذرے ذرے سے عیاں ہے شانِ صبحِ عید کی
ہر طرف پھیلی ہوئی ہے روشنی امید کی

چاندنی ہی چاندنی، تنویر ہی تنویر ہے
دوسرا رُخ ہی نہیں ملتا، عجب تصویر ہے

شاعر

اے مرے پیغامبر تیری صدا سنتا ہوں میں
دل میں بسنے والی متوالی صدا سنتا ہوں میں

مجھ پہ ظاہر ہیں تری دنیا کے اسرارِ نہاں
میری آنکھیں دیکھتی ہیں باطنِ کون و مکاں

جانتا ہوں تیری دنیا میں ہیں چشمے نور کے
بس رہے ہیں میری آنکھوں میں بھی جلوے طور کے

تیری دنیا کا ہشِ آلام سے آزاد ہے
اُس جہاں میں اک نشاطِ جاوداں آباد ہے

وہ جہاں لیکن مذاقِ درد سے محروم ہے
میں وہاں خوش رہ نہیں سکتا مجھے معلوم ہے

جانتا ہے تو مری ہستی سراپا درد ہے
اشک اشکِ خونفشاں ہے، آہ آہِ سرد ہے

میری فطرت میں ہے مضمر سوز و سازِ زندگی
اور میں ہوں مظہرِ رازِ دنیازِ زندگی

میری فطرت میں خوشی کے ساتھ شامل غم بھی ہے
نغمۂ شادی میں پنہاں نالۂ ماتم بھی ہے

وہ جہاں بے حس ہے بے کیف لذتِ آزار سے
کیا ملیگا مجھ کو ایسے گلشنِ بے خار سے؟

جس گلستاں میں بہارِ بے خزاں کا دور ہو
اس سے تسکینِ دلِ غم آشنا کس طور ہو؟

جستجو ہے مجھ کو اک دنیائے نو ایجاد کی
ہو نہ کچھ تفریق جس میں شاد، اور ناشاد کی

عالم بے شرق و غرب و بے شمال و بے جنوب
ہوں جہاں اطرافِ عالم مثلِ مہر و مہ غروب

کوئی ماضی ہو نہ جس میں کوئی استقبال ہو
وقت کی رفتار پابندِ زمانِ حال ہو

میری دنیا میں وطن ہو مہرِ عالم تاب کا،
کوئی نقشہ ہو کسی دیکھے ہوئے سے خواب کا

عالمِ ناسوت میں لاہوت کے بھی رنگ ہوں
عرشیوں کی زندگی میں فرشیوں کے ڈھنگ ہوں

زندگی ہو موت کی آغوش میں سوئی ہوئی
موت آبِ چشمۂ ظلمات میں دھوئی ہوئی

روشنی ایسی کہ ظلمت کے بھی ڈیرے ساتھ ہوں
چاندنی راتوں میں بھی گہرے اندھیرے ساتھ ہوں

بجلیاں مستور ہوں قلبِ شبِ دیجور میں
موسیٰ و فرعون گم ہوں جلوہ گاہِ طور میں

ہلکا ہلکا ہو اندھیرا، دھندلی دھندلی روشنی
ایک ہی نکتے سے پیدا حسن بھی ہو عشق بھی

امتزاجِ خوب و زشت و بیش و کم ہو اس طرح
نور و ظلمت کی ہو آمیزش شفق جس طرح

بزمِ عشرت میں تمیزِ میکش و ساقی نہ ہو
خالق و مخلوق میں فرقِ دوئی باقی نہ ہو

قرب ہو اتنا کلیم و جلوہ سازِ طور میں
فرق مشکل ہو انا الحق اور انا المنصور میں

جب وہ منزل میری آنکھوں پر عیاں ہو جائیگی
مجھ پہ ظاہر ایک دنیائے نہاں ہو جائیگی

روحِ عالم بن کے عالم میں سما جاؤں گا میں
اپنی ہستی کا نشاں ہر چیز میں پاؤں گا میں

—— عبد الحمید
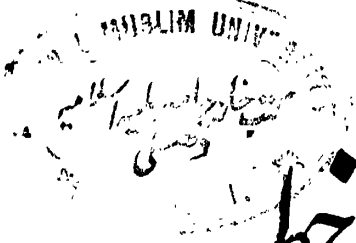
ایک خط

(—— کے نام)

تم کہتے ہو زندگی تلخ کام ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم اپنی ساری قوتِ فکر کو اس کے تاریک پہلو پر مرکوز کردینے سے تلخی کے عنصر کو کم کردینے میں کامیاب ہوجاؤ گے؟ تم جانتے ہو کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ پھر اپنی زندگی کی تلخیوں میں مزید اضافہ کیوں کررہے ہو؟ فلسفے اور منطق کی باتیں چھوڑو۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار کوشش کے باوجود ناممکن ہے کہ زندگی —— ایک حساس انسان کے لئے —— دکھوں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا چکر ہے بشرط صرف احساس کی ہے۔ یوں بے شرم ہوجائیں تو کوئی دکھ دکھ ہی نہ معلوم ہو مگر مصیبت تو یہ ہے کہ اب بے شرم ہونا بھی مشکل ہے۔ کوئی کب تک اپنے آپکو دھوکا دے؟ تم کہوگے کہ میں بھی تو زندگی کے متعلق تمہارے ہی زاویۂ نگاہ کی تائید کررہا ہوں۔ بڑی حد تک میں تم سے متفق ہوں۔ کبھی کبھی میں بھی غم واندوہ کے ہجوم سے گھبرا کر جی ہار بیٹھتا ہوں۔ بارہا بچوں کی طرح —— بلکہ یہ کیوں نہ کہوں کہ تمہاری طرح —— رویا ہوں۔ ایسے موقع بھی آئے جب دنیا والوں سے تنگ آکر خدا کے وجود ہی سے انکار کردیا —— انکار کرنا پڑا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں تمہیں ایک مسلسل ذہنی عذاب میں مبتلا دیکھنا گوارا نہیں کرسکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم قدرت کی پیدا کی ہوئی مصیبتوں پر اپنے ہاتھوں مزید اضافہ نہ کرو۔ سمجھ لو کہ زندگی ایک مسلسل اذیت ہے جسے بہرحال برداشت کرنا ہے۔ پھر اسے مسکراتے ہوئے جھیلنے کی کوشش کیوں نہ کرو؟ مجھے اعتراف ہے کہ میں خود اب تک اس کوشش میں ناکام رہا ہوں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم یہ کوشش ہی ترک کردیں؟

میں جانتا ہوں کہ روپیہ بڑی چیز ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے میں دولت کی "جہانگیری" کا قائل نہیں تھا۔ مگر اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ سماج میں روپے کے بغیر ہر چیز بیکار ہے۔ اگر تمہارے پاس روپیہ نہیں تو تمہاری شرافت۔ قابلیت اور شخصیت کی قطعاً کوئی قیمت نہیں پڑیگی۔ کوئی تمہاری ان خوبیوں کی طرف توجہ ہی نہ کریگا لیکن تم کئی ایسے آدمیوں کو جانتے ہو جو اگرچہ انسانوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں لیکن ان کے سر میں گدھے کا دماغ ہے جہاں تک شرافت کا تعلق ہے خود انہیں اپنے متعلق قطعاً اس قسم کا کوئی حسن ظن نہیں لیکن اس کے باوجود ان کی قابلیت کے چرچے ہیں۔ ان کی شرافت کا شہرہ ہے اسلئے کہ ان کے پاس روپیہ ہے۔ تم کہتے ہو کہ روپے کے بغیر بڑا آدمی بننا ناممکن ہے میں کہتا ہوں کہ روپے کے بغیر آدمی بننا ناممکن ہے دولت کے بغیر موجودہ سماجی نظام کے ماتحت انسانیت کی تکمیل ناممکن ہے۔ لیکن کیا اس نظام کے آگے

سر جھکا دیں؟ کیا اندر ہی اندر جلتے رہیں اور زبان پر فریاد تک نہ لائیں؟ میں کہتا ہوں کہ ہم اس نظام کے خلاف بغاوت کریں گے —— مقدور بھر بغاوت —— میں چپ چاپ یہ ظلم سہنے کے حق میں نہیں۔ گھٹ گھٹ کے مر جانا میرے نزدیک ذلیل ترین موت ہے۔ میں سماج کے اس گھناؤنے پہلو کی طرف دیکھتا ہوں تو اپنی تمام مصیبتوں کے باوجود مسکراتا ہوں —— انتہائی حقارت کے ساتھ مسکراتا ہوں۔ اور پھر اس کے خلاف آواز بلند کرتا ہوں۔ یہ آواز نحیف ہے اور کمزور کیونکہ سماج نے میرا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ کبھی کبھی یہ آواز میرے اپنے کانوں تک ہی محدود رہتی ہے لیکن میں احتجاج ضرور کرتا ہوں۔ دولت کی "جہانگیری" کا اعتراف لیکن اسے چپ چاپ برداشت کر لینا ناممکن!

دولت کی اس غلط تقسیم نے ہزاروں نوجوانوں کی روح سلب کر لی۔ ہم اسے جائز کس طرح تسلیم کر لیں؟ اس لئے کہ سماج اس کی پشت پر ہے؟ سماج کی تو عمارت ہی دولت کی اس غلط تقسیم پر کھڑی ہے۔ اس لئے کہ جھوٹے مذہب کے جھوٹے ٹھیکیدار خدا کی رضا پر سر جھکانے کو کہتے ہیں؟ خدا کی رضا کبھی یہ نہ تھی۔ یہ لوگ خدا کو بدنام کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کی اپنی ٹھیکیداری اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ غریبوں کو توکل کی تلقین کرنے والوں کی حرص کے شرمناک مظاہرے کس نے نہیں دیکھے؟

تمہیں رحم آتا ہے اس نوجوان لڑکی پر جس نے پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لئے اپنا جسم بیچ ڈالا اور تم اس سے نفرت کرتے ہو مجھے بھی اس لڑکی پر رحم آتا ہے لیکن میں اس سے نفرت نہیں کرتا تمہیں اپنے رہنماؤں پر کیوں رحم نہیں آتا؟ تم اپنے لیڈروں سے کیوں نفرت نہیں کرتے؟ اس لڑکی نے صرف اپنا جسم بیچا۔ تمہارے رہنما ساری قوم کا سودا کرتے ہیں۔ تم اس لڑکی کے وجود کو انسانیت کے نام پر ایک دھبا سمجھتے ہو۔ لیکن اس کے گناہوں کا اپنے لیڈروں کی خدمات سے مقابلہ کرو۔ اس نے اپنے حسن کے دام کھرے کئے۔ اس کا آوارہ مزاج گاہک خود چل کر اس کے پاس آیا۔ رات کی تاریکیوں میں —— لوگوں سے چھپ چھپا کر —— گناہ کی جنس بیچی گئی تمہاری سماج کو کیا نقصان پہنچا؟ اور اگر پہنچا بھی تو اس میں اس لڑکی کا کیا قصور؟ تمہاری سماج کا وہ معزز فرد —— جو اس کے بستر سے اٹھ کر دوستوں میں واپس جائے گا تو ایک معزز شہری سمجھا جائے گا —— کیوں اس کے پاس آیا تھا؟ کیا وہ اسے بلانے گئی تھی؟ اب اس لڑکی کا —— اس حسن فروش فاحشہ کا موازنہ اپنے رہنماؤں سے کرو۔ دن دہاڑے۔ روزِ روشن میں سب کے سامنے تمہاری قوم فروخت کی جاتی ہے —— سستے داموں —— اکثر اوقات کوڑیوں کے مول —— بعض اوقات بھرے مجمع میں ملت کا نیلام ہوتا ہے لیکن تم اس بدکار لڑکی سے نفرت کرتے ہو اور اپنے پاکباز اور مخلص لیڈر کا جلوس نکالتے ہو۔ اس کے نام کے نعرے لگاتے ہو۔ ایک نے صرف جسم بیچا —— اور وہ بھی اپنا جسم —— دوسرے نے پوری قوم بیچ ڈالی —— ایک سے نفرت اور دوسرے کی پرستش!! یہ کہاں کا انصاف ہے؟

تم کہتے تھے اس لڑکی نے چند ٹکوں کیلئے اپنی خودی بیچ ڈالی تم غلط سمجھے۔ اس لڑکی نے خودی نہیں بیچی۔ صرف اپنا گورا اور گداز جسم بیچا مجھے خود اس کوچہ میں سے گزرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن میں اکثر ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے عمر کا بہترین حصہ وہیں گزار دیا۔ وہ بتلاتے ہیں کہ بازاری عورت روح نہیں بیچتی۔ صرف جسم بیچتی ہے۔ لیڈری کے کوچے سے صرف ایک مرتبہ تم بھی گزر گئے ہو۔ کیا وہاں خودی بکتے

نہیں دیکھی ؟ شرعی روایات کو زندہ کرنے کا دعویٰ کرنے والوں کا بس چلے تو خود شرب کو بیچ ڈالیں۔ خودی کی حفاظت کی تلقین صرف میرے تم جیسے لوگوں کے لئے ہے۔ لیڈر کی شخصیت اِن باتوں سے بہت بالا تر ہے لیکن کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ قیامت کے دن لیڈر کا کیا حشر ہوگا؟ تسبیح پھیرتا ہے۔ قران کی تلاوت کرتا ہے۔ سنا ہے عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ صبح کی نماز قضا ہوئی۔ لیکن اِس کے باوجود لیڈر کے انجام کا تصور کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُس دن قران کی تلاوت۔ صبح کی نمازیں اور اولی الامر کی اطاعت اس کے کسی کام نہ آئیگی۔ ملت کے زخم پکاریں گے کہ اِس شخص نے قوم کے خون سے دنیوی جاہ کی کھیتی سینچی ہے —— اور یہ لڑکی جس سے تم نفرت کرتے ہو تھوڑی سی سزا کے بعد خدا کے رحم کی مستحق سمجھی جائے گی۔

تم نالاں ہو لوگوں کی ریا کاری سے۔ لیکن ریا کاری تو ہماری معاشرت کا ایک جزو بن چکی ہے۔ یہ تو نئی تہذیب کا ایک ضروری عنصر ہے۔ تمہیں شکوہ ہے کہ احباب بظاہر دوستی کا اظہار کرتے ہیں لیکن اپنے دل میں تمہاری نیک نامی سے جلتے ہیں۔ تمہیں ترقی کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ تمہاری عزت ہوتے دیکھ کر انہیں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن تمہارے کڑھنے سے کیا ان کی اصلاح ہو جائیگی یہ توقع عبث ہے۔ ناحق دل کو ایک اور روگ لگا رہے ہو۔ تمہاری جوانی بے داغ۔ تمہاری روح عفیف۔ تمہاری محبت پاک تمہارا خلوص مسلّم لیکن یہ لوگ تمہاری ان خوبیوں کو کیوں دیکھیں ؟ مجھ سے پوچھو تو ان کے نزدیک تمہارے سب سے بڑے نقائص یہی ہیں۔ اگر تم میں یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو کون تم سے حسد کرتا ؟ اگر تم ایک سعید روح۔ ایک پاکباز نوجوان۔ ایک مخلص دوست نہ ہوتے تو کسی کو تم سے جلنے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟ ملمّع آمیز دوستیوں کا گلہ نہ کرو کیونکہ تقریباً سبھی دوستیاں ملمّع کی محتاج ہیں۔ کس کس کا گلہ کرو گے ؟ مزے سے سب کچھ دیکھتے جاؤ۔ دوستوں کی باتیں سنتے رہو۔ ان میں خلوص ڈھونڈنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ مہذب لوگ عام طور پر خلوص سے بہت کم سروکار رکھا کرتے ہیں اور ہمارے سبھی دوست ماشاء اللہ مہذّب ہیں۔

تم جھوٹ سے سخت متنفر ہو۔ لیکن اِس کا کیا علاج کہ باقی دنیا تم سے متفق نہیں۔ خود مجھے تم سے اتفاق نہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ایک ہفتہ جھوٹ نہ بولوں تو کم از کم دس آدمیوں سے لڑائی ہو جائے۔ آخر اعلائے کلمتہ الحق کا ٹھیکہ ہمیں نے تو نہیں لے رکھا۔ اقرار کوئی نہیں کرتا مگر سب مہذب آدمی جھوٹ بولتے ہیں۔ دروغِ مصلحت آمیز فارسی کی ایک بڑی خوبصورت ترکیب ہے۔ گنوار جھوٹ بولتا ہے تو سادہ جھوٹ لیکن مہذب آدمی کبھی سادہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اسکا جھوٹ ہمیشہ دروغِ مصلحت آمیز ہوتا ہے۔ عام طور پر وہ سفید جھوٹ بولتا ہے اور اکثر اوقات بالکل غیر ضروری جھوٹ۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے دل کو یہی تسکین دیتا ہے کہ میں کوئی گناہ تھوڑا ہی کر رہا ہوں میں تو محض دروغِ مصلحت آمیز سے کام لے رہا ہوں۔

تم ہی بتاؤ اگر میرے جیسا کوئی شخص کسی لمبی داڑھی یا اونچے طرّے سے ملے تو کیا کرے ؟ سچ بولے ! لمبی داڑھیوں اور اونچے طرّوں کے متعلق میرے خیالات تمہیں معلوم ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مذہب اور قوم کے نام پر مذہب اور قوم کو بیچ کھایا۔ داڑھی کا ایک ایک بال اور طرّے کا ایک ایک تار میتیموں۔ بیواؤں اور غریبوں کے خون سے رنگین ہے۔ بظاہر یہ خون نظر نہیں آتا۔ لیکن اِس کے وجود سے خود داڑھی اور طرّے کو بھی انکار نہ ہوگا۔ مگر عوام کی دولت۔ رشوت کے روپے اور

غصب کے مال سے ایک عظیم الشان مکان بنا کر اس کے ماتھے پر "ھذا من فضل ربی" لکھ دینے یا زیادہ سے زیادہ ایک حج کرانے کے ندنیا کے ساتھ داڑھی اور طرّے کی عاقبت بھی سنور جاتی ہے۔ وہ حاجی نہیں الحاج کہلاتا ہے۔ ذرا بوڑھا ہو جائے تو ہر وقت ہاتھ میں تسبیح رکھتا ہے۔ لیکن داڑھی کی سفیدی کے ساتھ ساتھ دل کی سیاہی بڑھتی جاتی ہے۔ قویٰ بڈھے ہوتے جاتے ہیں اور ہوس جوان۔ سب جانتے ہیں داڑھی کی آڑ میں کیا ہو رہا ہے؟ لیکن سچ کون بولتا ہے؟ اگر کوئی سچ بولتا تو یہ داڑھیاں اور طرّے کبھی تمہاری انجمنوں کے صدر۔ تمہاری مساجد کے متولی اور تمہارے اوقاف کے ناظم نہ بننے پاتے۔

پھر ان طرّوں اور داڑھیوں کی اولاد باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت کے سوا اور سب کچھ بھول جاتی ہے۔ تمہیں اور مجھے اور تمہاری ندمیری طرح کے لاکھوں انسانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم طرّوں اور داڑھیوں کی اولاد نہیں۔ ہمارے باپ ـــــ نے ملّت فروشی نہ کی۔ غریبوں کا گلا نہ کاٹا۔ یتیموں کا حق نہ مارا۔ رشوت کے روپے سے حج نہ کیا۔ حرام کی کمائی سے مسجد نہ بنائی ـــــ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے لئے مزدوروں کے خون سے پیدا کی ہوئی دولت نہ چھوڑی۔ طرّوں کی اولاد آج اشتراکیت کی علمبردار ہے۔ مساوات کا دم بھرتی ہے۔ مزدوروں کے لئے آنسو بہاتی ہے۔ ذرا سوچو تمہاری اس سماج میں سچ کیلئے کہاں گنجائش ہے؟ طرّے کا بیٹا موٹر میں بیٹھ کر تانگے والوں کے پاس جاتا ہے اور انہیں ہڑتال کرنے پر اکساتا ہے۔ موٹر کو ایک طرف کھڑا کر کے ان کے جلسے میں دھواں دھار تقریر کرتا ہے۔ تھوڑی دور تک انکے جلوس کیساتھ بھی چلتا ہے لیکن پھر اپنی موٹر میں سوار ہو کر مال کے کسی پر تکلف ہوٹل میں آ بیٹھتا ہے اور کسی اور طرّے کی اشتراکی بیٹی کے ساتھ ملکر شراب پیتا ہے۔ ایسے لوگوں سے کیا سچ بولو گے؟ بات بات پر اپنے دادا کا ذکر کرنے والے۔ قدم قدم پر اپنی امارت جتانے والے سچی بات سننے کی تاب ہی کہاں رکھتے ہیں؟

تم بیزار ہو اس زندگی سے جس میں ذہنی اذیتوں کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹنے پاتا۔ تمہیں اس نظام سے نفرت ہے جس کی اساس دولت کی غلط تقسیم پر ہے۔ تم اس سماج سے متنفر ہو جہاں ایک نوجوان لڑکی پیٹ کے ہاتھوں اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہے۔ تم اس معاشرت سے نالاں ہو جہاں دوست ریاکاری سے کام لیتے ہیں۔ تم اس دنیا سے بھاگنا چاہتے ہو جہاں انسان جھوٹ بولے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس بیزاری اور اس نفرت کا ردِ عمل کیا ہے؟ سوچتے رہنا؟ کڑھتے رہنا؟ روتے رہنا؟ ـــــ اور سب کچھ برداشت کرتے رہنا؟ ـــــ یہ ہے تمہارا نسخہ؟ یہ ہے تمہارا علاج؟ یہ بزدلی ہے۔ کم ہمتی ہے۔ میں نے مانا کہ تمہارے کمزور بازوؤں میں سماج کا گلا گھونٹنے کی قوت نہیں۔ لیکن تمہارے دل میں یہ خواہش تو ہو۔ طرّے اور داڑھی کی روح کو "ہوائے زر و سیم" کھا گئی اور تمہاری روح کو ـــــ خدا بچائے!

حمید نظامی

توحیدِ مجازی

مرا ذوقِ نظر اُن کے تصور کا بنا سانچا
انہیں دیکھا انہیں سمجھا انہیں پرکھا انہیں جانچا

انہیں کی یاد سے وابستہ میری زندگی ساری
خیال آرا انہیں سے خواب میرا میری بیداری

کبھی میرے تصور میں وہ میٹھی نیند سو جائیں
کبھی اک خاص عالم میں نظر افروز ہو جائیں

انہیں پر حصر کیا ہے ان سے نسبت جس نے بھی پائی
بنا میرا خیالِ حسن رس اُس کا تماشائی

کبھی وہ خوابگاہِ ناز یکسر جگمگاتی ہے
نگاہِ خواب آلود ان کی جس میں مُسکراتی ہے

کبھی وہ حجلۂ زرتار شان اپنی دکھاتا ہے
جہاں حُسنِ تبسم ریز رنگ اپنا جماتا ہے

کھُلا ہر مظہرِ خوبی یہ ان کا حسنِ تام اچھا
سکوت اچھا کلام اچھا خرام اچھا قیام اچھا

انہیں کو منتخب میں نے کیا ہے خوش جمالوں میں
وہی میری نگاہوں میں وہی میرے خیالوں میں

رہیں مُمتاز سب سے سیر میں بھی خوبیاں ان کی
بچھی جاتی ہیں آنکھیں رہ میں خود ہمجولیاں ان کی

نظر آئے نہ کیونکر باغ کا باغ اُن کے قابو میں
مہارت کی ہے پیدا انکی خوش چشمی نے جادو میں

اِسی جادو سے ہے میرے دماغ و دل کا یہ عالم
"حیاتِ آبادِ عرفاں" میں وہی وہ ہیں مرے ہمدم

جُدا ان کے تصور سے نہ دل میرا نہ جاں میری
یہ توحیدِ مجازی ہے حقیقی ترجماں میری

علی منظور

جھوٹا دل

پوچھا یہ دل سے میں نے "گزرتی ہے کس طرح؟"

اور دل نے یہ کہا —

"شاداب سیب سرخ ہو بستاں میں جس طرح"

لیکن یہ جھوٹ تھا!

(ماخوذ)

بیگانگی!

چرا لیتا ہے آنکھیں

مرے غم سے تبسم

گزر جاتے ہو یونہی

مرے نزدیک سے تم! —

سعید احمد اعجاز

جدید شاعری کے چند نمونے

پچھلے دنوں "حلقۂ اربابِ ذوق" نے زیرِ صدارت میاں بشیر احمد صاحب ایک مشاعرہ منعقد کیا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں موجودہ شعراء کی صرف وہ نظمیں پڑھی گئیں جن میں زبان، طرزِ ادا، یا تخیّل کے لحاظ سے کوئی جدت تھی۔ اس مشاعرے کی بعض نظمیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ جناب جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، فراق گورکھپوری، حامد علی خاں، عبدالحمید عدم، محمد دین تاثیر، اور آرزو لکھنوی وغیرہم کی نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ عدمِ گنجائش کی وجہ سے سب نظمیں شائع نہیں ہو سکتیں۔ نئی نظموں میں زبان کی لغزشیں نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔ "ہمایوں"

اُونچا مکان

بے شمار آنکھوں کو چہرے میں لگائے ہوئے اِستادہ ہے۔ تعمیر کا اک نقشِ عجیب،
اے تمدن کے نقیب!
تری صورت ہے مہیب،
ذہنِ انسانی کا طوفان کھڑا ہے گویا!
ڈھل کے لہروں میں کئی گیت سنائی مجھے دیتے ہیں، مگر
اُن میں اک جوش ہے بیداد کا، فریاد کا اک عکسِ دراز
اَور الفاظ میں افسانے ہیں بے خوابی کے،
کیا کوئی روحِ حزیں
ترے سینے میں بھی بیتاب ہے تہذیب کے رخشندہ نگیں؟
گھٹ کے لہریں ترے گیتوں کی مٹیں، مجھ کو نظر آنے لگا
ایک تلخابۂ کسی بادۂ بدرنگ کا اک ٹوٹے ہوئے ساغر میں،
نشۂ مے سے نظر دھندلی ہوئی جاتی ہے،
رات کی تیرہ فضا کیوں مجھے گھبراتی ہے؟

رات کی تیرہ فضا میں تری آنکھوں کی چمک مجھ کو ڈرا سکتی نہیں ہے، میں تو
اِس سے بھی بڑھ کے اندھیرے میں رہا کرتا تھا،
اور اُس تیرگیٔ روح میں رخشاں تھے ستارے دُکھ کے،
اور کبھی بھول ہیں، ہر نجم درخشاں سے لپک اُٹھتے تھے شعلے سکھ کے،
جیسے روزن سے ترے تان لپکتی ہوئی پھیلاتی ہے بازو اپنے
جذب کر لیتا ہے پھر اُس کو خلاء کا دامن،
یاد آنے لگے تنہائی میں بہتے ہوئے آنسو اپنے،
وہی آنسو، وہی شعلے سکھ کے،
لیکن اک خواب تھا، اِک خواب کی مانند لپک شعلوں کی تھی،
مری تخئیل کے پر طائرِ زخمی کے پروں کی مانند
پھڑپھڑاتے ہوئے بیکار لرز اٹھتے تھے،
مرے اعضاء کا تناؤ مجھے جینے ہی نہ دیتا تھا، تڑپ کر، یکبار
جستجو مجکو رہائی کی ہُوا کرتی تھی،
مگر افسوس کہ جب درد دوا بننے لگا مجھ سے وہ پابندی ہٹی،
اپنے اعصاب کو آسودہ بنانے کے لئے
بھول کر تیرگیٔ روح کو میں آپہنچا
اِس بلندی کے قدم میں نے لئے
جس پہ تو سینکڑوں آنکھوں کو جھپکتے ہوئے استادہ ہے۔
ترے بارے میں سنا رکھی تھیں لوگوں نے مجھے
کچھ حکایاتِ عجیب
میں یہ سنتا تھا ترے جسمِ گرانبار میں بستر ہے بچھا
اور اک نازنین لیٹی ہے وہاں تنہائی
ایک پھیکی سی تھکن بن کے گھسی جاتی ہے
ذہن میں اُس کے، اگر وہ بیتاب
منتظرِ اس کی ہے پردہ لرزے

پیرہن ایک ڈھلکتا ہوا بادل بن جائے
اور در آئے اک اَن دیکھی، انوکھی صورت،
کچھ غرض اُس کو نہیں ہے اِس سے
دل کو بھاتی ہے، نہیں بھاتی ہے
آنے والے کی ادا ــــــــ
اُس کا ہے ایک ہی مقصود، وُہ استادہ کرے
بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اِک نقشِ عجیب
جس کی صورت سے کراہت آئے
اور وہ بن جائے نزا مدِمقابل پل میں
ذہنِ انسانی کا طوفان کھڑا ہو جائے
اور وہ نازنیں بے ساختہ، بے لاگ، ارادے کے بغیر
ایک گرتی ہوئی دیوار نظر آنے لگے
شب کے بے روح تماشائی کو۔
بھول کر اپنی تھکن کا نغمہ
مختصر لرزشِ چشم در سے
ریگ کے قصر کی مانند سبکسار کرے۔
بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اک نقشِ عجیب
ایک گرتی ہوئی دیوار کی مانند لچک کھا جائے۔
یہ حکایات مرے ذہن میں اک بوئے خراماں بن کر
جب کبھی چاہتی تھیں رقص کیا کرتی تھیں،
اور اب دیکھتا ہوں سینکڑوں آنکھوں میں تری
ایک ہی چشمِ درخشاں ہے مجھے آتی ہے نظر،
کیا اِسی چشمِ درخشاں میں ہے شعلہ سُکھ کا؟
ہاتھ سے اپنے اب اِس آنکھ کو میں بند کیا چاہتا ہوں۔

دریچے کے قریب

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
محفلِ خواب کے اِس فرشِ طربناک سے جاگ
لذتِ شب سے ترا جسم ابھی چُور سہی
آمری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو!
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنّا کا خیال آتا ہے۔
سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ، جنوں خیز نگاہیں اپنی،
صبح کے نور سے شاداب سہی،
اِسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے

. . . .

اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملّائے حزیں
ایک عفریت اُداس!
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں
ایسی ذِلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنّات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں۔

ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل،
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوّالہ بنے!
ان میں مفلس بھی ہیں، بیمار بھی ہیں۔
زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں!
ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں،
بھوک کا شاہسوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے!
اور اسی شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شب عیش گذر جانے پر
بہر جمع خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
چرخِ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ سہی،
مسجدِ شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالم رخصت میں شفق چومتی ہے۔

ن۔م۔راشد

پشیمانی

موت کا راگ نفیری پہ بجاتی اُٹھی،
لُو، جھلستی ہوئی لُو،
اُٹھی،

بڑھی،
ریت پر جیسے دھواں اُڑتا ہو۔
سرسراہٹ سی درختوں میں ہوئی،
پتے مرجھا گئے،
گرنے لگے،
وہ اُن کے کھڑکنے کی صدا ـــــ میرے خُدا!
تُو کے ہمراہ بڑھے؛
موت کے ناچ کا نکلا تھا جلوس!
چونک کر جاگ اُٹھے صحنِ چمن میں طائر،
آشیانوں سے جُدائی انہیں منظور نہ تھی۔
سہم کر اُٹھے، اُڑے، اُڑ کے وہیں آن گرے،
اُن کی وہ آخری فریاد کناں آہ و بکا ـــــ میرے خُدا!
اک گھٹاٹوپ اندھیرے میں جھکائے ہوئے سر
ہاتھ آنکھوں پہ رکھے،
بیٹھی ہے غمگین، اُداس، مجبور،
پہلو میں افسردہ خموشی کو لئے،
سانس رُکنے لگا،
خون جمنے لگا،
بیکلی ڈھونڈتی پھرتی تھی پناہ،
رینگتا رینگتا خوف آیا ـــــ سسکتا ہوا سانپ!
بیکلی کانپ اُٹھی،
خوف جھپٹ کر اُٹھا ـــــ بیکلی نزع میں تھی،
مجھ کو بچا ـــــ میرے خدا!
تیرگی کانپی،
فضا لرزی،

کھلی کرنوں کی راہ،

روحیں جو وسعتِ آفاق میں آوارہ سی تھیں،

ڈھونڈتی پھرتی تھیں منزل اپنی،

پھڑپھڑاتے ہوئے پر اپنے اُٹھیں،

اور ہواؤں میں بڑھیں

سامنے جنتِ گم گشتہ نظر آتی تھی۔

تصدّق حسین خالد

برادرِ نسبتی

میں شاد ہوں اپنے بھائیوں سے تو جھ سے راضی ہیں میرے بھائی
پھُپھیرے بھائی، خلیرے بھائی، ممیرے بھائی، چچیرے بھائی

پھُپھیرے بھائی کو دیکھتا ہوں پھپھی کی آتی ہے یاد صورت
وہی تکلم، وہی تبسم، وہی محبت، وہی عنایت

خلیرے بھائی نے یاد مجھ کو دلایا گزرا ہُوا زمانہ
وہ میری خالہ کا آ کے ہنسنا، وہ میری امّاں کا مسکرانا

میں جیسا ہوں دادھیال سے خوش اسی طرح ننھیال سے خوش
چچیرے بھائی کے حال سے خوش، ممیرے بھائی کی چال سے خوش

کشیدہ خاطر نہیں ہے کوئی، میں اِن کا شیدا وہ مجھ پہ مائل
جو سب کے سب رشتہ دار خوش ہیں شگفتہ ہیں باہمی وسائل

کیا ہے قانون اور شریعت نے قائم اور ایک تازہ رشتہ
جدید یہ رشتہ دار میرے لئے محبت کا ہے فرشتہ

یہ نیک انسان حقیقی بھائی میری شریکِ حیات کا ہے
برادرِ نسبتی کا دلکش اضافہ کس درجہ جانفزا ہے

برادرِ نسبتی اِدھر خوش مری شریکِ حیات اُدھر خوش
خوش اِس سے میں بول کر ہوں میں بھی غرض ہے اس وقت گھر کا گھر خوش

جدید یہ ارتباط ہوگا نئے نئے رابطوں کا حامل
اسی طرح پھیلتے رہے ہیں جہاں میں چھوٹے بڑے قبائل

وسیع ہوں گے اِس اشتراکِ لطیف سے دونوں خانداں بھی
ریاضِ ہستی کی ہوں گے زینت نئے مکیں بھی نئے مکاں بھی

برادرِ نسبتی کے تیور بتا رہے ہیں کہ باوفا ہے
ابھی بہت رسم و رہ بڑھے گی ابھی محبت کی ابتدا ہے

برادرِ نسبتی میں مجھ میں بڑھے نہ آئندہ کیوں صفائی
کہ ہوں گے میرے اور اِس کے بچے پھپھیرے بھائی ممیرے بھائی

سیّد علی منظور

بستی کی لڑکیوں میں

فریادیٔ جفائے ایام ہو رہا ہوں

پامالِ جورِ بخت و ناکام ہو رہا ہوں سرگشتۂ خیالِ انجام ہو رہا ہوں

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

بدنام ہو رہا ہوں

سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

سلمیٰ سے دل لگا کر سلمیٰ سے دل لگا کر

اس حورِ وش کے غم میں دنیا و دیں گنوا کر ہوش و حواس کھو کر صبر و سکوں لٹا کر

بیٹھے بٹھائے دل میں غم کی خلش بسا کر

ہر چیز کو بھلا کر

سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

کہتی ہیں سب "یہ کس کی تڑپا گئی ہے صورت"

سلمیٰ کی شاید اسکے من بھا گئی ہے صورت اور اُس کے غم میں اِسکی مرجھا گئی ہے صورت

مرجھا گئی ہے صورت، کملا گئی ہے صورت

سنولا گئی ہے صورت

سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

پنگھٹ پہ جبکہ ساری ہوتی ہیں جمع آکر

گاگر کو اپنی رکھ کر گھونگٹ اُٹھا اُٹھا کر یہ قصّہ چھیڑتی ہیں مجھ کو بتا بتا کر

"سلمیٰ سے باتیں کرتے دیکھا ہے اس کو جاکر
ہم سے نظر بچاکر"
سلمیٰ سے دل لگاکر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

کھیتوں سے لوٹتی ہیں جب دن چھپے مکاں کو
تب راستے میں باہم وہ میری داستاں کو دہرا کے چھیڑتی ہیں سلمیٰ کو میری جاں کو
اور وہ حیا کی ماری سی لیتی ہے زباں کو
کیا چھیڑے اس بیاں کو
سلمیٰ سے دل لگاکر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اک شوخ چھیڑتی ہے اس طرح پاس آکر
"دیکھو وہ جارہی ہے سلمیٰ نظر بچاکر شرما کے مسکرا کر آنچل سے مُنہ چھپاکر
جاؤ نا پیچھے پیچھے، دو باتیں کرلو جاکر
کھیتوں میں چھپ چھپاکر"
سلمیٰ سے دل لگاکر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اک شوخ تازہ وارد سسرال سے گھر آکر
سکھیوں سے پوچھتی ہے جس دم مجھے بتاکر "یہ کون ہے" تو ظالم کہتی ہے مسکرا کر
تم اس کا حال پوچھو سلمیٰ کے دل سے جاکر
یہ گیت اُسے سُناکر
"سلمیٰ سے دل لگاکر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں"

بنگال کا باغی شاعر

ایک سپاہی جاگ رہا ہے!
خندق میں سب اُس کے ساتھی خستہ خواب،
تاریکی ہے، خاموشی ہے، سناٹا ہے اور میدان!
دن بھر جس کے دامن میں تھا گرم لڑائی کا گھمسان!
تیغوں تیروں کی جھنکاریں اور بوچھاڑوں کا طوفان!
اب شورش کے تھم جانے سے گورستان!
ویراں مرگھٹ یا شمشان!

چیخیں سی کچھ گونج رہی ہیں،
طیاروں سے پھینک رہے ہیں تیر شعاع!
فرشِ زمیں پر چھوڑ رہا ہے گولے کوئی بم انداز!
بندوقوں کے چل جانے کی یک لخت آتی ہے آواز!
ایک دو لمحے شور و شغب کے پھر وہی خاموشی کا گداز!
پھر ظلمت کے بادل میں روپوش جہاز!
پھر وہی افسوں خواب نواز!

دل ہے سپاہی کا بیتاب
نیند اُس مضطر سے ہے کالے کوسوں دُور،
کروٹ کروٹ پہلو بدلے چین نہ پائے وہ بیدار!
جذبات اُس کے تیز لہو کی گردش سے غلطانِ فشار!
ایلو! نادانستہ اُس کے مُنہ سے ٹپکے چند شرار!
رزم افروز و ظلمت سوز و آتش بار!
انگاروں کی سُرخ بہار!

باغی شاعر کا آغاز!
جس کی بنگلہ ادب کے حلقوں میں ہے دھُوم

جس کے ہر اک شعر میں غلطاں شعلۂ تیغ خوں آشام!
ہر بنگالی کے دل میں ہے کندہ جس کا خونیں نام!
پرچمِ کادہ ہے سادنتوں کو جس کا پُرجوش پیام!
جس کے تلے ہیں دہقان و مزدور غلام!
آ گئے خود نذر الاسلام!

آگ، لہو، کوندے کی لپک!
گونج رہا ہے رزم گہہِ مشرق میں بگل!
بھک سے اُڑا دو، جھپٹو، کودو، گرجو، ہر چہ بادا باد!
مارو، مارو، دابو، دابو، استعمار و استبداد!
موت آئے یا اب آزادی، مرجائیں یا ہوں آزاد!
بھارت کے دقیانوسی شاعر برباد!
باغی شاعر زندہ باد!

م حسن لطیفی

اندھی جوانی

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

گھٹائیں کالی کالی

خوب برسنے والی

متوالی

پرشور

گھٹائیں

چھائی ہیں گھنگھور

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

گلشن کی گلپوش ادائیں آموں کی خاموش فضائیں

کوئل کی مدہوش صدائیں

بن میں بول رہے ہیں مور

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

جوانی لے آئی برسات جوانی لے آئی برسات

جوانی ہائے جوانی

سرشوری نادانی

مستانی

بدذات

جوانی

لے آئی برسات

جوانی لے آئی برسات

بیٹھا ہوں راوی کے کنارے کرتا ہوں پریوں کے نظارے

اُف یہ نگاہیں اُف یہ اشارے

چھائی نگہ پر کالی رات

جوانی لے آئی برسات جوانی لے آئی برسات

محبت آہوں کا طوفان محبت آہوں کا طوفان

محبت پیاری پیاری

میٹھی سی بیماری

بے چاری

انجان

محبت

آہوں کا طوفان

محبت آہوں کا طوفان

اک کشتی ملّاح سے خالی — میں نے اُٹھا دریا میں ڈالی

اِس کشتی کا اللہ والی

پار لگائے گا رحمان

محبت آہوں کا طوفان — محبت آہوں کا طوفان

حفیظ جالندھری

تسلّی

چند روز اَور مری جان! فقط چند ہی روز، — ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم،

اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں — اپنے اجداد کی میراث ہے، معذور ہیں ہم۔

جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں، — فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں،

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں! — زندگی کیا، کسی مفلس کی قبا ہے، جس میں

ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں۔ — لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں،

اک ذرا صبر! کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں، — عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں

ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے — اجنبی ہاتھوں کا بے نام، گرانبار ستم

آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے۔ — یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد

اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار، — چاندنی راتوں کا بیکار، دہکتا ہوا درد،

دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار، — چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز!

فیض احمد فیض

حسنِ عقیدت

زنظم و نثرِ مولانا ظہوری[1] زندہ ام غالب — رگِ جاں کردہ ام شیرازہ اجزائے کتابش را

مرزا اسد اللہ خاں غالب

کشتۂ اندازِ مُلّا جامی[2] ام — نظم و نثرِ اُو علاجِ خامی ام

اقبال

راحل ہوشیارپوری

۱۔ مُلّا نور الدین ظہوری ترشیزی — ۲۔ مُلّا نور الدین عبد الرحمٰن جامیؒ

ابدی راحت

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے"

"تم چاہو تو اب بھی کچھ نہیں گیا کارنیلسی! کیا واقعی تمہارے دل میں؟ ...."

"بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو تم اب اس تکرار سے کچھ حاصل نہیں۔ تمہیں چاہئے کہ پچھلی سب باتوں کو بھول جاؤ اور دعا کرو کہ جس شخص سے میرا آج عقد ہو رہا ہے تمام عمر"

"جس شخص سے میرا آج عقد ہو رہا ہے" تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ کارنیلسی۔ تم ذرا پلکیں اٹھا کر میری طرف تو دیکھو پہچانتی ہو میں کون ہوں میں"

"مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ میں نے تمہارا کافی انتظار کیا تم مجھے چھوڑ کر فوج میں چلے گئے تم نے میری پرواہ نہ کی۔ میں تمہاری یاد کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی"

"لیکن ——"

"وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔ مجھے بھی رفتہ رفتہ قرار آ گیا آج پھر تم عین اس وقت جب میری شادی ہو رہی ہے اپنی گذشتہ محبت کی داستان لیکر آ گئے ہو تمہیں کہو اب اس سے کیا فائدہ؟"

"دھوکا نہ کھاؤ کارنیلسی۔ میں اب بھی تمہیں ویسے ہی چاہتا ہوں۔ اُس سے بھی زیادہ ہم ایک دفعہ پھر اپنی محبت کے فردوس کو آباد کر سکتے ہیں۔ میں نے تمہارے ہی لئے تو ملازمت کی تھی تاکہ تمہارے لئے بہتر عیش کے سامان پیدا کر سکوں۔ میرے دل میں تمہاری محبت اب بھی ویسی ہی محبت ہے۔"

"ہو گی، لیکن میرے دل میں وہ مر چکی ہے۔ میرے دل میں اب اگر کسی کا کچھ احترام ہے۔ تو اُسی کا جس کے ساتھ آج ......"

"میرے سامنے اُس کا نام نہ لینا۔ میری غیرت اس کو برداشت نہیں کر سکتی تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا تم میرے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتیں"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم نوجوان ہو۔ خوبصورت ہو اچھے عہدے پر ہو تمہیں مجھ سے بہتر لڑکی مل جائے گی"

"مجھے تمہارے سوا اور کچھ نہیں چاہئے۔"

"یہ ناممکن ہے"

"ناممکن کیوں ہے۔ میں تمہارے دامن کو کبھی نہیں چھوڑونگا۔ دیکھتا ہوں دنیا کی کونسی طاقت مجھے تم سے الگ کر سکتی ہے"

"تم آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہو۔ مجھے مجبوراً اپنے نوکر کو آواز دینی پڑے گی۔ تم اُس کے سامنے مجھ سے ایسی باتیں نہیں

کر سکو گے،

'میں جا رہا ہوں لیکن یاد رکھو تم اُس سے آج رات شادی نہیں کر سکو گی۔ تم میری ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔'

وہ باہر چوراہے پر بدحواسی کے عالم میں کھڑا ہے۔ اُسکے چاروں طرف موٹر تانگے اور بگھیاں گذر رہی ہیں لیکن اُسے اُن کا علم تک بھی نہیں۔ سڑک کا شور وغل اُسے اس طرح محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ خواب میں کہیں دُور کی آوازیں سن رہا ہے۔ اُسکے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہے کہ کارنیلیسی کسی اور سے شادی نہ کرے لیکن آج ہی شام کو اُس کی شادی ہے۔ اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دن کے غروب ہونے میں صرف تین گھنٹے باقی ہیں۔ اُسے وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن وہ کیا کرے؟

خودکشی! نہیں یہ ایک بزدلانہ فعل ہے۔ وہ کیوں اپنے رقیب کے لئے میدان صاف کرے۔ کارنیلیسی اُس کے ساتھ ہنسی خوشی اپنی زندگی بسر کرے اور وہ سڑک پر کسی کار کے نیچے۔ نہیں یہ تخیل سخت بھیانک ہے لیکن وہ کیا کرے۔ اُس کے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ اُسکے دوست؟ اس معاملہ میں کوئی بھی اُسکی مدد نہیں کر سکتا لیکن اگر آج کارنیلیسی کی شادی ہو گئی تو ــــــــ

اُسے ایک چکر آیا اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ ایک وحشی شیر کی طرح غرّایا جو اچانک شکاری کے مضبوط سلاخوں والے پنجرے میں پھنس گیا ہو اور اُس کا کمزور شکاری پنجرے کے باہر کھڑا اُس کی حالت پر ہنس رہا ہو۔

مایوسی اور بدحواسی کے عالم میں وہ ایک بجلی کے کھمبے کا سہارا لیکر آنکھیں بند کرکے تھوڑی دیر کے لئے سستایا، معاً اس کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ ایک لمحے کیلئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ایک ایسے خرگوش کی طرح جس کے تعاقب میں چند خونخوار شکاری کتے لگے ہوئے ہوں اور اس بدحواسی کے عالم میں اسے یک لخت سامنے ایک ایسا غار مل جائے جس میں وہ پناہ لے سکتا ہو۔ اُس نے اطمینان کا ایک سانس لیا اور چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد ایک سمت کو دوڑ پڑا

میرا مقدس باپ! اُس نے دو دفعہ بیساختہ کہا اور راستے کی گاڑیوں کی ٹکر سے بے نیاز ہو کر دوڑنے لگا۔ راستے کے لوگ اُسے حیرت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بعض نے سمجھا یہ پاگل ہے اور اکثر یہ خیال کرنے لگے کہ وہ کوئی مجرم ہے جس کا پولیس تعاقب کر رہی ہے۔

' وہ ضرور میری مدد کریگا۔ وہی میری مدد کر سکتا ہے۔ مقدس باپ مذہب کا رکن رکین۔ اُسکو روحانی اختیارات حاصل ہیں۔ وہ چاہے تو دم بھر میں نظام عالم کو تہ و بالا کر دے۔ اُس کے لئے یہ کام نہایت معمولی ہے۔ میں اپنی کارنیلیسی اسی سے لوں گا۔ وہ مجھے دے سکتا ہے۔' اُسے افسوس تھا کہ وہ کارنیلیسی سے ملنے کی بجائے سیدھا اُسی کے پاس کیوں نہ گیا۔ اگر گیا ہوتا تو کارنیلیسی اسے اس قسم کا تلخ جواب نہ دیتی۔ ایک ایسے ملاح کی طرح جس کی کشتی طوفان میں غرق ہو گئی ہو۔ اور سارا دن ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد شام کیوقت اُسے سمندر کے ساحل کی حسین اور رنگین روشنیاں نظر آنے لگیں اُس نے اپنی تمام طاقتوں کو جمع کیا اور دوڑتا چلا گیا۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے مقدس باپ کی خوشنودی حاصل ہے۔ ورنہ اگر مجھے اس کی درگاہ میں شرف باریابی حاصل نہ ہو چکا ہوتا تو آج میں کس امید پر اس کے پاس اپنی التجا لے جاتا۔

کچھ عرصہ کے بعد اُس نے اپنے آپ کو مقدس باپ کے بنگلے کے سامنے دیکھا۔ دربانوں نے اُسے دُور سے اس حالت میں آتے دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ وہ کسی سخت تکلیف میں ہے۔ لیکن انہیں اس پر تعجب نہ ہوا کیونکہ مقدس باپ کے پاس کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ پریشاں حال لوگ آتے تھے۔

وہ دروازے پر آ کر رک گیا اور زور سے پکارا "مقدس باپ۔ مقدس باپ!"

'چلے آؤ' اندر سے ایک دھیمی بارعب اور پاکیزہ آواز آئی۔

ایک ایسے کسان کی طرح جو زمستاں کی کسی اولے پڑتی ہوئی رات میں کافی سفر طے کر لینے کے بعد اپنی جھونپڑی میں داخل ہو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ مقدس باپ اپنے کمرے کے وسط میں ایک پلنگ پر جلوہ افروز تھا۔ کمرے کے اندر دروازوں اور کھڑکیوں پر پردوں کی موجودگی کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ اس ظلمت خانے میں مقدس باپ کا پُرنور چہرہ اور سفید ریش اُس کی وجاہت میں اضافہ کر رہی تھی۔

'میرے مقدس باپ! میں سخت تکلیف میں ہوں۔ میری مدد کیجیئے۔' اُسنے اپنا سر مذہبی پیشوا کے قدموں میں رکھ دیا اور رونے لگا۔

'خدا تمہیں تسکین دیگا' مقدس باپ نے اُسکے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"میری کارنیلسی مجھ سے بے وفائی کر رہی ہے۔ وہ آج ایک اور سے شادی کر رہی ہے۔ آج ہی شام کو۔ مقدس باپ! میں مر جاؤں گا۔ میری کارنیلسی مجھے دلا دیجئے۔ آپ کے لئے یہ بہت معمولی بات ہے۔"

'میری طرف دیکھو' مقدس باپ نے دوبارہ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"فرمایئے" اُس نے اپنے سر کو اوپر اُٹھایا۔ اُسکی آنکھوں میں اُمید و بیم کی کشمکش واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔

تمہیں وہ شخص ہو جسے خدائے عزّوجل نے اپنے خاص کرم کے لئے منتخب کیا ہے۔ تم بڑے خوش نصیب ہو'

'تو مجھے میری کارنیلسی ———'

نہیں۔ ابدی راحت کارنیلسی سے کہیں زیادہ بہتر ہے'

'لیکن مجھے تو میری کارنیلسی چاہیئے میں ابدی راحت کو کیا کروں گا'

'ایک معصوم بچے کیطرح تم اپنا فائدہ اور نقصان خود نہیں سمجھ سکتے۔ تمہیں کیا معلوم کہ ابدی راحت کیا ہوتی ہے تمہیں شکر کرنا چاہیئے کہ یہ سعادت تمہارے حصّہ میں آئی ہے'

'لیکن مقدس باپ! وقت بہت تھوڑا ہے۔ شام کے وقت ———'

'ٹھہرو! تمہارا آسمانوں پر انتظار ہو رہا ہے اور تم دنیا کے ناپاک جھگڑوں میں اپنا دماغ پریشان کر رہے ہو۔ اُٹھو سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔'

'مگر ———'

'اٹھو کھڑے ہو جاؤ' مقدس باپ نے کڑک کر کہا۔

وہ کانپ گیا اور کھڑا ہو گیا۔

'جانتے ہو یہ کیا ہے؟' مقدس باپ نے اپنے فرغل سے ایک پستول نکالتے ہوئے کہا۔

'یہ پستول ہے' اُس نے خوف و حیرت سے جواب دیا۔

'ہاں یہ پستول ہے۔ اسے بوسہ دو اور لے لو۔ یہ تمہیں خدائے عزّوجل کی طرف سے ملا ہے۔ ملک کا وزیرِ اعظم مذہب کا دشمن ہے۔ خدا اور اُسکی بنائی ہوئی نیک روحوں کو اُسکے خون کی ضرورت ہے۔ قدرت کا منشا ہے کہ یہ کام تمہارے ہاتھوں سے سرانجام ہو۔ اُسی طاقت نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے وہ نابکار پرسوں اسی شہر میں ایک کھلے جلسے میں تقریر کریگا۔ وہیں تم اُسے ——"

'نہیں نہیں مقدس باپ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا'

'خاموش رہو' مذہبی پیشوا نے درشت ہو کر کہا 'خدا کی مرضی کی خلاف ورزی کرنا جانتے ہو کیا ہوگا۔ زمین پھٹ جائیگی اس میں سے لاوا نکلے گا اور چاروں طرف سے تمہیں گھیرے گا جہنم۔ ابدی جہنم۔'

"پناہ! مقدس باپ پناہ" وہ لرز رہا تھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر دھر لئے۔ لیکن اس خدمت کے لئے میں کیوں منتخب کیا گیا"

'اس لئے کہ خدا تم پر مہربان ہے۔ وہ تمہیں ابدی راحت دینا چاہتا ہے۔ اس پستول کو لو'

'رحم کرو مقدس باپ'

'نہیں لیتے؟' مقدس باپ نے چلا کر کہا اور اپنی آستینوں کو چڑھا کر ہاتھ اوپر اُٹھا لئے 'اپنے آپ کو قہرِ الٰہی کیلئے تیار کرو۔'

'نہیں۔ نہیں مقدس باپ۔ میں احکامِ الٰہی کی تعمیل کروں گا'

وہ مقدس باپ کے قدموں سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

'یاد رکھو اگر تم نے ذرّہ بھر بھی غداری کی یا اس کا خیال بھی تمہارے دل میں آیا تو تمہیں آگ لگ جائیگی'

'نہیں میں غداری نہیں کروں گا' اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

'میں تمہیں ابدی راحت کی خوشخبری دیتا ہوں۔ حوریں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تم جنّت میں حکومت کرو گے۔ اور کارنیلسی سے کہیں زیادہ ——'

آہ کارنیلسی —— 'اُس نے آہستہ سے کہا۔

گھبراؤ مت بیٹا۔ یہ دو دن کی بات ہے پھر تمہیں سکونِ ابدی میسر ہوگا۔ مذہبی خطبوں میں تمہارا نام دہرایا جائیگا تم پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں گی۔

مقدس باپ نے اسکا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ 'لو یہ پستول'

اُس نے پستول کو چوم کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اب جاؤ۔ میرے بیٹے۔ اور ہاں اسے کوٹ کے اندر اچھی طرح سے چھپا لو کیونکہ پولیس ہر شخص کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہی ہے مذہبی پیشوا نے نرم لہجے میں کہا۔ پرسوں۔ چار بجے شام" وہ باہر نکلا۔ دربانوں نے پر معنی انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا گویا وہ کہہ رہے تھے۔ دیکھا مقدس باپ نے اِس شخص کا سارا دکھ دور کر دیا ہے،

اُس کے پاؤں بوجھل ہو رہے تھے۔ اور وہ شام کے وقت نہر کی رو میں بہنے والے شیشم کے ایک سوکھے ہوئے تنہا پتے کی طرح اپنے دل ہی دل میں باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا اور اُسے معلوم نہ تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے۔

"آہ خدایا تو نے ابدی راحت کیلئے مجھے ہی کیوں پسند کیا۔ تیری دنیا کے لوگ کسقدر خوش و خرم چل پھر رہے ہیں ان سب میں مجھ سا بدنصیب اور نامراد کوئی نہیں۔ کیا تو اتنا قادرِ مطلق ہونے پر بھی اپنے دشمن وزیرِ اعظم کی جان خود نہیں لے سکتا۔ اور اس کے لئے تجھے مجھ سے ستم رسیدہ انسان کی خدمت کی ضرورت ہے یا وہ آگ جو مجھے تیرے حکم کی نافرمانی کرنے پر ناحشر جلا سکتی ہے اِس ظالم اور بدبخت وزیرِ اعظم کو بھسم نہیں کر سکتی۔ یا کیا واقعی تجھے اُن لوگوں کو اذیت دینے میں لطف آتا ہے جو تیرے دامن کو پکڑ کر پناہ لیں۔ بارِ الہا۔ اگر میں دنیا کے مظالم سے تنگ آکر تیری امداد کا خواہاں نہ ہوتا اور اس کیلئے تیرے بنائے ہوئے مذہبی پیشوا کے پاس نہ جاتا تو تو مجھے اِس خدمت پر کسطرح معمور کر سکتا تھا۔ کیا میرا صرف یہی قصور ہے کہ میں تجھ پر ایمان رکھتا ہوں تیرے احکام کی پیروی کرتے ہوئے تیرے مقدس پیشوا کی عزت اور اطاعت کرتا ہوں۔ بجلی کی روشنیوں میں یہ مسکراتے ہوئے چہرے۔ خدایا اِن میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں جو تیری بتائی ہوئی ہدایات کی کھلم کھلا توہین کرتے ہیں۔ تیرے مقدس پیشواؤں کو جانتے بھی نہیں پھر بھی تجھے اُن کو دکھ دینا منظور نہیں۔ اگر ہے تو مجھے جو تجھ سے ڈرتا ہوں۔ اے خدا تو منصف و عادل ہے۔ کاملیسی آج اپنے شوہر کیساتھ جلسۂ عقد میں مسکراتی ہوئی پھر رہی ہوگی۔ اور میں پرسوں پھانسی پر لٹکایا جاؤنگا۔ میرے مالک میں نے تیری کونسی خطا کی ہے کیا تجھے اپنی مطلب براری کے لئے بیکسوں اور ناتوانوں کے خون کی ضرورت ہے؟"

اُسے دنیا بالکل اجنبی معلوم ہو رہی تھی اور وہ بجلی کی روشنیوں میں پر نور سڑکوں پر بھی چلتا ہوا یہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اندھیرے میں کسی ایسے زینے سے اتر رہا ہے جس سے اُس کا گذر کبھی نہیں ہوا۔ راستے میں ایک شخص نے اُسے اُس کے نام سے پکارا۔ دوسرے کے قہقہے کی آواز آئی جلتے ہو حضرت کی محبوبہ کسی اور سے شادی کر رہی ہے۔ یہ چوٹ اُسے بہت سخت پڑی مگر اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور چلتا رہا۔

تیسرے دن جب حکومت کا وزیرِ اعظم ایک جلسے میں لوگوں کو باغیوں کی کارستانیوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ ایک شخص اُس مجمع میں اسکی جان لینے کی ناکام کوشش کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ لوگوں کے دلوں میں اُس کے خلاف سخت نفرت تھی اور وہ اُسے حقارت اور عتاب کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

وزیرِ اعظم نے للکار کر کہا۔ وہ گو اہ حکومت کا مجرم ہے۔ اسے کل شہر کے صدر دروازے پر پھانسی دی جائیگی۔

ملزم چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"لوگو مجھے چھڑالو۔ مجھے ابدی راحت نہیں چاہیئے۔ مجھے اسی دنیا کی راحت لینے دو۔"

سید رضا گردیزی

تحسینِ سخن

عُرفی علیہ الرحمۃ

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیّل نے | تصدّق جس پہ حیرت خانۂ سینا دفارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اُس نے نوا ایسی | میسّر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشکِ عنابی

اقبال

راسخ دہلوی مرحوم

ہائے وہ مولانا راسخ کا کلام | وہ تخیل وہ مضامین کی ادا
آسمانوں پر وُہ پرواز خیال | وہ زمینوں کو بنا لینا نیا

آغا شاعر قزلباش

راحل ہوشیارپوری

پیکِ مُشتاقاں

نسیمِ صُبح جاتی ہے سوئے مُلکِ دکن حسرت
تپشہائے جدائی کا اسی سے ماجرا کہیئے

مشامِ جاں مُعطّر ہو رہا ہے
دکن سے جھونکے آتے ہیں صبا کے

حسرت موہانی

راحل ہوشیارپوری

سمندر پار

سمندر پار کے رہنے والے!
سمندر! یہ سمندر کہاں تک ہے؟
اور اِس کے پار کیا ہے؟
پار کے رہنے والے!
ہم اِس پار رہنے والے تو رہتے ہیں
تم اُس پار رہنے والے بھی کیا یُوں ہی رہتے ہو؟
یہ تو دُنیا ہے
اے اِس دُنیا سے دُور!
کیا وہ بھی دُنیا ہے کوئی جہاں تُو ہے؟
سمندر پار کے رہنے والے! سُن
سات سمندر پار تُو وہاں گیا جسے ولایت کہتے ہیں،
پھر اُس سے پرے پھر اُن ساتوں کے بھی پار
تنہا تُو کہاں گیا؟ اے میرے سمندر پار کے موتی! تو کہاں گیا؟
کہاں گیا اور کیوں اور کس لیئے گیا؟ اور کیا تُو ہے؟
اچھا! جا، تو اچھا گیا، تو اُس کے لئے گیا جو اچھا ہے!
تو گیا، چلا گیا، جا، چلا جا!
لیکن ایک شام، جھُٹپٹا ہوتے
اُس شام جیسی جب کہ تُو چل دیا،
اِن طوفانی ہواؤں کے اندر پکار
"ہاں میں رہتا ہوں سمندر پار" !

ب

گُریز

پھر ہُوا جاتا ہے تاراج تخیّل میرا
اک نئے درد کا احساس ہے پہلو کے قریب
کیا فقط موت کی آغوش میں پاؤں گا نجات
کیا نہ ہوگا کبھی دُنیا میں مجھے چین نصیب؟

× × × × × × × × × × × ×

تیری آنکھوں میں سمائے ہوئے آنسو کی جھلک
مجھے دیوانہ بناتی ہے رُلاتی ہے مجھے
تیرے ہونٹوں کی یہ موہوم تبسّم ریزی
کوئی بھولا ہوا افسانہ سناتی ہے مجھے

× × × × × × × × × × × ×

پیار سے یوں نہ مگر دیکھ، نہ یوں دیکھ مجھے
کہیں بھولے سے نہ کہہ جاؤں کوئی پیار کی بات
نہ کہیں لب پہ مرے حرفِ وفا آجائے
اور تو سمجھے کہ دنیا میں ہے اُلفت کو ثبات

× × × × × × × × × × × ×

میں نے دیکھے ہیں محبت کی تپش سے خالی
وہی سینے جو بنے شمعِ محبت کا لگن...
میں نے دیکھے ہیں اُسی جا پہ فقط راکھ کے ڈھیر
عشق کی آگ جہاں رہتی تھی ہر دم روشن

× × × × × × × × × × × ×

نہ کبھی ملتی تھی فرصت جسے طوفانوں سے
حکمراں اب ہے اُسی بحر پہ خاموش فضا
آندھیاں آتی تھیں جس دشت میں باراں لیکر
اب وہاں باقی ہے سوکھے ہوئے پتوں کی صدا

× × × × × × × × × × × ×

نظر آتا تھا کوئی پیکرِ الفت مجھ کو
اعتبار اپنی نگاہوں پہ کیا تھا میں نے
یوں بہا جاتا تھا جذبات کی رَو میں جیسے
غایتِ عشق کو پہچان لیا تھا میں نے

× × × × × × × × × × × × ×

نہیں، معلوم نہیں مجھ کو محبت کیا ہے۔
حسن بہکاتا تھا کیوں مجھ کو فسوں بن بن کر
کیا خطا کی تھی نگاہوں نے کہ آخر ٹپکی
میری آنکھوں سے تمنا مری خوں بن بن کر

× × × × × × × × × × × × ×

مجھے دعوےٰ تھا وفا کیش ہے فطرت میری
پاس الفت کا ترے دل میں رہے یا نہ رہے،
میں سمجھتا تھا محبت نہیں پابندِ زوال
گو ہوس خام ہو فانی ہو فنا ہو جائے۔

× × × × × × × × × × × × ×

وہ تمنائیں، وہ امیدیں، وہ پاکیزہ خلوص
جو پہنچتے تھے فرشتوں کی عبادت کے قریں
رفتہ رفتہ ہوئے افسانۂ ماضی — شاید
استواری کسی انسان کے مقدر میں نہیں

× × × × × × × × × × × × ×

ہوس و عشق میں اب فرق نہیں میرے لئے
صرف کر مجھ پہ نہ معصوم نگاہیں اپنی
ایک آوارہ و ناکارہ سے الفت کیسی؟
اپنے سینے میں دبی رہنے دے آہیں اپنی

× × × × × × × × × × × × ×

پھر نہ یوں دیکھ — نہیں — مجھ کو گنہگار نہ کر
منفعل رہنے دے بیتے ہوئے لمحوں پہ مجھے
بیچ کر صبر و سکوں ٹھوکریں کھانے کا خیال
گر تجھے ہو — کسی پتھر سے محبت کر لے

× × × × × × × × × × × × ×

مسعود پرویز

پنجابی ملازم

افرادِ تمثیل

میاں فتح خاں .... ایک پنجابی رئیس، محمد علی .... اُن کا نجی ملازم
نواب افتخار الدولہ .... لکھنؤ کے ایک نوّاب، کلّو .... نوّاب صاحب کا نوکر
وقت .... زمانۂ حال

پہلا منظر

مقام - لکھنؤ، نوّاب صاحب کی حویلی

میاں صاحب نوّاب صاحب کے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں، لمبے سفر نے ان کو تھکا کر چور کر دیا ہے اور وہ ایسی لمبی تان کر سو رہے ہیں کہ اٹھنے کا نام تک نہیں لیتے، نواب صاحب دیوان خانے میں کھانے پر اُن کا انتظار فرما رہے ہیں بھوک سے تنگ آ کر لکھنوی وضعداری سے چند لمحات کے لئے آخر چُھٹی لیتے ہیں، کلّو کو ہدایت ہوتی ہے کہ میاں صاحب کو باادب طریق سے بیدار کر کے کہہ دے کہ وہ ان کا انتظار کر رہے ہیں،

کلّو مہمان کمرہ میں نظر آتا ہے، گھڑی پر شام کے سات بجنے میں تین منٹ باقی ہیں۔ کلّو پورے سات پر الارم لگا کر آہستگی سے باہر آجاتا ہے، اور دروازہ کے پاس کھڑا الارم کے بجنے کا منتظر رہتا ہے، الارم بجتا ہے۔

میاں صاحب (کروٹ لیتے ہوئے اور آنکھیں کھولے بغیر نیچی آواز میں) اس نالائق کو آج ہی بجنا تھا،

کلّو (میاں صاحب کو بیدار ہوتے دیکھ کر لیکن جیسے اُس نے میاں صاحب کی آواز نہیں سُنی) اف سات بج گئے، وقت بھی کتنی جلدی گزرتا ہے،

میاں صاحب سات بج گئے؟

کلّو جی حضور۔

میاں صاحب: "اچھا! (وقفہ) میرا تولیہ صابن لاؤ"

کلّو باہر جاتا ہے، میاں صاحب گھڑی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچتے ہیں کہ نواب صاحب بھی کیا کہیں گے کہ میاں صاحب گھوڑے بیچ کر سوئے تھے یا مُردوں سے شرط بد کر۔ کلّو تولیہ کنگھی پانی کا جگ، صابون وغیرہ لے کر حاضر ہوتا ہے، میاں صاحب ہاتھ منہ دھوتے ہیں۔

میاں صاحب - نوّاب صاحب کہاں ہیں؟

کلّو - حضور دیوان خانے میں آپ کا انتظار فرما رہے ہیں۔ کوئی گھنٹے بھر سے۔

میاں صاحب: "اف انہیں کتنی کوفت ہوئی ہوگی"! (تولیہ واپس دیتے ہوئے) محمد علی کہاں ہے؟

کلّو: "میرے کمرے میں سرکار"

میاں صاحب: "اچھا! اسے وہاں بلا لانا"

میاں صاحب دیوان خانے کا رخ کرتے ہیں، کلّو باتمیز نوکروں کی طرح پیچھے پیچھے ہو لیتا ہے، میاں صاحب کو آتے دیکھ کر نوّاب صاحب استقبال کے لئے اُٹھتے ہیں، کلّو محمد علی کو بلانے کے لئے چلا جاتا ہے،

نوّاب صاحب، میاں صاحب۔ نیند میں کوئی حارج تو نہیں ہوا؟ بچے بار بار روکنے کے باوجود گھر میں آج کچھ زیادہ ہی شور مچاتے رہے،

میاں صاحب - جی نہیں۔ ایسی نیند تو کبھی غریب خانے پر بھی میسر نہیں ہوئی۔"

کلّو اور محمد علی حاضر ہوتے ہیں۔ کلّو کو نوّاب صاحب کھانا لانے کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ محمد علی تھوڑی دیر کھڑا رہنے کے بعد جوتوں کے پاس دہلیز پر بیٹھ جاتا ہے، کلّو کھانا لاتا ہے، اور میزبان ہاتھ دھوکر دسترخوان پر بیٹھ جاتے ہیں۔

نوّاب صاحب - واللہ آپ تو بہت تکلف کرتے ہیں۔ کھائیے نا۔ شیرمال تو دیکھئے، یہ شاہی ٹکڑا تو یہاں کی خاص چیز ہے،

میاں صاحب - (لقمہ لیتے ہوئے) بڑے مزے کی چیز ہے یہ تو۔

نوّاب صاحب: "یہ بریانی تو بیگم نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہے"

میاں صاحب: "بریانی تو میرا من بھاتا کھاجا ہے، بے اختیار بیگم صاحبہ کی محنت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے"

نوّاب صاحب: "اور یہ کوفتے دیکھئے نا۔ لیکن میں تو چنوں کا حلوا زیادہ رغبت سے کھاتا ہوں"

میاں صاحب (ایک چمچہ لیتے ہوئے) چنے کا حلوا میں نے تو آج ہی چکھا ہے۔ آپ کے دسترخوان پر ہر شے لذیذ ہے کوئی کیا کیا کھائے۔

محمد علی بدستور دہلیز پر بیٹھا جمائیاں لے رہا ہے۔ پاس ہی کلّو مؤدب کھڑا ہے۔ مہمان اور میزبان کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں، کلّو برتن طشت میں لگا کر واپس لے جاتا ہے، اور محمد علی اُسے قریب سے جاتے ہوئے دیکھ کر گہرا سانس لیتا ہے،

کلّو۔ حاضر ہُوا سرکار۔ (داخل ہوتے ہوئے) حکم سرکار!

نوّاب صاحب "چھیدو کی دُکان سے پھل لاؤ، انگور چمن کے لینا، پشاوری نہ لینا۔"

"بہت خوب حضور" (کلّو جاتا ہے)

نوّاب صاحب۔ (میاں صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے) کلّو بڑا چست نوکر ہے، دیکھئے نا وہ گیا، ....گلی کے نکڑ پر........ ننھے میاں کی حویلی کے سامنے........ وہ پھل والے کی دُکان پر پہنچا......... چھیدو نے انگور تولے........ وہ کلّو چلا........ ننھے میاں کی حویلی کے سامنے........ گلی کے نکڑ پر........ وہ آیا........ (با آواز بلند) کلّو!

کلّو۔ جی حضور!

نوّاب صاحب "پھل لایا"؟

کلّو۔ "جی حضور"۔ کلّو پلیٹ آگے بڑھاتا ہے۔ میاں صاحب کلّو کی مُستعدی پر حیران ہیں۔

(پردہ)

دوسرا منظر

ایک سال بعد، لاہور میں بیگم روڈ پر میاں صاحب کی کوٹھی،

میاں صاحب ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی گھنٹی کا بٹن دباتے ہیں، کچھ وقفے کے بعد محمد علی کمرے میں داخل ہوتا ہے،

میاں صاحب "محمد علی"!

محمد علی (سست آواز میں) "جی"

میاں صاحب "دیکھو، لکھنؤ سے نوّاب صاحب آرہے ہیں، چار پانچ دن یہاں قیام کریں گے۔ انہیں مسلم لیگ کے جلسے میں شرکت کرنا ہے، خدمت میں کمربستہ رہنا ہوگا۔ دیکھو بیوقوف مت"۔

محمد علی "جی۔ بہت اچھا"

میاں صاحب "ڈرائیور سے کہو کار نکالے، ہم اسٹیشن پر جائیں گے، نوّاب صاحب کو لینے"

محمد علی "جی اچھا"

محمد علی مہمان کمرے کی صفائی میں مشغول ہے، نوّاب صاحب میاں صاحب کے ہمراہ داخل ہوتے ہیں۔ کلّو اسباب سے لدا پھندا پیچھے ہے، محمد علی نوّاب صاحب کو سلام کرکے اپنے کام کو جاری رکھتا ہے، میاں صاحب کے ماتھے پر شکن دکھائی دیتی ہے، غصّے کو دباتے ہوئے وہ محمد علی کو نوّاب صاحب کے لئے پانی وغیرہ لانے کو کہتے ہیں اور نوّاب صاحب سے ڈرائنگ روم میں آنے کو کہہ کر خود اُسی کمرے میں جا بیٹھتے ہیں، چند منٹ بعد نوّاب صاحب بھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں،

میاں صاحب (اٹھتے ہوئے) آئیے یہاں تشریف رکھئے +

نواب صاحب (بیٹھتے ہوئے) آپ کی نوازش۔

میاں صاحب "سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی"

نواب صاحب "نہیں تو۔ راستہ خوب مزے سے کٹا۔ ڈبے میں کئی ہندو تھے، سیاسیات پر بحث ہوتی رہی۔ بڑا مزہ رہا۔ بھئی بہت لطف اٹھایا"

میاں صاحب "آپ کو تو سیاسیات سے گہری دلچسپی ہے۔ نواب صاحب یہ مسلم لیگ چاہتی کیا ہے؟"

نواب صاحب۔ اِدھر اُدھر (جھانک کر) مسلم لیگ چاہتی تو بہت کچھ ہے۔ لیکن..........

میاں صاحب "یعنی"

نواب صاحب "ہندوستان کے لئے آزادی، بے اے...... (سر کھجلاتے ہوئے) مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ اور۔ اور

(محمد علی منبر پر کھانا چینتا ہے)

......" اور مزدور کے لئے روٹی"

میاں صاحب "مزدور کے لئے روٹی"

نواب صاحب "ہاں ہاں مزدور کے لئے روٹی"

میاں صاحب "مسلم لیگ کیا مزدوروں کی جماعت ہے؟ میں تو یہی سمجھے رہا ہوں کہ لیگ مزدوروں مزدور کے جھگڑے سے پاک ہے"

نواب صاحب "آپ ٹھیک سمجھے۔ لیکن مزدور کو ساتھ ملائے بغیر کام نہیں چلتا۔ اسمبلی کے لئے ووٹ چاہئیں۔ ووٹ۔ اور ووٹ مزدور کے پاس کثرت سے ہیں، اُسے روٹی چاہئے ہمیں ووٹ"

میاں صاحب "لیکن اگر مزدور ووٹ کو خود کام میں لانا شروع کر دے تو"

نواب صاحب "بات تو بری ہے۔ لیکن ہمارے پاس بھی اس کا علاج ہے"

میاں صاحب "وہ کیا"

نواب صاحب "ہم اُسے اپنی زمین سے باہر نکال پھینکیں گے (دونوں قہقہہ لگاتے ہیں) بچہ کو فاقوں سے مار کر بڈھا کر دیں گے۔ ٹھیک ہے نا" (دونوں ہنستے ہیں)

میاں صاحب "مجھے ایک بات کھٹکتی ہے، کانگرس کہتی ہے کہ وہ مزدوروں کی جماعت ہے، اگر کانگرس کی حکومت قائم ہو جائے تو پھر"

نواب صاحب "گویا آپ کے نزدیک سردار پٹیل، راجندر بابو، سیٹھ جمنالال بجاج سارے کے سارے مزدور ہیں"

میاں صاحب "کانگرس میں سوشلسٹ بھی تو شامل ہیں"

نواب صاحب "لیکن [illegible] کا وجود آپ کے [illegible] سے [illegible] ہے، آپ کو معلوم نہیں گاندھی جی نے خود حال ہی میں فرمایا

ہے کہ مزدور کا بہترین محافظ سرمایہ دار ہے"

میاں صاحب "اچھا! بات تو معقول کہی ہے (کچھ وقفہ کے بعد بلند آواز سے) محمد علی"!

محمد علی "جی"

میاں صاحب "دسترخوان بڑھادو"

محمد علی ہاتھ دھلاکر برتن اٹھالے جاتا ہے

میاں صاحب "نواب صاحب محمد علی آپ کی خدمت میں حاضر رہے گا۔ کافی ہوشیار آدمی ہے"

نواب صاحب ہاں۔ سمجھدار معلوم ہوتا ہے

(گھنٹی بجتی ہے اور محمد علی داخل ہوتا ہے)

میاں صاحب محمد علی۔ رمضان سے پان لاؤ۔ کہنا نواب صاحب لکھنؤ سے آئے ہیں۔ خستہ ہوں (محمد علی کو جاتے دیکھ کر) بہت جلد آنا۔ (نواب صاحب سے مخاطب ہوکر) محمد علی دو سال پہلے بالکل اجڈ تھا، اب کچھ سلیقہ مند ہوگیا ہے کام میں ہوشیاری خوب دکھاتا ہے، دیکھئے ناپان لینے گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ تانگوں کے اڈے کے پاس پہنچا۔۔۔۔۔۔۔۔ لڑکوں کے سکول کے سامنے ۔۔۔۔۔۔۔۔ رمضان کی دکان پر۔۔۔۔۔۔۔۔ رمضان نے گلوریاں باندھیں۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد علی واپس دوڑا۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ اڈے پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کوٹھی کے احاطے میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ آیا۔۔۔۔۔ (بہ آواز بلند) محمد علی!

محمد علی "جی" (میاں صاحب کی باچھیں کھل جاتی ہیں)

میاں صاحب "پان لائے ہو"

محمد علی "جی ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ ابھی تک تو مجھے جوتی کا دوسرا پیر بھی نہیں ملا"

میاں صاحب کھسیانے ہوجاتے ہیں اور نواب صاحب قدرے مسکرا دیتے ہیں۔

پردہ

ایم۔ آئی ملک ایم ایس سی
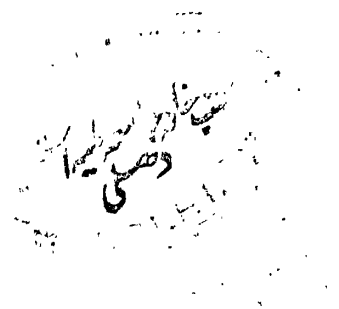
اِے زندگی

برگشتہ منزل کی طرح اندوہگیں دل کی طرح
غم کی اندھیری رات میں تو جا رہی ہے کس طرف
اے زندگی! اے زندگی!

شیدا ہو تو انوار کی کر جستجو انوار کی
اس عالمِ ظلمات میں کب تک یونہی بھٹکے گی تو
اِے زندگی! اے زندگی!

پھر خرمنِ آفاق سے تغئیر کے شعلے اُٹھے
نظمِ کہن برہم ہوا باغی ہیں اجزائے جہاں
اے زندگی! اے زندگی!

چل گلشنِ ہستی میں چل اِس وادیٔ غم سے نکل
ہر سمت اک ہنگامہ ہے تو بھی تو ہو آتش نوا
اِے زندگی! اے زندگی!

تاجور سامری ٹانڈوی

محفلِ ادب

غالبؔ کی دلّی

(از جناب پرنسپل مشتاق احمد صاحب دہلوی)

غالبؔ نے دلّی کے تین زمانے دیکھے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ دلّی کا سہاگ تھا۔ اور اس کا تاجدار خاندان تیموریہ کا آخری چراغ ناز و نعم میں پلی ہوئی دلّی کی رعایا کو آغوشِ پدری میں لئے تمام آفات دہر سے بچائے تختِ خلافت پر جلوہ افروز تھا۔ شہر مالامال اور اہل شہر خوشحال تھے۔ دن عید تھا اور رات شب برات تھی۔ ہر تہوار خوشی کا ایک بہانہ ہوتا تھا۔ شب و روز میلے رہتے تھے۔ بیاہ شادی، رسم و رسوم کی دھوم دھام، دولت و حشمت کے اظہار کا اور روپیہ خرچ کرنیکا ذریعہ تھا۔ علم و ہنر کی قدر تھی۔ شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ فن سپہ گری کا زور تھا۔ بزرگانِ دین کی دلوں میں عظمت تھی۔ خدا کا خوف تھا اور مذہب کی پابندی۔ خود حضرت ظلِّ سبحانی صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور زبدۃ الواصلین قدوۃ السالکین حضرت شاہ غلام نصیرالدین عرف میاں کالے صاحب کے مرید تھے۔ اور بار ہا حضور پُرنور قطب الاقطاب کے مزار کی زیارت کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ غرض کہ اس زمانے کی دلّی میں امن و سکون اس درجہ میسر تھا کہ اس کا ردِ عمل اِس ہنگامہ جہاں سوز میں رونما ہوا جس کو آنریبل جان کمپنی نے غدر کے نام سے مشہور کیا ہے۔ یہ وہ دوسرا زمانہ تھا جو غالبؔ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جب دلّی کا سہاگ لٹا اور بیوہ دشمن کی آتش غیظ و غضب کی چتا پر بیٹھ کر ستی ہوگئی اور ایک راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ اور دلّی والے پروانہ وار اپنے تاجدار پر نثار ہوگئے اور دادِ مردانگی دے کر ہمیشہ کے لئے گنج شہیداں میں جا سوئے۔ غالبؔ نے دلّی کا تیسرا دور وہ دیکھا جب مسلمانوں کی بادشاہت کا خاتمہ ہو کر ہندوستان پر مشرقی حکومت کی جگہ مغربی حکومت کا تسلط ہوا اور مشرقی تہذیب و تمدن کی تخریب کا بیج بو دیا گیا۔

جب تک بہادر شاہ کی بادشاہت رہی دلّی اِس تہذیب و تمدن اور علم و کمال کی حامل رہی جس کو مغلوں ترکوں ایرانیوں اور ہندیوں کے باہمی میل جول اور محبت و آشتی کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ دلّی کا شہر نہ صرف دار الحکومت ہونے کی وجہ سے اور علماء کی کثرت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں کیا بلکہ کسی زمانہ میں تمام دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ بہادر شاہ کے زمانہ میں بھی چاندنی چوک کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ بازار کے بیچوں بیچ ایک نہر رواں تھی اور جس جگہ اب گھنٹہ گھر ہے یہاں ایک حوض تھا۔ اِس حوض کے سامنے جہاں اب کپڑے والوں کی دکانیں اور نئی سڑک ہے ایک بہت بڑی سرائے تھی۔ اسی طرح قلعہ کے سامنے جہاں اب گھاس کے میدان اور پریڈ گراونڈ ہیں یہاں تمام آبادی اور تمام امراء و وزراء اور قلعہ کے متوسلین کے یہاں محلات حویلیاں اور مکان تھے اور اسی جگہ خانم کا بازار۔ خاص بازار اور اُردو بازار تھے۔ اِن میں سے خانم کا بازار دلّی کے سب بازاروں سے زیادہ رونق کا بازار تھا۔ خاص بازار فیض بازار اور قلعہ کے درمیان تھا اور اُردو بازار قلعہ اور خونی دروازے کے درمیان تھا جہاں [illegible]

پہلے ایک پتلی سی نہر تھی اسی طرح چاوڑی بازار میں سے گزر کر قاضی کے حوض تک اور وہاں سے لال کنوئیں سے ہوتی ہوئی فتح پوری تک
ہر گشت کرتی تھی مغل بادشاہوں نے ہندوستان کے گرم شہروں کی تمازت کو دور کرنے کے لئے نہ صرف اپنے محلات اور قلعے میں
شہر کے بازاروں اور باغوں میں بھی نہروں کا انتظام کیا تھا اور جا بجا کثرت سے باغات لگائے تھے دلی کے تریپولیہ دروازے تک اور
ں کے باہر کوسوں تک باغ ہی باغ تھے جن میں سے صرف روشن آرا باغ باقی ہے اور سب دست بُردِ زمانہ کے ہاتھوں غارت
گئے محلدار خاں کا دروازہ ابھی تک باقی ہے شورے کی کوٹھی والا باغ عمارات کی نذر ہوگیا۔ شہر میں بڑے بڑے عالیشان محل اور
یلیاں تھیں جن میں اب ایک ایک محلہ آباد ہے اور اب اس محل کے نام پہ محلّے کا نام ہے۔ جیسے رنگ محل۔ نواب وزیر کی حویلی۔
نیلی علی قلی خاں وغیرہ وغیرہ۔ ان حویلیوں میں دالان در دالان اور صحن چبوترہ ہوتا تھا۔ چبوترے پر شہ نشین اور بعض حویلیوں میں اندر کے
دالان کے پیچھے ہی شہ نشین یا غلام گردش ہوتی تھی۔ صحن میں چھوٹا سا چمن اور اس کے بیچ میں ایک مستطیل حوض ہوتا تھا جس میں
فوارے چلتے رہتے تھے۔ اب بھی بعض ساہوکاروں کے قبضے میں ایسی حویلیاں ہیں جو انہوں نے نیلام میں لیں یا قرض کے عوض
میں حاصل کیں۔

غالب کا اپنا لباس تو ان کی تصویر سے ظاہر ہوتا ہے جس کی خصوصیت اُن کی کلاہ پاپاخ ہے۔ لیکن عام طور پر
مسلمانوں کے لباس میں چوگوشیہ ٹوپی تھی جسے کلاہ تتری بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے چار پہل یا آٹھ پہل ہوتے تھے۔ اور اس
کی شکل کرک کی سی ہوتی تھی۔ اب بھی بعض خاندانوں میں اس کا رواج ہے اور بچوں کے لئے تو عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اس کے
نیچے کی گوٹ میں پتلی لیس اور گوشوں کے کنارے پر فیطون لگایا جاتا تھا۔ شوقین لوگ سلمے ستارے کے کام بھی کراتے تھے اور بادشاہ
سلامت کی ٹوپی میں موتی اور جواہرات بھی ٹکے ہوئے ہوتے تھے۔ دلی کی آبادی دو قسم کی تھی۔ قلعے والے اور شہر والے۔ قلعہ والے ٹوپی کے
پاکھوں کو کھڑا رکھتے تھے شہر والے دبا لیتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ٹوپی پنج گوشیہ کہلاتی تھی۔ چندوے پر سے یہ ٹوپی گنبد
کی شکل ہوتی تھی اور اس کے گوشے فصیل کے کناروں کی طرح کھڑے رہتے تھے ان کی ٹوپی عرق چیں کہلاتی تھی جس کے چندوے
میں چُنٹ دے کر گول گتا لگا لیا جاتا ہے۔ یہ ٹوپی بھی بعض خاندانوں میں اب تک استعمال ہوتی رہی ہے۔ عوام میں دو پلڑی اور
گول چندوے کی ٹوپی کا بہت رواج تھا اور اب تک بھی ہے دلی والے دوپلڑی کو سر پر منڈھ لیتے ہیں۔ لکھنؤ والے اُدھر رکھتے ہیں۔
گول چندوے کی ٹوپی سادی یا سوزنی کے یا فیتے کے کام کی ہوتی ہے۔ جس کا استعمال اب بھی عام ہے۔
لباس میں کرتے پاجامے کے اوپر انگرکھا استعمال ہوتا تھا۔ یہ پرانا ہندی لباس ہے۔ ہندی اونچا انگرکھا جو پیٹ
سے ذرا نیچے تک آئے پہنتے تھے۔ بعد کے لوگوں نے اسے نیچا کر کے ٹخنے یا آدھی پنڈلی تک پہنچا دیا۔ قلعے والے اس پر خفتان پہنتے
تھے جو جامے دار یا مخمل کی ہوتی تھی۔ زیادہ سردی میں حاشیے پر سمور۔ ویسے پتلی لیس لگا لیتے تھے۔ سینے کے قریب گھنڈی تکمے ہوتے
تھے جس کو عاشق معشوق یا چشمے بھی کہتے تھے۔ عام لوگ اسے نیم آستین کہتے ہیں اور گاؤں والے کُرتی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی
آستینیں کہنی سے اونچی ہوتی تھیں تاکہ وضو میں سہولیت رہے اور اس کی لمبائی کمر تک ہوتی تھی۔ اس لئے اس کا نام کُرتی پڑ گیا۔

ش لوگ سینہ کھلا رکھتے تھے اور اُسے شیروانی کہا جاتا تھا۔ چپکن یا اچکن کا رواج بعد میں ہوا۔ عمر رسیدہ اور کمزور لوگ زیادہ سردی
انگرکھے کے اوپر چوکور شالی رومال کو سموسہ کر کے سر پر اور پیٹھ پر ڈال لیتے تھے۔ اِس رومال کا نام بھی عرق چیں تھا اسی طرح
ین تچی کر کے رومال لپیٹنے کا بھی رواج تھا۔ پاجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا تھا۔ جیسے گلبدن۔ غلطہ۔ مشروع۔ موٹرا۔ اطلس یا گورنٹ پرانی
ع کے لوگ عام طور پر ایک برا یعنی ڈھیلا پاجامہ پہنتے تھے۔ شوقین لوگوں نے تنگ موری کا پاجامہ پہننا شروع کر دیا مگر ثقہ لوگ
پسند نہ کرتے تھے۔ چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں جو مرہٹوں کا لباس ہے پہنتے تھے۔ نیچی نیچی بانات کی چپکن یا اچکنیں پہنتے تھے
ین سُرخ شالی رومال لپیٹتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مور چھل ہوتے تھے۔ پاؤں میں شرفا زیادہ گھیتلی جوتی
استعمال کرتے تھے جو آج کل کے سلیپر کی طرح ہوتی تھی۔ مگر اِس کی چونچ نہیں ہوتی تھی۔ وہ ذرا اُوپر کو مُڑی ہوئی ہوتی تھی گزشتہ بیس سال
گھیتلی جوتی دلہنوں کے لئے استعمال کی جاتی تھی سلیم شاہی جوتی یعنی پتلی چونچ والی جوتی کا فیشن شروع ہو گیا تھا۔ مگر کم استعمال
تی تھی۔ ہاتھ میں بانس کی لکڑی رکھنے کا بہت فیشن تھا۔ اور کندھے پر گز بھر لٹھے کا چوکور رومال پڑا ہوتا تھا۔ اِن بانس کی لکڑیوں
کی خصوصیت یہ تھی کہ لمبی پور کا ٹھوس پتلا مگر بھاری بانس لیا جاتا تھا اسے تیل پلا کر مہندی لگا کر دھوئیں میں لٹکا دیتے تھے تاکہ رنگ
سیاہی مائل ہو جائے ہر گانٹھ پر تار باندھتے تھے۔ اگر بانس کھوکھلا ہو تو اُسے سیسہ پلاتے تھے۔ یہ سب محنت اس لئے کی جاتی تھی
جس طرح آج کل لوگ ٹینس کرکٹ کھیلتے ہیں اور اُن کے بلّے احتیاط سے رکھتے ہیں اسی طرح اُس زمانے میں بانک۔ بنوٹ وغیرہ
لکڑی کے کرتب کا فیشن تھا اور اسے ورزش اور اپنی حفاظت کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔

رومۃ الکبریٰ کے باشندوں کی طرح دلّی والے بھی سیر تماشے اور میلے ٹھیلے کے بہت شوقین تھے۔ زندگی کی ضروریات
بہ آسانی مہیا ہو جاتی تھیں۔ ہر چیز سستی تھی حتیٰ کہ گرانی اور قحط کے زمانہ میں جو اشیاء خوردنی کا بھاؤ تھا اُس سے معلوم ہوتا
ہے کہ وہ آج کل سستے سمے میں نہیں ہے۔ چنانچہ گرانی کی شکایت کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں "غلہ گراں۔ موت ارزاں ہے
ش کی دال آٹھ سیر۔ باجرہ بارہ سیر۔ گیہوں تیرہ سیر۔ چنے سولہ سیر۔ گھی ڈیڑھ سیر" اس وقت ہر چیز اُس سے زیادہ گراں ہے اور
ہم گرانی کو محسوس نہیں کرتے۔ کیونکہ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ اِس زمانے میں ہر چیز سستی ہونے کی وجہ سے اور دولت
کی افراط کے باعث سوائے دل بہلانے کے لوگوں کو اور کوئی کام نہ تھا۔ چنانچہ مہینے میں تیس دن اور تیس میلے ہوتے تھے۔
پھول والوں کی سیر۔ تیراکی کا میلہ۔ درگاہوں پر عرس۔ مدار کی چھڑیوں کا میلہ۔ قدم شریف کا میلہ۔ بسنت وغیرہ وغیرہ۔ اَن گنت
میلے تھے۔ جو موسم کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اس کے علاوہ قلعہ۔ چاندنی چوک۔ جامع مسجد اور جمنا کے پُل پر ہر روز اس قدر مجمع
رہتا تھا۔ کہ میلہ ہی لگا رہتا تھا۔ غرضکہ جس خوشحالی اور فارغ البالی سے بہادر شاہ کی بادشاہت میں لوگ رہتے تھے آج
کل کے لوگ اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے کیونکہ اس فارغ البالی کے نشان تک مٹ گئے۔ موجودہ نسل غلامی اور
مفلسی میں پیدا ہوئی۔ اُسے کیا معلوم کہ آزادی۔ خود مختاری اور خوشحالی کسے کہتے ہیں۔

غالب بادشاہ کے مصاحب تھے۔ قلعہ میں اُن کی آمد و رفت تھی۔ قلعہ کی حالت اب ایسی تو تھی نہیں جیسی شاہجہاں

زمانہ میں تھی۔ نہ تختِ طاؤس تھا نہ ہیرے جواہرات کی وہ جگمگاہٹ تختِ طاؤس نادر کی نذر ہوا تو دیوانِ خاص کے جواہرات اور دیوانِ عام کی چھت کا سونا غلام قادر روہیلے اور اسی قسم کے لٹیروں نے لوٹ لیا۔ بادشاہ کمپنی بہادر کا پنشن خوار تھا۔ اخراجاتِ شاہانہ تھے پنشن سے گزارہ نہ ہوتا تھا اس لئے قلعہ کی عمارات کی مرمت تک نہ ہوسکتی تھی سڑکوں کی درستی کا تو کیا ذکر ہے۔ اِس لئے بارش میں جابجا کیچڑ ہو جاتی تھی۔ شہر کے مقابلہ میں قلعے کی حالت اچھی نہ تھی مگر بادشاہ اور رعایا کے تعلقات بہت اچھے تھے جس کا اندازہ منشی کریم الدین صاحب کے بیان سے ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک مشاعرہ کرانا چاہا تو گو منشی جی ایک مطبع کے مالک اور متوسط الحال طبقے سے تعلق رکھتے تھے تاہم ان کی رسائی اِس سلسلہ میں حکیم احسن اللہ خاں صاحب کے توسط سے قلعہ تک ہوگئی اور خلاف توقع بارگاہ جہاں پناہی میں پیشی بھی ہوگئی۔ اب اِس پیشی کا حال منشی کریم الدین کی زبانی سنیئے جس سے کچھ بادشاہ کی سادہ طرزِ معاشرت کا حال معلوم ہوگا اور کچھ یہ معلوم ہوگا کہ بادشاہ کس بے تکلفی سے ایک معمولی درجے کے غیر معروف شخص سے بات چیت کر لیتے تھے۔ منشی کریم الدین لکھتے ہیں "چوبدار نے دیوانِ خاص کی سیڑھیوں کے پاس لیجا کر کھڑا کر دیا۔ حضرت جہاں پناہ اُس وقت حمام میں رونق افروز تھے .... یہ حمام کیا ہے ایک عالیشان عمارت ہے۔ جمنا کے رُخ پر جو حمام کا حصہ ہے وہ سردے ہے۔ ریتی کے رُخ خس کے پردے ڈال کر خسخانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی حوض ہیں۔ ان میں فوارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ہے ایک بہشت کا ٹکڑا ہے۔" چوبدار نے جب اندر داخل ہونے کے لئے کہا اس کے بعد کا حال سنیئے۔ چوبدار نے آواز دی "ادب سے، نگاہ روبرو۔ حضرت جہاں پناہ سلامت۔ آداب بجا لاؤ۔" میں دُہرا ہو کر سات تسلیمات بجا لایا اور نذر گزرانی نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا حضرت پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے پائنتی مرزا فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے ظلّ اللہ کو نہیں دیکھا۔ میانہ قد، بہت نحیف جسم۔ کسی قدر لمبا چہرہ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت اُبھری ہوئی۔ لمبی گردن۔ چونکہ ذرا اونچا۔ پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ۔ گہری سانولی رنگت سر منڈا ہوا چھدری ڈاڑھی۔ ٹھوڑی کلوں پر بال۔ لبیں کتری ہوئی۔ ستر برس سے اونچی عمر تھی .... سبز کمخواب کا ایک برکا پاجامہ اور سفید ڈھاکے کی ململ کا کرتہ زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی .... بادشاہ سلامت نے فرمایا "میاں تمہارا ہی نام کریم الدین ہے۔ ابھی ابھی تمہارا ہی ذکر مرزا فخرو کر رہے تھے ..... تم مشاعرہ کر تو رہے ہو مگر ہاتھیوں کی ٹکر کون سنبھالے گا .... میں اور مرزا شبّو تو آ نہیں سکتے۔ ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیج دوں گا۔ اور انشاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجوں گا .... میں نے عرض کی "پیر و مرشد تاریخ" فرمایا "۱۴ رجب مقرر کردو۔ دن بھی اچھا ہے۔ چاندنی رات بھی ہوگی اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہوسکتا ہے۔ نو دن باقی ہیں۔ موسم بھی ٹھنڈا ہو جائیگا۔ اچھا اب خدا حافظ۔" اس طرح دلی کا آخری بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ گھُل مل کر رہتا ہے۔ حفظِ مراتب کریم الدین کی طرف سے تھا مگر بہادر شاہ بالکل اسی طرح باتیں کر رہے تھے جس طرح کوئی اپنے برابر والے سے کرتا ہے۔ کسی ملک کے تہذیب و تمدن کا اندازہ اس ملک کے امراء کی زندگی سے کیا جاتا ہے جن میں بادشاہ سب سے بڑا ہوتا ہے اب ذرا دلی کے آخری بادشاہ

کے کھانے کا جسے خاصہ کہتے تھے حال سُنیئے۔ "کہاریاں، کشمیرنیں، ہینڈ کلیا۔ چھوٹے خاصے بڑے خاصے کے خوان سر پر لئے ایک قطار میں چلی آرہی ہیں۔ خاصے والیوں نے پہلے ایک سات گز لمبا، تین گز چکلا چمڑا بچھایا۔ اوپر سفید دسترخوان بچھایا۔ بیچوں بیچ میں دو گز لمبی ڈیڑھ گز چکلی چوکی لگا اس پر بھی پہلے چمڑا پھر دسترخوان بچھا خاص خوراک کے خوان مہر لگے ہوئے چوکی پر لگا خاصے کی داروغہ سامنے ہو بیٹھی۔ اس چوکی پر بادشاہ خاصہ کھائیں گے۔ باقی دسترخوان پر بیگماتیں شاہزادے شاہزادیاں کھانا کھائیں گے۔" کھانے میں فقط روٹیوں کے نام سن لیجئے "چپاتیاں۔ پھلکے۔ پراٹھے۔ روغنی روٹی۔ بری روٹی بیسنی روٹی خمیری روٹی۔ نان۔ شیرمال۔ گاؤدیدہ۔ گاؤزبان۔ کلچہ۔ باقرخانی۔ غوصی روٹی۔ بادام کی اور پستے کی روٹی چاول کی روٹی۔ گاجر کی روٹی۔ مصری کی روٹی۔ نان پنبہ یعنی بنولوں کی روٹی۔ نان گلزار۔ نان قماش۔ نان تنکی۔ نان خطائی بادام کی پستے اور چھوارے کی۔"

پلاؤں کے نام بھی سنیئے۔ یخنی پلاؤ۔ موتی پلاؤ۔ نورمحلی پلاؤ۔ نکتی پلاؤ۔ فالسائی پلاؤ۔ آبی پلاؤ۔ سنہری پلاؤ۔ روپہلی پلاؤ۔ بیضہ پلاؤ۔ اناناس پلاؤ۔ کوفتہ پلاؤ۔ بریانی۔ سارے بکرے کا پلاؤ۔ بونٹ پلاؤ۔ کشمش پلاؤ۔ نرگسی پلاؤ۔ زمردی پلاؤ۔ لال پلاؤ۔ مزعفر پلاؤ۔"

سب کھانے قرینے سے چنے گئے۔ بیچ میں سفلدان رکھدیئے اور نعمت خانہ کھڑا کر دیا گیا کہ مکھیاں دسترخوان پر نہ آئیں۔ مشک زعفران کیوڑے کی خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں۔ چاندی کے ورقوں سے دسترخوان جگمگا رہا ہے۔ چلمچی آفتابہ بیسن دانی چنبیلی کی کھلی صندل کی ٹکیوں کی ڈبیاں ایک طرف زیرانداز پر لگی۔ رومال زانو پوش۔ دست پوش۔ بینی پاک لئے رومال والیاں کھڑی ہیں۔ بادشاہ اپنی تپک پر چوکی کے سامنے آن بیٹھے۔ دائیں طرف ملکۂ دوراں اور بیگمائیں۔ بائیں طرف شہزادے شہزادیاں بیٹھیں۔ رومال خانے والیوں نے زانوپوش گھٹنوں پر ڈالے۔ دست پاک آگے رکھدیئے۔ بادشاہ نے خاصہ شروع کیا جس کو بادشاہ اپنے ہاتھ سے اُلُش مرحمت فرماتے ہیں وہ سرفراز کھڑے ہو کر آداب بجا لاتا ہے بیسن کھلی اور صندل کی ٹکیوں سے ہاتھ دھوئے۔ بھنڈا نوش کیا۔ گھنٹہ بھر بعد آب حیات مانگا۔ آبدار خانے کی داروغہ نے گنگا کا پانی جو صراحیوں میں بھرا برف میں لگا ہوا ہے جھٹ توڑ کی صراحی نکالی مہر لگا گیلی صافی لپیٹ خوجے کے حوالے کیا۔ اس نے بادشاہ کے سامنے مہر توڑ چاندی کے ظروف میں نکال بادشاہ کو پلایا۔ پیتے وقت حاضرین ادب سے کھڑے ہوگئے۔ جب پی چکے تو سب نے مزید حیات کہا۔ مجرا کیا اور رخصت ہوئے۔

مندرجہ بالا اقتباس سے بادشاہ کی خانگی زندگی کے ایک حصّے کی ذرا سی جھلک نظر آتی ہے جس سے اس زمانہ کی تمدّنی حالت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے کیسے انواع و اقسام کے کھانے تیار ہوتے تھے۔ دسترخوان پر کس طرح ہر قسم کی صفائی کا انتظام تھا اور کیا ادب و آداب تھے۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ بادشاہ کی نقل امیر امراء کرتے ہیں اور ان کی نقل حسب حیثیت نیچے کے طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ کمی کے ساتھ مگر اسی قسم کے کھانے امراء کے دسترخوان پر بھی ہوتے ہوں گے اور غالب نے جنکا تعلق سرکار لوہارو سے تھا اور جو شاہی مصاحب بھی تھے اِس تمدّن و معاشرت کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔ اور اس کے غارت ہونے پر وہ جب تک جیئے مرثیہ خوانی کرتے رہے۔

"ادیب"

مطبوعات

اُردو انسائیکلوپیڈیا۔ مرتبہ ادارہ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن۔ اس کا ایک ابتدائی نمونہ ہمارے پاس اظہارِ رائے کے لئے موصول
ہوا ہے جس میں صرف الف کے چند مختلف الفاظ مثلاً آزاد، آتش نشاں، الفل مینار، ایبا، اضافیت، امرؤالقیس، اپنشد وغیرہ درج ہیں۔
تعارف میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ انسائیکلوپیڈیا پانچ پانچ سو صفحات کی بارہ جلدوں میں مکمل ہوگی اور پہلی جلد اسی سال تیار ہو جائیگی
نمونے کے مضامین کی فہرست میں مضمون نگاروں کے نام بھی درج ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے پروفیسر اس کام خاص طور پر دلچسپی
لے رہے ہیں اور یہ امر بہت تسلی بخش ہے
ایک عرصے سے اُردو انسائیکلوپیڈیا کے مرتب ہونے کی جابجا تجویزیں ہوتی رہی ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ہم ادارۂ
ادبیاتِ اُردو کی اس کوشش کو اُردو ادب کے لئے غایت درجہ مفید سمجھتے ہیں اور اُس کے کارکنوں کو اس ابتدائی نمونے پر دلی مبارکباد
دیتے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ کام جلد سرانجام پائے گا اور اُردو ادب کی یہ کمی جلد پوری ہو جائے گی۔
یہ باتصویر گنجینہ علاوہ مفید ہونے کے دلچسپ اور دیدہ زیب بھی ہے۔
بعض انگریزی الفاظ کو صرف انگریزی حروف میں لکھا گیا ہے بہتر ہو کہ ان کے ساتھ ساتھ اُردو حروف میں بھی یہ الفاظ درج کر دیئے جائیں قیمت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا

ہمارے مربی۔ از پروفیسر پرتیم سنگھ صاحب ایم۔اے۔ حجم ۱۳۶ صفحات قیمت ۱۲/ پتہ :۔ پروفیسر پرتیم سنگھ ۳۹ ٹمپل روڈ
لاہور۔ یہ کتاب پروفیسر صاحب کی تصنیف مذاہب عالم کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں مشہور پیغمبروں اور مذہبی رہنماؤں کی زندگی
اور ان کی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور وحدتِ ادیان کے اصول کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اُمید ہے کہ اسکا مطالعہ مفید ثابت ہو

مورخ کے افسانے۔ جناب سید محمود مورخ صاحب اُردو کے ایک مشاق ادیب ہیں حال میں انہوں نے افسانوں کی طرف توجہ کی ہے
اس سے قبل ایک مجموعہ شہر خموشاں کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے اب دوسرا مجموعہ "مورخ کے افسانے" شائع ہوا ہے ہمیں امید ہے
کہ اس مجموعے کی کماحقہ قدر ہوئی۔ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت عہ/ پتہ :۔ گلفروشز پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

ہندو مسلم اتحاد۔ مصنفہ سیتہ بھگت۔ حجم ۳۲ صفحے۔ قیمت ۲/ پتہ ۔ سیتہ آشرم وردھا (سی پی)

ادیب۔ یہ نیا رسالہ سید محمد ارتضی صاحب واحدی اور فصیح الدین صاحب ایم۔اے کی ادارت میں دہلی سے جاری ہوا ہے مضامین نظم و نثر کا معیار
وسائل سے خاصا بلند ہے ظاہری دلکشی کے اعتبار سے بھی قابل قدر ہے۔ بڑی تقطیع حجم ۶۲ صفحات تصویریں بھی دیجاتی ہیں۔ چندہ سالانہ چھ روپے۔ دفتر ادیب

ہندوستانی ادب۔ یہ رسالہ غلام محمد خاں صاحب ایم۔اے عثمانیہ نے حیدرآباد سے جاری کیا ہے۔ افسانے نظمیں اور تنقیدی مضامین
[illegible] حجم ۷۰ صفحات چندہ سالانہ للعہ پتہ دفتر "ہندوستانی ادب" حیدرآباد۔ دکن۔

ایک ۱۰۰ سو

برس کی عمر کا راز

جو ۱۸۲۹ء سے ۱۹۲۹ء تک پہنچ کر

کارخانہ

اصغر علی تاجر عطر لکھنؤ

نے

حاصل کیا

مال کی عمدگی، دیانتداری اور خوش معاملگی

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس جمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں [illegible] روڈ لاہور سے شائع کیا۔

R. L. No. 1363.

قواعد

۱۔ "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے ۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے ۔

۵۔ خلاف تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے ۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا ۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے ۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے ۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے

منیجر رسالہ ہمایوں
۲۳ - لارنس روڈ - لاہور

The Title Page and Pictures Printed at Half-Tone Press,
Ram Nagar, Dev Samaj Road, Lahore.

یادگار آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ اگست ۱۹۴۱ء

جلد (۴۰) — نمبر (۲)

تصویر:- ننھا درزی

تصویر:- اِس مہینے کی تصویر کے لئے ہم جناب مسعود احمد خاں صاحب کے شکرگزار ہیں۔

تصحیح - جولائی کے "ہمایوں" میں صفحہ ۴۷۴ کے بعد صفحات کے نمبر غلط درج ہوگئے تھے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔ گزشتہ پرچے کے آخری صفحہ کا نمبر ۴۸۹ ہونا چاہئے تھا۔

جہاں نما

ایک امریکائی اخبار نویس کا جواب

امریکا کے صحیفے "کیتھالک ورلڈ" نے ایک نامہ نگار کا خط شائع کیا ہے جس میں نامہ نگارِ مذکور نے موجودہ جنگِ عظیم سے پیدا ہونے والے بہت سے اہم مسائل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس سلسلے میں متعدد سوالات بھی کئے ہیں۔ ہندوستان کے متعلق وہ لکھتا ہے:-

"میں آخر میں ہندوستان اور بقول آپ کے اُس کے "اڑتیس کروڑ غلاموں" کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ نے "غلاموں" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس پر قدرۃً سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان میں واقعی اب تک ایسی منڈیاں موجود ہیں جیسی کبھی ہمارے ہاں چارلسٹن وغیرہ مقامات میں غلاموں کی خرید و فروخت کے لئے ہوا کرتی تھیں۔ میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ عہدِ گذشتہ میں انگلستان نے ہندوستان میں نہایت عظیم اور احمقانہ غلطیاں کی ہیں۔ لیکن موجودہ واقعات کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ہمیں عہدِ حاضر ہی کے ہندوستان پر نظر ڈالنی چاہئے۔ گزشتہ موسمِ گرما میں گاندھی کے زیرِ قیادت ہندوستانی کانگریس نے موجودہ جنگ میں حصہ لینے کے معاوضے میں مکمل آزادی یا کم از کم درجۂ مستعمرات حاصل کرنے کے لئے برطانیہ سے اتحاد کی پینگیں بڑھائیں لیکن اِن سلسلہ جنبانیوں کے دوران میں گاندھی صاحب دفعۃً امن پسند بن کر کامل عدمِ تشدد کی حکمتِ عملی کے پابند بن گئے اور گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس طرزِ عمل پر انگریز ہی نہیں خود گاندھی جی کے چیلے بھی حیران رہ گئے اور بہت سے لوگ اب تک حیران ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا نتیجۃً جو تعطل پیدا ہو گیا ہے اس کے ذمہ دار انگریز ہیں؟"

"کیتھالک ورلڈ" کے ایڈیٹر نے اس پر جو رائے زنی کی ہے اس کے اہم حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ نامہ نگار کے فقرے واوین میں دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ایڈیٹر کا جوابی تبصرہ ہے:-

"آپ (ایڈیٹر) کا خیال ہے کہ انگلستان کا بڑا مقصد اپنی دُور دُور تک پھیلی ہوئی سلطنت کا تحفظ ہے"

ہاں بڑا مقصد لیکن تنہا مقصد نہیں۔

"تسمانیہ پر مسلسل قبضے کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک اتفاقی ضرورت کا معاملہ ہے"

فرض کیجیے ہم تسمانیہ نہیں کہتے بلکہ ہندوستان، آسٹریلیا، کینیڈا یا سنگاپور یا یوگنڈا یا جنوبی افریقہ کہتے ہیں۔

"انگلستان کو اِس تصور سے بھی گھن آتی ہے کہ اس کی سلطنت کے کسی حصے کا ایک انچ بھی نازیوں کے غیر ذمہ دار ہاتھوں میں چلا جائے۔"

ہاں بے شک لیکن اتحواہ نازیوں کے ہوں یا کسی اور کے ۔۔۔ ذمہ دار ہوں یا غیر ذمہ دار، بات یکساں ہے۔

• ہندوستان کے سلطنت سے علیحدہ ہو جانے کا مسئلہ چھڑنے پر بہت کم لوگ آپے سے باہر ہوتے ہیں یا اپنی متانت کھو بیٹھتے ہیں"۔

متانت؟ نہیں صرف متانت ہی نہیں، اس پر لوگ جانیں کھو چکے ہیں اور ابھی کھوئیں گے۔

• انگلستان کا ہر مرد اور عورت صرف ایک فکر میں مبتلا ہے۔ فکر کس بات کی ہے۔ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے امکان کی یا انگلستان پر حملے کی؟"

نہ تنہا پہلی بات کی نہ دوسری کی بلکہ دونوں کی۔ اگر انگلستان کو حملے سے محفوظ رکھنے کا معاہدہ اس شرط پر کیا جائے کہ اُس کی سلطنت تقسیم کر دی جائے گی یا اس کی سلطنت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی الگ کر لیا جائے گا تو انگلستان ضرور جنگ کرے گا۔ انگریزوں کو محض انگلستان کی نہیں بلکہ اپنی سلطنت کی بقا بھی مدِ نظر ہے

• انگلستان آزادیٔ تقریر آزادیٔ تحریر اور آزادیٔ ضمیر کے لئے لڑ رہا ہے"

ہاں اور بہت سی اور چیزوں کے لئے بھی جن میں بقول سٹریلک کے دنیا بھر پر معاشی تجارتی اور سیاسی تفوق قائم رکھنا بھی شامل ہے۔ اگر یہ آزادیاں • اس تفوق کی راہ میں حائل ہوں تو انگلستان ان آزادیوں کو دُور سے سلام کرے گا۔

• اگر ہم انگریز ناکام رہے تو یورپ سے عیسوی تہذیب کا نام و نشان مٹ جائے گا"

جب وحشی قبائل نے رومنوں کو شکست دی تھی اُس وقت بھی یہی کہا جاتا تھا مگر وہ وحشی آخر کیتھولک ہو گئے 'تم کیوں ڈرتے ہو؟ اے کمزور ایمان والو!'

• انگلستان سلطنت کے بغیر انگلستان نہیں رہے گا"

ہاں وہ انگلستان نہیں رہے گا جسے آج کل دنیا اس نام سے موسوم کرتی ہے۔ انگلستان اور سلطنت ہم معنی الفاظ ہیں۔

• سلطنت حاصل کرنے سے پہلے انگلستان کیا تھا؟"

ایک بیچارہ چھوٹا سا جزیرہ۔ آج کل اُس کی حالت یہ نہیں۔ ونسٹن چرچل نے ہمیں یاد دلایا ہے کہ "انگلستان کے ہر پانچ آدمیوں میں سے چار کی کفیل سلطنت ہے"۔ انگلستان سلطنت کے جسم پر ایک جونک کی طرح پل رہا ہے۔

• گزشتہ موسم گرما میں ہندوستان کی کانگریس شرکتِ جنگ کے معاوضے میں کامل آزادی یا استعماری درجہ حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہی تھی"

تو مطلب یہ ہے کہ پینتیس چالیس کروڑ باشندوں کا جائز مطالبہ اگر منظور کیا جاتا تو اپنا خون بہانے کے انعام کے طور پر، نہ اس لئے کہ یہ اُن کا جائز حق تھا۔

"گاندھی نے گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کر دیا"

کیا تعجب ہے جب چرچل صاف کہہ چکا تھا کہ ہمارا مطلق ارادہ نہیں کہ ہز مجسٹی کے تاج کا سب سے بیش قیمت ہیرا (ہندوستان) اپنے قبضہ سے نکلنے دیں" اور لارڈ برکن ہیڈ بھی کہہ چکا تھا کہ کوئی ہوشمند آدمی اُس وقت اور تاریخ کا تخمینی تعین بھی نہیں کر سکتا جب ہندوستان کو درجۂ مستعمرات حاصل ہونے کا تصور کیا جا سکے۔

"کیا موجودہ تعطل کے ذمہ دار انگریز ہیں؟"

جی ہاں!

خوش حال ہندوستان

مسٹر ایمری اور بعض دوسرے خوش فہم انگریز ہندوستان کو بہت خوش حال سمجھتے ہیں معلوم نہیں سر ابراہیم رحمت اللہ کے سر میں کیا سمائی ہے انہوں نے اس معقول خیال کی تردید شروع کر دی ہے حالانکہ اگر مفت میں خوش حالی کی سند ملتی ہو تو اُسے بہ خوشی قبول کر لینا چاہئے۔ ذیل کا بیان مسٹر ایمری سے منسوب کیا جاتا ہے:-

ہندوستان خوش حال ہے۔ مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے محاصل میں اضافہ ہو رہا ہے اس کے ساتھ ہی ہر طرف عملی طور پر مسلسل معاشرتی ترقی ہو رہی ہے۔

سر ابراہیم رحمت اللہ نے وزیر ہند کے محوّلہ بالا بیان کا معائنہ سنٹرل بورڈ آف ریوینیو کی شائع کردہ انکم ٹیکس رپورٹ کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:-

اس سرکاری رپورٹ کے مطابق بھی ہمارے ملک میں ۲۰۰۰ روپے یعنی ۱۵۰ پاؤنڈ سالانہ یا اس سے زیادہ آمدنی رکھنے والوں کی "عظیم الشان" تعداد ۲۸۵۹۴۰ ہے برطانوی ہند کے تیس کروڑ باشندوں کے مقابلے میں یہ تعداد آبادی کے ایک فیصدی کا بھی ½ واں حصہ ہے

یہ تو ہے خوش حال ہندوستان، اب جس ملک کی حالت اِس کے برعکس ہو وہ یقیناً بدحال ہے۔ چنانچہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں بدحال انگلستان میں کی آبادی ساڑھے چار کروڑ ہے، ۵۳۹ افراد ایسے تھے جن کی سالانہ آمدنی ۴۰،۰۰۰ پاؤنڈ یا اس سے زیادہ تھی۔ سر ابراہیم انگلستان کی اِس بدحالی سے خوش حال ہندوستان کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

برطانوی ہند کے تیس کروڑ باشندوں میں پانچ لاکھ روپے سالانہ یا اس سے زائد آمدنی رکھنے والے افراد کی عظیم الشان تعداد ۹ ہے۔

مسٹر ایمری کے تدبر نے تو ہندوستان کی کچھ ساکھ بنا دی تھی مگر سر ابراہیم نے بے تدبیری سے خود ہی اپنے افلاس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

چو خود کردند رازِ خویشتن فاش عراقی را چرا بدنام کردند

صحت کے لئے نیند بہت ضروری ہے۔ جو لوگ بلا ضرورت زیادہ دیر تک جاگتے رہتے ہیں وہ عموماً خرابیٔ صحت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر نیند نہ آتی
تو اس شکایات کو دفع کرنے کے متعدد طریقے ہیں۔ ایک طریقہ گہری دم کشی کا ہے۔ بستر پر لیٹ کر پہلے تمام اعضا کو پھیلا دو۔ اس کے بعد تمام اعضا او اعضا
بالکل ڈھیلا چھوڑ دو۔ اس عمل کو دو یا تین مرتبہ دہراؤ۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ قدرتی طریقے سے ایک درجن یا اس سے زیادہ گہری سانسیں لو۔ اگر تم کسی تکلیف
فکر میں مبتلا نہیں تو اس کے بعد بہت جلد نیند آجائے گی۔

اس بات کا پوری طرح اطمینان کرلینا چاہیئے کہ کمرے میں تازہ ہوا کی آمد و رفت کا انتظام اچھا ہے۔ اور تمہارا بستر آرام دہ ہے یعنی نہ زیادہ بھاری ہے نہ زیادہ
گرم اور نہ ایسا جس میں تمہیں سردی محسوس ہو۔ اگر تمہارا جسم زیادہ گرم یا زیادہ سرد ہوگا تو بھی تمہاری نیند میں خلل واقع ہوگا۔

رات کو زیادہ وقت گزر جانے پر ثقیل غذا کھانے سے بدہضمی ہو جاتی ہے اگرچہ عصبی مزاج والوں کو شام کے وقت کوئی نہ کوئی مقوی غذا ضرور درکار ہوتی
ہے۔ ضرورت سے کم کھانا بھی اتنا ہی بُرا ہے جتنا ضرورت سے زیادہ کھانا۔ سونے سے پہلے ہلکی سی سیر یا گرم غسل یا کوئی پینے کی گرم چیز خواب آور ہوتی ہے۔
عورتوں کے لئے رات کی نیند کے علاوہ دن کے وقت بھی تھوڑا سا آرام ضروری ہے۔ اگر ممکن ہو تو عورتوں کو دن کے وقت آدھ گھنٹے کے لئے
ضرور سونا چاہیئے۔

~~~~~~~~~~~~~~

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما

مسٹر والچند ہیرا چند جن کے زیرِ اہتمام ہندوستان میں پہلا ہوائی جہاز بنا ہے میسور میں موٹر کار بنانے کا کارخانہ بھی کھول رہے ہیں۔ سنا ہے
امریکا کے موٹر ساز اُن کی اس کوشش کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بمبئی میں جنرل موٹرز کے ایجنٹ مسٹر ہالسٹیڈ نے مسٹر والچند کے منصوبے
کی خبر سن کر کہا "جتنا جتھا اُتنی رونق"

ہندوستان میں موٹر کار کی تجارت پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر ہالسٹیڈ نے کہا کہ آج کل اس ملک میں سالانہ ۲۵۰۰۰ موٹروں کی کھپت
ہے۔ اس فروخت میں جنرل موٹرز کا حصہ ۵۰ فی صدی سے زائد ہے۔ جنرل موٹرز والے اپنے امریکائی کارخانوں سے پُرزے منگا کر اپنے
بمبئی کے کارخانے میں اُن کو جوڑتے ہیں اور اس کے بعد ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنی موٹر کاریں بھیجتے ہیں۔
جنرل موٹرز کے بمبئی کے کارخانے میں ۲۷۰۰ ہندوستانی کام کرتے ہیں اور مسٹر ہالسٹیڈ نے اپنے تجربے کی بنا پر یہ رائے ظاہر
کی ہے کہ ہندوستانی کارکنوں کی مناسب تربیت ہو تو وہ موٹر سازی کے فن میں بہت جلد ترقی کر سکتے ہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~

بڑے آدمیوں کا بچپن

"پیرپڈ" نے ایک انگریزی اخبار کے حوالے سے بعض بڑے آدمیوں کے لڑکپن کے متعلق دلچسپ معلومات درج کی ہیں۔ اُس اخبار کی رائے یہ ہے کہ کسی بڑے آدمی کے بچپن میں اُس کی آئندہ عظمت کا علم ہو جانا ضروری نہیں۔ بسا اوقات اعلیٰ درجے کی قابلیت ابتدا میں چھپی رہتی ہے اُسی طرح جیسے کوئی نشوونما پانے والا بیج کسی پتھر کے نیچے پڑا ہو لیکن پتھر ہٹا دینے کے بعد پھوٹ کر وہ پھولنے پھلنے لگے بہت سے لوگ حوصلہ افزائی اور مناسب مواقع بہم پہنچانے سے بہت جلد ترقی کر سکتے ہیں۔

اگر کسی بچے کا ذہن جلد کام نہ کرتا ہو تو استاد کو یہ نہیں چاہئے کہ اُس بچے کو کودن قرار دے کر دوسرے بچوں کو اُس پر ہنسنے کا موقع بہم پہنچائے۔ بلکہ اُس سے بہتر سلوک کرنا چاہئے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جسے آج ہم بالکل غبی سمجھتے ہیں وہ مستقبل کا کوئی غیر معمولی قابل آدمی ہو۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جیمز واٹ (جس نے ریلوے انجن ایجاد کیا) مسٹر میک ایڈم کے مدرسے کا مجہول ترین طالب علم تھا۔ اور جی ہیمانٹ جو ریڈیم کے انکشاف میں برابر کا حصہ دار تھا اتنا احمق سمجھا جاتا تھا کہ اُس کے والدین نے اُسے مدرسے سے نکال لیا۔

نپولین کی جماعت میں بیالیس لڑکے تھے جن میں نپولین کا نمبر اکتالیسواں تھا لیکن اُس نے یورپ کے نقشے کو بدل دیا اور آج وہ بے حد غیر معمولی فوجی قابلیت کا انسان سمجھا جاتا ہے۔ سر آئزک نیوٹن بھی اپنی جماعت میں صرف آخری سے پہلے نمبر پر تھا اور وہ جیومیٹری میں فیل بھی ہو گیا کیونکہ اُس نے سوالوں کو استاد کے بتائے ہوئے طریقے سے حل نہیں کیا تھا۔ لیکن ارشمیدس کے بعد اب تک نیوٹن اور گاس ہی دو سب سے بڑے ماہر ریاضیات سمجھے جاتے ہیں۔

امتحانات میں ناکام رہنا بھی کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔ بعض قابل طلبہ بھی امتحان میں گھبرا جاتے ہیں۔

آئین سٹائن جو اس عہد کا سب سے بڑا ماہر ریاضیات ہے انٹرنس کے امتحان میں ریاضی میں فیل ہو گیا تھا، اور اناطول فرانس بی۔ اے کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ ایمرسن بھی امتحان سے بہت گھبرایا کرتا تھا۔

بچوں کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ "غیر معمولی بچوں" کی نوع کے دماغ بہترین نہیں قرار دیئے بلکہ طویل اور سخت کام کے لئے آہستہ آہستہ نشوونما پانے والے دماغ زیادہ موزوں ہیں۔

مثلاً الگزنڈر فان ہمبولٹ مدرسے میں بہت معمولی طالب علم سمجھا جاتا تھا اور جارج ایلیٹ نے تو پڑھنا بھی سخت مشکل سے سیکھا تھا۔

ایسے مشاہیر کی ہر فہرست میں جو مدرسے میں غبی سمجھے جاتے تھے ذیل کے نام ضرور شامل ہوں گے:۔

ولیم شیکسپیئر، کیٹس (جو غبی ہونے کی وجہ سے سکول سے خارج کر دیا گیا) لارڈ کلائو، ٹامس کارلائل، سر لیف ہارووڈ فنانشل سکرٹری شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم (جب یہ مدرسے میں تھے تو استاد ان سے کہا کرتا تھا ہارووڈ دیکھو میں تمہیں پنیر (للاڈ) بنا رہا ہوں، اس کے بعد وہ جلی حروف میں بورڈ پر بیرن ہارووڈ (Barren Harwood) کے الفاظ لکھ دیتا اور دوسرے طلبہ Baron اور Barren کی صوتی مناسبت سے لطف اندوز ہوتے) لارڈ ریڈنگ اور مسٹر بالڈون بھی ایسے ہی غبی طلبہ تھے۔

حامد
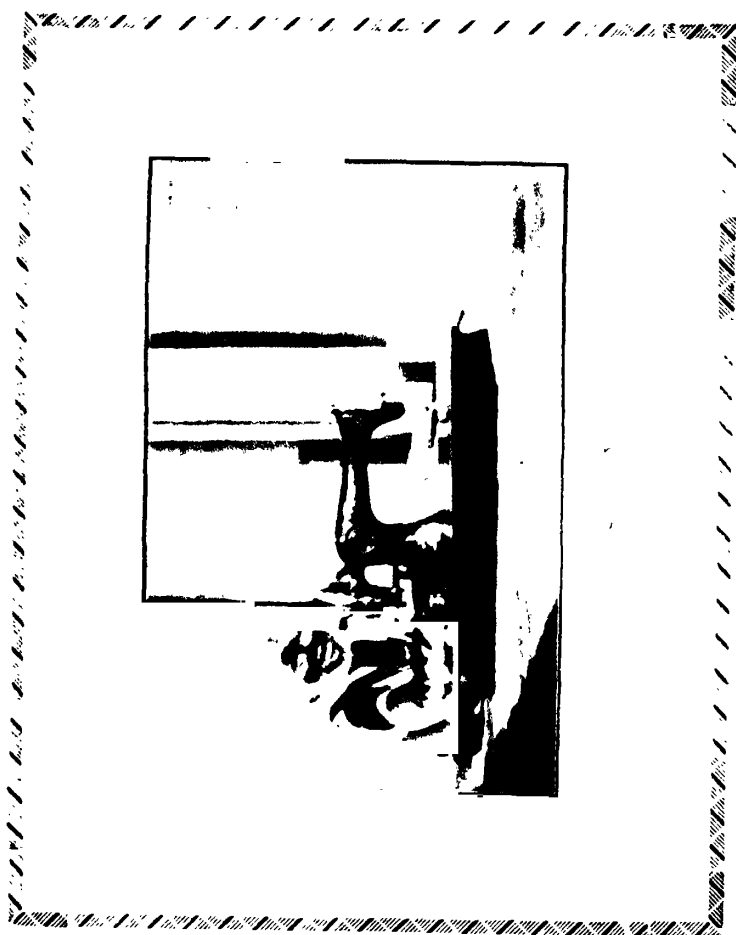
بے نیاز

افراد:—

مشتاق

دوست

بُوب

دورِ حاضر

[ایک اوسط درجہ کی حیثیت کے آدمی کا کمرہ!

دائیں جانب ایک اونچا لیمپ رکھا ہے۔ اس کے نیچے گدے دار آرام کرسی اور بازو میں نئی طرز کی ایک خانہ دار میز ہے۔ میز کے اوپر بھی اور خانوں میں بھی کتابیں رکھی ہیں۔ پشت میں دیوار سے لگی ہوئی کتابوں کی نیچی سی الماری رکھی ہے۔ اس کے اوپر ایک طرف ایک خوبصورت چھوٹی ٹائم پیس اور دوسری طرف ٹانگوں پر کتاب رکھے پڑھتے ہوئے بچے کا ایک مجسمہ۔ دیوار پر خزاں کی ایک تصویر! بائیں جانب ایک سوفا رکھا ہے اور سامنے ایک چھوٹی گول میز۔ پشت میں بائیں جانب داخل ہونے کا دروازہ ہے۔

جس وقت پردہ اُٹھتا ہے رات کے دس بجے کا عمل ہے۔ اونچا لیمپ روشن ہے۔ مشتاق بیٹھا کتاب کے ورق پلٹ رہا ہے۔ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بے سود۔ آخر کتاب کو میز پر ڈال دیتا ہے اور سامنے کھڑکی میں سے دور آسمان پر نکلے ہوئے تاروں کو دیکھنے لگتا ہے..... خیالات میں غرق اور ایک دنیا سے بیگانہ!]

مشتاق:- ستارے........ آسمان کی نیلگوں سطح پر...... جھلملاتے ہوئے سیمیں ستارے!... (ایک ٹھنڈے سانس کے ساتھ) کیا ہر ستارہ بُوب کی سیمیں جبین نہیں ہے؟..... (سر ہلا کر "ہاں" کا اشارہ کرتا ہے اور پہلو بدل کر کرسی پر اور ذرا ڈھلک جاتا ہے)

(دوست داخل ہوتا ہے)

دوست:- مشتاق!

(مشتاق چونک کر گردن پھیر کے دیکھتا ہے۔ لیکن اپنے دوست کو دیکھ کر پھر اسی طرح بیٹھ جاتا ہے)

دوست:- میں ایک جگہ کھانے پر گیا تھا... واپس گھر جا رہا تھا۔ یہاں روشنی دیکھی تو سوچا ذرا دیر بیٹھ کر سگرٹ ہی پی لوں (سوفے پر بیٹھ جاتا ہے اور سگرٹ نکال کر سلگاتا ہے۔ ایک کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے) کیا حال ہے؟

مشتاق:- حال پوچھتے ہو؟

دوست:- آج کیا بات ہے؟ میں نے آواز دی تو بڑی لاپروائی سے ایک نظر ڈالی ... حال پوچھا تو بڑی بے نیازی سے ارشاد ہوا "حال پوچھتے ہو؟"

(تمسخر آمیز ہنسی)

مشتاق:- بے نیازی! تم نے لاعلمی میں کتنا موزوں لفظ استعمال کیا ہے...... بے نیازی ایسی میرا حال ہے۔

دوست:- خیریت تو ہے؟

مشتاق:- تم جانتے ہو تمہارے آنے سے کیا ہوگیا؟

دوست:- کیا؟

مشتاق:- تم نے آکر مجھے میری بُوب سے جُدا کردیا!

دوست:- کیوں کیا وہ یہاں آئی ہوئی تھیں؟ .. (گھبرا کر) نہیں بھئی میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ واللہ بھئی تم نے کہدیا ہوتا تو میں اندر ہی کیوں آتا۔ کیا عجیب آدمی ہو...... (جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) وُہ بھی مجھے کوسنے دے رہی ہوں گی کہ کہاں لوند کے مہینے کی طرح آٹپکا!

مشتاق:- کہاں چلے؟ بیٹھو تو!

دوست:- نہیں بھئی کوئی تکلّف نہیں ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ لو بھئی سلام!

مشتاق:- (اُٹھ کر پکڑتا ہے) ارے بھئی۔ آئے ہو تو بیٹھو۔ اس طرح جانے کے کیا معنی!

دوست:- نہیں بھئی۔ تم بیٹھ کر اُن سے باتیں کرو۔ انہیں اکیلا بند رکھنا مناسب نہیں۔ میرا کیا ہے۔ میں صبح پھر آجاؤں گا۔ وہ تو روز روز نہیں آتیں!

مشتاق:- تم سمجھ رہے ہو کہ بُوب کو میں نے اُس کمرے میں بند کر دیا ہے۔

دوست:- تو کیا انہیں غسل خانہ میں چھپا دیا ہے؟

مشتاق:- نہیں بھئی نہیں! تم بیٹھو تو۔

دوست:- تم بھی عجیب آدمی ہو۔ روز تو ان کی فرقت میں تڑپتے تھے۔ اَور آج جب وُہ آئیں تو انہیں کہیں بند کر دیا اَور وہ بھی میری خاطر۔ بھئی خاطر تو ان کی کرنی چاہیئے تھی۔ میرا کیا ہے میں تو اپنا ہی آدمی ہوں۔

مشتاق:- تم بھی عجیب آدمی ہو تمہارے ذہن میں یہ کیسے بیٹھ گیا کہ وُہ یہاں آئی ہوئی تھیں۔ اَور تمہارے آنے پر میں نے انہیں کہیں بند کر دیا ہے۔

دوست:- ارے بھئی ابھی تمہیں نے تو کہا تھا کہ میں نے تمہیں بُوب سے جُدا کر دیا۔

مشتاق:- ہاں کہا تھا!

دوست:- تو پھر؟

مشتاق:- جب تم آئے تو میں اپنی بُوب کا تصور جمائے بیٹھا تھا تم آئے تو سب کچھ درہم برہم ہوگیا!

دوست:- (قہقہہ لگا کر) لاحول ولا قوۃ! بس اتنی سی بات تھی؟

مشتاق:- بات اتنی ہی تو نہیں ہے!

دوست:- تو پھر کتنی ہے؟

مشتاق:- تم ذرا اطمینان سے بیٹھو اَور ٹھیک طرح سنو تو کہوں۔

دوست:- تم کہو تو!

مشتاق:- تم جانتے ہی ہو مجھے بُوب سے کس قدر محبت ہے۔ میرا کل وجود بُوب کی محبت کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ میری رگ رگ دن رات بُوب کا نام جپا کرتی ہے میری آنکھوں میں بُوب سمائی ہوئی ہے۔ میں جدھر دیکھتا ہوں بُوب ہی بُوب نظر آتی ہے۔

دوست:- تو تم اس وقت بھی اسی طرح اپنا دل بہلا رہے تھے؟

مشتاق:- جسے تم بہلانا کہتے ہو، میرے لئے حقیقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میں بُوب سے بے نیاز ہو جاتا ہوں۔ بُوب مجھی میں ہے۔ میں اَور بُوب اب الگ وجود نہیں رہے ہیں۔

دوست:- خوب! یہ ایک ہی رہی!

مشتاق:- مجھ پر محبّت کی ایک لطیف رمز کا انکشاف ہوا ہے۔ ایک عجیب کیف کا ارتقا ہو رہا ہے۔

دوست:- اچھا؟

مشتاق:- بُوب سے جدائی کے باوجود میں اُس کے تصوّر میں ایک

سرور محسوس کرتا ہوں میرے اعصاب پر ایک مدہوشی سی طاری ہو جاتی ہے۔

دوست :۔ یہ تو ہوتا ہی ہے کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔

مشتاق :۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ وہ سرور جو مجھے تصور میں حاصل ہوتا ہے شاید رُوپ سے مل کر بھی نہ محسوس ہو۔ جب میں تصور کی گہرائیوں میں ڈوب کر دور اُس نیلگوں آسمان کے جھلملاتے تاروں کو دیکھتا ہوں تو وہاں مجھے میرے جذبات کی رعنائیوں میں ملبوس میری رُوپ نظر آتی ہے۔ اس کے گرد میرے شوقِ طلب کا ہالہ ہوتا ہے۔ اس کے رخسار پر میری آرزو کا غازہ۔ وہاں اس کے حسن میں کچھ اور ہی دمک ہوتی ہے۔

دوست :۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہاں کچھ نہیں ہے۔ وہاں تمہاری رُوپ نہیں ہے۔ وہ تاروں میں نہیں بلکہ اپنے گھر میں رہتی ہے۔

مشتاق :۔ (بگڑ کر) ہر وہ نظر جو اس دنیا سے دُور غیر معروف چیزوں کو دیکھنے کے لئے اُٹھتی ہے دنیا پر شاق گذرتی ہے۔ دنیا محبوب کے قالب سے بلند نہیں ہو سکتی۔ قالب ہی کے جال میں پھنسی رہتی ہے۔ وہ اُس طائر کی طرح ہے جو قفس کی تیلیوں ہی میں محدود رہے۔ اُس کا حسد کسی اور کو بھی ان تیلیوں سے دور کچھ اور دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کو کسی طرح پھر اسی قفس کی فضا میں گھسیٹ لائے۔

دوست :۔ تم تو ناحق بگڑ گئے۔ میں تمہیں کب مجبور کر رہا ہوں کہ تم رُوپ کے قالب ہی میں محصور رہو لیکن (ستاروں کی طرف اشارہ کر کے) وہاں بھی تو کچھ نہیں رکھا۔ وہ سب تمہارے توہمات ہیں محض خیالی تصاویر!

مشتاق :۔ وہاں وہ کچھ ہے جو یہ دنیا فراہم نہیں کر سکتی۔ وہاں وہ نظر آتا ہے جو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہاں ہر چیز خوشگوار ہے۔ مسرتیں پہلو بدل کر مصائب نہیں دکھاتیں۔ وہاں حُسن کو پائیداری ہے اور ہر دید کے ساتھ افزائش ہوتی ہے وہاں حُسن کی نقاب میں بے وفائی نہیں ہے۔ بے رُخی نہیں ہے۔

دوست :۔ تم کیا باتیں کر رہے ہو؟ یہ تو صریحاً خود فریبی ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ حقیقت اتنی رنگین نہیں ہوتی جتنا تصور اسے بنا دیتا ہے لیکن تصور خود کوئی شکل تخلیق نہیں کر سکتا۔ وہاں کا حُسن بھی حُسن کا رہینِ منت ہے۔ اُس کی آفرینش ہی اس حسن کے برانگیختہ کئے ہوئے جذبات کی صناعی ہے۔ رُوپ کی محبت اور اُس کے حُسن سے تم نے یہ طلسم گھڑا ہے ورنہ اس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔

مشتاق :۔ تم کچھ ہی کہو لیکن میں ان لذائذ کو ہاتھ سے نہیں دے سکتا میں ہر وقت رُوپ کے ساتھ رہتا ہوں اس کے حسن سے سرشار۔ مگر تصور کی دلفریبیاں بہت لطیف ہیں۔ ان میں یہاں جیسا مدو جزر نہیں ہوتا۔ وہاں موجیں طوفان نہیں بنتیں۔ ان کی روانی میں ہلکا سا نغمہ ہوتا ہے۔

دوست :۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ باتیں تمہیں سوجھیں کیسے؟ لا[illegible] میں دھرا کیا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا ان میں تمہیں لطف کیا آتا ہے؟

مشتاق :۔ ان میں سوجھ بوجھ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ تو احساس سے تعلق رکھتی ہیں ..... وہاں کا لطف مبہم ہوتا ہے یہاں ہر چیز ایک شکل رکھتی ہے، اس کے نقش نظر آتے ہیں اس لئے اس کی جامع تعریف بیان بھی کی جا سکتی ہے اور یہی اس کی پستی کی دلیل ہے۔

دوست :۔ خبر نہیں آج تم پر یہ کیا جنون سوار ہو گیا ہے؟

مشتاق :۔ تم تو اسے جنون ہی کہو گے اس لئے نہیں کہ یہ واقعی جنون ہے بلکہ اس لئے کہ ابھی یہ تم پر سوار نہیں ہوا ہے۔

دوست :۔ خیر یہی سہی ..... عود اپنے سوز کے دھوئیں میں تخیل کا رقص بھی دیکھ سکتا ہے اور طرح طرح کی جمالیات بھی ...... لیکن بھئی یہ حسن درقص کے ساعت؟ اس کے درہم برہم ہونے میں دیر ہی کیا لگتی ہے؟ تم ہی بتاؤ اِس طلسم سے کیا حاصل جو ایک جستجو

کی تاب نہ لاسکے۔ ایک سراب ہے جس سے پیاس نہیں بجھ سکتی۔

مشتاق:۔ ہر ساعت کی دریہی دوری ہی اصل پائیداری ہے۔ ہر آرزو کے ساتھ ایک نئی دنیا تشکیل ہوتی ہے۔ ہر طلب شوق ایک نیا مطلب پیش کرتی ہے۔ وہاں فراق کی خلش نہیں ہوتی۔ روحوں کا اتصال ہوتا ہے۔ محبت محبوب کے قالب سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔

دوست:۔ (ہنس کر) تو یہ تھی آپ کی بے نیازی! امیں سیدھا سادھا آدمی ناحق بیوقوف بنا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ محبت پلٹا کھا کر بے نیازی بن گئی ہے۔

مشتاق:۔ محبت کی ابتدا کشش سے ہوتی ہے۔ دل بے اختیار رجوع ہوتا ہے کشش کے بعد دوسری منزل طلب کی ہوتی ہے۔ مطلوب کے قرب کا شوق ہوتا ہے لیکن طلب کا ارتقا محویت بن جاتا ہے۔ طالب مطلوب میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اپنے کو بھول جاتا ہے۔ طلب کی معراج یہ ہے کہ طلب نہ رہے۔ طالب خود مطلوب بن جائے۔

دوست:۔ محبت کی انتہا بقول تمہارے یہ ہوئی کہ محبوب کی جستجو نہ رہے...۔ بھئی ایسی محبت کو ہمارا دور ہی سے سلام۔ (گھڑی دیکھ کر) بھئی چل کر سوئیں ...... سر بھاری ہو رہا ہے ذرا زیادہ کھالیا۔

مشتاق:۔ یہ نظام عالم ہی اسی اصول پر عمل پیرا ہے۔ ازل کی انتہا اجل ہے۔

دوست:۔ اچھا بھئی، میں تو جا رہا ہوں پھر کبھی جب تم ذرا ٹھیک ہو گے اور میرا پیٹ ذرا ہلکا تب باتیں ہوں گی..... لیکن بھئی ایک بات ہے؟

مشتاق:۔ کیا؟

دوست:۔ محبت کی آخری منزل ناکامی بھی تو فراہم کرسکتی ہے

مشتاق:۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ ناامیدی بے نیازی پر مجبور کر دیتی ہے؟

دوست:۔ جب ناامیدی کی برق گرتی ہے تو کچھ باقی نہیں رہتا مطلوب کی بے رخی اور سرد مہری جب نیاز سے ناامید کر دیتی ہے پھر بے نیازی ہی اختیار کرتے بن پڑتی ہے۔ جب سالن نہیں ہوتا روکھی ہی بھاتی ہے۔

مشتاق:۔ مجبوری بے نیازی کی نفی ہے۔

دوست:۔ ہوگی!...... بھئی تم جانو اور تمہارا کام۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ تم اپنے نفس کو دھوکا دے رہے ہو۔ اچھا ایک بات بتاؤ کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔

مشتاق:۔ کیا؟

دوست:۔ کیا محبوب کے پاس سے کوئی سلام پیام آیا تھا؟

مشتاق:۔ نہیں....

دوست:۔ (قہقہہ لگا کر) بس تو عقدہ حل ہو گیا۔

مشتاق:۔ تم بڑے ظالم ہو!

دوست:۔ اور تم جو اس غریب محبوب پر ظلم توڑ رہے ہو تو کچھ نہیں..... کم از کم اسے تم تنہا ہی دو تاکہ وہ غریب تمہارا پنڈ چھوڑے

(مشتاق خاموش ہے)

دوست:۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ اسے کیا خبر کہ آپ بے نیاز ہو گئے وہ ناحق اپنی راتیں کالی کر رہی ہوگی۔ اسے اطلاع تو کر دو۔

مشتاق:۔ تم جا سکتے ہو!

دوست:۔ بھئی تم تو ناراض ہو گئے! اچھا ایک بات تو سنو

(مشتاق خاموش ہے)

دوست:۔ ہو جاؤ تم ناراض۔ ہم کل آکر منالیں گے!.... اچھا بھئی ......سلام!..... بھلے آدمی سلام کا تو جواب دے!

مشتاق:- (بادلِ ناخواستہ) وعلیکم السلام

دوست دروازے کی طرف جاتا ہے ایک دفعہ مڑ کر دیکھتا ہے پھر چلا جاتا ہے
.... تھوڑی دیر بعد مشتاق مڑ کر دیکھتا ہے اور جا کر دروازے کا کھٹکا لگا دیتا
ہے .... آن کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے .... کچھ دیر سوچتا رہتا ہے ....)

مشتاق:- مجھے یوب کو ایک خط لکھ دینا چاہئے .... اور ساتھ اس کی
تصویر بھی واپس کر دوں! ....

(میز کے خانوں میں سے ایک کتاب میں سے یوب کی تصویر نکالتا ہے
اسے ایک نظر دیکھتا ہے بے اختیار ہونٹ تصویر کی طرف بڑھتے ہیں لیکن
مشتاق رک جاتا ہے جلدی سے تصویر میز پر رکھ دیتا ہے اور کاغذ قلم نکال
خط لکھنے لگتا ہے .... خط لکھ کر

مشتاق:- ہوں! .... (پڑھتا ہے)

یوب!

تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے
اور محبت اب اس قدر بڑھ گئی ہے کہ تم مجھے ہر جگہ ہر وقت نظر آتی ہو۔
تم ہر دم میرے ساتھ رہتی ہو اور میں اس قرب کی ساری لطیف کیفیتوں
سے سرشار رہتا ہوں ممکن ہے کہ تم کہو کہ مجھے اس یوب سے کیا
واسطہ جو ہر دم تمہارے ساتھ رہتی ہے ممکن ہے کہ وہ یوب تم نہ ہو
کیونکہ اس میں تمہارا سا نکھار رہنا نہیں ہے۔ اُسے میرے جذبات
کا پاس ہے۔ اس کے حسن میں تصور کا دھندلکا تو ہے لیکن بہر حال
وہ تمہارے ہی پر انگیختہ کئے ہوئے جذبات کا مجسمہ ہے اور تمہارے
ہی وجود کی ایک ارفع تشکیل!

میں تمہاری تصویر اس خط کے ساتھ واپس کر رہا ہوں یہ اس
لئے نہیں کہ مجھے اب تم سے محبت نہیں رہی ہے بلکہ اس وجہ
سے کہ یہ محبت اتنی بڑھی کہ یوب مجھ میں سما گئی۔ اب یہ تصویر
یوب کے ایک علیحدہ وجود کا احساس پیدا کر کے پھر مجھے فراق کی خلش
میں مبتلا کرنا چاہتی ہے۔

یوب! للہ تم میرے اس طلسم کو توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔

مشتاق

(خط پڑھ کر مشتاق چند لمحے کچھ سوچتا رہتا ہے .... پھر خط میز پر رکھ دیتا
ہے .... فوراً ہی خط اُٹھا کر ایک نظر ڈالتا ہے قلم اُٹھاتا ہے لیکن پھر قلم اور
خط دونوں رکھ دیتا ہے ...... کچھ سوچتا ہے ...... آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھا
کر تصویر کو اُٹھاتا ہے .... آہستہ آہستہ قریب لاتا ہے ... گردن جھکا
کر تصویر دیکھ رہا ہوتا ہے اور تصویر ہاتھ ہی میں ہوتی ہے کہ لیمپ کی روشنی
آہستہ آہستہ مدھم ہو کر غائب ہو جاتی ہے۔ کچھ لمحے تاریکی رہتی ہے کہ پھر
یک لخت لیمپ روشن ہو جاتا ہے .... اب تصویر میز پر رکھی ہے اور
مشتاق دور نیلگوں آسمان پر جھلملاتے تاروں کو دیکھ رہا ہوتا ہے کہ
دروازے پر کھٹ کھٹ ہوتی ہے .... مشتاق چونکتا ہے)

مشتاق:- کون؟

(دروازہ پر پھر کھٹ کھٹ ہوتی ہے)

مشتاق:- میں پوچھتا ہوں کون ہے؟ اتنی رات گئے اب کون آ گیا۔

(دروازے پر پھر کھٹ کھٹ ہوتی ہے اور
ساتھ چوڑیوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے)

مشتاق:- چوڑیوں کی آواز! ... میرا دل کہہ رہا تھا کہ یوب آئے گی!
.... بیتاب ہو کر جلدی سے دروازہ کھولنے کو لپکتا ہے لیکن رک جاتا
ہے ... آہستہ آہستہ پھر واپس آتا ہے) کہیں یہ طلسم ٹوٹ تو نہیں جائیگا؟

(دروازے پر اس بار آہستہ سے صرف ایک
کھٹ ہوتی ہے)

مشتاق:- نہیں .... طلسم نہیں ٹوٹے گا .... میں خود یہ خط یوب

کو دوں گا۔۔۔۔ (جاکر دروازہ کھولتا ہے)۔۔۔کون ہے؟۔۔۔ (اِدھر اُدھر دیکھتا ہے
۔۔۔۔ مایوس ہوکر واپس آجاتا ہے) تو کیا یُوب نہیں آئی تھی۔۔۔۔۔۔ (بہت
رنجیدہ ہے لیکن رنج پر فوراً غالب آکر) چلو اچھا ہُوا!

(یُوب داخل ہوتی ہے۔۔۔۔ چادر اُتار کر ایک کونے
میں ڈال دیتی ہے۔۔۔ مشتاق قدموں کی آہٹ سن
کر مُڑ کر دیکھتا ہے)

مشتاق:۔ (بے اختیار روح کی گہرائیوں سے مسرت بھری آواز نکلتی
ہے) یُوب!

یُوب:۔ (اُسی بیتابی کے لہجے میں) مشتاق!

مشتاق:۔ (فوراً بدل کر سوکھے اور کاروباری لہجے میں) تم کس لئے آئی ہو؟

یُوب:۔ (متحیر) کس لئے آئی ہوں؟۔۔۔۔ خیر تو ہے۔۔۔۔ آج تم کس طرح
بات کر رہے ہو؟

مشتاق:۔ کوئی خاص کام ہے؟

یُوب:۔ نہیں

مشتاق:۔ کوئی ضروری بات کہنی ہے؟

یُوب:۔ نہیں کوئی ضروری (ضروری پر زور دیتے ہوئے) بات تو نہیں
کہنی۔

مشتاق:۔ تو پھر؟

یُوب:۔ پھر کیا؟

مشتاق:۔ تو پھر تم یہاں کس لئے آئی ہو؟

یُوب:۔ تم مجھ سے ناراض ہو؟

مشتاق:۔ نہیں! میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔

یُوب:۔ تم کہتے تو ہو نہیں، لیکن تم مجھ سے ناراض ضرور ہو۔۔۔ کیا
اس لئے کہ میں تمہارے پاس نہ آسکی تھی؟

مشتاق:۔ نہیں!

یُوب:۔ میں مجبور تھی کرتی بھی تو کیا؟ تم تو جانتے ہی ہو گھر والوں کا مجھ
پر کس قدر سخت پہرہ رہتا ہے۔

مشتاق:۔ تو پھر تم اس وقت کیسے آگئیں؟

یُوب:۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی سہیلی کے ہاں رات کو رہنے
کی اجازت لی تھی۔ اب وہاں سے چپکے سے آئی ہوں۔

مشتاق:۔ نہ آتیں تو بہت اچھا تھا!

یُوب:۔ تم تو بہت ہی خفا ہوگئے!

مشتاق:۔ میں تم سے بالکل خفا نہیں ہوں۔ اوّل تو خفا ہونے کی
وُہ بات ہی ایسی کونسی تھی اور اگر تھی بھی اب نہیں رہی۔

یُوب:۔ یا الٰہی شکر تم ناراض نہیں ہو۔۔۔۔ (یُوب جو اب تک کھڑی
تھی بیٹھ جاتی ہے مشتاق کی خاموشی اور خنک جذباتی دیکھ کر) کیوں
کیا آج طبیعت ناساز ہے؟

مشتاق:۔ نہیں

یُوب:۔ کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہے۔ آج تم نے مجھ سے بیٹھ جانے
تک کو نہیں کہا۔ میں خود ہی بے غیرت بن کر بیٹھ گئی۔

مشتاق:۔ (پُرمعنی لہجے میں) بات؟

یُوب:۔ (مشتاق کے قریب جاکر) آج مشتاق تمہیں کیا ہوگیا
ہے۔ کم از کم میں تمہارے اس برتاؤ کو نہیں سمجھ سکتی۔

(مشتاق خاموش ہے)

یُوب:۔ (چند لمحے خاموش رہ کر) تو کیا میں اس کے معنی یہ سمجھوں
کہ اب تمہیں اپنی یُوب سے محبت نہیں رہی۔

مشتاق:۔ مجھے اپنی یُوب سے پہلے سے بھی زیادہ محبت ہے
اور تمہاری محبت بھی میری یُوب کی محبت میں تبدیل ہوگئی ہے۔

یُوب:۔ مجھ سے جو تمہیں محبت تھی وُہ تمہاری یُوب کی محبت میں تبدیل ہو گئی؟

مشتاق:۔ ہاں!

یُوب:۔ لیکن اس میں پھیر کیا ہے۔ فرق کیا ہے میں نہیں سمجھ سکتی اگر تم کو مجھ سے محبت نہیں رہی تو صاف صاف کہو۔

مشتاق:۔ مجھے تم سے محبت تھی۔ لا انتہا...... لیکن تم میسر کہاں تھیں ...... میرے جذبات نے میری یُوب کو میری تصور کی آنکھوں کے سامنے پیش کیا۔ اور میں نے اپنی تمام محبت اس کی طرف مبذول کر دی۔

یُوب:۔ لیکن وُہ بھی تو میں ہی یُوب ہوں۔

مشتاق:۔ نہیں یُوب! وُہ یُوب تم سے ارفع ہے۔ وُہ اس کون و مکان کے قفسوں سے آزاد ہے وُہ ہر دم میرے ساتھ رہتی ہے۔ اسے میرے جذبات کا پاس ہے اور میری محبت کا جواب محبت سے دیتی ہے۔

یُوب:۔ لیکن اب جب کہ میں آگئی ہوں تو اُس کی کیا حقیقت؟

مشتاق:۔ میرے لئے اُس یُوب کی حقیقت تم سے زیادہ ہے۔ تم چند لمحوں کے لئے میرے پاس آتی ہو لیکن وُہ ہر دم میرے ساتھ رہتی ہے۔ اس کو میری محبت کی کل گہرائیاں معلوم ہیں۔ وُہ میرے جذبات کی پہنائیوں سے واقف ہے۔ اس کو مجھ سے پہلے میری آرزو معلوم ہو جاتی ہے۔

یُوب:۔ تم کیا کہہ رہے ہو...... ایک خیالی تصویر کی حقیقت مجھ سے زیادہ ہے؟

مشتاق:۔ میں تم کو خیالی تصویر سمجھ سکتا ہوں کیونکہ تم ایک حسین خواب کی طرح کبھی کبھی نظر آجاتی ہو لیکن اس کی حقیقت میں میں شبہ نہیں کر سکتا

یُوب:۔ تم خیالی تصویروں کے عوض مجھے ٹھکرا رہے ہو؟

مشتاق:۔ وُہ خیالی تصویر میرے لئے تم سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس سے مجھے سکون ملتا ہے۔

یُوب:۔ تم کو (تم "پر زور دیتے ہوئے) اس سے سکون ملتا ہے نا؟

مشتاق:۔ ہاں یُوب! اور میں تمہارا بہت ممنون ہوں کہ تم نے درمیان میں واسطہ بن کر مجھے اس دائمی کیف سے دوچار کر دیا۔

یُوب:۔ ہوں! تو تم میرے جذبات سے کھیلتے رہے۔ مجھے بیوقوف بنایا۔

مشتاق:۔ یُوب تم سمجھنے......

یُوب:۔ اب تم سنبھلو۔ میں سمجھ گئی اور اچھی طرح سمجھ گئی۔...... تم خود غرض ہو تم کو صرف اپنے سکون کا خیال ہے صرف اپنے سکون کا۔ تم نے جدائی کی تلخی سے بچنے کے لئے یہ ڈھونگ بنایا ہے...... یہ بھی ایک بہانہ ہے۔

مشتاق:۔ تم سنو تو سہی۔

یُوب:۔ تم میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ صاف صاف کہہ سکو کہ میرے دل میں اب تمہاری محبت نہیں رہی اور اللہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔

مشتاق:۔ تم......

یُوب:۔ کیوں یہی بات ہے نا؟ لیکن تم سے محبت کرنے کو کس نے کہا تھا...... تمہیں مجھے اس طرح واسطہ بنانے کا حق کیا تھا؟...... اگر محبت میں جدائی کی تلخی بھی برداشت نہ ہوتی تھی تو وُہ تمہاری محبت ہی کیا تھی...... وُہ سب جھوٹ تھا اور یہ سب ایک فریب!

(یُوب رونے لگتی ہے)

مشتاق:۔ (یُوب کے پاس آکر) یُوب!...... یُوب!!......
(سوفے کے بازو پر بیٹھ کر یُوب کے شانے پکڑ کر) یُوب!!!

یُوب:۔ (بگڑ کر) خبردار جو تم نے مجھے ہاتھ لگایا...... تمہارے چھونے سے میری روح مشتعل ہوتی ہے۔

مشتاق:۔ اچھا تم میری بات تو سُنو!

یُوب:۔ میں اب تمہاری ایک بات بھی سُننا نہیں چاہتی!

مشتاق:- پُوب! تم چپ تو ہو جاؤ۔

پُوب:- تم نہیں جانتے مجھ پر کیا گذر رہی ہے۔ میں نہیں بتا سکتی میری کیا حالت ہے۔

مشتاق:- کیا ہوا؟

پُوب:- کیا ہوا؟..... کیا ہوا..... میرے جذبات کا خون کر کے، میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پوچھتے ہو کیا ہوا..... کہتے ہو..... کہ چپ ہو جاؤں..... چار آنسو بھی نہ بہاؤں

مشتاق:- تو کیا واقعی پُوب تمہیں مجھ سے اس قدر محبت تھی؟

پُوب:- (چند ے خاموشی کے بعد) تم کو یہ پوچھتے شرم نہیں آتی؟

مشتاق:- میری پُوب! میری پیاری پُوب!

پُوب:- میں تمہاری پُوب نہیں ہوں..... تمہاری پُوب تو کوئی اَور ہے..... جاؤ اس کو پُوب کہو۔

مشتاق:- میری پُوب! تم ہی میری پُوب ہو۔ وُہ تو ایک فریب تھا جس میں تمہاری سرد مہری نے مجھے مبتلا کر دیا تھا..... میری پُوب تو تم ہو..... پُوب!

پُوب:- تمہیں یقین ہے وُہ ایک فریب ہے؟

مشتاق:- ہاں میری پُوب!..... پُوب ..... اب ایسا نہیں ہوگا

پُوب:- (آنسو پونچھ کر چپ ہوتے ہوئے) اچھا!..... ..... میرا دل بہت کمزور ہے! خیر!

مشتاق:- (ہنس کر) انسان بھی کیا ہے؟..... اپنے کو کس کس طرح دھوکا دیتا ہے..... یہ دیکھو (میز پر سے پرچہ اُٹھا کر) یہ وُہ خط ہے جو میں نے تمہارے آنے سے چند منٹ پہلے لکھا تھا..... اَور میں تمہاری تصویر بھی واپس کر رہا تھا۔ (ہنستا ہے)

پُوب:- دکھانا تو مجھے یہ خط! دیکھوں کیا لکھا تھا!

مشتاق:- ناحق اب تمہیں تکلیف ہوگی..... اَور اب تو اس کو پھاڑ دینا چاہئے!

پُوب:- دو تو..... (خط لے کر پڑھتی ہے..... آخری فقرہ آواز سے پڑھتی ہے.....)..... اچھا!..... "للہ میرے اس طلسم کو توڑنے کی کوشش نہ کرنا"

مشتاق:- (شرمندہ ہو جاتا ہے اَور خط کو پھاڑتے ہوئے) وہ طلسم خود فریبی تھا پُوب اَور اب تو وُہ ٹوٹ گیا..... (پھٹے ہوئے خط کی چندیاں فرش پر پھینک دیتا ہے)

(لیمپ ایک دم بجھ جاتا ہے چند لمحے تاریکی رہتی ہے..... اَور پھر آہستہ آہستہ لیمپ روشن ہوتا ہے۔ اب پُوب کمرے میں نہیں ہے۔۔ مشتاق لیمپ کے نیچے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں پُوب کی تصویر ہے۔۔ پھٹے ہوئے خط کی چندیاں فرش پر نہیں ہیں۔ خط صحیح وسالم میز پر رکھا ہے.....)

مشتاق:- (چونک کر) ایں یہ کیا؟..... (تصویر میز پر رکھ دیتا ہے..... اضطراب کے ساتھ چاروں طرف دیکھتا ہے) پُوب؟..... (حیران ہے) اَور یہ خط میز ہی پر رکھا ہے..... (اُٹھاتا ہے) کیا پھٹا ہوا خط دوبارہ جڑ سکتا ہے؟..... تو کیا وہ سب ایک خواب تھا؟ ہوگا..... لیکن وہ طلسم تو ٹوٹ گیا..... خود فریبی.....

(خط پھاڑ دیتا ہے)

پردہ

ناصر الدین شمسی

شاعری اور زندگی

سوچتا تھا کہ شاعری کیا ہے؟
کام کی چیز یا تماشا ہے؟

لوگ کرتے تو ہیں بہت توصیف
اس کی مخصوص بھی ہے کچھ تعریف؟

دیکھتا جب اساتذہ کا کلام
دل میں اُٹھتے شکوک اور اوہام

مجھ کو ملتے تھے اک جگہ باہم
خندہ و گریہ، شادی و ماتم

کبھی شاعر ہے ناتواں اتنا
نہ ملا موت کو نشاں اس کا

اس کی آہوں سے ہو گیا چونچال
گوشہ اور بہار کا بھونچال

یاس و حرماں سے ارتباط رہا
بزمِ ماتم کا انضباط رہا

سر میں تھا تو قنوطیت کا جوش
ولولے دل میں تھے نہ جوش و خروش

تھے انہیں شاعروں میں ایسے بھی
نگہِ ذہن جن کی غائر تھی

ڈالتے آنکھ وہ حقیقت پر
تھی وسیع اور بالغ ان کی نظر

جن کے شعروں میں ہوتی کام کی بات
جن کا مضموں تھا روندادِ حیات

مدتوں شعر کا رہا یہ چلن
رطب و یابس رہے امینِ سخن

تھے وہ آزاد، حالی، اور اقبال
جن سے بدلی گئی وہ شعر کی چال

پھر سرور آئے اور اُٹھے چکبست
وطنیت کا کرنے بندوبست

اور ہیں مصلحوں کے زمرے میں
مصلحت ہے کہ چھوڑ جاؤں انہیں

ہے تصوف کی جو کلام میں بات
سخن آرائی کی فقط ہے گھات

فرق ہے قاتل اور بسمل میں
لب پہ کیوں آئے جو نہ ہو دل میں

غمِ دنیا ہے رات دن او فکر
پھر بھلا کیا ذات او صفت کا ذکر

صوفیانہ بھی ہو چلن جس کا
یہ مسائل ہیں اس کے حق میں روا

ورنہ سب داخلہ زبانی ہے
عکس اور شخص اک کہانی ہے

جن کا ہو قول ہم ردیفِ عمل
جن کا برتاؤ ہو سخن کا بدل

اُن کو حق ہے سنائیں وہ باتیں
اور تصوّف کے مسئلے چھیڑیں

شعر کوئی غزل کا بن نہ پڑا
فلسفے کا اُٹھا دیا جھگڑا

نثر ہے وعظ ، فلسفے کے لئے
شعر ہے جوش ۔ ولولے کے لئے

وُہ تصوف ہو یا تفلسف ہو
شعر سے شعریت نہ جانے دو

شعر کی جو ہوئی ہیں تعریفیں
ہیں وُہ ناقص نگارِ منطق ہیں

جیسا جس کا مذاق تھا لکھا
حصر اپنی پسند پر رکھّا

ذہنیت کا یہی تقاضا تھا
تھا نتیجہ شعور و وِجداں کا

ہوں جو جذبات دل میں جلوہ طراز
ان کو ملتی ہے شعر سے پرواز

شعر احساس کا ہے آئینہ دار
شعر جذبات کا علمبردار

شعر عکّاسِ رنگِ فطرت ہے
پرتَو اندازِ حسنِ قدرت ہے

کب حقایق سے شعر ہے معصوم
شعر و فطرت ہیں لازم و ملزوم

شعر ہے نفسیات کا مظہر
وُہ نہیں ہے غلو کا دست نگر

شعر کی شان نثر سے ہے جُدا
نثر توجیہ کا ہے اک آلہ

شعر کی ہے زبان موسیقی
نثر کی ہے زبان منطق کی

ہے محاکات شعر کی زینت
نثر کی سادگی اہم ہے صفت

شعر جذبات سے ہے مالا مال
نثر ہے ظرفِ پند و استدلال

شعر کے واسطے ہے رنگینی
نثر کے واسطے خوش آئینی

شعر کا نثر سے الگ اسلوب
اس کا انداز دلربا مرغوب

وزن اس کا لباس کہئے اگر
قافیہ اس کے حق میں ہے زیور

کوئی ان چیزوں کے جو دشمن ہیں
غسلِ شمسی کے سمجھ بجھن ہیں

قافیہ کا کردنہ قافیہ تنگ ۔۔۔ معنویت کا شعر کو دو رنگ

ہے ادب میں وہی کلام لطیف ۔۔۔ ہوں نہ جس میں سقائمِ تالیف
اس سخن میں نہ کیوں لطافت ہو ۔۔۔ جس کے مفہوم میں سہولت ہو
شوخی اچھی ہے۔ ہو اگر حد کی ۔۔۔ ورنہ شامت ہے صحبتِ بد کی
ہیں ترقّی پسند جو حضرات ۔۔۔ اُن سے کہنی ہے بس یہی اک بات
کہ کسی کو نہیں ترقی سے ۔۔۔ سب ہیں شیدا یہاں ترقی کے
کبھی اس پر کیا ہے آپ نے غور ۔۔۔ انقلاب اَور ہے۔ ترقی اَور
ہے وُہ بے روزگاری یا مزدور ۔۔۔ شعر سے مفلسی رہی کب دور
پہلے تھا قسمتوں پہ چرخ کا راج ۔۔۔ اب ہے معدن مصیبتوں کا سماج
شکوۂ دَورِ آسماں تھا جب ۔۔۔ گلہ سرمایہ دار کا ہے اب
لکھے جاتے تھے پہلے شہر آشوب ۔۔۔ اب سیاست کے سر پہ ہے زد و کوب
خلد ہی میں نہ کرتا شاعر رقص ۔۔۔ تھا نظر میں معاشرت کا نقص
کہیں بودی جو بات پاتا تھا ۔۔۔ منظرِ عام پر لے آتا تھا

ہو چکا ہے ادب میں استبداد ۔۔۔ مسترد لیکن اب ہیں وُہ ارشاد
اب بھی مانا ادب میں ہیں موجود ۔۔۔ شعر پر سخت شرطیں اَور قیود
کون ہے جس کو ہو نہ یہ تسلیم ۔۔۔ کیجے اس کی واجبی ترمیم
لیکن اس کا رہے لحاظ ضرور ۔۔۔ شعر کی اصل میں نہ آئے فتور
داخلیّت کہ خارجیّت ہو ۔۔۔ ہے تنوّع پسند انساں کو
حُسن کی بھی تمہیں ضرورت ہے ۔۔۔ عشق سے بھی تمہیں محبت ہے
ولولے۔ جوش۔ اَور یہ جذبات ۔۔۔ ہیں تحرّک سے مِل کے شرطِ حیات
دردِ دل اور ذکاوتِ احساس ۔۔۔ اِن کو بھی سمجھو شعریت کی اساس

خوب سرمایہ کی مذمّت ہو — اُور مزدُور کی حمایت ہو
غم نہیں میرِ نظم ہو جو کسان — شاعری کا ہے اس میں کیا نقصان
بات جو ہے وہ صرف ہے اتنی — ختم اسی پر نہ ہو سخن سنجی
ان کو جتنا بھی جی میں آئے بڑھاؤ — جانشیں زلف و خال کا نہ بناؤ
شعریت کا ہی قتل نہ ہو جائے — کہیں یہ شمع گل نہ ہو جائے
ہیں جو دنیا میں واقعی شاعر — اور فن کے نکات سے ماہر
پیالہ مٹی کا ایک دیں جو انھیں — جام جمشید وُہ اسے کر دیں
اُس کو بھدّے سے بھدّا دو موضوع — شاعر اس کو بنا دے بس مطبوع
نفسِ مضموں ہو مبتذل کہ وقیع — اس کو کر دیگا وہ بہت ہی رفیع
شعر کی تو بہت بلند ہے شان — شاعری کا وسیع ہے میدان
وُہ نہ ہو جائے تنگ اور محدود — ارتقا کی نہ راہیں ہوں مسدود
قید ہو شعر پر تو بس فن کی — اُور پھر جس کے جو خوشی من کی

ہم کو معلوم ہے۔ عزیزو۔ خوب — اب تخیل نیا ہے اور اسلوب
جب تخیل میں جدّت آئے گی — نئے الفاظ ساتھ لائے گی
روک ٹوک اس میں سخت ناواجب — آئیں۔ پر آئیں جدّتیں غالب
تھی محکِّ سخن پسند ثقات — تھی فصاحت بس ان کے منہ کی بات
جو وُہ بولیں فقط وہی ہے فصیح — اصل میں وہ غلط ہو یا ہو صحیح
رہی حاوی وبائے خاص پسند — عام پر در رہا سخن کا بند
کوئی اُٹھا جو ضامن اُور نظیر — تھے نگاہِ ادیب میں وہ حقیر
سُوقیت کا ملا انھیں تمغا — عامیانہ بنا کلام ان کا
غالب و مومن اور ناسخ سے — دو۔ کئی سو میں لطف اُٹھاتے تھے
اک صدی تک رہا یہ ان کا چلن — رہا خلقت پہ بند بابِ سخن

خاص کا خاتمہ یہ آیا دَور — ہو گیا ملک کا مذاق ہی اَور
اب کچھ اس طرح انقلاب آیا — جس نے پلٹی مذاق کی کایا
ہو گئی عام ملک میں تسلیم — ذوقِ عام اب ہوا ہے ذوقِ سلیم
نہیں شعر اب سیاسیات سے دور — ہے ادب میں بھی وقعتِ جمہور
اب سخن کا ہے اور ہی معیار — یاد رکھیں اسے ثقاتِ کبار
قابلِ داد اب ہے عام پسند — بیٹھے گردوں پہ جا کے فکرِ بلند
تھے مخاطب کبھی جو چند حضور — اب مخاطب ہے خلق اور جمہور
ہو گئے ایک خاص و عام و عوام — وُہ قدامت کا قصہ اب ہے تمام
اب ہے شاعر کا اور نصب العین — وہ وطن اَور ہے وطن کا چین

قوم پر آئے جب عبوری دَور — تو ہے اس کے لئے یہ قابلِ غور
نیست ہونے نہ پائے شے کوئی — کہ ضرورت ہو جانے کب اس کی
کام اصلاحی اور ہو تعمیری — انقلابی نہ ہو نہ تخریبی
انقلاب آنا ہے تو آئے گا — نہیں محتاج وُہ اجازت کا
آ گے دھر لے گا اپنے وُہ سب کو — اس سے بچ نکلیں یہ ہوا ہے نہ ہو
حال پر چاہیئے نظر سب کی — جب کی رہنے دو سوچو تم اب کی
حال ہی سے بنے گا مستقبل — دل میں سب کے یقیں یہ ہو کامل

زندگی پہلے تھی برائے ادب
زندگی کے لئے ادب ہے اب

کیفی

ماہیّتِ مادّہ

ابتدا میں سائنس نے کسی تنقید کے بغیر اصولِ تعلیل (Principle of Causation) کو قدرت کا اساسی اصول تسلیم کر لیا۔ اور اسی طرح دوسرے چند اصول دریافت ہوئے جنہیں یوں بیان کیا گیا ہے۔ کہ "ایک مخصوص علّت (الف) معلوم معلول (ب) پر منتج ہوگی" مثلاً برف کو اگر حرارت دی جائے تو یہ پگھل جاتی ہے۔ یا اگر بوضاحت بیان کیا جائے تو حرارت کائنات میں برف کی مقدار کو گھٹاتی ہے۔ اور پانی کی مقدار کو بڑھاتی ہے۔

ایامِ قدیم کے انسان کو اس قانون کا علم بآسانی ہو گیا ہوگا، جس کے لئے اسے محض کہر پر سورج کا اثر مشاہدہ کرنا تھا یا پہاڑوں کے برفانی تودوں پر موسمِ گرما کے اثرات کو دیکھنا تھا۔ موسمِ سرما میں وہ دیکھتا ہوگا کہ پانی پھر برف میں منتقل ہو جاتا ہے، بعد میں معلوم ہوا ہوگا کہ دوبارہ جمی ہوئی برف اور پگھلنے سے پیشتر کی اصل برف دونوں مقدار میں برابر ہیں۔ اِس صورت میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہوگا کہ پانی اور برف سے ماورا کوئی چیز ایسی ہے، جس کی مقدار اِن تغیّرات یعنی برف سے پانی اور پانی سے برف سے بالکل متاثر نہیں ہوتی۔

جدید طبیعیات اِس قسم کے عملیات سے خوب واقف ہے اور انہیں بقائی قوانین (Conservation Laws) سے موسوم کرتی ہے جس انکشاف کو ہم نے ایامِ قدیم کے انسان سے منسوب کیا ہے وہ قانونِ بقائے مادّہ کی ایک خاص شق ہے قانونِ بقائے لا کا مطلب یہ ہے کہ لا خواہ کچھ ہی ہو۔ اس کی کُلّی مقدار کائنات میں یکساں رہتی ہے اور کوئی عمل اِسے کسی ایسی حالت میں تبدیل نہیں کر سکتا جسے ہم لا نہیں کہہ سکتے۔ ایسے سب قوانین لازماً فرضی ہیں اور دراصل اِن کا مفہوم یہ ہے، کہ اب تک کوئی عمل نہیں کیا جا سکا جو لا کی کُلّی مقدار میں تغیّر و تبدل پیدا کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔ اور دراصل اگر کافی دفعہ کوشش کی گئی ہو اور ہر بار ناکامی ہوئی ہو تو ہم بقائے لا کے قانون کو بحیثیت ایک قابلِ عمل مفروضے کے پیش کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

گذشتہ صدی کے اختتام پر طبیعیات مندرجۂ ذیل تین بڑے بقائی قوانین کو تسلیم کرتی تھی۔

(۱) بقائے مادّہ (۲) بقائے کمیّت (۳) بقائے توانائی

دوسرے چھوٹے قوانین مثلاً خطّی یا زاویہ دار حرکت (Linear or Angular Momenta) کے قوانینِ بقا ہماری بحث میں داخل نہیں ہونے چاہئیں۔ کیونکہ یہ سب متذکرۂ بالا بڑے قوانین سے ماخوذ ہیں۔

ان تینوں میں سے بقائے مادّہ کا قانون قدیم ترین ہے، کیونکہ ڈیماکریٹس (Democritus) اور لکریٹیس (Lucretius) کا جوہری فلسفہ جس کے مطابق مادّے کے جوہر تخلیق، تغیّر اور تضیع سے بالا و برتر ہیں اِس قانون پر دلالت کرتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ کائنات کے کل مادّے کی مقدار ہمیشہ یکساں رہتی ہے، اور جب تک جوہروں کا دخل و خروج واقع نہ ہو کائنات کے ہر حصّے اور فضا کے ہر خطّے کا مادّہ بدستور قائم رہتا ہے

گویا کائنات تھیٹر کا سٹیج ہے جس میں جوہروں کے اداکار اپنا اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ اُن کی پوشش اور جماعت بندی میں فرق آجاتا ہے، مگر اُن کی انفرادیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور ان اداکاروں کو ابدی تسلیم کرلیا گیا۔

بقائے کمیّت کا قانون زمانۂ جدید کی پیداوار ہے، نیوٹن کا خیال تھا کہ ہر جسم یا جزدِ مادّہ سے ایک خاص مقدار متلازم ہے، جو اُس کی کمیّت کہلاتی ہے، یہ کمیّت اُس جسم کے جمود (momentum) یا اس کی حالتِ حرکت میں تبدیلی کرنے سے اعراض کی پیمائش کرتا ہے، اگر ایک موٹر کار کی رفتار کو دوسری موٹر کار کے برابر کرنے کے لئے دُگنی طاقت کا انجن درکار ہو تو ہم کہتے ہیں کہ پہلی کار کی کمیّت دوسری سے دُگنی ہے، قوتِ تجاذب کا دعویٰ ہے، کہ دو اجسام میں کشش اُن کی کمیّتوں کے بالکل متناسب ہوتی ہے، چنانچہ اگر دو اجسام پر زمین کی کشش یکساں ثابت ہو تو اُن کی کمیّتیں ضرور برابر ہوں گی۔ اِس لئے ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کسی جسم کی کمیّت کو ناپنے کا آسان ترین طریقہ اُس کا وزن کرلینا چاہئے۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ علم کیمیا نے ثابت کیا کہ چونکہ لکرٹیس کا جوہر ناقابل تقسیم نہیں ہے۔ اِس لئے اِسے یہ نام دینا درست نہیں چنانچہ اس کا نام سالمہ رکھا گیا۔ اور جوہر کا لفظ اُن اجزا کے لئے مخصوص کر دیا گیا جن میں سالمے کو منقسم کیا جا سکتا ہے۔ سالموں کے توڑنے اور جوہروں کو ترتیب دینے کے بے شمار طریق ہیں۔ اِس ترتیب کی ایک قسم محض اتصال ہے، جیسا کہ لوہے کے زنگ آلود ہونے یا دھات پر تیزاب ڈالنے کی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے یا سالموں کو جلانے۔ گرم کرنے دھماکے سے پھاڑنے یا شعاعِ نور کے وقوع (Incidence) سے توڑا جا سکتا ہے، اگر ہم ہائیڈروجن پرآکسائیڈ کی بوتل کو کسی روشن جگہ رکھیں تو روشنی کے محض گزرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہائیڈروجن پرآکسائیڈ کا ہر سالمہ پانی کے سالمے اور آکسیجن کے جوہر کی صورت اختیار کرے گا۔ جب ہم اِسی بوتل کا کارک اتاریں تو ہمیں ایک آواز سی سنائی دیتی ہے جو آکسیجن گیس کے اخراج سے پیدا ہوتی ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہائیڈروجن پرآکسائیڈ کا کچھ حصہ پانی بن گیا ہے، سلور برومائیڈ کے سالمے بھی روشنی کے وقوع سے غیر مترتب ہو جاتے ہیں۔ اور یہی تبدیلی فوٹوگرافی کا اصل اصول ہے۔

اٹھارھویں صدی ختم ہونے کو تھی کہ لاوئزیر نے (Lavoisier) بڑے وثوق سے دعوے کیا کہ مادّے کا کل وزن تمام معلوم کیمیاوی تبدیلیوں میں غیر متبدّل رہتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد بقائے کمیّت کا قانون سائنس کا ایک مصدقہ لازمی جزو بن گیا۔ ہم اب جانتے ہیں کہ یہ قانون کلّی طور پر درست نہیں۔ پرآکسائیڈ کی بوتل سے خارج شدہ آکسیجن اور باقی ماندہ مائع کے وزنوں کو اگر جمع کیا جائے تو یہ مجموعہ پرآکسائیڈ کے اصل وزن سے قدرے زیادہ ہوگا۔ اگر فوٹوگرافی کی پلیٹ کو روشنی میں رکھا جائے تو اِس کا وزن بھی بڑھ جاتا ہے، ہم بعد میں دیکھیں گے کہ اِس نادرستی کی وجہ یہ ہے، کہ متذکرہ قانون ہائیڈروجن پرآکسائیڈ یا سلور برومائیڈ کے سالموں کا روشنی سے اخذ کردہ وزن نظرانداز کر دیتا ہے۔

تیسرا اصول بقائے توانائی ہے جو جدید ترین ہے، توانائی بے شمار صورتیں اختیار کرلیتی ہے جن میں سے سادہ ترین توانائی حرکت ہے، مثلاً گاڑی کی ہموار پٹڑی پر یا بلیرڈ بال کی میز پر حرکت۔ نیوٹن نے اِس بات کی وضاحت کی تھی کہ خالص میکانیکل توانائی یکساں قائم رہتی ہے مثلاً جب دو بلیرڈ بال ٹکراتے ہیں تو ہر ایک کی توانائی میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، مگر مجموعی توانائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بیشک ایک بال دوسرے کو توانائی دیتا ہے، مگر اِس تبادلے میں توانائی میں کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوتی۔ تاہم یہ صورتِ حال جبھی ہو سکتی

وقت تھی، مگر عام حالات ہے جب دونوں کلیتہً ٹکرا رہوں جو ایک ایسی ذہنی حالت ہے، کہ اس میں دونوں بالوں کی مڑتے وقت وہ رفتار ہوگی جو ٹکراتے قدرت میں میکانیکل توانائی بلا استثناء ضائع شدہ معلوم ہوتی ہے، مثلاً جب گولی ہوا سے گذرتی ہے تو اس کی رفتار میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ اور اگر انجن کو بند کردیا جائے تو کچھ دیر کے بعد گاڑی ٹھہر جاتی ہے، ایسے تمام عملیات میں حرارت اور آواز پیدا ہوتی ہے، بڑی طویل تحقیقات کے بعد معلوم ہوا ہے، کہ خود حرارت اور آواز توانائی کی صورتیں ہیں۔

۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۰ء کے تاریخی سلسلۂ تجربات میں جول (Joule) نے حرارت کی توانائی کو ناپ لیا۔ اور وایولونچیلو نے اس کے سادہ سامان سے آواز کی توانائی کو بھی ناپنے کی کوشش کی۔ اگرچہ جول کے تجربات نامکمل تھے مگر نتیجہ یہ نکلا کہ بقائے توانائی کو ایسا اصول تسلیم کرلیا گیا جو توانائی کی مختلف صورتوں مثلاً حرارت۔ برقی طاقت اور آواز سب پر حاوی تھا۔ المختصر یہ واضح ہوگیا کہ توانائی ضائع نہیں ہوتی بلکہ مختلف صورتیں اختیار کرلیتی ہے، اور محرک اشیا میں جو توانائی واقع ہوئی تھی۔ وہ آواز اور حرارت کی بالکل مساوی توانائی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ گاڑی کی توانائی حرکت بھی شور میں اور بریکوں اور ریلوں کے گرمانے میں خرچ ہوگئی تھی۔

اُنیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں یہ تینوں بقائی قوانین بالائے شک وشبہ خیال کئے جاتے تھے۔ بقائے کمیت اور بقائے مادہ کے اصولوں میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی تھی کیونکہ کسی جسم کی کمیت اُس کے جوہروں کی کمیتوں کا مجموعہ سمجھی جاتی تھی۔ بلاشک یہ مفروضہ اس بات کی بآسانی تشریح کردیتا تھا کہ کیمیادی عملیات کلی کمیت کو کیوں تبدیل نہیں کرتے۔ لیکن جیسا کہ ہم اب جانتے ہیں یہ تشریح بہت بودی تھی مگر بقائے توانائی کا اصول جو تازہ دریافت ہوا تھا وہ اِن دونوں سے نامربوط تھا۔ یہ چیز قائم بالذات ہے۔ ابھی تک کائنات کو ایک سٹیج تصور کیا جاتا تھا جس کے اداکار جوہر تھے جو اپنی انفرادیت اور کمیت کو ہر وقت برقرار رکھتے تھے تکمیلِ تصویر کی خاطر ایک نئی ہستی توانائی فرض کی گئی جو کبھی ایک اداکار پر اور کبھی دوسرے پر عمل کرتی تھی۔ اور اداکاروں کی مانند ناقابلِ تضیع وتعمیر تھی۔

چاہئے تو یہ تھا کہ ان تینوں بقائی قوانین کو محض قابلِ قبول نظرئے سمجھا جاتا اور ان کا ہر طرح معائنہ کیا جاتا اور اگر کوئی نقص نکلتا تو انہیں چھوڑ دیا جاتا۔ مگر یہ قوانین یوں رائج ہوئے گویا یہ ایسے عالمگیر قوانین ہیں جن میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔ اُنیسویں صدی کے ماہرین طبیعیات ان قوانین کا اس طرز پر ذکر کرتے تھے گویا تمام کائنات اِن کے ماتحت مصروفِ عمل ہے، اور اس بنا پر بڑے بڑے فلسفی ماہیتِ کائنات کے متعلق فتوے صادر کرتے تھے۔

مگر یہ طوفان کے قبل ایک سکون تھا جس کی اوّلیں گرج سرجے۔ جے۔ ٹامسن کی ایک اصولی تفتیش تھی۔ جس سے ثابت ہوتا تھا کہ ایک برق لائے ہوئے جسم کی کمیت حرکت دینے سے تبدیل کی جاسکتی ہے، اور جس قدر یہ حرکت تیز ہوگی اُس قدر کمیت زیادہ ہوجائے گی۔ یہ نظریہ اس نظریے سے جس کے مطابق کمیت معیّن اور ناقابلِ تغیّر ہے بالکل متضاد تھا اور کچھ عرصے کے لئے یوں معلوم ہوتا تھا کہ بقائے کمیت کا اصول سائنس سے خارج ہوگیا ہے۔

ایک عرصے تک یہ نتیجہ محض علمی دلچسپی کا موجب بنا رہا جس کی وجہ یہ تھی کہ اسے عام مشاہدے سے پرکھا نہیں جاسکتا تھا۔ کیونکہ عام اجسام

کو نہ کافی حد تک بڑھایا جاسکتا تھا اور نہ ان کی حرکات ہی کو اتنا بڑھایا جاسکتا تھا کہ ہم اُس اضافہ کمیت کو دیکھ سکیں جو اِس نظریے کے مطابق واقع ہوگا مگر انیسویں صدی ختم ہونے کو تھی کہ سر جے۔ جے۔ ٹامسن اور اُن کے ہم خیالوں نے جوہر کو توڑنا شروع کیا۔ اب ثابت ہُوا کہ یہ جوہر بھی قابلِ تقسیم ہیں اور سالمے کی طرح جسے پہلے جوہر کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا انہیں یہ نام دینا غلطی ہے۔ مگر ان لوگوں کو صرف چھوٹے ٹکڑوں کو الگ کرنے میں کامیابی ہوئی تھی اور ہنوز جوہر کو اُس کے اصلی اجزا میں کلیۃً منتشر نہیں کیا جاسکا۔ یہ تمام ٹکڑے ایک دوسرے کے بالکل مشابہ تھے اور ان میں برقی طاقت پائی جاتی تھی اس لئے انہیں برقیوں کے نام سے موسوم کیا گیا۔

یہ برقیے عام اجسام کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ برقائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر ایک گرام سونے کو حتی الامکان پتلا کیا جائے اور اُس سے ایک گز مربع پترا بنا لیا جائے تو یہ بجلی کی ۶۰۰۰ برق ساکن اکائیاں (Electrostatic units of electricity) بشکل جذب کرسکتا ہے مگر ایک گرام برقیوں میں 9×10^{11} گنا زیادہ بجلی ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ برقی ذرائع سے برقیے کو ایک لاکھ میل فی سیکنڈ سے زیادہ رفتارِ حرکت دی جاسکتی ہے اِس مہیب رفتار اور برقی بھرتی کی موجودگی میں ہم اِس بات کی تصدیق کرسکتے ہیں کہ رفتارِ حرکت کے باعث برقیوں کی کمیت میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ تجربات سے ثابت ہُوا ہے کہ تغیرِ کمیت بالکل وہی ہے جس کی پیشین گوئی ٹامسن کے نظریے نے کی تھی۔

ہمیں رتھرفورڈ کی تحقیقات کا مشکور ہونا چاہئے کیونکہ اس کی وجہ سے اب یہ امر مسلّم خیال کیا جاتا ہے کہ ہر جوہر منفی بجلی کے برقیوں اور مثبت برقائے ہوئے ذروں سے جنہیں ہم پروٹون کہتے ہیں تعمیر شدہ ہے۔ مادہ بھی برقائے ہوئے ذرات کا ایک مجموعہ ثابت ہوگیا ہے اِس ایک انقلاب سے وُہ تمام علوم جن کا تعلق مادے کی ماہیت و خواص سے ہے علمِ برق کی شاخیں بن گئے ہیں۔ قبل ازیں فیراڈے اور میکسول نے ثابت کیا تھا کہ تمام اشعاع کی ماہیت برقی ہے اس لئے تمام علمِ طبیعیات اب علمِ برق میں مجتمع ہوگیا ہے۔

۱۹۰۵ء میں آئین سٹائن نے اِس نظریے کی بہت توسیع کردی۔ اُس نے ثابت کیا کہ توانائی حرکت کے علاوہ ہر قابلِ فہم توانائی کی بھی ذاتی کمیت ہونی چاہئے۔ اور اگر صورتِ حال یوں نہیں تو نظریۂ اضافیت درست نہیں ہے اِس طرح نظریۂ اضافیت کی ہر قابلِ مشاہدہ آزمائش اِس نظریے کی صداقت کی شہادت بن گئی کہ توانائی کمیت رکھتی ہے آئین سٹائن کی تحقیق سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہر قسم کی توانائی کی کمیت کا انحصار کلیۃً مقدارِ توانائی پر ہے اور کمیت مقدار کے بالکل متناسب ہوتی ہے۔ توانائی کی کمیت بہت ہی تھوڑی ہوتی ہے ماریٹینیا (Mareetania) کے جہاز کو اگر بوجھ سے بھر دیا جائے تو اُس کا وزن ۵۰۰۰۰ ٹن ہوگا۔ اور اگر یہ ۲۵ جہازی میل (Knot) کی رفتار سے حرکت کرے تو اس کے وزن میں اونس کے دس لاکھویں حصّے کا اضافہ ہوگا۔ ایک آدمی اپنی تمام عمر کے دستی کام میں جو توانائی خرچ کرتا ہے اُس کا وزن اونس کا سا ٹھ ہزارواں حصہ ہے۔

اس دریافت کی بنا پر یہ امکان پیدا ہوگیا کہ بقائے کمیت کے اصول کو دوبارہ تسلیم کرلیا جائے۔ کیونکہ کسی جسم کی کمیت اُس کی کمیتِ ساکن (Real-Mass) اور کمیتِ توانائی کے مجموعے کے برابر ہے اور چونکہ مقدارِ مادہ یکساں قائم رہتی ہے اس لئے اوّل الذکر غیر متبدل ہے ان دونوں وجوہ کی بنا پر کل کمیت کا یکساں قائم رہنا لازمی ہے۔ انیسویں صدی کے ماہرینِ طبیعیات کا خیال تھا کہ چونکہ مادہ غیر متبدل ہے اس لئے کمیت بھی غیر متبدل ہے۔ مگر بیسویں صدی میں دریافت ہُوا کہ اِس اصول میں بقائے توانائی بھی شامل ہے، اور اب یہ معلوم ہُوا ہے کہ بقائے کمیت کی وجہ یہ ہے، کہ مادہ اور

توانائی دونوں علیحدہ علیحدہ غیر متبدل ہیں۔

جب تک جوہروں کو دائمی اور لازوال یا بالفاظِ میکسول " کائنات کے غیر فانی سنگِ بنیاد" تسلیم کیا جاتا تھا جوہروں کو کائنات کے اساسی اجزا تصور کرنا قدرتی تھا۔ المختصر کائنات جوہروں کا مجموعہ تھی اور اشعاع بالکل ضمنی اہمیت رکھتی تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ جس طرح گھنٹی بجتی ہے اور اُس سے آواز پیدا ہوتی ہے اُسی طرح جوہر گاہ بگاہ جنبش میں آتا ہے، اور تھوڑے عرصے کے لئے اشعاع پیدا کرنے کے بعد سکون اختیار کر لیتا ہے اور اشعاع کو مادّے کا جزوِ اولی اُسی طرح نہیں سمجھا جاتا تھا جس طرح کہ آواز گھنٹو باجے (Carillon) کا جزوِ اولےٰ نہیں۔ اِس ضمن میں یہ بھی تشریح ہو گئی کہ سورج کا کروڑہا کروڑ سالوں تک عملِ اشعاع کے جاری رکھنے کا تصور کیوں ناممکن خیال کیا جاتا تھا۔

جونہی یہ دریافت ہُوا کہ جوہر برقائے ہوئے ذرّات کا مرکب ہے، حالات میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ کیونکہ برقیوں سے خواہ ہم کتنا ہی احتراز کریں ان کے جذب و دفع سے مخلصی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برقیے کسی نہ کسی طرز میں ساری فضا پر مستولی ہیں۔ میکسول اور فیریڈے نے اِس بات کی مزید وضاحت کی۔ اُنہوں نے برقائے ہوئے ذرّے کو آکٹوپس (مچھلی کا نام) کی مانند ایک مرکب تصور کیا جس کا ایک معین جسم ہوتا ہے جو اپنے گیریوں کو (tentacles) باہر پھیلا دیتا ہے، یہ گیریے۔ برقیے کے خطوطِ قوت (Lines of Force) ہیں جو ساری فضا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دو برقائے ہوئے ذرّات کے عملِ جذب و دفع کی یہ وجہ قرار دی گئی کہ کسی نہ کسی طریق سے دونوں کے گیریے، آپس میں مل کر ایک دوسرے کو کھینچنا یا دھکیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اِن گیریوں (خطوطِ قوت) کو اشعاع کی طرح برقی اور مقناطیسی قوتوں سے تعمیر شدہ فرض کیا گیا۔ اور جوہر کا اخراجِ اشعاع یوں متصوّر تھا کہ یہ خطوطِ قوت کو فضا میں چھوڑ دیتا ہے، اِس طرح شعاعوں اور مادّے کے نظریات میں وُہ رابطۂ اتحاد استوار ہُوا جو پہلے کبھی موجود نہ تھا۔

چونکہ ہر قسم کی شعاعیں توانائی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس لئے آئین شٹائن کے اصول کے مطابق ہر صورت مخصوص کمیّت رکھتی ہے، اور جب کوئی جوہر شعاعیں خارج کرتا ہے، تو اُس کی کمیّت خارج شدہ شعاعوں کی کمیّت کے برابر گھٹ جاتی ہے، چنانچہ جب کوئلے کو جلایا جاتا ہے، تو اِس کا وزن محض دھوئیں اور خاکستر میں تبدیل نہیں ہو جاتا بلکہ ان دونوں کے وزنوں میں ہمیں عملِ احتراق کے دوران میں پیدا شدہ حرارت اور روشنی کے اوزان کو بھی جمع کرنا چاہیئے اور صرف اِس صورت میں یہ مجموعۂ اوزان کوئلے کے اصل وزن کے برابر ہو گا۔

میکسول نے ۱۸۷۳ء میں ثابت کیا تھا کہ شعاعیں جس سطح پر پڑتی ہیں اُس پر دباؤ ڈالتی ہیں۔ جیسے ہم اب اِس حقیقت کا لازمی نتیجہ سمجھتے ہیں کہ شعاعیں کمیّت رکھتی ہیں، شعاعِ نور اس کمیّت پر مشتمل ہے جو روشنی کی رفتار یعنی ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ سے سفر کرتی ہے، بعد میں لیبیڈیو (Lebedew) نے شعاعوں کے اِس دباؤ کا مشاہدہ کیا اور پھر نکلز (Nichols) نے دریافت کیا کہ یہ مقدار میکسول کے تخمینے کے بالکل مطابق ہے۔ ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ درخشاں روشنی کی شعاعوں کے تصادم سے برف اپنی جگہ سے ویسے ہی ہل جاتی ہے، جیسے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی ہو۔ لیکن کرۂ ارض پر جس تصادم سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے وُہ بہت ہی قلیل ہے اس لئے ان عملیات کے پورے مشاہدہ کے لئے ہمیں کرۂ ارض اور ارضی عملوں سے پیدا شدہ طبیعیّات کو چھوڑ کر آسمان کی اُس وسیع طبیعیات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جس

عملیات کو ہم ستاروں کی مہیب کٹھالیوں میں مشاہدہ کرتے ہیں چھ انچ کی توپ کے گولے کو اکیس لاکھ درجہ حرارت تک گرم کیا جائے تو اس سے خارج شدہ شعاعوں کا تصادم آگ بجھانے والے انجن سے خارج شدہ پانی کی مانند اس قدر سخت ہوگا کہ پچاس میل تک کے اندر ہر انسان کو کچل دے گا۔ یہ درجہ حرارت عام ستاروں اور مرکز آفتاب میں پایا جاتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ستاروں کے اندرون میں شعاعوں کا دباؤ اس قدر زیادہ ہے، کہ ان کے وزن کا کافی حصہ یہی برداشت کرتا ہے۔

تخمینہ بتاتا ہے، کہ سورج کے عین نیچے ایک مربع میل زمین پر ہر منٹ میں اونس کا دس ہزارواں حصہ سورج کی روشنی پڑتی ہے، جو روشنی کی رفتار سے گرتی ہے اور جب اسے ساکن کیا جاتا ہے، تو زمین پر ۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ .... ضغطِ ہوا (atmospheric pressure) دباؤ پڑتا ہے، یہ اعداد و شمار اس قدر قلیل ہیں کہ ہنسی آتی ہے۔ سورج کی روشنی کا وزن جو ایک صدی میں زمین پر گرتا ہے۔ بارش کے اس وزن سے کم ہے، جو ایک خاصی گھٹا سیکنڈ کے پچاسویں حصے میں زمین پر برساتی ہے۔ اس مقدار کے حقیر معلوم ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ ایک میل مربع کھیت علم ہیئت کی فضا میں قطعی بے مایہ ہے۔ سورج کا کل اخراجِ شعاع پچیس کروڑ ٹن فی منٹ ہے۔ جو لندن برج کے نیچے بہنے والے پانی کی مقدار سے تقریباً دس ہزار گنا زیادہ ہے۔ اور اگر بالفرض یہ دس ہزار کا عدد غلط ہو تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم آفتابی شعاعوں کا صحیح وزن نہیں جانتے بلکہ یہ ہے۔ کہ دریائے ٹیمز کا اوسط بہاؤ ٹھیک معلوم نہیں ہے۔ ہیئاتی طبیعیات ارضی علم مائعات سے کہیں زیادہ درست ہے۔

سورج پر دوسرے ستاروں سے شعاعوں کا کچھ وزن پڑتا ہے، جو بمقابلہ خارج شدہ شعاعوں کے بالکل حقیر ہے۔ لہٰذا سورج اپنے وزن کو اُسی صورت میں برقرار رکھ سکتا ہے، جب کہ اس میں پچیس کروڑ ٹن مادّہ فی منٹ داخل ہوتا رہے،

اپنے فضائی سفر کے دوران میں سورج ہر وقت مزید مادّہ جمع کرتا رہتا ہے جو جوہر یا سلسلے یا گرد کے ذرّات یا شہابِ ثاقب کی صورت میں فضا میں بھٹکا پھرتا ہے، شہابِ ثاقب چھوٹے ٹھوس اجسام ہیں جو نظامِ شمسی میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ ستاروں کی طرح سورج کے گرد اپنے اپنے مداروں (orbits) میں گھومتے رہتے ہیں۔ بسا اوقات یہ ارضی کرۂ ہوا میں آنکلتے ہیں اور دُمدار ستاروں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بالعموم زمین پر پہنچنے سے قبل ہی یہ بخارات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں مگر کبھی کبھار کوئی اتنا جسیم شہابِ ثاقب بھی ہوتا ہے۔ کہ ہوائی رکاوٹ سے پیدا شدہ انتشار کے باوجود اس کا جسم قائم رہتا ہے۔ اور وہ پتھر کی صورت میں زمین پر گرتا ہے، جسے ہم میٹیورائٹ (Meteorite) کہتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا جسم بہت ہی بڑا ہوتا ہے۔ سائبیریا میں جو میٹیورائٹ ۱۹۰۸ء میں گرا تھا اس نے فضا میں اتنے بڑے شعلے پیدا کئے کہ جنگلات کا ایک بڑا رقبہ تباہ ہوگیا۔ اور اس کے تصادم سے پیدا شدہ جنبشِ ارضی نے وہ لہریں پیدا کیں جن کو ہزاروں میلوں تک محسوس کیا گیا خیال کیا جاتا ہے کہ آریزونا (Arizona) کے قریب تین میل محیط والا گڑھا بھی زمانۂ قدیم میں کسی اس سے بھی بڑے میٹیورائٹ کے گرنے سے بنا ہوا ہے، مگر ایسے بڑے شہابِ ثاقب خال خال پائے جاتے ہیں۔ بالعموم یہ چھوٹے چھوٹے دانوں سے بڑے نہیں ہوتے۔

شیپلے (Shapley) نے اندازہ لگایا ہے، کہ ارضی کرۂ ہوا میں ہر روز کروڑوں کروڑ شہابِ ثاقب داخل ہوتے ہیں۔ جو گرد یا بخارات میں تبدیل ہو کر کرۂ ارض کے وزن کو بڑھاتے رہتے ہیں۔ مگر اس تعداد سے کہیں زیادہ شہابِ ثاقب سورج میں ضرور گرتے ہوں گے اور اِس

کے جمع کردہ آوارہ مادّے میں کافی حصہ ان اربوں ارب شُہبِ ثاقبہ کا ہوگا۔ لیکن شیپلے کے اندازہ کے مطابق شُہبِ ثاقبہ کا کل وزن جو سورج میں گرتا ہے، دو ہزار ٹن فی سیکنڈ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ جو اُس وزن کا جو سورج شعاعوں کی صورت میں خارج کرتا ہے، دو ہزارواں حصہ ہے، سو یہ یقینی معلوم ہوتا ہے، کہ سورج کا وزن پچیس کروڑ ٹن فی منٹ کی مقدار سے کم ہو رہا ہے، اور اِس کی طرزِ تعمیر ہی زائل ہونے والی ہے، اور یہ آہستہ آہستہ ضائع ہو رہا ہے۔ سورج گلف سٹریم (Gulf Stream) کے ایک برفانی تودے کی طرح پگھل رہا ہے، اور دوسرے ستاروں کے حالات کو بھی ضرور ایسا ہی ہونا چاہئے۔

بنتیجہ علمِ ہیئت کے عام حقائق کے مطابق ہے، اگرچہ کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے، کہ کم عمر والے ستارے بڑی عمر والے ستاروں سے زیادہ بوجھل ہیں۔ اور اُن کی گرانی محض چند لاکھ ٹن ہی زیادہ نہیں بلکہ دس، پچاس اور سو گنا زیادہ ہے۔ اسی کی سادہ سی تشریح یہ ہے کہ ستارے عرصۂ زندگی میں اپنے وزن کا بڑا حصہ تلف کر دیتے ہیں۔ اب اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ سورج جو پچیس کروڑ ٹن وزن فی منٹ تلف کرتا ہے، کروڑوں کروڑ سالوں میں اِس قدر وزن ضائع کرے گا کہ اُسے محسوس کیا جا سکے گا۔ اور چونکہ دوسرے ستاروں میں بھی یہی صورتِ حال ہے، اس لئے ہمیں ستاروں کی زندگیوں کو کروڑوں کروڑ سال تصور کرنا پڑتا ہے،

ہم دیگر ذرائع سے بھی حیاتِ نجوم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ فضا میں ستاروں کی حرکت بالخصوص اُن کی قدامتِ عمر کو واضح طور پر ظاہر کرتی ہے، اور یہ حرکت بھی اِن کی عمر کو کروڑوں کروڑ سال بتاتی ہے۔ ہم مشاہدہ کر چکے ہیں کہ ستارے ایک دوسرے سے کس قدر دور ہیں۔ اتنی دور کہ دو ستاروں کا ایک دوسرے کے قریب آنا بہت ہی نادر واقعہ ہے، لیکن اگر ستاروں نے کروڑوں کروڑ سالوں کی طویل عمریں گزار دی ہیں تو چاہئے تھا کہ ہر ایک ستارہ کئی بار دوسرے ستاروں کے بہت قریب گیا ہوتا۔ اِن مواقع پر ستاروں کا ایک دوسرے پر عملِ تجاذب اتنا قوی نہیں ہو سکتا کہ سیاروں کا وجود عمل میں آئے۔ مگر اغلب ہے کہ اِس اثر کے ماتحت ستارے اپنا اپنا رستہ چھوڑ دیں اور اُن کی رفتار میں بھی فرق آجائے۔ مگر ثنویہ نجوم (Binary stars) کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ کسی قریبی ستارے کی قوتِ تجاذب اِن دونوں ستاروں کے مداروں کی ترتیب کو بدل ڈالے۔ ثنویہ نجوم دو مختلف اجسام پر مشتمل ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ اِس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ اُن کی رفتار و حرکت ایک ستارے کی مانند معلوم ہوتی ہے!

ان تمام اثرات کا بالتفصیل جائزہ لیا جا سکتا ہے، اِس لئے ہم کُلّی طور پر جانتے ہیں کہ اگر ستاروں کی کروڑوں کروڑ سالوں کی مفروضہ عمر واقعی درست ہے تو اِس صورت میں ہمیں کس کس چیز کی توقع رکھنی چاہئے۔ اور ہم ہر متوقع چیز کو دریافت کر رہے ہیں۔ تمام اندازہ کردہ اثرات موجود ہیں اور جہاں تک ہم جانتے ہیں یہ اثرات اِس قدر بڑے ہیں کہ ستاروں کا کروڑوں کروڑ سالوں کی زندگیاں بسر کر چکنا یقینی ہے۔

اسلم صدیقی

سنجوگ

پُروا کے جھونکے مل کر جب دو شاخوں کو سمجھاتے ہیں
پتے جھلمل جھلمل کر کے آپس میں مل جاتے ہیں
پنچھی، پنکھ پکھیرو، اُڑ کر گیت ملاپ کے گاتے ہیں
ہاں! گاتے ہیں ــــــــــ

پیڑوں کی فطری خاموشی
جُھوم جُھوم کر گاتی ہے
پُروا، چنچل، اچپل پُروا
مڑ مڑ کر رہ جاتی ہے
شوخی سے اٹھلاتی ہے

اور کسی ڈالی پر پنچھی پریم سے پر پھیلاتے ہیں
پتے جھلمل جھلمل کر کے آپس میں مل جاتے ہیں
رات کی رادھا چاند کی گاگر لے کے جمن پر آتی ہے۔
بہتی دھارا سر کو جُھکا کر یادوں میں کھو جاتی ہے۔
چاند کی گاگر پانی میں یوں اپنے عکس کو پاتی ہے۔
ترپاتی ہے ــــــــــ

جیسے اک ناری کے دل میں
یاد کسی کی آتی ہو
اور وُہ جس کی یاد آتی ہے
آئے، تو پھر شرماتی ہو

سوچ ہی میں کھو جاتی ہو

میٹھا سپنا بن کر رادھا جل بھرنے جب آتی ہے
بہتی دھارا سر کو جھکا کر یادوں میں کھو جاتی ہے
گیت ہوا کی لہروں پر جب تیر کے گم ہو جاتے ہیں۔
گونج ہی باقی رہ جاتی ہے وُہ خود تو کھو جاتے ہیں
جاتے جاتے لیکن اتنا کہتے ہیں "ہم تو جاتے ہیں"

"ہم جاتے ہیں"

یونہی ڈالی کے پنچھی بھی
گاتے ہیں اور ملتے ہیں
پتے جھلمل جھلمل کر کے
ملتے ہیں اور ہلتے ہیں۔

شاخوں کے گریباں سلتے ہیں

پریم کے ہاتھوں مل کر جب دو تن من اک ہو جاتے ہیں
گونج ہی باقی رہ جاتی ہے وُہ خود تو کھو جاتے ہیں

یوسف ظفر بی۔اے

اِکنّی

"اسے رکھ لو۔ انکار نہ کرو۔ بظاہر یہ اِکنّی ہے۔ مگر اِس کی قیمت سچ مچ اِس سے کہیں زیادہ ہے۔ بس رکھ لو اِسے۔ میرے پاس لے دے کر صرف یہی اِکنّی ہے، اگو یہ تمہاری مزدوری نہیں چکا سکتی ....."

یہ کہتے ہوئے میں نے راموموچی کی ہتھیلی پر اِکنّی رکھ دی۔ پورا آدھ گھنٹہ لگا کر اُس نے میرے بُوٹ کی مُرمّت کی تھی۔ مزدوری کی بات اُس نے میرے انصاف پر چھوڑ دی تھی۔ اِکنّی جیب میں ڈالتے ہوئے اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر شاید جیب میں اُسے مسلنے لگا،

اُسے کیا معلوم تھا کہ اِس اِکنّی سے میری ایک داستان وابستہ ہے —

مجھے دہلی سے کنڈلیشور جانا تھا۔ للت پور تک ریل کا سفر تھا۔ آگے لاری جاتی تھی۔ کئی روز تو اِسی شش و پنج میں گزر گئے کہ آج روپیہ ملے کل ملے۔

دہلی میں اخبار نویسوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ میرا ایک دوست جو کنڈلیشور سے شائع ہونے والے "مدھوکر" میں کام کرتا تھا اِس سلسلہ میں دہلی آیا۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے بہت مجبور کیا۔ میں نے کام کا بہانہ کر کے بات ٹال دی۔ وُہ مان گیا۔ مگر لگے ہاتھوں مجھے بتا تا گیا کہ للت پور تک پانچ روپیہ کا ٹکٹ لگتا ہے اور آگے کل پندرہ آنے موٹر کے لئے کافی ہیں۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ میں کنڈلیشور کی تیاری نہ کر سکا۔ روپیہ کا انتظار تھا۔ سُسرا روپیہ بھی کبھی کبھی بہت ترساتا ہے اور گو میرے سفر کے حالات روپیہ کی تنگی سے بھرے پڑے ہیں، دہلی کی وُہ تنگی مجھے ہمیشہ یاد رہیگی۔

جس دِن میں دہلی پہنچا تھا میرے پاس کل چند آنے پیسے موجود تھے وُہ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں پر خرچ ہو گئے۔ جہاں سے روپیہ ملنا تھا نہ ملا مگر مَیں نے اپنے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نہ پیدا ہونے دئے۔

نئی دہلی سے، جہاں میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہُوا تھا، میں اکثر پیدل ہی شہر پہنچتا اور پھر پیدل ہی اپنی اقامت گاہ کو لوٹتا۔ بہر صورت مجھے لوٹنے میں دیر ہو جاتی۔ میرا دوست ہنس کر اِس کی وجہ دریافت کرتا۔ میں ہنس کر بات آئی گئی کر دیتا۔ کیسے کہتا کہ میری جیب خالی پڑی ہے۔

خالی جیب کی مجھے کوئی خاص چِنتا کبھی کبھار ہی ہوتی ہے۔ اب یہ اِکنّی اِس موچی کو دے کر میری جیب خالی ہو گئی ہے تو کیا حرج ہے؟ میں خوش ہوں!

ایک دن دِلّی میں میری ایک دوست کے ہاں رات کو دعوت تھی۔ وہاں سے فارغ ہوتے ہوتے دس بج گئے۔ اب واپس نئی دہلی لوٹنا تھا۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔ حوصلہ ہارنا میں نے سیکھا ہی نہیں۔

پاس سے ایک تانگہ گزرا۔ میں نے آواز دی۔ "تانگہ"

تانگہ رُک گیا۔ ایک سواری پہلے بیٹھی تھی۔

تانگے والا بولا۔ "کدھر جاؤ گے؟"

"جدھر بھی لے چلو"

"خوب۔ جدھر بھی لے چلُوں! .... کدھر لے چلوں؟ —

میں تو نئی دلّی میں بارہ کھمبا جا رہا ہوں۔"

"مجھے بھی وہیں لے چلو۔"

"تین آنے پیسے ہوں گے۔ رات بہت چلی گئی ہے۔ دوسرا تانگہ نہیں ملنے کا!"

"مگر بھائی میرے پاس تو پیسے ہیں نہیں۔"

"پیسے ہیں نہیں! اجی صاحب یوں مذاق نہ کرو۔ یہ ٹھیک نہیں۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ میرے پاس سچ مچ پیسے نہیں ہیں۔"

تانگے والا کوئی بھلا آدمی تھا۔ اُسے رحم آگیا۔ بولا "اچھا تو بیٹھ جاؤ۔ تمہارے تین آنے میں خدا سے مانگ لوں گا۔"

"بہت ٹھیک۔"

تانگہ چلا جا رہا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ جب خُدا نے خود مجھے ہی تین آنے نہیں دئے تو اِس تانگے والے کو وُہ میرے حساب میں کیسے تین آنے دے دیگا؟ میرے دِل میں کئی طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہے۔ خُدا کیا بلا ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خُدا کا خیال صرف ایک وہم ہے..... کیا یہ سچ مچ ایک وہم ہے؟...... کیا میں خدا پر اتنا ہی یقین رکھتا ہوں جتنا یہ غریب تانگے والا؟ اگر نہیں تو میں نے کیسے مان لیا کہ وُہ ضرور میرے حساب میں خُدا سے تین آنے وصول کر سکے گا؟........ اُس وقت مجھے وہ واقعہ بھی یاد آیا جب میں نے ایک سوال کے جواب میں اپنے ایک ادیب دوست کو بتلایا تھا کہ اگر خُدا نہ بھی ہو تو صرف اپنی پناہ کیلئے ہمیں ایک خُدا فرض ضرور کر لینا چاہئے۔ پھر میں نے سوچا کہ اِس تانگے والے نے ضرور مجھے کوئی سادھو سمجھ لیا ہے۔ سر کے لمبے بالوں اور داڑھی کو دیکھ کر اکثر لوگوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے اور اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ سچ مچ کے خُدا پر اعتقاد رکھنے کی بجائے میں صرف ایک فرضی خُدا کو مانتا ہوں تو وُہ جھٹ مجھے اپنے تانگے سے اُتار باہر کرے۔

ساتھ والا مسافر بولا "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "دیہاتی گیت جمع کیا کرتا ہوں۔"

"کسی کمپنی کی طرف سے؟"

"نہیں صاحب! یہ میرا ذاتی شوق ہے۔"

"ذاتی شوق ہے؟...... خُوب!...... مگر صاحب، یہ دنیا ہے روپیہ کمانے کے ہی تو سب دھندے ہیں۔"

"مگر صاحب میں یہ کام صرف روپیہ کمانے ہی کے لئے نہیں کر رہا ہوں"

"گھر سے امیر ہو گے۔"

"گھر سے میں روپے نہیں لیتا۔"

"تو روٹی اور سفر کا خرچ کیسے چلاتے ہو؟"

"رسالوں اور اخباروں میں مضامین لکھ کر تھوڑے سے پیسے پیدا کر لیتا ہوں۔ اور میں سچ کہتا ہوں کہ اگر یہ پیسے ملنے بند بھی ہو جائیں تو بھی میں یہ کام چھوڑوں گا نہیں۔"

"آپ ضرور کوئی سادھو ہیں"

"نہیں، صاحب، میں تو ایک گرہستی ہوں۔ میری بیوی اور بیٹی، جو اکثر سفر میں میرے ہمراہ رہتی ہیں، ان دنوں گھر پر گئی ہوئی ہیں۔"

"خوب"

"خوب ہو یا نہ ہو۔ کچھ کہہ لیجئے۔ اِس وقت تو میں مُفت میں تانگے کی سواری کر رہا ہوں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں بھی اس تانگے والے کی طرح ایک مزدور ہوں۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ وہ نقد مزدوری پاتا ہے اور اِس غریب مضمون نویس کو کبھی کبھی اخبار یا رسالے والے ٹالتے چلے جاتے ہیں....... ورنہ، صاحب، آج یہ نو[illegible]کیں مفت میں تانگے کی سواری مانگوں اور یہ تو اِس آدمی کا خلوص دِلی

ہے کہ اُس نے میرے حساب کے تین آنے خدا سے لینے کی بات کہہ کر مجھے احسان کے بار سے بھی آزاد کر دیا ہے۔

سڑک پر بجلی کی روشنی تھی۔ اور اِس کے مقابلے میں غریب تانگے والے کا لیمپ بہت مدھم معلوم ہو رہا تھا!

تانگے والا ہماری باتیں بڑے مزے سے سن رہا تھا۔ اُسے خوش کرنے کے لئے میں نے کہا "صاحب، میں تو سمجھتا ہوں تانگے والوں کی کمائی خون پسینے کی کمائی ہے۔ اگر کبھی پھر اِس دنیا میں مجھے آدمی کی جون جنم ملے تو میں تو چاہتا ہوں کہ میں کسی تانگے والے کے گھر جنم لوں۔"

تانگے والا بولا "یہ نہ کہو جی۔ ہم تو دن میں سو جھوٹ بولتے ہیں۔ اور مَیں تو چاہتا ہوں آپ کو نجات ملے۔ پیدا ہونا اور مر جانا —— یہ تو بہت سخت امتحان ہے جی!"

دہلی میں وہ دو ہفتے میں نے بڑی جدّوجہد کے ساتھ گزارے۔ کھانے کی کوئی تکلیف نہ تھی مگر کئی کئی میل پیدل چلنا اور وہ بھی اپنا بھاری بیگ اُٹھائے ہوئے، کچھ آسان کام نہ تھا۔ دوستوں سے ملنا اور گیتوں کی تلاش میں مناسب مقامات پر پہنچنا تو ضروری تھا۔

کنڈلیشور سے خط آیا۔ لکھا تھا۔ فوراً چلے آؤ۔ یہ چوبے جی کا خط تھا۔ اب وہاں جانا اور بھی ضروری ہو گیا۔

اپنے میزبان سے میں نے سات روپے ادھار گئے۔ پانچ روپے پندرہ آنے کرایہ کے لئے اور ایک روپیہ اور ایک اکنّی اوپر کے خرچ کیلئے..... آٹھ آنے تو سٹیشن تک تانگے والے کو دینے پڑے۔ باقی بچے ساڑھے چھ روپے۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر پہنچا تو پتہ چلا کہ للت پور تک پانچ روپے کا نہیں بلکہ پانچ روپے گیارہ آنے کا ٹکٹ لگے گا۔ یہ بھی خوب رہی۔ تو کیا اُس کنڈلیشور والے دوست نے مذاق کیا تھا؟...... اپنی کمزور یادداشت پر میں بہت جھلّایا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا میں نے للت پور کا ٹکٹ لیا۔ اور قلی سے اسباب اُٹھوا کر گاڑی میں جا بیٹھا ایک اِکنّی قلی کو دی۔

اب جو باقی بچی نقدی گنی تو کل ساڑھے دس آنے نکلے۔ اب یاد آیا کہ ڈیڑھ آنہ دن میں تانگے پر خرچ ہو گیا تھا۔ ساڑھے دس آنے.......

کل ساڑھے دس آنے! دل میں کئی اُتار چڑھاؤ پیدا ہوئے پھر کسی طرح غم غلط کیا۔ للت پور تو پہنچوں۔ دیکھا جائے گا۔

رات بھر ریل گاڑی کا سفر رہا نیند نہ آئی۔ اگلی صبح للت پور آگیا۔ قلی سامان باہر لے آیا۔ پتہ چلا کہ لاری کے اڈے تک تانگے والے کو ایک دونّی دینا ہوگی۔ میری جیب میں کل ساڑھے دس آنے تھے۔ بڑی مشکل سے قلی کو دو پیسے میں بھگتایا۔ اور تانگے والا ایک اِکنّی پر مان گیا۔

تانگہ چلا جا رہا تھا۔

ساتھ کی سیٹ والے نوجوان کی طرف مخاطب ہو کر میں نے پوچھا "کیوں بھائی کنڈلیشور کا یہاں سے کیا لگے گا؟"

یہ سوال میں نے اِس لہجے میں کیا تھا کہ اُسے یہی محسوس ہو کہ میں اِس سلسلے میں بالکل اجنبی ہوں۔

وُہ بولا "صرف پندرہ آنے۔"

"پندرہ آنے!...... مگر بھائی میری جیب میں تو صرف دس آنے رہ گئے ہیں اور اِن میں سے ایک اِکنّی اِس تانگے والے کی ہو چکی سمجھئے۔ اور میرے پاس رہ گئے صرف نو آنے......."

"نو آنے!...... تو باقی چھ آنے کہاں سے پاؤ گے؟"

"یہی تو فکر ہے۔ کوئی سبیل ہو تو بتاؤ۔"

"اب یہ مَیں کیا جانوں، بھائی؟ میں تو ابھی ودیارتھی ہوں۔ سچ جانو میرے پاس ہوتے تو میں ٹکٹ لے دیتا....... اور مشکل تو یہ ہے کہ میں راستے سے پڑھنے آتا ہوں یہ کوئی مجھے اُدھار دے گا نہیں نا"

میں چُپ ہوگیا۔ اَور سچ مانو، میں یہاں پہنچ کر یوں ایکا ایکی چپ ہو جانے ہی کی وجہ سے اُس ودیارتھی پر اثر ڈال سکا۔

وُہ بھی چند منٹ تک خاموش بیٹھا رہا۔ تانگہ چلا جا رہا تھا۔ اَور میں نے تانگے والے کو مخاطب کر کے کہا "ارے بھئی اگر تم اپنی اِکنّی مجھ سے نہ لو تو میری مشکل گھٹ کر چھ آنے کی بجائے پانچ ہی آنے کی رہ جاتی ہے"۔

وُہ بولا "نا صاحب میں اپنی اِکنّی ضرور لوں گا۔ یوں اِکنّیاں چھوڑنے لگوں تو میرا گھوڑا بھوکا مر جائے۔ اَور گھر جانے پر بیوی کی گالیاں الگ کھاؤں"۔

اُسے یہ شک گزرا کہ میں اڈّے پر پہنچ کر اِکنّی دینے سے انکار نہ کر بیٹھوں۔ اُس نے تانگہ روک لیا۔ بولا "اڈّہ اب دور نہیں۔ اِکنّی نکالئے"۔ میں نے اِکنّی اس کی ہتھیلی پر رکھی۔ تب کہیں وُہ آگے چلا۔

وُہ ودیارتھی پوچھنے لگا "کام کیا کرتے ہو؟"

"ہر زبان کے دیہاتی گیت جمع کیا کرتا ہوں"۔

"ٹھیک ٹھیک۔ 'وشومتر' میں میں نے گیتوں پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ آپ ہی کا ہوگا"۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کام بنتا دیکھ کر میں نے اُسے بگاڑنا مناسب نہ سمجھا، ورنہ کوئی اور موقع ہوتا تو میں پوچھتا کہ کس ماہ کے 'وشومتر' کی بات ہے اَور مضمون کا کیا عنوان تھا۔

وُہ بولا "آپ کا نام؟"

مَیں نے اپنا نام بتایا۔ اَور وُہ بولا "وہ مضمون میں نے بڑے شوق سے پڑھا تھا۔ ضرور وُہ آپ ہی کا لکھا ہُوا ہوگا ...... یہ بہت بڑا کام ہے صاحب!"

اِس تعریف نے مجھے اَور بھی شرمندہ کر دیا۔ یہ بہت بڑا کام ہے! ...... اگر یہ کام بڑا ہے تو میری مالی حالت اتنی خراب کیوں ہے؟ ..... لاری کا ٹکٹ لگے گا پندرہ آنے کا اور میرے پاس ہیں صرف نَو آنے۔

وُہ بولا۔ "آپ اب فکر نہ کریں۔ میں آپ کا بندوبست اپنے ذمّے لیتا ہوں۔ آپ کسی سے مت کہیں کہ آپ کے پاس پیسے کم ہیں۔ آپ لاری پر سوار ہو جائیے۔ ابھی لاری دو گھنٹے بعد چلے گی۔ اتنے میں مَیں دیکھ لوں گا۔

اڈّے پر پہنچ کر اُس نے مجھے آرام سے لاری میں بٹھا دیا۔ اَور وہ خود ٹکٹ کنڈکٹر سے جا کر مِلا۔ کون جانے اُس نے اُس سے کیا کیا سچی جھوٹی باتیں کی ہونگی۔ میں تو اتنا ہی مانتا ہوں کہ وہ اُسے لئے ہوئے میرے پاس آیا اَور بولا "وہ نَو آنے اِن کو دے دیجئے۔ یہ آپ کو کنڈلیشور کا ٹکٹ دے دیتے ہیں"۔

میں نے بٹوا کھولا۔ نَو کے نَو آنے میں نے بڑے غور سے دیکھے۔ مگر باہر صرف آٹھ آنے نکالے۔ انہیں اُسے دیتے ہوئے میں نے کہا "آپ اجازت دیں تو ایک اِکنّی میں رکھ لیتا ہوں۔ کنڈلیشور میں ضرورت پڑے گی۔ سڑک سے چوبے جی کے مکان تک اسباب لے جانے والے قلی کو دے دونگا۔ وہاں پہنچتے ہی اُن پر یہ تو ظاہر کئے سے رہا کہ میری جیب میں ایک اِکنّی تک نہیں ہے"۔

"ہاں ہاں، اِکنّی آپ شوق سے رکھئے"۔

وہاں کنڈلیشور میں پہنچا تو سڑک پر چوبے جی کا ایک دوست موجود تھا۔ اُس نے میرا اسباب پہنچانے کا بندوبست کر دیا۔

وُہ اِکنّی میرے پاس بچ رہی۔ اِسے میں نے احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ جب کبھی چوبے جی کو گلوری کی ضرورت ہوتی میں فوراً جیب سے اِکنّی نکال کر دکھاتا اَور کہتا ــ پیسے میں دونگا۔ چوبے جی نہیں نہیں کہتے ہوئے اسے واپس کر دیتے۔

اور جب میں نے رامو سے بوٹ مرمت کرانے کے بعد اُسے یہ اِکنّی دیتے ہوئے کہا "اِسے رکھ لو۔ انکار نہ کرو۔ بظاہر یہ اِکنّی ہے۔ مگر اِس کی قیمت سچ مچ اس سے کہیں زیادہ ہے" میری آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ میں نے دیکھا کہ رامو کی آنکھیں بھی نمناک ہوگئی تھیں ...... اُسے سارے دن میں اُس اِکنّی کے سوا اور کچھ نہ ملا تھا اُس نے سوچا ہوگا کہ اُس نے ایک انتر جامی سادھو کا بوٹ مرمت کیا ہے ورنہ وہ کیسے جانتا ہے کہ گھر میں اُسکی بھوکی بیوی اور بچے اِسی اِکنّی کی راہ تک رہے ہیں۔

دیوندر ستیارتھی

عشقِ خود اعتماد

کوئی قدرِ مذاقِ بے وفائی کر نہیں سکتا
کوئی نا آشنا سے آشنائی کر نہیں سکتا

اگر واقع میں اب تم سوئے خبطِ جور مائل ہو
تو میں اس خبط کی ہمّت فزائی کر نہیں سکتا
اگر واقع میں اب تم جبر کی منطق کے قائل ہو
تو میں اس جہل کی مدحت سرائی کر نہیں سکتا

اگر یہ سچ ہے تم نازانِ کارِ بے وفائی ہو
تو یہ بالکل غلط ہے میں بے وفائی کر نہیں سکتا
اگر یہ سچ ہے، تم آمادۂ بے اعتنائی ہو
تو پھر یہ جھوٹ ہے میں بے اعتنائی کر نہیں سکتا

اگر تم قصدِ کارِ کج ادائی کرنے والے ہو
تو کیا میں عزمِ کارِ کج ادائی کر نہیں سکتا
اگر تم مجھ سے جی بھر کر رکھائی کرنے والے ہو
تو کیا میں تم سے کچھ بڑھ کر رکھائی کر نہیں سکتا

اگر تم عازمِ نا آشنائی ہونے والے ہو
تو کیا میں تم سے ترکِ آشنائی کر نہیں سکتا
اگر تم ساعئ باہم جدائی ہونے والے ہو
تو کیا میں سبقتِ باہم جدائی کر نہیں سکتا

اگر تم پیکرِ جنگ آزمائی بن کے آئے ہو
تو کیا میں ہمّتِ جنگ آزمائی کر نہیں سکتا
اگر تم دشمنِ صلح و صفائی بن کے آئے ہو
تو کیا میں نفیٔ ہر صلح و صفائی کر نہیں سکتا

اگر اب تم ڈِھٹائی ہی کی مجھ سے ٹھان بیٹھے ہو — تو میں کیوں چپ رہوں کیا میں ڈھٹائی کر نہیں سکتا
اگر اب تم لڑائی ہی کی مجھ سے ٹھان بیٹھے ہو — تو میں کیوں طرح دوں، کیا میں لڑائی کر نہیں سکتا

میں اصنامِ حسیں کے ناز اُٹھانے کو تو حاضر ہوں — پر[1] اُن کی چوکھٹوں پر جبہہ سائی کر نہیں سکتا
میں اہلِ حسن کی قیمت بڑھانے کو تو حاضر ہوں — پر[1] اُن کے وصل کی خاطر گدائی کر نہیں سکتا

اگر میں فرض کر لوں، قیدو بندِ غم مقدر ہے — تو کیا میں کوئی تدبیرِ رہائی کر نہیں سکتا
اگر میں مان لوں، میرا مقدر نارسا تر ہے — تو کیا میں کچھ علاجِ نارسائی کر نہیں سکتا

اگر کوئی مرا مشکل کُشا بننے سے منکر ہے — تو کیا میں اپنی خود مشکل کشائی کر نہیں سکتا
اگر کوئی مرا حاجت روا بننے سے قاصر ہے — تو کیا میں اپنی خود حاجت روائی کر نہیں سکتا

مری ہمّت مجھے خود ناخدا بننا سکھا دے گی — بلا سے، کوئی میری ناخدائی کر نہیں سکتا
مری منزل مجھے خود ڈھونڈ کر اپنا پتا دے گی — بلا سے، کوئی میری رہ نمائی کر نہیں سکتا

جہاں آزاد! اب میرا نیازِ عشق غائر ہے
وہاں کوئی غرورِ دلربائی کر نہیں سکتا

حکیم آزاد انصاری

---

[1] میں لفظ "پر" بمعنی لیکن اور مگر وغیرہ کو قابلِ ترک نہیں سمجھتا۔ آزاد انصاری

مولوی صاحب کی چھتری

مولوی صاحب کے گھوڑے کا ذکر آپ مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کی پہلی کتاب میں پڑھ آئے ہیں۔ اب ان کی چھتری کا ذکر بھی سن لیجئے:۔

دنیا میں دو چھتریاں مشہور ہیں۔ ایک مسٹر چیمبرلین[1] کی اور دوسری ہمارے مولوی صاحب کی۔ مسٹر چیمبرلین کی چھتری کو سیاسیات سے تعلق ہے اور ہمارے مولوی صاحب کی چھتری کو مذہبیات اور معاشیات سے۔ میونخ کا معاہدہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا اگر مسٹر چیمبرلین کی چھتری ان کے ہمراہ ایک طیارہ میں پرواز کر کے میونخ نہ پہنچتی اور ہماری نمازِ جمعہ بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اگر کسی دن مولوی صاحب کی چھتری کو ان سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ مسٹر چیمبرلین کی چھتری نے بڑے بڑے شاطرانِ سیاست کے چھکے چھڑا دیئے اور مولوی صاحب کی چھتری نے سکول کے تمام اساتذہ و طلبہ کو لرزہ براندام کر رکھا ہے۔ جہاں ان کی چھتری دکھائی دی بس سمجھو مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ پھر کیا ہے۔ زید کو خبیث، بکر کو منافق اور عمرو کو فاسق و فاجر کی گردانیں سننا پڑیں۔ ہٹلر نے پیراشوٹ، کا خیال مسٹر چیمبرلین کی چھتری ہی سے چرایا ہے اور ہمارے مولوی صاحب کی چھتری۔ سبحان اللہ اس کی نقالی تو آسمان نے بھی کی ہے جو چھتری بن کر رہ گیا۔

چھتری تو ہر شخص کے پاس ہو سکتی ہے مگر اس کا صحیح استعمال۔ یہ صرف خداداد قابلیت پر منحصر ہے اور ظاہر ہے کہ ہمارے مولوی صاحب کو اس قابلیت سے حصۂ وافر ملا ہے جس طرح ہمارے مولوی صاحب ہر فن مولا ہیں اسی طرح ان کی چھتری سے بھی ہر ایک کام لیا جا سکتا ہے۔ ہمارے مولوی صاحب ہر چیز سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بچاری چھتری اور ایک ہزار ایک کام۔

مولوی صاحب کی وفادار چھتری ان کو اگر موسمِ گرما میں دھوپ سے بچاتی ہے تو موسمِ سرما میں کمبل کا کام بھی چھتری ہی سے لیا جاتا ہے کیونکہ یہ صبح شام اُن کے سر پر لگی رہتی ہے۔ بارش میں چھتری کے بغیر ہر شریف آدمی کبھی کبھی شرافت سے بھیگتا ہے مگر ہمارے مولوی صاحب جو چھتری کو دم بھر کی چھٹی نہیں دیتے، مطلقاً نہیں بھیگتے۔ خشک سالی کے زمانے میں اس چھتری کے طفیل ہمارے مولوی صاحب لُو سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ یہ انہی کی حیران کن ایجاد ہے کہ جس طرف سے لُو چلتی ہو اُس طرف چھتری آڑی رکھ کر بیٹھ جاؤ۔ لُو مطلقاً نہ لگے گی۔ چنانچہ ہمارے مولوی صاحب اپنی چھتری سے سال کے ہر موسم میں مستفید ہوتے ہیں۔ موسمِ بہار میں بورڈنگ ہاؤس کے احاطے سے پھول چرا کر اس میں بھر لیتے ہیں۔ مولوی صاحب پر چوری کا مطلقاً شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ موسمِ خزاں میں پت جھڑ کرنے والی ہواؤں سے بچنے کے لئے بھی انہیں چھتری کا لگانا ضروری ہے۔ دن کے وقت تو حسبِ ضرورت چھتری ہر ایک شخص ہی لگاتا ہے مگر رات کے وقت چھتری لگانے کا انداز کچھ انہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

ہم نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا "قبلہ! رات کے وقت چھتری لگانے کا مقصد؟"

---

[1] جب یہ مضمون ہمیں موصول ہوا اُس وقت مسٹر چیمبرلین مع چھتری کے زندہ تھے۔ "ہمایوں"

"بھئی واہ! رات کے وقت اوس پڑتی ہے۔ بغیر چھتری کے رات کو گشت کی جائے تو نزلہ ہو جاتا ہے۔ چھتری رات کے وقت اوس سے بچاتی ہے۔ یہ غلط ہے کہ نزلہ قبض سے ہوتا ہے۔ گلے میں کسی قسم کی خراش سے ہو جاتا ہے۔ سردی کے وقت گرمی۔ اور گرمی کے وقت سردی لگ جانے سے ہو جاتا ہے۔ زیادہ سرد یا زیادہ گرم چیز کھانے سے ہو جاتا ہے۔ دماغ کی کمزوری سے ہو جاتا ہے یا موسموں کے تغیر و تبدل سے ہو جاتا ہے۔ نزلہ ہونے کی وجہ ہی صرف ایک، محض ایک ہے۔ وہ یہ کہ ہم لوگ رات کے وقت اوس سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں کرتے۔ سب سے اچھا انتظام یہی ہے کہ رات کو جب باہر نکلو۔ چھتری لگا کر۔ چھتری گرمیوں میں ٹھنڈک اور سردیوں میں گرمی پہنچاتی ہے۔"

ان کی اس طولانی تقریر نے ہمیں مرعوب کر دیا۔ اس لئے کہ یہ حکیم حاذق بھی ہیں۔ ہم ابھی دم بخود ہی تھے کہ پھر کہنا شروع کیا۔

"بھئی جب چھتری خرید ہی لی۔ جب ایک مرتبہ اس پر دام خرچ ہی کر ڈالے تو صرف اسے دن کے استعمال کے لئے رکھ چھوڑنا کفران نعمت نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر یہ چھتری رات کے وقت بھی استعمال کی جاسکے تو اس میں کیوں بُخل سے کام لیا جائے۔ ہندوستان اسی لئے تو آزاد نہیں ہوتا کہ یہاں کے لوگ کسی چیز کا بہترین استعمال نہیں جانتے۔ اسلام اسی وجہ سے خطرے میں ہے کہ مسلمان لوگ جو بے حد مفلس ہیں کسی چیز سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا نہیں جانتے۔ معمولی سے معمولی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے فوراً جیب ٹٹولتے ہیں۔ حالانکہ بغیر پیسہ خرچ کئے بھی یہ ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ المبذرین کانوا اخوان الشیاطین سے یہ لوگ بالکل نہیں ڈرتے۔"

لو صاحب! اس تقریر کے بعد ہماری کیا مجال تھی کہ ہم لب کشائی کرتے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ چھتری ہی ہندوستان کو آزاد کرا سکتی ہے اور چھتری ہی اسلام کو خطرے سے باہر نکال سکتی ہے۔

مولوی صاحب چھتری کو رات کے وقت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی چھتری کا غلاف سفید ہے۔ جب یہ چھتری کو بند شکل میں اپنے ہاتھ میں لئے ہوتے ہیں تو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ان کی چھتری پر "ید بیضا" کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے تاریک کمرے کی تاریکی میں بھی چھتری کے غلاف کی سفیدی رات کے وقت ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ مولوی صاحب کے ہاں (وہ خود میرے روبرو مان چکے ہیں) مہینے بھر میں تین پیسے کا مٹی کا تیل خرچ ہوتا ہے۔ وہ دیئے کا کام چھتری ہی سے لیتے ہیں۔ جب مولوی صاحب کو رات کے وقت باہر سے آکر کپڑے اُتارنا مقصود ہوتے ہیں تو چھتری ہی سے ٹٹول ٹٹول کر کپڑے ٹانگنے کی کھونٹیوں تک پہنچتے ہیں۔

مولوی صاحب کی جائے اقامت سکول کے احاطہ ہی میں ہے۔ ان کے "عربی روم" اور قیام گاہ کے درمیان مشکل سے پچاس گز کا فاصلہ ہوگا مگر مولوی صاحب کو جب گھر سے سکول اور سکول سے گھر جانا مقصود ہو تو چھتری پہلے کُھل جاتی ہے اور اس عجلت کے ساتھ کہ اس پر آٹومیٹک چھتری (خود بخود کھل جانے والی) کا گمان ہوتا ہے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جاتے وقت بھی خواہ وہ ساتھ ہی والا کمرہ کیوں نہ ہو یہ چھتری "زیب قامت" ہوتی ہے مولوی صاحب ماشاءاللہ سر زندہ واقع ہوئے ہیں۔

مولوی صاحب کی خوش قسمتی کہئے یا ان کی چھتری کی بدقسمتی کہ مسجد بھی سکول کے احاطے ہی میں واقع ہے مولوی صاحب جمعہ کے دن دوسری اذان سے ایک دو منٹ پیشتر بہ دستار و جُبّہ بڑی آن بان سے اپنی حرم سرا سے نکلتے ہیں بیاٹے کے ساتھ ساتھ جو اس وقت کم و بیش

وہ وضو فرما چکا ہوتا ہے تشریف لاتے ہیں۔ مگر سر پر چھتری باقاعدہ لگی ہوتی ہے۔ چونکہ مولوی صاحب دھوپ میں پگھل جانے کے ڈر سے چھتری کے باوجود دیواروں کے عین ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس لئے چھتری کی سلاخوں کی رگڑ سے دیواروں پر کچھ ایسی امٹ سی لکیریں پڑ گئی ہیں کہ سالانہ مرمت کے وقت سفیدی اور رنگ کے دو دو تین تین کوٹ بھی انہیں نہیں مٹا سکتے۔ بورڈنگ ہاؤس کا احاطہ ختم ہو چکنے کے بعد نیم کا سایہ مولوی صاحب کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے پھر جنرل نالج روم اور دفتر انجمن کے برآمدے کے سائے بڑھ بڑھ کر مولوی صاحب کی قدم بوسی کرتے ہیں۔ اولاں مسجد کی دیوار کے شمالی سایہ کو مولوی صاحب اپنے قدم میمنت لزوم سے نوازتے ہیں۔ اندرون مسجد وضو گاہ کی چھت اور جنوبی برآمدے کے زیر سایہ مولوی صاحب محرابِ مسجد میں مع اپنی چھتری کے داخل ہو کر فرائضِ امامت ادا کرتے ہیں۔ یہ ہے مولوی صاحب کی گذرگاہ 'از حرم تا بمسجد'

ایک دفعہ سکول میں حکم نافذ ہوا کہ جماعت میں چھڑی کا استعمال ممنوع ہے۔ اس "آرڈیننس" کے ماتحت سکول میں جس قدر چھڑیاں طلبہ کی زدوکوب کے لئے مخصوص تھیں جمنوالی گئیں۔ مگر مولوی صاحب ماشاء اللہ نہایت جیّد الطبع واقع ہوئے ہیں۔ سوجھی اور خوب سوجھی۔ لگے چھڑی کی بجائے چھتری استعمال کرنے۔ آخر جواب طلبی ہوئی۔ لکھ بھیجا 'چھڑی ممنوع ہے چھتری نہیں'

مولوی صاحب نے چھتری کے استعمال میں جو جدتیں پیدا کی ہیں اُن کی تشریح کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ یہاں چند اشارات سے شاید کچھ اندازہ ہو سکے ؏

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

مولوی صاحب کو ایک دفعہ پسینہ آ رہا تھا۔ آپ نے نہایت تکلف سے چھتری اُٹھائی اور غلاف کے ساتھ منہ اور ماتھا صاف کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب رومال کبھی نہیں رکھتے۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھو چکنے پر چھتری کا غلاف تولیہ کا کام بھی دیتا ہے۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب کی پیٹھ پر کسی ایسی جگہ کھجلی ہو رہی تھی جہاں اُن کا ہاتھ نہ پہنچ سکتا تھا۔ جھٹ چھتری اٹھائی اور اُس کے دستے کے ساتھ پیٹھ کو نہایت آسانی سے کھجا لیا۔ کسی شاگرد سے کھجلوانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

احسان ناخدا کا اُٹھائے مری بلا

ایک دفعہ مولوی صاحب بازار سے آ رہے تھے اور چھتری خلافِ معمول بند تھی۔ مگر اس طرح کہ اُس کی ساتوں سلاخیں دستے کے پاس سے ملحقہ میں دبا رکھی تھیں اور چھتری کا پیٹ ابھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اُن کی چھتری سے کچھ عقیدت سی ہو گئی ہے۔ میں نے مذاق مذاق میں اُن کے ہاتھ سے چھتری سنبھال لی۔ اُسے کھولا تو دیکھا بیچ میں بینگن بھرے ہیں۔ کھسیانے سے ہو کر فرمانے لگے 'میں تو سبزی اسی میں لایا کرتا ہوں'۔

مولوی صاحب کی چھتری پردہ پوش بھی واقع ہوئی ہے۔ ہمارے مولوی صاحب ہیں تو شادی شدہ مگر تجرد کے قائل ہیں۔ اس لئے کہ ان کا خیال ہے کہ ازدواجی زندگی اُن کی ریاضت و عبادت میں مُخل ہوتی ہے چنانچہ مولوی صاحب سال بھر میں چھ ماہ تن تنہا رہنے کے عادی ہیں۔ مسجد کے عقب میں ایک تنور ہے۔ ایسی حالت میں مولوی صاحب کے خورونوش کا انتظام اسی تنور میں ہوتا ہے۔ احباب کی نگاہوں سے بچنے کے لئے کھانا کھاتے وقت مولوی صاحب اپنی چھتری میز پر تان کر آڑی رکھ دیتے ہیں اور اس کی اوٹ میں مزے سے شکم پُری کے فرائض کو ادا کرتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق کم کھانا بھی کفرانِ نعمت ہے۔ اس طرح مولوی صاحب بازار سے گذرنے والے احباب کی تواضع کے فرض سے بھی بچ جاتے

ہیں۔ دوسرے چونکہ بازار میں کھانا عیب ہے ان کی عیب پوشی بھی ہو جاتی ہے۔ رمضان کے مہینے میں یہ چھتری بہت کام آتی ہے بشرطیکہ مولوی صاحب کی طبیعت خدانخواستہ علیل ہو اور روزہ رکھنے کا فریضہ ان پر عائد نہ ہوتا ہو۔

مولوی صاحب کا وطن ایک ریتلے علاقہ میں واقع ہے جہاں گرمی زیادہ ہوتی ہے اور پانی کم۔ رہگذروں پر کہیں کہیں کنوئیں ملتے ہیں مگر ان میں سے بعض پر پانی نکالنے کا اہتمام نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں مولوی صاحب پھر اپنی چھتری ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسے کھول کر اپنی دستار سے اُلٹا باندھ لیتے ہیں اور اسے کنوئیں میں ڈال کر پانی نکال لیتے ہیں اور سیر ہو کر پی لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب نے غلاف کے لئے موٹی زین کا انتخاب کیا ہے جنگل میں جاتے وقت چھتری کی اوٹ میں آپ قضائے حاجت سے بھی عہدہ برآ ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ مولوی صاحب بیمار پڑ گئے۔ خیر سے دو تین ماہ صاحبِ فراش رہے۔ چھتری کا استعمال نہ کر سکے۔ چھتری کو بیکار پڑے دیکھ کر ہر وقت کُڑھتے رہتے تھے۔ آخر ان سے ضبط ہو ہی نہ سکا۔ ان کی ستم ظریفی دیکھئے۔ چھتری کھلوا کر چھت کی ایک کڑی میں رسی ڈلوا اسے اُلٹا لٹکوا دیا اور اس میں کوئی من بھر پیاز خرید کر بھروا دی۔ کہنے لگے " برسات کے بعد کام آئے گی "

چوہوں کو مولوی صاحب سے خاصی عقیدت ہے اور انہیں اُن سے عداوت۔ اپنی چھتری سے دن بھر میں تین تین چار چار چوہے مار پھینکتے ہیں۔ گویا ان کی چھتری چوہے دان سے کم نہیں۔ لطف یہ کہ چوہوں کے بل بھی چھتری کی نوک ہی سے بند کئے جاتے ہیں۔ بیلچے اور کُدال کا کام بھی ان کی سعادت مند چھتری ہی دیتی ہے۔

اگر مولوی صاحب کو بیٹھنے کے لئے کوئی اور چیز میسر نہ آئے تو بلا توقف چھتری زمین پر ڈال اُس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کئی دفعہ دیکھا گیا کہ مولوی صاحب رات کے وقت تکیہ کا کام بھی چھتری ہی سے لیتے ہیں۔

ہمارے سکول میں جامنوں کے پیڑ بہت ہیں اور مولوی صاحب اُن کے انچارج ہیں۔ بدقسمتی سے ایک لڑکا جامنیں توڑتے پکڑا گیا۔ بیدلاکا تھا اچھوت۔ اس کو ہاتھ لگانا گناہ مگر اسے چھوڑنا بدتر از گناہ۔ ایک دو منٹ تو یہ اسی اُلجھن میں پھنسے رہے مگر آخر چھتری ہی نے ان کی مشکل کشائی کی۔ فوراً کہا ع

چل مری چھتری بسم اللہ

چھتری کا مڑا ہوا دستہ اس اچھوت لڑکے کی گردن میں ڈالا اور لے کشاں کشاں ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں لا موجود کیا۔ اس وقت یہ چھتری نہ ہوتی تو بس مولوی صاحب کے لئے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن، کا معاملہ ہو گیا تھا۔

کبھی کبھی مولوی صاحب چھتری کو آگے گاڑ کر نماز بھی پڑھ لیتے ہیں۔ مگر یہ کام چھتری سے اس وقت لیا جاتا ہے جب نماز برسرِ راہ پڑھنی پڑے تاکہ آگے سے گذرنے والے نماز میں نقص پیدا نہ کر سکیں۔ جب مولوی صاحب نکاح پڑھانے جاتے ہیں تو دلہن کا نکاح پڑھاتے وقت چھتری تان کر درمیان رکھ لی جاتی ہے تاکہ پردہ کی جائز حدود سے تجاوز نہ ہو سکے۔

ہمارے مولوی صاحب اپنی چھتری سے اپنا بستر بھی جھاڑ لیتے ہیں۔ بالخصوص لحاف۔

اگر مولوی صاحب کا کسی سے جھگڑا ہو جائے تو اپنے حریف کو طمانچے کی بجائے چھتری ہی دکھاتے ہیں۔

ایک دفعہ مولوی صاحب کو سردی لگ رہی تھی اس وقت آپ نے چھتری کو سینہ سے لگا رکھا تھا۔ مگر گرمی میں وہ چھتری سے پنکھے کا کام بھی لیتے ہیں۔ ایک دفعہ گرمی کے موسم میں ہوا بالکل بند تھی مولوی صاحب چھتری کے اُس چھلے کو جہاں چھتری کی ساتوں سلاخیں آکر ملتی ہیں بعجلتِ تمام اوپر نیچے کرنے لگے ایک دو منٹ میں پسینہ خشک ہو گیا۔

"ایک نہ ایک وقت کھیلنا بھی ضرور چاہیئے۔ اِس سے بدن میں چستی پیدا ہوتی ہے"۔ کسی نے انہیں بتایا کہ باہر جنگل میں جا کر کسی درخت کی نیچی شاخ سے لٹک کر ڈنٹر پیلے جائیں۔ صبح سویرے جنگل کی طرف تو جائے ان کی بلا۔ ان کے کوارٹر کی چھت کے ایک شہتیر میں آہنی ہُک لگا ہوا ہے آپ اپنی چھتری کو اُس ہُک میں لٹکا لیتے ہیں اور چھتری کے ساتھ لٹک کر خوب ڈنٹر پیلتے ہیں۔ ان کی چھتری جتنی مضبوط ہے اُسی نسبت سے مولوی صاحب دُبلے پتلے ہیں۔ اپنی چھتری سے حجام، موچی، باورچی اور درزی کا کام لینے کا معاملہ ابھی تک مولوی صاحب کے زیرِ غور ہے۔ اگر ان کی جدتِ طبع شاملِ حال رہی تو یہ گتھی بھی انشاءاللہ جلد ہی سُلجھ جائے گی۔

چھتری ان کی ادبیات میں بھی داخل ہو گئی ہے۔ آپ کے پاس کئی فضیلتیں ہیں۔ منشی فاضل۔ مولوی فاضل۔ ادیب فاضل۔ فاضلِ دینیات اور نہ معلوم کیا کیا۔ اس لئے جو کچھ آپ زبان سے نکالتے ہیں اُسے ادبی طور پر مستند سمجھا جاتا ہے۔ کسی سے لڑائی ہو جائے تو کہتے ہیں "ابے تجھے مار کر چھتری بنا دوں گا۔ کسی شاگرد سے ناراض ہوں تو کہتے ہیں تجھے چھتری کی طرح اُلٹا لٹکا دوں گا۔ کسی کی تعریف کرنا مقصود ہو تو کہتے ہیں وہ چھتری کی طرح سیدھا ہے' وہ چھتری کی طرح وفادار ہے' اُس نے اپنے عزیزوں کو چھتری کی طرح ڈھانپ رکھا ہے کبھی کہتے ہیں کہ وہ چھتری کی طرح تنا کھڑا ہے۔ ایک دفعہ اپنے کسی دوست سے کہہ رہے تھے 'تمہاری زندگی تو چھتری کی طرح ہے۔ کبھی نہاں اور کبھی عیاں'۔ نہ معلوم بچاری ایک چھتری پر کتنے روزمرے۔ کتنے محاورات اور کتنی تشبیہات تراش ڈالیں۔

مولوی صاحب کی چھتری مقیاس الاوقات کا کام بھی دیتی ہے۔ جب ان کی چھتری ان کے سر پر عمود اً لگی ہوئی ہو (بشرطیکہ رات نہ ہو) تو سمجھ لو کہ سورج نصف النہار پر چمک رہا ہے یعنی دوپہر کا وقت ہے۔ اس میں یقیناً غلطی کا اندیشہ نہیں۔ اگر چھتری مشرق کی طرف آڑی ہے تو دوپہر سے پہلا وقت ہے اور اگر مغرب کی طرف جھکی ہوئی ہے تو تیسرا پہر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ان کی چھتری قطب نما سے کم نہیں اگر چھتری پیچھے کی طرف لگی ہے تو سمجھ لو سورج ان پشت کی طرف ہے اور اگر آگے کی طرف ہے تو سورج بھی آگے کی طرف ہی ہوگا۔ لیکن اگر آگے کی طرف سورج نہ ہو مگر چھتری آگے کی طرف لگی ہوئی ہو تو سمجھ لو کہ مولوی صاحب کا کوئی قرضخواہ سامنے آرہا ہے۔ جس سے بچنے کے لئے یہ چھتری آگے کی طرف لگی ہوئی ہے۔

اِن کی چھتری مقیاس المزاج بھی واقع ہوئی ہے۔ اگر یہ چھتری ان کے دائیں یا بائیں بازو پر لٹک رہی ہو تو سمجھ لیجیے کہ مولوی صاحب آج قدرے بشاش ہیں۔ اگر بغل میں دبی ہوئی ہو تو قدرے دلگیر۔ اگر اسے اپنی گردن میں ڈال کر بار بار کھینچتے ہوں تو یہ نشانی قدرے متفکر ہونے کی ہے۔ اُس وقت مولوی صاحب کسی اُلجھن میں ہوتے ہیں اور اگر بند چھتری کو ہاتھ میں چھڑی کی طرح لے کر چلیں تو یہ علامت

ہے اُن کے غرور کی جو کسی کسی وقت وہ اپنی ہمہ دانی پر ظاہر کیا کرتے ہیں۔

ایک دفعہ کہنے لگے "چھتری بھی عجیب ایجاد ہے۔ اس کے موجد کو نوبل پرائز ملنا چاہیئے تھا۔ چھتری ناکارہ ہو کر بھی بیکار نہیں جاتی اس کے غلاف کو دھو کر رومال بنائے جاسکتے ہیں۔ اس کی چھڑی تو بہرکیف چھڑی کا کام دے گی۔ مگر اس کی سلاخیں بھی کام آسکتی ہیں۔ ان سے حُقّہ کی نے صاف کی جاسکتی ہے"

ان کا عقیدہ ہے کہ شعراء خدا کے نزدیک اسی لئے مقہور و مطعون ہیں کہ ان میں سے کسی نے آج تک چھتری کا قصیدہ نہیں کہا۔ اگر اب بھی اُن کی قوم میں سے کوئی ایک شاعر چھتری کا قصیدہ کہہ ڈالے تو سب کا کفّارہ ادا ہوسکتا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں 'چھتریات' پر لیکچر ہونے چاہئیں۔ بلکہ یونیورسٹیوں کو اس مضمون کو داخلِ نصاب کرکے صحیح مذاقِ تعلیم کا ثبوت دینا چاہیئے۔ چھتری کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے اگر اسے چشمِ بد دُور پیرس کی ماہ جبینوں کی رفاقت کا اعزاز حاصل ہے تو کانگو دیلی کے حبشی نژاد لوگ بھی اسے استعمال کرتے ہیں بچے۔ جوان۔ بوڑھے اسے یکساں طور پر چاہتے ہیں۔ ہندو مسلم سکھ اور عیسائی کی یہ محبوبہ ہے اور بہت ممکن ہے کسی روز یہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد بھی پیدا کردے۔

مولوی صاحب کی چھتری اگرچہ قاضیٔ حاجات ہونے کے علاوہ ستارِ عیوب بھی ہے مگر ایک دفعہ اس نے اُن کا راز بُری طرح فاش کر دیا بورڈنگ ہاؤس کے احاطے میں طلبہ کے لئے کچھ سبزی لگی ہوئی تھی۔ یہاں سے سبزی لینے پر سخت پابندیاں تھیں۔ مگر تعجب اس پر تھا کہ راتوں رات سب کیارے خالی ہوجاتے تھے۔ ہر طرح سے سبزی کی رکھوالی کی گئی مگر بے سود۔ مالی اور سپرنٹنڈنٹ صاحب سخت تنگ آرہے تھے مگر چور کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی حیران و پریشاں تھے۔ آخر یہ بھانڈا پھوٹ ہی گیا۔ ایک صبح مالی نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس شکایت کی کہ ٹماٹر کے تین پودے جو کل شام لدے کھڑے تھے بالکل خالی ہوچکے ہیں۔ وُہ خود وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بڑے پودے کی اوٹ میں ہمارے مولوی صاحب کی چھتری پڑی تھی۔ بس معلوم ہوگیا ؎

چوں بخلوت میروند آں کارِ دیگر میکنند

ہمارے مولوی صاحب کو چھتری نے بچپن میں کھلونے کا کام دیا۔ کیونکہ اسے گھوڑا بنا کر کھیلتے تھے۔ جوانی میں شریکِ حیات کا بلکہ 'نصفِ بہتر' کا کیونکہ یہ خلوت و جلوت میں اُن کے ہمراہ رہتی ہے۔ خدا کرے بڑھاپے میں یہی چھتری عصائے پیری کا کام بھی دے ؎

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

(سید) نیاز احمد ترمذی

دعوتِ طرب

ہاں ساز اٹھا، ساز، خوش آواز مغنّی

برسات کی بھیگی ہوئی یہ رات شبابی
ہیں رقص میں آفاق، زمانہ ہے ربابی
ہر روح کے آنچل میں دہکتے ہیں شرارے
بھیگے ہوئے جھونکے ہیں فضائیں ہیں شرابی
ہنستے ہوئے سبزے پہ مچلتی ہوئی شبنم
کلیوں کو ستاروں نے بنایا ہے شہابی
ہاں گھول دے امرت سا فضاؤں میں مغنّی
یہ موسمِ گل رنگ یہ ماحول شبابی

ہاں ساز اٹھا، ساز، خوش آواز مغنّی

ساحل پہ پپیہے کی صدا جھوم رہی ہے
کونین ہیں سرشار فضا جھوم رہی ہے
مخمور گلستاں میں ہوا جھوم رہی ہے
آفاق پہ رحمت کی گھٹا جھوم رہی ہے
گلزار میں پھولوں نے نیا رنگ دکھایا
گردوں پہ ستاروں کی فضا جھوم رہی ہے
سیلابِ مسرت ہے زمانہ ہے طربناک
دنیا نہیں خود بزم خدا جھوم رہی ہے

ہاں ساز اٹھا، ساز، خوش آواز مغنّی

ہر گام پہ مُڑتا ہُوا گاتا ہُوا پانی
بیتاب ہے موجوں میں ستاروں کی جوانی

گلشن پہ عجب ناز سے چھائی ہیں بہاریں
ہر پھول کے ہونٹوں پہ ہے جنت کی کہانی
بیتاب ہیں قلبِ خس و خاشاک میں ارماں
ہر برگ کے ساغر میں ہے صہبا کی جوانی
یہ محفلِ احباب یہ اوقاتِ فراغت
آئے گی نہ برسات کی یہ رات سہانی

ہاں ساز اٹھا، ساز، خوش آواز مغنّی

یوں چھیڑ ترانے کہ یہ عالم ہی بدل جائے
افسوں ترا رفتارِ مشیّت پہ بھی چل جائے
پیشانیِ حسرت پہ بشاشت و مک اٹھے
کانٹا سا ہر اک روح کے پردے سے نکل جائے
ہر دل کی کلی کثرتِ جذبات سے ہنس دے
ہر اشک میں طوفانِ تبسم کا مچا جائے
مہتابِ مسرت ہو نمایاں شبِ غم سے
ہر ایک فغاں قالبِ نغمات میں ڈھل جائے

ہاں ساز اٹھا، ساز، خوش آواز مغنّی

اے مطربِ گل بار فضاؤں کو ہنسا دے
نغموں سے بیاباں کی خموشی کو جگا دے
منہ دیکھ کے رہ جائے جمالِ رخِ ایام
اے روحِ طرب رنگِ حوادث کا اڑا دے
ہر تان سے لا راہ پہ بھٹکے ہوئے دل کو
اے خضرِ طرب فرصتِ ہستی کو بڑھا دے
کونین کی افسردہ تمنائیں تڑپ جائیں
طوفانِ ترنم میں زمانہ کو بہا دے

ہاں ساز اٹھا، ساز، خوش آواز مغنّی

صفیہ شمیم ملیح آبادی

اصغر کا روزنامچہ

۹ر جنوری ۱۹۳۹ء

.... آج مجھے منج (منظر) کا ایک نہایت پیارا خط ملا۔ میرے تجربے میں وہ یقیناً اپنے زمانے کا سب سے ہوشیار لڑکا ہے۔ میں فخر کرتا ہوں کہ میرا ایک ایسا بھائی ہے۔

.... میں سپین کی حکومت کی عظیم الشان جارحانہ کارروائی سے بہت خوش ہوا ہوں۔ اس سے ان ڈکٹیٹروں کو ایک سبق مل رہے گا۔ ہاں اگر مسٹر چیمبرلین پھر کہیں بھیک مانگنے چل پڑے تو اور بات ہے۔ یہ ڈکٹیٹر پرلے درجے کے لغو آدمی ہیں اور چیمبرلین سب سے عجیب وغریب مسخرا ہے اولمپیا کے برٹرم ملز سے بھی بڑھ کر۔

۱۰ر جنوری ۱۹۳۹ء

میں اُس دن کو ترس رہا ہوں جب میں پھر آکسفورڈ واپس پہنچ جاؤں گا۔ آج کا دن پہلے سب دنوں سے زیادہ اُداس اور اُکتا دینے والا تھا اور اگر رف (رفعت) کا ایک لمبا اور پُرلطف خط نہ آجاتا تو میں یہی کرتا کہ دن بھر کے لئے پھر پڑ کر سو رہتا........ کچھ عرصے سے اپنے ماحول سے دلچسپی قائم نہ رہنے کا نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ میں زندگی پر غور وخوض کرتا رہتا ہوں اور غمگیں خیالات میں مستغرق رہتا ہوں جس سے میری فطرت کی غم پسندی بڑھ رہی ہے۔ آج میں نے ایک خاص عزم کیا ہے اور دل سے دُعا کرتا ہوں کہ مجھے اس کے پورا کرنے کی ہمت دی جائے۔ کیا میں ایسا کرسکوں گا؟ میرے دریچے کے باہر بارش کی ٹپ ٹپ میری ہنسی اُڑاتی "نہیں" کہتی معلوم ہوتی ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ کامیاب ہوں، ممکن ہے اس کوشش میں ایک دن میں زندگی ہی کھو بیٹھوں اور اگر میں ناکام رہا تو گویا سبھی کچھ ہار دوں گا۔ خیر آنے والا زمانہ ہی بتائے گا کہ کیا ہوگا!

(ترجمہ از ب ط)

اصغر بشیر

افکارِ پریشاں

کسے معلوم گم ہیں علم و عرفاں چشمِ حیراں میں
یہ تابانی نگاہوں میں ہے یا حسنِ فروزاں میں

حجاب اک رمزِ محبوبی ہے حسنِ جلوہ ساماں میں
جھلک کر رہ گئیں رنگینیاں گلہائے خنداں میں

سمایا شوق بن کر کون یہ جذباتِ پنہاں میں
عجب عالم سرور و سرخوشی کا ہے دل و جاں میں

تجلی بڑھ گئی زلفِ سیہ سے روئے تاباں میں
نثارِ کفر ابجلی کوندتی ہے نورِ ایماں میں

نویدِ موسمِ گل یا نویدِ اضطراب آئی
نسیمِ صبح نے چنگاریاں رکھ دیں دل و جاں میں

ازل میں وہ نگاہِ ناز کی جنبش معاذ اللہ
کہ جیسے رہ گیا ہو ٹوٹ کر نشتر رگِ جاں میں

یہ دل کا اضطراب اور حسن کی یہ جلوہ سامانی
کہ جیسے جام بھر کر دے دیا ہو دستِ لرزاں میں

نفس عنبر فشاں، مسرور دل آنکھیں منور ہیں
وہ یاد آیا کہ ہوتی ہے سحر صحنِ گلستاں میں

نہیں منت کشِ چشمِ تماشا میری رنگینی
میں وہ گل ہوں کھلایا جس کو قدرت نے بیاباں میں

انہیں ہم شعر سمجھیں یا جگر نغماتِ لاہوتی
عجب کیفیتیں ہیں تیرے افکارِ پریشاں میں

جگر بریلوی

تجلیات

بہارِ عیش سے ہے سوزشِ دروں بہتر
شرابِ ناب سے ہے اشکِ لالہ گوں بہتر

متاعِ درد پہ دونوں جہاں لٹا ڈالے
یہ ہے جنوں، تو ہے مجھ کو بھی جنوں بہتر

گرے جو ذکرِ الٰہی میں شب کے دامن پر
ہے آفتابِ سحر سے وہ اشکِ خوں بہتر

وہ آشتی سے ملے گر تو آشتی اچھی
وہ کشت و خوں سے ہو حاصل تو کشت و خوں بہتر

بہار ایک فسوں ہے، خزاں بھی ایک فسوں
بہار کا ہے خزاں سے مگر فسوں بہتر

سکونِ مرگ ہے بیکارِ زندگی سے گریز
سکونِ مرگ سے ہے جانِ بے سکوں بہتر

خدا سے مانگ نہ کچھ بھی جنونِ حق کے سوا
کہ دو جہاں کی خرد سے ہے یہ جنوں بہتر

مآلِ عشق اگر خاک و خوں ہے صہبائی
تو مجھ کو بسترِ گل سے ہے خاک و خوں بہتر

"آل انڈیا ریڈیو"

اثر صہبائی

غزل

عشق کی بے تابیاں تنہائیاں
حُسن کی وُہ انجمن آرائیاں

چشمِ ساقی کی اثر فرمائیاں
موج مے لینے لگی انگڑائیاں

وہ بھی دل کے ذکر پر ہنسنے لگے
دُور جا پہنچیں مری رسوائیاں

ہر تمنا خون ہو کر رہ گئی
یاد آئیں گی کرم فرمائیاں

کچھ اُمیدیں کچھ اُمیدوں کے فریب
چند جلوے اور کچھ پرچھائیاں

بھول جائیں وُہ تو کوئی کیا کرے!
پھر غنیمت ہیں ستم آرائیاں

موت کی بھی اب جھجک باقی نہیں
کی گئیں وہ حوصلہ افزائیاں

آہ پر خفگی نہیں ہے بے سبب
بات کی سمجھی گئیں گہرائیاں

دل کو چسکا پڑ گیا ہے جور کا
مار ڈالیں گی یہ بے پروائیاں

تم کو رُسوا کر نہ دیں ماہر کہیں
چاندنی راتوں کی یہ تنہائیاں

ماہر القادری

محفلِ ادب

اُردو زبان اور صحّتِ الفاظ

جب اُردو کا خاکہ تیار ہوا اور روز بروز اُس کی دلفریبیاں طبیعتوں کو اپنی طرف مائل کرنے لگیں تو اُس کی ادبی حیثیت کی بھی بنائیں قائم ہو چلیں، ابتدائی دور گزر جانے کے بعد اُردو کے ایسے ایسے شیدائی پیدا ہوئے جنہوں نے ایک طرف اس کے خدوخال کو سنوارا اور رنگ روپ کو نکھارا اور دوسری طرف اس میں وہ وہ باب کھولے جو رفتہ رفتہ وسیع میدانوں میں تبدیل ہو گئے، سوداؔ۔ میرؔ۔ آنند رام مخلصؔ۔ سراج یکرنگ، آبروؔ، حاتمؔ، یکتاؔ، بیدلؔ، ناجیؔ، مضمونؔ، مظہرؔ، انصاف، آرزوؔ، یقینؔ، تاباںؔ، اور فغاںؔ، و بیانہ وغیرہم وہ بزرگ تھے، جنہوں نے اُردو کی دلآویزیوں میں چار چاند لگا دیئے اور اُس کی محبت کو دُور دُور تک عام کر دیا، اِن کے بعد آنے والوں نے انہیں سے اپنے چراغ جلائے اور اُردو کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اس تمام خدمت گزاری و سرگرمی کے طفیل مذاق میں صحت اور صفائی بھی پیدا ہوتی گئی جو تمام تر فارسی کا قالب بنکر ادبی معیار کے نام سے مشہور ہو گئی، متقدّمین نے جو ذخیرۂ تصنیفات ترکہ میں چھوڑا اُس میں اُن کے جانشینوں کو ایک بڑا انبار سقیم و غیر معتدل نظر آیا۔ اس انبار میں کچھ قدیم الفاظ اور ترکیبیں تھیں، اور کچھ معنوی بے عنوانیاں، ان لوگوں نے اس کی اصلاح شروع کی، صدہا ہندی الفاظ کو داخلِ متروکات کیا جس پر کچھ زمانہ ہُوا اِسی رسالہ میں کچھ عرض کر چکا ہوں، یہاں صرف اِتنا عرض کر دینا مناسبِ مقام ہے، کہ بہت سے متروکات اب تک اساتذہ استعمال کرتے چلے آتے ہیں، اس لئے کہ اوّل تو ان الفاظ نے اپنا خاص محل و مصرف پیدا کر لیا ہے، دوسرے کسی لفظ یا ترکیب کا بہت دنوں تک استعمال نہ ہونا یا کسی خاص شخص کا اُسے متروک کر دینا اُس کے ترک کی کافی وجہ نہیں، بہت سے الفاظ کو غیر معتبر اور غلط بتایا گیا لیکن، یہ سب بظاہر اُردو سے وابستگی کا نتیجہ تھا سیاسی، تمدّنی یا مذہبی اغراض و مقاصد پر مبنی نہ تھا بلکہ اس زبان میں ابھی یہ صلاحیّت و اہمیت ہی پیدا نہ ہوئی تھی، کہ اس کو کسی قومی یا سیاسی دارے کی حیثیت سے دیکھا جاتا۔ یہ تمام تر کوشش و کاوش اس لئے تھی، کہ بھاشا اور عربی فارسی کی قیدوں سے آزاد ہو کر اُردو اپنی علیحدہ ہستی قائم کر لے، اس مقصد کے لئے اُردو جس زبان سے مراد تھی، وہ سید انشا کی ذیل کی عبارت سے کافی طور پر متحقق و متعیّن ہو جاتی ہے:—

"مخفی نماند کہ ہر لفظے کہ در اُردو مشہور شد عربی باشد یا فارسی یا ترکی یا سُریانی یا پنجابی یا پوربی از روئے اصل غلط باشد یا صحیح، آں لفظ لفظِ اُردو ست، اگر موافقِ اصل مستعمل است ہم صحیح و اگر خلافِ اصل است ہم صحیح، صحت و غلطی آں موقوف بر استعمال پذیرفتن در اُردو ست زیراکہ ہر چہ خلافِ اُردو ست غلط است گو در اصل صحیح باشد، و ہر چہ موافقِ اُردو ست صحیح باشد گو در اصل صحت نداشتہ باشد"[1]

[1] دریائے لطافت صفحہ ۲۴۸

اردو الفاظ کی یہی خصوصیت اس زبان کو ایک طرف عربی فارسی سے اور دوسری طرف بھاشا سے ممیز کرتی ہے اور اس کو ایک مستقل زبان کی نوعیت عطا کرتی ہے، عربی فارسی کے بے شمار الفاظ ایسے ہیں، جو اردو میں آکر اپنی ماخذ زبانوں سے بالکل مختلف مفہوم ادا کرتے ہیں، اسی طرح ان دونوں زبانوں کے باہمی امتزاج سے، نیز ہندی اور عربی فارسی کے پیوند سے صدہا الفاظ ایسے وضع ہو کر رائج ہو گئے جو اپنی اصل زبانوں سے بالکل انوکھی چیز ہیں، اور اُن کے صرفی ونحوی قواعد سے آزاد، جیسے جمعدار کہ اصل میں جماعہ دار تھا یا آفرا تفری کہ اصل میں افراط و تفریط تھا یا ہندی میں بیکل۔ چلتن۔ لہو وغیرہ ایسے بدلے کہ اب اُن کی اصل کا پتہ لگانا بھی دشوار ہے اس عمل کے لئے نہ کوئی خاص قاعدہ مقرر تھا نہ ہو سکتا ہے، درحقیقت زبان کے بنانے والے جمہور ہوتے ہیں، جو اپنی طبعی مناسبت اور لب ولہجہ کی سہولت کے لحاظ سے موقع ومحل کے مطابق الفاظ تلاش کرتے ہیں، اگر مروجہ لفظوں نے اُن کی ضرورت پوری نہ کی تو وہ انہیں میں سے کسی کو توڑ مروڑ کر ایک نیا لفظ ڈھال لیتے ہیں یا کوئی بالکل نیا لفظ گھڑ لیتے ہیں جس کی مثال آگے آئیگی، شاعر اور ادیب اس ذخیرے کو سانچے میں ڈھالتے اور مستقل حیثیت دیتے ہیں، اس کا تجزیہ کرکے اُصول وقواعد مرتب کرتے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے قواعد وضوابط منضبط ہو جائیں، اُس کے بعد اُن کے مطابق زبان گھڑی جائے، ابتدا میں اسی قسم کے سیکڑوں لفظوں اور ترکیبوں نے اُردو کے ذاتی وجود کی بنائیں قائم کیں۔ اور اُس کی انفرادی زندگی کے قیام وارتقا میں امداد دی، جب زباندان ظہور میں آئے، اُنہوں نے اس تمام ذخیرے کو ایک خاص معیار پر جانچا اور پرکھا اور اس معیار کے اجزا کو توام فن یا اُصولِ فصاحت وبلاغت کا نام دیا یہ تمام سرمایہ اس کسوٹی پر پورا نہیں اُتر سکتا تھا۔ اس لئے بہت سا حصّہ متروکات کی ذیل میں آگیا اور بہت سا مستعملات میں رہا۔ آخر الذکر حصّہ میں سے چند ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں، جنکی ساخت میں دو زبانیں شامل ہیں؛—

بھڑے گھلپا۔ جیب کترا۔ گلے باز۔ شوربے چٹ۔ منہ زور۔ جوشیلا۔ دل لگی۔ اگن بوٹ۔ ڈھلمل یقین۔ ایماندار۔ لمبردار۔ ترشی جوان۔ ٹکڑگدا۔ ڈنڈا کش۔ کاپی نگار۔ چھاپہ خانہ۔ ڈولی بردار۔ سمجھ دار۔ چوکیدار۔ تھانہ دار۔ گاڑی بان۔ رتھ بان۔ بوباس۔ غل غپاڑہ۔ جگت باز۔ پنشندار۔ چٹھی رساں۔ چھت گیری۔ جگت اُستاد۔ وغیرہ وغیرہ جگت اُستاد کے اُصول پر امیر مینائی نے "جگت آشنا"[۲] لکھا۔[۱]

ان لفظوں نے اُردو کی مستقل ہستی ہی قائم نہیں کی، بلکہ ان میں جو اشتقاقی واختراعی اُصول جاری وساری ہیں۔ اُن سے اُس کی ترقی کا میدان بہت وسیع ہو گیا۔ اور یہی ان الفاظ کی سب سے بڑی خصوصیت وغایت ہے، اگر ان اصولوں کی پیروی سلیقہ اور تمیز کے ساتھ کی جائے تو اُردو ادبی تفریح کی چہار دیواری سے نکل کر واقعی ایک قومی زبان بنجائے۔ اور اس کی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ حایل نہ ہو۔ بعض ادیبوں کو اس کا احساس ہے، لیکن اکثریت اُن حضرات کی ہے، جنھوں نے زبان کے اشتقاقی واختراعی راستوں کو بند کرکے اُصول وقواعد کو اس قدر تنگ ومحدود کر دیا ہے، کہ زبان کے بنیادی سرمایہ میں اضافہ ہونا تو درکنار خود وہ سرمایہ ہی نابود ہوتا چلا جاتا ہے، اور اس سختی سے زبان کا جائزہ لیا جاتا ہے، کہ وہ جنس جو ایک زمانہ میں نہایت پسندیدہ اور ہر دلعزیز تھی، اب قابلِ نفرت ہو گئی۔ جب زبان سے وہ ذخیرہ نکل

[۱] مرقع ادب صفحہ ۳۲

گیا جس پر اُس کی مستقل حیات و بقا کا دار و مدار تھا۔ تو یہ کمی اور کمزوری پورا کرنے کے لئے عربی فارسی کی عجیب الخلقت ترکیبیں جا دیجا طلو
پر ٹھونسی جانے لگیں، لیکن زبان کے وارث یعنی جمہور کے قوائے ذہنی کب اِن شکنجوں میں جکڑے جاسکتے تھے، اور کب ان کی طبیعتیں
نفسیاتی اُصول کے خلاف "مقیاس الحرارت" "قرطاس ابیض" "مقاطعۂ جوعی" "طیارہ" وغیرہ کی متحمل ہو سکتی تھیں، وہ تو برابر تھرمامیٹر،
وائٹ پیپر، بھوک ہڑتال اور ہوائی جہاز ہی بولتے اور لکھتے ہیں، اور بولتے اور لکھتے رہیں گے، پھر اگر اُردو لکھنؤ کے گلی کوچوں، دِلّی کی
گلیوں، یا چند علماء کی درسگاہوں یا شاعروں اور ادیبوں کے حلقۂ تلمذ یا ارباب فن کے ایوانِ ادب تک ہی محدود رہتی یا صرف پامال
و ہوس کارانہ حُسن و عشق کی داستان سرائی تک اس کا عمل و تصرف رہتا یا محض تفنن و تفریح ہی کا مشغلہ بنی رہتی تو ضرور یہ پابندیاں
جو اُصول و فن کے نام سے عائد کی جاتی ہیں نبھ سکتی تھیں، مگر زمانہ نے کروٹ لی اور ایسی کروٹ لی کہ ساری دُنیا کی کایا پلٹ ہوگئی، ایسا
انقلاب آیا کہ زمین و آسمان بدل گئے۔ معجزات سائنس نے تمام عالم کو حیرت میں ڈال دیا۔ دُنیا کے کاروبار مقاصد و مشاغل میں بھی عظیم
تغیر پیدا کر دیا۔ نئی نئی ایجادات و اختراعات نے انسانی بستی میں چکا چوند کر دی۔ ہر مقام کے سیاسی و معاشرتی نصب العین میں بھی حیرت
انگیز تغیرات رُونما ہوئے۔ ضعیف اور بے بس ہندوستان اس عالمگیر اور طوفانی ہنگامہ سے کب بچ سکتا تھا اس پاک سرزمین کا
وہ معصوم باشندہ بھی جو کسی زمانے میں عبادت و گوشہ نشینی کو معراج حیات و مقصود زندگی جانتا تھا۔ اپنے پُرانے معتقدات سے بغاوت
کر اُٹھا اور زمانہ کے متواتر تلخ تجربوں نے اس پر ثابت کر دیا کہ خلوت پسندی و تنہا نشینی کی میعاد ختم ہوگئی، اس کی زندگی اب تمام
دنیا کی مجموعی زندگی کا مستقل جزو بنکر ہی قائم رہ سکتی ہے اور دُنیا کی مجموعی زندگی ہزاروں قسم کی سرگرمیوں پر مشتمل ہے، ان تمام سرگرمیوں
میں نہ سہی چند در چند ایسی ضرور ہیں، جن میں استقلال و خلوص کے ساتھ حِصّہ لئے بغیر ہندیوں کو چارہ نہیں، ایسی زندگی کو کامیاب بنانے
کے لئے لازم ہے کہ زبان کو بھی لامحدود وسعت دی جائے، اس لئے کہ کوئی قوم اپنی مکمل زبان کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی، یہاں کسی ایک
زبان کا مقتضیات وقت کے مطابق مکمل ہونا درکنار ابھی یہی نہیں معلوم ہے کہ کونسی زبان اس سخت کشمکش اور آزمائش کے وقت
ہمارا ساتھ دے سکے گی، بہرحال کوئی زبان بھی ہو۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اُسے چلنا پڑے گا اور انگریزی سے بھی اُسے مدد لینا ہو گی،
جمہور اپنی روز افزوں ضرورتوں کے مطابق ہر صنعت و حرفت فن اور مشغلہ میں صدہا الفاظ مروجہ زبانوں سے گھڑتے چلے جاتے ہیں،
جن کا سکہ بازاروں، کارخانوں، ملوں، کلوں، تفریح گاہوں اور اخباروں میں رواں ہے، مثال کے طور پر ایک لفظ "رتیائی" پیش کرتا
ہوں، جو کانپور کے ملوں میں کام کرنے والوں نے (Night Shift) کے لئے گھڑا اور خوب گھڑا ہے، اسی قبیل سے "ہوائی جہاز"
بھی ہے، اور میں پھر دانی بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ رتیائی سے بہتر (Night Shift) کے لئے کوئی دوسرا لفظ عربی فارسی کے قاعدوں سے وضع
نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس میں شک ہو تو کسی عربی فارسی کے عالم کا امتحان لے لیا جائے :۔

کسی زمانے میں اساتذہ اپنے خلوت خانوں میں بیٹھے بیٹھے زبان پر احکام صادر کیا کرتے تھے، اُن کے شاگرد اور شاگردوں کے
شاگرد اِن احکام کی پابندی پر جان دیتے تھے، اُس وقت اُردو کی غرض و غایت ایک تفریحی مشغلے سے زیادہ نہ تھی، اب ملک کو ایسی

زبان کی ضرورت ہے، جو اس سرزمین کی گوناگوں خصوصیتوں کو محفوظ و قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ زمانے کے مطابق ہر قسم کی ترقی کا آسان وسیلہ بن سکے، ظاہر ہے کہ وہ قانونِ زبان جو خلوت خانوں میں بیٹھکر مرتب کیا گیا تھا اس قسم کی زبان کا ساتھ نہیں دے سکتا، اور تنگ اور سخت بندشوں میں رہ کر کوئی زبان وہ خدمت انجام نہیں دے سکتی جس کی اب ہمارے ملک کو ضرورت ہے، ادیبوں اور شاعروں کا اب یہ فرض ہے کہ زبان کی جکڑبندیوں کو ڈھیلا کریں، نئے الفاظ اور ترکیبوں کا جو سرمایہ داخل ہو رہا ہے، اُس کو قومی ضروریات کا مفید ثمرہ اور ارتقائے قومی کا لسانی وسیلہ سمجھیں، ادب میں اُس کی صحیح جگہ معیّن کریں، ادب و شعر کو جمہور کی عام بول چال اور گھریلو زندگیوں کے مطابق بنا کر ہر دلعزیز بنائیں، جس سے شعر و ادب عوام کی رہنے بسنے کی سب حالتوں کی اصلاح کا ذریعہ بن سکیں، اُن کی سماجی دلچسپیوں کو بہتر بنا سکیں، ان میں کشمکش حیات کے مردانہ مقابلہ کی قوت پیدا کریں، زندگی کے مقاصد سے خبردار بنائیں، مختصر یہ کہ جو تمام ملکی و قومی زندگی کو بہ حیثیت مجموعی بلند کر کے مضبوط ہموار اور پاکیزہ بنائیں، یہ تمام مقاصد آسان اور گھریلو زبان کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے، اور یقیناً اس زبان سے یہ مہم سر نہیں ہو سکتی جو بات بات پر زبان کاٹنے اور قدم قدم پر بیڑیاں ڈالے

اِس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ اگر ہر شخص کی بولی زبان میں داخل کر لی جائے تو زبان چوں چوں کا مربہ بن کر رہ جائے، اس کا سب سے پہلا جواب یہ ہے کہ اُردو متعدد زبانوں کا مرکب ہونے کے باعث چوں چوں کا مرّبہ تو ہے ہی، بنکر کیا رہ جائیگی دوسرے یہ کہ ہم کو ضرورت ایسی ہی زبان کی ہے جو تمام بولیوں کی قائم مقام ہو اور جو دیہاتوں میں بسنے والے کسانوں کیلئے بہ نسبت شہریوں کے زیادہ سود مند ہو، چند شہر والے اپنے مرصّع کمروں میں آرام سے بیٹھکر غالب۔ آتش۔ داغ وغیرہم کے دیوانوں کا لطف حاصل کیا کریں لیکن عوام کو اس سے کیا فائدہ ہے:۔

ان تمام باتوں کے باوصف میرا یہ بھی مطلب نہیں کہ خواہمخواہ ہر غلط سلط لفظ کو جو عوام میں رائج ہو زبان کا معتبر جزو مان لیا جائے، یا ادب کی حدود ہی مٹادی جائیں، صرف ضرورت یہ ہے، کہ ان حدود کو وسیع کر دیا جائے، جو بہت سے پُرانے قواعد توڑے بغیر ناممکن ہے، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ہمارے ارباب فن بہت سے پُرانے سکوں کو جو صدیوں سے رائج ہیں نام نہاد قواعد و ضوابط کی گرفت میں لا کر زبان کے خزانے سے خارج کر رہے ہیں اور عجیب عجیب ہیئت کی ترکیبیں اُن کی جگہ لے رہی ہیں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ یہ کیوں ہو رہا ہے اس پر مفصل بحث ہندی، اُردو ہندوستانی کے عنوان سے اِسی رسالہ میں اپریل ۱۹۳۶ء میں کی جا چکی ہے آگے چلکر کچھ ایسے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں جو متقدمین کے عہد سے ابتک زبان کا ٹکسالی سکہ بنے ہوئے ہیں، مگر عربی فارسی کے دلدادہ صرف و نحو کے قواعد یا لغت کے ماتحت ان کو اُردو سے خارج کر دینے پر مُصر ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ یہ زبان ان کی مرضی کے مطابق رَواج پائے، یہ ممکن ہے یا نہیں، ملکی ضرورِیات ثابت کر رہی ہیں۔ بہر حال یہ ظاہر ہے، کہ ان ضوابط و قواعد نے ان اساتذہ فن کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ ضرور دیدیا ہے، جسے وہ معیار کے نام سے استعمال کر کے دُور دُور تک اپنا رُعب بٹھائے ہوئے ہیں اور جس تصنیف اور مصنف کو چاہتے ہیں مجروح و مضروب کر دیتے ہیں:۔

قانونِ قدرت کی راہیں انسانی تصرفات سے باہر ہیں، اور جب کسی سرزمین میں انقلاب آتا ہے تو وہاں کی قوم نیا جنم لیتی ہے، پرانے اداروں میں تبدیلی ہو جاتی ہے، اور زبان بھی پرانی بندشوں سے آزاد ہو جاتی ہے، اور نئی نئی ضروریات، نئے نئے مشاغل و مقاصد کے پورا کرنے کے لئے نیا چولا بدلنا شروع کر دیتی ہے، اس بارے میں اجارہ دارانِ فن کے لئے ایران کی مثال بہت سبق آموز ہے۔ ایران میں آج کل جو زبان رائج ہے اُس کو وہاں کی پرانی زبان سے کوئی علاقہ نہیں، اگر اب سے پچاس برس ہی پہلے کے ادبا و شعرا وہاں آج نمودار ہو جائیں تو نہ اُن کی بولی کوئی سمجھے نہ وہ کسی کی، اب جو زبان وہاں رائج ہے اُس میں ہزارہا لفظ ایسے ہیں جو اپنے پرانے لغوی یا اصطلاحی معنی کی حدود سے آزاد ہو کر نئے نئے مطالب و مفہوم ادا کرتے ہیں اور ہزاروں لفظ نئے ایسے وضع ہو گئے ہیں، جو نہ پرانے لغات میں ملتے ہیں نہ پرانی صرف و نحو کے قاعدوں میں آتے ہیں، ان سب کو جدید فارسی کا نام دیا جاتا ہے خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ اب میں وہ الفاظ پیش کرتا ہوں، جو اب تک شاعروں اور انشا پردازوں کا دستور العمل بنے ہوئے ہیں، اور جن کا قلع قمع کر دینے کے لئے اہل فن ہر وقت شمشیر بکف بیٹھے رہتے ہیں، ان الفاظ کو دو ذیلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے

(۱) وہ الفاظ جو عربی فارسی میں کچھ معنی رکھتے ہیں اور اردو میں کچھ اور، لیکن اب ان کا استعمال عربی یا فارسی معنی کے خلاف غلط بتایا جاتا ہے

(۲) وہ الفاظ اور ترکیبیں جو اپنی ساخت میں غلط بتائی جاتی ہیں:۔

۱۔ وہ الفاظ جو عربی فارسی میں کچھ معنی رکھتے ہیں، اور اُردو میں کچھ اور، لیکن اب ان کا استعمال عربی یا فارسی معنی کے خلاف غلط بتایا جاتا ہے

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اردو معنی	سند
دِقت	باریکی	مشکل	"یہاں سے اُس نے مصر کا رُخ کیا۔۔۔۔ جو بے دقت اُسکے قبضہ میں آ گیا (محمد حسین آزاد۔ سکندر اعظم) ع "بلا دِقت میں بن جاؤں تری ساس" اکبر الہ آبادی اُن میں اور شعر میں حد فاصل قائم کرنا مشکل ہے، زیادہ دِقت اس لئے ہوتی ہے" (شعر العجم حصہ ۴)
اوقات	جمع وقت	حیثیت	"میں تو غریب آدمی ہوں ٹکے کی اوقات" (جام سرشار ۲۹۱)
عرصہ	میدان	مدّت	"اور عرصۂ دراز کے بعد انکی زبان کو ادبی شان نصیب ہوئی" (تنقیدات عبدالحق ص…) کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے (غالب) ع تواں بعرصۂ چہل روز یا دو ماہ رسید (نعمت خاں عالی)
سرپرست	خادم	مربّی	"یہ بھی تجویز ہے کہ اس انجمن کی سرپرستی میں ایک سلسلہ اردوئے معلیٰ کے نام سے جاری کیا جائے" (تنقیدات عبدالحق)

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اُردو معنی	سند
			" اور کتاب کو اُردو کے سب سے بڑے سرپرست اعلیٰ حضرت . . . طرف نسبت دیکر نظام اُردو کے نام سے موسوم کر دیا " نظام اُردو منسوب از آرزو لکھنوی
معافی	صیغہ اسم فاعل بمعنی عفو کنندہ	چھما	" طبع کے بعد معافی مانگنا یہ اور ستم ہے " نوٹ :- قابلِ معافی اور طالبِ معافی عام طور پر رائج ہیں ؟
فرصت	نوبت	آرام پانا	" ہر خط میں آلام و امراضِ گوناگوں کا رونا اور قلتِ فرصت کا رونا " (تنقیدات عبدالحق) " فرصت ناز بھی پہروں نہیں ملتی افسوس وہ ہے مصروف تماشائے غزالاں کوئی (داغ)
مضطر	بے اختیار و بیچارہ	بے قرار	" اُس کی چتون پھرتے ہی محفل میں ہلچل پڑ گئی مضطرب کو مضطرب مضطر کو مضطر لے چلا (داغ) ع ساتھ اپنے اُنہیں لے کے گئی بانوئے مضطر (انیس) مضطر ہوں چین آنے پہ آتا نہیں مجھے رونے میں منہ ترا نظر آتا نہیں مجھے (انیس) ع دیکھتے جاؤ ہمارے دلِ مضطر کے مزے (داغ)
فضا	فراخی زمین و کشادگی صحن	بہار، حالت	اک داغ رہ گیا ہے سو وہ بھی مٹا مٹا دِل میں بہارِ عشق کی اب وہ فضا نہیں (داغ) ع سُنا جو کرتے تھے وہ باغ پُر فضا ہے یہ (چکبست) ع ازل میں تھی جو فضا اُس کا یادگار ہے یہ (چکبست) " شاید آپ کو میں نے لفظ فضا کی تحقیق لکھدی تھی، اگر اُردو معنی لئے جائیں تو بہار کے ہو سکتے ہیں " شوق قدوائی مرقع ادب صفحہ ۹۱
محرم	واقف کار	انگیا	کسی کی محرمِ آب رواں کی یاد آئی حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا
مشکور	شکر کیا گیا، ستودہ	شکر کرنیوالا	ایک نے مجمع سادات میں بڑھکر یہ کہا گرچہ اس لطف کے مشکور رہیں ہم خاک نشیں (شبلی)

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اردو معنی	سند
			"نہ یہ کہ سارا پنجاب خاص اُردو کی واقفیت کیلئے ان کا مشکور ہو" (منشورات از کیفی دہلوی) ع نہ ہو مشکور کیوں پھر بندہ لطف کبریائی کا (ذکی تلمیذ غالب) "منت کے بعد نامہ سعادت آیا ممنون و مشکور کیا" (امیر مینائی مرقع ادب ص۲۵)
منت	احسان کردن	خوشامد	اس نے نمانی نہ کوئی میری بات منتیں کرکے بات بھی کھوئی (داغ)
تکلیف	کار فرمودن	دُکھ	شب فراق کی تکلیف سے یقین آیا مقابل اس کے جہنم میں عیش ہوتا ہے (داغ)
خاطر	دل	آؤ بھگت مدارات	"وہ جوہری کچھ ڈٹا ہوا ہے اور بڑی خاطریں ہو رہی ہیں" (جام سرشار ص۲۶) "اُن کی خاطر داری اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا" (محمد حسین آزاد - سکندر اعظم) ع "نانا کی طرح خاطرِ اُمت تھی زیادہ" (انیس)
مرتبہ	درجہ رُتبہ	بار - دفعہ	اُردو میں اس کا استعمال دفعہ کے معنی میں عام ہے اور اب فارسی میں بھی اس معنی میں عام ہو گیا ہے۔ جیسے ذیل میں "ازاں جملہ نہ سال و ہشت ماہ مرتبہ اول حکومت نمود و بعد ازاں پانزدہ سال در کابل و قندھار مرتبہ ثانی۔۔۔۔۔" (از زینت الزماں ذکر جلوس ہمایوں)
غصہ	اندوہ	غیظ - کرودھ	قلزم کے بدن میں لگ گئی آگ منہ پر غصہ سے آ گئے جھاگ (منشی جوالا پرشاد برق) غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے (آتش)
روزگار	زمانہ	روزی	"ایک لڑکی چھ مہینے کی گود میں، ابھی تک کوئی صورت روزگار نہیں اور نہ کہیں سے اُمید ہے" (شریف زادہ از مرزا رسوا لکھنوی)

میں نے صرف چند الفاظ مثال کے طور پر پیش کئے ہیں۔ اور جن مقامات پر خط کھینچ دئے ہیں۔ اُن سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ اور اسی قبیل کے دیگر الفاظ اپنے اُردو مفہوم میں صرف مفرد استعمال نہیں ہوتے، بلکہ تراکیبِ فارسی کے ساتھ بھی ان کا استعمال جائز ہے۔

۲۔ وہ الفاظ اور ترکیبیں جو اپنی ساخت میں غلط بتائی جاتی ہیں:۔

لفظ	کیفیت	سند
مُنشّی	نشہ سے بنایا گیا بمعنی نشہ کرنے والی چیز	"مس کو کسی منشی دوا سے بیہوش کر کے بھگا لے گیا۔" (جامِ سرشار صفحہ ۲۳۹)
نشیلی	نشے سے رسیلی کے انداز پر بنایا گیا	ع یوں نشیلی ایسی متوالی نہیں (داغ)
زہریلی	زہر سے رسیلی کے انداز پر بنایا گیا	"معشوق کی آنکھ کو زہریلی شعرائے فارس نے بھی کہا ہے۔" (شوق قدوائی مرقعِ ادب صفحہ [illegible])
عادی	عادت سے بنایا گیا	ع ہم جو عادی ہو گئے دشنام کے (داغ) ع قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی (چکبست) تیغ ابرو کی زبان عادی ہوئی بلکہ سیدھی بھی جو کی ٹیڑھی ہوئی (خواجہ وزیر)
سوائے	اصل لفظ سوا ہے	"سوائے وہی ڈینگ اور کوئی بات نہیں (جامِ سرشار صفحہ [illegible]) کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن سوائے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیئے (غالب) "اُن سب نسخوں میں سوائے ایک کے یہ شعر یوں لکھا ہے" (تنقیدات عبدالحق صفحہ ۲)
بہتات	عربی فارسی میں کوئی لفظ نہیں	دل ہمارا موردِ آفات ہے رنج کی بہتات ہی بہتات ہے (داغ) گوناگوں تیلیوں کی بہتات کب ہوتی ہے جب ہو خوب برسات (صفی لکھنوی)
بدحواسی	فارسی میں بےحواسی مستعمل ہے	کیا کہوں وجہ بدحواسی کی ہوش پرّاں ہیں رنگِ محفل سے (داغ) ع سمجھ لیا ہے ستمگر نے بدحواس مجھے (داغ) بجائے مے دیا پانی کا اک گلاس مجھے سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے (سرور جہان آبادی) "شیریں کمان کی بدحواسی اور غم و غصہ اور رنگِ چہرہ کے پرواز پر بغور نظر ڈال رہی تھی۔" (جامِ سرشار صفحہ [illegible])

لفظ	کیفیت	سند
تلاشی متلاشی	نزکی لفظ تلاش سے بنے ہیں	نکلا ہے تلاشی سے فقط اک درم داغ یاروں کو مرے دل پہ ہزاروں کا بھرم تھا (داغ) ع جلوت میں یوں ہے وہ کہ تلاشی ہے چشم شوق (داغ) شب کو خیال رہتا ہے اِک رشکِ حور کا ظلمت میں دل مرا متلاشی ہے نور کا (آتش)
بادشاہت	یہ لفظ چاہت کے طریقہ پر بنا ہے	"یہ بہار دیکھکر اپنے رفقا سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا میں اسی عیش و عشرت کا نام بادشاہت ہے" (محمد حسین آزاد - سکندر اعظم)
رہائش	فارسی حاصل مصدروں کے انداز پر رہنا سے بنا۔	انشا کی دریائے لطافت میں ص۱۳۱ پر اور رسالہ صبح امید میں جس کے ایڈیٹر حضرت چکبست تھے صفحہ ۳ و ۳۱ پر استعمال ہوا ہے
قدیمی	اصل لفظ قدیم ہے	میں ہوں آپ کا قدیمی دعاگو" (امیر فقیر مرقعِ ادب ص۲۴)
صافی	اصل لفظ صاف ہے	آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را (غالب) آبِ صافی بنکے شکل ابرِ تر ہے برستا قطرہ قطرہ خاک پر
بہبودی	اصل لفظ بہبود ہے	"لیکن زبان کی بہبودی اُن کی یا کسی کی خوشنودی پر فوقیت چاہتی ہے"۔ نشورات از کیفی دہلوی ص۲)
شروعات	شروع سے بنایا گیا	"یہاں سے اُردو کی تنسیق و تنظیم شروع ہوئی جو اُنیسویں صدی عیسوی کی شروعات تک برابر جاری رہی" (منشورات از کیفی دہلوی ص۹)
تبادلہ	عربی فارسی میں کوئی لفظ نہیں	"تبادلۂ خیالات کے بعد اُنھوں نے مجھی کو اس کام کے لئے مجبور کیا۔ (نظام اُردو از آرزو لکھنوی ص خ) (نوٹ۔ یہاں تبادلہ ترکیب اضافی کے ساتھ ہے)
مکرر	مکرر کی مثال پر بنایا گیا	"نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک قافیہ کو مکرر سہ کرر باندھنا پڑتا ہے شعر الہند ص۲۹ از عبد السلام ندوی)
بلا	بلا اور لا دونوں عربی نہیں ہیں اور دونوں دو زبانوں کے جزو ہیں اس لئے بلا غلط کہا جاتا ہے،	"اُردو کی اصل وہی زبان مانی جا سکتی ہے جس کے الفاظ سے بلا شرکت غیرے کوئی ایسا جملہ بن جائے جسے اُردو کہہ سکیں (نظامِ اُردو از آرزو لکھنوی ص۵)

لفظ	کیفیت	سند
		ع "بلا وقت میں بن جاؤں تری ساس" (اکبر الٰہ آبادی)
لاچار	لا عربی اور چار فارسی، اعلیٰ لفظ کہا جاتا ہے	قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا ذوق ع اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے (چکبست)
ازحد	بمعنی ازحد زیادہ	"اس ننگ کو بیٹی کے باپ نے گوارا نہ کیا۔ قیس کو ازحد رنج ہوا (شریف زادہ مرزا رسوا صہ ۵۹) بہت نادم خجل ازحد نہایت منفعل ہو گے اگر منھ ڈال کر دیکھو گے تم اپنے گریباں میں حکیم محمد آور گرچہ ازحد ہوں گنہگار مسلمان تو ہوں پیچھے پیچھے مرے دوزخ میں بھی جنت آئی (داغ)
بُوباس	ایک لفظ فارسی ایک ہندی	بوباس غیر ہے تیرے پھولوں کے ہار میں (داغ) (نوٹ۔ اضافت کے ساتھ بو باس ہے)
پھبتی نما	ایک لفظ ہندی ایک فارسی	"جدید لیکن پھبتی نما تشبیہیں بھی اس رنگ کا ایک لازمی جزو ہیں" (شعر الہند صہ ۳۷)
سمجھ دار	" "	"سمجھدار آدمی سے زیادہ کہنا دیوانہ پن ہے" (منشورات از کیفی دہلوی صہ ۲۲۶)
تابعدار	تابع کے ساتھ دار زائد ہے	ع غمخوار باپوں کی رہیں ماؤں کی تابعدار تم (حالی)
ڈھلمل یقین	ایک لفظ ہندی ایک عربی	"بلکہ عمل سے بھی ضعیف الاعتقاد اور ڈھلمل یقین ہیں" (منشورات از کیفی دہلوی صہ ۱۶۲)
فوق البھڑک	ایضاً	وہ مس فوق البھڑک لباس زیب تن کئے اتراتی پھرتی تھی (جام سرشار صہ ۲۳۹)
لگاوٹ باز	ایضاً	"انکھڑیاں لگاوٹ باز" " "
گراں ڈیل	ایضاً	"دو بڑے گرانڈیل اژدہوں کی طرح منھ کھولکر (جام سرشار صہ ۱۱۱)
بے ساختہ پن	ایضاً	زیور کی نہیں حاجت ہرگز بھی حسینوں کو معشوق وہ ہے جس میں بیساختہ پن ہوگا (داغ)
گل تکیہ	گل مخفف گال ہندی اور تکیہ عربی	وہ گل تکیہ جیسے سر قدمیں رکھنا معطر ہو جو زلف مشکبو سے (داغ)

لفظ	کیفیت	سند
دیوانہ پن	ایک جزو فارسی ایک ہندی	وہ رہگذر وہ کوچہ وہ در مجھ سے کب چھٹتا کچھ ہوش کا لگاؤ بھی دیوانہ پن میں ہے (داؔ
لاأبالی پن	ایک جزو عربی ایک ہندی	"مگر اُن کی بے پروائی اور لاأبالی پن سے کچھ تعجب مرقعِ ادب ص۲۲
دانہ پانی	ایک جزو فارسی ایک ہندی	قفس ہی میں جائیں گے ہم گلستاں سے ہمارا یہاں دانہ پانی نہیں ہے (داؔ
غلطی	اصل لفظ غلط ہے	غلطیہائے مضامین مت پوچھ لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں (غالؔ
طرفدار	بمعنی جانب دار استعمال ہوتا ہے ایک لفظ عربی ایک فارسی ہے	دل روزِ حشر اُس کا طرفدار ہو گیا بگڑا مرا معاملہ جھوٹے گواہ سے (داؔ ع طرفداری قیامت میں کریگا پاسباں میری (داؔ ہم تو دیوانے ہیں مجنوں کی کہے جائینگے ہیں حسین آپ طرفداریٔ لیلےٰ کیجے یہاں طرفداری بہ ترکیب اضافی ہے (ذوقؔ
پاٹ دار	ایک جزو ہندی ایک فارسی	اے ہمصفیر میری فغاں کا ہے رنگ اور آواز پاٹ دار کہاں عندلیب کی (داؔ

"قریب المرگ" کو اس لئے غلط بتایا جاتا ہے کہ قریب عربی ہے اور مرگ فارسی، اور عربی قاعدہ سے دونوں کو ... گیا۔ اگر اس لفظ کو زبان سے خارج کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ کسی کے اختیار کی بات نہیں تو صدہا امکان اور حور و غلمان وغیرہ نکالا جائے۔ ان میں بھی ایسا ہی نقص ہے لفظ تو ہیں عربی اور جوڑ فارسی اضافت و عطف سے لگایا گیا ہے ان کو کوئی نہیں نکال سکتا میں عرض کرتا ہوں کہ ایسے الفاظ اور ترکیبوں کو عربی فارسی قاعدے سے جانچا ہی کیا ... انہیں عربی فارسی کا ایسا پیوندی جزو کہیئے، جو اُردو ہے، ورنہ اگر ایسے الفاظ کو غلط ہی کہہ دیا جائیگا۔ تو بہت سا ... ایسا خارج ہو جائیگا جس کی جگہ کوئی دوسری چیز پُر نہ کر سکے گی، اور خارج کہاں سے ہو جائیگا۔ صرف علماء و بلغا ... سے جمہور تو اسی لفظ سے اپنا کام نکالیں گے، جو موقع اور محل کے مطابق ہوگا، اور ان الفاظ نے اپنا خاص م...

زبان میں پیدا کر لیا ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا، اُردو تو اُردو فارسی میں بھی ایسے الفاظ اور ترکیبیں ملتی ہیں جن کا ایک جزو عربی ایک فارسی ہے، مثلاً خیمہ گاہ۔ ارادت کیش۔ عقیدت مند۔ یہی نہیں بلکہ فارسی نے بہت سے ہندی الفاظ کو بھی اپنا لیا مثلاً بادلہ پوش۔ چیرہ بند، جھکڑ۔ گلاب۔ فارسی جو ایک اجنبی زبان تھی۔ اُس نے ہندی کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ اور اردو کے ٹھیکہ دار اپنی ہی زبان کے الفاظ کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں، اسی سلسلہ میں اضافی و عطفی تراکیب کے متعلق بھی کچھ ضمناً عرض کرنا مقتضائے مقام ہے۔ اردو میں اضافت کے لئے "کا" "کے" "کی" ہیں۔ اور عطف کے لئے "اور" و "اور" فارسی میں یہ کام زیر زبر پیش اور واؤ سے لیا جاتا ہے، فارسی میں اضافی و عطفی تراکیب سے دو اغراض پورے ہوتے ہیں ایک تو کلام میں کسی قدر اختصار ہو جاتا ہے اور دوسرے ترکیب میں چستی آجاتی ہے، اس کے لئے اب تک یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ہندی لفظ کے ساتھ فارسی اضافت یا عطف نہ آنا چاہیئے، مثلاً موسمِ برسات یا رنگ و روپ کہنا صحیح نہیں، لیکن زبان کی روز افزوں ترقی واضح کر رہی ہے، کہ اُسے اس قید سے بھی آزاد کرنا ہوگا۔ اور اس کے ادب کو زندگی کی نئی روشوں کے سانچے میں ڈھلنا ہوگا اور ضروریات جو ترکیبیں اختراع کرنے پر مجبور کر رہی ہیں: ارباب فن کے غم و غصہ کے برخلاف ادبی جزو بنکر رہیں گی، کس کی مجال ہے جو ذیل کی ترکیبوں کو اور ایسی ترکیبیں صدہا ہیں، جمہور تو خود تعلیم یافتہ طبقہ ہی کے استعمال سے روک سکے،

ممبرانِ لیگ۔ کارکنانِ کانفرنس۔ ممبرانِ بورڈ۔ جلسۂ بورڈ۔ مالکانِ مل۔ افرادِ کمیٹی۔ طلبائے کالج۔ کاریگرانِ مل۔ افسرانِ محکمہ۔ لیڈرانِ ملک و قوم وغیرہ وغیرہ جب فارسی، عربی اور عربی عربی الفاظ فارسی کی اضافی و عطفی تراکیب کے ساتھ رواج پاکر مستند ہو گئے، جیسے حدِ امکان اور حور و غلمان اور ہندی فارسی الفاظ میں بھی افصح الفصحا داغ نے اضافت لگانے میں تعصب نہیں برتا جیسے "بو باس غیر" تو انگریزی اور ہندی لفظوں کے ساتھ کیوں تعصب برتا جائے، دورِ حاضرہ کے وسیع النظر ادیبوں اور شاعروں نے اس کا احساس بھی کر لیا ہے اور اس کی مثالیں بھی پیش کر دی ہیں، حضرت عزیز لکھنوی مرحوم فرماتے ہیں:-

کنارا کیجئے گا صحبتِ رندانِ کالج سے ۔۔۔ غضب ہی ڈھائیں گے اے شیخ یہ پھندے ہیں انگریزی

اکبر الہ آبادی کے یہاں اس قسم کی مثالیں متعدد ملتی ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک بات اور یاد آگئی وہ بھی عرض کر دوں، اُردو میں عربی فارسی کے بہت سے ایسے لفظ مستعمل ہیں جن کے اوّل میں حروف متحرک ہیں۔ جیسے کَلِمہ۔ صَدَقہ۔ اَرِنی۔ حَرَکت۔ بَرَکت وغیرہ نثر میں تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ الفاظ صحت حرکت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں یا نہیں، مگر نظم میں جہاں ایسا کوئی لفظ حرف دوم کے سکون کے ساتھ آیا۔ کہ ارباب فن نے فوراً فتویٰ لگا دیا غلط غلط۔ اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ فارسی میں بھی یہ پابندی توڑ دی گئی ہے مثلاً

موسیٰ ازیں جام تہی دید دست شیشہ بکہ پایۂ ارنی شکست

چناں باد شمشیر دستے فشاند کہ در خرمن عمر برکت نماند (زندتی)

صبا ہا خجلتِ سائل بزمینم در کرد بے زری کرد بمن آنچہ بقارون زر کرد (صائبؔ)

زبس خوش حرکت و شیریں ادا بود کہ گر میداد تیزی خوشنما بود (مُلا فوقی)

اوپر کے شعروں میں ارنی، برکت، خجالت، حرکت بہ سکون حروف دوم آئے ہیں، اُردو کے شعرا نے بھی یہ تصرف جائز رکھا ہے، میؔر کو یہ کہے ہوئے زمانہ گزر گیا:۔

"خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھ زاہد"

لیکن ناواقفانِ اُصولِ زبان مدعیانِ فن بنکر عام رواج کے خلاف احکام صادر کرتے ہیں، اب اُن سے کیا کہا جائے، سوا اس کے کہ اُردو کے اساتذہ کے یہاں سے نمونے پیش کرکے اُن کی مزید تشفی کردی جائے،۔

اشکِ خجلت کسی میکش کے جو دوزخ میں گریں اوس پڑ جائے دہکتے ہوئے انگاروں پر (داغ)

تعلیم کا شور ایسا تہذیب کا غل اتنا برکت جو نہیں ہوتی نیت کی خرابی ہے (اکبر الہ آبادی)

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت بڑھا جانب بو قبیس ابرِ رحمت (حالی)

ع سر دیتے ہیں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار (انیس)

ہاتھوں کو جوڑتی ہوں میں یا شاہ بحر و بر شفقت کی اُس کے حال پہ ہر دم رہے نظر (انیس)

شاعری میں ان قیدوں میں اور بھی اضافہ کردیا گیا ہے، مثلاً حروفِ علت کا دبنا۔ تعقید، ترکیبِ اضافی و عطفی میں اعلانِ نون، یائے مشدد کا آنا، وغیرہ وغیرہ جس پر کبھی کسی دوسری فرصت میں کچھ عرض کیا جائے گا۔

(شام موہن لال جگر بریلوی) "زمانہ"

سید ہمایوں مرزا صاحب کے بعد

میرے شوہر سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر ایٹ لا علیہ الرحمتہ ہمیشہ مجھ سے یہ کہا کرتے تھے کہ ہماری اولاد نہیں ہے ہمارے بعد کیا ہوگا کون فاتحہ پڑھے گا حسرت دیا ہی ہمارے مزار پر برسے گی ہم گمنام ہی دنیا سے چلے، ہمارا کوئی بھی تو وارث نہیں۔ میرے باپ دادا کا نام ختم ہو رہا ہے۔ یہ باتیں سُن سُن کر مجھے بھی افسوس ہوتا تھا۔ کہ ان کا کوئی بھائی بہن بھی تو نہیں، میں کہا کرتی تھی آپ دوسرا عقد کرلیں اگر کہو تو میں خود آپ کے لئے کوئی لڑکی تجویز کردوں، مگر اُنھوں نے میرے اصرار پر بھی دوسرا عقد نہیں کیا اور ۷۰ سال کی عمر

میں دُنیا سے رُخصت ہوئے، اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ جو لوگ صاحبِ اولاد مگر ہیں جنہوں نے دولت بھی چھوڑی اور اولاد بھی ان کا سنگِ مزار بھی نہیں۔

پچھلے سال میں لاہور گئی تھی، اور سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئی، چبوترے پر مزار ہے نہ مقبرہ بنا ہے نہ سنگِ مزار ہے۔ شاد مرحوم کے پوتے کا خط میرے نام آیا ہے۔ کہ جنابِ شادؔ کا سنگِ مزار لگوا دیجئے، یہ حالت اُن لوگوں کے مزار کی ہے جنکو دُنیا پوج رہی ہے اقبال کے نام پر ہر جگہ جلسے ہوئے انجمنیں قائم ہوئیں رسالے نکلے مگر ابتک یہ مزار تیار نہیں ہوا۔ یہ لوگ صاحبِ اولاد بھی تھے، اور نام بھی خوب پیدا کیا۔ سید ہمایوں مرزا صاحب لاولد تھے پٹنہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے نہ بھائی تھا نہ بہن۔ پردیس میں اپنے وطن سے دُور لاوارث دُنیا سے رُخصت ہوئے، انتقال کے بعد حضرتِ اقدس اعلیٰ سرکار نظام شاہ دکن میر عثمان علیخاں خلد اللہ ملکہ نے تاریخِ وفات ارشاد فرمائی "در جنت ہمایوں ہم برفت" اس تاریخ پر حفیظ ہوشیار پوری نے یہ لکھا ہے۔

در ہوائے عالمِ نیرنگِ بو، سیدِ والا ازیں عالم برفت

گفت تاریخش شہنشاہِ دکن جانبِ جنّت ہمایوں ہم برفت

اور بہت سے لوگوں نے تاریخیں لکھیں، تعزیت کے جلسے ہوئے، ہائیکورٹ و محکمۂ فوجداری وغیرہ کی تعطیل ہوئی۔ اُن کا مقبرہ میں نے ایسا خوبصورت بنوایا ہے، کہ اکثر بڑے بڑے بادشاہوں کا بھی ایسا مقبرہ نہیں ہے جس کے ستون ایک سو چار ہیں مرحوم کی ۴۸ صفحہ کی خود نوشت سوانحعمری "میری کہانی میری زبانی" ہے۔ یہ بھی چھپ گئی ہے، اور حج بدل بھی کروا چکی ہوں۔

مقبرہ میں قرآن خواں موجود ہے، مقبرے کے قریب ہی بازو میں ایک مدرسہ بھی بچیوں کا ہے، مدرسۂ صفدریہ بھی ہمارا ہی ہے مرحوم نے ایک ایکڑ زمین دی تھی۔ اور سات ہزار روپے دئے تھے، اسکول کی لڑکیاں روزانہ مقبرہ میں پڑھتی ہیں۔ قرآن خواں اذان دیتا ہے۔ خوبصورت بلور کی طرح مقبرہ ہے جس کے چاروں طرف کمسن لڑکیاں گھومتی ہیں۔ مرحوم کی پہلی برسی میں میری کہانی میری زبانی مفت تقسیم کی اور غربا کو کھانا کھلایا کپڑے تقسیم کئے، اس سال ۱۹۴۰ء میں دوسری برسی ہوئی تو مرحوم کا دیوان تقسیم کیا گیا، اور کتاب حالاتِ بی بی فاطمہؓ جو میں نے لکھی ہے تقسیم کی گئی، غربا کو کپڑے تقسیم کئے کھانا کھلایا گیا۔ مقبرے میں بجلی کی روشنی کی گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے اولیا اللہ کی درگاہ ہے، نہایت خوبصورت ہے میں تنہا عورت اکیلی کیا کر سکتی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس قدر سخت رنج و غم کی حالت میں مجھ سے یہ مقبرہ بنوا دیا۔ تمام تمام دن مقبرے میں مرحوم کے مزار کے پاس بیٹھی رہتی، مقبرہ بنوانے کی نگرانی میں خود کرتی تھی۔ اور سوانح عمری کا پروف بھی وہیں دیکھتی، میں نے اپنی ڈیڑھ لاکھ کی جائداد غربا کے لئے وقف کر دی ہے، بیرسٹر صاحب مرحوم ہمیشہ اولاد کی فکر میں رہا کرتے تھے اُن کے لئے جو کچھ ہوا سب خدا کی طرف سے ہوا۔ اولاد والے دیکھیں اور نیک کام کرتے رہیں صرف اولاد کے بھروسے بیٹھے نہ رہیں۔ خدا کرے سید ہمایوں مرزا صاحب کا نام ہمیشہ زندہ رہے تاکہ دوسروں کو معلوم ہو کہ لاوارث کا وارث بھی ایک زبردست ذات ہے

صغرا ہمایوں مرزا

"عصمت"

مطبوعات

کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ پروفیسر اُردو جامعۂ عثمانیہ نے مجلسِ اشاعتِ دکنی مخطوطات کی طرف سے گول کنڈہ کے اِس مشہور تاجدار (۹۷۳ تا ۱۰۲۰ سنہ ہجری) کے اُردو کلام کا مجموعہ اور حالات وکلام پر تبصرہ ایک ہزار اڑسٹھ صفحات کی اِس ضخیم کتاب میں شائع کیا ہے۔ پیش لفظ میں مولوی سید محمد اعظم صاحب صدرِ مجلس لکھتے ہیں کہ "پیوستہ سال سٹی کالج میں دو صد سالہ جشنِ یادگارِ ولیؔ کے موقع پر دکن کے مخطوطات" کی جو نمائش منعقد کی گئی تھی اِس سے معلوم ہوا کہ کتنے ہی انمول جواہر پارے ایسے ہیں جن کی اشاعت سے نہ صرف اُردو ادب کے ذخیرے میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوگا بلکہ اُن سے اُردو کی ابتدائی ترقیوں اِس زبان کی عہد بعہد تبدیلیوں اور عہدِ گزشتہ کی تہذیب و تمدن کے متعلق نہایت کارآمد معلومات حاصل ہوں گی۔ نیز اِس عہد کی کتابوں کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ ابتدائی اُردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ کے ساتھ ہندی کے الفاظ بھی برابر کے شریک تھے جو بعد کو رفتہ رفتہ زبان سے خارج ہوگئے۔

فاضل مرتّب نے تین سال کی محنت اِس کتاب پر صرف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر بعض الفاظ اور ترکیبوں کو وُہ اب تک سمجھ نہیں سکے تو تعجب نہیں کیونکہ خود محمد قلی قطب شاہ لکھ گئے ہیں :-

ہمارا علم ہے سب عالماں پر جوں اعجاز   نہ لکھ سکے گا کنے شرح مجھ کتاباں کا

کلیات سے پہلے تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کا ایک نہایت دلچسپ اور مفید مقدمہ لکھا گیا ہے۔ محمّد قلی قطب شاہ اکبر کا ہم عصر تھا۔ "اس کا کلام کسی ملک الشعراء کے شعری کارناموں سے بھی کسی طرح کم نہیں"۔ وہ صرف اُردو کا شاعر نہ تھا فارسی اور تلنگی میں بھی اُس نے ہزاروں شعر لکھے۔ اس کے نعمت خانے میں اس کے دسترخوان پر کبھی دس ہزار آدمی سے کم نہ ہوتے۔ حیدرآباد اُسی کا بسایا ہوا ہے۔ محمّد قلی کا اُردو کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں ہر صنفِ سخن کے وافر نمونے ہیں محلاّت کی رنگینیاں غریبوں کی زندگی کھیل کُود تماشے نیچرل شاعری سب موجود ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ محمّد قلی کی زبان میں حلاوت اور شیرینی ہے اور اس کا ناگری حروف میں منتقل ہونا بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن ہم فاضل مرتب کے اِس دعوے سے متفق نہیں ہیں کہ "اگر کوئی زبان ہندوستانی کہلائی جاسکتی ہے تو وہ اس شاعرِ اعظم کی زبان ہے"۔ مرورِ زمانہ کی وجہ سے تین چار صدیاں پہلے کی ہندوستانی آج کل کیسے ہندوستانی کا کام دے سکتی ہے؟

محمد قلی قطب شاہ کی بیسیوں معشوقائیں "تھیں جن میں ۲ بارہ پیاریاں" زنخی سانولی کونلی پیاری گوری چھبیلی رنگیلی لالالالن وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مقدمے کے بعد پہلے ۳۲۴ صفحات میں نظمیں ہیں پھر ۲۹۶ صفحات غزلیات اور ۷۴ صفحات دیگر اصنافِ سخن پر مشتمل ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ ہی ہیں جن کے یہ شعر خاص و عام میں مشہور ہیں :-

پیا باج پیالہ پیا جائے نا ۔۔۔ پیا باج یک تل جیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند ۔۔۔ دوانے کوں کچھ پند دیا جائے نا

چند اور شعر سُن لیجئے :-

چند سُو تیرے نور تے نس دن کو نورانی کیا ۔۔۔ تیری صفت کن کر سکے توں آپی میرے جیا
تج نام تے آرام منج جیو سو تج نام سے ہے ۔۔۔ سب جگ کو تجھ سوں کام ہے تج نام ہے اللہ ہوا
بندہ ہوں گنہگار خدا میرا گنہ بخش ۔۔۔ تج لطف کر افیض خدا منج کوں سدا بخش
منج جیو کے بُلبل بن کوں کر آپ شوق ہوں تازہ ۔۔۔ منج نین کے دین کوں آپس مکھ تھے صفا بخش (تیرے) (کا) (مجھ کو)
(میرے دل پھول بن کو پتے سے)
منج بخت کے تارے کوں سدا رکھ توں جھلکتا ۔۔۔ منج عشق کے تروج کوں سو دن دن سمل نصیب بخش (میری آنکھ آئینہ کو اپنے چہرے سے)

مرتب نے اکثر اشعار میں متروک الفاظ کے ساتھ مستعمل الفاظ درج کر دیئے ہیں جس سے کلام کے سمجھنے میں خاصی آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب بلا شبہ نہایت دلچسپ اور مفید ہے اور ہم مرتب کو اس اعلیٰ درجے کی تالیف پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ کتاب با تصویر اور مجلد ہے قیمت پندرہ روپے ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر خیریت آباد (حیدرآباد دکن)

کلیاتِ سراج :- اس مجلس نے یہ دلکش با تصویر کتاب بھی شائع کی ہے ۔ اس کے مرتب عبدالقادر سروری صاحب لکچرر اُردو جامعہ عثمانیہ ہیں۔ یہ سراج اورنگ آبادی کے کلام پر مشتمل ہے۔ شروع میں ایک دلچسپ مقدمہ ہے۔ سراج کی ولادت ۱۱۲۸ھ میں ہوئی۔ سراج آبرو اور میر کے ہمعصر تھے۔ وہ ولی سے بہت سے متاثر ہوئے۔ اُن کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ کلیات کا آغاز سراج کی مشہور مثنوی بوستان خیال سے ہوتا ہے جو ایک آپ بیتی پر مبنی ہے :-

ارے ہم نشینو! مرا دکھ سنو ۔۔۔ مرے دل کے گلشن کی کلیاں چنو
فلک ہو تو اس چوٹ سے جائے لوٹ ۔۔۔ جگر کے جگر کے جگر میں ہے چوٹ
نہ کھلتا ہے دل گشتِ گلزار میں ۔۔۔ نہ لگتا ہے جی سیر بازار میں
اگر سلطنت ہاتھ آوے تو کیا ۔۔۔ وگر کیمیا گنج بتا دے تو کیا
کہ جمعیتِ دل پریشان ہے ۔۔۔ مرا فرحت آباد ویران ہے

مثنویات کے بعد غزلیات اور متفرقات اور پھر فارسی کلام درج کیا گیا ہے۔

انتخاب ملاحظہ ہو :-

ہماری آنکھوں کی پتلیوں میں ترا مبارک مقام ہوگا ۔۔۔ پلک کے پٹ ہم نے کھول دیکھے تو عین ہاتھ تمام ہوگا

اے شرابِ خرد کے کیفی نہ کر تُوں دعویٰ لمِ پختہ مغزی
مئے محبت کا جام پی تُوں کہ اب تلک ظرفِ خام ہوگا

دورنگی خوب نہیں یک رنگ ہوجا
سراپا موم ہو یا سنگ ہوجا

کہو اُس لالۂ گلزارِ جاں کوں
کبھی تو دیکھ داغِ دل کسی کا

شربتِ دیدار کے بن زندگانی ہیچ ہے
بے رُخِ ساقی حیاتِ جاودانی ہیچ ہے

گر حقیقت کی بسیر ہے خواہش
راہِ عشقِ مجاز لازم ہے

صنم ہزار ہوا تو وہی صنم کا صنم
کہ اصلِ ہستی بے بوُ ہے عام کا عدم

مشتاق ہوں میں تیری فصاحت کا لیکن
رانجھا کے نصیبوں میں کہاں ہیر کی آواز

کتاب کی ضخامت ۴۷۶ صفحات ہے قیمت پانچ روپے ہے۔ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد (حیدرآباد دکن)۔

سیاستِ ملیہ:- یہ دلچسپ اور مفید کتاب جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے مسلمانانِ ہند کی سیاست (۱۸۵۷ء تا آغاز ۱۹۴۱ء) کی مکمل مفصل "تاریخ" ہے جسے جناب محمد امین صاحب زبیری مارہروی نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب چونکہ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اس لئے اسے مصنف نے بجا طور پر راجہ صاحب محمود آباد کے نامِ نامی سے منسوب کیا ہے۔

اس کتاب کے ۱۹ ابواب ہیں۔ افسوس ہے کہ ان میں عنوانات قائم نہیں کئے گئے لیکن نقشۂ ذیل سے ان کی جداگانہ کیفیت ظاہر ہوگی:-

بابِ اوّل: (تا ۱۸۸۲ء) ہندوستان میں مسلمانوں کا زوال۔ ابتدائی سیاسی میلانات۔ بابِ دوم:- (۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۴ء) کانگریس کی تاسیس۔ سرسید کی سیاسی پالیسی۔ بابِ سوم (۱۹۰۰ء تا ۱۹۰۹ء) سیاسی تنظیم کی کوشش۔ نفاذِ اصلاحات۔ بابِ چہارم:- (۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۴ء) انتخابِ جداگانہ سے ہندوؤں کا اشتعال۔ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش۔ بابِ پنجم (۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۹ء) مسلم لیگ اور کانگریس کا میثاق۔ آئینی اصلاحات کی رپورٹ۔ بابِ ششم (۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۳ء) ترکِ موالات۔ بابِ ہفتم (۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۶ء) شدھی اور سنگٹھن کی تحریکات۔ بابِ ہشتم (۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۰ء) نہرو رپورٹ۔ کانگریس کے اجلاسِ لاہور میں اعلانِ آزادی۔ سول نافرمانی۔ بابِ نہم:- (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۵ء) گول میز کانفرنسیں۔ کمیونل ایوارڈ۔ آل مسلم پارٹیز کانفرنس۔ بابِ دہم: (۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء) کانگریس کی لیگ سے معاندت۔ لیگ کا اجلاس لکھنو۔ بابِ یازدہم:- (۱۹۳۸ء) کانگریس اور لیگ میں مذاکرات۔ بابِ دوازدہم: (۱۹۳۸ء) اجلاسِ مسلم لیگ منعقدۂ پٹنہ۔ بابِ سیزدہم (۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۰ء) کانگریسی وزارتوں کے صوبوں میں مسلمانوں کے خلاف آئینی وغیر آئینی کارروائیاں۔ بابِ چہاردہم (۱۹۳۹ء) جنگ کا آغاز اور وائسرائے اور سیاسی لیڈروں کی ملاقاتیں۔ بابِ پانزدہم:- (۱۹۳۹ء و ۱۹۴۰ء) کانگریسی وزارتوں کے استعفے۔ یومِ رستگاری۔ بابِ شانزدہم: (۱۹۴۰ء) اجلاسِ مسلم لیگ منعقدۂ لاہور۔ بابِ ہفدہم: (۱۹۴۰ء) مذاکرات متعلقِ آئینِ جدید۔ وائسرائے کی پیشکش۔ بابِ ہیژدہم: (۱۹۴۰ء) سول نافرمانی کی مہم۔ بابِ نوزدہم: (۱۹۴۰ء و ۱۹۴۱ء) پاکستان

اخیر میں مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن اور جدید مردم شماری سے متعلق دو ضمیمے درج کئے گئے ہیں۔

کتاب ۱۴۴ صفحات پر ختم ہوئی ہے اور مجلد ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ ملنے کا پتہ۔ عزیزی پریس آگرہ ہے۔ اس کتاب کے مفید ہونے میں ذرا بھی شک نہیں۔ سیاست کے ہر طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

شمیم کے سو شعر۔ سید جمیل الدین صاحب نے جناب مظفر حسین صاحب شمیم کے سو اشعار کا یہ انتخاب شائع کیا ہے شمیم صاحب ایک کامیاب ڈراما نگار اور ادیب ہیں امید ہے کہ ان کے اشعار کا یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ قیمت ۴ر پتہ عثمانیہ بک ڈپو۔ دکان ۱۵ محمد علی بلڈنگ بمبئی ۳

انتخاب شاد۔ جناب رضی حیدر صاحب نے حضرت شاد عظیم آبادی کے سو شعروں کا یہ دلکش انتخاب شائع کیا ہے۔ قیمت صرف ۲ر پتہ نور الحسن صاحب۔ مراد پور۔ گیا۔

مکتبۂ جامعہ کا پنج سالہ پروگرام:۔ مکتبہ جامعہ دہلی نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ پانچ سال میں بعض اہم موضوعات پر مفید اور پُر از معلومات کتابیں شائع کرے۔ اس کا پروگرام ہمارے پیش نظر ہے جو ذیل کے حصوں میں منقسم ہے:۔

(الف) علمی اور ادبی کتابیں۔ اسلامیات۔ تاریخ۔ سیاسیات۔ معاشیات۔ تعلیم۔ ادب۔

(ب) بچوں کی کتابیں

(ج) عورتوں کی کتابیں

(د) تعلیم بالغاں

اس پروگرام کو پیش نظر رکھ کر حال ہی چار کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

۱۔ **بحر الکاہل کی سیاست**:۔ اس کتاب میں بحر الکاہل کی جغرافیائی حالت اور اس کے ساحلی ممالک اور جزیروں وغیرہ کے تذکرے کے بعد اس میں مختلف مشرقی، مغربی اور امریکائی ممالک کے مفاد کی وضاحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ موجودہ جنگ یہاں کیا کیا امکانات پیدا کرسکتی ہے۔ کتاب بہت پر از معلومات ہے۔ قیمت مجلد عہ

۲۔ **قومیت اور بین الاقوامیت**:۔ یہ کتاب اوپر کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ چند باب یہ ہیں (۱) قومیت (۲) قومیت کا ارتقا (۳) مشرق میں قومیت (۴) یورپ کی جدید قومیت (۵) آفاقیت (۶) بین الاقوامیت وغیرہ۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے قیمت مجلد عہ

۳۔ **نازیت**۔ اس سلسلے کی تیسری کتاب شاہد حسین صاحب رزاقی ایم اے نے لکھی ہے۔ اس کتاب کے چند باب یہ ہیں۔ (۱) آمریت اور عمومیت (۲) جرمن مملکت کا ارتقا (۳) فریڈرک اعظم (۴) انقلابِ فرانس (۵) بسمارک اور ہٹلر (۶) اتحادِ قومی کی مشکلات۔ (۷) عہد نامۂ ورسائی (۸) قومی اشتراکیت (۹) قومیت (۱۰) نسلیت (۱۱) یہودی وغیرہ۔ اس کتاب کا مطالعہ آج کل بالخصوص بہت ضروری ہے۔ قیمت مجلد عہ

۴۔ **ممالک اسلامیہ کی سیاست**۔ از عشرت حسین صاحب صدیقی۔ اس کتاب میں اسلامی ممالک مصر، ٹرکی، عرب

ایران، عراق، افغانستان، افریقہ کے اسلامی خطوں اور بعض اہم اسلامی شہروں کی سیاسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسلمانوں کے لئے بالخصوص اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ حجم ڈھائی سو صفحات قیمت مجلد عمر۔ پتہ۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔

پھریری۔ یہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کی نئی تالیف ہے۔ اس میں مرزا صاحب کے چودہ دلچسپ افسانے شامل ہیں۔ مرزا صاحب کا لطیف مزاحیہ انداز اب تک ملک میں بہت مقبول ہوچکا ہے اور اُن کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں۔ قیمت مجلد دو روپے۔

پتہ:۔ کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی ۳

روحِ مکاتیب:۔ حضرتِ ساغر نظامی مدیر ایشیا نے اپنے دوستوں، بزرگوں، شعراء ادباء اور مشاہیر کے وہ خطوط اس مجموعے میں جمع کر دیئے ہیں جو انہیں ۱۹۲۳ء سے دسمبر ۱۹۴۱ء تک وصول ہوئے۔ بعض خطوط بلکہ اکثر بے تکلفانہ ہیں۔ اس مجموعے کا مطالعہ یقیناً پُرلطف اور ایک لحاظ سے مفید بھی ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحات قیمت عمر:۔ پتہ:۔ ادبی مرکز میرٹھ۔

گل و مل۔ مجموعۂ کلامِ فارسی جناب سید علی عباس صاحب عباس بی اے ایل ایل بی۔ عباس صاحب کا کلام زیادہ تر غزلیہ ہے اور اُن کا اندازہ شگفتہ اور دلکش ہے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

میں سرخوشِ چشمِ ساقی ہوں اور دردکشِ میخانہ بھی
مذہب ہے حکیمانہ میرا، مشرب ہے مگر رندانہ بھی

وُہ میکش ہوں کہ میرا جو نفس ہے تشنۂ مے ہے
نہیں گر ساغرِ مے لب پہ ہے تقریرِ مے خانہ

فارسی

زمانہ نظمِ معیشت چناں کند تبدیل
کہ احتیاجِ بہ دام و درم نخواہد شد

دوش در گلشن نمودی شغلِ مے — از نشاطِ مے گلستانی ہنوز

حجم ڈھائی سو صفحات سے زائد۔ قیمت عمر پتہ:۔ انجمنِ ترقیٔ اردو دہلی۔

دوسری جنگِ عظیم:۔ از جناب محمد مرزا صاحب دہلوی۔ اس کتاب میں دولِ یورپ کی رقیبانہ سیاست کی روشنی میں موجودہ جنگِ عظیم کے اسباب و علل پر ایک سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مختلف عنوانوں پر بنتالیس دلچسپ اور پُرازمعلومات باب ہیں کتاب میں ابتدائے جنگِ موجودہ سے لے کر مارچ ۱۹۴۱ء تک کے حالاتِ جنگ بھی ہیں۔ یہ کتاب موجودہ سیاسیات کے مطالعے کے لئے بیش بہا ہے۔ حجم ۱۱۴ صفحات قیمت مجلد عہ

مسرت افزاء

جوانی کی کرن

ہمیشہ خوش رہو اور
اپنے ارد گرد خوشی اور مسرت کی لہر جو کہ کامل
صحت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے پھیلاؤ ۔ جسم
کے شباب کو قائم رکھنے والی صحت
بڑھانیوالی رسائن

کرن جوانی

کے استعمال سے اپنے آپکو مضبوط اور طاقت ور
بناؤ ۔ کرن جوانی میں ایک حیرت انگیز قدرتی
طاقت ہے اس میں وہ بات نہیں جو جا[illegible] بندر و
کے مردہ غدودوں سے جسم کو گندہ کرنے
والی دوائیوں میں ہے ۔

کرن جوانی

ایک بے نظیر رسائن ہے جو جسم کی
رگ رگ اور نس نس میں قدرتی طریقہ سے
ہی طاقت اور شباب کو پھر سے واپس لاتی ہے

امرت دھارا فارمیسی لاہور

قیمت ۱۰۰ گولی چار روپے
۲۴ گولی ایک روپیہ
قیمت درجہ اول ۱۰۰ گولی بارہ روپے
۲۴ گولی تین روپے

سید عبداللطیف پرنٹر [illegible] اسٹال پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

اپریل ۱۹۳۶ء

ہر روز حشر نہیں ہوگا پر بھی
دورِ زمانہ چال قیامت کی چل گیا

بیادگار علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خان، بی۔ اے

فہرست مضامین

جلد ۴۰ — "ہمایوں" بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۴۱ء — نمبر ۴

تصحیح:- گزشتہ مہینے "فردوسِ گم گشتہ" کے ریویو میں چودھری غلام احمد صاحب پرویز کے نام کے ساتھ "مدیر طلوعِ اسلام" کے الفاظ سہواً درج ہو گئے۔ اس کے ایڈیٹر اخوندزادہ حسین امام صاحب ہیں۔

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول ڈاک آ — قیمت فی پرچہ ۸/

جہاں نما

آزادی کے گداگر اور صداقت شعار چرچل

موجودہ مہذب حکومتوں کا یہ فیشن ہے کہ اگر وہ کسی غیر ملک پر قبضہ کرتی ہیں تو اُس کو اور باقی دنیا کو یقین دلا دیتی ہیں کہ یہ قبضہ محض مقبوضہ ملک کے فائدے کے لئے کیا گیا ہے۔ اگر اُس ملک کے باشندوں کا رنگ گورا ہو تو قبضہ اُن کی آزادی کے تحفظ کے لئے ہوتا ہے اور اگر وہ کالے ہوں تو پھر یہ قبضہ اُنہیں مہذب بنانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ رسم کے مطابق آخر الذکر قسم کے مقبوضہ ملک سے یہ وعدہ بھی ہوتا ہے کہ وُہ مہذب بنتے ہی آزاد کر دیا جائے گا۔ دراصل یہ موجود فاتحین کی شائستگی اور حُسنِ خلق ہے ورنہ انہیں یہ وعدہ کرنے پر بھی کون مجبور کر سکتا ہے۔

ہندوستانیوں کا ایک پست خیال اور بے ہمت طبقہ اس رسم کو جاننے کے باوجود انجان بنتا ہے اور ایک بہادر اور فاتح قوم کو محض اُس کے رسمی اور شائستہ اعلانوں پر لفظی بحث کی مشکلات میں گھسیٹتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ کسی طرح فاتح قوم سے اُس کی خون پسینے کی کمائی ہوئی سلطنت بھیک میں مانگ کر ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر مالکِ ملک بن جائے۔ یہ لوگ حکومت کے دروازوں پر آئے دن ع

کچھ راہِ خدا دے دے

کی صدائیں لگاتے پھرتے ہیں اور اُس کو ناحق دق کرتے رہتے ہیں۔

رسم و رواج کی پابندیوں کا بُرا ہو کہ اربابِ حکومت میں سے کسی اللہ کے بندے کو اب تک سچی بات کہنے کی جرأت نہ ہوئی تھی ایک وعدے کے بعد دوسرا وعدہ اور پھر اُس وعدے پر گداگرانہ ذہنیت کے ہندوستانیوں کی لفظی بحث حکومت کے لئے ہمیشہ ایک نئی پریشانی پیدا کر دیا کرتی تھی۔

ہمارے موجودہ مالک اور انگلستان کے برگزیدہ وزیرِ اعظم مسٹر چرچل کی اخلاقی جرأت قابلِ تعریف ہے کہ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر یہ معاملہ ہمیشہ کے لئے خوب صاف کر دیا ہے۔

صدرِ جمہوریۂ امریکہ کے اشتراک سے مسٹر چرچل کہیں یہ اعلان کر بیٹھے تھے کہ موجودہ جنگ آزادیٔ اقوام کے لئے لڑی جا رہی ہے مطلب تو صاف تھا کہ حال ہی میں جو قومیں جرمنی کے زیرِ نگیں ہو گئی ہیں وہ جرمنوں کے اثر و اقتدار سے آزاد کرا لی جائیں گی، لیکن بوجھ بجھکڑ ہندوستانیوں نے مسٹر چرچل کو اِس لفظی بحث میں پھانسنا چاہا کہ "اقوام" میں تو ہم بھی شریک ہیں۔ پھر کیا یہ جنگ ہمیں بھی آزادی دلا دے گی؟

ان عقل کے مالکوں نے یہ سمجھا کہ انگلستان جرمنی کے خلاف لڑ رہا ہے، اپنے خلاف جنگ آزما نہیں۔ جنگ کا یہ انوکھا

مقصد کبھی نہیں سنا گیا کہ کوئی قوم اپنا خون بہا کر فتح حاصل کرنے کے بعد خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارے اور اپنی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُسے ہوسِ سلطنت رکھنے والے نامرد بھک منگوں کے حوالے کر دے۔ آفرین ہے اُن عقلمند ہندوستانیوں کو جو انگریزوں کو ایسی اُلٹی کھوپری کا مالک سمجھتے ہیں

اگر بجائے چرچل کے علاوہ کوئی اور انگریز اِس بحث میں پھنسایا جاتا تو غالباً وہ چکرا جاتا یا اِن گدایانِ بہرم کو کسی جھوٹے وعدے سے ٹالنے کی کوشش کرتا مگر صداقت شعار چرچل نے یہ دو ٹوک جواب دے دیا کہ ہمارے اِس مشترکہ اعلان سے تمہارا یا سلطنتِ برطانیہ کے کسی اور علاقے کا قطعاً کوئی تعلق نہیں، نہ تمہارے متعلق حکومت کی اُس حکمتِ عملی میں کوئی فرق آئے گا جس پر وُہ کاربند ہے۔

بات بھی درست ہے۔ سلطنت کی بھیک نہ آج تک کسی نے مانگی ہے نہ کسی نے دی ہے۔ اگر ہماری بے غیرتی اِس حد کو پہنچ چکی ہے۔ کہ ہم بھیک میں مانگی ہوئی سلطنت سے مطمئن ہو سکتے ہیں تو انگریزوں پر کیا بھوت سوار ہوا ہے کہ ہم اُن سے بھی ایک خلافِ فطرت "بخشیش" کرنے کی توقع رکھیں حالانکہ اُن بیچاروں کے آباد اجداد نے اُن کے لئے قوتِ بازو اور عقل و دانش سے چھ ہزار میل دُور یہ سلطنت حاصل کی تھی اور وُہ اس پر اب تک اپنی قابلیت اور حکمت سے قابض ہیں۔

اس نمک خوار کی رائے تو یہ ہے کہ آئندہ تمام انگریز مدبر صاف گوئی میں صداقت شعار چرچل کی پیروی کیا کریں تاکہ کسی کو نیا جائز موقع ہی نہ ملے کہ سرکار کا وقت بیکار لفظی بحث میں ضائع کرنے پائے۔ خدا کرے آئندہ جو ہندوستانی گدا گر انگریز سرکار کے دروازے پر سے

کچھ راہِ خدا دے جا

جا تیرا بھلا ہوگا

کا نعرہ بلند کرے، اُسے ایسا ہی ٹکا سا جواب ملے۔ آمین!

ہندوستان کی مرکزی حکومت کی آمد اور خرچ

	آمد	خرچ
سنہ ١٩٢٦-٢٧ء	١٣١٦٥٤٦٩٠٣	١٣١٦٥٤٦٩٠٣
سنہ ١٩٢٧-٢٨ء	١٢٧٢٢٧٧٩٢٠	١٢٧٢٢٧٧٩٢٠
سنہ ١٩٢٨-٢٩ء	١٢٨٩٧٠٢٤١٦	١٢٩٢٨٥٦٤١٨
سنہ ١٩٢٩-٣٠ء	١٣٢٦٤٥٥١٠٢	١٣١٤١٧١٥٠٤
سنہ ١٩٣٠-٣١ء	١٢٤٥٩٥٥٧٢١	١٣٦١٨٠٠٦٩٥
سنہ ١٩٣١-٣٢ء	١٢١٦٤٩٥٧١٤	١٣٣٣٩٣٨٩٩١

	آمد	خرچ
۱۹۳۲-۳۳ء	۱۲۵۴۳۶۹۷۹۵	۱۲۳۸۸۵۰۶۰۳
۱۹۳۴-۳۵ء	۱۲۲۱۲۴۰۴۷۲	۱۲۱۷۶۴۰۴۷۲
۱۹۳۵-۳۶ء	۱۲۱۰۷۲۶۵۲۷	۱۲۱۰۷۲۶۵۲۷
۱۹۳۶-۳۷ء	۱۱۷۸۳۸۹۱۹۲	۱۱۹۶۲۶۰۷۹۶
۱۹۳۷-۳۸ء	۱۲۲۴۸۰۰۰۰۰	۱۲۲۴۸۰۰۰۰۰
۱۹۳۸-۳۹ء	۱۱۹۵۶۷۶۰۰۰	۱۲۲۲۱۵۱۰۰۰
۱۹۳۹-۴۰ء	۱۲۱۷۹۹۵۰۰۰	۱۲۱۷۶۷۹۰۰۰

تیز رفتاری کی یادگاریں

دخانی کشتی

۱۹ راگست ۱۹۳۹ء کو سر میلکم کیمبل نے "بلو برڈ ۲" کو ۱۴۰ میل فی گھنٹہ چلا کر پانی پر رفتار کی سابقہ کل عالم یادگار کومات دی۔

ریل گاڑی

۳ رجولائی ۱۹۳۸ء کو لندن اینڈ نارتھ ویسٹرن ریلوے "کی کارونیشن ایکسپریس" ۱۲۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار تک پہنچی۔ یہ دنیا میں ریل گاڑی کی یادگار تیز ترین رفتار کہی جاتی ہے۔

موٹر سائیکل

دنیا میں موٹر سائیکل کی تیز رفتاری کی یادگار ارنسٹ ہین نے ۱۷۰۲۶۴ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا کر قائم کی۔

برف پر پھسلنے کی رفتار

۱۶ فروری ۱۹۳۳ء کو ناروے کے مشہور مشاق جیلینڈ نے برفانی جوتوں کی مدد سے برف پر ۹۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل کر دنیا بھر میں انسانی ٹانگوں کی تیز رفتاری کی یادگار قائم کی۔

موٹر کار

جان کوب نے موٹر کار کو ۳۶۸٫۸۵ میل کی رفتار سے چلا کر کیپٹن آئسٹن کی قائم کردہ ۳۵۷٫۵۰ میل فی گھنٹہ کی یادگار کو مات دی۔

دیہات کی سادہ تہذیب

ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور نے پچھلے دنوں اپنے ایک مضمون میں ہندوستانی دیہات کے باشندوں کی فطری سیر چشمی اور مہماں نوازی کا ذکر کرتے ہوئے ذیل کا واقعہ بیان کیا تھا:۔

"ایک دفعہ مجھے ایک مقام سے جو کلکتے سے سو میل کے فاصلے پر واقع تھا کلکتہ تک موٹر میں آنے کا موقع پیش آیا۔ موٹر کار کی مشین میں کوئی نقص واقع ہو جانے کی وجہ سے ہمیں تقریباً ہر آدھ گھنٹے کے بعد پانی بدلنے کی ضرورت در پیش ہوتی تھی۔ جس گاؤں کے قریب ہم پہلے پہل ٹھہرنے پر مجبور ہوئے وہاں کے ایک باشندے سے ہم نے پانی مانگا۔ اس نے کافی دقّت اُٹھانے کے بعد ہمیں پانی بہم پہنچایا لیکن جب ہم نے اس کے بدلے میں بہ طور انعام اُسے کچھ دینا چاہا تو اُس نے غریبی کے باوجود اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پندرہ گاؤں اور ایسے آئے جہاں یہی واقعہ پیش آیا لیکن کسی شخص نے انعام قبول نہ کیا۔ اِس گرم ملک میں جہاں مسافروں کو پانی کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے اور جہاں گرمیوں میں پانی کم ملتا ہے دہاتی لوگ ضرورت مندوں کو پانی مہیا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ طلب و رسد کے قانون کے مطابق وُہ چاہیں تو اسے اپنا کاروبار بنا سکتے ہیں لیکن اُن کے لئے یہ خدمت ایک مذہبی فریضے کی حیثیت رکھتی ہے انہیں پانی بیچنے کیلئے کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی انہیں اپنی زندگی فروخت کرنے کا مشورہ دے۔ پانی کی ملکیت کو وُہ اپنے کسی شخصی گُن سے منسوب نہیں کرتے"

شہری زندگی میں کاروباری ذہنیت زیادہ نمایاں ہے۔ آہستہ آہستہ دیہات پر بھی اسی ذہنیت کا غلبہ ہو رہا ہے اور فطری سادگی اور سخاوت کی جگہ سوداگرانہ ذہنیت لے رہی ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور لکھتے ہیں:۔

"ایک کروڑپتی سیاح جو اپنے روپے کی مدد سے منڈی کی تمام اشیائے خوردنی کو قبضے میں کر لینے اور دنیا کو فاقہ کشی کے لئے مجبور کر کے خود دولت مند بننے پر ہر وقت تیار رہتا ہے جب ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اِن دیہات میں سے گزرتا ہے تو وہ اِن لوگوں کے اخلاق کو خاطر میں لانے کے قابل ہی نہیں سمجھتا۔

. . . .

"ان لوگوں کی تہذیب بلاشبہ بہت سادہ ہے لیکن اِس کا ارتقاء صدیوں میں ہوا ہے۔ اس سادگی کی نقالی آسان کام نہیں۔ انسان چند سال میں اس قابل تو ہو سکتا ہے کہ ایک مشین کا چکر گھما کر ہزاروں سوئیوں میں بیک وقت سوراخ کرنا سیکھ لے لیکن دشمن یا اجنبی سے یہ سادہ دلانہ مروّت کا سلوک سیکھنے کے لئے پشت ہا پشت کی مشق درکار ہے۔ سادگی اپنی قدر و قیمت کا شمار نہیں کرتی اور اُسے کسی مزدوری کی توقع بھی نہیں ہوتی۔ اسی لئے وُہ لوگ جو طاقت کے نشے میں سرشار ہیں اس بات کا احساس نہیں رکھتے کہ روحانیت کا یہ سادہ اظہار تہذیب کا سب سے بہتر ثمر ہے"

مرزا عظیم بیگ چغتائی اور حضرتِ فانی بدایونی کی رحلت

اگست ۱۹۴۱ء ہندوستان کی ادبی زندگی کے لئے بہت منحوس ثابت ہوا۔ ٹیگور کے بعد اردو زبان کے دو مشہور ادیب یعنی مرزا عظیم بیگ چغتائی اور حضرتِ فانی بھی اسی مہینے میں ہم سے جدا ہو گئے۔

مرزا عظیم بیگ نے عالمِ جوانی میں ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء کو رحلت فرمائی۔ وہ بے حد زود نویس نثار اور مزاحیہ رنگ میں ہندوستان کی خانگی زندگی کی دلچسپیوں کے بہت چابک دست عکاس تھے۔ انہوں نے اپنی مختصر ادبی زندگی میں اردو افسانہ نگاری کی بہت خدمت کی۔ اُن کی بیسیوں کتابیں مدت تک اُن کا نام زندہ رکھیں گی۔

"ہمایوں" سے مرزا صاحب مرحوم کے بہت دیرینہ تعلقات تھے اور غالباً اُن کی ادبی زندگی کا آغاز "ہمایوں" ہی کے صفحات سے ہوا تھا اس لئے ہمارے لئے اُن کا انتقال دُہرے رنج کا باعث ہے اور ہم اس صدمے میں اُن کے اعزہ و اقربا کے ساتھ دل سے شریک ہیں۔

مرزا صاحب کی رحلت کی خبر سے متاثر ہو کر جنابِ جگر قریشی لدھیانوی نے ایک قطعہ لکھ کر ہمایوں کے لئے بھیجا ہے جو درج ذیل ہے۔

طریقِ مزاح کا خوش ذوق بانی ۔۔۔ تھی مشہور جس کے قلم کی روانی

وہ چغتائی زندہ دل اب کہاں ہے ۔۔۔ کدھر چھپ گیا ہے وہ ماہِ معانی

جناب شوکت علی خاں صاحب فانی بدایونی اپنی حزنیہ غزل گوئی کے لئے مشہور تھے۔ جن دنوں اُن کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوا اُردو غزل کی مخالفت شروع ہو چکی تھی لیکن فانی اُس عہد کے بعض اور شعراء کی طرح غزل گوئی پر اصرار سے جمے رہے اور آخر ایک پختہ اور مقبول رنگ پیدا کر لینے میں کامیاب ہوئے۔

فانی ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں گھر پر عربی اور فارسی کی تعلیم ہوئی۔ اس کے بعد اُنہوں نے ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے اور ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ گیارہ سال کی عمر میں فانی نے غزل گوئی شروع کی اور پہلا دیوان ۳۰ سال کی عمر میں مرتب کیا مگر افسوس کہ مسودہ ضائع ہو گیا۔ اس کے بعد جو غزلیں مل سکیں "باقیاتِ فانی" کے نام سے شائع کی گئیں۔ سنا گیا ہے کہ اب "انجمنِ ترقیٔ اردو" کی طرف سے "کلیاتِ فانی" کے نام سے اُن کا مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے۔

افسوس کہ صاحبِ کمال فانی کی زندگی کے آخری ایام حیدر آباد دکن میں بہت تنگ دستی کی حالت میں گزرے اور طویل علالت کے بعد ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو وہیں اُن کا انتقال ہو گیا۔

زندگی آخر تک اُن کے لئے ایک دردانگیز الجھن بنی رہی۔ خود کہتے ہیں ؎

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا ۔۔۔ زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

مرزا عظیم بیگ چغتائی

مجھے مرزا فہیم بیگ صاحب چغتائی کے ایک خط سے جب مرزا عظیم بیگ مرحوم کے انتقال کی اطلاع ملی تو میں نے اُن سے مرحوم کے مختصر حالاتِ زندگی لکھنے کی درخواست کی تھی۔ میرے خط کے جواب میں اُنہوں نے ذیل کا خط اور حالات لکھے ہیں جنہیں انہیں کے قلم سے درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ح

برادرم حامد علی خاں

کیا کہوں ایک تو کوتہ قلم واقع ہوا ہوں دوسرے طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، اس کے علاوہ میرزا عظیم بیگ مرحوم کے بہت سے حالات ابھی تک معلوم نہ ہو سکے، کچھ یوں ہی بے ترتیب سی چند باتیں لکھ سکا، یہ دیکھ کر آپ اپنے طور پر کوئی مضمون نکال لیجئے، دوسرے صاحبان کو اتنی بھی معلومات نہیں، میں چاہتا ہوں سب سے پہلے مرحوم کے متعلق ہمایوں میں کچھ شائع ہو۔

بہت ممکن ہے کہ اپنے اپنے تعلقات اور جذبات و معلومات کے مطابق دوسرے اخبارات اور رسالے مرحوم کے متعلق لکھیں، یا نہ لکھیں اس سے کیا غرض میرا بھائی تھا میں چاہتا ہوں، کہ ایک مضمون اُس کی یادگار کے طور پر ہمایوں میں نکل جائے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۴۱ء

دعاگو۔ میرزا فہیم چغتائی

والد کا نام۔ میرزا قسیم بیگ چغتائی بی۔اے علیگ

صاحب موصوف میرے منجھلے چچا میاں تھے، آپ نے سر سید احمد خاں صاحب کی زندگی ہی میں علی گڑھ سے بی۔اے کیا، اور ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔

میرزا عظیم بیگ بتاریخ ۱۲ اگست ۱۸۹۸ء مطابق ۲۳ ربیع الاول ۱۳۱۶ھ بروزِ جمعہ بوقت چار بجے صبح بمقامِ غازی پور پیدا ہوئے یوں تو کئی دن سے جھڑی لگی ہوئی تھی، لیکن اُس وقت کچھ اس زور سے بارش ہوئی، کہ پردے کی دیوارِ خام ڈھے پڑی اور بنگلے کے احاطے میں پانی ہی پانی ہو گیا۔

سید زین العابدین صاحب نے جو ہمسایہ تھے، عظیم بیگ نام رکھا، ان دنوں عظیم بیگ کے نانا شیخ امراؤ علی صاحب مصنف ناول "بزمِ آخرہ" میں سخت علیل تھے، جس وقت اُنہیں نواسے کی نوید پہنچی تو اُن پر نزع طاری تھی، "مبارک ہو" کہا اور خاموش ہو گئے۔

میرے والدِ مرحوم میرزا ابراہیم بیگ چغتائی المتخلص بہ میرزا کو اس مولود کی خبر ضلع بھنڈ ریاست گوالیار میں ہوئی، اُنہیں بھی یہ نام پسند آیا، اور انہوں نے "پورِ نو عظیم بیگ" میں ۱۳۱۶ھ نکالا تھا۔

۱۹۰۱ء میں میرزا قسیم بیگ صاحب کا غازی پور سے رائے بریلی کو تبادلہ ہو گیا تھا، وہاں انہوں نے عظیم بیگ کے بڑے بھائی میرزا نسیم بیگ کی سواری کے لئے ایک ٹٹو لیا، اُسے آختہ کرتے دیکھ کر عظیم بیگ کچھ ایسے سہمے کہ حضرت کو بخار آنے لگا، رفتہ رفتہ چند

روز میں یہ حالت ہوئی کہ اکثر غشی طاری ہوجاتی تھی اور اس درجہ کمزوری بڑھی کہ کروٹ لینا مشکل ہوگیا۔

رائے بریلی سے تبادلہ ہونے پر ان کے والد میرزا قسیم بیگ صاحب ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ گئے اور کوٹھی امین الدولہ بہادر میں مقیم ہوئے، وہیں عظیم بیگ کے ختنے کئے گئے۔

۱۹۰۳ء میں اُناؤ کو تبادلہ ہوا، وہاں عظیم بیگ کی بسم اللہ (مکتب) کرائی گئی۔

چند مہینے بعد اُناؤ سے مین پوری تبدیل ہوئے، مین پوری میں عظیم بیگ کو مولوی میاں جان صاحب اُردو کا قاعدہ پڑھانے اور تختی لکھوانے لگے۔

شروع اکتوبر ۱۹۰۳ء سے مین پوری میں ایسی سخت بارش شروع ہوئی، اور ندی میں طغیانی آئی، کہ بازاروں کے راستے بند ہوگئے، اُن دنوں ہاتھی کی سواری پر بھی کچہری جانا دشوار تھا، عظیم بیگ کو کچھ موسم کی خرابی اور کچھ دانت نکلنے کی وجہ سے تیز بخار آیا، اُس شدت میں ایک دورہ ایسا پڑا کہ دانتی بھنچ کر بے ہوش ہوگئے، میرزا نعیم بیگ صاحب باوجود پیرانہ سالی کے عظیم بیگ کی دوا دوش کے سلسلہ میں بار بار ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیگتے گئے اور بھیگتے آئے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو بھی بخار آنے لگا جلد جلد حالت گرتی گئی حتیٰ کہ یکم نومبر ۱۹۰۳ء کو انتقال کر گئے۔

میرزا نعیم بیگ صاحب چغتائی کی قبر مولوی محسن صاحب کاکوروی صاحب ہفت بند کاشی کی ٹروا میں دونوں کے سلسلے میں نہایت مناسب مقام پر بنائی گئی۔

۱۹۰۴ء میں میرزا قسیم بیگ صاحب کا تبادلہ مین پوری سے بدایوں کو ہوگیا، ۳۱ جولائی ۱۹۰۸ء کو مولوی احمد حسین صاحب نے عظیم بیگ کا قرآن شریف ختم کرایا، اور وہ بدایوں کے تحصیلی اسکول کی دوسری جماعت میں داخل کر لئے گئے۔

یکم اپریل ۱۹۰۹ء کو ضعیف القویٰ اور دائم المرض ہونے کی وجہ سے ان کا نام اسکول سے خارج کرادیا گیا، اپنے گھر ہی مولوی احمد حسین صاحب سے اُردو پڑھتے تھے۔

۱۵ مئی ۱۹۱۱ء درجہ ششم پاس کرکے ساتویں درجے میں آئے، پھر ۱۶ جولائی کو اپنے بڑے بھائی میرزا نسیم بیگ کے ساتھ ولی محمد خاں ملازم کی نگرانی میں رام پور پڑھنے کو گئے، لیکن وہاں کا انتظام خاطر خواہ نہ ہونے کی وجہ سے دو مہینے بعد بدایوں واپس آئے۔"

یہ چچا میاں کے لکھے ہوئے روزنامچے کا اختصار ہے، اسی کاپی میں کچھ صفحے سادہ چھوڑ کر خود عظیم بیگ نے اپنے قلم سے حالات لکھے ہیں، جن کا اقتباس حسب ذیل ہے:۔

یکم نومبر ۱۹۱۹ء کو کوآپریٹو ٹریننگ کلاس میں داخل ہوا۔ ۱۴ اپریل ۱۹۲۰ء کو اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہوں، سکنڈ ڈویژن میں سب سے اوّل رہا، کل لڑکوں میں میرا ساتواں نمبر رہا، یعنی فرسٹ ڈویژن والوں میں ملا کر۔

یکم مئی ۱۹۲۰ء اسسٹنٹ مینجر ڈسٹرکٹ بنک ضلع اٹیہ مقرر ہوکر ۲ کو اٹیہ پہنچا۔ رمضان شریف کا مہینہ نہایت سخت گذرا، چودھویں روز بیمار ہوا تو عید تک صحت نہ ہوئی، طبیعت مضمحل رہتی ہے، بہت کمزور ہوگیا ہوں۔

۲۵ اگست ڈسٹرکٹ کوآپریٹو بنک اٹیہ کو تقریباً ایک ہزار روپیہ خسارہ ہوا اس واسطے اسسٹنٹ رجسٹرار صاحب بابو رام سرن داس نے

ملے ہم لوگوں کے تبسے یاد آیا

مشورہ دیا کہ میں چھٹی لے کر گھر جاؤں، چنانچہ میں نے عمل کیا چھٹی لے کر آگرہ گیا، وہاں سے ایٹہ واپس آیا، چار روز تنخواہ کا انتظار کیا، لیکن نصف ماہ بعد ملی، تنخواہ ملی اور بیکار ہو کر ۱۳ مارچ کو پہنچ گیا۔

بقر عید ۱۹۲۰ء سندیلہ میں پچاس روپیہ تنخواہ اور دس آنہ یومیہ بھتہ پر سپروائزری پر تقرر کی اطلاع ملی، لیکن جب ۲ مارچ سے وہاں گیا تو قبول احمد صاحب مینجر سندیلہ سے معلوم ہوا کہ جن کی جگہ یہ تقرر ہوا ہے، ابھی تک خبر نہیں ان کا تبادلہ کہاں کیا گیا، لہٰذا واپس جاؤ اطلاعِ ثانی پر آنا۔

یکم نومبر کو میں نے سندیلہ جا کر سنٹرل کوآپریٹو بنک میں سپروائزری کا چارج لیا۔

چند مہینے سے نائب تحصیلداری کی نامزدگی کے لئے کوشش جاری تھی، ۲۲ دسمبر ۱۹۲۰ء کو دو روز کی چھٹی لے کر آگرہ گیا، کمشنر صاحب کے یہاں حاضری دی، تو انہوں نے فرمایا، کہ امسال کچھ نہیں ہو سکتا۔

۷ اکتوبر ڈاڑھی رکھائے سوا مہینہ ہو گیا، دیکھئے کب تک رہے۔

یکم اپریل ۱۹۲۱ء آج تین مہینے بعد میں نے ڈاڑھی مونڈ ڈالی۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء ہفتہ بھر سے پہلی مرتبہ پیچش میں مبتلا ہوں، اس سے قبل یہ بیماری کبھی نہیں ہوئی تھی۔

۱۳ نومبر ۱۹۲۱ء دس یوم کی چھٹی لے کر اس امید پر آگرہ گیا، کہ تحصیلداری کی نامزدگی ہو جائے لیکن نہ ہوئی، میں نے پانچ روز کی رخصت اور بڑھوائی، کیونکہ میری شادی کا مسئلہ درپیش تھا، خوب سوچ بچار کے بعد میں نے قطعی فیصلہ کر لیا، کہ شادی ضرور کرنا چاہئے اور سب بھی بسیار قیل و قال کے بعد رضامند ہو گئے اور صفدر خاں صاحب کے ذریعہ سے ان کے بھائی سرور خاں صاحب کو رقعہ روانہ کر دیا گیا، رامپور سے میری منجھلی بہن کا خط آیا، کہ سرور خاں صاحب نے یہ رشتہ منظور کر لیا، آئندہ موسم سرما میں شادی ہو جائے گی۔

۳ دسمبر ۱۹۲۱ء کو والد صاحب کا تار آیا کہ صاحب کمشنر نے مجھ کو آبکاری میں نامزد کر دیا ہے، ڈاکٹری سارٹیفکیٹ چاہئے، میں نے بیس روپے کے خرچ سے ڈاکٹری سارٹیفکیٹ حاصل کیا اور بھیج دیا۔

دوسری فروری ۱۹۲۲ء آبکاری کے واسطے معائنہ ہوا، طبیعت بہت مکدر ہوئی، خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں نہیں لیا گیا، ۲۵ فروری برائے انتخاب سب رجسٹراری مقرر ہوئی، مگر انتخاب ملتوی کر دیا گیا نہ جانے آئندہ انتخاب کب ہوگا۔

آئندہ ماہ یعنی اپریل ۱۹۲۲ء میں میری شادی کی تاریخ مقرر ہونے والی ہے۔

عظیم بیگ مرحوم نے اس کاپی میں اتنے ہی حالات لکھے اور رہ گئے، اب جو کچھ بے ترتیب سا مجھے معلوم ہے لکھتا ہوں۔

مرزا عظیم بیگ نے اسکول کے دنوں میں رابنسن کروسو کے سفرنامے کی طرح ایک ترکی خاندان کا فرضی سفرنامہ "قصر صحرا" تصنیف کیا تھا، جو غالباً ۱۹۱۸ء میں دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوا، اس کے پہلے ایڈیشن میں سرورق پر بجائے عظیم بیگ کے میرا نام فہیم بیگ چھپ گیا تھا۔

۱۹۲۳ء میں مرزا عظیم بیگ آگرہ کوآپریٹو بنک میں تھے، پنشن ہو جانے کے سبب سے چچا میاں بھی آگرہ ہی آ گئے تھے میں نے آگرہ والی کوٹھی میں بھی

سے واپس آکر رہتے سہتے پایا، اس وقت تک عظیم بیگ کی شادی ہو چکی تھی، اس واسطے ان کی دُلہن بھی وہاں تھیں۔

جیسا وہ خود اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں، اُن کے قلم سے ایک انگریزی ناول Mrs. Frank Penny کا اُردو ترجمہ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۳ء کو ہوگیا تھا۔

۱۹۲۴ء میں کسی دوست کی صلاح سے آگرہ کو اپریٹو بنک کی ملازمت ترک کرکے بمبئی گئے وہاں ایک ہوٹل میں نوکری کرلی، چند مہینے ہوٹل کی ملازمت کرکے علی گڑھ چلے گئے، یونیورسٹی کی پچاس سالہ جوبلی میں اُن سے ملاقات ہوئی، چچا میاں بھی وہیں ڈگی والی کوٹھی میں جس میں محمد علی مرحوم نے جامعۂ ملیہ قائم کی تھی، رہتے تھے، اور جامعہ ملیہ دہلی کو منتقل ہو چکی تھی، اس وقت مجھے اور میاں حفظ الرحمٰن صاحب جامع حفظ العلوم کو عظیم بیگ نے ایک طبعزاد ناول سنایا تھا، اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو ان کے مصنفہ ایک ترک خاندان کے سفرنامہ "قصرِ صحرا" کا دوسرا حصہ دارالاشاعت لاہور سے چھپ کر عظیم بیگ کے پاس پہنچ چکا تھا۔

عظیم بیگ نے علی گڑھ جا کر نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب مرحوم کے کارخانہ میں نوکری کرلی تھی، اور فاضل وقت مطالعہ میں گزارتے تھے، اس طرح انہوں نے ۱۹۲۷ء میں بی۔اے کیا، اور سن ۱۹۳۰ء میں ایل۔ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

کچھ عزیز و اقارب کیونکہ وہاں موجود ہیں لہٰذا عظیم بیگ کو یہی سوجھی کہ جودھپور میں وکالت کرنی چاہیئے، وہاں جا کر مارواڑی غیر مارواڑی کا قصہ تھا، مارواڑی ثابت کرنے کے لئے لکھا پڑھی کی، جب فیصلہ میں دیر معلوم ہوئی، تو اپنی خسرال رامپور چلے گئے، رامپور میں تقریباً چھ مہینے وکالت کی تھی، کہ انہیں مارواڑی تسلیم کر لئے جانے کی اطلاع ہوئی، اس واسطے جودھپور چلے گئے۔

اپریل ۱۹۳۶ء میں ریاست جاورہ کی چیف ججی پر مامور ہوئے لیکن افسوس جاورہ راس نہ آیا، پیدائشی دائم المریض چلے آئے تھے، میرے خیال میں شاید وہ بالکل تندرست تمام زندگی بھر لگاتار ایک سال کیا چھ مہینے بھی نہ رہے ہوں گے، قیام علی گڑھ سے اکثر حرارت میں مبتلا ہو جایا کرتے تھے، جاورہ جا کر دیرینہ کمزوریوں نے ٹی بی کی صورت اختیار کرلی، مجبوراً صرف چودہ مہینے وہاں کی چیف ججی پر رہ کر جودھپور چلے آئے۔

انہوں نے سن ۱۹۳۰ء سے باقاعدہ رسائل و اخبارات میں مضامین بھیجنے شروع کئے تھے، اور یہ سلسلہ صاحبِ فراش ہو جانے کے باوجود جودھپور میں بھی جاری رکھا، البتہ اب کوئی ایک سال سے لکھنے کی طاقت نہ رہی تھی۔

جنوری میں مجھے جودھپور بلایا، اور بڑی بڑی منتوں کے علاوہ تار دیا کہ جلد آیئے۔ لیکن فروری میں نشرگاہ لکھنؤ پر دو پروگرام مقرر ہو چکے تھے، جاتے جاتے بہت دن لگ گئے، دوسری مارچ کو جودھپور پہنچا، تو میاں عظیم بیگ مشتِ استخواں نظر آئے، اِدھر میں خود بلڈ پریشر کی وجہ سے سخت تکلیف میں مبتلا تھا، خیر میرا بھگتوان تو نہ جانے کب ختم ہوگا۔ موت زندگی کی الجھن میں دن کاٹتا رہا، مگر میاں عظیم بیگ روز بروز ضعیف ہوتے گئے، کچھ دن تو چوبیس گھنٹے میں ایک آدھ توسٹ کھا کر چند تولہ چائے پی لیتے تھے، پھر اس میں بھی کمی ہوگئی، اور مختصر یہ کہ جون میں پیروں کا ورم شروع ہوگیا۔

اب زندگی کی کیا اُمید ہو سکتی تھی، لیکن واقعہ ہے کہ موت کا یقین ہونے کے باوجود وہ نہایت مستقل مزاج رہے، اور ایسا بھی ہوا کہ کبھی ورم میں قدرے کمی آگئی، کبھی کچھ زیادہ ہوگیا، پھر کچھ ایسے ناگفتہ بہ وجوہ حائل ہوئے، کہ انہیں اسی حال میں چھوڑ کر مجھکو ۳ جولائی کی صبح شیخوپور آنا پڑا۔

۲۴ اگست ۱۹۴۱ء کو عظیم بیگ کے بڑے فرزند رحیم بیگ سلمہٗ کے خط سے معلوم ہوا کہ عظیم بیگ ۲۰ اگست کو ایک بجے دن کے قیدِ حیات سے آزاد ہوگئے۔

اُس روز حسبِ معمول صبح پانچ بجے بیدار ہو کر انہوں نے اچھی طرح باتیں کیں، تھوڑی دیر میں کہنے لگے، مجھے نیند آرہی ہے، سب لوگ ہٹ گئے کہ ذرا آرام کریں، لیکن بار بار دیکھ دیکھ جاتے تھے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی، ایک بار اُن کی حالت کچھ عجیب سی نظر آئی، تو اُن کی والدہ سمیت عزیز و اقارب اس کمرے میں آکر بیٹھ گئے، میاں عظیم بیگ آہستہ آہستہ خرخر کر رہے تھے، ان کا ہاتھ ٹیڑھا رکھا تھا، وہ جو سیدھا کیا، تو روح منتقل ہو چکی تھی۔

ساڑھے پانچ بجے شام کو جنازہ اُٹھا، اس وقت ایسی بارش ہو رہی تھی کہ سڑکوں کی نالیاں ڈھائی ڈھائی فٹ چل رہی تھیں، مگر جنازہ نہ بھیگا اور بخیر کے قبرستان تک پہنچ گیا۔ محمود امیر کی درگاہ کے احاطے باہر نہر کے درمیان ایک چھوٹا سا قطعہ ہے وہاں میرے خاندان کے افراد کی چار قبریں موجود تھیں چچا میاں (مرزا قسیم بیگ) اور میرے والد اور بھی وہیں آسودہ ہیں اس حظیرہ میں عظیم بیگ کی پانچویں قبر ہے۔

[illegible] اگست ۱۸۹۸ء مطابق ۲۴ ربیع الاول ۱۳۱۶ھ بمقام غازی پور بروز جمعہ پیدا ہونے والے ہندوستان کے ایک خاص ادیب مرزا [illegible] [illegible] ۱۳۶۰ھ [illegible] گئے

اگر موت نہ ہوتی
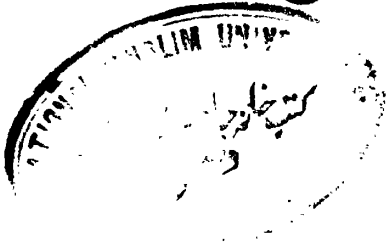
زخم ہمیشہ تازہ رہتے، رستے رہتے۔ خون کی ندیاں بہ جاتیں
آنسو کبھی نہ تھمتے، دریا بن جاتے
آہوں کا دھواں روشنی کو مغلوب کر لیتا، تاریکی پھیل جاتی
خوبصورتی مٹ جاتی، جوانی اور رعنائی کا خاتمہ ہو جاتا
مسکراہٹ اور قہقہے آہوں اور آنسوؤں سے سفر پڑ جاتے
کوئی کہاں رہتا، کہاں چلتا، کدھر جاتا، کیا کرتا!
افلاس کا ظالم بھوت اپنا خوفناک منہ کھولے دنیا کا تعاقب کرتا، لوگوں کو نگل لیتا، معصوم بچوں کو، جوانوں کو، سب کو
زندگی نہ ختم ہونے والی بدصورتی میں بدل کر مسلسل نوحہ بن جاتی، ابدی لعنت ہو جاتی۔
اگر موت نہ ہوتی تو زندگی موت ہوتی

محمد عباس

غزل

حلقۂ موج میں ہوں دیکھئے ہمت میری ... کشمکش چاہتی ہے اور طبیعت میری
بزمِ ہستی میں نہیں کوئی شناسا میرا ... ہے پرے کچھ عدم آباد سے شہرت میری
کر دیا غیر نے اظہارِ محبت شاید ... دیکھتے ہیں وہ بڑے غور سے صورت میری
سن کے فرماتے ہیں افسانۂ ہجری گل ... اس میں در پردہ نکلتی ہے شکایت میری
فتنہ پردازیٔ اغیار کا احساں سر پہ ... ورنہ کھلتی نہ کبھی اُن پہ محبت میری

پردۂ ہستیٔ موہوم میں ہے رازِ حیات
موت ہے مجھ پہ جو کھل جائے حقیقت میری

سید ظہیر الدین حیدر

یاد

یہی کوہ کا تھا دامن یونہی دن بہار کے تھے
یونہی گلستاں کھلا تھا یہی نغمے شار کے تھے
یونہی چاندنی تھیں راتیں یونہی سبزہ لہلہاتا
اسی کنج میں تو مجھ سے دمِ آخری ملا تھا
مجھے یاد ہے وُہ سب کچھ مجھے یاد ہی رہے گا
ترے بن جیوں گا جب تک غمِ زندگی رہیگا

تِرا بے سبب بگڑنا ترا یونہی روٹھ جانا
مرا لاکھ منّتوں سے تجھے جا کے پھر منانا
کبھی وعدہ کر کے بھولو کبھی بِن بلائے آؤ
کبھی منتظر ہی رکھ کر مرا صبر آزماؤ
مرے بن ترا وُہ جینا ترے بن مرا وُہ مرنا
ترا بے رُخی سے ملنا ترا وہ گریز کرنا
تری گفتگو کا لہجہ تری صوت کا ترنّم
ترا چاند کا سا چہرہ تری زلف ہائے برہم
مجھے یاد ہے، وہ سب کچھ مجھے یاد ہے وُہ ابتک
مجھے یاد ہی رہے گا مری زندگی ہے جب تک

فضل محمود شانتی نکیتن

گوئٹے پر حافظ کی شاعری کا اثر

پینسٹھ برس کی عمر میں گوئٹے کی زندگی کا ایک دلچسپ دور شروع ہوتا ہے۔

اس سے پہلے وہ مدتوں طبیعیات اور حیاتیات کی دشوار گزار گھاٹیوں میں بھٹکتا پھرا۔ خوش قسمتی سے اس علمی تگ و دو میں گوئٹے کے فطری ذوقِ ادبیات نے اس کا دامن تھامے رکھا ورنہ ممکن تھا کہ اُس کے فلک پیما تخیلات جو جرمن زبان کی شاعری کا بہترین سرمایہ ہیں سائنس کے کسی ادق مسئلہ میں اُلجھ کر رہ جاتے۔ جس طرح ٹالسٹائے آخری عمر میں جمالی اور اخلاقی رجحانات کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا اسی طرح گوئٹے کی طبیعت بھی سائنس اور ادب کی آویزش سے محفوظ نہ رہ سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں اُس کی شاعری میں سائنس کا دخل ہو گیا وہاں اُس کے علمی نظریات میں شاعری کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ آپ فاؤسٹ ہی کو لیجئے۔ اس میں علمِ کیمیا، مابعد الطبیعیات اور نظریۂ ارتقا کے مسائل کا بیان شاعرانہ تخیل کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی طرح سائنس کے میدان میں جب اُس نے نیوٹن کے سات رنگوں والے نظریہ کی تردید کی تو تمام یورپ کے حکماء نے اس کی مخالفت میں لمبے چوڑے مضامین لکھے مگر وہ برابر کہتا گیا کہ میں یہ کیسے مان لوں کہ سفید روشنی جو ایک سماوی مظہرِ قدرت ہے سات حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے ؎

بُت پرستی میں بھی رکھ حُسن کے پہلو پہ نظر
ناربن، دیر سے رشتہ ہو تو زنّار نہ بن

عمر کے اس دور میں جب عوام کے روحانی اور جسمانی قوے پریخ بستہ افسردگی چھا جاتی ہے اور ہمارے شاعر "شیب" کا ماتم شروع کر دیتے ہیں گوئٹے کی رگوں میں خون کے بجائے شراب اور آگ گردش کرنے لگتی ہے اور وُہ ایک نو عمر عاشق کی عقیدت مندی کے ساتھ "محبوبِ چہاردہ سالہ" کے سامنے دوزانو ہو جاتا ہے۔

اس حیرت انگیز تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ اتنا عرصہ خشک علمی مباحث میں مصروف رہنے سے اُس کی طبیعت افسردہ ہو گئی تھی۔ اب آہستہ آہستہ ردِعمل شروع ہو رہا تھا۔ عین اسی وقت وہ حافظ شیرازی کی شاعری سے روشناس ہوا۔ فارسی شاعری اور تغزل کی دو نمایاں خصوصیات ہیں حکمت اور عشق چونکہ گوئٹے کی فطرت کا خمیر انہی دو عناصر سے اُٹھایا گیا تھا اس لئے وُہ حافظ کے حکیمانہ تغزل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ حافظ نے بندگی اور الوہیّت، حقیقت و معرفت، مذہب و اخلاق اور فنا و بقا کے مسائل کو ساقی کے گوشۂ چشم اور چینِ ابرو سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری ذہنی اُلجھنوں میں مذہب اور تصوّف کا اثر غالب ہے، اس لئے ہم حافظ کی شراب کو شرابِ معرفت سے تعبیر کرتے ہیں، مگر گوئٹے جو لامذہب کیا مذہب کا دشمن تھا اُس کو معرفت اور حقانیت کا واعظ نہیں بلکہ جوانی اور محبت کا پیامبر سمجھتا تھا۔ اس کو حافظ کی شراب میں تلخی اور بدمستی کا احساس ہوتا تھا۔ اُس کے لئے حافظ کی قنوطیت بھی اُمید افزا ثابت ہوئی۔ حافظ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بقول خود اس کو ازسرِ نو شباب حاصل ہو گیا۔ نقطۂ نگاہ کا اختلاف

کیسے یہ ذہنیت کا فرق کیسی ستم ظریفی ہے کہ جو کلام ہمیں یاس و قنوط کا درس دیتا ہے، جسے پڑھ کر ہمارے نوجوانوں کے عملی قوے مفلوج ہو جاتے ہیں وہی کلام ایک آزاد قوم کے پیرزال کے لئے آبِ حیات کا کام کرتا ہے۔

گوئٹے پر حافظ کے کلام کا یہ اثر ہوا کہ دن رات اس پر عجیب مسرت بخش وجدانی کیفیت طاری رہنے لگی۔ وہ بسا اوقات گوشۂ تنہائی میں چلا جاتا یا باہر ویرانہ میں نکل جاتا اور پہروں ایک ایک شعر پر غور و خوض کرتا رہتا۔ معنوی محاسن سے قطعِ نظر اس کو غزل کے قافیئے اور ردیف سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی مگر سب سے زیادہ وہ فارسی شاعری کی اچھوتی تشبیہوں سے متاثر ہوا۔ مثلاً سیمیں ذقن، گلبدن، آہو چشم، نرگسِ جادو، بوسۂ شکریں، سروِ رواں، لعلِ نوشِ لب، ساقِ شمشاد قد، ساعدِ سیم اندام، وغیرہ۔ مغربی شاعری میں لطیف تشبیہوں کی کمی نہیں مگر فارسی کے مقابلے میں گوئٹے انہیں ہیچ سمجھتا تھا۔ حافظ کی نادر ترا کیب اور سبک بندشیں اس کی جمالیاتی حس کو تسکین کا ساماں بہم پہنچاتی تھیں۔ اس کے تتبع میں گوئٹے نے بعض بہت نازک ترا کیب اپنی زبان میں داخل کیں۔ گوئٹے کے اس رنگ میں کہے ہوئے قطعات حافظ کے شعروں کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

گوئٹے ایک آزاد مشرب حکیم تھا۔ اس کا تخیل وطنیت اور ملت کی بندشوں سے آزاد تھا۔ بنی نوعِ انسان کے لئے اُس کی ہمدردی اور دلسوزی ہمہ گیر تھی۔ وہ رنگ و قوم کی قیود کو انسانیتِ عالیہ کے لئے لعنت سمجھتا تھا۔ اس نے بارہا اپنی قوم کے قومی جنون، خود پرستی، استبداد، عسکری تادیب اور فنونِ لطیفہ سے بیگانگی کا رونا رویا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ اگر جرمنوں کو یہودیوں کی طرح ساری دنیا میں بکھیر دیا جائے تو وہ یقیناً انسانیتِ عالیہ کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ بحیثیتِ قوم اُن کا وجود صد درجہ خطرناک ہے۔ چونکہ وُہ خود ایک عالمِ بے بدل تھا، اس لئے کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ عمر بھر اس نے صرف دو شاعروں کو اپنا ہم مرتبہ تسلیم کیا۔ حافظ اور بائرن۔ حافظ کے مشرب کی عالمگیر وسعت نے اُس پر جادو کا اثر کیا۔ اِس شعر کو اُس نے یقیناً بہت سراہا ہو گا ؎

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

والٹیر کی طرح وُہ بھی اپنے ہم عصر رہنمایانِ دین کی ریاکاری اور ابلہ فریبی سے سخت نالاں تھا۔ حافظ نے مکار صوفیوں کا خوب خاکا اُڑایا ہے۔ یہاں بھی دونوں میں نسبتِ روحانی پیدا ہو گئی۔ حافظ کے مندرجۂ ذیل اشعار میں اُسے ویمر یا برلن کے کسی گندم نما جَو فروش بشپ کی زندہ تصویر حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہو گی ؎

نقدِ صوفی نہ ہمہ صافی و بے غش باشد
اے بسا خرقہ کہ مستوجبِ آتش باشد
صوفیٔ ما کہ ز وِردِ سحری مست شدے
شامگاہش نگراں باش کہ سرخوش باشد
صوفیاں جملہ حریفند و نظر باز ولے
زیں میاں حافظِ دل سوختہ بدنام افتاد

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند

چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

فقیہِ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد

کہ مے حرام ولے بہ ز مالِ اوقاف است

اِس جگہ بے اختیار مجھے پنجاب کے "طوطا باز" پیرزادوں کا خیال آگیا جن کے مجاہداتِ نفس کونسل کی ممبری کے لئے دوڑ دھوپ، خرگوش کے شکار اور کشمیر کی سیر تک محدود ہو کے رہ گئے ہیں۔ مریدوں کی جو حالت ہوگی وہ ظاہر ہے۔ طالب آملی نے سچ کہا ہے ؎

خانۂ شرع خراب است کہ اربابِ صلاح

در عمارت گریٔ گنبدِ دستارِ خود اند

حافظ کے کلام نے گوئٹے کو صحیح معنوں میں جوان کر دیا تھا۔ اس کا جنسی جذبہ از سرِ نو بھڑک اُٹھا۔ انہی ایام میں جب وہ حافظ کے ہاتھ سے بادۂ شیراز کے جام نوش کر رہا تھا ایک مدت کی جدائی کے بعد اُسے اپنا ایک رنگین مزاج دوست فان ولمر ملا۔ فان ولمر کے ساتھ اس کی نو عمر محبوبہ میرین بھی تھی میرین جیسی خانہ بدوشوں کی لڑکی تھی جسے چودہ برس کی عمر میں فان ولمر نے اس کے والدین سے خرید لیا تھا۔ آمدِ شباب کے ساتھ اِس بدیشی حسینہ کا جوبن پہاڑی چشمے کی طرح پھوٹ پڑا۔ متناسب اعضاء، گدرایا ہوا جسم، سیاہ رسیلی آنکھیں، کلی کی طرح نازک دہن، آواز میں طوطیٔ شکر دہاں کی چہک، گوئٹے نے محسوس کیا جیسے حافظ کی خیالی محبوبہ اس کی نگاہوں کے سامنے زندہ ہو کر آگئی ہے۔ ہزار جان سے اُس پر عاشق ہوگیا۔ وہ اُسے مشرقی حسن کا بہترین نمونہ سمجھنے لگا۔ عربی اور فارسی ادبیات کے مطالعہ کے بعد لفظِ "مشرق" کے ساتھ جو رنگین تاثرات اس کے ذہن پر مرتسم ہو گئے تھے میرین کو دیکھ کر تازہ ہو گئے۔ اس کے رگ و پے میں عنفوانِ شباب کی گرمی دوڑ گئی اور اس کے جمالی احساسات تھرتھرا اُٹھے ؎

گفتم ز لعلِ نوش لباں پیر را چہ سود

گفتا بہ بوسۂ شکرینش جواں کنند

انہیں ایام میں فان ولمر نے گوئٹے کو اپنے دیہاتی مسکن پر آنے کی دعوت دی۔ جسے اُس نے دلی شوق کے ساتھ قبول کر لیا۔ اب اُس کی زندگی شراب و شعر کی فضا میں گھُلنے لگی۔ وہ بہت کم باہر نکلتا۔ اپنے کمرے میں ایک طرف بیٹھا تصورات کی دنیا میں کھویا رہتا۔ سامنے میز پر ایک نقرئی ساغر شراب سے لبالب بھرا پڑا رہتا اور وہ اس پر نظریں گاڑے بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا رہتا ؎

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم

اے بے خبر ز لذتِ شُربِ مدامِ ما

دن کا کچھ حصّہ وہ پائیں باغ کے پھولوں کے مطالعہ میں گزارتا اور شام کو میرین سے پیانو پر اپنے لکھے ہوئے گیت سنتا اور سر دُھنتا لیکن اوقات جذبات کی فراوانی سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ میرین اپنے دستِ نازک سے اُسے مئے گلرنگ اُنڈیل کر دیتی جب گوئٹے آتشبار نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تو میرین کے رخسار اُن کی تپش سے تمتما اُٹھتے ؎

یاد باد آنکہ چو یاقوتِ قدح خندہ زدے

درمیانِ من و لعلِ تو حکایت ہا بود

کبھی کبھی وہ اس کے قریب آبیٹھتی تو گوئٹے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں اُسے اپنی شراب و عشق کی تعریف میں لکھی ہوئی غزلیات سُنایا کرتا۔ میرین جس کی رگوں میں صحرا کا جنوں پرور خون گردش کر رہا تھا اپنے بوڑھے عاشق کی والہانہ محبت کی تاب نہ لا سکی۔ اس مُعمّر شاعر کے گیتوں نے جن میں بادۂ شیراز کی آگ دہک رہی تھی اس پر جادو کر دیا۔ اور وُہ بھی اُس سے محبت کرنے لگی۔ گوئٹے کا یہ قطعہ اُسی زمانے کا ہے۔

اُس نے مجمع پر ایک نگاہِ دزدیدہ ڈالی

سب حیران ہیں کہ اِس نگاہ کا مطلوب کون ہو سکتا ہے

مگر میں خوب جانتا ہوں کہ یہ خاموش پیار

میری ہی خوش نصیبی میں اضافہ کرے گا

مگر یہ معاملاتِ ناز و نیاز زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکے۔ فان ولمر گوئٹے کی سرمستی اور میرین کی محبت بھری محبوب نگاہوں سے خائف ہو گیا۔

ترا حیا و مرا آبِ دیدہ شُد غمّاز

وگرنہ عاشق و معشوق راز دارانند

اس کے بعد جلد ہی ولمر نے میرین سے نکاح کر لیا۔ اب گوئٹے کو بھی اخلاقی فرض کے پیشِ نظر اپنی محبوبہ سے جُدا ہونا پڑا اور وُہ دل پر پتھر رکھ کر ویمر چلا گیا۔ اس کے بعد تا دمِ مرگ اُن کی ملاقات نہ ہو سکی۔ مگر میرین کی محبت اُس کے دل میں باقی رہی۔ اب اس نے اپنی نظموں میں اپنے آپ کو حافظ اور میرین کو زلیخا کے نام سے مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ میرین بھی گوئٹے کو نہ بُھلا سکی۔ لطف یہ ہے کہ اس پُرجوش جذبۂ عشق نے اِس صحرائی حسینہ کو شاعرہ بنا دیا۔ اس واقعے کے بعد اُن کی خط و کتابت جاری رہی اور وُہ شعروں میں ایک دوسرے پر اپنی ناکامیِ آرزو کا اظہار کرتے رہے۔ گوئٹے کے دیوان میں جو دیوانِ حافظ کی روش پر لکھا گیا ہے میرین کی چار نظمیں بھی شامل ہیں۔ اور اہلِ نقد و نظر انہیں اِس دیوان کی چند بہترین نظموں میں شمار کرتے ہیں۔

ویمر میں میرین کی طرف سے جو پہلا خط گوئٹے کو مِلا اُس میں اِس مطلب کے اشعار درج تھے۔

آہ! میری حسرت نصیب محبت

اے نسیم! تیرے بازو پر کیف آور لمحات کا بار ہے

اور تیرے جھونکوں میں سرمدی راحت کا پیام نہاں ہے

لیکن میرے دلِ ناشاد کو تسکین کہاں؟

آ میرے کانوں میں سرگوشی کے لہجے میں کہہ دے:۔

"اس سے پہلے کہ شبِ تار کی زنگاری ردا

وادی اور دریا اور کوہستان کو ڈھانک لے

تجھے بھی اپنے محبوب کی آغوش ڈھانک لے گی"

گوئٹے نے مندرجۂ ذیل جواب لکھ کر بھیجا:۔

میرا دل جو زلفِ سیاہ کے پرپیچ حلقوں میں اسیر ہے

ہر وقت اضطراب اور بے کلی کی حالت میں رہتا ہے

لیکن میں اس قید کا جس پر آزادی روح نثار کردوں اور ان بدمست

سانپوں کا جن پر شراب کی سیہ مستی فدا ہو جائے کیسے شکوہ کرسکتا ہوں

فصلِ بہار آگئی

مرغزاروں اور گلبنوں میں سبزے نے اپنی چادر بچھادی

کوہِ آتش فشاں بھی سبزے سے ڈھک گیا

مگر اس کے سینے میں جہنم کی آگ بھڑک رہی ہے۔

اسی طرح جانِ من تمہارا عاشق محبت کی آتشِ خاموش میں جل کر بھسم ہوگیا۔

ان دنوں وہ کہیں راکھ کا ڈھیر دیکھ کر کہہ اٹھے گی

"اف بیچارہ۔ میری محبت میں جل مرا"

آپ نے دیکھا حافظ کے الہامی نغموں نے مغرب کے اس مفکر اور حکیم کے دل و دماغ کو کس طرح متاثر کیا تھا۔ حافظ کا اثر اتنا سطحی نہیں تھا کہ وہ گوئٹے کے "دیوان" کے صفحات میں محدود ہو کر رہ جاتا۔ اسّی برس کی عمر میں گوئٹے نے اپنا شاہکار فاوسٹ مکمل کیا۔ فاوسٹ کے آخری حصے میں جہاں کہیں معاملاتِ حسن و عشق بیان کئے گئے ہیں حافظ کے اس گہرے اثر کا کھوج ملتا ہے۔

عبّاس درویش

تضمین بر غزلِ حضرتِ بیدلؒ

بگذر زپیرہنِ کہن، بدرش کن وبکفن درآ ۔۔۔ تو بغربتے اے دل ناسزا چہ فتادۂ بوطن درآ
بجمالِ تن چہ نظر کنی، بخیالِ جاں ہمہ تن درآ ۔۔۔ ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو و سمن درآ

تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ

بہ محبتِ بتِ شعلہ خو مبر آبِ چہرۂ آبرو ۔۔۔ مپذیر قربتِ گل رخاں مطلب وصالِ رخِ نکو
بسیہ دلانِ سپید رو مفگن نظر بصد آرزو ۔۔۔ پۓ نافہائے رمیدہ بو مپسند زحمتِ جستجو

بخیالِ حلقۂ زلفِ او گرہے خورد بختن درآ

بہ غمِ فراقِ تو ہم نفس! نفسے برنج شمردہ ام ۔۔۔ تنِ ناتوان وضعیف را ہمہ تن بمرگ سپردہ ام
بہوائے روئے شگفتہ ات چو فسردہ غنچہ فسردہ ام ۔۔۔ غمِ انتظارِ تو بردہ ام برِ خیال تو مردہ ام

قدمے بہ پرسشِ من کشا نفسے چو جاں بہ بدن درآ

بگذشت عمرِ عزیزِ تو ہمہ تن بہ سستی و کاہلی ۔۔۔ لبِ دجلہ جائے گرفتی و بہ لبانِ خشک چو ساحلی
بہ تصورِ بتِ سادہ رو، کہ بیادِ زہرہ شمائلی؟ ۔۔۔ بہ کدام آئینہ مائلی کہ زفرصت ایں ہمہ کاہلی

تو نگاہِ دیدۂ بسملی مژہ واکن و بکفن درآ

رہِ نرد بانِ غنا طلب چہ فتادۂ بگو عنا ۔۔۔ قدمے بصدق و صفا بنہ بگریز از ہمہ ماسوا
بدر آ بنبہ زگوشہا ہمہ گوش شو دلِ ناسزا ۔۔۔ ز سروشِ محفلِ کبریا ہمہ وقت می رسد ایں ندا

کہ بخلوتِ ادب و وفا زدرے بروں نشدن درآ

مبر امجد! از کسِ ہیکساں، مبر احتیاج بہ پیش کس ۔۔۔ تو ہمائے اوجِ سعادتی مفگن نظر بہ پرِ مگس
نفسے گزار بہ خوش دلی۔ بگذر ز کشمکشِ نفس ۔۔۔ بدر آئے بیدل ازیں قفس اگر آں طرف کشدت ہوس

تو بغربتے آں ہمہ خوش نہ کہ نگویت بوطن درآ

احمد حسین امجد

سلام

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو
ہم کو ہے طبل و پرچمِ لشکر کی آرزو

بامِ جدال و گردِ رہِ عزم کا ہے شوق
اورنگ کی ہوس ہے نہ افسر کی آرزو

کانٹوں پہ حق پرست بدلتے ہیں کروٹیں
بالش کا اشتیاق نہ بستر کی آرزو

تعویذ کیا کروں گا کہ اِن بازوؤں کو ہے
اژدر شکار قوتِ حیدر کی آرزو

کرنا ہے اپنے خون میں ہم کو شناوری
تسنیم کی تڑپ ہے نہ کوثر کی آرزو

اُس آرزو سے میرے لہو میں ہے جزر و مد
دشتِ بلا میں تھی جو بہتر کی آرزو

رنگیں مزاجیوں کا نہیں ہے محل ہنوز
دل کو ہے خونِ مرحب و عنتر کی آرزو

بادِ مراد، آبِ طرب کا نہیں ہے وقت
طوفاں کا اشتیاق ہے صرصر کی آرزو

رقصِ پری و شانِ خرامِ صبا حرام
دل کو ہے ضربِ فاتحِ خیبر کی آرزو

ہاں عمرِ جاوداں کی ہمیں بھی نوید دے
اے موت، اے جوانیٔ اکبر کی آرزو

جوش اُس سبوئے قلب پہ کون و مکاں نثار
غلطاں ہو جس میں ساقیٔ کوثر کی آرزو

جوش ملیح آبادی

سماج

بچپن میں بھوتوں اور پریوں کی فرضی کہانیاں سُننے کے بعد جب سچ مچ کی کہانیاں پڑھیں تو اُن میں عموماً ایک مشکل سا لفظ آیا کرتا۔ ساری کہانی سمجھ میں آجاتی لیکن وہ لفظ سمجھ میں نہ آتا۔ وُہ دن — اور آج کا دن، اُس لفظ کا پتہ ہی نہ چل سکا۔

وہ لفظ ہے "سماج"۔ یوں تو یہ لفظ آسان ہی ہے، اِس کے معنی "برادری" کے ہوں گے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جماعت کے لوگ بستے کہاں ہیں اور کیوں بات بات پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ لوگوں کو کچھ کرنے نہیں دیتے۔ کسی کو آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ نہ جانے اِس جماعت کے اغراض ومقاصد کیا ہیں؟ اور یہ لوگ کیوں سکون کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی ہم نے سُنا۔ ظالم سماج، خوفناک سماج، مکرُوہ سماج — !

اُن دنوں ہمیں یوں معلوم ہوتا جیسے سماج شیطان کے بھائی بندوں میں سے کوئی بیہودہ سا آوارہ گرد شخص ہے جس کا کام دن بھر ظلم کرنا اور لوگوں کو ڈرانا ہے۔ چنانچہ بچپن میں ہم جتنا شیطان سے ڈرتے اُتنا ہی سماج سے ڈرا کرتے۔

پھر کچھ اور دماغی تصویریں بن گئیں۔ یہ لفظ بڑے بڑے دکھائی دینے لگے — "سماج کا شکار" — "سماج کے تیز پنجوں میں حقیری جان" — "سماج کے بھیانک منہ کا نوالہ" — !

کئی سال تک ہمارے سامنے سماج ایک ڈراؤنا سا جانور رہا، جو اونٹ کی طرح بے ڈھنگا، ریچھ کی طرح مکّار اور بھدّا، اور چیتے کی طرح خطرناک تھا — اب آپ کہیں گے یہ اونٹ، ریچھ وغیرہ اکٹھے کیسے ہو گئے؟ — تو بس سمجھ لیجئے کہ یونہی ہو گئے، بچپن ہی تو تھا — اور پھر سماج کوئی سادہ چیز تو تھی ہی نہیں، خیر! کتنے ہی دنوں ہم سماج کو خوفناک درندوں میں گنتے رہے!

اس کے بعد ذرا عقل مند ہوئے اور اب سماج پر ایک نقاد کی طرح جو غور کیا تو چند اور الفاظ دل میں کھٹکنے لگے — "سماج کے ٹھیکیدار" — "سماج کے اجارہ دار" — ! نتیجہ جو نکلا تو افسوس ہُوا کہ اب تک ہم سماج کو بالکل غلط سمجھتے رہے۔ سماج تو ایسی چیز ہے جس کا ٹھیکہ بھی لیا جا سکتا ہے، کوئی تجارتی جنس ہوگی — یا شاید نباتات یا معدنیات میں سے کچھ ہو، جو کچھ بھی تھا بہر حال ہمیں یہ پتا ضرور چل گیا کہ سماج کا ٹھیکہ لینا کوئی آسان کام نہیں — بڑے دل جگرے کا کام ہے۔ لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ کیونکہ بچہ بچہ ان کے خُون کا پیاسا نظر آتا ہے۔ ساری خلقت ان کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑی ہوتی ہے۔

کتنے ہی دنوں ہمیں یہ تلاش رہی کہ کسی "سماج کے ٹھیکیدار" کا بغور ملاحظہ کریں۔ بازاروں میں تلاش کی، گلی کوچوں میں پھرے، ہر قسم کے ٹھیکیدار دیکھے، — کوئلے کے، لکڑی کے، مزدوروں کے، اور نہ جانے کس کس چیز کے، — لیکن اِس قسم کا ٹھیکیدار کہیں نہ ملا۔ کئی سیانے حضرات سے کہا کہ قبلہ آپ ہی یہ مشکل آسان کر دیجے۔ کئی لاحول پڑھنے لگے۔ بہت سے بولے "میاں جاہل ہو!" پھر ایک خاتون سے جن

کے ہر مضمون کے ہر صفحے پر ہر پانچ چھ سطروں کے بعد سماج کا لفظ آتا تھا ملتے گئے۔ اور بڑی عاجزی سے کہا کہ محترمہ آپ کو تو ان ٹھیکیداروں کا اتا پتا معلوم ہوگا اگر آپ ان میں سے کسی کو اِس خاکسار سے ملا دیں تو ایک بوجھ میرے سینے سے اُتر جائے۔ باوجود اس قدر سنجیدگی کے وہ یہی کہیں کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔

سماج کی کہانیوں میں عموماً ایک مزدور کی محبت ایک امیر لڑکی سے ہو جاتی ہے، فریقین مختلف ذات (جات پات) کے ہوتے ہیں۔ آنکھ جھپکتے ہی محبت ہو جاتی ہے — پریم کی شراب نینوں میں چھلکنے لگتی ہے، پریم کے تیر نینوں کو چیر کر دلوں میں کھُب جاتے ہیں۔ پھر رسوائی ہوتی ہے —— اور رسوائی کیا اچھی خاصی پبلسٹی کی جاتی ہے، ہیرو اور ہیروئن زور زور سے آہیں بھرتے ہیں، مختلف طرز کے گانے گاتے ہیں —— پھر سماج بیچ میں آجاتا ہے — سماج کے ٹھیکیداروں سے اپیل کی جاتی ہے — پھر بغاوت ہوتی ہے اور ہیرو ہیروئن کو لے کر بھاگ نکلتا ہے۔ اگر ہیروئن پوچھے کہ "بھئی ہم کہاں جا رہے ہیں؟" تو جواب ملتا ہے کہ "دُور — دُور — ! اس مکروفریب کی دنیا سے بہت دُور — ! جہاں آشائیں مچلتی ہیں۔ جہاں اُمنگیں پنپتی ہیں — جہاں سماج کا خوفناک پنجہ —— معصوم روحوں کا تعاقب نہیں کرتا........!" وغیرہ

یقین مانئے مجھے اِس قسم کی جگہ کی بڑی تلاش رہی ہے —— خاص طور پر امتحان کی تیاری کے دنوں میں، تاکہ یکسوئی سے پڑھ سکوں۔ کوہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے سی۔ پی کے جنگلوں تک، اور وہاں سے سندھ کے ریگستانوں تک جا کر دیکھ لیا، لیکن اِس قسم کی پُرسکون جگہ کہیں نہ ملی —— جہاں بھی گیا وہاں وہی "مکروفریب" کی قسم کی دُنیا ملی۔

جی ! — تو فرض کیا وہ دونوں چل پڑے —— اب کہانی لکھنے والے کا فرض ہے کہ وہ یا تو دونوں سے ورنہ کم از کم ایک سے تو ضرور ہی خودکشی کرا دے، اور نہ پھر کہانی ہی کیا رہی۔ اور اگر ایک انتقال کر گیا (یا کر گئی) تو دوسرے کا انجام بھی نزدیک ہی ہے۔ عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں اکٹھے سماج کے جنگل میں آ جاتے ہیں اور شہیدانِ محبت کی لاشیں کسی دریا میں تیرتی ملتی ہیں —— یا یوں ہوتا ہے کہ ایک کچھ دیر پہلے مرتا ہے اور دُوسرا اُس کی لاش پر چیخ مار کر گرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اب صاحب اِس قسم کا مرنا بہت مشکل ہے، مشکل کیا ایک حد تک ناممکن ہے۔ خیر! پھر یہ فقرہ آتا ہے —— "اُن معصوم ہستیوں کی یاد میں جو سماج کے بھینٹ چڑھ گئیں" اور آخر میں سماج پر دل کھول کر لعنت بھیجی جاتی ہے، اُسے خوب کوسا جاتا ہے، گالیاں دی جاتی ہیں۔

ایک بات اور میں نہیں سمجھا۔ بھلا ایک مزدور کو کس حکیم نے کہا ہے کہ وہ ضرور ایک سیٹھ کی لڑکی سے محبت کرے، بالفرض محبت کر بھی لے تو پھر ضرور ہی اُس سے شادی کرنے پر اُتر آئے۔ کم از کم یہی سوچ لے کہ اُسے لا کر بٹھائے گا کہاں۔ خالی محبت تو ایک دو مہینے تک چلے گی بس۔

اِس قسم کے لوگ سماج کو کوسنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ٹھنڈے دل سے عملی باتوں پر غور کر لیا کریں تو اُن کو کسی قدر افاقہ ہو جائے۔

ایک دن میرے ایک بدشکل سے کلرک دوست آئے جنہوں نے خلافِ معمول لمبے لمبے سانس لئے ۔۔۔ میں سمجھا کسی ڈاکٹر نے پھیپھڑوں کے لئے ورزش تجویز کی ہے۔ پھر اُنہوں نے بار بار پیٹ پر ہاتھ رکھنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ سینے کی بھی مالش کرنے لگے۔ مجھے رحم آنے لگا کہ بیچارے بیمار ہیں ۔۔۔ درد ہوگا کہیں۔ ابھی میں ہمدردی کے لئے الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ وُہ اُٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے دن اُن کا یہی پروگرام بڑی سرگرمی سے شروع ہوا۔ پوچھا کہ بھئی اب تک درد اچھا نہیں ہوا ایک روز فاقہ کرلو تو بہتر ہے۔

بولے "یہ درد تو اب جان لے کر ٹلے گا"۔ میں ڈر گیا۔ پھر بولے "کیا کبھی تمہیں کسی سے پریم ہوا؟"

میں نے چمک کر کہا "میرے دُشمنوں کو ہو پریم! مجھے کیا مصیبت پڑی ہے ۔۔۔!"

وُہ مُنہ بسور کر بولے "ہائے تم کیا جانو اس آگ کو، کیا سچ مچ تمہیں پریم نہیں ہُوا؟"

"ارے بھئی بتا تو دیا ایک دفعہ کہ نہ تو ہُوا ہے اور نہ ارادہ ہی ہے۔ مجھے خُوب نیند آجاتی ہے، سارے کھیل کھیل لیتا ہُوں، دوسرے تیسرے دن سینما دیکھ لیتا ہوں ۔۔۔ میرے پاس ایک موٹر سائیکل بھی ہے، خوب تندرست ہوں، مگن رہتا ہوں ۔۔۔ یہاں تو پریم کی گنجائش ہی نہیں نکلتی ۔۔۔!"

وُہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر اُنہوں نے رُک رُک کر اپنی خونچکاں داستانِ حُسن وعشق سنائی کہ کس طرح اُنہیں دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کی حسین لڑکی سے محبت ہوگئی ہے اور وُہ بھی ان کی طرف دیکھ کر مُسکرایا کرتی ہے۔

میں نے پوچھا "مسکرایا کرتی ہے؟ ۔۔۔ کس بات پر؟"

وُہ بولے "میرے گھائل ہردے پر مرہم لگانے کے لئے ۔۔۔!"

"تو پھر تم چاہتے کیا ہو ۔۔۔؟"

"اُس فرشتے کو اپنا بنانا چاہتا ہوں ۔۔۔!"

"کس فرشتے کو؟ ۔ ابھی تو تم سپرنٹنڈنٹ کی لڑکی کا ذکر کر رہے تھے ۔۔۔!"

"اسی کو ۔۔۔ اُس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔!"

میں نے پوچھا "تو پھر رُکاوٹ کس بات کی ہے؟"

بولے "ظالم سماج! ۔۔۔ یہ ہندوستان کی مصیبت، یہ لعنت ۔۔۔ ذلیل سماج! ۔۔۔ سماج کے ٹھیکیدار جنہوں نے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ سماج کے اس مقتل میں معصوم زندگیاں ذبح ہو رہی ہیں ۔۔۔ سماج کا بیڑا غرق ہو ۔۔۔!"

میں نے جلدی سے کہا "بس بس ۔۔۔ یوں سماج کی گردان مت کرو۔ پہلے یہ تو بتاؤ تمہاری آمدنی کیا ہے؟"

بولے "بیالیس روپے دس آنے، پانچ پائی ۔۔۔!"

"اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کی؟"

"ساڑھے سات سو ——!"

"تو تم یہ چاہتے ہو کہ سماج تمہاری تنخواہ اتنی بڑھا دے کہ تم اُن کی لڑکی سے شادی کر سکو —— ؟"

"نہیں تو ——! یعنی کہ —— وُہ دیکھئے نا میرا مطلب ہے کہ سماج ——!"

"فضول گفتگو سے پرہیز کرو ——! بہتر ہوگا کہ تم اِن بیالیس روپے، دس آنے اور پانچ پائیوں ہی پر قانع رہو۔ اور پھر تم نے کبھی غور سے اپنی شکل کسی اچھے سے آئینے میں ——!"

"آہ! تم نہیں جانتے، پریم شکل و صورت، آمدنی —— اور تنخواہ وغیرہ سب سے بلند ہے ——!"

"یہ سب فضول ہے —— نکمّی باتیں ہیں —— میں نہیں مانتا۔ تم اسی وقت اپنی صورت کسی آئینے میں ——!"

"آہ! ظالم سماج ——!"

میں نے سماج کی طرف داری کرتے ہوئے کہا "خبردار! اگر اب تم نے سماج کو بُرا بھلا کہا تو میں شاید تمہارے کان کھینچنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

بہت سے حضرات دیکھے، جو افسانے کو پڑھنے سے پہلے صفحات کو جلد جلد اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں، اور اگر انہیں کہیں سماج کا لفظ نظر آجائے تو فوراً وہ افسانہ چھوڑ کر دوسرے کا پوسٹ مارٹم شروع کر دیتے ہیں۔ اگر پوچھیں کہ "یہ کیا —— ؟" جواب ملتا ہے "جناب اِس کا پلاٹ تو پہلے ہی معلوم ہوگیا۔ یقین نہ ہو تو سُن لیجئے ——!" اس کے بعد وہ پلاٹ بھی سنا دیں گے تو قریب قریب صحیح ہی نکلے گا۔

پانچ چھ سُرخیاں تو ہیں ہی —— بے جوڑ محبت —— امیری اور غریبی کا رونا، مزدور کے بیوی بچوں کی علالت —— فاقہ کشی —— رسوائی —— بغاوت —— اپیل —— خودکشی ——! دوسرے نمبر پر بوڑھے آدمیوں کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ کہ کس طرح ایک غریب ضعیف آدمی پر مصیبتیں ٹوٹتی ہیں۔ وُہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اُسے دوا تک کو پیسے میسّر نہیں ہوتے پڑوس کے محل میں جشن ہو رہا ہے —— نغموں کی صدا اتنی بلند تھی کہ اُس نے بوڑھے کے کراہنے کی مدھم آواز کو دبا لیا —— اُدھر مُسرت تھی مستی تھی، سرمایہ داری نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی —— اِدھر ایک غریب دم توڑ رہا تھا —— اُس کی کمزور ہڈیاں چٹخ رہی تھیں، ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا، داڑھی پر آنسو بہہ رہے تھے۔ وُہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا، اور زمین کھودنے لگا، جس میں سے ایک زنگ آلودہ صندوقچی نکلی، اور اُس میں کیا تھا —— ؟ —— آہ! اس میں ایک حسین لڑکی کی دھندلی سی تصویر تھی —— بڈھے نے ایک سرد آہ کھینچی، اُس کے ہونٹ ہلے —— وہ بولا "آہ ظالم سماج!" —— اور ایک لمحے میں اُس کا بے جان جسم زمین پر پڑا تھا —— اور پڑوس میں نغموں کی صدائیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں ——!" —— اب اس بیچارے سماج کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔

ایک تو یہ کہ وُہ شخص بوڑھا کیوں ہُوا؟ —— ہمیشہ جوان ہی کیوں نہ رہا؟ —— تو صاحب بوڑھا تو آخر ہر کوئی ہوتا ہے اس میں کسی کا کیا بس ——! جو جوانی میں چھلانگیں لگاتا پھرے وُہ ایک دن بوڑھا بھی ہوگا۔ دوسرے یہ کہ وہ بوڑھا بیمار کیوں ہُوا —— ؟

ایک دن میرے ایک بدشکل سے کلرک دوست آئے جنہوں نے خلافِ معمول لمبے لمبے سانس لئے ـــ میں سمجھا کسی ڈاکٹر نے پھیپھڑوں کے لئے ورزش تجویز کی ہے۔ پھر اُنہوں نے بار بار پیٹ پر ہاتھ رکھنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ سینے کی بھی مالش کرنے لگے۔ مجھے رحم آنے لگا کہ بیچارے بیمار ہیں ـــ درد ہوگا کہیں۔ ابھی میں ہمدردی کے لئے الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ وُہ اُٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے دن اُن کا یہی پروگرام بڑی سرگرمی سے شروع ہوا۔ پوچھا کہ بھئی اب تک درد اچھا نہیں ہُوا ایک روز فاقہ کر لو تو بہتر ہے۔

بولے "یہ درد تو اب جان لے کر ٹلے گا" میں ڈر گیا۔ پھر بولے "کیا کبھی تمہیں کسی سے پریم ہُوا؟"

میں نے چمک کر کہا "میرے دُشمنوں کو ہو پریم، مجھے کیا مصیبت پڑی ہے ـــ!"

وُہ مُنہ بسور کر بولے "ہائے تم کیا جانو اس آگ کو، کیا سچ مچ تمہیں پریم نہیں ہُوا؟"

"ارے بھئی بتا تو دیا ایک دفعہ کہ نہ تو ہُوا ہے اور نہ ارادہ ہی ہے۔ مجھے خُوب نیند آجاتی ہے، سارے کھیل کھیل لیتا ہُوں، دوسرے تیسرے دن سینما دیکھ لیتا ہوں ـــ میرے پاس ایک موٹر سائیکل بھی ہے، خوب تندرست ہوں، مگن رہتا ہوں ـــ یہاں تو پریم کی گنجائش ہی نہیں نکلتی ـــ!"

وُہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر اُنہوں نے رُک رُک کر اپنی خونچکاں داستانِ حُسن وعشق سنائی کہ کس طرح اُنہیں دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کی حسین لڑکی سے محبت ہوگئی ہے اور وُہ بھی ان کی طرف دیکھ کر مُسکرایا کرتی ہے۔

میں نے پوچھا "مسکرایا کرتی ہے؟ ـــ کس بات پر؟"

وُہ بولے "میرے گھائل ہردے پر مرہم لگانے کے لئے ـــ!"

"تو پھر تم چاہتے کیا ہو ـــ؟"

"اُس فرشتے کو اپنا بنانا چاہتا ہوں ـــ!"

"کس فرشتے کو؟ ـ ابھی تو تم سپرنٹنڈنٹ کی لڑکی کا ذکر کر رہے تھے ـــ!"

"اسی کو ـــ اُس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں ـــ!"

میں نے پوچھا "تو پھر رُکاوٹ کس بات کی ہے؟"

بولے "ظالم سماج! ـــ یہ ہندوستان کی مصیبت، یہ لعنت ـــ ذلیل سماج! ـــ سماج کے ٹھیکیدار جنہوں نے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ سماج کے اس مقتل میں معصوم زندگیاں ذبح ہو رہی ہیں ـــ سماج کا بیڑا غرق ہو ـــ!"

میں نے جلدی سے کہا "بس بس ـــ یوں سماج کی گردان مت کرو۔ پہلے یہ تو بتاؤ تمہاری آمدنی کیا ہے؟"

بولے "بیالیس روپے دس آنے، پانچ پائی ـــ!"

"اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کی؟"

"ساڑھے سات سو——!"

"تو تم یہ چاہتے ہو کہ سماج تمہاری تنخواہ اتنی بڑھا دے کہ تم اُن کی لڑکی سے شادی کر سکو——؟"

"نہیں تو——! یعنی کہ—— وُہ دیکھئے نا میرا مطلب ہے کہ سماج——!"

"فضول گفتگو سے پرہیز کرو——! بہتر ہوگا کہ تم اِن بیالیس روپے، دس آنے اور پانچ پائیوں ہی پر قانع رہو۔ اور پھر تم نے کبھی غور سے اپنی شکل کسی اچھے سے آئینے میں——!"

"آہ! تم نہیں جانتے، پریم شکل و صورت، آمدنی—— اور تنخواہ وغیرہ سب سے بلند ہے——!"

"یہ سب فضول ہے—— نکمّی باتیں ہیں—— میں نہیں مانتا۔ تم اسی وقت اپنی صورت کسی آئینے میں——!"

"آہ! ظالم سماج——!"

میں نے سماج کی طرف داری کرتے ہوئے کہا، "خبردار! اگر اب تم نے سماج کو بُرا بھلا کہا تو میں شاید تمہارے کان کھینچنے پر مجبور ہو جاؤں گا"

بہت سے حضرات دیکھے، جو افسانے کو پڑھنے سے پہلے صفحات کو جلد جلد اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں، اور اگر انہیں کہیں سماج کا لفظ نظر آ جائے تو فوراً وہ افسانہ چھوڑ کر دوسرے کا پوسٹ مارٹم شروع کر دیتے ہیں۔ اگر پوچھیں کہ یہ کیا——؟ جواب ملتا ہے "جناب! اس کا پلاٹ تو پہلے ہی معلوم ہو گیا۔ یقین نہ ہو تو سُن لیجئے——!" اس کے بعد وہ پلاٹ بھی سنا دیں گے تو قریب قریب صحیح ہی نکلے گا۔

پانچ چھ سُرخیاں تو ہیں ہی—— بے جوڑ محبّت—— امیری اور غریبی کا رونا، مزدور کے بیوی بچوں کی علالت—— فاقہ کشی—— رسوائی—— بغاوت—— اپیل—— خودکشی——! دوسرے نمبر پر بوڑھے آدمیوں کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ کہ کس طرح ایک غریب ضعیف آدمی پر مصیبتیں ٹوٹتی ہیں۔ وُہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اُسے دوا تک کو پیسے میسّر نہیں ہوتے پڑوس کے محل میں جشن ہو رہا ہے—— نغموں کی صدا اتنی بلند تھی کہ اُس نے بوڑھے کے کراہنے کی مدھم آواز کو دبا لیا—— اُدھر مُسرّت تھی مستی تھی، سرمایہ داری نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی—— اِدھر ایک غریب دم توڑ رہا تھا—— اُس کی کمزور ہڈیاں چٹخ رہی تھیں، ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا، داڑھی پر آنسو بہہ رہے تھے۔ وُہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا، اور زمین کھودنے لگا، جس میں سے ایک زنگ آلودہ صندوقچی نکلی، اور اُس میں کیا تھا——؟—— آہ! اس میں ایک حسین لڑکی کی دھندلی سی تصویر تھی—— بوڑھے نے ایک سرد آہ کھینچی، اُس کے ہونٹ ہلے—— وہ بولا "آہ ظالم سماج!"—— اور ایک لمحے میں اُس کا بے جان جسم زمین پر پڑا تھا—— اور پڑوس میں نغموں کی صدائیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں——!"—— اب اس بیچارے سماج کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔

ایک تو یہ کہ وُہ شخص بوڑھا کیوں ہُوا؟—— ہمیشہ جوان ہی کیوں نہ رہا؟—— تو صاحب بوڑھا تو آخر ہر کوئی ہوتا ہے اس میں کسی کا کیا بس——! جو جوانی میں چھلانگیں لگاتا پھرے وُہ ایک دن بوڑھا بھی ہوگا۔ دوسرے یہ کہ وہ بوڑھا بیمار کیوں ہُوا——؟——

ضرور سماج کی شرارت ہے ـــــ سو عرض ہے کہ طبی کتابیں پڑھئے تو پتا چلے گا کہ بوڑھے آدمی عموماً بیمار رہتے ہیں ـــــ اور بڑھاپا بذاتِ خود ایک بیماری ہے۔

پھر یہ کہ وہ بوڑھا اتنا غریب کیوں تھا؟ ـــــ اب بتائیے اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کہ اُسے جوانی میں جو محبت تھی اس میں سماج نے خواہ مخواہ اپنی ٹانگ کیوں اڑائی؟ کیوں اُس کی محبوبہ کو اُس سے چھین لیا ـــــ کیا حق تھا سماج کو دو پریم کے متوالے دلوں کو توڑنے کا؟ اور ہاں ایک بات میں بھول گیا ـــــ وہ یہ کہ پڑوس میں ایک محل کیوں تھا؟ ـــــ اور سماج کی سازش سے اُس میں اُسی رات جشن کیوں ہوا؟ (مرثیہ گوئی کیوں نہ ہوئی؟) ـــــ سو یہ محلِ وقوع کا قصور ہے۔ حدودِ اربعہ کا قصور ہے۔ اور اُس امیر کے پروگرام کا قصور ہے۔ اب خود ہی خیال فرمائیے کیا یہ افسانے ایسے نہیں ہوتے جنہیں پڑھ کر اچھے بھلے انسان کو مالیخولیا ہو جائے دُنیا میں قہقہے بھی ہیں، مسکراہٹ بھی ہے! ـــــ مسرت بھی ہے۔ لیکن اس کی تلاش نہیں کی جاتی۔

یا شاید سماج اُس طاقت کا نام ہے جو کسی شخص کو اپنا مقصد پورا کرنے سے روکتی ہے۔ ایک غریب کو امیر ہونے سے روکتی ہے۔ بدشکل آدمیوں کی محبت میں حائل ہوتی ہے ـــــ ایک اَن پڑھ مزدور کو کار میں بیٹھنے سے باز رکھتی ہے ـــــ اِکسی کوشش کا نتیجہ خاطرخواہ نہ نکلا، یا کوئی احمقانہ حرکت کر بیٹھے تو بجائے لاحول پڑھنے کے کہہ دیا کہ ظالم سماج کا قصور ہے۔

اگر اسی طرح ہر بات میں غریب سماج کو قصوروار ٹھہرایا گیا تو وہ دن دُور نہیں جب کسی کو بخار چڑھے گا تو وہ مُنہ بسور کر کہے گا کہ سماج کا قصور ہے۔ کوئی صاحب دُبلے رہ گئے تو کہیں گے کہ یہ سماج کی بُرائی ہے۔ اور اگر کوئی صاحب بہت موٹے ہو گئے تو بھی سماج ہی کو کوسا جائے گا۔ نالائق لڑکے امتحان میں فیل ہونے کی وجہ سماج کی کھوکھلی بنیادوں کو قرار دیں گے۔ یہاں تک کہ گالیاں بھی یوں دی جائیں گی ـــــ کہ "خدا کرے تجھ پر سماج کا ظلم ٹوٹے"، "یا اللہ اسے سماج کے پنجے میں گرفتار کر"ـــــ یا "پرماتما نے چاہا تو سماج سر چڑھ کر بولے گا" اور دعائیں بھی اِس قسم کی ہوں گی "پیسہ دیتا جا بابا خدا تجھے سماج سے بچائے ـــــ!" "یا میرے اللہ مجھے سماج کی ہوا سے بچائیو" وغیرہ۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ سماج کے متعلق زیادہ سوچنے والوں یا "مریضِ سماج" لکھنے والوں میں زیادہ تعداد کمزور، چڑچڑے، اور غمگین حضرات کی ہے۔ تندرست اور ہنس مکھ آدمیوں کو کبھی سماج کی غیبت کرتے نہیں سُنا گیا، اوّل تو وہ جانتے ہی نہیں کہ سماج کس چڑیا کا نام ہے، اور اگر انہیں کوئی اس کی بُرائیاں بتا بھی دے تو یہ حسبِ معمول سماج کی تعریفیں ہی کریں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ سماج کے متعلق سوچتے رہنا ایک بیماری ہے جس کا تعلق خُون کی کمی، اعصاب کی کمزوری اور ہاضمے کی خرابی سے ہے۔ یہ بیماری اُس وقت تک دفع نہیں ہوتی جب تک دیگر شکایات رفع نہ کی جائیں۔ اور اگر اس بیماری کو یونہی چھوڑ دیا جائے تو مریض کی حالت خطرناک ہوتی جاتی ہے۔ ذرّے ذرّے میں اُسے سماج کی کرشمہ آرائیاں نظر آتی ہیں ـــــ رنگ برنگ کے پھُول دیکھ کر اُسے افسوس ہوتا ہے کہ یہ مسرور کیوں ہیں، سوکھے ہوئے پتوں کو دیکھ کر اُس کا کلیجہ مُنہ کو آجاتا ہے ـــــ سوچتا ہے کہ یہ سوکھے ہوئے کیوں ہیں۔ کوّوں کو دیکھ کر

غمگین ہوجاتا ہے کہ یہ کالے کیوں ہیں۔ کسی کو ہنستے دیکھ کر اُس کا خُون کھولنے لگتا ہے اور یوں منہ بناتا ہے جیسے کہہ رہا ہو —— "ہنستا ہے بے؟ ابھی کہہ دوں گا سماج سے۔ ہاں!" اُسے خواب بھی عجیب و غریب دکھائی دیتے ہیں جیسے ہندوستان ایک بہشت ہے، جس میں نہ جنگل ہیں، نہ پہاڑ، نہ صحرا ہیں نہ دریا، نہ کسی دوسرے ملک کو یہاں سے کوئی راستہ جاتا ہے۔ بس ایک پیارا پیارا دیش ہے، جدھر نظر دوڑاؤ اُونچی اُونچی عالیشان کوٹھیاں ہیں، جھونپڑوں کی قسم کی کوئی چیز نظر نہیں آتی، آدمیوں میں جات پات کی تمیز مٹانے کے لئے اُنہیں نمبروں سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً ابا کا نمبر ہے تین سو پچاس الف/۴، بڑا بیٹا سولہ سو تیس ج ہے اور چھوٹی بچی پندرہ سو سولہ ل ہے سب کے سب ایک ہی قد کے ہیں، ایک ہی رنگ ہے شکلیں بھی اتنی ملتی ہیں کہ بس نمبر ہی سے پہچانے جاتے ہیں —— چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔

کارخانوں میں مزدوروں کا نام و نشان تک نہیں مشینیں خود بخود چل رہی ہیں —— اور جو کام ایسے تھے جن میں مزدوروں کی اشد ضرورت تھی وہ بند کر دیئے گئے ہیں۔

ہر ایک ہندوستانی کے پاس ایک خوبصورت سی کار ہے اور ایک حسین بیوی —— کار کی پچھلی کھڑکی میں چند بکریاں بیٹھی جگالی کر رہی ہیں۔

لوگ جہاں چاہیں، جس وقت چاہیں، جس سے چاہیں —— بلا روک ٹوک "پریم" کر سکتے ہیں اور شادی کر سکتے ہیں۔ قرض لے سکتے ہیں، لڑ جھگڑ سکتے ہیں، سماج کا نام لینے والا جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔

اب ذرا آپ سوچئے اوّل تو یہ سب ہو کس طرح سکتا ہے، اور جو بالفرض یوں ہو بھی جائے تو ایک دم دنگا فساد مچ جائے اور سارا ہندوستان زیر و زبر ہو جائے۔ تو اس قسم کے "بیمارِ سماج" حضرات کا علاج —— وہ ہے کاٹانک مچھلی کا تیل، فروٹ سالٹ، تازہ پھل اور سبزیاں، ورزش اور تبدیلیٔ آب و ہوا ہے۔ بہتر ہوگا اگر ان کے ٹانسل نکلوا دیئے جائیں اور خراب دانت بھی ——!

اِن سے زبردستی ورزش کرائی جائے ورنہیں ہنس مکھ حضرات کی صحبت میں رکھا جائے۔ افاقہ ہونے پر انہیں تاکید کی جائے کہ اپنی صحت برقرار رکھیں مبادا کہیں پھر دورہ پڑ جائے

کیا آپ خود نہیں محسوس کرتے کہ یہ "سماج" کا مذاق بہت پُرانا ہو چکا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سماج (جو کچھ بھی وہ ہے اور جہاں کہیں ہے) —— کی وہ مٹی پلید ہوتی ہے جس کی انتہا نہیں۔ اب مارے شرم کے اس نے اپنی بہت کچھ اصلاح کر لی ہے اب وہ پشیمان ہے، آپ کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے، اُس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو رواں ہیں۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ وہ سچے دل سے معافی کا خواستگار ہے۔ کیا آپ اُسے معاف نہ کر دیں گے؟ —— اُسے ضرور معاف کر دیجئے۔ اور اس کا ثبوت اس صورت میں مل سکتا ہے کہ اب افسانوں میں غریب سماج کو لعنت ملامت نہ کی جائے بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، افسانوں میں خودکشی کی وارداتیں ذرا کم ہو جائیں۔ اور مزدور امیروں کی لڑکیوں سے محبت کرنا چھوڑ دیں اور پریم کے

متوالے اگر پریم کر کے ضرور ہی ثواب لوٹنا چاہیں تو اپنی حیثیت کے مطابق اپنی ہی جات پات میں محبت کیا کریں۔ اور محبت کرنے سے پہلے ذرا کسی اچھے سے آئینے میں اپنا چہرہ بھی بغور ملاحظہ فرما لیا کریں۔

باقی رہے سماج کے ٹھیکیدار ــــ سو جب سماج ہی میں وُہ بات نہ رہے گی تو اُن کی ٹھیکیداری کیا خاک چلے گی، سارا کام ٹھنڈا پڑ جائے گا، خود سیدھے راستے پر آجائیں گے۔

یہ سب کچھ ہو سکتا ہے ــــ للہ آپ سماج کی خطائیں معاف کر دیجئے!

شفیق الرحمٰن

زندگی

(قطریؔ بن الفجاءۃ کی ایک عربی نظم کا ترجمہ)

جب میری روح جنگجو سپاہیوں کے خوف سے کانپ رہی تھی
میں نے اُسے باہمت بننے کے لئے کہا:
اگر تو چاہے کہ موت اپنے مقررہ وقت سے ایک دن کے لئے بھی ٹل جائے
تو یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکے گی
موت کا سامنا کرتے وقت صبر سے کام لے
زندگیٔ جاوداں حاصل کرنا ناممکن ہے
ہمیشہ کی زندگی کا لبادہ عزّت کا لبادہ نہیں
اگر ایسا ہوتا تو یہ ہر حقیر انسان سے چھین لیا جاتا
ہر زندہ انسان کو موت کے راستے سے گزرنا ہے
موت اہلِ دُنیا کو شکار کرنے میں برابر مصروف ہے
جو انسان جوانی میں موت کا مزہ نہیں چکھتا
بڑھاپا اُسے زندگی سے بیزار کر دیتا ہے اور وقت اُسے موت کے حوالے کر دیتا ہے
انسان کے لئے زندگی میں کوئی مزہ نہیں رہ سکتا
اگر اُس کا شمار دنیا کی بے کار چیزوں میں ہو

ذکی الدین

برسات کی صُبح

خوش رنگ وخوش آہنگ وفسوں خیز ہے موسم!!
مستانہ وگلریز وجنوں بیز ہے موسم!!

جلووں میں دل افروز ملاحت کا اثر ہے
کس سانولے محبوب کے مانند سحر ہے؟
بھیگی ہوئی ظلمت جو ہے لہرائی ہوئی سی
ہر چیز نظر آتی ہے سنولائی ہوئی سی
آنکھوں کو لبھاتی ہے بعنوانِ ضیافت
خنکی ہیں سموئی ہوئی شب رنگ ملاحت
ہر سمت ہے چھایا ہوا ساون کا اندھیرا
ہے شام سے ملتا ہُوا نمناک سویرا

خوش رنگ، وخوش آہنگ وفسوں خیز ہے موسم!!
مستانہ وگلریز وجنوں بیز ہے موسم!!

(۲)

خوش رنگ وخوش آہنگ وفسوں خیز ہے موسم!!
مستانہ وگلریز وجنوں بیز ہے موسم!!

آنکھوں کو دکھا دیتے ہیں پریوں کے قرینے
اُڑتے ہوئے بادل کے گہر بار سفینے
سبزے پہ مچلتی ہیں نم آلود ہوائیں
پانی کا خزانہ لئے بوجھل ہیں گھٹائیں
اللہ ری جاں بخش ترشح کی بہاریں
بوندیں، کبھی جھالا ہے، کبھی نرم پھواریں
بوندوں سے ٹپکتی ہے گھٹاؤں کی جوانی
ہر چیز پہ مستی ہے، ہر اک شے ہے سہانی

خوش رنگ وخوش آہنگ وفسوں خیز ہے موسم!!
مستانہ وگلریز وجنوں بیز ہے موسم!!

ذوقی

اے آکاش پہ رہنے والو — دھیمے دھیمے بہنے والو
کاہکشاں میں بسنے والو — مجبوروں پر ہنسنے والو
دُور پار ہے دیس تمہارا — تم سے جھلمل عالم سارا
آپس میں آنکھیں مت مارو — مجھے دُکھی کہکر نہ پکارو
تم کیا ہو؟ یہ کوئی نہ جانے — انجان - جانے پہچانے
پھر بھی میں اور تم سے باتیں — تم سے جگمگ میری راتیں
کتنے ہو! گنتا رہتا ہوں — جی لگتا ہے - سچ کہتا ہوں
شاعر کے جذبے بکھرے ہیں — مطرب کے نغمے نکھرے ہیں
"اُس" کی افشاں چھوٹ پڑی ہے — حور کی مالا ٹوٹ پڑی ہے
چھوٹے تارو اچھے تارو — میرے دل پر تیر نہ مارو
کوئی میٹھا راگ سناؤ — بے کھٹکے بے لاگ سناؤ
ٹوٹے دل کی بات بنالو — کوئی ایسی راہ نکالو

ہاتھ آجائے پریم کنارا
جاگ اُٹھے قسمت کا تارا

شاد عارفی

بمبئی کی ایک رات

یوں تو ہندوستان جنت نشان میں ایسے " جہانیاں جہاں گشت " بھی موجود ہیں جنہوں نے عمر آگرے میں بسر کی اور بھول کر تاج محل نہ دیکھا لیکن جس ہندوستانی کو حقیقتہً سیاحت کا شوق ہے اس نے بمبئی کی زیارت ضرور کی ہوگی - فورٹ کی سربفلک عمارات اپالو بندر کا دل فریب منظر جوہو کی چہل پہل نئی چوپاٹی کی گہما گہمی پرانی چوپاٹی کی رنگینیاں ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ انہیں ایک مرتبہ دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کو دل نہ چاہے۔

میں نے ہندوستان کی اس رومان خیز سرزمین کی سیر پہلی دفعہ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں کی۔ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینے کے بعد ہندوستانیوں میں بھی کچھ احساسِ تفوق سا پیدا ہو جاتا ہے۔ میں بھی اس احساسِ تفوق سے خالی نہ تھا اور تمام درجے پر اس طرح قبضہ کئے ہوئے تھا جیسے کسی دوسرے مسافر کے آنے کا امکان ہی نہ ہو۔ اس طلسمِ تفوق کو بیانہ جنکشن پر ایک کرخت آواز نے پاش پاش کر دیا۔ دروازے کا ہینڈل پکڑے ہوئے ایک فربہ اندام انسان نہایت درشت لہجے میں کہہ رہا تھا " ہٹائیے صاحب اپنا اسباب آپ نے تو پورے درجے پر قبضہ کر رکھا ہے "، اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ایک خاص وقار کے ساتھ ـــ جو موٹے آدمیوں سے مختص ہوتا ہے ـــ انہوں نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اور ان کے دبلے پتلے ساتھی نے جو اس سے قبل ان کی ضخامت و جسامت کی وجہ سے میری نظر سے پنہاں تھے حیرت خیز عجلت کے ساتھ میرا مختصر لیکن بے ترتیبی سے پھیلا ہوا سامان میری برتھ کے نیچے رکھ دیا۔

اپنا سامانِ راحت درست کرنے کے بعد وقت کاٹنے کے لئے یا شاید دلجوئی کی غرض سے انہیں فربہ اندام صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کہاں تک جائیں گے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میں بمبئی جاؤں گا تو یکایک پیکرِ خلوص بن کر ارشاد فرمایا " پھر تو خوب لطف سے گزرے گی میں بھی محمود صاحب کے ساتھ بمبئی چل رہا ہوں "، ان کی اس قلبِ ماہیت کے بعد محمود صاحب کے پانوں اور خود ان کے سگرٹوں نے مجھے بھی اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا اور بمبئی پہنچ کر میں بھی زمان صاحب اور محمود صاحب کے ساتھ گرگام روڈ کے ایک ہوٹل میں مقیم ہو گیا۔

دوسرے دن " جم دیا "، تھا اور سچ پوچھئے تو بمبئی کی دیوالی ہی دیکھنے کے لئے میں نے اکتوبر کا مہینہ اس سفر کے لئے پسند کیا تھا حالانکہ مجھے میرے بعض احباب متنبہ کر چکے تھے کہ اکتوبر میں بمبئی کا موسم نہایت ناگوار ہوتا ہے۔

صبح ہوئی تو زمان صاحب کچھ بے چین سے نظر آئے۔ میں نے وجہِ اضطراب پوچھی تو کہنے لگے " جی کوئی خاص بات تو نہیں ہے مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ آج سیر سپاٹے سے ذرا جلدی واپس آ جائیں تاکہ کھانا وانا کھا کر ایک دو بجے سے شام کی تفریح میں مصروف ہو جائیں "، اور اگرچہ اس وقت میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ شام کی تفریح کے لئے اس مہتم بالشان تیاری کی کیا ضرورت ہے لیکن سہ پہر کو

تارے

اے آکاش پہ رہنے والو — دھیمے دھیمے بہنے والو
کاہکشاں میں بسنے والو — مجبوروں پر ہنسنے والو
دُور پار ہے دیس تمہارا — تم سے جھلمل عالم سارا
آپس میں آنکھیں مت مارو — مجھے دُکھی کہہ کر نہ پکارو
تم کیا ہو؟ یہ کوئی نہ جانے — انجان - جانے پہچانے
پھر بھی ہیں اور تم سے باتیں — تم سے جگمگ میری راتیں
کتنے ہو! گنتا رہتا ہوں — جی لگتا ہے۔ سچ کہتا ہوں
شاعر کے جذبے بکھرے ہیں — مطرب کے نغمے نکھرے ہیں
"اُس" کی افشاں چھوٹ پڑی ہے — حور کی مالا ٹوٹ پڑی ہے
چھوٹے تارو اچھے تارو — میرے دل پر تیر نہ مارو
کوئی میٹھا راگ سناؤ — بے کھٹکے بے لاگ سناؤ
ٹوٹے دل کی بات بنالو — کوئی ایسی راہ نکالو

ہاتھ آجائے پریم کنارا
جاگ اُٹھے قسمت کا تارا

شاد عارفی

بمبئی کی ایک رات

یوں تو ہندوستان جنت نشان میں ایسے "جہانیاں جہاں گشت" بھی موجود ہیں جنہوں نے عمر آگرے میں بسر کی اور بھول کر تاج محل نہ دیکھا لیکن جس ہندوستانی کو حقیقتہً سیاحت کا شوق ہے اس نے بمبئی کی زیارت ضرور کی ہوگی۔ فورٹ کی سربفلک عمارات اپالو بندر کا دل فریب منظر جوہو کی چہل پہل نئی چوپاٹی کی گہما گہمی پرانی چوپاٹی کی رنگینیاں ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ انہیں ایک مرتبہ دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کو دل نہ چاہے۔

میں نے ہندوستان کی اس رومان خیز سرزمین کی سیر پہلی دفعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں کی۔ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینے کے بعد ہندوستانیوں میں بھی کچھ احساسِ تفوق سا پیدا ہو جاتا ہے۔ میں بھی اس احساسِ تفوق سے خالی نہ تھا اور تمام درجے پر اس طرح قبضہ کئے ہوئے تھا جیسے کسی دوسرے مسافر کے آنے کا امکان ہی نہ ہو۔ اس طلسمِ تفوق کو بیانہ جنکشن پر ایک کرخت آواز نے پاش پاش کر دیا۔ دروازے کا ہینڈل پکڑے ہوئے ایک فربہ اندام انسان نہایت درشت لہجے میں کہہ رہا تھا "ہٹائیے صاحب اپنا اسباب آپ نے تو پورے درجے پر قبضہ کر رکھا ہے"، اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ایک خاص وقار کے ساتھ ـــ جو موٹے آدمیوں سے مختص ہوتا ہے ـــ انہوں نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اور ان کے دبلے پتلے ساتھی نے جو اس سے قبل ان کی ضخامت وجسامت کی وجہ سے میری نظر سے پنہاں تھے حیرت خیز عجلت کے ساتھ میرا مختصر لیکن بے ترتیبی سے پھیلا ہوا سامان میری برتھ کے نیچے رکھ دیا۔

اپنا سامانِ راحت درست کرنے کے بعد وقت کاٹنے کے لئے یا شاید دلجوئی کی غرض سے انہیں فربہ اندام صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کہاں تک جائیں گے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میں بمبئی جاؤں گا تو یکایک پیکرِ خلوص بن کر ارشاد فرمایا "پھر تو خوب لطف سے گزرے گی میں بھی محمود صاحب کے ساتھ بمبئی چل رہا ہوں"، ان کی اس قلبِ ماہیت کے بعد محمود صاحب کے پانوں اور خود ان کے سگرٹوں نے مجھے بھی اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا اور بمبئی پہنچ کر میں بھی زمان صاحب اور محمود صاحب کے ساتھ گرگام روڈ کے ایک ہوٹل میں مقیم ہو گیا۔

دوسرے دن "جم دیا"، تھا اور سچ پوچھئے تو بمبئی کی دیوالی ہی دیکھنے کے لئے میں نے اکتوبر کا مہینہ اس سفر کے لئے پسند کیا تھا حالانکہ مجھے میرے بعض احباب متنبہ کر چکے تھے کہ اکتوبر میں بمبئی کا موسم نہایت ناگوار ہوتا ہے۔

صبح ہوئی تو زمان صاحب کچھ بے چین سے نظر آئے۔ میں نے وجہ اضطراب پوچھی تو کہنے لگے "جی کوئی خاص بات تو نہیں ہے مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ آج سیر سپاٹے سے ذرا جلدی واپس آجائیں تاکہ کھانا وانا کھا کر ایک دو بجے سے شام کی تفریح میں مصروف ہو جائیں"، اور اگرچہ اس وقت میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ شام کی تفریح کے لئے اس اہتمام بالشان تیاری کی کیا ضرورت ہے لیکن سہ پہر کو

معلوم ہوگیا کہ زماں صاحب کے تیار ہونے کے لئے واقعی تین چار گھنٹے بھی ناکافی ہیں۔ زماں نے سب سے پہلے اپنی ان نصف تراشیدہ مونچھوں پہ ہاتھ صاف کیا جن پر دور سے سیاہ تتلی کا دھوکا ہوتا تھا پھر ڈاڑھی کی باری آئی اور جب تک میں نے اور محمود نے قسمیں کھا کر یقین نہیں دلا دیا کہ کوئی کھونٹی باقی نہیں رہی زماں نے استرا ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ حجامت اور غسل سے فارغ ہوئے تو قمیص ٹائی رومال اور جراب کے میچ کا سوال پیش ہوا اور جب یہ مرحلہ بھی محمود کی توجہ سے طے ہوگیا تو خدا خدا کر کے زمان صاحب نے نیا سوٹ ملبوسِ بدن فرمایا۔ محمود صاحب کا سنگار مقابلتہً مختصر تھا۔ ان کی تمام نرکاوشیں اس بات کے لئے تھیں کہ ان کی شیر دانی کا کالر کسی طرح ان کی گردن کے داد کو چھپا لے اور جب کالر کو کھینچنے اور اونچا کرنے کے باوجود داد کی بیداد نہ مٹ سکی تو ایک یاس آمیز "اونھ" کے ساتھ بناؤ ختم کر دیا گیا۔ غرض اپنے زعمِ ناقص میں ہم لوگ سامانِ قتلِ عام مہیا کئے ہوئے ساڑھے پانچ بجے ایک وکٹوریا پر سوار ہوگئے۔ غروبِ آفتاب سے قبل تو اس آوارہ گردی کا واحد مقصد خود بینی و خود نمائی تھا لیکن شام ہونے کے بعد خود نمائی کے ساتھ لطفِ نظّارہ نے ایک کیف پیدا کر دیا۔

کافر ادایانِ بمبئی اپنی تمام کافر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھے اور ان کی ہر نظر میں دعوتِ نظّارہ مضمر تھی۔ ہم لوگ ہر جلوے پر نقدِ جاں دینے کو آمادہ تھے لیکن کثرتِ جلوہ سے فرصتِ نظّارہ مفقود سی ہوگئی تھی۔ چرنی روڈ جنکشن پر پہنچے تو یہ احساس پیدا ہوا کہ موٹروں اور گاڑیوں کی لامتناہی قطاروں میں پھنسے رہنے سے بہتر یہ ہوگا کہ وکٹوریا کو خیرباد کہی جائے۔ چنانچہ وکٹوریا والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا اور ہم لوگ خراماں خراماں لطفِ نظّارہ حاصل کرنے لگے۔ اسپتال کے پاس ایک وکٹوریا کے بیٹھنے والوں نے کچھ اس طرح دعوتِ نظّارہ دی کہ چار و ناچار تھوڑی دور تک تعاقب کرنا پڑا۔ وکٹوریا والے نل بازار سے رومال ہلا کر دوسری طرف مڑ گئے اور ہم لوگوں نے اپنی حرماں نصیبی کا انتقام نل بازار کے کٹہرے میں بیٹھنے والوں سے لیا۔ دیوالی یہاں بھی تھی لیکن افلاس کا خونیں رنگ دیوالی کے رنگ و بو پر غالب تھا۔ کبھی کبھی پھولوں کی خوشبو بھی آجاتی تھی لیکن ایڈوفارم کی بدبو اور مکانوں کی عفونت پھولوں کی لطیف خوشبو کو بہت جلد فنا کر دیتی تھی۔ ملّاح قلی اور مزدور لوہے کی سلاخوں کے پاس کھڑے ہوئے رومان انگیزی کی یاس آمیز کوشش کر رہے تھے اور لوہے کی سلاخوں کے اِدھر سے ناز و ادا کرشمہ و غمزہ کا ناکام مظاہرہ بھی کیا جا رہا تھا مگر اس تمام سین میں کچھ ایسا تصنّع سا معلوم ہوتا تھا کہ بے اختیار کسی دل جلے کا قول یاد آجاتا تھا کہ رومان اور آسودگی لازم و ملزوم ہیں! اس یاس آمیز رومان سے اُکتا کر ہم لوگ پاس کے ایک پارک میں چلے گئے۔ بینچ پر ایک نورانی صورت کے بزرگ رونق افروز تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر انہوں نے اپنا بٹوا کھولا، روپے گنے اور چشم و ابرو سے نفرت کا اظہار فرماتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ایک خوش پوشاک نوجوان تشریف لائے اور ہمارے پاس بیٹھ کر باقاعدہ وقفے کے ساتھ ٹھنڈی سانسیں بھرنا شروع کیں۔ جب ہم لوگوں نے خلافِ توقع اس "آہِ سرد و لبِ خشک" کی وجہ نہیں پوچھی تو انہوں نے خود سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔ کہنے لگے آپ لوگ یو۔ پی کے معلوم ہوتے ہیں اور ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر فرمانے لگے "میں بھی یو۔ پی کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام شاہد ہے۔ بمبئی کی سیر کرنے آیا تھا۔ آج دیوالی کے ہجوم میں کسی نے میرا بٹوا غائب کر دیا۔ اب میرے پاس واپسی کے ٹکٹ کے علاوہ ایک پیسہ بھی نہیں ہے جو کھانا کھا سکوں" زمان پر اس داستانِ غم کا خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا

کہ شاہد صاحب نے شاید تکمیلِ داستان کی غرض سے جیب میں سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور کہنے لگے دیکھئے صاحب یہ ہے بمبئی سے واپسی کا ٹکٹ۔ محمود نے ان کے سنبھلنے سے پیشتر وُہ کاغذ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور بجلی کے کھمبے کے پاس جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دادر سے دہلی کا ٹکٹ تھا۔ زمان کی ہمدردی بہت جلد نفرت اور حقارت سے بدل گئی اور شاہد کی اس تاویل کے بعد بھی کہ دہلی سے واپسی کا ٹکٹ کہیں گر گیا زمان انہیں بدمعاش اور دغاباز کہتے رہے۔ شاہد کے جانے کے بعد تعلیم یافتہ دنیا کی غدّاری کا ماتم کرتے ہوئے ہم لوگ بھی اُٹھے تو دفعتہً میری نگاہ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی روشنی میں دیکھا تو بمبئی سے واپسی کا ٹکٹ تھا۔ زمان صاحب کا جذبۂ ہمدردی پھر عود کر آیا اور کہنے لگے کہ محمود کی بدگمانی نے مجھے بھی بدگمان کر دیا تھا ورنہ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ شاہد کسی شریف گھرانے کا فرد ہے۔ چلو بھائی اسے ڈھونڈ کر اس کا ٹکٹ اسے دے دیں۔

شاہد کی تلاش خلافِ توقع آسان ثابت ہوئی۔ پارک سے پچاس قدم کے فاصلے پر وُہ کسی مارواڑی سیٹھ سے باتیں کر رہا تھا۔ ہم لوگوں کو آتا دیکھ کر وُہ کچھ گھبرا سا گیا اور جب زمان نے اسے اشارے سے بلایا تو وہ بہ جبر واکراہ ہمارے پاس آیا اور کچھ کھسیانا ہو کر کہنے لگا "کہئے صاحب کیا حکم ہے،" زمان نے خجالت آمیز انداز سے ٹکٹ واپس کرتے ہوئے کہا "شاہد صاحب میری سخت کلامی کو معاف فرمایئے یہ لیجئے اپنا ٹکٹ اور یہ دس روپے میری بدگمانی کا کفّارہ سمجھ کر قبول کیجئے" شاہد نے ایک معنی خیز تبسّم کے علاوہ رسمی شکریہ بھی غیر ضروری سمجھا اور تیز قدم بڑھاتا ہوا بہت جلد ہماری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ ہم لوگ پارک میں واپس آئے تو وہی نورانی صورت بزرگ جو ہمیں آتا دیکھ کر پارک سے چلے گئے تھے بینچ کے پاس کوئی چیز ڈھونڈ رہے تھے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُن کا بمبئی سے دہلی تک کا واپسی کا ٹکٹ گم ہو گیا تھا!

طالب صفوی

۷ راگست ۱۹۴۱ء

جمعرات کا دن اگست کی ۷ رتاریخ۔ فضائے ہند میں چھائی ہوئی کافوری ٹھنڈک۔

یکایک سکوت ٹوٹا۔ اور قیامت بپا ہو گئی۔

علم نے کہا:۔ میرا تاجدار مجھ سے خفا ہو گیا۔

فلسفی نے کہا:۔ زندگی اور موت کے اسرار کا رازدار ہم سے روٹھ گیا۔

اہل دل یوں گویا ہوئے :۔ وُہ روح کو وجد میں لانے والے گیت سنانے والا ہم سے جُدا ہو گیا۔

سیاست دان چلایا:۔ میرا دستِ راست ٹوٹ گیا۔

مزدور نے آہ کی:۔ میرا ہمدرد بچھڑ گیا۔

غریب پکارا:۔ میرا سہارا ٹوٹ گیا۔

سب مل کر چیخ اُٹھے:۔ آہ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

شفیق احمد رضوی

شعروشاعری

طبعِ موزوں کے لئے کم تو نہیں ہیں یہ سوال،
کیسے اشعار کہوں، اُن کی زمیں کیسی ہو،
کون سی بحر ہے موزوں مرے نغموں کیلئے،
کیسے الفاظ خیالات کے مظہر ہوں گے،—
سوچتا ہوں کہ گراں تو نہیں گزرے گی یہ بحر
"فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن
بیشتر جس میں تخیّل مرا ڈھل جاتا ہے—
چاہتا ہوں کہ بیاں میں ہو لطافت ایسی
کہ اُسے پڑھتے ہی اک کیف سا محسوس کریں
وہ غزلخواں جنہیں اندازِ کہن بھاتا ہے—
رقص کرتے ہوئے الفاظ ہوں جن کے گھیرے
ذہن میں حلقے بناتے ہوئے پرواز کریں—
میری تخئیل میں جادو کا اثر ہو پیدا
میرے انداز میں مہکے ہوئے نغمے ہوں نہاں
جو سماعت میں اُترتے ہی قیامت ڈھائیں۔
چاہتا ہوں کہ تصوّر میں تخیّل کی جھلک
ایک دُنیا نئی تخلیق کرے دُنیا میں—
اِن خیالات کی اُلجھن میں گرفتار ہوں میں
میری خواہش ہے کہ میں راہ کروں ہر دل میں
اور لوگوں کے لئے شاعرِ فنکار بنوں—

(۲)

سوچنا یوں تو بھلا ہے مگر ایسا کیا سوچ
جس سے بیدار نہ ہو جوہرِ ذاتی اپنا—
ہیچ ہے "غیر مقفےٰ و مقفےٰ" کا خیال
مجھ کو کیا اِس سے کہ شعروں میں مرا ذوقِ نظر
ہے وہی جو مجھے ممتاز کرے دُنیا میں۔

کیا مجھے اپنے خیالوں کے ادا کرنے کو
اُسی رفتار سے چلنا ہے کہ جس سے اب تک
دھیرے دھیرے مرے ہم عصر چلے جاتے ہیں؟ —
کیا مجھے شہرت و عزت کے لئے جینا ہے؟
داخلِ فرض ترنم بھی ہے شاعر کے لئے؟ —
گرد آلودہ جبیں اور گریباں صد چاک
شاعری کے لئے کیا یہ بھی ضروری ہوگا —
اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں؟ —
یہ نہیں ہوگا — نہیں ہوگا — نہیں ہو سکتا!
میں مداری تو نہیں ہوں کہ پٹاری لے کر،
کھیل دکھلاتا پھروں شعبدہ بازوں کی طرح،
میں تو خود اپنا پیمبر ہوں کہ میرے نغمے
میرے احساس کی تصویر ہوا کرتے ہیں،
میرے شعلے تو مری روح کی آوازیں ہیں —
کتنی کم ظرفیٔ فطرت ہے مرا سوچ، کہ میں
اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں —
فاعلاتن، فعلاتن، سے غرض کیا مجھ کو،
قافیہ کیا، میری تخئیل کو کوئی طاقت
پابجولاں نہیں کر سکتی غلاموں کی طرح
کون کہتا ہے کہ اشعار ہیں میرے الفاظ
یہ تو اک خام خیالی ہے جہاں والوں کی —
میں تو جو سنتا ہوں نظروں سے تری کہتا ہوں
یہ الگ بات ہے مفعول، فعولن، فعلن
یا فعولن، فعلاتن میں بیاں ہو جائے۔

یوسف ظفر

یہ حسرت تھی —

کبھی موجوں سے ٹکراتا کبھی لہروں پہ لہراتا
تلاطم خیز گردابوں کا سینہ روندتا ہوتا

نسیمِ صبح بن کر شوخیاں کرتا گلستاں میں
گلوں کو گدگداتا کونپلوں کو چھیڑتا ہوتا

گھروں میں یاس کی کرتا امیدوں کا کنول روشن
کسی بیمارِ غم کا مونسِ شامِ بلا ہوتا

اک ایسی بانسری ہوتا کہ جس کے کیفِ نغمہ سے
جھپکتی آنکھ تاروں کی زمانہ سو گیا ہوتا

قلوبِ سخت کی سنگین دیواروں سے ٹکراتا
سکوتِ شب میں اک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہوتا

ڈبو کر کشتیٔ سرمایہ داری قعرِ دریا میں
میں مغروروں کی حسرت کا تماشا دیکھتا ہوتا

غریبوں کے محلے میں چراغِ رہ گذر بن کر
(ق) اندھیرے جھونپڑوں کو بھیک اپنی دے رہا ہوتا

چراغِ رہ گذارِ بیکسی جس کے اُجالے میں
کسی مزدور فاقہ کش کا بچہ کھیلتا ہوتا

بہشتِ قیصر و فغفور کے سنسان کھنڈروں میں
بغاوت اور تباہی کا ترانہ گا رہا ہوتا

پتنگوں کو حرارت شمع کو سوزش عطا کر کے
اگر جلنا ہی تھا دل کو تو اک آتشکدہ ہوتا

مگر افسوس فطرت نے اسے شاعر بنا ڈالا
نہیں تو اشکؔ اپنی آرزوؤں کا خدا ہوتا

احسن احمد اشکؔ ۔ کلکتہ

ہم دُعا کیوں مانگتے ہیں؟

دعا ایک التجا یا خواہش کا نام ہے جس کا اظہار کوئی بندہ اپنے معبُود سے کرے۔ ہماری زندگی میں باوجود ہماری ہٹ دھرمیوں اور خود پسندیوں کے قدم قدم پر ایسے مواقع آتے ہیں کہ ہماری پیش نہیں جاتی اور خُدا کی امداد کے بغیر ہمارا کام کسی صورت چلتا ہی نظر نہیں آتا۔ بعض سیدھے سچے لوگ تو بغیر دعا درود کے لقمہ بھی نہیں توڑتے۔ لیکن آپ کو حیرت ہوگی یہ سنکر کہ اس بے ضرر مسئلہ میں بھی دوسرے مسئلوں کی طرح کانی کھینچا تانی اور کانی آنا کانی ہے اور بہت سی اُلجھن کی باتیں نکل آئی ہیں۔ وہ لوگ جو مادّہ پر جان چھڑکتے ہیں اور روحانیت وغیرہ کو نہیں مانتے اور وہ جو مذہب کو اب ڈھونگ سمجھتے ہیں وہ تو سرے سے کسی خدا یا ذاتِ یکتا کے قائل ہی نہیں۔ ان کے نزدیک دعا کرنا یا دراصل کسی خُدا یا بڑے کرتار یا داتار سے امداد طلب کرنا یقیناً شخصیتِ انسانی کو بےجان دبے پر بنا دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک سائل یا منگتے کی حیثیت اس کی کم مائیگی اور بے حوصلگی کی دلیل ہے۔ خواہ سائل کسی نوع کا ہو اور صاحبِ کرم کسی مرتبہ و مقدرت کا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہماری زندگی کا نصب العینِ حقیقی تو پن چکی کی طرح چلنا، چلنا، مدام چلنا، ٹھہرا ہے یعنی سعئ پیہم اور جہدِ مسلسل۔ نتیجے خود مرتب ہوتے چلے جائیں گے اور فطرت اور قوانینِ فطرت اپنا کام کریں گے۔ تو پھر اس نصب العینِ حقیقی کو حاصل کر لینے کے بعد لازمی نتائج کو کسی اَن دیکھی ذات کے رحم و کرم پر اُٹھا رکھنا اور اس کے لئے گڑگڑا گڑگڑا کر فضول بھیک سی مانگنا اور بیکار سہارے ڈھونڈنا انتہائی سیدھ پن اور ڈھکوسلا ہی تو ہوا۔

اس قسم کی دلیلوں کی روشنی میں تو یہی معلوم ہوگا کہ دعا مانگنے کی خواہش ایک اچھے خاصے خود مختار انسان کی کمر توڑ دیتی ہے اور اس کی قوتِ ارادی کو تننے سے پہلے بگڑنا سکھا دیتی ہے۔ لیکن اگر ذرا فکر کو وسعت دی جائے اور دعا کے صحیح نفسیاتی اور اخلاقی پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہوجائے گی کہ دعا کو فی الواقع غلط معنی نہ پہنائے جائیں تو اس کے مانگنے سے نہ تو قوائے انسانی پہ فالج کا اثر ہوتا ہے اور نہ انسانی اختیار و عظمت کو بٹہ لگتا ہے۔

دُعا تو جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا ایک التجا یا خواہش کے اظہار کا نام ہے اور اس کا مذہبی معتقدات سے گہرا تعلق ہے۔ اس لئے کہ کسی پکار کے سُننے والے کے بغیر کیا پُکار؟ کہاں کی التجا اور کیسی دُہائی؟ مگر اس سلسلہ میں ایک سیدھی سی بات یہ بھی ہے کہ ہر مخلوق کے لئے خالق کا ہونا، ہر چیز کے لئے ایک بنانے والے کا ہونا اور ہر کوزہ کے لئے کسی کوزہ گر کا ہونا اسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ اثرات کے لئے اسباب و علل کا یعنی آخر دُنیا کی اس بھری سبھا کا کوئی سبھاپتی اور اس نوچندی کا کوئی چاند بھی تو ہونا چاہئے! اس جلوہ گاہِ ناز کے لئے کوئی شاہدِ رعنا بھی تو ہو۔ خواہ اُسے کسی نام سے پکاریں، رام کہیں یا رحیم یا خالق باری سرجن ہار، کچھ ہی نام دھرلیں۔ مدعا یہ ہے کہ صانعِ مطلق کی

حقیقت سے انکار کرنا ایسا پہلے درجہ کا بُخلِ باطنی اور کذبِ عظیم ہے کہ بس اولادِ آدم ہی کو سزاوار ہے۔ ورنہ واقعہ تو یہی ہے کہ اگر ہم خدا یا حقیقت المطلق کا وجود ہی نہ مانیں گے اور اس ذات کو مکمل و اکمل ہی قرار نہ دیں گے تو توانائی انسانی اور شخصیتِ انفرادی ہی محتاجِ تشریح رہ جاتی ہے اور یہ تمام نظام سچ مچ دیوانے کا سپنا بن کر رہ جاتا ہے جسے نہ کوئی سمجھے نہ سمجھا سکے۔ شاید روسو نے اسی لئے تو کہا ہے کہ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے انہیں بھی ضرورۃً کسی نہ کسی چیز کو اپنا خُدا تو قرار دینا ہی پڑے گا جس سے اس نظامِ کائنات کی آفرینش کو منسوب کیا جا سکے۔ ہمارے یہاں مرزا غالب نے کیسے سہل انداز میں اس مشکل مسئلہ کو حل کر کے رکھ دیا ہے، ملاحظہ ہو:-

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود پھر یہ ہنگامہ اے خُدا کیا ہے؟!

خیر یہ قصہ تو بڑا بیڈھب اور یہ بحث بڑی پُرانی ہے اور شاید رہتی دُنیا تک رہے گی بلکہ جوں جوں انسان کے پر پرزے نکلتے جائیں گے خُدا کی خُدائی پر یہ غلّہ بازی اور زیادہ شعور اور زور شور کے ساتھ کی جائے گی۔ میرا مقصد یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ ہماری التجاؤں اور دعاؤں کے سننے والے خدا کا وجود جس کی ذات کو ہم غیر محدود مانتے ہیں بھلا کس طرح ہمیں معذور و ضعیف بنا سکتا ہے؟۔ ایک لا محدود سے لا محدود، ممکن سے واجب، غیر متعین سے متعین بلا شبہ بہت کچھ پا سکتا ہے بلکہ یہی بات آخر الذکر کے لئے باعثِ بہجت و افزائش ہے کیونکہ ہمیشہ رہنے والی اُمیدوں کا سوت وہی ہُوا۔ فلسفۂ زندگی کے لئے بھی یہ شرطِ اوّل ہے کہ وُہ انسانی ترقی کا ضامن و معاون ہو ورنہ ظاہر ہے کہ نطشہ کا فوق البشر (Superman) بھی معراجِ ارتقا اور منازلِ ارتفاع سے محروم ہی رہ جائے گا۔ پس ایسے خدا سے جسے ہم اپنے آپ سے ہر طرح بڑا، زیادہ طاقتور اور جگ داتا مان رہے ہوں کسی امداد و کرم کی التجا کرنے میں ہماری بات نیچی ہوتی ہے کہ اونچی ہو جاتی ہے اور ہمارا دم خم گھٹتا ہے کہ بڑھ جاتا ہے؟

دُعا کی اہمیت آپ کی سمجھ میں آجائے گی اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ انسانی قوائے عملی کی فاعلیت دو صورتیں اختیار کرتی ہے، ایک کو جہدِ ظاہری کہہ لیجئے اور دوسری کو جہدِ باطنی۔ جب جہدِ ظاہری پورا پورا ظاہر ہو چکا ہوتا ہے اور ہماری ظاہری دوڑ دھوپ کی سب ممکن بازیاں لگ چکتی ہیں تو پھر جہدِ باطنی کی باری آتی ہے۔ مثلاً ایک کسان اپنا خون پسینہ ایک کر کے اور اپنی ہڈیاں پیل کر اپنی کھیتی جب بو جوت چکتا ہے تو پھر اس کے مَن میں اُمید کی موجیں اُٹھنا شروع ہوتی ہیں اور وہ اپنے رب سے، جس کے قبضہ میں اس کے اعتقاد کے نزدیک اور با اسبابِ ظاہر تمام آفاتِ ارضی و سماوی ہیں اور جو چاہے تو بادِ سموم کے ایک جھونکے میں ہری بالیوں کو جُھلسا کر رکھدے، لَو لگاتا ہے۔ اسی لَو لگانے کو میں نے جہدِ باطنی کہا ہے۔ اس کے ذیل میں جمعیتِ قلب، شکر و یقینِ محکم ایک جذبۂ بے اختیار بن کر دل کی گہرائیوں سے اُٹھتے ہیں اور اُمیدِ حاصل کی لہریں اس جہدِ خاموش کو ایک ہیجانی کیفیت میں بدل دیتی ہیں۔ اس کیفیتِ ہیجان و اضطراب کے اثر سے ظاہری اعضاء بھی نہیں بچتے۔ اُس وقت کبھی جہدِ ظاہری کی کوتاہیاں یاد آ آ کر دل پر سانپ سا لوٹنے لگتا ہے کہ ہائے فلاں بات کرنی

رہ گئی، ہائے یوں کرتے تو یوں ہوتا، اور کبھی مستقبل کی تابناک تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے تو چہرے پر مسرت کھیلنے لگتی ہے۔ غرض اسی کشمکشِ سکون و اضطراب کے ماتحت لب بے اختیار جنبش میں آجاتے ہیں آنکھیں اُٹھ اُٹھ کر اُسی اپنے من مانے خدا کی رحمتِ کاملہ سے التجائے خموش کرنا شروع کرتی ہیں اور پھر ہاتھ جو ہمارے جسم میں سب سے زیادہ چُلبلے واقع ہوئے ہیں بےساختہ اُٹھ جاتے ہیں کہ رحم کی بھیک اُس داتا سے اگر ہو سکے تو مجازی طور پر بڑھ کر لے لیں، وہ بھیک نہیں بلکہ انعام جس کے ملنے کا یقین ہی تمام جہدِ عملی کی تاویل تھی اور اپنا ایمان۔ اسی جہدِ باطنی، اسی کشاکشِ دروں اور تمنائے دلی کا اظہار جس نہج پر ہو جائے اُسے ہی ہم دراصل دعا کہتے ہیں۔

تو آپ سمجھ لیجئے کہ یہ جو ہم لوگ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اور گود پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگا کرتے ہیں یہ اُسی کیفیت میں گُم ہو جانے کی ایک وجدانی شکل ہے جو اب محض رسم بن کر رہ گئی ہے ورنہ آسمان سے کوئی من و سلویٰ تھوڑا ہی برستا ہے کہ ہم ہاتھ نہ پھیلائیں تو اُسے لپک ہی نہ پائیں! اس نقطۂ نظر سے یہ شیوۂ دعا ایک شعورِ ایمان اور تہذیبِ نفس ہے کہ اس سے تسلیم و رضا کی بو آتی ہے اور خو بڑھتی ہے۔ اسی چیز کو پھل آشا بھی کہتے ہیں

لیکن یہاں آکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دُعا کا نظریہ صحیح بھی ہی، لیکن کیا درحقیقت محض دعا سے مقدر کا لکھا مٹ سکتا ہے یا آنے والی بلائیں ٹل جاتی ہیں؟ اس کے جواب ہی میں اِس عقدہ کو حل چھپا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کو زمین کی بادشاہت اور خدا کی خلافت ضرور بخشی گئی ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ یہ حضرت اس خلافت کی گدّی کو سنبھالے جھوٹے توکّل پر تکیہ کئے تقدیر پر شاکر بیٹھے رہیں، نہ کچھ کریں نہ دھریں۔ بجز اس کے کہ آسمان کو تکا کریں اور ضربیں لگایا کریں کہ "یا اللہ بھیج چھپّن کروڑ کی چوتھائی" نہیں ہرگز نہیں۔ اس کی زندگی کا مدار اس کے عمل پیہم ہے نہ کہ بے عملی پر۔ قنوط و نومیدی جینے کی شرط نہیں۔ مثال کے طور پر قرآن شریف ہی میں مسلم کی زبان سے دین دنیا کی سرخروئی کے لیے بارہا دعائیں بلند کرائی گئی ہیں اور خدا کو دعاؤں کا سننے والا کہا گیا ہے لیکن صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ تمہاری کمائی کا حصہ تمہاری مساعی پر ملے گا۔ کسی کی محنت رائگاں نہیں جاتی' اس مقولہ میں سچائی ہی سچائی بھری ہے۔ من چنگا اور کٹھوتی میں گنگا والی بات بھی بس یہی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں

پس دُعا اک شعارِ ایمانیہ ہے اور جو دعائیں بغیر کوشش اور عمل کے مانگی جاتی ہیں وہ اس کسوٹی پر پوری ہی نہیں اُترتیں ورنہ تمام فلسفۂ حیات ہی غارت ہو جائے اور دُنیا میں عمل کے نام تو بس مکھیاں ہی بھنکا کریں، انسان دعا کے بھروسے پر ایک جیتی جاگتی مٹی کی مورت بن کر رہ جائے جس میں نہ حرکت رہے نہ احساس، نہ خودی نہ خودداری۔ کوشش کے بغیر انجام کی دعا کرنا یا تمنا رکھنا ایسا ہی ہے جیسے بغیر دوا کے صحت کی آس لگانا، بیج ڈالے بغیر پھل کھانے کی جستجو کرنا۔ اگر توفیقِ خداوندی اتنے سستے داموں نصیب ہو جایا کرتی تو پھر تو سارے کام خدا ہی بنے پڑا کرتے اور انسان تو کام چور نوالہ حاضر اَلغتہ بن کر رہ جاتا۔ علّامہ اقبال نے اس نکتہ کو یوں واضح کیا ہے ؎

مسلم از دُنیا سوئے حق رم کند   از دُعا تدبیر را محکم کُند

یعنی دُعا تو تدبیر کو تیز تر بنا دیتی ہے، جیسے تلوار پر صیقل۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تدبیر تو نہ ہو اور محض دعاؤں کے گنڈے پر بیٹھے رہیں، گویا تلوار تو غائب اور آلاتِ صیقل ہی سے کاٹ کا کام لینے کی سعی کی جائے!

اسی غلط نظریہ کا نتیجہ ہے کہ لوگوں نے دعاؤں کو عجیب قسم کا افسوں اور اَنچھر سمجھ رکھا ہے جس کے ذریعے سے غیب کے خزانے لوٹ لائیں۔ دُنیا کی خاصی آبادی اور بالخصوص ایشیائی ممالک کا بڑا حصّہ اب بھی اسی دھوکے فریب کا شکار ہے اور یہ فنِ سوداگری آج کل ہمارے ملک میں تو بہت ہی فروغ پر ہے۔ یہ بھلے مانس نہیں سوچتے کہ محض خالی پھیکی دعاؤں سے تقدیریں نہیں بدلتیں بلکہ تقدیر کی کاٹ تو صرف تدبیر ہی کر سکتی ہے۔ دُور کیوں جائیے؟ اسی جنگ کو دیکھ لیجئے۔ اگر غنیم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو عملی ناکہ بندی سے روکنے کے بجائے انگریز صرف آرچ بشپ آف کنٹربری سے کہہ دیں کہ جناب ذرا اپنا سر کھول کر خُدا سے یہ دُعا فرما دیجئے کہ ابنِ مریمؑ کے صدقے میں دُشمن کی توپوں میں کیڑے پڑ جائیں اور اُس کو ڈھائی گھڑی کا ہیضہ ہو جائے تو کیا آپ کے نزدیک یہ منتر کافی ہوگا؟ نہیں اور قیامت تک نہیں۔ یہاں تو جو مارے سو میری کا مضمون ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ہندوستانیوں نے تو اس نکتہ کو بالکل نہیں سمجھا اور دعاؤں کو بُری طرح زمانہ سازی اور ریاکاری کا آلہ بنا رکھا ہے۔ ملک میں ایک بڑا گروہ اس ڈھب کے لوگوں کا ہے جن کا کام دعاؤں کے جھانسے دینا اور خُدا کے نام پر ضعیف الاعتقاد غرباء کی جیبوں پر ڈاکا ڈالنا ہے۔ ان نیم مذہبی ڈکیتیوں کے اڈّے ہر شہر میں اور ہر قریہ میں موجود ہیں اور کھُلے بندوں زبانی اور تحریری دونوں طریق پر خُدا سے معاملے طے کرائے جاتے ہیں۔ کیسی ہی کٹھن گتھی کیوں نہ پڑ جائے یہ اپنی دعا کے زور سے اُسے چٹکی بجاتے میں کھول کر دھر دیں گے بشرطیکہ آپ اِس کرامات کا مناسب ہدیہ پیش فرما دیں۔ جس طرح دنیا میں ضروریات کے اعتبار سے اور بہت سے آنا دپیشے ہیں، مثلاً وکیل مقدمے لڑاتے اور انسانوں میں سر پھٹول کراتے ہیں، حکیم ڈاکٹر بیماروں کو اچھا اور اچھوں کو بیمار کرتے ہیں، بھٹیارے روٹیاں تھوپتے اور ساقی لکھنؤ اور دلّی والوں کو شراب کی بجائے حُقّے پلاتے پھرتے ہیں، بالکل اسی طرح اس قبیل کے لوگوں کو بھی سمجھئے کہ خدائی ٹنڈیل ہیں جنہوں نے دربارِ الٰہی میں دُنیا بھر کی طرف سے صفائی و ترجمانی کا کام اپنے سر لے لیا ہے۔ ان کی زبان گویا تاثیر کی بجلی ہے کہ ذرا ہلی اور تیر نشانۂ اجابت پر جا لگا!

یہ گروہ چشم بد دُور ہمارے نام نہاد پیروں فقیروں، قلندروں مچھندروں، مجاوروں، مہنتوں اور سائیں باباؤں کا ہے جن کی ساری کائنات لمبی لمبی تسبیحیں اور مالائیں اور نقشِ سلیمانی و علاج الغرباء جیسی دو چار کتابیں ہیں اور کچھ اُلٹے سیدھے ٹوٹکے ٹونے، اشلوک منتر، جھاڑ پھونک جنہیں وہ 'دُعا' اور 'آشیرباد' کے نام دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن بزرگوں نے دعا کو گھیرے کا پنیترا بنا رکھا ہے جس کے ذریعے سے یہ براہِ راست خُدا کو گھیر لیتے ہیں یا شاید یوں ہوگا کہ یہ پیشہ ور دعاگو قسم کے لوگ' ان نالائق بیرسٹروں کی طرح جو مجسٹریٹوں سے اپنی ذاتی دوستی کی ڈینگیں مار مار کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے پھرتے ہیں، اللہ میاں کے ایجنٹ ہوں گے جو اس کی رحمت اور حمایت کا رعایتی قیمت پر پروپیگنڈا کرنے کے لئے چھوٹے ہوئے ہیں، جنہیں نہ قومی لیڈر روکیں، نہ پنچایتیں ٹوکیں، نہ انجمنوں اور کمیٹیوں والے للکاریں۔

اب وقت ہے کہ اس لغویت کا سدِباب کیا جائے اور بندوں کو اُن کے خدا پر اور خدا کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے!

فضل احمد صدیقی

(حسبِ اجازت نشرگاہِ بمبئی)

سراب

نہ مُسکرا مری صورت سے گرعیاں ہے ملال
نہیں شکست کا احساس گو حزیں ہوں میں
نہ دید کا مجھے ارماں نہ آرزوئے وصال
غمِ فراق میں کھویا ہوا نہیں ہوں میں

مرا سکون، مرا چین چھن گیا مجھ سے
تھا تیرے جذبۂ بے لوث میں اثر اتنا
اسی جنوں میں گزرتی تمام عمر مری
نہ ہوتا گر تری فطرت میں بے وفا ہونا

نہ گو سماتا کبھی میرے دل میں تیرا خیال
مگر کیا تھا مجھے تو نے پیار یوں جیسے
کوئی تھکا ہوا درماندہ بے خبر راہی
ہجومِ یاس میں منزل کے پاس جا پہنچے

زبوں نہیں ہوں اگر تو نے پھیریں نظریں
ترے بغیر بھی قائم تھی زندگی میری
جہاں میں اور بھی دُکھ درد سہہ رہا تھا میں
پیامِ موت نہیں مجھ کو بے رُخی تیری

معاً اُٹھائی تھیں جب تو نے سُرمگیں پلکیں
تری نگاہوں میں پاکیزگی تھی سربسجود
ترے لبوں پہ لرزتے تھے ناتمام الفاظ
خلوصِ جذبِ محبّت کی تھی جبیں پہ نمود

ملول ہوں کہ وُہ معصوم پیار کا پرتو
جہانِ خاک سے جس کو نہ ہو کوئی نسبت
طلسمِ خواب کی مانند ٹوٹ کر رہ جائے
ہو اک سراب حقیقت میں جذبۂ الفت

خود اپنے دل سے مجھے اب نہیں کوئی اُمید
جو زخم تو نے دیا ہے نہ بھر سکوں گا میں
کسی کے حُسن پہ شاید کبھی نظر اُٹھے
مگر کسی سے محبت نہ کر سکوں گا میں

مسعود پرویز

غالبؔ کا ایک خط

حضرت ارسطو جاہ بہادر مرحوم کے نام غالبؔ نے بہت سے خطوط لکھے ہیں جن میں سے اکثر شائع ہو چکے ہیں۔ ایک خط جو سر سیّد مرحوم کی مشہور تصنیف آثار الصنادید بھیجنے کے وقت لکھا تھا مجھے آثار کے اوراق سے اُس وقت ملا تھا جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ بہت احتیاط سے میرے پاس رکھا ہُوا تھا۔ جب میرے محترم دوست چودھری غلام رسول مہر کی مشہور کتاب "غالب" کا اشتہار نکلا تو اُس کا عکس میں نے اُن کی خدمت میں بھیج دیا۔ چنانچہ وُہ اُن کی کتاب میں شائع کیا گیا۔ وہ خط نامطبوعہ تھا اور پہلی مرتبہ "غالب" میں شائع ہُوا۔ غالباً جب فارسی اور اُردو کے رقعات غالبؔ کی زندگی میں چھپے تھے اس وقت بعض خطوط کی نقلیں نہیں بھیجی گئیں۔ اگرچہ ایک خط سے جو مجھے ارسطو جاہ بہادر مرحوم کے پُرانے مسودات سے ملا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اردوئے مُعلّیٰ کی طبع کے وقت اُردو خطوط خود غالبؔ کے ایما پر بغرض طباعت حضرت ارسطو جاہ بہادر مرحوم سے طلب کئے گئے تھے چنانچہ میر فخر الدین مہتمم اکمل الاخبار دہلی نے ۱۷ رجون ۱۸۶۸ء کو حضرت ارسطو جاہ بہادر مرحوم کے نام ایک خط لکھا تھا۔ جس میں وہ لکھتے ہیں۔ بندہ نے بہ ایمائے جناب مرزا صاحب قبلہ مرزا نوشتہ صاحب غالبؔ رقعۂ اُردو جناب ممدوح کے اطراف و جوانب سے منگائے ہیں۔ چنانچہ بہت سے جمع ہوگئے ہیں۔ اور عنقریب اُن کے طبع کرنے کا ارادہ ہے۔ آج بزبانی مشفقی و مکرمی جناب منشی رائے جواہر سنگھ صاحب دریافت ہُوا کہ حضرت کے پاس بھی بہت رقعۂ اُردو جناب ممدوح کے جمع ہیں۔ لہٰذا گذارش ہے کہ براہِ عنایت و کرم جس قدر رقعے آپ کے پاس موجود ہوں بندہ کے پاس ارسال فرمایئے تا اس میں شمول کئے جائیں۔ اور بروقت چھپنے کے ایک جلد آپ کے پاس بھی پہنچے گی اور صحت کا التزام جناب مرزا نوشتہ صاحب کے ذمہ ہے اور نام اُردوئے معلیٰ رکھا گیا ہے۔ غرضکہ آپ جلد تر براہِ بندہ نوازی رقعے مرزا صاحب کے عنایت فرمایئے اور بعد نقل کے رقعے خدمتِ عالی میں واپس بھیجے جائیں گے۔

یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ نقل ہونے کے بعد واپس بھیجے گئے یا نہیں۔

ماہ جون ۱۹۴۰ء میں میں رخصت پر گھر گیا تھا وہاں پُرانے خطوط پڑھتا رہا۔ اتفاق سے سب سے پہلا خط جو بطور تعارف کے لکھا گیا ہے مجھے مل گیا۔ اُس کا عکس اِس مہینے "ہمایوں" کے صفحۂ آئندہ پر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی غالبؔ کے اندازِ تحریر کا بہترین نمونہ ہے۔ چونکہ فارسی خطوط سے شاعر کے ماحول پر کافی روشنی پڑتی ہے اِس لئے میں نے گوارا نہ کیا کہ ہمارے سب سے بڑے شاعر کے مدّاح اس تحریر سے محروم رہیں۔

سیّد آغا حسین

غالب کے خط کا عکس

مرسلۂ سید آغا حسین

جنگِ مغلوبہ

سنہ ۱۹۳۹، ۴۰، ۴۱ء کی جنگِ یورپ پر ایک بے لاگ منظوم تبصرہ

ابتلا خیز جنگ برپا ہے — محشر انگیز جنگ برپا ہے
تیز سے تیز جنگ برپا ہے — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جتنے باہر سے تار آتے ہیں — جنگ کی اطلاع لاتے ہیں
ریڈیو گھر میں غل مچاتے ہیں — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

برّی و بحری و ہوائی جنگ — ابتدا سے ہے انتہائی جنگ
جنگ بھی اور کیمیائی جنگ — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جس طرف رُخ سیاہ کرتی ہے — حملۂ بے پناہ کرتی ہے
امنِ عالم تباہ کرتی ہے — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

بحرِ خشکی سے ہٹ چکے ہیں تمام — اپنے ساحل سے کٹ چکے ہیں تمام
کہ سُرنگوں سے پٹ چکے ہیں تمام — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ہر دو بحریہ ہائے چابک و تیز — عرصۂ بحر میں ہیں گرم ستیز
صد بلا ریز و صد تباہی خیز — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

آبدوزیں ہیں اور تبہ کاری — تارپیڈو ہیں اور بلا باری
ہائے! خلق خدا کی ناچاری — سخت خوں زیز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

روز غرقاب ہو رہے ہیں جہاز　　روز نایاب ہو رہے ہیں جہاز
قصۂ خواب ہو رہے ہیں جہاز　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذر لنگ برپا ہے

ناکہ بندی کے دام چار طرف　　قحط اور موت عام چار طرف
صبحِ ہستی کی شام چار طرف　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

روز طیّارے لائے جاتے ہیں　　روز لشکر بڑھائے جاتے ہیں
قہر پر قہر ڈھائے جاتے ہیں　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جب ہوائی جہاز آتے ہیں　　آتش افروز بم گراتے ہیں
خاک کے ڈھیر چھوڑ جاتے ہیں　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

سیکڑوں اسلحہ ہیں آتش بار　　لاکھوں آلات اُگل رہے ہیں شرار
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جس طرف جاؤ اُٹھ رہا ہے دُھواں　　سقف و دیوار و در ہیں شعلہ فشاں
آتشیں غُسل کر رہا ہے جہاں　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

اِن خطرناک یورشوں کے سوا　　حملہ آور ہے ایک اور بلا
یعنی فتنہ پروپیگنڈے کا　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

اِس وغا میں ہے یہ بلا بھی شریک　　یہ وبال اور یہ وبا بھی شریک
یہ بھی اور اس کا ارتقا بھی شریک　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صدر عذرِ لنگ برپا ہے

کوششِ نشرِ مدح و ذم بھی شریک　　ناشر و کاتب و قلم بھی شریک

اور بدقسمتی سے ہم بھی شریک — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ضربہ ہائے زباں بھی شامل ہیں — حملہ ہائے بیاں بھی شامل ہیں
یاں بھی شامل ہیں، واں بھی شامل ہیں — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

دم بھی، دھوکا بھی، افترا بھی ہے — جھوٹ بھی، مکر بھی، دغا بھی ہے
اور پھر سچ کا ادّعا بھی ہے — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

سب و شتم باہم دگر بھی ہے — طعن و تشنیعِ تلخ تر بھی ہے
کوششِ از دیادِ شر بھی ہے — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ریڈیو، ٹیلی فون، تار، اخبار — بن چکے ہیں وغا کے آلۂ کار
جنگ کا بھوت ہے سروں پہ سوار — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جنگ زا ذکر، جنگ زا تقریر — جنگ زا فکر، جنگ زا تحریر
بارک اللہ! جنگ کی تقدیر — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صدر عذرِ لنگ برپا ہے

مغربی بادشاہیوں کا جہاں — توبہ تو حرص زائیوں کا جہاں
بن چکا ہے لڑائیوں کا جہاں — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صدر عذرِ لنگ برپا ہے

نئے اقدام ہیں نئی پیکار — نئے آلات ہیں نئے ہتیار
بحر و بر ہیں نئی بلا سے دوچار — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

قوم پر قوم کھا رہی ہے مات — ملک کے ملک کھو رہے ہیں ثبات
سخت نازک ہے صورتِ حالات — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے

اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جرمنی کے بڑے سہی دم خم
جان بل بھی نہیں کچھ اُس سے کم
جو وُہ سہراب ہے تو یہ رُستم
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے

اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

اِس طرف چرچل، اُس طرف ہٹلر
دونوں خود دار، خود نگر، خود سر
ایک سے ایک ضد میں بڑھ چڑھ کر
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے

اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

دونوں صاحب عساکرِ جرّار
دونوں احقاقِ حق کے دعویٰ دار
دونوں اک دوسرے کے دشمنِ کار
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے

اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

چارسو عالمِ تباہی ہے
قتل و غارت کی بادشاہی ہے
کیا نرالی جہاں پناہی ہے
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے

اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

اِک طرف حکمِ عامِ بربادی
اک طرف اذنِ تامِ بربادی
ہر طرف اہتمامِ بربادی
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے

اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ہر طرف قتلِ عام جاری ہے
ہر طرف نہب تام جاری ہے
اور بہ صد انتظام جاری ہے
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے

اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

نوعِ انساں ہے اور تباہی ہے
ظلمِ دوراں ہے اور تباہی ہے
امنِ گیہاں ہے اور تباہی ہے
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے

اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

روز دو دو کروڑ سکۂ زر
مفت برباد ہو رہا ہے مگر
پھر بھی اِس بے پناہ نقصاں پر
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے

اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جنگ وحشت میں بڑھتی جاتی ہے زور و شدّت میں بڑھتی جاتی ہے
اور وسعت میں بڑھتی جاتی ہے سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

کیا خبر، اب یہ کس طرف کو جھکے کیا خبر، اب کہاں یہ جاکے رُکے
کیا خبر، کیونکر اب یہ قصّہ چکے سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

صلح کی کیا اُمید بر آئے صلح کی کیا کوئی خبر آئے
کوئی دنیا بھی تو نظر آئے سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

سعیٔ صلحِ بہم غلط ہے ہنوز اِس طرف ہر قدم غلط ہے ہنوز
لا صحیح اور نعم غلط ہے ہنوز سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

گو فریقین مردِ میداں ہیں گو حریفین فردِ گیہاں ہیں
سخت ترساں ہیں سخت لرزاں ہیں سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

کیا پتا، کس کی صف اُلٹ جائے کیا پتا، کس کا نام کٹ جائے
کون رہ جائے، کون چھٹ جائے سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ہند والو! کچھ اب تو ہوش میں آؤ فرصتوں کو نفاق میں نہ گنواؤ
وقت ہے وقت، متحد ہو جاؤ سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

وقتِ فرصت کو مغتنم سمجھو خدمتِ ملک کو اہم سمجھو
ورنہ اپنے کو کالعدم سمجھو سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

آزاد انصاری

کوئٹے کا زلزلہ

(۱)

میٹرک کرنے کے بعد میں نے سوچا، کہ بھئی آج کل ملازمتوں کا تو کچھ ٹھیک نہیں، بجائے انگریزی تعلیم جاری رکھنے کے کوئی فنی صیغہ اختیار کرنا چاہیئے، یہ سوچ کر طبیہ کالج دہلی میں داخل ہوگیا، دو سال خیریت سے گذرے، تیسرا سال شروع ہوا تھا، کہ بیماری نے آگھیرا، مجبوراً آگرہ واپس آنا پڑا، صحت بحال ہوئی تو دہلی جانے کو جی نہ چاہا، باغبانی کی تعلیم حاصل کرنے سہارن پور چلا گیا۔

باغبانی کا نصاب پورا کرنے کے بعد فکر ہوئی ملازمت کی، بہتیری دوڑ دھوپ کی کوئی جگہ نہ ملی، والد ماجد سے کہا، اگر آپ کچھ خرچ دیں تو کراچی جا کر تجارت کروں، یہ تجویز انہیں پسند آئی، تین سو روپیہ بطورِ زادِ راہ دے کر فرمایا، فی الحال اتنی ہی رقم لے جاؤ، راستہ میں ضائع ہونے کا احتمال ہے، وہاں پہنچ کر جتنی ضرورت ہو لکھنا، یہاں سے منی آرڈر کر دیا جائے گا۔

کراچی میں بڑی دقت پیش آئی، نیا شہر جہاں کوئی جان پہچان نہیں، کس سے صلاح لوں، کیا کروں، ہفتہ عشرہ یوں ہی نکل گیا، کہ دن بھر ہوٹل میں پڑا رہا، شام کو اٹھا ادھر ادھر چکر کاٹ کر چلا آیا، اور خیالاتِ پریشاں کی اُدھیڑ بُن میں اُلجھ گیا۔

ایک روز ذرا بندرگاہ کی طرف جا نکلا، حیران رہ گیا، جدھر نگاہ اُٹھتی دہیں کی ہو رہتی، کچھ دیر مبہوت رہنے کے بعد سیرِ دریا کی سوجھی، کرایہ کی بے شمار کشتیاں موجوں سے لڑتی بھڑتی دوڑی دوڑی پھرتی تھیں، اور ملاحوں نے ایک ہڑبونگ مچا رکھا تھا، کنارے تک پہنچتے پہنچتے بے طرح لپٹ پڑے، جوں ہی میں نے ایک کشتی میں قدم رکھا، وہ ساحل چھوڑ سمندر کے رُخ روانہ ہوگئی۔

کیا سیر تھی۔ ایک طرف بندرگاہ کی چہل پہل، دوسری طرف نیچے پانی اوپر آسمان۔ پانی کی حد نہ آسمان کا اور چھور۔ یہ کائنات کس قدر وسیع ہے۔ کشتی موجوں میں ہچکولے کھاتی رواں دواں تھی، نزدیک و دُور ماہی گیروں کی کشتیاں بادبان کھولے قطار در قطار پھیلی ہوئی تھیں، جیسے کسی جھیل پر قازوں کی ڈاریں اُتر رہی ہوں۔

ان کشتیوں کی نظارہ نوازی محویت میں، مجھے یکایک خیال آیا، کہ اچھا.... مچھلی کی تجارت ٹھیک رہے گی اور دل ہی دل میں جوڑ توڑ لگا کر بہت جلد فیصلہ کر لیا، کہ پہلے مچھلی کے کسی تاجر کی ملازمت کرنا چاہیئے، پھر جیسا ہوگا دیکھا جائے گا۔

(۲)

معمولی ہی سی کوشش سے مچھلی کے ایک بڑے آڑھتی کے یہاں روزگار لگ گیا چونکہ حوصلہ افزا اُمیدیں وابستہ تھیں، میں نے خوب جی لگا کر کام کیا، دن رات کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا، کہ پورا سال نہ گذرا تھا اس کاروبار کا مجھے پورا پورا تجربہ ہوگیا، اُدھر آڑھتی صاحب کو بھی مجھ پر اعتمادِ کلی حاصل ہو چکا تھا، انہوں نے اپنی ایک شاخ قائم کرنے کی غرض سے مجھے کوئٹہ بھیج دیا۔

میں نے وہاں بھی نہایت دیانتداری ذہن وہی سے کام کیا، مقامی ضروریات اور میری کوششوں کے سبب سے وُہ فرم بہت کامیاب رہی، ان کارگذاریوں کے بعد میں نے کاغذی گھوڑے دوڑائے تنخواہ میں اضافے کی کتنی ہی درخواستیں بھیجیں، مگر انہوں نے کچھ پروانہ کی، وُہ ہی کراچی کی تنخواہ پچپن روپیہ رہنے دی، مجھے اس تجارت کی رکانیں تو معلوم ہو ہی چکی تھیں، ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنا کام شروع کر دیا، اب میں نے دریائی سمندری مچھلی کے علاوہ ایک مُرغی خانہ کھول لیا اور انڈا مرغی بھی بہم پہنچانے لگا، اس طرح آج کچھ کل کچھ میرا کاروبار ترقی کرتا گیا۔

کاروبار کی رفتار کے ساتھ مراسم بھی دن دونے رات چوگنے ہوتے گئے، ان اُلجھنوں کی وجہ سے مجھے آگرہ جانے کا موقع نہ ملا، حالانکہ ہم دو بہنیں اور چھ بھائی ہیں، پھر بھی ماں کی مامتا، والدہ ماجدہ نے مجھ کو بار بار یاد فرمایا، خطوں کی ڈاک بٹھادی، ان خطوط میں میری شادی کے متعلق بھی کچھ اشارے ہوا کرتے تھے، آگے چل کر اس ایما کا صاف صاف اظہار کیا جانے لگا، مگر میں ان تحریکوں کو کھٹائی میں ڈالتے ڈالتے ۳۴ء تک لے آیا، کہ ایسی جلدی بھی کیا ہے، ذرا کاروبار کی طرف سے اطمینان ہو پھر جو مرضی ہو کیجئے گا۔

جب خط و کتابت سے خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا، تو اُنہوں نے بڑے بھائی صاحب کو بھیجا، اور سخت تاکید کی کہ جس طرح بھی ہو اُسے لے کر ہی آنا!

بھائی صاحب کوئٹہ تشریف لائے، لیکن میری مصروفیت دیکھ کر زیادہ زور نہ ڈال سکے، یوں ہی واپس چلے گئے۔

کاروبار کے علاوہ اپنے کوئٹہ نہ چھوڑنے کا ایک اور راز بھی ظاہر کر دوں، جو اس افسانہ کی جان ہے!

بات یہ ہوئی کہ گاہکوں میں ایک صاحب میرے پاس اکثر آنے جانے لگے، یہ میل ملاپ بڑھتا گیا، جب گہری چھننے لگی، تو ایک بار انہوں نے میری دعوت کی، گھر لے گئے اور اپنے والدِ ماجد سے ملایا، ان بزرگ کی عمر یو۔پی میں بسر ہوئی تھی پنشن کے بعد کوئٹہ جو آئے تو یہیں کے ہو رہے، اپنا وطن پنجاب بھی ترک کر دیا، اور عموماً کسی سے ملتے جلتے نہ تھے، البتہ کسی کو یو۔پی کا سُن پاتے، تو بہت اخلاق سے پیش آتے، مجھ ناچیز پر بھی شفقتِ بزرگانہ فرمائی، کہنے لگے برخودار! یہاں تمہارا کون ہے، غریب خانہ کو اپنا گھر سمجھو، ان بچوں کے ساتھ کھانا کھایا کرو!! یہ سُن کر میں بڑا چکرایا یوں ہی کچھ ہوں ہاں میں ٹال مٹول کر کے رہ گیا۔

مگر بزرگوں کی باتیں کچھ دنیا دکھاوے کی تھوڑا ہی ہوتی ہیں، اِس روز کے بعد سے وُہ کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی چیز بھجوا دیتے تیسرے، چوتھے ضرور دعوت کرتے، رفتہ رفتہ انہوں نے مجھ وحشی کو رام کر لیا، کچھ ایسا مانوس کیا، گھر بھلا دیا، اُن کی بیوی صاحبہ بھی اِس درجہ شفیق تھیں کہ مجھے اُن پر اپنی سگی ماں کا سا شُبہ گذرنے لگا۔

اِن بزرگ کے دو لڑکے تین لڑکیاں تھیں، بڑی لڑکی سیانی ہو چلی تھی، بزرگوار خُدا رسیدہ تارک الدنیا لوگوں کی طرح سہ منزلے پر اللہ اللہ کیا کرتے تھے، مائی صاحب گھر کے کام کاج میں رہتیں، بڑی لڑکی ہی میرے ہم سن دوست اپنے بڑے بھائی کو اور مجھے کھانا کھلایا کرتی تھی، وُہ کچھ اِس ذوق و شوق سے خندہ پیشانی میری خاطر تواضع کرتی، گویا یہ بھی کوئی عبادت ہے۔

غرض اِس خاندان کے چھوٹے بڑے سب ہی نے ایسا اچھا برتاؤ کیا، کہ ان کی یگانگت میرے تخیل میں پیوست ہوگئی، اور یقین ہونے لگا، کہ بس اب ان ہی میں میرا مرنا جینا ہے۔

طرفہ یہ کہ اس درجہ گھُل مل جانے کے باوجود اُس لڑکی اور میرے درمیان ایک لطیف حجاب حائل تھا، اتفاقاً کبھی آنکھیں لڑتیں بھی تو فوراً منتشر ہو جاتیں، اور مجھے صریحاً محسوس ہونے لگتا تھا، کہ ظاہری و باطنی فضائیں پُر اسرار افسانوں سے معمور ہیں۔

(۳)

میں نے صرف ڈھائی سو روپیہ سے بیوپار شروع کیا تھا، چھ سال میں مال اور تجارتی پھیلاؤ چھوڑ کر ساڑھے بارہ ہزار روپیہ نقد بنک میں جمع ہوگیا، مراجعتِ وطن کا خیال خوابِ فراموش ہو چکا تھا، میونسپلٹی سے ایک قطعہ منظور کرا کے ذاتی مکان بنوانے کی فکر تھی، اپریل ۱۹۳۵ء کے آخری ہفتہ میں بھائی صاحب کا ایک خط موصول ہوا، لکھا تھا والدۂ ماجدہ علیل ہیں، ڈاکٹروں نے تبدیلِ آب و ہوا کا مشورہ دیا ہے، آگرہ آکر اُنہیں لے جاؤ۔

کہاں کا آنا کہاں کا جانا، اُس وقت مجھے اپنی دُھن میں کچھ نہ سوجھتا تھا، لکھ دیا آپ تو میری مصروفیتیں دیکھ ہی گئے ہیں، سر کھجانے کی فرصت نہیں، آگرہ کیونکر حاضر ہو سکتا ہوں، ذرا آپ ہی اُن کو یہاں پہنچا جائیں۔ بھائی صاحب کو جواب لکھ کر میں نے والدۂ ماجدہ کے لئے ضروری انتظامات کر لئے، تاکہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، اور خوش تھا کہ اچھا ہے، اُنہیں بھی اُس خاندان سے ملا دوں گا، اس زمانے میں ایسے مخلص اور شریف النفس انسان کہاں ملتے ہیں، یقین ہے میری طرح متاثر ہو کر وہ بھی اس گھرانے میں مستقل تعلقات قائم کرنے کی آرزومند ہو جائیں گی۔

۱۷ یا شاید ۱۸ مئی ۱۹۳۵ء کو ان کے تشریف لانے کی خبر تھی، اُس کے تیسرے چوتھے دن دوسرا خط آیا جس میں لکھا تھا، کہ دفعتہً چھوٹے بھائی کی طبیعت ناساز ہوگئی، اس واسطے فی الحال سفر ملتوی کیا گیا۔

اُن دنوں مجھے کچھ عجیب عجیب خواب دکھائی دینے لگے تھے، جن سے اُس وقت تو میں بہت متاثر ہوتا تھا، پھر کچھ نہیں، مثلاً ۲۰ مئی ۱۹۳۵ء کو ڈاکٹر محمد طاہر صاحب لاہوری سے ملنے اسلام آباد گیا، ہم دونوں میڈیکل ہال میں بیٹھے شطرنج کھیلتے رہے، رات کے گیارہ بجے اُن کے یہاں سے واپس آیا اور بستر پر دراز ہوگیا۔

پچھلی رات دیکھا، کہ پریشاں روزگار ہوں، ایک جواں سال دوست کہتے ہیں، کہ مجھے بھی کوئی نوکری چاکری نہیں ملتی آئیے مصر چل کر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کریں، امید ہے کہ وہیں کوئی ملازمت بھی مل جائے گی۔

ہم مصر پہنچ گئے، میں نے چار سال میں ڈاکٹری کا کورس ختم کر کے سند حاصل کر لی، ملازمت ملی نہیں، میری قیام گاہ کے قریب ہی ایک بزرگ رہتے تھے، انہوں نے رائے دی، کہ میرا ذاتی مکان ہے، اس کے نیچے کا حصّہ بغیر کرایہ کے خالی کر دوں، اُس میں اپنی پریکٹس شروع کر دو!

میں اِس بات پر تیار ہوگیا، پریکٹس کرنے لگا، کام چل نکلا، دو سال میں میرے پاس تین ملازم ہوگئے۔

ایک روز دوپہر کا کھانا کھا کر کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا، وہ بزرگ تشریف لائے، باتوں باتوں میں فرمانے لگے،۔

برخوردار! تمہاری شادی ہوگئی ؟

میں نے جواب دیا۔ جی نہیں!

بولے۔ تو میری خواہش ہے، کہ اپنی اکلوتی لڑکی تم سے بیاہ دوں!

میں نے گذارش کی۔

والدین کی اجازت بغیر میں از خود کچھ نہیں کرسکتا۔

فرمایا۔ اچھّا! اُن کا پتا لکھوادو، پھر ہم جانیں وُہ جانیں!!

میں نے گھر کا پتا لکھوادیا، انہوں نے خط وکتابت کرکے منظوری منگوالی، اور میرے والد کی تحریر دکھا کر کہا۔ کیوں برخوردار! اب تو عذر کی گنجائش نہیں ؟

مجھے خاموش ہونا پڑا، انہوں نے اپنی لڑکی سے میرا عقد کردیا، شادی کے دوسرے سال ایک لڑکا پیدا ہوا، مزے سے گذر رہی تھی، ان بزرگ نے انتقال فرمایا، اس کے چند روز بعد میری طبیعت خراب ہوگئی، اور جلد جلد صحت گرنے لگی، ڈاکٹروں کو دکھایا تو انہوں نے مرض خطرناک بنایا۔

ایک روز گھر میں مرد عورت کا ہجوم ہوگیا، وُہ میری اہلیہ کے عزیز واقارب تھے، ناگہاں میرے کان میں بھنک پڑی، ان کی طرف سے مایوسی ہے، ڈاکٹر صاحب کا انتظار تھا، تھوڑی دیر میں وُہ تشریف لائے اور نا اُمیدی ظاہر کرکے چلے گئے، بیوی بچے مجھے حسرت سے تکنے لگے، پھر سُنا کہ آہ! بیچارے کا انتقال ہوگیا، ایک کہرام بپا تھا، میں چُپکا پڑا دیکھتا رہا، کہ اب کیا ہوتا ہے۔

تختہ لایا گیا، اور غسلِ میت کے لئے مجھے اُٹھایا جانے لگا، مارے خوف کے میں نے اپنے ہاتھ جھٹکے پٹّیوں پر کہنیاں لگیں، آنکھ کھلی تو معلوم ہوا، اُسی کوئٹہ والے گھر میں اپنی چارپائی پر پڑا ہوں، یہ ایک متوحش خواب تھا، آنکھ کھُلنے پر بھی میرا ڈر دُور نہ ہُوا، زور زور سے دل دھڑکتا رہا صبح تک پلک سے پلک نہ لگی، اور تین چار دن کہنیوں میں درد رہا۔

(۴)

۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کو میں نے وُہ خواب دیکھا، جس نے ایک بھری پُری بستی ملیامیٹ کردی، اور تاریخ ہند میں ایک عبرت ناک یادگار چھوڑ گیا۔

بے خبر پڑا سو رہا تھا، کیا دیکھتا ہوں، کہ یکایک کرۂ ارض کسی سیارے سے ٹکرایا، آسمان اُڑ گیا، زمین پاش پاش ہوگئی، مخلوق کی روحیں واویلا کرتی منڈلاتی پھرتی ہیں، اور میرا لاشہ تحت الثریٰ میں سما گیا ہے۔ ایک بجلی سی گری، گھبرا کر آنکھیں کھول

دیں، دوڑ کر برآمدے سے باہر کو جھانکا، دنیا گہری نیند میں غرق تھی، کمرے کی طرف رُخ پھیرا تو کلاک کی سوئی ایک سے چند منٹ آگے نظر آئی، کچھ دیر وہیں بے جان سا کھڑا رہا، پھر پیر گھسیٹتا ہوا بستر پر آگرا۔

کمرے میں کلاک کی ٹِک ٹِک یا میرے دل کی دھڑکن کے سوا بالکل سکوت تھا، اس وقت کلاک کی ٹِک ٹِک کوئی زندہ سی چیز معلوم ہوئی، گویا چیخ چیخ کر آگاہ کر رہی ہے، کہ اے غافل انسان ہلاکت آفریں مستقبل سر پہ آپہنچا، ہوشیار! ہوشیار!! ہوشیار!!!

جب ذرا آنکھ بند کرتا، دل کی دھڑکن سے روح بے چین ہونے لگتی۔ اور میرا قیاس ہے، کہ اگر اس مجبور دل کے ہاتھ پاؤں ہوتے، تو ضرور مجھے اُٹھا کر نہ جانے کہاں پہنچ آتا، اب بیچارہ سوائے اس کے کیا کر سکتا تھا، کہ زور زور سے سینہ میں ٹھو کے دے اور رہ جائے۔

کلاک کی ٹک ٹک مجھے بیدار کرتی رہی، دل کی دھڑکن نے ہزار فریاد کی لاکھ سر دُھنا ان تحریکوں سے بار بار جی گھبرا یا وحشت اُٹھی، روح پر ایک ہیجان طاری تھا، مگر میری سمجھ میں کیونکر آتا عقل پر تو پردہ پڑا ہوا تھا، آخر انگاروں پر لوٹتے لوٹتے جھپکی لگ گئی۔

تن بدن کی سُدھ نہ تھی، کسی نامعلوم اضطراب کے اثر سے یکایک چونکا کمرے میں کچھ عجیب وحشت ناک بے رونقی تھی اور ہر چیز تہ و بالا ہوتی پائی گئی[1]، میں نے اُٹھ کر بھاگنا چاہا، مگر کیا ہوتا، وقت نکل چکا تھا، قدم نہ جما[2] معاً ایسی گرج کے ساتھ گویا بڑے بڑے پہاڑوں میں تصادم ہو گیا، سامنے کی دیوار مجھ پر آرہی، اور فوراً ہی باقی دیواریں بھی باہر کے رُخ ڈھے پڑیں۔

جیسے ہزاروں مشین گنیں چل رہی ہوں، شش جہات میں ایک شورِ قیامت خیز بپا تھا، آندھی میں اُڑنے والے تنکے کی طرح زمین اُلٹ پُلٹ ہو رہی تھی، اور میں منوں ملبے کے نیچے دبا پڑا تھا[3]۔

(۵)

توبہ . . . . توبہ . . . . توبہ ہے، اُس عقوبت ناک وقت کا اندازہ لگائیے، جبکہ بہ سلامتیٔ ہوش وحواس ایک انسان سر سے پیر تک کچلا کچلایا، ہر طرف سے شکنجہ کی طرح جکڑا، موت کے لئے بے چین ہو، لیکن دم کے دھاگے ٹوٹیں، اور نہ چھٹکارے کی صورت نظر آئے۔

ایسی جاں کنی میں کہ تڑپنا تو درکنار سانس لینا دشوار تھا، تنگ سوراخوں سے آنے والے گرد و غبار میں دَم گھٹتے گھٹتے ہو گئے، زندگی کے تصورات ماند پڑ چکے، والدۂ ماجدہ بالکل ساکت آسمان پر ٹکٹکی لگائے نظر آئیں، کچھ ڈھارس بندھی، اُسی وقت

---

[1] اس وقت خیال آیا، کہ بھئی یہ کیسا خواب ہے، جو ابھی تو دیکھا تھا اور ابھی پھر دکھائی دینے لگا۔

[2] دو جھٹکے آچکے تھے، تیسرے جھٹکے پر میری آنکھ کھلی۔

[3] رات کے تین بجے تھے۔

میرے منہ کے قریب والی بلی کو جنبش ہوئی جس سے جبڑے ہل گئے، معلوم ہوا دانتوں نے جگہ چھوڑ دی، البتہ سانس لینے کی کچھ گنجائش ضرور نکل آئی، مدد کے لئے میں زور زور سے چیخا، اس بلی سے کوئی سولجر ٹکا کھڑا تھا، اسی وقت کچھ کھٹ کھٹ ہونے لگی، چند منٹ میں آسمان جھلکا، اور دو تین سولجر دکھائی دیئے، انہوں نے مجھ زندہ درگور کو باہر نکالا، اب جو دیکھتا ہوں تو ؎

مکیں رہے نہ مکاں طرفہ کارخانہ ہوا

زمیں اُلٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا میر انیس

اِس وقت سولجر کی رسٹ واچ دن کے تین بجا رہی تھی، گویا بارہ گھنٹے قضا کا مہمان رہ کر میں اسی جگہ پلٹ آیا جو کل تک بہشتِ ارضی تھی اور آج حسرت و ارمان کا مدفن، جہاں لکھوکھا اجل رسیدوں کی طرح میری اُمیدیں خاک بسر ہو چکی تھیں، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، وُہ جیتا جاگتا شہر جس کی سڑکوں پر کھوے سے کھوا چھلتا تھا، ہو کا میدان نظر آیا، ایک بڑے میاں میرے قریب کھڑے تھے، سولجر مجھے فوجی کیمپ میں لے جانے لگے، بڑے میاں بھی ساتھ ہو لئے، موقع پا کر اُنہوں نے میرے کان میں کہا :-

خبردار! وہاں مت جانا، بہت بُری حالت ہے، ہر لحہ زخمیوں میں اضافہ ہوتے جانے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحبان دیکھ بھال سے مجبور ہو رہے ہیں، جو لوگ وہاں مر جاتے ہیں، اُنہیں پہاڑی کے دامن میں پٹرول ڈال کر جلا دیا جاتا ہے -

سولجروں کا شکریہ ادا کر کے میں نے کہا :-

مجھے یوں ہی چھوڑ دیجئے، میں اپنا بندوبست خود کر لوں گا، مگر وُہ نہ مانے، ایک مکان کے زینہ کا کچھ حصّہ باقی رہ گیا تھا، اس کے نیچے سے چند آدمی گزرنے لگے، اسی وقت زلزلے کے جھٹکے[1] سے وہ زینہ اُن کے اُوپر آ رہا، گورے اُنہیں سنبھالنے کو دوڑے، ادھر میں بڑے میاں کے ساتھ فٹ بال گراؤنڈ کی طرف روانہ ہو گیا -

یہاں کے مکان والوں کا بھی کچھ حال معلوم ہے؟

انہوں نے جواب دیا - اُس خاندان کی دو عورتیں اور ایک بچّہ زخموں سے چُور فوجی کیمپ کو لے جاتے دیکھے تھے، اگر زندہ ہیں تو وہیں ہوں گے -

میں نے منّت کی - ذرا مجھے وہاں پہنچا دیجئے -

وُہ ترس کھا کر بولے چلئے!

ایک نوک دار لکڑی میری پیٹھ میں گھُس کر اندر اُتر گئی تھی، وہ جیوں کی تیوں رہی، اس کے علاوہ جوڑ جوڑ ٹوٹا ہُوا، لیکن دل کی مجبوری سے کیا سوجھتا، قوّتِ ارادی کے زور سے قدم اُٹھایا، سخت جستجو پر ناکامی ہوئی، ہم دونوں ہر پھر کر رات تک اُسی فٹ بال گراؤنڈ میں آ کھڑے ہوئے -

---

[1] یہ معمولی جھٹکا تھا -

یہ رات کیوں کر کٹی، کیا کہوں، منہ اندھیرے فوجی کیمپ کا رُخ کیا، جو وہاں سے ڈھائی میل تھا، کئی گھنٹے میں پہنچے، وہاں سو ڈیڑھ سو خیمے لگے ہوئے تھے، اتفاقاً اس لڑکی کا چھوٹا بھائی نظر آیا، وہ مجھے اُس کے پاس لے گیا، گھاس پر بچھی ہوئی دری کے اُوپر لڑکی زخموں سے چُور چُور پڑی تھی، میں دری کے پاس بیٹھ گیا، بچاری کرب و اضطراب سے کتنی ہی بار اُٹھی اور گر گر پڑی، اس کے حواس بجا نہ تھے، چھوٹے بھائی نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا:-

آپا! دیکھنا یہ کون ہیں؛

لڑکی نے چار پانچ مرتبہ خوب دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، بمشکل مجھے پہچانی -

اس کی زبان سے نکلا - افسوس! میں آپ کی خدمت نہ کر سکی .... اور ایک ہچکی لے کر خاموش ہوگئی سے

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

انسان کیسے کیسے ہوائی قلعے تعمیر کرتا ہے، پھر وہ کس طرح بیک گردشِ چرخِ نیلوفری تہس نہس ہو جایا کرتے ہیں۔

(بہ اجازتِ نشر گاہ لکھنؤ)

مرزا فہیم چغتائی

غزل

مے کی حاجت ہے، نہ مینا کی، نہ پیمانے کی
رد رخ آنکھوں میں تری جذب ہے میخانے کی

تُو جو میرا ہے تو گویا ہے زمانہ میرا
اب نہ اپنے کی ضرورت ہے نہ بیگانے کی

کثرتِ غم سے جو آتش بہ جگر ہے شاید
شمع پر آہ پڑی ہے کسی پروانے کی

مہر و مہ کو ہے در و بام سے وحشت انور
دیکھی جاتی نہیں حالت مرے غمخانے کی

کبیر احمد جعفری احمد پوری

قطعہ

تاریخِ وفاتِ حسرت آیاتِ عُلیا حضرت مادرِ دکن نَوَّرَ اللہ مرقدہا

شفقتِ مادر سے آہ، ہوگئے محروم شاہ — خسروِ عالم پناہ، پُشت وپناہِ دکن

رنج کی جب یہ خبر، صبح نے کی مُشتہر — آگئی پیشِ نظر، شامِ سیاہِ دکن

قصر میں کہرام تھا، جوشِ بُکا عام تھا — نالۂ ناکام تھا حاصلِ آہِ دکن

نعش محل سے اُٹھی، پھول سے خوشبو چلی — غیر ہُوا اور بھی حالِ تباہِ دکن

آدمیوں میں ملے، جیسے فرشتے بھی تھے — تنگ تھی اُس بھیڑ سے وسعتِ راہِ دکن

خلق کا سرتاج تھا ماں کے جنازے کے ساتھ — عام سرِ شام تھا جلوۂ ماہِ دکن

خاک کو سونپی گئی مسجدِ جُودی میں نعش — چادرِ گل بن گیا فرشِ گیاہِ دکن

شاہ ہُوئے اشکبار، روئے صغار و کبار — شبنم و ابرِ بہار چشم و نگاہِ دکن

از سرِ داغش نوشت مصرعِ تاریخ صدق

روئے بہ جنت نہاد مادرِ شاہِ دکن

سنہ ۱۳۶۰

اصغر کا روزنامچہ

۱۲ر جنوری ۱۹۳۹ء

آج کا دن اہم واقعات سے بالکل خالی ہے۔

۱۳ر جنوری

سو اب میں پھر آکسفورڈ آگیا ہوں۔ بہت پُرلطف ہے یہاں پھر آجانا اور پھر انہیں خوش آنند چہروں کو دیکھنا۔ میں اب روز بروز یہ سمجھ رہا ہوں کہ میں نے اتنا کام نہیں کیا جتنا مجھے چھٹیوں میں کرنا چاہیئے تھا۔

۱۴ر جنوری

کچھ سستی اور کچھ عدیم الفرصتی کی وجہ سے آج میں اِس قابل نہیں کہ کسی بات پر رائے زنی کر سکوں

۱۵ر جنوری

وہی کل والی بات۔

۱۶ر جنوری

ایضاً۔ ایضاً

۱۷ر جنوری

مجھے یہ روزنامچہ لکھنے کا کام شروع ہی نہ کرنا چاہیئے تھا۔

۱۸ر جنوری

میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے یہ فضول کام چھوڑ دینا چاہیئے۔

۱۹ر جنوری

میرا اب بھی اس کی نسبت یہی خیال ہے۔

۲۰ر جنوری

وہی حال ہے

۲۱ر جنوری

[illegible]

۲۲ر جنوری

میں اب بھی بیزار ہوں۔

۲۳ر جنوری

بہت زیادہ جیسے اوڈنیس اور سکوآش کے کھیل۔ میں کام کب کرنے لگوں گا؟

۲۴ر جنوری

مجھے معلوم نہیں

۲۵ر جنوری

مجھے اب بھی معلوم نہیں

۲۶ر جنوری

بھلا اس سب کچھ کا فائدہ کیا ہے؟

۲۷ر جنوری

مجھ سے بہتر آدمیوں کو بھی اس کا کچھ جواب نہیں ملا کم از کم کوئی مناسب جواب۔ خیر کچھ بھی ہو۔ کسے پروا ہے؟

۲۸ر جنوری

مجھے تو نہیں

۲۹ر جنوری

مجھے اب بھی نہیں

۳۰ر جنوری

بہتر ہے کہ میں کچھ توجہ کروں۔ کیا کہتے ہو؟

۳۱ر جنوری

کیوں؟

یکم فروری ۱۹۳۹ء

میں نہیں جانتا

۲ر فروری

تو پھر فکر کاہے کی؟

۳ر فروری

کم از کم آج میں نے فکر نہیں کی۔

سُستی اور فراغت کی انتہائی خوشی بھی کیا چیز ہے!

۴ر فروری

مُلر کے ساتھ ٹینس کھیلا۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اُسے ہرا دیا۔ ۴ – ۶ ، ۶-۶ ۲-۴ ۴-۶

۵ر فروری

فان فیلڈن کے ساتھ ٹینس کھیلا۔ میں بہت ہی بُری طرح کھیلا لیکن کسی نہ کسی طرح جیت گیا۔ ۹-۷، ۲-۶، ۴-۶

۶ر فروری

کلک، فان اور کوبرن کے ساتھ ٹینس کھیلا۔ فان اور میں ۴-۶، ۲-۶ پر جیت گئے۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہمارے مخالفین نکمّے تھے اور ہم بھی تقریباً ویسے ہی نکمّے تھے گو اُن سے کچھ کم۔

۷ر فروری

کوبرن کے ساتھ ٹینس۔ ۰-۶، ۰-۶، ۲-۶۔ میں پھولا نہ سمایا لیکن سچ یہ ہے کہ اُس نے اپنے دماغ سے کام نہ لیا۔

۸ر فروری

اِدھر اُدھر وقت گزارا۔ شطرنج کھیلی۔ سکواش کھیلی وغیرہ وغیرہ ....

۹ر فروری

"یونین" میں ایک بڑا پُر مذاق سا مباحثہ ہوا ....

۱۰ر فروری

لیبر کلب میں چالٹ ہالڈین کی تقریر بہت معمولی تھی۔ سُستی مانع ہے کہ اور کچھ لکھوں۔

۱۱ر فروری

مُلر، فرنیکلن اور فان کے ساتھ ٹینس کھیلا۔ میں کبھی اتنی بُری طرح نہیں کھیلا ....

۱۲ر فروری

"مجلس" کے ایک علمی حلقے میں شریک ہوا اور اُسے ۱/۲ درجہ دلچسپ پایا۔ دیکھئے کل کیا ہوتا ہے۔ لازم ہے کہ اب میں دل لگا کر کام کروں۔ آج تو میں خوب شطرنج کھیلا اور میں نے مُور کو ہرا دیا۔

(ترجمہ از دلی)

اصغر بشیر

(نوٹ) ۲۳ء ۴۴ دنوں کے بعد یہ روزنامچہ ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اصغر اپنے کام میں منہمک ہو گیا جیسا اس سے پہلے تھا۔ مطالعہ مباحثہ شاعری موسیقی فلم افسانہ سیر دینیات

محفلِ ادب

مہاراجہ سرکشن پرشاد اور سر محمد اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط

وارڈن ویسفلڈ روڈ بمبئی۔

مئی ڈیئر اقبال! شاد باش و شاد زی از فضل رب۔

اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی۔ اس یاد فرمائی کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔ مجھ جیسے ناچیز فقیر کو جس طرح آپ دل سے چاہتے ہیں، خدا کی مہربانی بھی آپ پر دونی رہے۔ بھئی اقبال۔ سچے دوست کی یہی تعریف ہے کہ ایک ناچیز اور ہیچ میرز دوست کے ساتھ دوستی نباہ دے۔ مجھے اب تک اس کا عقدہ نہ کھلا کہ آپ سے مجھے کیوں دلی خلوص ہے بجز اس کے کہ آپ ہی کا خلوص اس کا باعث یا عقدہ سمجھوں مگر افسوس ہے کہ میں اپنے ایسے دوست کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ نہ اس قابل ہوں۔ اس سفر میں زیر باری بہت ہوئی امید ایک حبہ کی نہیں۔ نرمی طلبی سخن دریں است۔ نہ اجمیر کے دربار میں حاضر ہو سکا نہ لاہور، نہ امرتسر میں اپنے احباب سے ملا، نہ ہردوار کے منظر کے درشن ہوئے۔ ہائے۔ اس قیدِ بے زنجیر کا ستیاناس ہو۔ انسان دنیوی اغراض کے لئے کس قدر مجبور ہو جاتا ہے اور آزاد ہو کر غلامی قبول کرتا ہے۔ یا اللہ جس قدر عمر باقی ہے اس کو تو ہی آزادی میں بسر کرائے۔ اب میں باز آیا ایسی امارت سے توبہ توبہ۔ بجز اس کے کوئلہ کی دلالی میں روسیاہی کی ہی توقع ہر طرح ہو سکتی ہے۔ سرخروئی محال ہے۔ اِلّا مَن یشاء شاد میں اگر جاذبہ کی قوت ہوتی تو پھر کیا پوچھتے۔ مگر شاد تو ہر طرح ناکارہ ہے کوئی بات بھی حاصل نہ کی۔ صرف فضل کا امیدوار ہے۔ اگر خلوص ہے تو خدا کی ذات سے۔ اُمید ہے کہ اقبال سے حیدر آباد کا اقبال چمک جائے گا۔ ہوائی جہاز کا منظر بے شک اچھا ہوا ہو گا۔ مگر یہ تو کہئے کہ سب کے حواس قائم تھے یا ہوائیوں کے ساتھ ہوا ہو گئے۔ بہر حال آپ ہر طرح کے تماشے دیکھئے اور ہمیں ترسایئے۔ ایک غزل تازہ مرسل خدمت ہے۔ مالکِ یومِ الدّین کہاں ہیں ان کی خدمت میں کہہ دیجئے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ

بڑے ہوشیار (نعبد) کے مطلب کو تو قبول کر لیتے ہیں مگر نَسۡتَعِیۡن پر انجان ہوتے ہیں۔ اللہ ان کو شاد و بامُراد رکھے

۸ ر مارچ کو انشاء اللہ تعالیٰ بندہ یہاں سے راہی حیدر آباد ہو گا۔ مہربان آپ کے بچوں کی تصویریں اور اپنی ایک تصویر ضرور بھیجئے۔ یوں تو میرے دل میں آپ کی تصویر ہے مگر اپنے احباب کو اگر دکھانا منظور ہو تو کس طرح دکھاؤں کہ یہ اقبالِ شاد نواز ہے۔ خدا حافظ

جواب علّامۂ اقبال

سرکارِ والا تبار تسلیم مع التعظیم!

والا نامہ پرسوں مل گیا تھا جس میں سرکارِ دولت مدار کے حیدرآباد واپس جانے کی خبر تھی لہٰذا یہ عریضہ حیدرآباد ہی کے پتہ پر لکھتا ہوں کہ سرکار کل بمبئی سے رخصت ہو جائیں گے۔

فارسی غزلوں کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کا والا نامہ بار روم میں ملا تھا۔ یہاں کے وکالت پیشہ احباب میں بعض ذوقِ سخن رکھتے ہیں۔ اہلِ پنجاب کے دلوں پر آپ کا نقش تو پہلے سے ہے۔ فارسی غزل "کیستم من" جب پڑھی گئی تو اربابِ ذوق سرمست ہو گئے۔ واقعی لاجواب غزل ہے انہیں باتوں سے اقبال آپ کا گرویدہ ہے۔ امارت، عزت و آبرو، جاہ و حشم عام ہے مگر دل ایک ایسی چیز ہے کہ ہر امیر کے پہلو میں نہیں ہوتا۔ کیا خوب ہو اگر سرکارِ عالی کا فارسی دیوان مرتب ہو کر دیدۂ افروزِ اہلِ بصیرت ہو۔

مجھے جو خلوص سرکار سے ہے اس کا راز معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں یہ راز مضمر ہے اُس دل میں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخشا ہے۔ سرکار کی قبائے امارت سے میرے دل کو مسرت ہے مگر میری نگاہ اِس سے پرے جاتی ہے اور اس چیز پر جا ٹھہرتی ہے جو اس قبا میں پوشیدہ ہے۔ الحمد للہ کہ یہ خلوص کسی غرض کا پردہ دار نہیں اور نہ انشاء اللہ ہو گا۔ انسانی قلب کے لئے اس سے بڑھ کر زبوں بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا خلوص پروردۂ اغراض و مقاصد ہو جائے۔ انشاء اللہ العزیز اقبال کو آپ حاضر و غائب اپنا مخلص پائیں گے۔ اللہ نے اس کو نگاہ بلند اور دلِ غیور عطا کیا ہے جو خدمت کا طالب نہیں اور احباب کی خدمت کو ہمیشہ حاضر ہے۔ اللہ اکبر سے دو چار روز ہوئے ملاقات ہوئی تھی آپ کا تذکرہ بھی ہوا تھا۔ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا دور دورہ پھر ہو جائے گا مطمئن رہئے۔ آج کل لاہور میں سلطان کے سرائے میں ایک مجذوب نے بہت لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ہے کسی روز ان کی خدمت میں بھی جانے کا قصد ہے۔ شاد کا پیغام بھی پہنچا دوں گا۔

قید سے گھبرانا کیا! اس کی شدت انشاء اللہ لطفِ آزادی کو دوبالا کر دے گی۔ عرصہ ہوا میں نے پھول سے خطاب کیا تھا۔

"اگر منظور ہے تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا	تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگِل بھی ہے	انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے"

تصویر ابھی کوئی پاس نہیں نئی بنوا کر سرکار کی خدمت میں حاضر کروں گا۔ لڑکا دہلی کالج میں پڑھتا ہے۔ ذہین و طبّاع ہے مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آج کل اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرا دوں یا اس کی شادی کر دوں کہ اس کے ناز میں نیاز ہو جائے۔

نازِ تا ناز است کم خیزد نیاز	ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز

اس کی تصویر بھی انشاء اللہ حاضر ہو گی۔ والسلام

مخلصِ قدیم
محمد اقبال

لاہور۔ ۷ مارچ ۱۹۱۷ء

"سب رس"

یونہی

کہو اک بات کہوں؟ ــــــــ کوئی سنے گا تو نہیں؟

تم سُنوگی؟ —— ارے ہاں تم تو سُنوگی —— لیکن
سُوچ لو، سُن کے بُرا تو نہیں مانوگی اسے
تم بُرا مانوگی؟ —— میں جانتا ہوں —— جانتا ہوں ——
خیر! لو، آؤ، سُنو —— آؤ قریب آجاؤ،
کوئی آجائے گا؟ —— آئے گا تو پھر کیا ہوگا!
پھر سہی، پھر سہی، جاؤ کوئی آجائے گا ——
اب کہوں، سوچ لو! میں تم سے کہے دیتا ہوں
نہیں مانوگی؟ —— نہیں مانوگی تم؟ —— مان بھی جاؤ
کیوں مجھے اپنی قسم دیتی ہو؟ —— ٹھہرو ٹھہرو ——
چھیڑتا ہوں؟ —— تمہیں میں چھیڑتا ہوں؟ —— خوب چہ خوب ——
اچھا —— تو آؤ، سنو —— تم تو نہیں مانوگی،
مانوگی؟ —— اچھا —— کہے دیتا ہوں —— میں نے کل رات
دل میں سوچا تھا کہ اب تم سے نہیں بولوں گا ——

یوسف ظفر

"ادبی دنیا"

طرزِ بیان اور مضمونِ شعر

اچھے شعر کو بُرے شعر سے تمیز کرلینا یا اچھے شعر سے متاثر ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ قریب قریب غیرارادی فعل ہے۔ اور ہم میں سے جو لوگ شعر سے تھوڑی بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ کم از کم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں۔ دقت اس وقت پیش آتی ہے۔ جب ہم اپنی پسند یا ناپسندیدگی کی وجوہات تلاش کرنے بیٹھیں یا دوسروں کے لئے اچھے اور بُرے اشعار کا معیار قائم کرنے کی کوشش کریں۔ ایسے موقعوں پر ہمارے اکثر نقاد' ذوقِ سلیم، حسنِ مذاق، اور ایسے ایسے دوسرے مبہم الفاظ کی آڑ لینے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاعری کی طرح سخن فہمی بھی خداداد ملکہ ہے اور
ع "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

لیکن آج کل سائنس کا زمانہ ہے۔ لوگ بال کی کھال اتارے بغیر دم نہیں لیتے۔ اگر میں یہ کہوں کہ فلاں شعر اس لئے اچھا ہے کہ مجھے پسند ہے تو وہ پوچھیں گے کہ کیوں پسند ہے۔ اگر میں یہ جواب دوں کہ میرا دل یہی کہتا ہے تو وہ کہیں گے کہ آپ کے دل کو ایسا کہنے کا کیا حق ہے اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ بہتر یہی ہے کہ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اچھے شعر کو اچھا کیوں کہتے ہیں۔ اور اس میں کون سے اجزا یا کون سی صفات ہونا چاہئیں جو ہمیں پہچاننے میں مدد دیں۔

سب سے پہلے یہ سوال پیش آتا ہے کہ شعر کو ہم اُس کے مضمون کی وجہ سے اچھا کہتے ہیں۔ یا طرزِ بیان کی وجہ سے۔ اور شعر کی ترکیب میں ان دونوں کی اہمیت اور باہمی تعلق کیا ہے؟ شاعری کے عمل پر نظر ڈالنے سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ شاعر پہلے کچھ کہنا چاہتا ہے اور اس کے بعد اُسے الفاظ کی جستجو ہوتی ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وُہ پہلے الفاظ ذہن میں رکھ لے اور پھر ان میں مضمون ڈالنے کی کوشش کرے۔ اس لئے کہ جذبات اور خیالات الفاظ کے بغیر بھی ذہن میں آ سکتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات انکا الفاظ میں سمانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن الفاظ اپنے معانی کے بغیر ذہن میں نہیں آ سکتے یہ تو ہو سکتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں پہلے سے کوئی جذبہ یا خیال موجود ہو اور بعد میں وُہ اُسے الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اُس کے ذہن میں الفاظ موجود ہوں لیکن مضمون کا پتہ نہ چلے۔ اگر الفاظ ذہن میں آ جائیں تو مضمون لازماً ذہن میں آ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ الفاظ اور مضمون بیک وقت ذہن میں آ جائیں۔ لیکن یہ بھی زیادہ قرین قیاس نہیں مضمون بہت سے الفاظ سے مل کر بنتا ہے اور شعر میں ان الفاظ کی کوئی ترتیب بھی ہونا چاہیئے۔ کیسے ممکن ہے کہ بہت سے باترتیب الفاظ یک دم دماغ میں آ جائیں۔ اور مضمون پیدا ہو جائے۔

عموماً ہوتا یہی ہے کہ مضمون یعنی کوئی تجربہ یا خیال پہلے سے موجود ہوتا ہے اور اس کے بیان کی باری بعد میں آتی ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ مضمون کو فنی اعتبار سے طرزِ بیان پر فوقیت حاصل ہے۔ البتہ یہ معلوم ہو گیا کہ شاعری کے نفسیاتی عمل میں مضمون پہلا قدم ہے اور طرزِ بیان دوسرا یا دوسرے الفاظ میں طرزِ بیان محض مضمون کے اظہار کا آلہ ہے۔

اب یہ بھی طے کر لیا جائے کہ فنی اعتبار سے فوقیت کے کیا معنی ہیں۔ جب ہم کوئی اچھا شعر یا اچھی نظم پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں تو ہمیں ایک قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے اگر فلسفہ کا کوئی معقول نظریہ ہماری نظر سے گزرے۔ یا ہم ریاضی کا کوئی مشکل سوال حل کریں تو بھی ہمیں ایک مختلف قسم کی فرحت میسّر آتی ہے۔ ان دونوں فرحتوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ فلسفہ کے نظریئے یا ریاضی کے سوالات ہمیں خالص دماغی فرحت بہم پہنچاتے ہیں لیکن شاعرانہ فرحت پر جذباتی رنگ ہوتا ہے۔ آپ پوچھیں گے یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ شاعر اپنے اشعار کے ذریعے کوئی جذباتی تجربہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وُہ کچھ دیکھتا ہے، کچھ سنتا ہے یا کچھ محسوس کرتا ہے۔ اُس کے دل پر ایک جذباتی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وُہ چاہتا ہے کہ اُس کے پڑھنے والے بھی اس کیفیت میں شریک ہوں۔ اُسے خواہش ہوتی ہے کہ آپ نہ صرف اُس کے تجربہ کو سمجھیں بلکہ اُس سے متأثر بھی ہوں اور اُس کے تجربہ کا جذباتی عنصر آپ تک اُسی شدت اور گہرائی سمیت پہنچے جس سے شاعر کا اپنا دل متاثر ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر شعر کامیاب ہے تو اُس کے مجموعی تاثر میں یہ جذباتی عنصر بھی شامل ہوگا۔ اب آپ یہ کہیں گے کہ شاعر کے تجربات کا جذباتی ہونا کیوں ضروری ہے شاعر فلسفیانہ مسائل کیوں نہ بیان کرے یا ریاضی کے عمل کیوں نہ سمجھائے؟ اس کا جواب یہی ہے۔ کہ اگر شعر سے ہمیں وُہ مخصوص فرحت حاصل نہ ہو جو ہم شعر سے متعلق کرتے ہیں تو شعر گفتن چہ ضرور؟ شاعری کوئی حکم الٰہی تو ہے نہیں کہ ہر بات شعر ہی میں کی جائے۔ اگر آپ محض کوئی ذہنی عقیدہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ یا کسی کو محض عقلاً قائل کرنا چاہتے ہیں تو نثر [illegible] کر لیجئے۔ شاعری کے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ اِس سے میری یہ مُراد نہیں کہ شاعری میں فلسفیانہ مسائل کا ذکر ہی نہ ہونا چاہیئے شاعری میں ہر مضمون سما سکتا ہے بشرطیکہ شاعر کے ذہن میں

اس مضمون کا جذباتی تصور موجود ہو۔ اگر وُہ کوئی فلسفیانہ مسئلہ بیان کرے تو وُہ مسئلہ اُس کے ذاتی تخیلی تجربے کی پیداوار ہونا چاہئے نہ کہ کسی خارجی عقلی عقیدہ کا۔ فلسفیانہ شاعری نسبتہً مشکل اسی لئے ہے کہ ایک خوبصورت عورت کا جذباتی تصور قائم کر لینا نہایت آسان ہے لیکن نظریۂ اضافیت کے متعلق کوئی شدید جذبہ محسوس کرنا اور اسے دوسروں تک پہنچانا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ ان تمام باتوں سے ثابت یہ ہوا کہ شاعری جذباتی تجربات کو الفاظ کے ذریعے دوسروں تک پہنچانے کا نام ہے۔ اور اس کی پہلی خوبی یہ ہونا چاہئے کہ اسے پڑھ کر ہم ایک خاص جذباتی فرحت محسوس کریں۔ جس چیز کا اس فرحت کی پیدائش میں زیادہ حصّہ ہے۔ وہی زیادہ اہم بھی ہے۔ اب یہ فیصلہ کر لینا زیادہ مشکل نہیں کہ اس فرحت کی پیدائش میں مضمون کو زیادہ دخل ہے یا طرزِ بیان کو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ یہ جذباتی فرحت شاعر کے تجربہ کے جذباتی پہلو کا عکس ہوتی ہے۔ اگر اُس کے تجربہ میں یہ عنصر سرے سے موجود ہی نہ ہو تو طرزِ بیان کیا کرے گا۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ شاعر اپنے تجربات ہم تک الفاظ ہی کے ذریعہ سے تو پہنچائے گا۔ اگر الفاظ میں جان نہ ہو تو اُس کے تجربہ کی شدت اور گہرائی ہم محسوس ہی کیسے کریں گے۔ یہ بات نہایت صحیح ہے لیکن الفاظ اپنے معانی کے علاوہ اور ہیں کیا چیز اور انہی معانی کو ہم مجموعی طور پر مضمون کہتے ہیں۔ اگر الفاظ زور دار ہوں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُن کے معانی زور دار ہیں یا دوسرے الفاظ میں ان کا مضمون پر جوش ہے۔ اگر الفاظ بے جان اور کمزور ہوں گے۔ تو مضمون بھی ایسا ہی ہوگا۔ اگر مضمون میں خلوص اور جذبہ نہ ہو تو ہم لاکھ سر ماریں الفاظ کھوکھلے اور کمزور ہی دکھائی دیں گے۔ تو کیا یوں نہیں ہوتا کہ شاعر کے ذہن میں مضمون تو نہایت عمدہ ہے لیکن اُس کا طرزِ بیان اچھا نہیں۔ اور اس لئے شعر میں بات پیدا نہیں ہو سکی۔ یا شعر میں مضمون تو کوئی خاص ہے نہیں۔ لیکن طرزِ بیان کی دلکشی کی وجہ سے شعر پُر لطف ہو گیا ہے پہلی بات کا جواب آسان ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ شاعر کے اپنے ذہن میں کیا مضمون ہے۔ کیا نہیں۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہم تک کیا مضمون پہنچا ہے۔ ہمارے نزدیک شاعر کے ذہن میں وہی ہے۔ اگر طرزِ بیان ناقص ہوگا۔ تو مضمون میں بھی نقص واقع ہو جائے گا۔ ہم یہی کہیں گے کہ یا شاعر کے ذہن میں مضمون صاف نہیں یا اُس میں اتنی قوتِ اظہار نہیں کہ اپنے مضمون کو ہو بہو ہم تک پہنچا سکے۔ بہر صورت جو مضمون ہم تک پہنچے گا ناقص ہوگا اور اسی وجہ سے ہم شعر کو بھی ناقص ٹھہرائیں گے۔ باقی رہی یہ بات کہ مضمون کے معمولی ہوتے ہوئے بھی ہم طرزِ بیان کا لطف اُٹھا سکتے ہیں یا نہیں۔ میں کہوں گا کہ یقیناً اُٹھا سکتے ہیں۔ لیکن یہ لطف جذباتی نہیں دماغی ہوگا۔ اگر کسی شعر کی بندش نہایت چست ہو یا اس میں کوئی محاورہ نہایت خوبصورتی سے چسپاں کیا جائے یا کوئی مشکل قافیہ نہایت بے ساختگی سے بندھا ہو یا بحروں اور قافیوں کی ترتیب میں موزونیت اور شگفتگی پائی جائے تو ہمیں ایک فرحت ضرور حاصل ہوگی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی جادوگر کسی معزز شخص کی ڈاڑھی سے انڈا نکال لائے یا خالی بکس سے خرگوش برآمد کرے تو ہمیں فرحت حاصل ہوتی ہے۔ دونوں حالتوں میں ہمیں خوشگوار اچنبھا سا معلوم ہوتا ہے۔ اور منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ ایسا شعر پڑھنے پر شاعر یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ ع " ہاتھ لا اُستاد کیوں کیسی کہی"! اور ہم اسی لہجہ میں اُسے داد بھی دیتے ہیں۔

شاید کوئی صاحب یہ اعتراض کریں کہ ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ روانی سلاست. بے ساختگی وغیرہ شعر کی بنیادی خوبیاں
ان کا تعلق طرزِ بیان سے ہے نہ کہ مضمون سے۔ یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ روانی سلاست۔ بے ساختگی وغیرہ خوبیاں ضرور ہیں
ہم ذرا سا غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دراصل یہ مضمون یا معانی ہی کی خوبیاں ہیں۔ روانی کے یہ معنی ہیں کہ جب ہمارا ذہن ایک لفظ
ں سے دوسرے لفظ کے معنوں کی طرف حرکت کرے تو اُسے رُکنا نہ پڑے اور اُس کی حرکت آزاد اور یکساں رہے۔ روانی کے
ے پہلو یعنی الفاظ کی آواز پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔ سلاست کے یہ معنی ہیں کہ مضمون اتنا زود فہم اور اُس کا اظہار اتنا کامیاب
ہمیں اس تک پہنچنے میں زحمت برداشت نہیں کرنی پڑتی۔ اسی طرح بے ساختگی سے یہ مراد ہے کہ مضمون روزمرہ زندگی سے
ا قریب ہے۔ اور ہم اُسے دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں اور اس وجہ سے ہمارا ذہن تازگی سی محسوس کرتا ہے۔ اگر شاعر اپنا مضمون
سے ہم تک منتقل کر سکا ہے۔ تو الفاظ کیسے بھی کیوں نہ ہوں شعر سلیس ہی معلوم ہوگا۔ مثال کے طور پر غالب کے دو شعر لیجئے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم ۔۔۔ اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۔۔۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

پہلے شعر کے الفاظ اور تراکیب فارسی ہیں۔ دوسرے شعر میں کوئی ترکیب نہیں اور الفاظ سب کے سب روزمرہ استعمال میں آتے ہیں۔
ے باوجود پہلا شعر اتنا ہی سلیس ہے جتنا دوسرا۔ اب بھی بعض حضرات یہ کہیں گے کہ طرزِ بیان ہی بعض اشعار کی جان ہے اور بعض شعرا
یان ہی کے بل پر شہرتِ جاوید کے حق دار ہیں۔ اگر داغ۔ امیر۔ ریاض وغیرہ کے طرزِ بیان کو نظر انداز کر دیا جائے تو اُن کے کلام میں
ئی ہی نہیں رہ جاتا۔ مثلاً یہ اشعار لیجئے ؎

مہمان ہے وہ غیرتِ خورشید و قمر آج ۔۔۔ دن آج ہے۔ رات آج ہے شام آج سحر آج

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں ۔۔۔ کسی کی آج بگڑی ہے جو وُہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

الٰہی کیوں نہیں اُٹھتی قیامت، ماجرا کیا ہے ۔۔۔ ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

دن آج۔ رات آج۔ شام آج۔ سحر آج کا توازن۔ کسی کے بننے اور بگڑنے کا تضاد۔ قیامت کے اٹھنے اور اُن کے بیٹھنے کا مقابلہ۔
ں کے قافیہ کی چستی۔ ان باتوں سے ہمیں فرحت ضرور حاصل ہوتی ہے لیکن یہ فرحت محض دماغی ہے اور شاعری سے مخصوص نہیں۔
سم کی فرحت ہمیں ایک ظریف کے چست فقرے یا ایک فلسفی کی استادانہ منطق بھی مہیا کر سکتی ہے۔ اگر ایسے اشعار لئے جائیں
ں یہ لفظی صنعتیں موجود نہیں۔ مثلاً ؎

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور ۔۔۔ کیا چیز حرام ہو گئی ہے

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے ۔۔۔ جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اُٹھا لے

تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہم داد اُس بات کی دے رہے ہیں جو شاعر نے کہی ہے۔ یا اُن تصورات کی جنہیں شعر نے ہمارے ذہن میں

بیدار کیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اگر یہی بات کسی اور انداز میں کہی جاتی تو بے مزہ ہوجاتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات صرف اسی انداز میں کہی جاسکتی تھی اور اگر کسی اور انداز میں کہی جاتی۔ تو بات بھی کچھ اور ہو جاتی اور اسی وجہ سے ہمیں اس کا لطف بھی نہ آتا۔ معاملہ بندی کے اشعار کی قیمت معاملات کی دلچسپی کی وجہ سے ہے نہ کہ بندش کے حسن کی وجہ سے۔ داغ۔ ریاض اور لکھنوی شعراء کے معاملات سطحی اور غیر اہم ہونے کی وجہ ان کا شاعرانہ رتبہ بھی بہت بلند نہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ خالص شاعرانہ نقطۂ نظر یا خالص فنی نقطۂ نظر سے ان کا کلام بہت بیش قیمت ہے لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر صرف ایک ہی ہے۔ اور بدقسمتی سے یہ بہت خالص نہیں۔ اس میں مضمون کی وسعت گہرائی اور جذباتی شدت کی آمیزش فقرہ بازی۔ قافیہ آرائی اور محاورہ بندی سے کہیں زیادہ ہے۔ طرزِ بیان کے مداحوں کے اعتراضات ابھی ختم نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ کہ شاعری میں لفظوں کی آواز اور موسیقی کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے اور کم از کم یہ تو مضمون اور معانی پر مبنی ہے۔ یہ بات بھی غلط ہے۔ ہر لفظ کی آواز کے ساتھ اُس کے معنوں کا تصور بھی ذہن میں آجاتا ہے اور اگر آوازیں بھونڈی یا دلکش معلوم ہوتی ہیں تو انہیں تصورات کی وجہ سے "ڑ" کی آواز بہت کرخت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن آپ پنجابی سے یہ آواز خارج کردیں تو اس زبان کی نصف شاعری کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر آپ کسی سے نہایت سریلی آواز میں کہئے کہ تم بڑے احمق ہو، تو وہ آپ کی آواز پر سر دھننے کی بجائے آپ کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑے گا۔

اِن سب باتوں سے میری یہ مُراد نہیں کہ شعر کی ترکیب میں طرزِ بیاں کی اہمیت ہے ہی نہیں۔ شعر سے ہم جو فرحت حاصل کرتے ہیں وُہ ایک حد تک دماغی ہوتی ہے اور زیادہ حد تک جذباتی۔ دماغی فرحت کا تعلق طرزِ بیان سے ہے اور جذباتی فرحت کا مضمونِ شعر سے۔ ان دونوں میں سے ہم جذباتی فرحت کو زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ شعر کی امتیازی خصوصیت یہی ہے۔ یہ درست ہے کہ طرزِ بیان شعر کو نثر سے تمیز کرنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن "اکتّر۔ بنتّر۔ تہتّر۔ چہتّر۔ پچھتّر۔ چھہتّر۔ سنتّر۔ اٹھتّر" بحر اور قافیہ کے باوجود شعر نہیں کہلا سکتا۔ شاعرانہ طرزِ بیان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مضمون پڑھنے والوں تک زیادہ سے زیادہ مؤثر طریقہ سے پہنچے اور اس کی کامیابی مضمون کی خوبی پر منحصر ہے۔ دائمی قیمت مضمون یا زندگی کے بنیادی تجربات کو حاصل ہے۔ طرزِ بیان محض اُن کا لباس ہے۔ جو موزوں ہوا پہن لیا۔ جو بوسیدہ ہوگیا پھینک دیا بیان کرنے ہی کو کچھ نہ ہو تو طرزِ بیان کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ لیکن اگر کوئی جذبہ اظہار کے لئے بے قرار ہے تو اظہار کی کوئی نہ کوئی موزوں صورت نکل ہی آئے گی۔ جیسے کسی نے کہا ہے کہ ؎

"جو دل کو لگانے کے ڈھب جانتے ہیں — وہ ترکیب در کیب سب جانتے ہیں"

(نشر کردہ فیض احمد فیض)

"ادب لطیف"

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک تاریخی خط

شاعر اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے سر کا خطاب واپس کرتے ہوئے لارڈ چیمسفورڈ کے نام ایک خط لکھا تھا۔ وہ تاریخی خط حسب ذیل ہے،

یور ایکسیلینسی

پنجاب میں چند مقامی فسادات کو فرو کرنے کے لئے حکومت نے جو تدابیر اختیار کی ہیں، اُن کی سختی نے ایک شدید صدمے کے ساتھ ہمارے دماغوں پر اپنی حالت کی اُس بے چارگی کا انکشاف کر دیا جس میں ہندوستان کی برطانی رعایا کی حیثیت سے ہم مبتلا ہیں۔

بدقسمت لوگوں کو جو سزائیں دی گئی ہیں، وہ غیر مناسب حد تک سخت ہیں اور یقین ہے کہ ان سزاؤں کا طریقہ بھی مہذب حکومتوں کی تاریخ میں چند نمایاں مستثنیات سے قطع نظر کرنے کے بعد اپنی مثال نہیں رکھتا۔

اِس امر کو ملحوظ رکھ کر کہ سلوک ایک ایسی قوم کے ساتھ جس کے پاس نہ ہتھیار ہیں نہ ذرائع ہیں، اُس قوت نے روا رکھا ہے جس کے پاس انسانی زندگی کی تباہی کے لئے انتہائی دہشتناک اور موثر تنظیم موجود ہے میں پورے زور سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ قوت کسی سیاسی تدبّر کی مدعی نہیں ہو سکتی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اِس طرزِ عمل کو صحیح ثابت کرنے کا دعویٰ اور زیادہ کمزور ہے پنجاب میں ہمارے بھائیوں کی جو ذلت ہوئی ہے اور جو مصائب اُن کو برداشت کرنے پڑے ہیں اُن کی تفصیل تمام سختیوں کے باوجود ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ گئی۔

ہماری قوم کے دل میں جس جذبۂ نفرت کا ہمہ گیر احساس پیدا ہوا، اس سے ہمارے حکمرانوں نے تغافل کیا۔ ممکن ہے حکمران اپنے آپ کو لائقِ تحسین سمجھتے ہوں اور انہوں نے اپنے اس فعل کو ابتدائی اسباق کی حیثیت دی ہو۔

اِس سنگدلانہ بے حسی کی تعریف اکثر اینگلو انڈین اخبارات نے کی ہے اور بعض اخبارات تو اس وحشیانہ حد تک جا پہنچے کہ انہوں نے ہمارے مصائب کا مضحکہ اُڑایا اور اِس قوت نے ان کی ذرا بھی مزاحمت نہ کی بلکہ وہ قوت درد کی ہر چیخ اور جذبات کے ہر اظہار کو جو مصیبت زدہ لوگوں کے نمائندہ اخبارات کے ذریعہ سے ہوتا تھا، سنگدلانہ ہوشیاری سے دبانے میں مصروف رہی۔

یہ جان کر کہ ہماری التجائیں بیکار ثابت ہوئی ہیں اور جذبۂ انتقام ہماری حکومت کے سیاسی تدبّر کی شریف آنکھوں کو اندھا کر رہا ہے ــــ حالانکہ یہ حکومت اپنی مادّی قوت کی موجودگی میں آسانی سے وسیع النظر ہو سکتی ہے، میں اپنے ملک کے لئے کم از کم جو کچھ کر سکتا ہوں یہ ہے کہ تمام نتائج سے بے پروا ہو کر اپنے لاکھوں ہم وطنوں کی طرف سے جو دفعتہً دہشت کے کرب و اندوہ میں گر گئے ہیں احتجاج کی صدا بلند کروں۔

اب وقت آ گیا ہے کہ اعزاز کی علامات کو ہم اپنی بے شمار ذلتوں میں ایک اور ذلت کا اضافہ سمجھیں۔ اسی لئے میں اپنی طرف سے اس خواہش کا اظہار کرتا ہوں کہ تمام امتیازی خصوصیات سے معرا ہو کر اپنے ان ہم وطن باشندوں کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں جو اپنی اُس حیثیت میں جس کو معمولی حیثیت کہا جاتا ہے اُن ذلتوں کو برداشت کرنے کے مستحق سمجھے جاتے ہیں جن کا کوئی انسان سزاوار نہیں۔

انہی وجوہ سے میں مجبور ہو گیا ہوں کہ یور ایکسیلینسی سے مناسب ادب، احترام اور افسوس کے ساتھ استدعا کروں کہ مجھ سے خطاب نائٹ ہڈ (سر کا خطاب) واپس لے لیا جائے۔ یہ وہ خطاب ہے جس کو ملک معظم کی جانب سے آپ کے پیشرو کے ہاتھوں (جس کی فراخی قلب کی میرے دل میں بڑی قدر ہے) مجھے قبول کرنے کی عزت حاصل ہوئی تھی۔

آپ کا مخلص
ٹیگور

سید عبد اللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "ہمایوں" ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

R. L. No. 1363

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

Title Printed at The Half-Tone Press, Dev Samaj Road, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلتِ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

جلد ۴۴ — نمبر ۵

"ہمایوں" بابت ماہِ نومبر ۱۹۴۱ء

چندہ سالانہ ۵ روپے ششماہی ۳ روپے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

جہاں نما

نوّاب زادہ لیاقت علی خاں

مسلم لیگ کے سکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں بہت خاموش کام کرنے والوں میں سے ہیں۔ باوجود ذاتی پروپیگنڈے کا کافی موقع میسّر ہونے کے انہوں نے کبھی اِس طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ انہیں محض اپنے کام سے کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمان اُن کے حالات سے بہت کم باخبر ہیں۔ حال ہی میں کلکتے کے اخبار "سٹار آف انڈیا" نے مسلمان رہنماؤں کے حالاتِ زندگی کے ایک سلسلے کی اشاعت شروع کی ہے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے متعلق ذیل کی معلومات اُسی سلسلے کے ایک مضمون سے اخذ کی گئی ہیں:۔

جو تعلق مسٹر بریندن بریکن کو مسٹر چرچل سے ہے (اگرچہ اب وُہ برطانوی وزیرِاعظم کے سکرٹری نہیں بلکہ وزیرِ اطلاعات کے عہدے پر فائز ہو چکے ہیں) یا جو تعلق مسٹر سٹیو نز ارلی کو پریزیڈنٹ رُوزولٹ سے ہے وہی تعلق نواب زادہ لیاقت علی خاں کو مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ سے ہے۔

بریکن اور ارلی کی طرح لیاقت علی خاں بھی عملی آدمی ہیں۔ اُن کی معاملہ فہم طبیعت بہت جلد بات کی تہ تک پہنچ جاتی ہے اور کام کی کوئی تفصیل اُن کی دقیقہ رس نظر سے چھپی نہیں رہتی، نہ کوئی فروگزاشت اُن کی نظر سے بچ سکتی ہے۔

مسٹر جناح نواب زادہ لیاقت علی خاں کے بہت گرویدہ ہیں اور اُن کی شخصیت فی الواقع ہے بھی بہت پسندیدہ۔ مسلم لیگ کے صبر آزما کام میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کی شرکت قائدِ اعظم کے لئے بڑی مدد کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ نواب زادہ صاحب نہ صرف صاحبِ حیثیت، محنت پسند اور کام سے نہ تھکنے والے آدمی ہیں بلکہ اِن سب صفات سے بڑھ کر اُن میں اخلاص کی صفت بھی ہے اور وُہ مسلم لیگ کے کام کو اور نتیجۃً اسلامی ہند کے ہر کام کو یکساں عزیز رکھنے کے ساتھ قابلِ تقلید وفاداری اور اشتیاق سے اپنے سردار کے کام کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش میں بھی لگے رہتے ہیں۔

ایک اتنی بڑی اور ملک بھر میں شاخ در شاخ پھیلی ہوئی جماعت کی معتمدی کا کام آسان نہیں۔ ایسا کام جتنا گراں بار ہوتا ہے اتنا ہی نازک بھی ہوتا ہے کیونکہ سکرٹری کو بعض ایسے معاملات میں نمایاں حصّہ لینا پڑتا ہے جو دوسروں کے لئے ہمیشہ خوشگوار ہی نہیں ہوتے۔ ایسے معاملات کو کامیابی سے سنبھالنے کے لئے بہت ہوشیاری اور بیدار مغزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلاشبہ نواب زادہ لیاقت علی خاں گوناگوں صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اُن کی نظر کی طرح اُن کی ہمدردی کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ وُہ اپنے موجودہ کام کے لئے جو چند سال سے اُنہوں نے اپنے ذمّے لے رکھا ہے بہت موزون ہیں اور اس سے عہدہ برا ہونے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں۔ اُن میں دوست بنانے کی غیر محدود صلاحیت ہے۔ جو شخص اُن سے ملتا ہے اُن

کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ کسی شخص کو اُن سے کسی قسم کی شکایت نہیں ہوتی۔

بہت سے بڑے آدمی اپنی کامیابی کے ذکر میں ازراہِ شکر گزاری اپنی بیویوں کی مدد کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً مہاتما گاندھی شریمتی کستورابائی کی رفاقت کو اپنی کامیابی کا حصہ دار جانتے ہیں اور پنڈت جواہر لعل نہرو اپنی سوانحعمری میں جگہ جگہ مسز کملا نہرو کی وفادارانہ رفاقت کا ذکر کرتے ہیں۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے بارے میں بھی بلاخوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی عظمت میں اُن کی لائق رفیقۂ حیات کا بہت کچھ حصہ ہے۔ بیگم لیاقت علی خاں بہت ذہین اور شائستہ خاتون ہیں۔ وُہ نسوانی معاشری تحریکوں میں ہمیشہ عملی حصہ لیتی رہی ہیں۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں صوبجاتِ متحدہ کے ایک امیر گھرانے کے چشم و چراغ اور آکسفرڈ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ وُہ بہت مساعد حالات کے اندر سیاسیات کے میدان میں داخل ہوئے۔ جلد ہی صوبجاتِ متحدہ کی سیاسیات میں انہوں نے نام پیدا کر لیا اور مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات کے ماتحت وُہ اپنے صوبے کی مجلسِ وضعِ قوانین کے رکن ہی نہیں بلکہ اُس کے ڈپٹی پریزیڈنٹ بھی بن گئے۔ اس دو عملے نظامِ حکومت کے خاتمے پر کچھ عرصہ لیاقت علی خاں خاموش رہے۔ اس زمانے میں اُن کے پیشِ نظر کوئی خاص کام نہ تھا۔ اسی اثناء میں وُہ مسٹر جناح کے زیرِ اثر آئے اور اپنی خدمات انہیں پیش کر دیں۔ اب وُہ قائدِ اعظم کے نہایت معتمد مددگار ہیں۔ جن دو بڑے مکانوں کی چھتوں کے نیچے مسلم لیگ بعض بہت اہم فیصلے کر چکی ہے، اُن میں سے ایک بمبئی میں مسٹر محمد علی جناح کا مسکن ہے اور دوسرا دہلی میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کا۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے خوبصورت بنگلہ "گلِ رعنا" ہی میں جو ہمایوں کے تاریخی قلعے کے روبرو واقع ہے لیگ نے وائسرائے کی کونسل کی توسیع کے متعلق اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کیا تھا۔

"سٹار آف انڈیا" کے نامہ نگار نے آخر میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کو اور زیادہ عملی آدمی بننے کی تلقین کی ہے۔ اُس کا مطلب یہ ہے کہ نواب زادہ صاحب عوام سے زیادہ تعلق پیدا کریں۔ اب تک وُہ صرف اپنے منصبِ بلند کی وجہ سے عوام میں روشناس ہیں۔ انہیں مسلمانوں کے عام مذہبی و سیاسی اداروں سے مزید دلچسپی پیدا کر کے پوری طرح عام مسلمانوں کا آدمی بن جانا چاہئے۔ نسبتۂ کم عمر ہونے کی وجہ سے انہیں یہ موقع حاصل ہے کہ وُہ اُن باتوں میں بھی کامیاب ہو سکیں جن میں مسٹر جناح کامیاب نہیں ہو سکتے۔

بعض مشہور ہندوستانی

ڈاکٹر امبیدکار

ڈاکٹر امبیڈکر یا امبیدکار ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ وُہ پی ایچ ڈی۔ ڈی۔ ایس سی اور بیرسٹرایٹ لا ہیں۔ اُن کا تعلق اُس

طبقے سے ہے جسے اُن کے ہم قوم اپنے ایک آدمیت سوز نقطۂ نظر کے مطابق "اچھوت" کہتے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے مہاراجہ بڑودہ کے وظیفے سے کولمبیا یونیورسٹی میں معاشیات اور مدنیات کی تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ علمی تحقیق کے لئے ایک سال لنڈن میں بھی رہے اور "انڈیا آفس" کے کتب خانے سے مستفید ہوتے رہے۔ وہ ۱۹۱۷ء میں ہندوستان واپس آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مالیات اور ذات پات کے متعلق متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ انہوں نے اچھوتوں کی ترقی کے لئے بھی ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے اور ہندوستان کے اچھوتوں کے مسلّمہ رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بمبئی کی مجلس وضع قوانین کے نامزد کردہ رکن ہیں ۱۹۳۰-۳۲ء میں "گول میز کانفرنس" اور "جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی" کے رکن مقرر ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ہم قوموں کو کئی دفعہ یہ دھمکی دی کہ چونکہ تم ہم کو اچھوت سمجھتے ہو اس لئے میں اپنے تمام پیروؤں کو ساتھ لے کر اپنا مذہب بدل لوں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھمکی محض سنسنی پیدا کرنے کے لئے دی جاتی تھی کیونکہ وہ اب تک اپنے مذہب پر قائم ہیں اور اُن کے ہم قوم انہیں برابر اچھوت کہتے ہیں۔ حال میں انہوں نے پاکستان کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے مسلمانوں کو بہت وحشی اور درندہ صفت ظاہر کیا ہے اور ہندوؤں کو رائے دی ہے کہ بہتر ہے انہیں پاکستان دے کر الگ ہی کر دیا جائے۔ یہ اس قابل نہیں کہ انہیں اپنی قوم میں شامل رکھا جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام ۱۸۸۸ء میں مکّہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا بچپن عرب میں گزرا۔ اُن کی دینی تعلیم قاہرہ کی جامعۂ ازہر میں ہوئی۔ اُن کے والد ماجد دہلی کے رہنے والے تھے۔ مصر سے واپس آنے کے کچھ سال بعد انہوں نے بہت نوعمری میں امرتسر کے "وکیل" کی ادارت کے فرائض اپنے ذمّے لئے۔ اس دوران میں وہ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے رہے۔ ۱۹۱۱ء کے قریب انہوں نے خود کلکتہ سے اپنا مشہور ہفتہ وار اخبار "الہلال" جاری کیا۔ اُردو میں اُن کا عربی آمیز اندازِ تحریر مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا۔ اُن کے مذہبی و سیاسی مضامین اُن کی بصیرت کے گواہ ہیں۔ "الہلال" کا نام اب تک بہت عزت سے لیا جاتا ہے۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے آغاز کے وقت اسلامی ممالک کے متعلق اُن کے مضامین اُن کی نظر بندی کا سبب بنے۔ آزادی کے بعد اُنہوں نے جناب گاندھی صاحب کے زیر قیادت تحریکِ خلافت میں بہت کچھ حصہ لیا۔ وہ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۳۰ء میں کانگرس کے صدر ہوئے اور اب پھر صدرِ کانگرس کی حیثیت سے ستیہ گرہ کر کے قید ہو چکے ہیں۔ مولویوں میں اُن کے سے صحیح الدماغ آدمی کا وجود الشاذ کالمعدوم ہے۔ افسوس ہے کہ اُن کی متلوّن مزاجی نے انہیں موجودہ اسلامی سیاسیات سے بالکل الگ کر رکھا ہے اور ہندو جن کی کانگرس سے وہ اُس زمانے سے وابستہ ہیں جب وہ خالص ہندو جماعت نہیں رہی تھی اُنہیں اپنا رہنما نہیں سمجھتے۔ اسی لئے اُن سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا کوئی سمجھوتا کرانے میں کامیاب ہو سکیں گے حالانکہ ایسے سمجھوتے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ سمجھوتا اُسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یا تو ہندو مسلمانوں کے غلام بننے پر آمادہ ہو سکیں یا مسلمان ہندوؤں کے غلام بن جائیں اور یا دونوں قومیں اپنے اپنے تہذیبی و تمدّنی

مراکز میں اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کر کے دفاعی و تجارتی ضروریات کے لئے آپس میں کسی قسم کا اتحاد کرلیں۔ اگر مولانا ان صورتوں میں سے کسی ایک کو قابلِ عمل بنا سکیں تو اُن کی صدارتِ کانگرس مفید ہو سکتی ہے ورنہ بیکار ہے کیونکہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں سے کوئی ایک قوم اپنی الگ تھلگ کوششوں سے غلامی کی زنجیریں توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

سر اکبر حیدری

محمد اکبر نذر علی حیدری المخاطب بہ نواب حیدر نواز جنگ و سر اکبر حیدری ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ بمبئی کے ایک مشن کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۸ء میں ہندوستان کے فائینس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے اور اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل (صوبجات متحدہ) ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل (بمبئی و مدراس) ایگزیمنر گورنمنٹ پریس اکاؤنٹس، کنٹرولر آف ٹریژریز انڈیا، فائننشل سکرٹری و سکرٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا اور اکاؤنٹنٹ جنرل ریاست حیدرآباد (۱۹۰۵ء) اکاؤنٹنٹ جنرل بمبئی (۱۹۲۰ء) فائنس و ریلوے ممبر حیدرآباد دکن (۱۹۲۱ء) کے فرائض بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۷ء میں وہ "آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے صدر مقرر ہوئے۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کا خیال پیدا کر کے اسے جامۂ عمل پہنانے کا سامان کیا۔ یہ پہلی یونیورسٹی ہے جس کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ اُنہوں نے حیدرآباد میں محکمۂ آثارِ قدیمہ قائم کیا۔ تین دفعہ گول میز کانفرنس میں حیدرآباد کے نمائندوں کی قیادت کی۔ جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ وُہ بہت سی کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں سر کشن پرشاد کے بعد وُہ حیدرآباد کے وزیرِ اعظم یعنی صدرِ بابِ حکومت کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔

حال ہی میں سر اکبر کو والسرائے نے اپنی ایگزیکٹو کونسل میں لے لیا ہے اور وُہ حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ اعلیٰ حضرت خسروِ دکن و برار نے اپنے ایک فرمان کے ذریعہ سے اُن کے لئے تین ہزار روپے (برطانی سکہ) ماہوار پنشن مقرر کی ہے اس کے علاوہ چونکہ صدارتِ بابِ حکومت کے دوران میں سر اکبر نے اپنے حقِ رخصت سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا تھا اُن کے لئے پوری تنخواہ کے ساتھ سات مہینے کی رخصت بھی منظور ہوئی ہے۔ یہ پوری رقم پچاس ہزار روپے (برطانی سکہ) بہ طورِ حق الخدمت اُنہیں یکمشت ادا کر دی جائے گی۔ سر اکبر کے پانچوں پوتوں میں سے ہر ایک کا سو روپے عثمانی سکہ ماہوار منصب مقرر کیا گیا ہے۔ سوماجی گوڑہ میں سر اکبر کی موجودہ اقامت گاہ "دلکشا" جو ایک سرکاری عمارت ہے تا حینِ حیات سر اکبر کو دے دی گئی ہے تاکہ جتنی مرتبہ وُہ حیدرآباد جائیں اِس عمارت میں قیام کر سکیں۔

بابو سبھاش چندر بوس

سبھاش چندر بوس ۲۳ جنوری ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ ریونشا کالج کٹک سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۱۳-۱۴ء میں

وُہ پریزیڈنسی کالج کی یونین کے سکرٹری مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں بی۔ اے پاس کرنے پر فلسفے میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء تک کیمبرج میں طالب علم رہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا۔ کامیاب طلبہ میں اِن کا نمبر چوتھا تھا اَور انگریزی کمپوزیشن کے پرچے میں اوّل آئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں بی۔ اے کنیٹب ہوئے۔ ابھی لنڈن ہی میں تھے کہ آئی سی ایس سے مستعفی ہوگئے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں شمالی بنگال کے طوفان زدہ علاقے کی امداد کے کام کے ذمہ دار ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اخبار "فارورڈ" کے منیجر ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں کلکتہ کارپوریشن کے چیف ایگزیکٹو افسر مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں سنہ ۱۸۱۸ء کے ضابطہ ۳ کے ماتحت گرفتار ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ایک جلوس کے سلسلے میں بہ الزامِ بغاوت ایک سال کی قیدِ بامشقت میسّر ہوئی۔ ابھی جیل ہی میں تھے کہ اگست سنہ ۱۹۳۰ء میں مسٹر جے۔ ایم سین گپتا کے بجائے کلکتہ کے میئر نامزد کئے گئے۔ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء میں جب وہ کلکتہ کے میئر تھے انہیں دوبارہ چھ مہینے کی قید سخت حاصل ہوئی۔ اِس دفعہ قید کا تعلق ایک "ممنوع" جلسے سے تھا۔ قید سے رہائی پانے کے بعد دوبارہ بمبئی میں گرفتار کر لئے گئے لیکن خرابیٔ صحت کے باعث انہیں یورپ جانے کی اجازت مل گئی۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں اپنے والد کی وفات پر واپس کلکتہ آئے اور گھر میں نظر بند کر دیئے گئے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ یورپ چلے گئے لیکن پھر سنہ ۱۹۳۶ء میں واپسی پر بمبئی ہی میں گرفتار کر لئے گئے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں جیل سے آزادی ملی اَور سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء میں کانگرس کے صدر ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں وُہ پھر صدر منتخب ہوئے لیکن کانگریس ہائی کمانڈ یعنی حضرت گاندھی سے اختلاف رکھنے کے باعث وہ کانگریس سے مستعفی ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔ کانگریس کے طرزِ عمل پر احتجاج کیا تو بہ طورِ سزا کانگریس میں کوئی عہدہ حاصل کرنے کے حق سے محروم کر دیئے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے آزاد خیال جماعت کا ایک "فارورڈ بلاک" بنایا جو کانگریس کے اندر ایک "بایاں بازو" تھا۔ لیکن جناب گاندھی صاحب اَور کانگریس ہائی کمانڈ کو بوس کی یہ سرگرمیاں بہت ناگوار تھیں اس لئے وہ برابر اُن کی راہ میں مشکلات پیدا کر کے اُن کی حوصلہ شکنی کرتے رہے۔ غالباً اِسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بوس ایک دن چپ چاپ اپنے گھر سے کسی نامعلوم مقام کی طرف کوچ کر گئے اَور اب کسی کو یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کہاں ہیں بلکہ اب اُن کا زندہ ہونا بھی مشتبہ ہے۔

حامد علی خاں

اطلاع: جواب طلب اُمور کے لئے اپنا پتہ لکھ کر جوابی کارڈ، اَور مضامین کے ساتھ اُن کی واپسی یا رسید کی اطلاع کے لئے اپنا پتہ لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ بہ صورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہیں ہوگا اَور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے۔ منیجر

ایس پیرانتو

انسانی جنگ وجدل کے باوجود سائنس کی تمام طاقتیں زمان ومکان کی پہنائیوں کو سکیڑ نے اور نسلی و تہذیبی بیگانگی کو مٹانے میں ہر دم کوشاں رہی ہیں۔ ان تمام طاقتوں میں ریڈیو کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ آج انسانی آواز دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک منٹوں میں پہنچ جاتی ہے۔ چرچل اور روزویلٹ کی تقاریر ایک ہی وقت دنیا کے مختلف علاقوں میں لاکھوں آدمی سنتے ہیں۔ کروڑوں سننا چاہتے ہیں مگر سمجھ نہیں سکتے۔ ہر ملک میں ہر زبان میں اُن تقاریر کا ترجمہ ہوتا ہے۔ کچھ ترجمے کی دقتوں سے، کچھ لب ولہجہ کی عدم موجودگی سے مطلب آدھا رہ جاتا ہے۔ برلن اور لندن سے لڑائی کی خبریں ایک درجن کے قریب زبانوں میں براڈ کاسٹ کی جاتی ہیں۔ انسان اپنی آواز کو تو سمندر پار پہنچا سکتا ہے۔ اپنی زبان کو نہیں سمجھا سکتا۔ جب ایک جرمن اور ہسپانوی، ایک روسی اور اطالوی، ایک ہندوستانی اور جاپانی ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اُن کے لئے سوائے اِس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ بس مسکرا کر آگے چل دیں۔ دوسرے ملکوں میں جا کر ایک سیاح کے لئے اُن کے رسم ورواج یا سیاسی واجتماعی زندگی کا مطالعہ تو درکنار۔ زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے اپنے قیام وطعام کا انتظام بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لسانی اختلافات سے تجارت وصنعت میں جو رکاوٹیں سدِ راہ ہیں اُن کا اندازہ صرف وہی کمپنیاں کر سکتی ہیں جن کا غیر ملکی تجارت سے واسطہ ہے۔ سیاسی اور تمدنی جماعتیں ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ سے ناواقف، غلط فہمی کا شکار ہو کر کشیدگی اور کشمکش کا باعث بنتی ہیں۔ سائنس دان ہمعصروں کی ایجادوں سے بے بہرہ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی مشکلات کو حل نہیں کر سکتے۔ اہلِ ادب چاہتے ہیں کہ ان کے احساسات دُنیا کے دلوں کو ہلا دیں مگر دُنیا اُن کی زبان نہیں جانتی۔

بائیبل کے شروع میں ایک کہانی آتی ہے کہ حضرت نوح کی اولاد نے ارادہ کیا کہ بابل میں ایک ایسا مینار بنایا جائے جس کی رسائی بہشت تک ہو۔ خداوند تعالیٰ کو یہ ناگوار گزرا۔ ان کے اتحاد اور قومیت کو مٹانے کے لئے خدا نے ان کے درمیان لسانی اختلاف پیدا کر دیا۔ مینار وہیں کا وہیں رہ گیا۔ حضرت نوح کی اولاد ابھی تک اِسی لعنت کا شکار ہے۔ ایک دوسرے کی ہاں اور نہیں تک نہیں سمجھ سکتی۔ کارلائیل اور لوئی بلانک کی ملاقات کا قصہ کس نے نہیں سُنا۔ کارلائیل فرانسیسی زبان جانتا تھا۔ تاہم اس کی اپنی ہی قسم کی انگریزی کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ اور وہ بھی سکاٹ لینڈ کی طرز میں بولا ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوئی بلانک اِس کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا۔ انگلستان کا مشہور سائنسدان فیراڈے جرمن زبان نہیں جانتا تھا۔ اس لئے رابرٹ میئر اور ہیم ہولٹز کی ایجادات سے بے بہرہ رہا اور دُنیا ابھی تک اندازہ نہیں کر سکی کہ اس سے علم وسائنس کو کس قدر نقصان پہنچا۔ ڈین سٹینلے کا قول ہے کہ اگر نیومین جرمن زبان پڑھ سکتا تو انگلستان کے چرچ کی تاریخ مختلف ہوتی۔ ڈاکٹر فرنیوال شیکسپیئر کا قابل ترین مُفسر ہو گزرا ہے۔ اسے جرمن کے ایک سکالر نے شیکسپیئر کی تصانیف کا مشروح نسخہ بھیجا۔ تاکہ وُہ اسے اپنے ایڈیشن میں استعمال کر سکے۔ مگر ڈاکٹر موصوف نے اسے واپس بھیج دیا کیونکہ جرمن زبان اس کے لئے لاینحل معمّا تھی۔ ڈوینس کے مقدمے

کے دوران میں جب زولا انگلستان بھاگ گیا تو اسے زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے نہایت کڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈنمارک کا مشہور
شاعر ہرمن بینگ ۱۹۱۲ء میں امریکہ میں مرا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی موت نہایت تکلیف دہ ہوئی کیونکہ وہ اپنی معمولی ضروریات کو بھی سمجھانے
کے ناقابل تھا۔

آج زبان کی واقفیت صرف بیوپاریوں۔ سائینسدانوں اور سیاحوں وغیرہ کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ ریڈیو کی ترقی کی وجہ سے ہر ایک انسان
کے لئے لازمی ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں ہم لوگ انگریزی زبان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں۔ گویا ہمارے لئے غیر انگریزی دنیا کا وجود تک نہیں۔ ہم
دنیا کو انگریزی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر ہماری سیاسی آزادی کے ساتھ ہمارے سیاسی۔ تمدنی تعلیمی اور اقتصادی تعلقات کے دائرہ کا وسیع ہونا
لازمی ہے ہم جلد محسوس کرنے لگیں گے کہ انگریزی زبان ہماری تمام ضروریات کو پورا کرنے کے ناقابل ہے۔ کوئی قومی زبان دنیا کی متحدہ زبان نہیں ہو
سکتی پچھلی لڑائی کے بعد جب جمعیتہ الاقوام کی بنیاد پڑی تو زبان کا مسئلہ نہایت پیچیدہ تھا۔ دنیا میں ڈیڑھ ہزار کے قریب زبانیں بولی جاتی ہیں صرف یورپ
میں ایک سو بیس کے قریب زبانیں مروج تھیں۔ فرانسیسی زبان کا سب سے زیادہ زور تھا۔ انگریزی بھی نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے
مل کر امریکہ کی مدد سے لڑائی جیتی تھی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہر دو زبانیں جمعیتہ الاقوام کی زبانیں قرار دی گئیں۔ اس سے دونوں کا اختیار و اقتدار تو بڑھ گیا۔ مگر باقی قومیں
کچھ منحرف سی رہیں۔ ہر معاملے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو نمایاں فائدہ رہتا تھا۔ ایسے بھی اگر ایک جاپانی نمائندے کی انگریزی تقریر کا ایک
اطالوی نمائندے کے لئے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ تو اس تقریر کا کیا رہ جاتا ہے۔ لیگ کو تیس کے قریب مترجم متعین کرنے پڑے جن
کی صرف تنخواہوں پر انتیس ہزار آٹھ سو پونڈ سالانہ خرچ آتے تھے۔ ان کے علاوہ درجنوں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ لکھنے والے مقرر تھے جمعیتہ
کا مقصد اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ایک ایسی زبان دنیا میں رائج نہ ہو جو کسی ملک سے تعلق نہ رکھتی ہو جو آسان ہو اور جو دقیق
سے دقیق مسئلے پر بحث کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

ایسی زبان کی ضرورت اسی وقت محسوس ہونے لگی تھی جب تحریک احیائے علوم (Renaissance) کے بعد لاطینی زبان کا انحط
ہوا تو قومی زبانوں نے زور پکڑا اور پچاس ہی سال کے عرصے میں یورپ کا ادب فلسفہ ملکی و لسانی حدود کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ لسانی اختلاف
مسئلے کا حل سب سے پہلے فرانس کے مشہور فلاسفر، موجودہ فلاسفی کے بانی ڈے کارٹ نے ۱۶۲۹ء میں پیش کیا اور اس وقت سے لیکر
تک اس میدان میں ہزاروں کوششیں ہو چکی ہیں۔ کوئی تین سو کے قریب مثالیں ابھی تک موجود ہیں مگر یہاں مجھے ان میں سب سے کامیاب
مقبول عام کا ذکر کرنا ہے جو ڈاکٹر لوئی لیزارس زمین ہاف (Dr. Louis Lazarus Zamenhof) کی سعی جم
تھی۔ ڈاکٹر موصوف ایک روسی خاندان میں پولینڈ کے بیلوسٹاک نامی شہر میں ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ وارسا میں پڑھا کرتے تھے۔
میں چار قومیں روسی۔ پول۔ یہودی اور جرمن آباد تھیں جن کی زبانیں مختلف تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں ابھی طالب علم ہی تھا جب مجھے
ہونے لگا۔ کہ یہاں انسان نہیں رہتے۔ قومیں رہتی ہیں جن کا آپس میں کچھ تعلق نہیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں وہ مختلف قسم
سوچنے لگے۔ اور آخر کار ۱۸۸۷ء میں انہوں نے ایک نئی زبان نکالی جس کے موجد کا فرضی نام ڈاکٹو روالیس پیرانتو (ڈاکٹر با

کرکے شائع کر دیا۔ اِس سے اس زبان کا نام ہی ایس پیرانتو پڑ گیا۔ زبان نہایت سادہ اور میٹھی تھی۔ یورپ کی مختلف زبانوں پر مبنی تھی جلد ہی زور پکڑ گئی۔ اُسی سال جرمنی کے نیودم برگ شہر سے "الابس پر انتستو" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا گیا۔ ۱۸۹۸ء میں فرانس میں اور ۱۹۰۴ء میں انگلستان میں ایس پیرانتو انجمنیں قائم ہو گئیں ۱۹۰۵ء میں ایک عظیم الشان بین الاقوامی ایس پیرانتو کانفرنس فرانس کے شہر بولن میں منعقد ہوئی جس میں فرانسیسی گورنمنٹ کی طرف سے ڈاکٹر زمین ہاف کو اعزازی خطابات عطا کئے گئے۔ کانفرنس نہایت کامیاب تھی مختلف اقوام کے نمائندے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار نئی زبان کے ذریعے ہر قسم کے پیچیدہ مسائل پر بحث کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مولیر کا مشہور ڈراما (La Mariage Force) ایس پیرانتو میں اسٹیج کیا گیا جس میں چھ قوموں کے شوقیہ ایکٹروں نے کام کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُنیا کے لسانی اختلافات کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اِس کے بعد ہر سال دنیا کے مختلف ممالک میں کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

پہلی۔ ۱۹۰۵ء ۔ بولن ۔ فرانس
دوسری۔ ۱۹۰۶ء ۔ جینوا ۔ سوئٹزرلینڈ
تیسری۔ ۱۹۰۷ء ۔ کیمرج ۔ انگلستان
چوتھی ۔ ۱۹۰۸ء ۔ ڈرسڈن ۔ جرمنی
پانچویں۔ ۱۹۰۹ء ۔ بارسیلونا ۔ ہسپانیہ
چھٹی۔ ۱۹۱۰ء ۔ واشنگٹن ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ
ساتویں۔ ۱۹۱۱ء ۔ انٹورپ ۔ بلجیم
آٹھویں۔ ۱۹۱۲ء ۔ کراکو ۔ پولینڈ
نویں۔ ۱۹۱۳ء ۔ جنوا ۔ اٹلی

۱۹۱۴ء کی کانفرنس پیرس میں منعقد ہونا قرار پائی۔ تحریکِ ایس پیرانتو کمال تک پہنچ چکی تھی۔ ایک سو سے زیادہ رسائل مختلف ملکوں میں جاری تھے۔ نئی زبان کے جاننے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں نمائندے شریک ہونے والے تھے۔ کئی ایک پہنچ بھی چکے تھے ڈاکٹر زمین ہاف راستے میں تھے اور اُن کے لئے شاہانہ استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ لڑائی چھڑ گئی۔ اور تمام نمائندے اپنے اپنے ملکوں کو بھاگ گئے۔

دورانِ جنگ میں مردم کشی کے علاوہ دنیا کی تمام تحریکیں بند رہیں۔ ایس پیرانتو کے رسالوں کی تعداد سو سے تیس تک آ پہنچی۔ کانفرنسوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔ ۱۴ اپریل ۱۹۱۷ء کو ڈاکٹر زمین ہاف کا بھی انتقال ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بین الاقوامی زبان کی ایک اور کوشش رائگاں گئی مگر جنگ کے بعد تحریک نے پھر سر اُٹھایا۔ رسالے تقریباً تمام پھر جاری ہو گئے کانفرنسیں بھی ہونے لگیں۔

کے دوران میں جب نولا انگلستان بھاگ گیا تو اُسے زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے نہایت کڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈنمارک کا مشہور شاعر ہرمن بینگ ۱۹۱۲ء میں امریکہ میں مرا کہا جاتا ہے کہ اس کی موت نہایت تکلیف دہ ہوئی کیونکہ وُہ اپنی معمولی ضروریات کو بھی سمجھانے کے ناقابل تھا۔

آج زبان کی واقفیت صرف بیوپاریوں۔ سائینسدانوں اور سیاحوں وغیرہ کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ ریڈیو کی ترقی کی وجہ سے ہر ایک انسان کے لئے لازمی ہوجاتی ہے۔ ہندوستان میں ہم لوگ انگریزی زبان کے اتنے عادی ہوچکے ہیں۔ گویا ہمارے لئے غیر انگریزی دنیا کا وجود تک نہیں۔ ہم دنیا کو انگریزی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر ہماری سیاسی آزادی کے ساتھ ہمارے سیاسی۔ تمدّنی تعلیمی اور اقتصادی تعلقات کے دائرہ کا وسیع ہونا لازمی ہے ہم جلد محسوس کرنے لگیں گے کہ انگریزی زبان ہماری تمام ضروریات کو پورا کرنے کے ناقابل ہے۔ کوئی قومی زبان دُنیا کی متحدہ زبان نہیں ہو سکتی پچھلی لڑائی کے بعد جب جمعیتہ الاقوام کی بنیاد پڑی تو زبان کا مسئلہ نہایت پیچیدہ تھا۔ دُنیا میں ڈیڑھ ہزار کے قریب زبانیں بولی جاتی ہیں صرف یورپ میں ایک سو بیس کے قریب زبانیں مُروج تھیں۔ فرانسیسی زبان کا سب سے زیادہ زور تھا۔ انگریزی بھی نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے مل کر امریکہ کی مدد سے لڑائی جیتی تھی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہر دو زبانیں جمعیتہ الاقوام کی زبانیں قرار دی گئیں۔ اس سے دونوں کا اختیار و اقتدار تو بڑھ گیا۔ مگر باقی قومیں کچھ منحرف سی رہیں۔ ہر معاملے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو نامناسب فائدہ رہتا تھا۔ ایسے بھی اگر ایک جاپانی نمائندے کی انگریزی تقریر کا ایک اطالوی نمائندے کے لئے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ تو اس تقریر کا کیا رہ جاتا ہے۔ لیگ کو تیس کے قریب مترجم متعین کرنے پڑے جن کی صرف تنخواہوں پر اُنتیس ہزار آٹھ سو پونڈ سالانہ خرچ آتے تھے۔ ان کے علاوہ درجنوں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ لکھنے والے مقرر تھے جمعیتہ الا کا مقصد اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک ایک ایسی زبان دنیا میں رائج نہ ہو جو کسی ملک سے تعلق نہ رکھتی ہو جو آسان ہو اور جو دقیق سے دقیق مسئلے پر بحث کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

ایسی زبان کی ضرورت اُسی وقت محسوس ہونے لگی تھی جب تحریکِ احیائے علوم (Renaissance) کے بعد لاطینی زبان کا انحطاط ہوا تو قومی زبانوں نے زور پکڑا اور پچاس ہی سال کے عرصے میں یورپ کا ادب فلسفہ ملکی و لسانی حدود کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ لسانی اختلاف کے مسئلے کا حل سب سے پہلے فرانس کے مشہور فلاسفر، موجودہ فلاسفی کے بانی ڈے کارٹ نے ۱۶۲۹ء میں پیش کیا اور اس وقت سے لیکر آج تک اس میدان میں ہزاروں کوششیں ہوچکی ہیں۔ کوئی تین سو کے قریب مثالیں ابھی تک موجود ہیں مگر یہاں مجھے ان میں سب سے کامیاب اور مقبولِ عام کا ذکر کرنا ہے جو ڈاکٹر لوئی لیزارس زمین ہاف (Dr. Louis Lazarus Zamenhof) کی سعیِ جمیلہ کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر موصوف ایک روسی خاندان میں پولینڈ کے بیلوسٹاک نامی شہر میں ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ وارسا میں پڑھا کرتے تھے۔ وارسہ میں چار قومیں روسی۔ پول۔ یہودی اور جرمن آباد تھیں جن کی زبانیں مختلف تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں ابھی طالب علم ہی تھا جب مجھے محسوس ہونے لگا۔ کہ یہاں انسان نہیں رہتے۔ قومیں رہتی ہیں جن کا آپس میں کچھ تعلق نہیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں وُہ مختلف قسم کی تجاویز سوچنے لگے۔ اور آخر کار ۱۸۸۷ء میں اُنہوں نے ایک نئی زبان نکالی جس کے موجد کا فرضی نام ڈاکٹو رو ایس پیرانتو (ڈاکٹر با اُمید)

کر اُسے شائع کر دیا۔ اس سے اس زبان کا نام ہی ایس پیرانتو پڑ گیا۔ زبان نہایت سادہ اور میٹھی تھی۔ یورپ کی مختلف زبانوں پر مبنی تھی جلد ہی زور پکڑ گئی۔ اُسی سال جرمنی کے نیورم برگ شہر سے "الا ایس پرانتستو" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا گیا۔ ۱۸۹۸ء میں فرانس میں اور ۱۹۰۴ء میں انگلستان میں ایس پیرانتو انجمنیں قائم ہوگئیں ۱۹۰۵ء میں ایک عظیم الشان بین الاقوامی ایس پیرانتو کانفرنس فرانس کے شہر بولن میں منعقد ہوئی جس میں فرانسیسی گورنمنٹ کی طرف سے ڈاکٹر زمین ہاف کو اعزازی خطابات عطا کئے گئے۔ کانفرنس نہایت کامیاب تھی مختلف اقوام کے نمائندے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار نئی زبان کے ذریعے ہر قسم کے پیچیدہ مسائل پر بحث کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مولیر کا مشہور ڈراما (La Mariage Force) ایس پیرانتو میں اسٹیج کیا گیا جس میں چھ قوموں کے شوقیہ ایکٹروں نے کام کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُنیا کے لسانی اختلافات کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ اس کے بعد ہر سال دنیا کے مختلف ممالک میں کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

پہلی۔ ۱۹۰۵ء۔ بولن۔ فرانس

دوسری۔ ۱۹۰۶ء۔ جینوا۔ سوئٹزرلینڈ

تیسری۔ ۱۹۰۷ء۔ کیمرج۔ انگلستان

چوتھی۔ ۱۹۰۸ء۔ ڈریسڈن۔ جرمنی

پانچویں۔ ۱۹۰۹ء۔ بارسیلونا۔ ہسپانیہ

چھٹی۔ ۱۹۱۰ء۔ واشنگٹن۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ

ساتویں۔ ۱۹۱۱ء۔ انٹورپ۔ بلجیم

آٹھویں۔ ۱۹۱۲ء۔ کراکو۔ پولینڈ

نویں۔ ۱۹۱۳ء۔ جنوا۔ اٹلی

۱۹۱۴ء کی کانفرنس پیرس میں منعقد ہونا قرار پائی۔ تحریکِ ایس پیرانتو کمال تک پہنچ چکی تھی۔ ایک سو سے زیادہ رسائل مختلف ملکوں میں جاری تھے۔ نئی زبان کے جاننے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں نمائندے شریک ہونے والے تھے۔ کئی ایک پہنچ بھی چکے تھے ڈاکٹر زمین ہاف راستے میں تھے اور اُن کے لئے شاہانہ استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ لڑائی چھڑ گئی اور تمام نمائندے اپنے اپنے ملکوں کو بھاگ گئے۔

دورانِ جنگ میں مردم کشی کے علاوہ دنیا کی تمام تحریکیں بند رہیں۔ ایس پیرانتو کے رسالوں کی تعداد سو سے تیس تک آ پہنچی۔ کانفرنسوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔ ۱۴ اپریل ۱۹۱۷ء کو ڈاکٹر زمین ہاف کا بھی انتقال ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بین الاقوامی زبان کی ایک اور کوشش رائگاں گئی مگر جنگ کے بعد تحریک نے پھر سر اُٹھایا۔ رسالے تقریباً تمام پھر جاری ہو گئے کانفرنسیں بھی ہونے لگیں۔

۱۹۲۲ء میں جو کانفرنس پراگ میں منعقد ہوئی اس میں دو ہزار تین سو کے قریب ڈیلیگیٹ دور دراز ملکوں سے شریک ہوئے۔ انجمنیں پھر قائم ہو گئیں۔ ۱۹۲۹ء میں صرف یورپ کے پندرہ ملکوں میں ۶۲ مقاموں سے ایس پیرانتو میں براڈکاسٹ ہونے لگا۔ ریڈ کراس سوسائٹی اور روٹری سرکل کی مرکزی انجمنوں نے اس کی حمایت کی۔ لارڈ بیڈن پاول نے سکاؤٹ اور گائیڈ انجمنوں سے سفارش کی کہ وہ بین الاقوامی ضرورت کے لئے نئی زبان کا استعمال کیا کریں۔ انگلستان میں پچاس سے اوپر تجارتی انجمنوں نے اس کے حق میں تجاویز پاس کیں۔ فرانس کی ۱۱۲ انجمنوں کے صدر نے اس کی پُرزور سفارش کی۔ آج کل (یعنی موجودہ جنگ کے شروع ہونے سے پہلے) اس کا استعمال غیر ممالک کی تجارتی کمپنیوں میں بڑھ رہا ہے۔ بیس کے قریب شارٹ ہینڈ کے طریقے نکل چکے ہیں۔ انگلستان، جرمنی، فرانس، سوئٹزرلینڈ، پولینڈ، روس، ریاستہائے متحدہ امریکہ جاپان وغیرہ میں سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے اور باقاعدہ ڈپلومے وغیرہ بھی دیئے جاتے ہیں۔

ایس پیرانتو کے حق میں سب سے زیادہ زبردست دلیل یہ ہے کہ اس نے عملی معاملات کے میدان میں کئی مشکلات کا حل کر دیا ہے۔ جن بین الاقوامی جلسوں میں ایس پیرانتو کا استعمال نہیں کیا جاتا اُن کا نقشہ ہی عجیب ہوتا ہے۔ کوئی دوسرے کی بات کو نہیں سمجھتا۔ جب جرمن زبان میں تقریر ہوتی ہے تو غیر جرمن نمائندے سو جاتے ہیں۔ جب اطالوی زبان بولی جاتی ہے تو غیر اطالوی ڈیلیگیٹ اونگھنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی ایک جلسے کا حال یوں بیان کیا جاتا ہے "اٹلی کا ایک نمائندہ فرانسیسی زبان میں ایک دستاویز پڑھ رہا تھا، مگر طرزِ ادا عجیب تھی۔ فرانسیسی نمائندے بھی اُسے نہ سمجھ سکے۔" ایک اور جلسے کی بابت ایک انگریز نمائندے کا بیان ہے "ہر ایک آدمی انگریزی بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند کو کامیابی ہوئی۔ میں کئی جاپانیوں جرمنوں اور روسیوں کی انگریزی نہ سمجھ سکا۔" بیسیوں شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ لسانی اختلاف کی وجہ سے تمام بین الاقوامی علمی، ادبی، اقتصادی، سیاسی، تمدنی، تاریخی، تحقیقی، منطقی یا مذہبی کانفرنسیں مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں۔ اِن کے برعکس کسی ایک ایس پیرانتو کانفرنس کا حال پڑھئے تو حیرت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کلارک صاحب لکھتے ہیں "میرے دل میں ولولے اُٹھتے تھے۔ جب میں دیکھتا تھا کہ ہال کے ہر ایک کونے سے مختلف ممالک کے نمائندے اُٹھتے تھے اور دقیق سے دقیق مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ہر روز مباحثے، تقریریں، سائنس کے مختلف صیغوں کے جلسے ہوتے تھے زبان فہمی میں رتی بھر تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لسانی مشکلات کا خاتمہ ہو گیا ہے۔" ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ میں ایس پیرانتو کانفرنس کو بابل کا مینار تصور کرتا ہوں جس میں لسانی اختلافات سدِ راہ نہیں ہیں۔ یہ ایک ہفتہ کا خواب تھا جسے میں ہمیشہ مسرت کے ساتھ یاد کیا کروں گا۔" میں خود ۱۹۳۶ء میں لنڈن میں ایس پیرانتو کی تیسویں کانفرنس میں شریک ہوا۔ دُنیا کے ہر حصے سے ہزاروں کی تعداد میں نمائندے آئے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ کے لئے اپنی اپنی مادری زبان کو بھول کر ایس پیرانتو ہی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ چونکہ ایس پیرانتو کا تلفظ اور لب و لہجہ ایک ہی ہے۔ اس واسطے روسی، اطالوی اور جاپانی نمائندے ایک دوسرے کی بات بخوبی سمجھتے تھے۔ علمی، تمدنی، منطقی اور سائنٹیفک ہر قسم کے معاملات پر غور و خوض ہوتا رہا۔ ہر قسم کے خیالات آسانی کے ساتھ ظاہر کئے گئے۔ ناچ دعوتیں وغیرہ بھی ہوتی رہیں جن میں ایس پیرانتو کے علاوہ ہر زبان ممنوع تھی۔ ایس پیرانتو میں ایک ڈراما اور ایک فلم بھی دکھائی گئی۔ تفریح کے لئے مختلف مقامات کی سیر کا انتظام کیا گیا۔ گاور سٹریٹ کے نزدیک دکانداروں نے کام چلانے کے لئے ہفتے دو ہفتے میں کچھ ایس پیرانتو سیکھ لی۔ ایس پیرانتو

پولیس تعینات کی گئی۔ ایس پیرانتو ڈاکخانے کھول دئے گئے۔ کئی اخباروں کے پوسٹر بھی ایس پیرانتو میں نکلے۔ یہ اصلی معنوں میں بین الاقوامی جلسہ تھا جہاں کم از کم ایک ہفتہ کے لئے تمام لوگ رنگ و رسم۔ قوم و زبان کے اختلاف کو بھول گئے اور گو وہ کانفرنس موجودہ جنگ کو روکنے کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ تاہم اس نے مستقبل کے امن کا راستہ دکھا دیا۔

ایس پیرانتو نہایت سادہ اور آسان زبان ہے۔ اس کے حروف کے تلفظ اور لہجے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ یعنی جو شخص ایس پیرانتو قطعی نہیں جانتا۔ وہ بھی اسے ٹھیک پڑھ سکتا ہے۔ قواعد کے صرف سولہ اصول ہیں۔ جو ہمایوں کے ایک صفحے پر چھاپے جا سکتے ہیں۔ اور جو استثنا سے بالکل بری ہیں۔ یعنی مذکر سے مونث بنانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ اور اگر وہ طریقہ ایک فقرہ میں لکھ دیا جائے۔ تو تذکیر و تانیث کا مکمل باب ختم ہو جاتا ہے۔ نیز اگر باپ، بھائی، شوہر کے لئے الفاظ ہوں تو اُن کی تانیث ظاہر کرنے کے لئے دوسرے الفاظ یعنی ماں، بہن، بیوی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اُسی طریقے سے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کام کرنے کے لئے ایک لفظ ہے تو محنت کرنا، مشقت کرنا، مزدوری کرنا، کاروبار کرنا، روزی کمانا، تعاون کرنا، سستی کرنا، محنتی آدمی، سست آدمی، قیدِ مشقت، کارخانہ وغیرہ سب اُسی لفظ سے بنتے ہیں۔ چند نہایت سادہ طریقے ہیں جن کی رو سے ہر قسم کا لفظ ہر قسم کے معنوں کے لئے بنایا جا سکتا ہے اس سے زبان نہایت مختصر بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر زمین ہاف کے لغت میں صرف دو ہزار پانچ سو اسی الفاظ ہیں۔ اکیلے شیکسپئیر نے تقریباً پچیس ہزار الفاظ کا اور ملٹن نے آٹھ ہزار الفاظ کا استعمال کیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایس پیرانتو اظہارِ خیالات میں ناقص ہے۔ انگریزی ادب میں خیالات یا احساسات کے تعمق کے لحاظ سے ہیملٹ سے کوئی بلند تر کتاب نہیں ہیملیٹ کا ترجمہ خود ڈاکٹر زمین ہاف نے نہایت فصاحت سے کیا ہے جو کئی بار کامیابی کے ساتھ اسٹیج ہو چکا ہے۔ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ چونکہ ایس پیرانتو ایک نیا دتی زبان ہے اور اس کا ہر ایک لفظ جانچ تول کر بنایا جاتا ہے، اس واسطے ترجمہ کرنے میں کئی الفاظ یا فقرے جو اصل زبان میں مبہم یا مذبذب ہوتے ہیں صاف ہو جاتے ہیں۔ اس وقت دُنیا کے بہترین اصنافِ ادب کا ترجمہ ایس پیرانتو میں ہو چکا ہے ہومر، ورجل، دانتے، شیکسپیر، راسیس، مولیئر، گوئٹے، ٹالسٹائی، پشکن اور درجنوں اور نامور ادباء کی تصانیف ایس پیرانتو میں ملتی ہیں۔ بائبل کا ترجمہ بھی مکمل ہے۔ اس کے علاوہ نثر و نظم میں کافی بلند پایہ ابتدائی لٹریچر بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔ پچاس سال کی زبان سے بہت توقع تو نہیں کی جا سکتی۔ مگر اس قلیل عرصے میں سینکڑوں کتابیں ہر قسم کے مضامین پر لکھی جا چکی ہیں۔ یہ نئی قسم کا لٹریچر ہے جو قومی تعصب سے دور، مذہبی تفرقات سے بالاتر، فرقہ وارانہ آلودگیوں سے پاک اور سیاسی اور اقتصادی کشمکش سے پرے، نہایت وسیع معنوں میں بین الاقوامی درجہ رکھتا ہے۔ آدمیت اور انسانیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ انسانی فراخدلی کا عکس ہے اور انسانی احساسات کا نچوڑ۔ ایس پیرانتو صرف بین الاقوامی زبان ہی نہیں ہے یہ ایک اصول ہے ایک عقیدہ ہے۔ ایک ضابطۂ حیات ہے جو نسلی اور لسانی امتیاز کو مٹا کر، مذہبی اور سیاسی تنگدلی سے نکال کر انسان کو اصلی معنوں میں انسان بناتا ہے۔ آج دُنیا شخصی اور قومی حرص کا شکار بنی خونریزی اور مردم کشی میں غرق ہے۔ جلد ہی اہلِ مغرب ہوش میں آئیں گے۔ امن پھر قائم ہوگا۔ اور امن قائم ہونے کے ساتھ امن کو پائدار بنانے کی خواہش بھی پیدا ہوگی۔ اس وقت ان تمام امور میں جو امن کو پائدار بنانے میں ممد ہونگے۔ بین الاقوامی زبان کا درجہ نہایت اُونچا ہوگا۔ جو ان گمراہ یا گمراہ کردہ قوموں کو ایک دوسرے کا نقطۂ نگاہ سمجھائیگی۔ دنیا میں یگانگی پیدا کرے گی۔ اخوت کا مذہب پھیلے گا۔ خدا وہ دن جلد لائے۔

ایش کمار

اُسی جگہ میری راہ تکنا!

جہاں سپہرِ بریں بھی جھک کر زمیں کی پیشانی چومتا ہے
جہاں صنوبر کا دُھندلا سایہ چمن کے سبزے پہ جھومتا ہے
اُسی جگہ میری راہ تکنا!
اُسی جگہ میری راہ تکنا!

جہاں کے چشموں کے پانیوں کو بہاریں آ آ کے چومتی ہیں
جہاں سرور آفریں ہوائیں حسین پھولوں میں گھومتی ہیں
اُسی جگہ میری راہ تکنا!
اُسی جگہ میری راہ تکنا!

جہاں کی صبحِ حسیں کے رُخ سے سیاہ آنچل ہٹا ہوا ہے
جہاں کی شبنم کے موتیوں کو ستارۂ صبح تک رہا ہے
اُسی جگہ میری راہ تکنا!
اُسی جگہ میری راہ تکنا!

اُن آبشاروں کے پاس تُم کو وفا کے نغمے سناؤں گی میں
تمہارے بازو پہ سر کو رکھ کر خوشی کے آنسو بہاؤں گی میں
اُسی جگہ میری راہ تکنا!
اُسی جگہ میری راہ تکنا!

میں توڑ کر سازِ زندگی کو تمہاری ہی سمت آ رہی ہوں
میں ہو کے آزاد بندِ غم سے خوشی کے پیغام لا رہی ہوں
اُسی جگہ میری راہ تکنا!
اُسی جگہ میری راہ تکنا!

نجمی رحمت اللہ بی۔اے
از ڈلہوزی

معقولیت ناممکن نہیں

میں ایک معقولیت پسند ہوں اور چاہتا ہوں کہ میری طرح سب معقولیت پسند ہو جائیں مگر معقولیت پسندی کا حال ان دنوں بہت پتلا ہے۔ اس پر ہر طرف سے جان لیوا حملے ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں پہلے تو یہ جاننا ہی دشوار ہے کہ معقولیت پسندی سے مراد کیا ہے؟ اور یہ معلوم ہو بھی جائے تو دریافت طلب یہ ہے کہ آیا وہ قابل حصول بھی ہے؟ معقولیت پسندی کے پہلو دو ہیں ۱۔ نظری اور ۲۔ عملی معقول رائے کیا ہے؟ اور معقول عمل کیا ہے؟ نتائجیت رائے کی غیر عقلیت پسندی پر زور دیتی ہے اور تحلیل نفسی عمل کی غیر عقلیت پسندی پر۔ بنابریں بہت لوگ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ معقولیت کا کوئی معیار ہی نہیں جس کی مطابقت فکر اور عمل میں کی جائے نتیجہ یہ کہ مجھ میں اور آپ میں اگر کسی بات پر اختلاف رائے ہو تو دلیل یا کسی غیر جانبدار ثالث سے رجوع کرنا بیکار ہے بلکہ ہمارے لئے واحد کھلا راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی مالی قوت اور فوجی اسپرٹ کے موافق پروپیگنڈا اور جنگ سے کام لیں۔ یہ ایک خطرناک نظریہ ہے اور آخر میں تہذیب وتمدن کے لئے مہلک۔ لہٰذا میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ معقولیت کا معیار ان خیالات سے جو اس کے لئے مہلک باور کئے جاتے ہیں قطعاً متاثر نہیں ہوتا اور یہ کہ وہ فکر اور عمل کی رہبری کے لئے آج بھی اتنا ہی اہم اور ضروری ہے جتنا کہ پہلے تھا۔

فکر و نظر کی معقولیت سے مراد یہ ہے کہ کسی رائے کے قائم کرنے سے پہلے جملہ متعلق شہادت پر پوری طرح توجہ کی جائے جہاں تیقن کا حصول ناممکن ہوتا ہے وہاں ایک معقولیت پسند انسان سب سے زیادہ اغلب رائے کو سب سے زیادہ وزنی قرار دیتا ہے اور دوسری رایوں کو جو نمایاں طور پر ممکن ہوتی ہیں مفروضات کی حیثیت میں قائم رکھتا اور بعد میں شہادت سے اگر ان کی تائید ہو تو انہیں ترجیح دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم اکثر بیشتر واقعات اور امکانات کو معروضی اسلوب کے ذریعے سے دریافت کر سکتے ہیں — ایک ایسے اسلوب کے ذریعے سے دریافت کر سکتے ہیں جو دو مختلط اشخاص کو ایک ہی نتیجے پر پہنچا سکتا ہے اس چیز کو عموماً محل نظر خیال کیا جاتا ہے۔ بہتیرے اشخاص کہتے ہیں کہ عقل کا واحد عمل یہ ہے کہ وہ فرد کی خواہشات اور ضروریات کی تسکین اور تکمیل میں سہولت بہم پہنچائے The Plebs Textbooks Committee نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے Outline of Psychology اس کے مصنفین لکھتے ہیں کہ عقل پاسداری کا آلہ ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ جو افعال فرد یا نوع کیلئے مفید ہوں وہ انجام پائیں اور جو کم مفید ہوں وہ روک دیے جائیں" (ص ۶۸)

لیکن یہی اہل قلم اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ مارکس کے پیرو کا عقیدہ مذہبی عقیدے سے بین اختلاف رکھتا ہے مؤخر الذکر خواہش اور رعایت پر مبنی ہے اور اول الذکر معروضی حقیقت کی اصولی تحلیل پر" (ص ۱۲۳) اور ان کا یہ خیال عقل کے متعلق ان کے مذکورہ بالا خیال سے قطعی بے میل ہے الا اگر ان کا مطلب یہ ہو کہ مارکسی عقیدے کی قبولیت عقل پر مبنی نہیں بہر حال چونکہ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ معروضی حقیقت کی اصولی تحلیل"، ممکن ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ ایسی رائیں قائم کی جا سکتی ہیں جو معروضی مفہوم میں معقول ہوں۔

غیر عقلیت پسندی کے زیادہ قابل حامیوں مثلاً نتائجی فلسفیوں کی گرفت اتنی سستی اتنی آسان نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ معروضی واقعے جیسی کوئی چیز موجود ہی نہیں جس کی مطابقت ہماری رایوں کی صحت اور صداقت کا معیار ہو۔ ان فلسفیوں کے نزدیک رائیں تنازع للبقاء کے آلات ہیں۔ لہٰذا جو رائیں بقا میں مدد دیتی ہیں وہ سچی ہیں۔ یہ نظریہ جاپان میں چھٹی صدی عیسوی میں رائج تھا۔ اس زمانہ میں بدھ مت پہلی مرتبہ اس سرزمین

پر وارد ہوا۔ حکومتِ وقت کو اس نئے مذہب کی صداقت پر کچھ شبہ تھا لہٰذا اس نے اپنے ایک درباری کو حکم دیا کہ وہ اس مذہب کو تجربۃً اختیار کرے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ وہ اسے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مرفہ الحال بناتا ہے یا نہیں۔ نتیجہ اگر خاطر خواہ برآمد ہو تو سمجھا جائے گا کہ مذہب سچا ہے اور پھر اسے عام طور سے قبول کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ یہی وہ اسلوب ہے جسے موجودہ زمانے میں نتائجیین کچھ ضروری ترمیم کے ساتھ جملہ مذہبی مباحث میں استعمال کرتے ہیں بایں ہمہ آج تک کسی نے بھی یہودی مذہب اختیار نہیں کیا حالانکہ وہ اور مذاہب کے مقابلے میں انسان کو بہت جلد ایک کامیاب مہاجن بنا دیتا ہے۔

لیکن نتائجی فلسفی "حق" کے بارے میں ایک بالکل انوکھا خیال رکھنے پر بھی روزمرہ کے عملی معاملات میں اپنے مسلّمہ معیار کو نہیں برتتا۔ بلکہ ایک قطعاً جداگانہ معیار استعمال کرتا ہے۔ قتل کے کسی مقدمہ میں اگر ہمارا نتائجی دستِ جیوری میں شامل ہو تو وہ شہادت کو اسی طرح ضروری سمجھے گا اور جانچے گا جیسا کہ اس کا کوئی غیر نتائجی ساتھی کرتا ہے حالانکہ اگر وہ اپنے فلسفہ کی پوری پوری پابندی کرے تو اسے سوچنا چاہئے کہ آبادی میں کس کو پھانسی دینا زیادہ مفید ہوگا۔ اور بنابریں زیادہ سچا ہوگا۔ بعض اوقات ایسی نتائجیت وقوع میں آتی ہے۔ امریکہ اور روس میں بہتیری خفیہ سازشوں کو اسی طرح کچلا گیا ہے مگر ایسی صورتوں میں اخفا کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ ورنہ رسوائی کا ڈر ہوتا ہے۔ اخفا کی یہ کوششیں بتلاتی ہیں کہ پولیس کو بھی معروضی حق کا یقین ہوتا ہے۔ اسی قسم کے معروضی حق کو سائنس میں تلاش کیا جاتا ہے اور مذہب میں بھی جہاں تک کہ اس کے ہاتھ آنے کی توقع ہوتی ہے جب ایک سیدھے سادے مفہوم میں مذہب کو سچا ثابت نہیں کیا جا سکتا تبھی یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ ایک نو ایجاد مفہوم میں سچا ہے۔ غیر عقلیت پسندی یعنی معروضی واقعے کی بے اعتباری عموماً یا تو کسی ایسی چیز کا دعویٰ کرنے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے جس کیلئے کوئی شہادت موجود نہیں یا پھر کسی ایسی چیز کا انکار کرنے کی خواہش سے جس کیلئے بڑی اچھی شہادت موجود ہے لیکن معروضی واقعے کا یقین عملی معاملات میں یکساں قائم رہتا ہے مثلاً ملازم کے رکھنے میں یا کسی کام میں روپیہ کے لگانے میں اور اگر واقعہ ہمارے یقینیات کا معیار ہے تو اسے ہر جگہ معیار ہونا چاہئے۔ اب رہیں ایسی صورتیں جہاں اس کا انطباق نہیں ہوتا وہاں لاادریت پر عمل ہونا چاہئے۔

اوپر کی بحث اپنے مقصد کے لئے غالباً ناکافی ہے۔ واقعہ کی معروضیت کا مبحث فلسفیوں کی بدحواسیوں سے بے حد پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ سے تفصیلی بحث کا یہ کوئی محل نہیں۔ مگر یہ بے خطر فرض کیا جا سکتا ہے کہ واقعات ہیں۔ ان میں سے بعض کا علم ہو سکتا ہے اور بقیہ کے متعلق ان قابلِ علم واقعات کے لحاظ سے امکان کا پتہ لگایا جا سکتا ہے لیکن ہمارے یقینیات اکثر خلافِ واقعہ ہوتے ہیں لہٰذا فکر و نظر کی معقولیت عبارت ہے امورِ واقعہ کے متعلق یقینیات کو خواہشات، تعصبات اور روایات پر نہیں بلکہ شہادت پر مبنی ٹھہرانے سے۔

بعضوں کا خیال ہے کہ تحلیلِ نفسی نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم اپنی رایوں میں معقول نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بیشتر اشخاص میں ان کا سرچشمہ عجیب اور مجنونانہ ہوتا ہے۔ میں تحلیلِ نفسی کا بڑا معتقد ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ انسانیت کی بہت اہم خدمت انجام دے سکتی ہے مگر عام طور پر اس کے اصلی مقصد و منشاء کو کسی قدر بھلا دیا گیا ہے۔ فرائڈ اور اس کے پیروؤں کی جدید نفسیات ہسٹیریا اور جنون کی مختلف قسموں کا ایک طریقہ علاج ہے وہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں لڑائی کے عصبی فسادوں کا ایک مؤثر ترین علاج ثابت ہوئی ریواز کی مشہور کتاب Instinct and the unconscious گولہ باری کے ان صدموں سے بحث کرتی ہے جو دماغ یا گویائی کو پہنچے۔ اس میں خوف کے فاسد اثرات کی بڑی اچھی تحلیل کی گئی ہے۔ بتلایا گیا ہے کہ جب خوف کے تہیج کی سیدھے صاف طور سے تکمیل نہیں ہوتی نہیں ہو سکتی تو اسی کے اثرات فساد انگیز بن جاتے ہیں۔ وہ بڑی حد تک غیر عقلی ہوتے ہیں اور مختلف اقسام کے فالجوں اور جسمانی تکلیفوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ فی الوقت ہمیں ان سے

سے بحث نہیں بحث دراصل ہمیں عقلی اختلافوں سے ہے اور ان کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ مجنونوں کے بہتیرے توہمات جبلی مزاحمتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کا علاج ذہنی طریقوں سے ہو سکتا اور کیا جاتا ہے یعنی مریضوں کو وہ تمام واقعات یاد دلائے جاتے ہیں جنہیں انہوں نے دبا یا بھلا دیا ہے۔ اس طرح یہ طریقۂ علاج اور وُہ نظریہ جس پر یہ طریقۂ علاج مبنی ہے دونوں دماغی صحت کے ایک معیار کے قائل ہیں مریض ان کے نزدیک اسی معیار سے جدا ہو جاتا ہے اور وُہ اُسے اسی معیار پر واپس لاتے ہیں۔ یہ تو اس غیر عقلیت پسندی کا عکس ہے جس کا بعض لوگ ڈھنڈورا پیٹتے ہیں مگر یہ حضرت صرف یہی جانتے ہیں کہ تحلیل نفسی بتلاتی ہے کہ غیر عقلی یقینیات عام ہیں یعنی انہیں یہ نہیں معلوم یا وُہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تحلیل نفسی ایک خاص طریقۂ علاج کے ذریعے اِس پھیلاؤ کو کم کرنا چاہتی ہے۔ اسی سے ملتا جلتا ایک طریقۂ علاج ان اشخاص کی نامعقولیتوں کو دور کر سکتا ہے جو مسلّمہ مجنون نہیں۔ مثلاً آمری ممالک کے مختارِ مطلق، جمہوریتوں کے صدر، پارلیمانی حکومتوں کے وزرائے کابینہ، سلطنتوں کے فرمانروا، سیاسی جماعتوں کے قائد اور مشاہیر۔ مگر شرط یہ ہے کہ وُہ علاج کے لئے خود کو ایسے معالجوں کے پاس پیش کریں جو ان کے توہمات سے پاک ہوں۔ اس شرط کی بہت کم تکمیل ہوتی ہے اور یہ خطرناک دیوانے سدا لاعلاج رہتے ہیں۔

یہاں تک تو معقولیت پسندی کے نظری پہلو سے بحث تھی۔ اب عملی پہلو کو لیجئے جو نسبتاً زیادہ دقیق اور دشوار ہے۔ عملی معاملات میں اختلاف رائے عموماً پیدا ہوتا ہے ایک تو اشخاص کی خواہشوں کے اختلاف سے اور دوسرے ان خواہشوں کے ذرائع تکمیل کی تجویزوں کے اختلاف سے آخری قسم کے اختلاف حقیقتاً نظری ہیں۔ آج کل جنگ ہو رہی ہے فرض کیجئے کہ کسی متحارب فریق کے بعض عہدہ دار یہ کہتے ہیں کہ ان کا پہلا خطِ دفاع جنگی جہازوں پر مشتمل ہونا چاہئے اور دوسرے کہتے ہیں کہ نہیں وُہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں پر مشتمل ہونا چاہئے۔ یہاں مجوزہ مقصد یعنی قومی یا وطنی دفاع کے متعلق کوئی اختلاف نہیں اختلاف ہے صرف ذرائع تکمیل کے متعلق ایسی صورت میں اصولی طریقہ پر استدلال کیا جا سکتا ہے کیونکہ اختلاف واقعات سے تعلق رکھتا ہے ایسی تمام مثالوں پر معقولیت پسندی کی نظری قسم منطبق ہوتی ہے۔

لیکن اس قسم کی متعدد تطبیقوں میں ایک نہایت اہم عملی دقت رونما ہوتی ہے ایک شخص ایک خاص طریقے پر کام کرنا چاہتا ہے۔ اور خود کو یہ باور کراتا ہے کہ وُہ اس طرح کام کر کے ایک پسندیدہ مقصد کی تکمیل کر رہا ہے حالانکہ وُہ اگر ایسا نہ چاہے تو پھر اس یقین کی کوئی بنیاد نہیں رہتی۔ وُہ امورِ واقعہ اور احتمالات کے متعلق اس شخص سے جو بالکل مختلف خواہشات رکھتا ہے بالکل مختلف رائیں قائم کرتا ہے جواری ان اصولوں کے متعلق جو آخر میں کامیابی کے ضامن سمجھتے ہیں انتہائی غیر عقلی یقینیات رکھتے ہیں۔ سیاسیات سے شغف رکھنے والے یہ باور کرتے ہیں کہ ان کی جماعت کے قائد کبھی دیانتداریں اور کبھی ان فریب کاریوں کے مرتکب نہیں ہو سکتے جو مخالف سیاستدانوں کا طغرائے امتیاز ہیں۔ اربابِ نظم و نسق یہ خیال کرتے ہیں کہ رعایا کے ساتھ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کا سا سلوک نہایت موزوں ہے تمباکو کی لت رکھنے والے سمجھتے اور سمجھانا چاہتے ہیں کہ وُہ اعصاب کو سکون عطا کرتا ہے اور شراب کے دلدادہ یہ فرماتے ہیں کہ اس سے عقل و فہم میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح جو تعصب پیدا ہوتا ہے وہ واقعات کے متعلق افراد کی رایوں کو بگاڑ دیتا ہے اور کچھ اس طرح بگاڑ دیتا ہے کہ اس کا ادراک اور اس سے اجتناب مشکل ہے۔ اعصاب پر شراب کے اثرات کی نسبت ایک عالمانہ مقالہ بھی فوراً یہ ظاہر کر دے گا کہ مصنف تارکِ مسکرات ہے یا نہیں۔ ہر صورت میں وُہ واقعات کو اس زاویۂ نظر سے دیکھے گا جو اس کے اپنے عمل کا پیدا کردہ اور اس سے ہم آہنگ ہے۔ سیاسیات اور مذہب میں ایسے امور نہایت اہم ہو جاتے ہیں بہتوں کا خیال ہوتا ہے کہ وُہ سیاسی رایوں کے قائم کرنے میں فلاحِ عامہ کے جذبۂ بلند سے متحرک ہوئے ہیں درآں حالیکہ سو میں سے ننانوے انسانوں کی سیاست ان

کے طرزِ معیشت و معاشرت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس پر سے بعض یہ دعویٰ اور بنیر عملاً یہ یقین کرنے لگے ہیں کہ ایسے معاملات میں واقعیت پسند ہونا محال ہے اور یہ کہ
مُعارض جذبات کے طبقوں میں رسّاکشی کے سوا اور کوئی طریقِ استدلال ممکن یا مستحسن نہیں۔

لیکن انھیں معاملات میں تحلیلِ نفسی خصوصیت سے مفید ہے کیونکہ وُہ ہمیں اپنے غیر شعوری تعصبات اور رجحانات سے آگاہ کرتی ہے اور ایک ایسی فنّی قابلیت
ہم میں پیدا کرتی ہے جس کی بدولت ہم خود کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اپنے متعلق ہماری یہ رائے بہت کم غیر منصفانہ ہوتی ہے سائنٹفک ذہنیت
اس فنی قابلیت دونوں کے ملنے سے انسانوں میں امورِ متنازعہ اور کسی مجوّزہ فعل کے ممکن اثر کی نسبت موجودہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ معقولیت پسندی پیدا
جائے گی اور جب وُہ ایسے معاملات میں مختلف الرائے نہ ہوں گے تو جو اختلافات باقی رہ جائیں گے ان میں دوستانہ مطابقت آسانی سے پیدا کی جا سکے گی
پھر بھی ایک جزو ایسا باقی رہ جاتا ہے جو عقلی استدلال کو قبول نہیں کرتا۔ ایک فرد کی خواہشات دوسرے کی خواہشات سے میل نہیں کھاتیں ہر شخص چاہتا ہے کہ دا
کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ میں رہے عملی معاملات میں اختلافِ رائے کا یہ سب سے بڑا اور اہم سرچشمہ ہے لیکن معقولیت پسندی یہاں بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ وُ
نقصان کی وسعت اور شدت کو ممکن حد تک کم کر دیتی ہے۔ ہم غیر عقلیت پسند اُس آدمی کو کہیں گے جو کسی خاص جذبہ کے تحت کام کرتا ہے وُہ نا معقول ہے اس لئے
یہ بھول جاتا ہے کہ کسی وقتی شدید خواہش کی تکمیل میں اسے اپنی دوسری خواہشوں کو دبانا ہوگا جو ممکن ہے آگے چلکر اس کے لئے زیادہ اہم اور قیمتی ثابت ہوں۔ اگر تمام
انسان معقولیت پسند ہوتے تو اپنی اغراض کا وُہ موجودہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ صحیح اندازہ کرتے۔ اگر وُہ روشن خیال خود غرضی سے کام کرتے تو دُنیا بہشت ہوتی جس
افراد عمرانی تعلقات کو قائم اور برقرار رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو کم سے کم آزار پہنچاتے۔ ہر چند عمل کے لئے خود غرضی کوئی اعلیٰ محرک نہیں لیکن اگر وہ روشن خیالا
تو ایثار اور بے نفسی کی طرح محمود اور مستحسن ہے کسی منظّم جماعت میں کوئی فرد ایسا کام نہیں کریگا جو دوسروں کے لئے بہت زیادہ نقصان رساں ہو۔ ایک نامعقو
شخص ہی یہ ادراک نہیں کر سکتا کہ وُہ چیزیں جو دوسروں کو نقصان پہنچاتی ہیں خود اُسے بھی نقصان پہنچاتی ہیں کیونکہ نفرت اور حسد اس کی عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں لہذا روشن
خود غرضی اگرچہ اخلاق کا کوئی اعلیٰ معیار نہیں تاہم کم سے کم اگر وہی عام ہو جائے تو ہماری یہ دنیا جو آجکل زندوں کا دوزخ بنی ہوئی ہے واقعی دار السلام بن جائے۔

کردار اور عمل کی معقولیت سے مراد یہ ہے کہ ہم کسی فوری خواہش کے زیر اثر کام نہ کریں بلکہ پہلے اپنی جملہ متعلق خواہشات کا جائزہ لیں اور ان کی طرف
ہوں۔ فکر و نظر کی معقولیت کی مانند کردار و عمل کی معقولیت بھی درجہ کی چیز ہے مکمل معقولیت ایک ناممکن الحصول نصب العین ہے لیکن پاگل خانے اور جیل
بہ اصرار یہ بتلاتے ہیں کہ ہم میں سے بعض دوسروں سے زیادہ معقول ہیں۔ دنیا کی ترقی کا راز صرف معقولیت پسندی کی اشاعت اور توسیع میں مضمر ہے
کے اخلاق کی تلقین محض بے سود ہے۔ وہ صرف اُن اشخاص سے اپیل کر سکے گی جو پہلے سے ایثاری جذبات رکھتے ہیں اور ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا جو ایسی خصلتوں
سے عاری ہیں لیکن معقولیت پسندی کی تبلیغ ایک بالکل دوسری چیز ہے وُہ ہمیں اپنی تمام خواہشوں کے احساس میں مدد دیتی ہے جس شخص کی عقل اس کی خواہشوں
زیادہ اطلاع اور واقفیت رکھتی ہے اسی قدر زیادہ وہ شخص معقول ہے۔ افعال پر عقل کا اقتدار ایک نہایت اہم چیز ہے آج سائنس تیزی سے ان ذرائع میں اضافہ کر رہی
جن سے ہم اپنے ہمجنسوں کو بڑے پیمانے پر تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں افعال پر عقل کا ہی اقتدار عمرانی زندگی کی بقاء کا ضامن ہو سکتا ہے
تعلیم، صحافت اور مذہب ـــــ مختصر یہ کہ دنیا کی تمام بڑی قوتیں آج غیر عقلیت پسندی کی جانب ہیں۔ وہ ان افراد کے ہاتھوں میں ہیں جو ہمیں تباہی
انتشارِ مطلق کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اس کا علاج کسی انقلاب کے خاص عقیدہ کو ظلم یا معاشی دباؤ کے ذریعہ ختم کرنے میں نہیں بلکہ افراد کی اپنی ان کوششوں میں ہے
ہمسایوں اور دنیا والوں کے ساتھ اپنے تعلقات کا ایک زیادہ متوازن اور سنجیدہ زاویۂ نظر قائم کریں عقل ہی زیادہ سے زیادہ عام ہو کر ان آلام اور

اُردو کی دو مشہور مثنویاں

سحرالبیان —— گلزارِ نسیم

گزشتہ دنوں نشرگاہِ لاہور نے "جھوٹ میں سچ" کے زیرِ عنوان تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ ہمارے قدیم افسانوی ادب میں موجودہ حقیقت پسند قارئین کہاں تک دلچسپی لے سکتے ہیں۔ یعنی قدیم ادب کے "جھوٹ" میں موجودہ حقیقت نگاری کے "سچ" کا عنصر کس قدر موجود ہے۔ اس سلسلے کے یہ دونوں مضامین نشرگاہِ مذکور کی اجازت سے شائع ہو رہے ہیں۔ نشر شدہ مضامین میں نشر ہونے کے بعد کچھ اضافے کئے گئے ہیں جن کے لئے مضمون نگار خود ذمہ دار ہیں۔ "ہمایوں"

(۱)

سحرالبیان

میرحسن کی مثنوی سحرالبیان کی تصنیف کو ڈیڑھ سو سال سے زائد مدت گذر چکی ہے۔ اُردو کی مشہور مثنویوں میں یہی مثنوی سب سے قدیم اور سب سے زیادہ مقبول ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد آبِ حیات میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

میرحسن مرحوم نے اسے لکھا اور ایسی صاف زبان فصیح محاورے اور میٹھی گفتگو میں اور اس کیفیت کے ساتھ ادا کیا جیسے آبِ رواں۔ اصل واقعے کا نقشہ آنکھوں میں کھچ گیا اور اُن ہی باتوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں جو اُس وقت وہاں ہو رہی تھیں۔

نصف صدی کے قریب زمانہ گزر چکا ہے جب آزاد نے یہ رائے ظاہر کی تھی۔ مگر میرحسن کی زبان اور واقعہ نگاری کے متعلق آج بھی اس رائے میں بہت کم تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

کہانی یوں ہے:۔

ماہ رخ پری شہزادہ بے نظیر کو اُس کے محل کی چھت پر سوتے ہوئے دیکھ پاتی ہے اور اُس پر فریفتہ ہو کر اُسے اپنے ساتھ اُڑا لے جاتی ہے۔ کچھ دنوں بعد بے نظیر کو اُداس دیکھ کر ماہ رخ اُسے سیر و تفریح کے لئے ایک "اُڑنے والا کل کا گھوڑا" دیتی ہے۔ شہزادہ اس گھوڑے پر سوار اُڑتا ہوا اتفاقاً سراندیپ کے بادشاہ کی بیٹی بدرِ منیر کے محل میں جا پہنچتا ہے اور دونوں پہلی ہی نظر میں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ کچھ عرصہ خفیہ ملاقاتیں جاری رہتی ہیں لیکن آخر پری کے کانوں تک یہ خبر پہنچ جاتی ہے اور وہ جوشِ رقابت میں غضب آلود ہو کر بے نظیر کو ایک

۷۰۰

ہم کیفیت کھلتی ہے

تھے حسن

پری اور ایک

طول بیان کا احت

اور مصنف کے اظہارِ عجز وانکس

کا مثنوی کے موضوع سے کوئی ت

جہاں کہیں کسی بادشاہ کا ذکر آیا ہے اُس

مثال یہ ہے کہ ایک مقام پہ بدرِ منیر کا خواب

کے ساتھ بیان کرتا ہے حالانکہ وہاں خواب کا سر

جہاں تک جن پری کے قصّوں اور ناقابلِ اعتب

اُردو ادب پر یا میر حسن پر کسی قسم کی حرف گیری نہیں کرسکتے۔ا

اور فوق الفطرت کہانیوں سے دلچسپی لیتا ہے اُسی طرح ادبیا

عوام کی کہانیاں عجیب وغریب ناقابلِ یقین باتوں سے بھری ز

اور عجیب وغریب کارناموں میں بھی درحقیقت انسانی سیرتیں اور تی ہیں

میں سچ چھپا ہوتا ہے جس کا سراغ لگانا بجائے خود ایک بہت دلچ

آج کل کے بعض ترقی پسند نقاد "سحرالبیان" پر شاید یہ اعتراض بھی کریں کے تذکرے سے خال

اور شہزادوں، شہزادیوں کی زندگی کے واقعات تک محدود ہے۔ میر حسن کو یہ مجبور کے علاوہ اِس لئے بھی پیش ا

بادشاہ پرستی کے اُس عہد میں عام لوگوں کی زندگی سے خود عوام کو بھی زیادہ دلچسپی نہ تھی اور افسانوں کی مقبولیت کے لئے اُن میں بادشاہوں

اور شہزادوں، شہزادیوں کا ذکر ضروری ہوگیا تھا۔ لیکن چونکہ بادشاہ بھی انسانی خصوصیات سے یکسر عاری نہیں ہو سکتے اِس لئے یہ بھی

نہیں کہا جاسکتا کہ اُن کے ذکر کے باعث "سحرالبیان" موجودہ حقیقت پرست قارئین کی دلچسپی کی چیز نہیں رہی۔ یہ مثنوی اب سے

ڈیڑھ صدی قبل کے خیالات و رجحانات، رسم و رواج، لباس و آرائش اور تہذیب و تمدن وغیرہ پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ اِس کے

وہ منظرکشی، جذبات نگاری اور کردار نمائی کے فن پر میرحسن کو وہ قدرت حاصل تھی جس کی داد اُنہیں ہر عہد کے نکتہ شناسوں سے ملتی رہے گی۔

شہزادۂ بے نظیر کے محل کی چہل پہل کا منظر یوں دکھایا گیا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے اُس زمانے کے بے فکر مشرقی شہزادے کیسے ماحول میں رہتے تھے:-

خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم — محل کی وُہ چہلیں وُہ آپس کی دھوم

تکلف کا پہنے پھریں سب لباس — رہیں رات دن شاہزادے کے پاس

کنیزانِ مہ رُو کی ہر سمت ریل — چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل

اِدھر اور اُدھر آتیاں جاتیاں — پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں

ادا سے کوئی بیٹھی حقہ پیئے — دمِ دوستی کوئی بھر بھر جیئے،

کوئی حوض میں جاکے غوطے لگائے — کوئی نہر پر پاؤں بیٹھی ہلائے

یہ تو خوشی کی گہما گہمی تھی اب ایک اور نظارہ دیکھئے۔ جب شہزادے کو پری اُڑا لے جاتی ہے تو محل سرا میں عیش و عشرت کا یہ ہنستا ہوا منظر دفعتہً غم واندوہ کی ایک تاریک تصویر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ خواصیں اور لونڈیاں سب اپنی اپنی طبیعت کے تقاضے پر متاثر نظر آتی ہیں:-

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی — کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی

کوئی بلبلائی سی پھرنے لگی — کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی

کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو — گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب — کسی نے کہا گھر ہُوا یہ خراب

کسی نے دیئے کھول سنبل سے بال — طمانچوں سے جوں گل کئے سرخ گال

کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

ادبیات میں حقیقت نگاری کی اہمیت مسلّمہ ہے لیکن یہ ایک عجیب دلچسپ بات ہے کہ حالات کے بدل جانے پر بعض اوقات خلافِ حقیقت تصوّرات بھی حقیقت کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ میرحسن نے جب اپنی مثنوی میں کل کے گھوڑے "فلک سیر" کا حال لکھا تھا، انہیں قطعاً یہ احساس نہ ہُوا ہو گا کہ فلک سیر کی شرح میں وہ موجودہ ہوائی جہاز کا تصوّر پیش کر رہے تھے۔ اب سے پینتیس ۳۵ چالیس سال پہلے کے حقیقت پرست قارئین کے لئے فلک سیر کا وجود محض خیالی اور اِس لئے شاید بالکل بے لطف تھا مگر ہوا بازی کے اِس عہد میں ہمارے لئے کل کے گھوڑے کے تصوّر میں ازسرِ نو تازگی اور اِس لئے ایک نیا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

اندھے کنوئیں میں ڈال دیتی ہے۔ ایک رات خواب میں غم زدہ بدرِ منیر پر بے نظیر کی مصیبت کی تمام کیفیت کھلتی ہے
اور شہزادی کی وفادار سہیلی وزیر زادی نجم النساء جوگن کا بھیس بدل کر سرِ صحرا اُس کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔ حُسن
اتفاق سے جنوں کے بادشاہ کا بیٹا فیروز شاہ نجم النساء کی مدد پر آمادہ ہو جاتا ہے اور بے نظیر کو ماہ رُخ کی قید سے رہائی
ملتی ہے۔ انجامِ کار بدرِ منیر کی شادی بے نظیر سے اور نجم النساء کی شادی فیروز شاہ سے ہو جاتی ہے۔

سحر البیان پر موجودہ نقطۂ نظر سے دو اعتراض ہو سکتے ہیں۔ ایک اعتراض طولِ بیان کا ہے اور دوسرا اس کے کرداروں میں ایک پری اور ایک جن کی شرکت کا، جس کی وجہ سے داستان میں بعض ایسی باتیں آگئیں جو ناقابلِ اعتبار ہیں۔

طولِ بیان کا احساس ابتداء ہی میں ہوتا ہے جہاں اُس زمانے کے دستور کے مطابق دو سو اشعار، حمد، نعت، منقبت، مدحِ بادشاہ اور مصنف کے اظہارِ عجز و انکسار پر صرف کر دیئے گئے ہیں۔ اِن اشعار کی حیثیت مثنوی پر ایک بیکار بوجھ کی سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ نہ ان کا مثنوی کے موضوع سے کوئی تعلق ہے اور نہ اپنی جگہ شعریت ہی کے لحاظ سے یہ کچھ قابلِ توجہ ہیں۔ اِس کے بعد بھی قصّے کے کرداروں میں جہاں کہیں کسی بادشاہ کا ذکر آیا ہے اُس کی بے لطف مدح سرائی میں بہت سے اشعار کی بھرتی کر دی گئی ہے۔ بے جا تفصیل کی ایک اور مثال یہ ہے کہ ایک مقام پہ بدرِ منیر کا خواب بہ تفصیل درج کر چکنے کے بعد مصنّف ایک دوسرے مقام پر دوبارہ اسے تمام تفصیلات کے ساتھ بیان کرتا ہے حالانکہ وہاں خواب کا سرسری ہی ذکر کفایت کر سکتا تھا۔

جہاں تک جن پری کے قصّوں اور ناقابلِ اعتبار باتوں کا تعلق ہے، اُن کے لئے مثنوی کے زمانۂ تصنیف کو پیشِ نظر رکھ کر ہم قدیم اُردو ادب پر یا میر حسن پر کسی قسم کی حرف گیری نہیں کر سکتے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ جس طرح انسان زمانۂ طفلی میں جنوں پریوں کی داستانوں اور فوق الفطرت کہانیوں سے دلچسپی لیتا ہے، اُسی طرح ادبیات پر بھی طفلی کا یہ دَور گزرتا ہے اور ہر زبان کے اوّلیں ادبی کارنامے اور عوام کی کہانیاں عجیب و غریب ناقابلِ یقین باتوں سے بھری نظر آتی ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو جنوں پریوں کے بے اصل کرداروں اور عجیب و غریب کارناموں میں بھی درحقیقت انسانی سیرتیں اور انسانی خواہشات ہی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ گویا اس جھوٹ کے پردے میں سچ چھپا ہوتا ہے جس کا سراغ لگانا بجائے خود ایک بہت دلچسپ مشغلہ ہے۔

آج کل کے بعض ترقی پسند نقاد "سحر البیان" پر شاید یہ اعتراض بھی کریں کہ اِس کی کہانی عام لوگوں کے تذکرے سے خالی، صرف بادشاہوں اور شہزادوں، شہزادیوں کی زندگی کے واقعات تک محدود ہے۔ میر حسن کو یہ مجبوری دوسرے اسباب کے علاوہ اِس لئے بھی پیش آئی کہ بادشاہ پرستی کے اُس عہد میں عام لوگوں کی زندگی سے خود عوام کو بھی زیادہ دلچسپی نہ تھی اور کہانیوں کی مقبولیت کے لئے اُن میں بادشاہوں اور شہزادوں، شہزادیوں کا ذکر ضروری ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ بادشاہ بھی انسانی خصوصیات سے یکسر عاری نہیں ہو سکتے اِس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کے ذکر کے باعث "سحر البیان" موجودہ حقیقت پرست قارئین کی دلچسپی کی چیز نہیں رہی۔ یہ مثنوی اب سے ڈیڑھ صدی قبل کے خیالات و رجحانات، رسم و رواج، لباس و آرائش اور تہذیب و تمدن وغیرہ پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ اِس کے

علاوہ منظر کشی، جذبات نگاری اور کردار نگاری کے فن پر میر حسن کو وہ قدرت حاصل تھی جس کی داد انہیں ہر عہد کے نکتہ شناسوں سے ملتی رہے گی۔

شہزادۂ بے نظیر کے محل کی چہل پہل کا منظر یوں دکھایا گیا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے اُس زمانے کے بے فکر مشرقی شہزادے کیسے ماحول میں رہتے تھے:۔

خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم — محل کی وہ چہلیں وہ آپس کی دھوم
تکلف کا پہنے پھریں سب لباس — رہیں رات دن شاہزادے کے پاس
کنیزانِ مہ رُو کی ہر سمت ریل — چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل
اِدھر اور اُدھر آتیاں جاتیاں — پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں
ادا سے کوئی بیٹھی حقہ پیئے — دم دوستی کوئی بھر بھر جیئے،
کوئی حوض میں جا کے غوطے لگائے — کوئی نہر پر پاؤں بیٹھی ہلائے

یہ تو خوشی کی گہما گہمی تھی اب ایک اور نظارہ دیکھئے۔ جب شہزادے کو پری اُڑا لے جاتی ہے تو محل سرا میں عیش و عشرت کا یہ جگمگاتا ہوا منظر دفعۃً غم و اندوہ کی ایک تاریک تصویر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ خواصیں اور لونڈیاں سب اپنی اپنی طبیعت کے مطابق اِس حادثے پر متاثر نظر آتی ہیں:۔

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی — کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلائی سی پھرنے لگی — کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو — گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
رہی کوئی اُنگلی کو دانتوں میں داب — کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
کسی نے دیئے کھول سنبل سے بال — طمانچوں سے جوں گُل کئے سرخ گال
کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

ادبیات میں حقیقت نگاری کی اہمیت مسلّمہ ہے لیکن یہ ایک عجیب دلچسپ بات ہے کہ حالات کے بدل جانے پر بعض اوقات خلافِ حقیقت تصوّرات بھی حقیقت کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ میر حسن نے جب اپنی مثنوی میں کل کے گھوڑے "فلک سیر" کا حال لکھا تھا، انہیں قطعاً یہ احساس نہ ہوا ہو گا کہ فلک سیر کی شرح میں وہ موجودہ ہوائی جہاز کا تصوّر پیش کر رہے تھے۔ اب سے پینتیس ۳۵ چالیس سال پہلے کے حقیقت پرست قارئین کے لئے فلک سیر کا وجود محض خیالی اور اِس لئے شاید بالکل بے لطف تھا مگر ہوا بازی کے اِس عہد میں ہمارے لئے کل کے گھوڑے کے تصوّر میں از سرِ نو تازگی اور اس لئے ایک نیا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

پری شہزادے کو کل کا گھوڑا دے کر ہدایت کرتی ہے :۔

جو مُڑے تو کل اس کی یوں جوڑیو — جو برعکس چاہے تو وُوں موڑیو

زمیں سے لگا اور تا آسماں — جہاں چاہیو جائیو تو وہاں

اسی طرح ایک اَور دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ بعض باتیں جو کسی زمانے میں عین حقیقت کے مطابق ہوتی ہیں، حالات کے بدل جانے سے خلافِ فطرت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً جب بے نظیر کل کے گھوڑے" پر اُڑتا ہوا بدرِ منیر کے محل میں پہنچتا ہے اَور شہزادی کی سہیلیاں اَور باندیاں اُسے خانہ باغ میں دیکھ پاتی ہیں تو سب یکبارگی غش کر جاتی ہیں۔ یوں ہی شہزادہ اَور شہزادی بھی پہلی ہی نظر میں ایک دوسرے پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اَور غش کھا کر گر پڑتے ہیں۔ سہیلیوں اَور باندیوں کی غشی اَور شہزادی اَور شہزادے کی ناگہانی محبت آج کل بہت خلافِ فطرت معلوم ہوتی ہے لیکن جب یہ داستان لکھی گئی تھی اُن دنوں چونکہ نوجوان لڑکوں اَور لڑکیوں کو باہم میل ملاپ کا قطعاً موقع نہ ملتا تھا اس لئے جب کبھی اُن کا ایک دوسرے سے سامنا ہو جاتا تو یہ موقع اُن کے لئے سخت صبر آزما ثابت ہوتا اَور اس سے اُن کے اعصاب فی الحقیقت بُری طرح متاثر ہو جاتے۔ مخالف جنسوں کے میل جول پر شدید پابندی ہی زیادہ تر پہلی نظر کی محبت کے واقعات کی ذمہ دار بھی تھی ؎

گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل — نظر سے نظر جی سے جی دل سے دل

"سحرالبیان" کے مکالموں میں میر حسن نے افرادِ قصہ کی مختلف سیرتوں کو جا بہ جا خوب نمایاں کر دکھایا ہے۔ وزیر کی بیٹی نجم النساء جب گلاب چھڑک کر شہزادے اَور شہزادی کو ہوش میں لاتی ہے تو

وُہ شہزادہ دیکھ اُس کے رُخ کو ٹھٹک — وہیں رہ گیا نقشِ پا سا جھجک

کہ وُہ نازنیں بھی جھجک منہ چھپا — کمر اَور چوٹی کا عالم دکھا

چلی اُس کے آگے سے مُنہ موڑ کر — وہیں نیم بسمل اُسے چھوڑ کر

کمر اَور چوٹی کا عالم دکھانے کے باوجود بدرِ منیر کی نسوانی طبیعت رسمی حجاب کا اظہار ضروری سمجھتی ہے :۔

یہ ہے کون کمبخت آیا یہاں، — میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں

یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں — چھپی جا کے وہ اپنے دالان میں

نجم النساء بہت چالاک اَور چنچل ہے۔ وہ بدرِ منیر کی اِس شرم حضوری کو کوئی وقعت نہیں دیتی اور ہنستے ہوئے اُس سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتی ہے۔

مری طرف ٹک دیکھ تو ہائے ہائے — مثل ہے کہ من بھائے مُنڈیا ہلائے

کیا ہے اگر تو نے گھائل اُسے — تو اب چھوڑ مت نیم بسمل اُسے

شہزادی پھر اپنی فطرت کے مطابق حقیقتِ حال کے اقرار سے گُریز کرتی ہے اَور نیم منافقانہ ٹال مٹول سے کام لیتے ہوئے نجم النساء کو اُلٹا یہ جواب دیتی ہے:۔

میں سمجھی ترا دل گیا ہے اُدھر	بہانے تو کرتی ہے کیوں مجھ پہ دھر؟

وزیر زادی کی زندہ دلی اَور حاضر جوابی ملاحظہ ہو:۔

لگی کہنے ہنس ہنس کے وُہ ماہ وش	ہوئی تھی اُسے دیکھ میں ہی تو غش
تمہیں نے تو چھڑکا تھا مجھ پر گلاب	بھلا میری خاطر بلا لو شتاب

لیکن شہزادے کے سامنے بدرِ مُنیر کی کیفیت کچھ اَور ہے۔ جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ ایک پری کی قید میں ہے تو عام عورتوں کی طرح اُس کے جذباتِ رقابت برانگیختہ ہو جاتے ہیں اَور وُہ کُھل کر اپنے جذبات کا صاف صاف اظہار کرتی ہے:۔

مرو تم پری پر وُہ تم پر مرے	بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے
میں اِس طرح کا دل لگاتی نہیں	یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں

شہزادی تو آخر صلح کر لیتی ہے مگر بے نظیر ایسا قسمت کا دلی ہے کہ دوسری طرف ماہ رُخ اُس کی بُری گت بناتی ہے۔ ماہ رُخ پری ہے مگر بدرِ مُنیر سے شہزادے کے تعلقِ خاطر کی اطلاع پا کر بوالہوس عشّاق کی طرح رقابت کے غیظ و غضب میں آپے سے باہر ہو جاتی ہے:۔

بلا سی وُہ دیکھ اُس کے پیچھے پڑی	کہا سُن تو لے موذی و مدعی!
تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا	کہ اُس مالزادی کو جوڑا دیا؟

شہزادے کے کنوئیں میں قید ہو جانے کے بعد بدرِ مُنیر بہت بے حال ہو جاتی ہے۔ شاعر نے چند لاجواب اشعار میں اِس کیفیّت کو ظاہر کیا ہے۔ یہ شعر اصلیّت کی ہو بہو تصویر ہونے کے باعث سالہا سال سے لوگوں کی زبانوں پر رواں ہیں:۔

خفا زندگانی سے ہونے لگی	بہانے سے جا جا کے سونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا	نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے	محبت میں دن رات گھُٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو،	تو اُٹھنا اُسے، کہہ کے ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے،	تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے،
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی	یہ پوچھی جو دن کی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے	کہا خیر، بہتر ہے، منگوائیے

نجم النساء جوگن کا بھیس بدل کر شہزادے کی تلاش میں نکلتی ہے اَور اپنا رنگ روپ چھپانے کے لئے بدن پر راکھ مل لیتی ہے مگر

صفا راکھ سے اور چمکی وہاں

چنانچہ نجم النساء سے محبت کرنے کے لئے شاعر کو ایک جن پیدا کرنا پڑا، یعنی جنّوں کے بادشاہ کا بیٹا فیروز شاہ، جس نے وزیر زادی کو جوگن بنے ایک جنگل میں کِدارا گاتے ہوئے دیکھ پایا۔ جوگن کے حُسن کی بہار دیکھ کر اِس جن کا بھی وہی حال ہُوا جو اُس زمانے میں عام آدمی زاد عاشقوں کا ہوتا تھا۔ اُدھر نجم النساء کے دل میں بھی اُس کی محبت کا تیر پیوست ہونے میں دیر نہ لگی۔ اس کے عِلاوہ چونکہ شہزادہ ایک پری کی قید میں تھا اس لئے نجم النساء نے ایک جن کے یوں قبضے میں آجانے کو امدادِ غیبی بھی تصوّر کیا۔ وزیر زادی جو لگاوٹ کے سب گرُ خوب جانتی تھی فیروز شاہ کو اَور زیادہ فریفتہ کرنے کے لئے ابتداء میں بہت بے نیازی دکھاتی ہے۔ فیروز شاہ نے اظہار شوق کیا تو

کہا ہنس کے جوگن نے ہر بول ہر! جہاں سے تو آیا چلا جا ادھر

جن بھی وارفتہ مزاج عاشقوں کی بولی ٹھولی جانتا تھا

کہا تب پری زاد نے واہ جی! بڑے گرم ہیں آپ' اللہ جی!

نہ روکھی ہو اتنی بھلا جاؤں گا ذرا بین سُن کر چلا جاؤں گا

بین سننے کا بہانہ جوگن کے لئے بھی سہارا بن جاتا ہے۔ اِس فرمائش پر جوگن فیروز شاہ کو بازاری انداز میں دھتکارتی تو ہے لیکن ساتھ ہی بیٹھے رہنے کا اشارہ بھی کر دیتی ہے:۔

کہا، ہوتے سوتے سے اپنے کہو! فقیروں کو چھیڑو نہ، بیٹھے رہو

اِس کے بعد رات بھر بین بجا بجا کر اُسے رجھاتی رہی اَور صبح جن اُسے اپنے تخت پر بٹھا کر پرستان کی طرف لے اُڑا ۔ ؎

زمیں سے اُڑا آسماں کے تئیں وہ کتنا کہا کی نہیں رے نہیں!

فیروز شاہ کے محل میں پہنچ کر بھی نجم النساء جوگن کا سوانگ دھارے رہتی ہے۔ اُس کی اڑان گھائیوں سے فیروز شاہ آخر گھبرا جاتا ہے اَور اشارے کنائے چھوڑ کر صاف الفاظ میں اظہارِ عشق کا ارادہ کرتا ہے۔ چنانچہ ایک دن جوگن کو تنہا پا کر وُہ اِسی نیّت سے اُس کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہے۔ جوگن اب بھی اپنی بناوٹ کی روش پر قائم رہتی ہے اَور انجان بن کر اُس سے قدموں پر گرنے کا سبب پوچھنے لگتی ہے:۔

مرے بیٹھنے سے اذیّت ہوئی؟ کہ مہمانوں کی مصیبت ہوئی؟

اذیّت مگر ہم سے پاتا ہے تو! کہ یوں پاؤں پڑ پڑ اُٹھاتا ہے تو!

فقیروں سے اتنا نہ ہو تُو خفا چلے ہم بھلا، جا ترا ہو بھلا

جوگن کی یہ بے مہری دیکھ کر سادہ لوح فیروز شاہ کا جی بھر آتا ہے بیچارا ہے تو جن مگر جذبات کے لحاظ سے سیدھا سادھا آدمی زاد معلوم ہوتا ہے:۔

لگا کہنے رو رو کے فیروز شاہ کہ بس بس یہی تو کہو گی نہ واہ

تمہاری سمجھ نے تو مارا ہمیں — یہ باتیں نہیں اب گوارا ہمیں
ہوئیں تم نہ واقف مرے حال سے — فدا ہیں رہا جان اور مال سے

نجم النساء اس جذباتی ہیجان میں بھی بدرِ مُنیر کے متعلق اپنے فرض کو نہیں بھولتی۔ اس موقع کو مناسب پاکر ساری آپ بیتی فیروز شاہ کو کہہ سناتی ہے اور اپنی محبّت کا لالچ دے کر اُسے بے نظیر کو تلاش کرنے کی فرمائش کرتی ہے۔ وہاں کیا دیر تھی۔ جن فوراً شہزادے کا کھوج لگا لیتا ہے بلکہ ماہ رُخ کو بلا کر اُسے ایک آدمی زاد سے دل لگانے پر سخت ملامت بھی کرتا ہے۔ اس ملامت میں لطف یہ ہے کہ جن بھی عام واعظوں کی طرح اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر نہیں دیکھتا :۔

بنی آدمی کو تو چوری سے لا — بٹھاتی ہے گھر میں تعشّق جتا،
ترے باپ کو گر لکھوں تیرا حال — تو کیا حال ہو پھر ترا اے چھنال

غیرت مند جن کو بھی انسانی کنبوں برادریوں کے بزرگوں کی طرح ذات پات اور کُفو وغیر کُفو کا بہت خیال معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے لئے نہ جانے کیوں سب کچھ جائز سمجھتا ہے۔ شاید وُہ اُن لوگوں کا ہم خیال ہے جو کہتے ہیں کہ غیر ذات کی لڑکی لے لینے میں تو کوئی عیب نہیں مگر اپنی بیٹی غیر ذات میں نہیں جانی چاہئے۔ چنانچہ پری کو یوں شرماتا ہے :۔

ترا رنگ غیرت سے اُڑتا نہیں — تجھے کیا پری زاد جُڑتا نہیں

پری بھی ماشاء اللہ بڑی نیک ذات ہے اور ننگ و ناموس کی قدر و قیمت خوب جانتی ہے۔ اِسی لئے شہزادے کی حوالگی کے وعدے کے ساتھ ہی فیروز شاہ سے یہ درخواست بھی کر دیتی ہے :۔

پر اتنا یہ احسان مجھ پر کرو — کہ اس کا پرستاں میں چرچا نہ ہو
مرے باپ کو بھی نہ ہووے خبر — کہ پھر میں نہ ایدھر کی ہوں نے اُدھر

بے نظیر کے مل جانے کے بعد نجم النساء اور فیروز شاہ اُسے ساتھ لے کر بدرِ مُنیر کے پاس پہنچتے ہیں اور بچھڑے ہوئے دل زدگانِ محبت ایک دوسرے کو اپنی سرگزشت سناتے ہوئے رات آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں ؎

کٹی رات حرف و حکایات میں — سحر ہوگئی بات کی بات میں

کچھ دنوں بعد بے نظیر وہاں سے رخصت ہو جاتا ہے اور پھر بدرِ مُنیر کے باپ کو اُس کی خواستگاری کا پیغام بھیجتا ہے۔ جلد ہی شادی بھی ہو جاتی ہے۔ میر حسن کی ستم ظریفی یا یوں کہیئے کہ بعض رسوم کا کھوکھلا پن دکھانے کے لئے اُن کی حقیقت نگاری ملاحظہ ہو کہ اتنی طول طویل "کورٹ شپ" کے بعد بے نظیر اور بدرِ مُنیر کی شادی کی رسوم میں یہ ذکر بھی ضروری سمجھتے ہیں :۔

دکھا مصحف اور آرسی کو نکال — دھرا بیچ میں سر پہ آنچل کو ڈال

بدرِ مُنیر کے ایماء پر وزیر بھی اُسی دن اپنی بیٹی نجم النساء کی شادی فیروز شاہ سے کر دیتا ہے۔ شادی کے بعد دونوں جوڑے ہنسی

خوشی اپنے اپنے گھر کو رخصت ہوتے ہیں اور کہانی انجام کو پہنچتی ہے۔

میر حسن نے یہ مثنوی اپنی وفات سے دو سال پہلے ختم کی تھی۔ انہیں خود اس کے آئندہ قبول عام کا صحیح اندازہ تھا، چنانچہ خاتمۂ کتاب پر جو دعویٰ انہوں نے پیش کیا اُس پر وقت نے مہرِ تصدیق لگا دی ہے:-

"نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان — نہیں مثنوی، ہے یہ سحر البیان

رہے گا جہاں میں مرا اِس سے نام — کہ ہے یادگارِ جہاں یہ کلام"

حامد علی خاں

(۲)
گلزارِ نسیم

پورے سَو برس ہوئے جب پنڈت دیا شنکر نسیمؔ نے اپنی مشہور مثنوی 'گلزارِ نسیم' شائع کی۔ شروع میں پچاس ساٹھ برس تک یہ مثنوی بہت مقبول رہی لیکن جُوں جُوں انگریزی مذاق مُلک میں سرایت کرتا گیا، اُسی قدر اِس مثنوی کے پڑھنے کا شوق کم ہوتا گیا۔ آزادؔ اور حالیؔ کے عہد سے کیفیت یہ ہوئی کہ اُردو شاعری 'نئی ہو یا پُرانی'، انگریزیّت کی چاشنی کے بغیر مصنوعی اور جھوٹی سمجھی جانے لگی۔ 'انگریزیّت کی چاشنی' سے مُراد ہے لفظی صنعتوں سے بچنا اور واقعات کے بیان پر زور دینا۔ بدقسمتی سے 'گلزارِ نسیم' میں رعایتِ لفظی کی اِتنی بھرمار ہے جتنی اُردو کی اور کسی طویل نظم میں نہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہمارا نیم انگریزی داں مذاق اِس مثنوی کی عام شاعرانہ خوبیوں سے بھی بدظن ہو گیا۔ ہم نے یہ خیال نہ کیا کہ جب خود انگلستان میں لوگ شیکسپیئر کے کلام کو تناسبِ لفظی اور ضلع جگت کی کثرت کے باوجود فطرت کا آئینہ سمجھتے ہیں تو کیا عجب ہے کہ بچارا دیا شنکر نسیمؔ بھی اپنے صنائع و بدائع کے باوجود اپنی نظم میں واقعیّت کی کوئی جھلک قائم رکھ سکا ہو۔

لیکن پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی بدقسمتی یہیں ختم نہیں ہوئی۔ لفظی صنعتوں کے ارتکاب کو ہم شاید ایک قابلِ معافی جُرم سمجھنے پر آمادہ ہو جاتے مگر نسیمؔ نے دوسرا غضب یہ کیا ہے کہ اپنی مثنوی میں ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان نظم کی ہے جو ہماری سائنس داں طبیعتوں کو موافق نہیں آتی۔ پُورب دیس کا شہزادہ تاج الملوک ایک طلسمی پھول کی تلاش میں مُلکِ پرستان کو روانہ ہوتا ہے۔ یہ پھُول پرستان کی شہزادی بکاؤلی کے محل میں بہار دے رہا ہے۔ تاج الملوک دیووں کی مدد سے بکاؤلی کے محل تک پہنچتا ہے اور وہاں سے واپسی پر صرف پھول ہی نہیں، بکاؤلی کا دل بھی چُرا لاتا ہے۔ بکاؤلی اُس کی تلاش میں سرگرداں نکلتی ہے۔ بہت سی مصیبتوں اور خرابیوں کے بعد دونوں آخر کار مل جاتے ہیں اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نسیمؔ نے اپنی داستان تو سجا لی لیکن اِس میں دیووں اور پریوں کو جو دخل ہے، بھلا وُہ کوئی ہمارے ماننے کی بات ہے؟ پہلے جھُوٹا طرزِ بیان، پھر جھوٹے واقعات! اِس جھُوٹ سے ہمارے سچ کو صدمہ ہوتا ہے اور اِس طرح ہم یورپ کی نقلی صورت اختیار کرتے کرتے اُردو نظم کے ایک اصلی شاہکار سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ یہ

کہاں سے لازم آیا کہ ہر کہانی صرف انسانوں کی کہانی ہو؛

حقیقت یہ ہے کہ شاعری ہو یا کوئی اور فن، ہر ایک کو بعض رسمیات کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ یہ ہمارے ذوقِ سلیم کا کام ہے کہ رسمیات کے پردے ہٹا کر ہمیں اصلیت تک پہنچا دے۔ ورنہ سچ پوچھیے تو خود اصلیت کے ٹھیک ٹھیک اظہار میں بھی پوری اصلیت پیدا نہیں ہوتی۔ مثلاً فوٹو گراف میں جیسے ہم انسان کی ہو بہو تصویر مانتے ہیں کبھی ایک کان کبھی ایک آنکھ غائب ہوتی ہے، ٹانگیں تو بالعموم اُڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ اِس کے باوجود ہم سمجھ جاتے ہیں کہ کان آنکھ یا ٹانگیں صرف چھپ گئی ہیں، اِس شخص پر کوئی حادثہ نہیں گزرا۔ اگر ذرا غور سے دیکھئے تو "گلزارِ نسیم" میں بھی تناسبِ لفظی کی رسمی جانچ تول کے پیچھے، زندگی کے سچے واقعات کی تصویر اُسی طرح نظر آئے گی جس طرح فوٹو گراف میں انسانی خال وخد اور اعضا کا عکس۔

"گلزارِ نسیم" میں رعایتِ لفظی کی اہمیّت کا بڑا سبب یہ ہے کہ پچھلی صدی میں لکھنؤ کی عام شاعرانہ روِش یہی تھی۔ لفظوں کے استعمال کے ہر پہلو پر توجہ دلانا لیاقت اور شائستگی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ نسیمؔ کا کمال یہ ہے کہ لفظی رعایتوں کے زور شور کے باوجود گنتی کے چند موقعوں کے سوا اُس نے اصل مطلب کہیں خبط نہیں ہونے دیا۔ باقی رہیں پریاں، سو وہ بچاریاں بھی کچھ زیادہ قصور وار نہیں ہیں۔ پچھلی صدی کی شاعری نے اگر اُن سے کام لیا ہے تو اِس کی ایک وجہ تو اُن کی خوبصورتی ہے اور دوسری وجہ اُس زمانے کی ایک سماجی پابندی۔ اُن دنوں محبت کرنا شریف مردوں کے لئے تو جائز مگر شریف عورتوں کے لئے ناجائز تھا۔ شاعر کے لئے یہ بڑی مشکل تھی کہ عشق و محبّت کی داستان لکھے لیکن کسی شریف زادی کا سایہ تک اُس پر نہ پڑنے دے۔ اِس مصیبت میں شہزادیاں اور پریاں شاعروں کے کام آئیں کیونکہ اِن پر عام سماجی اخلاق کی گرفت کچھ زیادہ مضبوط نہ تھی۔ جو لوگ پُرانی شاعری کے جھوٹ میں نئی روشنی کا سچ ڈھونڈتے ہیں وہ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ یہ پریاں نام کو پریاں ہیں لیکن باقی ہر لحاظ سے حوّا کی بیٹیاں۔ بکاؤلی جادو ہو یا پری، وہ انسان کی طرح کھاتی پیتی اور سوتی جاگتی ہے۔ اُس کی شکل و شباہت انسان کی شکل و شباہت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اُسی طرح انسان کی محبت میں گرفتار ہوتی ہے جس طرح میں اور آپ۔ بکاؤلی کی ایک خاص نسوانی سیرت ہے۔ نو عمر لڑکیوں کا الھّڑ پن اور شوخی اُس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن ساتھ ہی وہ نہایت ذہین سمجھدار اور موقع شناس ہے۔ اُسے بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہے، بعض دفعہ کوئی بیڈھب بات بھی بڑے سلیقے سے کہہ کر معاملے کو سُلجھا لیتی ہے۔ وہ سیر و تفریح اور ہنسی دل لگی سے پورا لطف اُٹھا سکتی ہے لیکن ساتھ ہی انسان کی طرح اُس کے پہلو میں ایک دردمند دل ہے۔ اُس کی محبت گہری اور پائدار ہے اور اُس کی فطرت وفادار۔ چنچل اور شوخ ہونے کے باوجود شادی کے بعد اپنے شوہر پر جان نثار کرنا اُس کے لئے ایک کھیل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ "گلزارِ نسیم" دراصل سچی محبّت کی ایک داستان ہے۔ ایک دفعہ تھوڑی سی ہمّت کر کے یہ فرض کر لیجئے کہ جن پری اور جادو کا بھی کوئی وجود ہے۔ اِس کے بعد اِس داستان کی ہر چیز واقعاتِ زندگی اور انسانی تجربے کے مطابق چلتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تاج الملوک اُس زمانے کے دستور کے لحاظ سے اپنی بیویوں کا عدد ایک سے دو، دو سے تین اور تین سے چار تک پہنچا دیتا ہے لیکن بکاؤلی کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ

اس داستانِ محبت کا ہیرو تاج الملوک اور ہیروئن بکاؤلی ہے۔

"گلزارِ نسیم" کے متعلق ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ یہ داستان خود نسیم کی ایجاد نہیں بلکہ ایک پُرانے قصّے سے ماخوذ ہے سب سے پہلے ۱۷۲۲ء میں شیخ عزت اللہ بنگالی نے اِسے فارسی میں لکھا تھا۔ لارڈ ولزلی کے عہد میں نہال چند لاہوری نے اس کا ترجمہ اُردو نثر میں کیا جو قصّۂ گل بکاؤلی کے نام سے مشہور ہے۔ تیس چالیس سال بعد نسیم نے اِس پر توجہ کی اور ڈیڑھ ہزار شعر کی مثنوی لکھ کر گلزارِ نسیم نام رکھا۔ غور کے قابل یہ بات ہے کہ اپنی نوعمری کے باوجود نسیم نے نہال چند لاہوری کے قصّے کو کیسی نکتہ شناسی سے پرکھا ہے۔ اصل قصّے کی غیر متعلق چیزوں کو یا تو سرے سے حذف یا بالکل مختصر کر دیا ہے۔ اس سے ربط اور تسلسل کی خاصی شان پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً برہمن اور شیر کی حکایت جو اصل قصّے میں موجود ہے "گلزارِ نسیم" میں حذف کر دی گئی ہے۔ اسی طرح بکاؤلی سے پہلی دفعہ بچھڑنے کے بعد تاج الملوک کو جو مصیبتیں پیش آئیں اُن کا بیان اصل قصّے کے مقابلے میں مختصر کر دیا ہے۔ پھر ایک احتیاط یہ کی ہے کہ مافوق الفطرت واقعات سے زیادہ تر وہیں کام لیا ہے جہاں داستان میں کوئی مافوق الفطرت مشکل در پیش ہو مثلاً باغ ارم تک پہنچنے کے لئے دیووں کی مدد لینا یا دیو کے مقابلے میں جادو کی ٹوپی پہن لینا۔ اِس کے علاوہ جو باتیں نمایاں کرنے کی تھیں ان کو اور زیادہ چمکایا ہے بلکہ واقعہ نگاری کے لحاظ سے اگر کہیں کوئی کمی معلوم ہوئی ہے تو اپنی طرف سے اضافہ کر کے اُسے پورا کر دیا ہے۔ مثلاً "قصّۂ گل بکاؤلی" میں تاج الملوک دلبر بیسوا کی بوڑھی ملازمہ کو صرف چاپلوسی سے پھسلا کر دلبر کا راز معلوم کرتا ہے لیکن "گلزارِ نسیم" میں اِس فریب کو ایک اور تدبیر سے واقعیت کا رنگ دیا گیا ہے۔ تاج الملوک دلبر بیسوا کے دروازے پر کھڑا ہے اور سوچ رہا ہے کہ کیا کروں ؎

حیران تھا یہ بلند پایہ | نکلی اندر سے ایک دایہ
لڑکا کوئی کھو گیا تھا اُس کا | ہم شکل یہ مہ لقا تھا اُس کا
بولی وُہ کہ نام کیا ہے تیرا | فرزند اِسی شکل کا تھا میرا
بولا وُہ کہ نام تو نہیں یاد | طفلی میں ہوا ہوں خانہ برباد
لیکن یہ میں جانتا ہوں دلگیر | مادر تھی مری بھی ایسی ہی پیر

اصل قصّے میں تاج الملوک سرنگ کھدوا کر باغ بکاؤلی تک پہنچتا ہے اور اسی راہ سے واپس آتا ہے۔ سرنگ کا معاملہ یہیں ختم ہو جاتا ہے مگر "گلزارِ نسیم" کا مصنف اصل قصّہ گو سے زیادہ محتاط ہے اس لئے تاج الملوک کی واپسی پر اِس سرنگ کو بند کرنا ضروری سمجھتا ہے ؎

گُل لے کے جیب آملا وُہ گُلچیں | اُس نقب کی رخنہ بندیاں کیں

شاعر کا اصل زورِ قلم وہاں کُھلتا ہے جہاں وُہ بکاؤلی کے واردات و کیفیات کا بیان کرتا ہے۔ پھول کی چوری کے بعد بکاؤلی دفعۃً اس طرح ہمارے سامنے آتی ہے جیسے کسی امیر گھرانے کی لاڈلی بیٹی منہ بسورتی، مچلتی، ماماؤں پر بگڑتی ہوئی آئے۔ لیکن اس سے پہلے ارم میں صبح کا طلوع اور بکاؤلی کا بیدار ہونا بھی ایک کیفیت رکھتا ہے ؎

گُل چیں نے وُہ پھول جب اُڑایا | اور غنچۂ صُبح کھلکھلایا
وُہ سبزۂ باغِ خوابِ آرام | یعنی وہ بکاؤلی گُل اندام
جاگی مُرغِ سحر کے غُل سے | اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے

اپنے پھول کو باغ میں نہ پا کر پہلے تو یخ دپریشانی کی تصویر بن جاتی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد قدرۃً اُسے اپنی خواصوں پر شبہ ہوتا ہے اور غصّے میں آکر انہیں ڈپٹتی ہے۔ یہ شعر بجا طور پر مشہور ہیں ؎

گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گُل؟ | جھنجلائی کہ کون دے گیا جُل؟
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟ | ہے ہے مجھے خار دے گیا کون؟
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے | بُو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے
نرگس تُو دکھا کدھر گیا گُل | سوسن تو بتا کدھر گیا گُل
سنبل، مرا تازیانہ لانا! | شمشاد، انہیں سُولی پر چڑھانا!

لیکن لڑکپن کی بے فکری کا زمانہ اس کے ساتھ ہی گزر گیا۔ وُہ پھول گویا ایک علامت تھا کہ لڑکی ختم ہوئی اور عورت کا دور شروع ہُوا۔ اب بکاؤلی نے عشق کے خار زار میں قدم رکھا۔ مردانہ لباس پہنا، فرّخ نام اختیار کیا اور تاج الملوک کو ڈھونڈتی ہوئی اُس کے باپ کے پایۂ تخت میں آئی۔ اِس موقع پر نہال چند لاہوری نے جو کچھ لکھا ہے اُسے دیکھئے اور پھر گلزارِ نسیم کے مقابل کے شعر پڑھئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ایک اُستاد کا قلم معمولی مکالمے کو کہاں سے کہاں لے گیا۔ نہال چند لاہوری لکھتا ہے:۔

حضرت نے پوچھا کہو کہاں سے آنا ہُوا، اور تمہارا کیا نام ہے، کس واسطے آئے ہو۔ جوان نے عرض کی کہ وطن تو غُلام کا پچھم ہے اور نام فرّخ۔ نوکری کی تلاش میں آیا ہوں۔ اب جہاں پناہ کے تفضلات سے اُمید یہ ہے کہ حضور کے ملازموں میں سرفراز ہوں تا دعائے دولت میں بخاطرِ جمع مشغول رہوں۔ زین الملوک نے کہا "بہت بہتر حاضر رہو۔"

اب گلزارِ نسیم اُٹھائیے۔ بادشاہ فرّخ کے حُسن و جمال کو دیکھ کر متعجب ہوتا ہے ؎

پوچھا اے آدمِ پری رُو | انساں ہے، پری ہے، کون ہے تو؟
کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے؟ | ہے کون سا گُل، چمن کدھر ہے؟

بکاؤلی فرّخ کے بھیس میں کچھ تو اپنی درویشانہ شان قائم رکھنا چاہتی ہے، کچھ بادشاہ کا رحم اور ہمدردی حاصل کرنے کی خواہش مند ہے۔ کیا خوب جواب دیتی ہے ؎

گُل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں | غُربت زدہ کیا وطن بتاؤں
گھر بار سے کیا فقیر کو کام! | کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام!

اِس آخری شعر پر غور کیجیے۔ شاعر نے دو مصرعوں میں صرف بندش کی چستی سے کام لے کر بکاؤلی کے حُسنِ کلام اور برجستگیٔ گفتگو کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ نہال چند لاہوری کے قصّے میں فرّخ ایک گمنام درباری کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن گلزارِ نسیم میں وُہ بجا طور پر بادشاہ کا وزیر اور معتمد بنتا ہے، اور داستان کے اِس حصّے میں واقعات کا مرکز ہے۔

آخر بکاؤلی تاج الملوک کو ڈھونڈ لیتی ہے اور بیٹے کو باپ سے دوبارہ ملاتی ہے۔ تاج الملوک گُلِ بکاؤلی کے چرانے کا قصہ سُناتا ہے تو بکاؤلی پر بھی سب راز کھُلتا ہے۔ وُہ پرستان کو واپس چلی جاتی ہے اور وہاں سے تاج الملوک کو ایک نامۂ شوق بھیجتی ہے۔ یہ پہلا خط ہے، لیکن پھر بھی طبیعت کی شوخی کے ہاتھوں تاج الملوک کو چھیڑنے سے باز نہیں رہتی ؎

تُو باغِ ارم سے لے گیا گُل — تو مجھ سی پری کو دے گیا جُل
بے رُخ ترے واسطے ہوئی میں — فرّخ ترے واسطے ہوئی میں
تجھ کو ترے باپ سے ملایا — مجھ کو یہ ملا کہ تجھ کو پایا
جو جو اسرار تھے نہانی — سب تجھ سے سُنے تری زبانی
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے — جادو وُہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

اِس کے جواب میں تاج الملوک کی طرف سے محبّت نامہ آتا ہے۔ بکاؤلی اِسے خوش خوش پڑھ رہی ہے کہ اِتنے میں اس کی ایک بیغض دست دیونی پاس سے گزرتی ہے۔ اِسی دیونی کی مدد سے تاج الملوک نے بکاؤلی کا پھُول چرایا تھا۔ بکاؤلی فرّخ کے بھیس میں یہ سب ماجرا سن چکی ہے لیکن اب تک خاموش رہی ہے۔ اب دل میں خوشی کی لہر اُٹھی ہے تو کچھ خفا ہو کر، کچھ انجان بن کر دیونی سے بھی چُہل کرتی ہے ؎

پوچھا کہ اری تجھے خبر ہے — گُل چین مرا کون سا بشر ہے

دیونی کا اِنکار اور اِس پر بکاؤلی کا مصنوعی غصہ، یہ کیفیت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بکاؤلی پھُول کے چور کو بددُعا دیتی ہے مگر اِس بددعا میں بھی ایک لطف ہے۔ بظاہر تو یہ کہتی ہے کہ "اُس موئے کو زندہ درگور کروں" لیکن دراصل یہ کہہ گئی ہے کہ "خدا کرے وُہ مُوا گور میں پڑ کر بھی نہ مرے"۔ یہاں لفظوں میں ایسی صنعت رکھی گئی ہے کہ بددُعا ہوتے ہوتے دُعا بن گئے ہیں ؎

گُل نقب کی راہ لے گیا چور — زندہ کردوں اُس موئے کو درگور

بہانے بہانے کی اِس خفگی سے آخر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہی دیونی تاج الملوک کو بکاؤلی کے پاس لاتی ہے اِس پہلی ملاقات میں ایک طرف ناز، دوسری طرف نیاز کی تصویر، اور پھر خود ناز کے نیاز بن جانے کا نقشہ کھینچ کر نسیم نے اپنا پورا کمال دکھایا ہے۔ جب اِن چھُپی چھُپی کی ملاقاتوں کا حال بکاؤلی کی ماں پر کھُلتا ہے تو اُس کے غیظ و غضب میں اصلیت کا ایسا رنگ بھرا ہے کہ کسی آدم زاد ماں اور اِس پری زاد ماں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ پھر سہیلیوں کا بکاؤلی کو سمجھانا اور اُس کا چمک کر جواب دینا "گلزارِ نسیم" کے اُن حصّوں میں سے ہے جن کو انسان بار بار پڑھ کر بھی نہیں تھکتا۔ اِسی عرصے میں تاج الملوک ایک بار پھر مصیبتوں میں پڑتا اور دیووں سے لڑتا

بکاؤلی کی چچیری بہن رُوح افزا کے پاس جا نکلتا ہے۔ رُوح افزا اِسی طرح تاج الملوک کا ساتھ دیتی ہے اور بالآخر بکاؤلی سے اُس کا بیاہ ہو جاتا ہے۔

یہاں پر داستان ختم ہو جانی چاہیئے تھی لیکن شاعر ابھی ہمیں پریوں کے بادشاہ راجہ اِندر کی بزم میں لے جانا چاہتا ہے۔ یہ حصّہ کسی قدر غیر متعلق ہے مگر دو باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ غیر متعلق حصّہ بھی ہمیں خوشی سے قبول ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ بکاؤلی کے شوہر پرستی کے جذبے کا پورا اظہار یہیں ہُوا ہے۔ وُہ چھپ کر راجہ اِندر کے دربار میں جاتی ہے، بار بار آگ میں جل کر راکھ بنتی اور پھر زندہ ہوتی ہے صرف اِس لئے کہ راجہ اِندر اُسے تاج الملوک سے جُدا نہ کرے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اِس حصّے میں "گلزارِ نسیم" کے بعض بہترین شعر ہیں۔ اِس کی ایک مثال دیکھئے۔ ایک رات راجہ اِندر کو خیال آیا کہ بکاؤلی اب کبھی اپنا ناچ دکھانے حاضر نہیں ہوئی ؎

پوچھا پریوں سے، کچھ خبر ہے　　　　شہزادی بکاؤلی کدھر ہے؟

اِس پر پریاں دل ہی دل میں خوش ہوئیں کہ لو اب بکاؤلی کا راز فاش ہُوا۔ بدنیت لوگوں اور حاسد طبیعتوں کا خاصہ ہے کہ دوسرے کی بُرائی سُن کر اُنہیں خوشی ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اُس بات کو خود زبان پر لاتے ہوئے اُنہیں ڈر بھی لگتا ہے۔ یہ پریاں اِسی کیفیت کی تصویر ہیں۔ اِندر کے سوال پر ؎

مُنہ پھیر کے ایک مسکرائی　　　　آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک　　　　ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

اور پھر وُہ لاجواب شعر جو اِندر کے دربار میں بکاؤلی کے ناچ کا جھلمل کرتا ہُوا مرقّع ہے ؎

وُہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی　　　　خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

داستان کا اِسی منزل پر انجام کو پہنچ جانا ہر لحاظ سے مناسب تھا لیکن شاعر نے صریح زیادتی کی ہے کہ اِسے زبردستی اور تھوڑی دُور تک چلایا ہے۔ ابتدائی شعروں کو چھوڑ کر یہ حصّہ پھیکا ہے اور رُوح افزا اور بہرام کی شادی کا قصّہ تو اِس داستان میں سرے سے اَنمل بے جوڑ ہے۔ دراصل پُرانے داستان گو کچھ اِس رواج کے پابند ہو گئے تھے کہ اپنی داستان کے تمام بِن بیاہے مردوں اور کنواری پریوں کے لئے مناسب رشتہ ضرور تلاش کریں۔ "گلزارِ نسیم" میں شاعر نے رُوح افزا کو ٹھکانے لگا کر گویا اپنا ایک اخلاقی فرض ادا کیا ہے۔ اِس کے بعد وُہ پورے خلوص اور دلجمعی سے اپنی داستان کو اِس دُعا پر ختم کر سکا ہے کہ

جس طرح اُنہیں بہم ملایا
بچھڑے ہوئے سب ملیں خُدایا

حمید احمد خاں

آہ فانیؔ!

"تو آج مرگِ فانیؔ بے کس سے مٹ گئی
وُہ اِک خلش جو خاطرِ اہلِ وطن میں تھی!"

وُہ بجھ گئی ہے شمع، وُہ سر دُھن رہا ہے دُود! — اُف، کتنا بے نیاز ہے قانونِ رفت و بُود

وُہ ہند سے غزل کا شہنشاہ چھن گیا — ہوتی ہے آہ عقدۂ ہستی کی یوں کشود!

نغمے کی کیا فنا ہی بقا کی دلیل ہے؟ — بکھرا پڑا ہے بربطِ رنگیں کا تار و پود

فانیؔ، وُہ ارضِ ہند کا مسکینِ بے نوا — جس کی ہر ایک تان سے آتی ہے بوئے عُود

جس کی ہر اِک الاپ میں عرفانِ زیست ہے — جس کے ہر ایک سُر میں ہے افسانۂ وجُود

جو صرف اِس لئے تھا گریزاں حیات سے — پابندیاں ہیں زیست میں اور موت میں خلود

اشکوں میں جس کے لاکھ تبسّم تھے جلوہ ریز — جس کے غرور میں بھی نہاں تھا غمِ سجود

وُہ اُڑتا جا رہا ہے ستاروں کے دیس میں — وُہ دیس جس میں ہوتا ہے انوار کا ورود

صہبائے غم کا ساقیٔ باقی چلا گیا — اے روحِ تشنہ کام نہ کر خواہشِ سرود

وُہ اُڑ رہی ہیں دھندلی فضاؤں میں دھجیاں — "فانیؔ کی ذات سے غمِ ہستی کی تھی نمود

شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا!"

سوگوار:۔ احمد ندیم قاسمی

فانی بدایونی

ہمالیہ کے پربتوں کے دامن میں روہیلکھنڈ کا سرسبز و شاداب خطہ ہے۔ اسی روہیلکھنڈ کے آغوش میں بدایوں کا چھوٹا سا شہر صدیوں کی پرانی بستی ہے۔ اس کا ایک ایک ذرہ مسلمانوں کی پرانی عظمتوں کی یاد دلاتا ہے اور اس کی ایک ایک عمارت ہمارے دل میں ان کی مٹی ہوئی شان و شوکت کا نقش جما دیتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ بستی ہمیشہ مسلمان بادشاہوں کی آماجگاہ بنی رہی اور اس کی خاک نے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہوں کا دل لبھایا۔ اس کی مردم خیزی میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسی خاک سے ایسے ایسے صوفیائے کرام اُٹھے جن کی عظمت مسلّم ہے اور جن کے مزارات آج بھی ہزاروں انسانوں کی زیارت گاہ ہیں۔ اسی سرزمین میں شاعر بھی پیدا ہوئے۔ اور بعض تو ان میں سے بہت اچھے شاعر تھے لیکن ان کی گوشہ نشینی اور خاکساری نے انہیں زیادہ مشہور نہ ہونے دیا۔ مذاق میاں ایک بزرگ بدایوں کے رہنے والے اپنی نظیر آپ تھے۔ ان کا ضخیم دیوان موجود ہے۔ راقم الحروف کا خاندان ہمیشہ ان کا پرستار رہا۔ نعت اور تصوف میں بہت بلند پایہ کہنے والوں میں تھے۔ لیکن زمانہ کا رجحان اس طرف نہ ہونے کے باعث انہیں زیادہ شہرت نصیب نہ ہوئی۔ ان کی شاعری زیادہ تر ان کے متعلقین تک محدود رہی اور ان کا مطبوعہ دیوان آج بھی ان لوگوں کے گلوں کا تعویذ ہے۔ قمر بدایونی کو کون نہیں جانتا جن کا حال ہی میں انتقال ہوا لیکن بدایوں کے سب سے بڑے شاعر جن پر بدایوں کی سرزمین ہمیشہ فخر کرے گی اور اردو غزل گوئی جن کے بارِ احسان سے کبھی بھی سبکدوش نہ ہو گی وہ فانی تھے جن کی "شبِ فرقت" ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو حیدرآباد میں کٹی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صبحِ عدم سے ہم آغوش ہو گئے۔

فانی نے اسی بدایوں کی سرزمین پر ۱۸۷۹ء میں آنکھ کھولی۔ ان کی زندگی کی مختصر کہانی انہیں کی زبانی سنیئے۔

"میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دُنیا میں لایا گیا یا اب تک کہ دسمبر ۱۹۴۰ء ہے زندہ سمجھا جاتا ہوں۔ نسلاً پٹھان ہوں۔ اصلی وطن کابل ہے اس طرح کہ شاہ عالم بادشاہِ دہلی کے زمانے میں میرے مورثِ اعلیٰ اصالت خاں نامی ہندوستان آئے۔ دربارِ دہلی نے انہیں اور ان کے جانشینوں کو بہت کچھ نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فائز کئے جانے کے علاوہ جاگیرات۔ خطابات منصب وغیرہ سے سرفراز ہوئے۔ نواب بشارت خاں مرحوم جو میرے دادا تھے، صوبۂ بدایوں کے گورنر تھے۔ تقریباً دو سو مواضعات پر ان کی جاگیر مشتمل تھی مگر زمانے کے انقلاب نے رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچا دی کہ میرے والد محمد شجاعت علی خاں صاحب جو مورثِ اعلیٰ سے چھٹی پشت میں تھے پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے چنانچہ قلیل آمدنی کے سہارے پر مرحوم نے اپنی ساری زندگی شرافت، دیانت، عزت اور جرأت کے ساتھ گذار دی۔ میری جوان لڑکی نے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا۔ میرے دو لڑکے سعادت علی خاں اور وجاہت علی خاں کے نام سے موسوم ہیں۔ مذہباً میں حنفی ہوں"

میں نے ۱۹۰۱ء میں بی۔اے کی ڈگری لی اور ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ ۱۹۲۳ء تک لکھنؤ میں اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء تک آگرہ میں وکالت ذریعۂ معاش رہا۔ کچھ سال بدایوں اور بریلی میں بھی وکالت کرتا رہا۔ ۳۲ء سے ۱۹۳۹ء تک دکن میں صدر مدرس رہا۔ ۱۹۳۹ء کے بعد سے اب تک بیکار ہوں۔ آئندہ کیا ہوگا معلوم نہیں۔ مختصراً ننگِ خاندان بھی ہوں اور بارِ زمیں بھی۔ میری ہستی کسی اور کے لئے تو کیا مفید ہوتی خود میرے لئے نہیں۔"

"میری موجودہ تصنیفات "دیوانِ فانی" مطبوعہ نقیب پریس بدایوں ۱۹۲۰ء "باقیاتِ فانی" مطبوعہ آگرہ اخبار پریس ۱۹۲۶ء اور "عرفانیاتِ فانی" مطبوعہ لطیفی پریس ۱۹۳۹ء ہیں۔ باقی تصانیف تلف ہو گئیں۔" — نگار جنوری ۱۹۴۱ء

یہ چند سطریں ہیں جن میں فانی نے اپنی زندگی کی مختصر کہانی بیان کی ہے۔ ہر پڑھنے والا اس کو محسوس کرے گا کہ فانی کے ان جملوں میں کس قدر درد ہے کس قدر سوز و گداز ہے۔ یہ کسی "دل جلے" کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ "اب تک کہ دسمبر ۱۹۴۰ء ہے زندہ سمجھا جاتا ہوں"۔ اس جملہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا زندگی سے بیزار ہے۔ اس کو اس جہانِ فانی میں زندگی کا کوئی لطف حاصل نہیں اور حقیقتہً یہ سچ بھی ہے۔ فانی نے اپنی ساری زندگی اسی طرح بیزاری کے عالم میں کاٹی۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کو بیکار ہی سمجھا چنانچہ لکھتے ہیں "آئندہ کیا ہوگا معلوم نہیں۔ مختصراً ننگِ خاندان بھی ہوں اور بارِ زمیں بھی۔ میری ہستی کسی اور کے لئے تو کیا مفید ہوتی خود میرے لئے نہیں۔" الغرض فانی کی عمر کچھ اس طرح گزری کہ انہیں کبھی خوشی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور ظاہر ہے کہ جب ان کی زندگی خود ان کے لئے ہی بیکار تھی تو دوسروں کے لئے کیا مفید ہو سکتی تھی۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو ننگِ خاندان اور بارِ زمیں سمجھتے رہے۔

فانی نے جن دنوں ہوش سنبھالا ہے۔ نئی تہذیب کی بجلیاں ہندوستان کے آسمان پر اچھی طرح چمک رہی تھیں مغربیت کا سیلاب تیزی سے اُمڈا چلا آتا تھا۔ ہر طرف نئے خیالات کی اشاعت۔ جس کو دیکھو نئے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ فانی نے زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی رفتار کو دیکھا اور پہچانا اور یہ سب اسی کا طفیل تھا کہ بدایوں کے ایک پٹھان خاندان کے چشم و چراغ نے اُس زمانے میں علیگڈھ کالج سے بی۔اے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ ورنہ اس زمانہ میں روہیلکھنڈ کے پٹھانوں میں کب اس بات کا رواج تھا۔ وہاں تو تعلیم کو اچھی نظر سے دیکھا ہی نہ جاتا تھا۔ بہر حال فانی کی تعلیم اچھی طرح ہوئی۔ علی گڑھ کی صحبتوں نے ان پر بہت اثر ڈالا۔ انہوں نے شاعرانہ طبیعت پائی تھی اور اس کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ دوسرے ملکوں کے ادبیات کے مطالعہ نے اس آتشِ شوق کو اور بھی بھڑکا دیا اور ان کی شاعری کی ابتدا صحیح معنوں میں علی گڈھ سے ہوئی۔

فانی کے زمانے میں اُردو شاعری کی کیا حالت تھی؟ اس کا جواب دینا ان کی شاعری پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے ۱۹۰۵ء میں نواب مرزا خاں داغ کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن ان کے رسیلے نغمے دہلی، رام پور اور حیدر آباد سے اُٹھ کر سارے ہندوستان میں گونج چکے تھے۔ اور ہندوستان کے شہروں کے گلی کوچوں میں ان کی غزلیں گائی جاتی تھیں آزاد حالی اور اکبر جدید قسم کی شاعری کا پرچم بلند کر چکے تھے۔ ہر چیز میں جدت درکار تھی حالی کا ہر چہار طرف ڈنکا بج رہا تھا۔ انہوں نے غزل گوئی

میں بھی ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا جس سے اُردو کا کوئی ہونے والا غزل گو شاعر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فانی کا شباب حالی کا بڑھاپا تھا۔ اور وہ رختِ سفر باندھے اِس دُنیا سے جانے کے لئے تیار ہی بیٹھے تھے۔ ان کی ہستی اُردو شاعری کے لئے بہت کچھ کر چکی تھی۔ ہر شخص کی زبان پر حالی حالی تھا۔ فانی حالی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ حالی نے اُردو غزل گوئی میں جو ایک جدّت کی روح پھونکی تھی اس کو فانی نے اچھی طرح سوچا سمجھا اور اس پر عمل بھی کیا۔ فانی نے غزل ہی کو اپنی طبع آزمائی کے لئے موزوں خیال کیا۔ کیونکہ انہیں اس کی وسعت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ وُہ سمجھتے تھے کہ غزل کی شاعری ہمیشہ برقرار رہنے والی ہے۔ وُہ کبھی مٹ نہیں سکتی۔ بشرطیکہ اس کو قاعدے سے برتا جائے۔ انہوں نے غزل کو اپنے ہاتھ میں لے کر غزل گوئی کی ایک بالکل نئی راہ نکالی جو انہیں کا حصّہ ہے۔

فانی کے زمانے میں لکھنوی شاعری ایک ایسے دور سے گزر رہی تھی جو اس دبستان کی قدیم شاعری کا ردِّ عمل تھا۔ انگیا چوٹی اور سرمہ مِسّی کی شاعری موت کی نیند سو چکی تھی۔ مرثیہ نے اپنی دھاک بٹھا دی تھی حتیٰ کہ غزل بھی مرثیت کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ ان دنوں لکھنؤ کے شاعروں کو گورِ غریباں، یاس و حرماں اور گریہ و ماتم وغیرہ کے علاوہ اور کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ سب اس رنگین شاعری کا ردِّ عمل تھا جو عرصہ تک لکھنؤ کو گرما چکی تھی۔ اب اس کا ردِّ عمل ہُوا تو یہاں کے شاعروں نے اس کو بھی انتہا پر پہنچا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس میں بھی ایک طرح کی بناوٹ پیدا ہو گئی۔ ہر چند اس زمانے میں ایسی شاعری کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ اودھ کی سلطنت پر فرنگیوں کا یونین جیک لہرانے لگا تھا۔ جان عالم پیا واجد علی شاہ اختر لکھنؤ کو سونا کر کے مٹیا برج سدھار چکے تھے اور اُن کے جانے کے بعد لکھنؤ کی تمام رنگین صحبتوں پر اوس سی پڑ گئی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ حزن و یاس اور رنج و الم کی صورت میں ظاہر ہونا چاہئے تھا چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ لیکن لکھنوی شاعروں کی انتہا پسندی نے اس کو بھی بناوٹ کا رنگ دیئے بغیر نہ چھوڑا۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات ان کی یہ شاعری بھی ہمیں اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ بہر حال یہ لکھنؤ میں بالکل ایک نئی چیز تھی۔

فانی اِس لکھنوی شاعری سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ان کی طبیعت رنجیدہ قسم کی واقع ہوئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات کا وہ میر کی طرح اپنے دل پر اثر لیتے تھے۔ زندگی کی پیہم ٹھوکروں نے ان میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی جس سے وُہ ہمیشہ ملول رہا کرتے تھے۔ اور اسی لئے ان میں ٹامس ہارڈی کی طرح ایک قسم کی قنوطیت پیدا ہو گئی تھی۔ فانی نے جب اُردو شاعری کا مطالعہ کیا تو ان کی نظر لکھنؤ کی "مرثیت آمیز" شاعری پر پڑی۔ اِس نے ان کے دل کو موہ لیا۔ لیکن وُہ لکیر کے فقیر ہو کر رہنے والے نہ تھے۔ بس انہوں نے اس کی بناوٹ کو چھوڑ اپنی افتادِ طبیعت سے بالکل ایک نیا رنگ ایجاد کیا جو ان کا خاص رنگ ہے اور وہ اس میں اُردو کے سارے شاعروں سے الگ نظر آتے ہیں۔ یہ سب فانی کی انفرادیت کا طفیل تھا۔ انہوں نے سوچ سمجھ کر اُردو غزل گوئی میں ایک ایسے باب کا افتتاح کیا جس کا کبھی کسی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا۔

ہر چند فانی نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس سے یہ بات ظاہر ہو سکے کہ شاعری اور آرٹ کے متعلق ان کے خیالات کیا تھے لیکن ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وُہ المیہ آرٹ کو پسند کرتے تھے اور

کچھ ایسی ہی ان کی افتادِ طبیعت تھی۔ اس معاملہ میں وُہ Marc Andre کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں جو شاعری کی تعریف یہ کرتا ہے کہ "شاعری رنج والم کی بہن ہے۔ ہر وُہ شخص جو تکلیف میں مُبتلا ہوتا ہے اور آنسو بہاتا ہے شاعر ہے۔ ہر آنسو ایک شعر ہے اور ہر دل ایک نظم"۔ فانؔی کا آرٹ المیہ ہے۔ ان کے دل سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وُہ کسی دکھے ہوئے دل کی ٹیس ہے جو انتہائی کرب و اضطراب برداشت کرنے کے بعد آہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ان کا سارا کلام اِسی قسم کے اشعار سے بھرا پڑا ہے۔

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وُہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

سینۂ فانؔی ہے یا جولانگہِ برقِ فنا
دل ہے یارب یا بلائے آسمانِ اضطراب

فانؔی اِس عالمِ ظاہر میں سراپا غم تھا
چھپ گیا خاک میں تو ہم غمِ پنہاں سمجھے

فانؔی وُہ بلاکش ہوں غم بھی مجھے راحت ہے
میں نے غمِ ہستی کی صورت بھی نہ پہچانی

طاقتِ دل دے چکی جواب پر اب تک
قوتِ غم رو بہ انحطاط نہیں ہے

جو تابِ دلنوازیٔ درماں نہ لا سکے
میں ہوں وُہ دردِ غمکدۂ روزگار میں

فانؔی کی ذات سے غمِ ہستی کی تھی نمود
شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

لیکن یہ سب کیوں ہُوا؟ بات یہ ہے کہ فانی کی زندگی کچھ اس ڈھب سے گزری جس میں مسرت کا کہیں گذر ہی نہ تھا۔ انہیں ناکامیوں کی پیہم ٹھوکریں کھانی پڑیں جن کا اثر یہ ہوا کہ انہیں ساری دُنیا میں رنج و غم کا راج نظر آنے لگا۔ ہر شخص کا دل انہوں نے رنج و غم سے فگار دیکھا دنیا ان کے نزدیک رنج والم کا ایک گہوارہ تھی فانؔی کی زندگی کی ساری تفصیلات اِس چیز کو بخوبی ظاہر کریں گی۔ زندگی میں ناکامیوں کا منہ دیکھنے کے علاوہ انہیں کچھ ایسے صدمے اُٹھانے پڑے جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ان کی جوان لڑکی کی وفات نے ان کی دنیا اجاڑ دی۔ فانؔی کو اس سانحہ سے بے انتہا صدمہ پہنچا۔ اِس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے

زندگی سے متعلق چند سطریں لکھتے وقت اس واقعہ کو فراموش نہیں کیا۔ اپنے آباؤ اجداد کا حال لکھنے کے فوراً ہی بعد لکھتے ہیں: "میری جوان لڑکی نے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ محمد حسین آزاد کو بھی ایک ایسا ہی سانحہ پیش آیا تھا جس نے ان کو مجنون کرکے چھوڑا۔ فانی مجنون تو نہ ہوئے لیکن جب تک زندہ رہے ہمیشہ سُلگتے رہے —— پھر حیدرآباد میں زندگی کے آخری ایام جس حالت میں انہوں نے کاٹے ہیں وُہ یقیناً بہت افسوسناک ہے۔ خود ان کی مذکورہ صدر خود نوشتہ سوانح عمری کے الفاظ اس کے گواہ ہیں۔ حیدرآباد کا مشہور اخبار پیام لکھتا ہے۔

"حیدرآباد کے عصرِ حاضر میں اس سرزمین پر شاید ہی کوئی ایسا صاحب کمال اس کس مپرسی کی حالت میں دفن ہُوا ہو جس حالت میں کہ فانی نے اپنی زندگی کے چند آخری سال گزارے۔"

یہ تو ہیں اُن کی آخری زندگی کے واقعات لیکن جوانی میں بھی انہوں نے ایسے صدمے اُٹھائے جنہوں نے ان کے دل کو ایک ویران بستی بنا دیا تھا۔ "ہماری زبان" نے نوجوانی کے صدموں کا ذکر کیا ہے معلوم نہیں کہ یہ جوانی کے صدمے کیا تھے جنہوں نے ان کو ہمیشہ مجسم رنج والم بنائے رکھا اور وُہ زندگی بھر ایسی آگ میں سُلگا کیے جس کی وجہ سے ان کو ساری دنیا میں رنج وغم بسیرا لیتے نظر آئے ؎

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں   اِک بے قرار تڑپا اِک بے قرار رویا

غم اصلِ کائنات ہے دل جوہرِ حیات   دل غم سے غم ہے دل سے مقابل جگہ جگہ

ہر چند یہ تمام واقعات ان کے حق میں بُرے تھے لیکن انہوں نے ان کی شاعری کو ایک ایسا رنگ دیا جو ادب کی دنیا میں ہمیشہ سے نہایت مقبول رہا ہے اور رہتی دنیا تک مقبول رہے گا۔ وہ المیہ آرٹ ہے اس آرٹ کو ہمیشہ خواص و عوام نے پسند کیا ہے۔ اور اکثر بڑے بڑے شاعروں نے اسی قسم کے آرٹ کو آرٹ اور شاعری کی معراج سمجھا ہے اور حتی الوسع اپنے کلام کو اس کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے چنانچہ انگریزی کا مشہور شاعر شیلے کہتا ہے۔

"We look before and after
And pine for what is not
Our Sincerest laughter
With some pain is fraught
Our Sweetest Songs are those that tell of Saddest thought."

ترجمہ: "ہم اپنے آگے پیچھے دیکھتے ہیں اور جو چیز ہمیں نہیں ملتی اُس پر کڑھتے ہیں اور افسردہ و رنجیدہ ہوتے ہیں۔ ہماری سچی سے سچی ہنسی بھی رنج وغم سے معمور ہوتی ہے۔ ہمارے سب سے میٹھے اور رسیلے گیت وُہ ہوتے ہیں جن میں سب سے زیادہ رنج وغم کے خیالات کا اظہار ہو"

یقیناً فانی کے المیہ نغمے ہمیشہ ہمیشہ دل جلوں کی محفلوں میں مقبول رہیں گے اور دنیا انہیں کبھی بھی فراموش نہ کرے گی۔ کیونکہ ان میں فانی نے ایسے جذبات و احساسات کی تصویر کھینچی ہے جن سے آئے دن ہر انسان کو سابقہ رہتا ہے۔ اور جو ہر لمحہ انسان کے دم کے ساتھ رہتے ہیں۔ سارے اُردو شاعروں نے اس کو سوچا سمجھا ہے میر و درد کی مقبولیت کا بڑا سبب یہی ہے۔ جس طرح میر و درد کی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی شاعری مٹنے والی نہیں اُسی طرح فانی کی شاعری کی بہار میں بھی کبھی خزاں کی بادِ سموم نہ چل سکے گی اور ان کی شاعری کا گلشن سدا بہار رہے گا۔

غزل گوئی کو صرف عشق و محبت کے بیان کے لئے وقف کر دینا یقیناً غزل کی وسعت کا خون کرنا ہے۔ جو لوگ غزل کو صرف عورتوں سے باتیں کرنے تک محدود کر دینا چاہتے ہیں وُہ غزل کی رُوح کو سمجھے ہی نہیں۔ غزل ایک وسیع میدان ہے جس میں ہر قسم کے مضامین کو جگہ دی جا سکتی ہے اور بڑے بڑے غزل گو شعراء نے دی ہے۔ میر کے ہاں رنج و غم، افلاس، محبت، کرب، بے چینی کے علاوہ فلسفے کا بیان بھی ملتا ہے۔ تصوف کے راز ہائے سربستہ بھی بے نقاب ہوتے ہیں۔ غالب کی شاعری کا موضوع اگر صرف عشق و محبت سمجھ لیا جائے تو ان کی شاعری میں بہت تھوڑے سے اشعار ملیں گے۔ وُہ بھی عشق و محبت کے ساتھ ساتھ اخلاق، تصوف اور فلسفے کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں اور فلسفہ تو ان کی شاعری کی جان ہے۔ فانی کا بھی یہی حال ہے۔ انہوں نے "جوانی کے صدموں" سے متاثر ہو کر صرف عشق و محبت ہی کو اپنی شاعری میں جگہ نہ دی بلکہ طرح طرح کی اور چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت کے بیان کا اچھا خاصا حصہ موجود ہے اور یقیناً وُہ اشعار بہت بلند ہیں کیونکہ فانی بناوٹی شاعری نہیں کرتے تھے۔ وُہ شاعر پیدا ہوئے تھے، شاعری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ جب خیالات و احساسات شعر کہنے کے لئے انتہائی مجبور کرتے تھے تو شعر کہہ دیتے تھے۔ ان کے عشق و محبت کے اشعار میں ہمیں کہیں بھی تصنع کا احساس نہیں ہو سکتا۔ وُہ عشق و محبت کے جذبات کی سچی تصویریں ہیں ؎

جب ترا ذکر آگیا ہم دفعتہً چپ ہو گئے
وُہ چھپایا راز دل ہم نے کہ افشا کر دیا

دل سراپا درد تھا وُہ ابتدائے عشق تھی
انتہا یہ ہے کہ فانی درد اب دل ہو گیا

مری اک عمر فانی نزع کے عالم میں گزری ہے
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

موت ان کا مُنہ ہی تکتی رہ گئی
جو تری فرقت کے صدمے سہہ گئے

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

کچھ نہ کہنا وُہ کسی مجبورِ خاموشی کا ہائے
وُہ جتانے پر ترا کہنا خفا کیوں ہو گئے

لیجیئے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہئے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا

اب انہیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشمِ بد دُور دلھن بن کے شباب آتا ہے

سازِ خیالِ یار سے چھیڑ چلی ہی کیوں نہ جائے
نغمۂ آرزو سُنا نوحۂ یاس بھی سہی

بیداد کے اس تیور اس حُسن کے ہیں صدقے
ان کو مرے رونے پر آئی تو ہنسی آئی

یوں چرائیں اس نے آنکھیں سادگی تو دیکھئے
بزم میں گویا مری جانب اشارہ کر دیا

ادا سے آڑ میں خنجر کی مُنہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وُہ لائے دلھن بنائے ہوئے

قربان اِک ادائے تغافل پہ لاکھ بار
وُہ زندگی جو صرف ہوئی انتظار میں

لیکن ان اشعار سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ان کی محبت ناکام محبت ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں ان کے اشعار میں ایک ٹیس سی محسوس ہوتی ہے اور ہر شعر یہ بولتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ میں جس دل سے نکل کر آیا ہوں اس نے کبھی بھی کامیابی کا منہ نہ دیکھا۔ جو ایک ایسا چمن ہے جس میں کبھی بھی بہار نہ آئی اور جس کو ساری عمر خزاں سے کام رہا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فانی کی محبت حقیقی تھی یا مجازی؟ فانی کی مجازی محبت کی حدیں حقیقت تک پہنچ گئی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری میں تصوف کو بھی دخل دیا ہے۔ تصوف کا ان پر اثر ہونا لازمی تھا۔ انہوں نے ایسی بستی میں جنم لیا اور ہوش سنبھالا جہاں بڑے بڑے اولیاء اللہ رہے اور اب بھی ان کے مزار موجود ہیں۔ جہاں تک تصوف کا تعلق ہے بدایوں کو اس سلسلہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ روہیلکھنڈ کے مسلم عوام کا یہ خیال ہے کہ اگر ہندوستان میں کعبہ ہوتا تو بدایوں میں ہوتا۔ آئے دن عرسوں کے چرچے، بڑے بوڑھوں کا اہلِ تصوف سے لگاؤ۔ اِن سب چیزوں نے فانی پر بہت اثر کیا پھر وُہ مسلمانوں کے اِس فرقے سے تعلق رکھتے تھے جس کو حنفی کہتے ہیں۔ اولیاء اللہ کا احترام جتنا حنفی کرتے ہیں اتنا کسی اور فرقے کے لوگ نہیں کرتے۔ غرض فانی پر ان تمام چیزوں نے اثر کیا اور فانی

نے تصوّف سے دلچسپی لی۔ اس لئے ان کی شاعری میں تصوّف سے متعلق دو چار چھ نہیں بیسیوں شعر ملتے ہیں۔ ہم اس کے متعلق یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی مجازی محبت کی حدیں حقیقت سے ملی ہوئی تھیں اور ان کی نظر تاریکیوں کے پردوں کو چیر کر اس جگہ پہونچ چکی تھی جہاں ہر عامی آدمی کی نظر جاتے ہوئے ٹکراتی ہے۔

تاکید ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی — مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے — تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز

وادیٔ شوق میں وارفتۂ رفتار ہیں ہم — بے خودی کچھ تو بتا کس کے طلب گار ہیں ہم

صور و منصور و طور ارے توبہ — ایک ہے تیری بات کا انداز

محتاج اجل کیوں ہے خود اپنی فنا ہو جا — غیرت ہے تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا

اس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے وہم — بلبلا ہے عین دریا پھر بھی دامن چیدہ ہے

فانی کی شاعری میں ایسی عشق و محبت کی کیفیات کے دوش بدوش ہمیں فلسفہ کے مسائل بھی ملتے ہیں ——— فلسفہ کے وہ مسائل جو آئے دن ان کے دماغ میں موجیں مارا کرتے تھے۔ اور جن کے متعلق سوچ بچار کرنا ہر حساس انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ فلسفیوں کے علاوہ جنہوں نے اپنے خیالات کے مختلف اصول قائم کر دیئے، ان چیزوں نے شاعروں کو بھی پریشان کیا ہے۔ اور شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس کے کلام سے یہ مترشح نہ ہوتا ہو کہ اس نے ان سوالات پر غور نہیں کیا۔ وہ سوالات یہ ہیں کہ زندگی کیا ہے؟ موت کس کو کہتے ہیں؟ انسان کس لئے دنیا میں آتا ہے؟ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ وغیرہ۔ ہر کسی نے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ فانی کو بھی ان چیزوں نے پریشان کیا اور انہوں نے بھی ان سوالات کے جواب دیئے ہیں۔ وہ غالب سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن غالب سے بہت زیادہ مختلف فانی فلسفیانہ خیالات کو بڑی سہولت سے ادا کر دیتے ہیں:-

ہوش کا سرمایہ وحشت کے سوا ممکن نہیں — عالم اک مجموعۂ ذرات صحرا بیز ہے

دنیا جسے کہتے ہیں زمانہ فانی — ہے ایک طلسم اجتماع اضداد

ہر ذرۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب　　　عالم دلیلِ گمرہیٔ چشم و گوش ہے

زندگی خود چیز کیا ہے یہ تو کیا کہئے مگر　　　موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم　　　مری ہستی ہے غیب کی آواز

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں　　　آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

مرا وجود ہے میری نگاہ خود نشناس　　　وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا

جبر و اختیار کا مسئلہ ہمیشہ سے بحث طلب رہا ہے چنانچہ اس پر لوگوں کے دو گروہ ہی بن گئے ہیں۔ ایک جبر کا قائل اور دوسرا اختیار کا۔ اُردو شاعروں نے بھی اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فانی کے ہاں بھی اس موضوع پر اشعار ملتے ہیں جن سے ان کی رائے کا پتہ چلتا ہے۔ فانی مسلمان تھے اور حنفی مسلمان جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے اس لئے مسئلہ جبر و اختیار میں کم و بیش ان کا وہی نظریہ ہے جو ایک سچے مسلمان کا ہونا چاہئے۔ وہ کسی انتہا پر جانا نہیں چاہتے۔ ان کی راہ ان دونوں کے درمیان ہے ؎

جسمِ آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح　　　خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی　　　سانچے ہیں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں　　　ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

غرض فانی کی شاعری ان چیزوں سے خالی نہیں۔ لیکن فلسفے کے مسائل بیان کرتے وقت وہ فلسفی نہیں ہو جاتے بلکہ ان کے ہاں نام کو بھی وہ بات پیدا نہیں ہونے پاتی جس سے فلسفہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی خشکی اور کھرا پن" جو فلسفہ کا نام آتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ فانی کا بہت بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ان پیچیدہ مسائل کو انتہائی شگفتگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور غزل کی شان کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس میں کرختگی ذرا بھی پیدا نہیں ہونے پاتی۔ برخلاف اس کے ان کے بیان میں ایک عجیب قسم کی دل موہ لینے والی خصوصیت ہوتی ہے جس سے پڑھنے والا گرویدہ ہو جاتا ہے ان کا ہر بیان شعریت کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔ زبان اتنی صاف اور میٹھی کہ دوسرا اس کے استعمال کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ پھر اس میں ایک عجیب قسم کی گھلاوٹ۔ یہ سب فانی ہی کا حصہ ہے اور شاید

نے تصوّف سے دلچسپی لی۔ اس لئے ان کی شاعری میں تصوّف سے متعلق دو چار چھ نہیں بیسیوں شعر ملتے ہیں۔ ہم اس کے متعلق یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی مجازی محبت کی حدیں حقیقت سے ملی ہوئی تھیں اور ان کی نظر تاریکیوں کے پردوں کو چیر کر اس جگہ پہونچ چکی تھی جہاں ہر عامی آدمی کی نظر جاتے ہوئے ڈگمگاتی ہے۔

تاکید ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی ۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے ۔۔۔ تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز

وادیٔ شوق میں وارفتۂ رفتار رہیں ہم ۔۔۔ بے خودی کچھ تو بتا کس کے طلبگار رہیں ہم

صورِ منصور و طور ارے توبہ ۔۔۔ ایک تیری بات کا اندازہ

محتاجِ اجل کیوں ہے خود اپنی فنا ہو جا ۔۔۔ غیرت ہے تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا

اِس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے وہم ۔۔۔ بلبلا ہے عینِ دریا پھر بھی دامن چیدہ ہے

فانی کی شاعری میں ایسی عشق و محبت کی کیفیات کے دوش بدوش ہمیں فلسفہ کے مسائل بھی ملتے ہیں ـــــ فلسفہ کے مسائل جو آئے دن اُن کے دماغ میں موجیں مارا کرتے تھے۔ اور جن کے متعلق سوچ بچار کرنا ہر حسّاس انسان کی فطرت میں داخل ہے فلسفیوں کے علاوہ جنہوں نے اپنے خیالات کے مختلف اصول قائم کر دیئے، ان چیزوں نے شاعروں کو بھی پریشان کیا ہے۔ اور شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس کے کلام سے یہ مترشح نہ ہوتا ہو کہ اس نے ان سوالات پر غور نہیں کیا۔ وُہ سوالات یہ ہیں کہ زندگی کیا ہے؟ موت کس کو کہتے؟ انسان کس لئے دنیا میں آتا ہے؟ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ وغیرہ۔ ہر کسی نے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ فانی کو بھی چیزوں نے پریشان کیا اور انہوں نے بھی اِن سوالات کے جواب دیئے ہیں۔ وُہ غالب سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن غالب سے بہت زیادہ فانی فلسفیانہ خیالات کو بڑی سہولت سے ادا کر دیتے ہیں:۔

ہوش کا سرمایہ وحشت کے سوا ممکن نہیں ۔۔۔ عالم اِک مجموعۂ ذرّاتِ صحرا بیز ہے

دنیا جسے کہتا ہے زمانہ فانی ۔۔۔ ہے ایک طلسمِ اجتماعِ اضداد

ہر مژدۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب　　عالم دلیلِ گمرہی چشم و گوش ہے

زندگی خود چیز کیا ہے یہ تو کیا کہئے مگر　　موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم　　مری ہستی ہے غیب کی آواز

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں　　آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

مراد جو ہے میری نگاہِ خود نشناس　　وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا

جبر و اختیار کا مسئلہ ہمیشہ سے بحث طلب رہا ہے چنانچہ اس پر لوگوں کے دو گروہ ہی بن گئے ہیں۔ ایک جبر کا قائل اور دوسرا اختیار کا۔ اُردو شاعروں نے بھی اِس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فانی کے ہاں بھی اس موضوع پر اشعار ملتے ہیں جن سے ان کی رائے کا پتہ چلتا ہے۔ فانی مسلمان تھے اور حنفی مسلمان جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے اس لئے مسئلہ جبر و اختیار میں کم و بیش ان کا وہی نظریہ ہے جو ایک سچے مسلمان کا ہونا چاہئے۔ وہ کسی انتہا پر جانا نہیں چاہتے۔ ان کی راہ ان دونوں کے درمیان ہے ؎

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح　　خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی　　سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں　　ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

غرض فانی کی شاعری ان چیزوں سے خالی نہیں۔ لیکن فلسفے کے مسائل بیان کرتے وقت وہ فلسفی نہیں ہو جاتے بلکہ ان کے ہاں نام کو بھی وہ بات پیدا نہیں ہونے پاتی جس سے فلسفہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی خشکی اور "کھکڑاپن" جو فلسفہ کا نام آتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ فانی کا بہت بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ان پیچیدہ مسائل کو انتہائی شگفتگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور غزل کی شان کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس میں کرختگی ذرا بھی پیدا نہیں ہونے پاتی۔ برخلاف اس کے ان کے بیان میں ایک عجیب قسم کی دل موہ لینے والی خصوصیت ہوتی ہے جس سے پڑھنے والا گرویدہ ہو جاتا ہے ان کا ہر بیان شعریت کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔ زبان اتنی صاف اور میٹھی کہ دوسرا اس کے استعمال کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ پھر اس میں ایک عجیب قسم کی گھلاوٹ۔ یہ سب فانی ہی کا حصہ ہے اور شاید

خشک مسائل کو سیدھے سادے پیرائے میں بیان کرنے میں فانی سے زیادہ (میر کو چھوڑ کر) کوئی شاعر بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ فانی اس کے بادشاہ ہیں۔

اس موقع پر ایک یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ فانی نے فلسفہ کو اپنی شاعری میں دخل دیا تو آخر ان کا فلسفہ کیا ہے؟ یقیناً ان کی شاعری سے ان کے نظریۂ زندگی کے متعلق بہت کچھ مواد ملتا ہے۔ ان کا فلسفہ نہایت سیدھا سادھا فلسفہ ہے۔ وُہ دنیا کو ایک "طلسمِ اجتماعِ اضداد" سمجھتے ہیں ان کے خیال کے مطابق اس دنیا کی ہستی ایک افسانہ کی سی ہے جہاں رنج وغم کا دور دورہ ہے اور جہاں ایک دل بھی ایسا نہیں جو رنج والم کے ہاتھوں سے فگار نہ ہو۔ انہیں دنیا میں دور تک رنج وغم کی پُر ہول اندھیاری نظر آتی ہے۔ انسان اس میں بھٹکتا پھرتا ہے اور ایسی ایسی اذیتوں کا شکار ہوتا ہے جن سے زندگی میں نجات حاصل کرنا انتہائی دشوار بلکہ ناممکن ہے اگر ایک لمحہ کے لئے یہاں خوشی بھی ہوتی ہے تو اس کو بھی دائمی خوشی نہ سمجھ لینا چاہئے بلکہ اس پر بھی رنج والم کا سایہ رہتا ہے ؎

عیشِ جہاں باعث نشاط نہیں ہے　　　خندۂ تصویر انبساط نہیں ہے

لیکن شوپنہار کی طرح وُہ اس کو ایک "اندھی مشیت" کی کار فرمائی نہیں سمجھتے۔ بلکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہاں خاموش ہو جاتے ہیں ان کے خیال میں موت کے بعد ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے جس کو وُہ "سحر" سے تعبیر کرتے ہیں ؎

شبِ فرقت کٹی یا عمر فانی　　　اجل کے بعد آمد ہے سحر کی

مرنے کے بعد دنیا کی تمام تکلیفوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور انسان کو ان سے نجات ملتی ہے۔ خدا وحدہٗ لاشریک ہے وُہ دنیا میں سب کچھ کرنے والا ہے۔

فانی اپنی غزلوں میں انسانی نفسیات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ وُہ نفسیات کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ غزل گوئی میں اس کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے اگر غزل گو شاعر انسانی نفسیات کو اچھی طرح نہ سمجھ سکا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری شاعری کا خون کر دیا۔ اس کی شاعری کبھی بھی بقائے دوام کا تمغہ حاصل نہیں کر سکتی۔ فانی نے اس کو اچھی طرح سمجھا چنانچہ ان کی شاعری میں ہمیں نفسیات کی ایسی ایسی گہرائیاں ملتی ہیں جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئیں ان کا ایک شعر ہے ؎

ترکِ امید بس کی بات نہیں　　　ورنہ اُمید کب بر آئی ہے

انسان کا خاصہ ہے کہ ناکامیوں کی پیہم ٹھوکریں کھانے کے باوجود بھی وُہ مرتے دم تک اُمید کا دامن نہیں چھوڑتا۔ فانی نے اسی خیال کو مذکورۂ بالا شعر میں بیان کیا ہے یہ فانی کی بالکل الگ خصوصیت ہے کہ ان کو یاس کی تاریکی میں اُمید کی ہلکی سی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ وُہ کبھی ناامید نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری میں باوجود بے انتہا رنج والم کی کیفیتوں کے بیان کے ہمیں ایک امید کی جھلک نظر آتی ہے جو صاف کہہ دیتی ہے کہ فانی کی طبیعت نہیں کہ کبھی ناامید ہو سکے۔

جب ترا ذکر آگیا ہم دفعتہً چپ ہو گئے　　　وُہ چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کر دیا

محبت کرنے والے انسان کا یہی حال ہوتا ہے۔ اگر کہیں اُس کے معشوق کا ذکر آتا ہے تو وُہ اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے معشوق کا ذکر اگر کسی محفل میں آتا ہے تو دوسرے لوگ اس پر طرح طرح کی خیال آرائیاں کرتے ہیں۔ تنقید کرتے ہیں۔ آوازے کستے ہیں۔ غرض کوئی چیز ان کو خاموش رہنے پر مجبور نہیں کرتی۔ لیکن عاشق خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگتے ہیں اور یہی باعث ہوتا ہے اس راز کے افشا ہونے کا۔ فانی نے مذکورۂ بالا شعر میں اسی خیال کو کس قدر عمدہ اور عام فہم پیرائے میں بیان کیا ہے۔

یا کہتے تھے کچھ کہئے جب اُس نے کہا کہئے　　　تو چپ ہیں کہ کیا کہئے کھلتی ہے زباں کوئی

عاشق کو ہمیشہ اپنے معشوق سے شکوہ رہتا ہے اور وُہ شکوہ و شکایت کا دفتر لئے اس اُمید میں گھوما کرتا ہے کہ کہیں موقع ملے تو دل کھول کر اپنے محبوب کے سامنے ان کو رکھے لیکن جب معشوق سامنے آتا ہے زبان گونگی ہو جاتی ہے۔ وُہ تمام شکوہ و شکایت کافور ہو جاتے ہیں اور اُن کا بیان کرنا تو درکنار، وُہ سرے سے ان کو بھول جاتا ہے۔ فانی نے اسی خیال کو کس خوبی سے نظم کیا ہے۔ غرض مثالیں کہاں تک دی جائیں۔ فانی کے ہاں اسی قسم کے بیسیوں اشعار ملتے ہیں جو ان کے ماہر نفسیات ہونے پر صداقت کی مہر لگاتے ہیں۔

فانی نے جگہ جگہ صرف چند الفاظ میں ایسی ایسی تصویریں کھینچی ہیں جن کو اچھے سے اچھا مصوّر بہترین رنگوں کو جمع کرنے کے باوجود بھی نہیں کھینچ سکتا، فانی صرف چند اشارے کرتے ہیں اور کسی ایک مخصوص ادا، ایک مخصوص منظر یا ایک مخصوص تیور کی تصویر ہماری آنکھوں میں پھر جاتی ہے ؎

نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو آہ　　　ادا وُہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

اُدھر مُنہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو اِدھر دیکھو　　　مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

صبح تک فانی وُہ آوازِ شکستِ دل کے ساتھ　　　کیا قیامت تھا وُہ تیرا جانبِ در دیکھنا

یوں چرائیں اُس نے آنکھیں سادگی تو دیکھئے　　　بزم میں گویا مری جانب اشارہ کر دیا

مذکورۂ بالا اشعار اس بات کی زندہ مثال ہیں کہ فانی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مصوّر بھی تھے جن کو الفاظ میں تصویریں کھینچنے کا ملکہ حاصل تھا۔

شاعری میں اندازِ بیان ایک خاص چیز ہے۔ یہی ایک ایسا جادو ہے جس سے سامع فوراً ہی پڑھنے والے کو اپنی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ دنیا کے ہر بڑے شاعر کا ایک الگ اندازِ بیان ہوتا ہے۔ ہمارے اُردو شاعروں میں میر، درد، سودا، انشا، غالب، مومن، ذوق، آتش غرض کہ ہر ایک شاعر کا ایک جداگانہ طرز ہے لیکن میر و مومن کو اپنے خیالات ایک لطیف انداز میں بیان کرنے میں فوقیت حاصل ہے۔ میر و مومن کی شاعری کی بڑائی تو ایک حد تک ان کے اندازِ بیان ہی میں مضمر ہے۔ فانی کا اندازِ بیان بھی مومن ہی کی طرح ایک خاص مرتبہ رکھتا

وُہ جو کچھ بھی کہتے ہیں کچھ ایسے تیور سے کہتے ہیں کہ خواہ مخواہ پڑھنے والے کو اچھا معلوم ہوتا ہے اور سیدھی سادھی بات میں بھی چار
لگ جاتے ہیں ؎

ہو غمِ ہستئ جاوید گوارا کیونکر	جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم

حشر میں حشر چاہیئے حشر پہ حشر چاہیئے	دفن ہیں سجدہ ہائے شوق ناصیۂ نیاز میں

اب جو ہوا ہوا مآل چھوڑ خدا پہ اندمال	زخم جگر پہ خاک ڈال تیر سنبھال رہ نہ جائے

ہائے دنیا وُہ تری سرمہ تقاضا آنکھیں	کیا مری خاک کا ذرّہ کوئی بیکار نہیں

الٰہی کیا خبر لاتا ہے قاصد وصلِ دلبر کی	بلائیں لے رہی ہیں میری تقدیریں مقدر کی

ں انداز بیان نے اِن کی شاعری کو ایک عجیب قسم کا بانکپن دیا ہے جو کم شاعروں کو نصیب ہوتا ہے۔ فانیؔ کی شاعری اِس وجہ سے بہت
ں بلند ہوگئی ہے۔

فانیؔ کی شاعری کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا ہر شعر شعریت کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔ ان کے ہر شعر میں کوئی
وئی شاعرانہ خوبی ضرور ملتی ہے۔ ان کے تمام دیوانوں میں شاید ایک شعر بھی ایسا نہ ملے گا جس میں کوئی نہ کوئی خوبی موجود نہ ہو۔ اس چیز نے
ہی شاعری کو ایک ایسی منزل پر پہونچا دیا ہے جس پر کم شاعر پہونچ پاتے ہیں۔ عموماً غزل گو شعراء کے ہاں یہ نقص ہوتا ہے کہ ان کی ہر غزل
ں دو چار شعر انتخاب سے اچھے نکلتے ہیں اور بقیہ اشعار اس قابل نہیں ہوتے کہ مقبولیّت کی سند پا سکیں لیکن فانیؔ کے یہاں یہ بات نہیں
ں کی شاعری میں انتخاب کی گنجائش نہیں۔ ان کا ایک شعر بھی ایسا نہیں جو نظر انداز کیا جا سکے۔ فانیؔ اس حیثیت سے بہت بلند ہیں۔

فانیؔ کی طبیعت جدت پسند تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بعض فرسودہ خیالات، جن کو بیسیوں شعراء نے بار ہا باندھا اور
ب بھی باندھتے ہیں، کچھ ایسے پیرائے میں ملتے ہیں کہ اُس طرح کسی اَور کو باندھنے کا خیال تک نہ ہوا۔ فانیؔ کی طبیعت میں اپج تھی جس نے ان کو ہر فرسودہ سے
فرسودہ خیال کو ایک جدید پیرائے میں ظاہر کرنے پر مجبور کیا۔ فانیؔ نے ان تمام فرسودہ خیالات کو نظم کیا ہے جو ولیؔ کے زمانے سے لے کر اب
ت نظم ہوتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی ہمیں وہی حشر کا ذکر ملتا ہے۔ وہی چاکِ گریباں۔ شبِ فرقت، ہجر و وصل، گل و بلبل،
شمع و پروانہ، طور و موسیٰ اور قیس و فرہاد وغیرہ کے افسانے ملتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک فانیؔ کی اپنی چیز معلوم ہوتی ہے جس کی
پیشانی پر جدت کا ٹیکا لگا ہے۔ ہمیں پڑھتے وقت اس کا شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ کسی کی تقلید میں کہے گئے ہیں ؎

کچھ کھیل نہ تھا یوں بھی پروانہ کا جل بجھنا　　جل کر نہ بجھے ایسے پروانے کو کیا کہئے

اب جفا ہے نہ وفا یادِ وفا باقی ہے　　تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانوں کی

پھر گوشہ گیرِ حلقۂ زنجیر ہے جنوں　　صحرا کو نذرِ تنگیٔ زنداں کئے ہوئے

پھر ابر میں وحشت کی تصویر نظر آئی　　لہرائی ہوئی بجلی زنجیر نظر آئی

بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر　　کچھ خاک سی اُڑی ہوئی سارے چمن میں تھی

رو رو کے ایک ایک قدم بڑھ رہا ہوں میں　　ہنستی ہے مجھ پہ دوریٔ منزل جگہ جگہ

شب گریۂ غم کے طوفاں کا وہ جوش وہ جوش ارے توبہ　　ہر اشک اُمڈ کر کہتا تھا میں دل کے لہو کا دریا ہوں

اُس نورِ مجسم کے افسانے کو کیا کہئے　　ہے شمع بھی پروانہ پروانے کو کیا کہئے

سحر ہوئی کہ وہ یادش بخیر آتا ہے　　چراغ ہیں مری تربت کے جھلملائے ہوئے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے　　دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کی　　گریباں نے گلے لپٹا لیا ہے بڑھ کے داماں کو

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانی　　ملتی ہے گلے مل کے سحر شمعِ سحر سے

سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار   نہ موجِ بوئے گل اُٹھتی نہ آشیاں ہوتا

سر پٹکتا ہوں خسانۂ زنجیر دیکھ کر   ہے ہے وہ اہلِ ذوق کی زنداں نوازیاں

صبحِ بہارِ حشر کا چہرہ اُتر گیا   شاید کہ شامِ ہجر کے مارے بھی جی اُٹھے

آرٹ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی انتہائی خوبی اس کے پوشیدہ رکھنے میں ہے جو آرٹسٹ اپنے آرٹ کو پوشیدہ رکھنا چاہئے گا وُہ صرف چند اشاروں سے اپنے مطلب کو ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا یہی آرٹ سب سے بلند ہے۔ بڑے شاعروں نے بھی ایسا ہی کیا ہے ہماری اُردو میں غالب کا پایہ اس میں بہت بلند ہے اور وُہ اس سلسلہ میں بہت کامیاب ہوئے ہیں لیکن غالب کے بعد اگر کسی دوسرے شاعر نے اس حیثیت سے کمال حاصل کیا تو وہ فانی ہیں۔ان کے بہت سے اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں انہوں نے صرف چند اشاروں سے اپنا مطلب بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ پڑھنے والا بعض چھوٹی ہوئی باتوں کو اپنے ذہن کی مدد سے پورا کر لیتا ہے جو انتہائی لطف کا باعث ہوتا ہے

تمہیں خبر ہے کہ اپنی خبر نہیں ہے مجھے   جنوں سہی اثرِ بے خودیٔ غم نہ سہی

کیا قیامت تھا وُہ تیرا جانبِ در دیکھنا   صبح تک فانی وُہ آوازِ شکست دل کے ساتھ

گریۂ شوق کو پھر دعوتِ طغیانی دے   سُن کے افسانۂ دل پھر متبسم ہو جا

کوئی جگہ اُٹھا نہ رکھ کوئی سوال رہ نہ جائے   عشق ہے جب جنوں تو پھر شاد ہوائے دل حزیں

اِک اِک لہو کی بوند پہ ظالم مچل گئی   اللہ رے نوکِ نشترِ غم کی لگاوٹیں

میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے   اک فسانہ سُن گئے اک کہہ گئے

محفل سے جو وُہ اُٹھے لیتے ہوئے انگڑائی   لبریز تموج تھا اِک اِک خطِ پیمانہ

فانی نے ہر جگہ زبان کا خیال رکھا ہے۔ اور جس موقع پر جیسی زبان کی ضرورت ہوئی ویسی ہی زبان استعمال کی ہے۔ان کی زبان میں

ایک عجیب طرح کی شیرینی ہے جس سے خواہ مخواہ لطف آتا ہے۔ اس میں ایک عجیب قسم کی گھلاوٹ ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ وہ عربی فارسی کی بڑی بڑی ترکیبیں اور الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ محاوروں کا مناسب موقع پر استعمال ان کی خاص خوبی ہے۔ وہ چند الفاظ کو باہم ملجا کے ایک ترنم پیدا کر دیتے ہیں جو شاعری کی جان ہے۔ وہی روزمرہ کی بول چال ہے لیکن فانی کی زبان سے جب وہی کلمات وزن و قافیہ کے سانچے میں ڈھل کر نکلتے ہیں تو ہر پڑھنے والے کا دل موہ لیتے ہیں مشکل خیالات کو آسان زبان میں بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بڑے بڑے شاعروں کو یہاں سپر ڈالنی پڑتی ہے لیکن فانی کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ بڑے سے بڑے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو ایسی زبان میں بیان کرتے ہیں کہ بھلا معلوم ہوتا ہے اور بغیر کسی کوشش کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ غزل میں جیسی پیاری زبان کی ضرورت ہوتی ہے وہ فانی کا حصہ ہے۔

غرض فانی بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی خوبیاں کہاں تک بیان کی جائیں۔ انہوں نے اپنا ایک بالکل الگ رنگ قائم کیا جو اردو غزل گوئی میں بالکل ایک نئے باب کا افتتاح ہے۔ ان کی شاعری گوناگوں خوبیوں کا گلدستہ ہے۔ ان کے نغموں میں ایک عجیب کیفیت ہے۔ ہر چند انہوں نے اپنی دنیا الگ بنالی تھی لیکن ان کے تمام افکار ایک انسان کے افکار معلوم ہوتے ہیں ان پر بیتنے ہوئے دکھ درد کو ہم خود اپنا دکھ درد محسوس کرتے ہیں۔ ان کے نغموں کا ہر پڑھنے والا اپنے دل میں ایک ٹیس سی محسوس کرتا ہے۔ فانی کی ساری زندگی رنج والم کے گہوارے میں گزری لیکن ان کی شاعری کے یہ پھول کبھی خزاں کی صورت نہ دیکھ سکیں گے۔ وہ ایسے پھول ہیں جن کی خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی ہے ——— ان کی شاعری بانسری کی ایک ایسی سُریلی تان ہے جو اپنی سحر آفرین و دردآگیں صدا سے ساری دنیا کو مبہوت کئے ہوئے ہے۔ ادب کی دیویاں (The Muses) اس پر اپنے تبسم کے پھول نچھاور کر رہی ہیں اُن کی شاعری کا ماہتاب آسمانِ ادب پر جگمگا رہا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ جگمگاتا رہے گا اور اس کی چاندنی کی حسین مسکراہٹ سے ساری دُنیا لطف اندوز ہو رہی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ ہوتی رہے گی لیکن کائنات کی ہر چیز ان کا نام آتے کے ساتھ ہی دھیمے سروں میں یہ گنگناتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ؎

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہئے تھا — فانی

عبادت بریلوی

تاریخ وفات حضرتِ فانی بدایونی مرحوم و مغفور

ہے کیا تربتِ فانی پہ کتبہ — بہت حیراں تھے احباب پریشاں
کہا یہ صدق نے اے حق شناسو — فقط لکھ دو، غبارِ ناامیداں
۱۳۶۰ھ

صدق جائسی

رات

تخیّل کے طائر نے بازو سمیٹے
بسیرا لیا نیند کے آشیاں میں
چمکتے، جھمکتے ستاروں کی کلیاں
کھلیں، دورِ آکاش کے گلستاں میں
نشیلا اندھیرا، طلسمی خموشی، خموشی میں جاں بخش لوری کا جادُو
ملائم سی خنکی، لچیلی ہوائیں۔ ہواؤں کی موجوں میں ہلکی سی خوشبو

وُہ رہ رہ کے مُڑتی ہوئی نرم شاخیں
وُہ تھم تھم کے بہتے ہوئے نرم جھونکے
وُہ کوئل کی دلدوز، مدھم صدائیں
وُہ جھیلوں میں لہروں کے خوابیدہ نغمے
کہیں گیت گاتی ہوئی جنبشیں ہیں، کہیں گنگناتی ہوئی سرسراہٹ
کہیں جگنوؤں کی گھڑی بھر چمک میں اندھیرے کی سہمی ہوئی مُسکراہٹ

رات

خلاؤں میں رقصاں ہے شب کی حسینہ
ستاروں کا زرتار پرچم اڑائے
نشیلے اندھیرے پہ چھائے ہوئے ہیں
سنہرے طربناک خوابوں کے سائے

پُراسرار ظلمت، وہ رنگین سپنے، وہ سپنوں میں جیون کی آشائیں لرزاں
جوانی کے سہمے ہوئے ولولوں میں فراغت کی دھندلی تمنائیں لرزاں

یہ زنداں کی زنجیر ٹوٹی پڑی ہے!!
وہ "افلاس کا دیو" سویا ہوا ہے!!
یہ "دکھ درد کا راکشس" سرنگوں ہے!!
وہ "آزادیوں کا دریچہ" کھلا ہے!!
یہ دم بھر کو رویں جو چونچال سی ہیں، وہ سب خواب کی دلنشیں سیمیا ہے
نہ زنداں کی زنجیر ٹوٹی پڑی ہے، نہ افلاس کا دیو سویا ہوا ہے

ذوقی

گُناہ

جیسے اندھیرا گرہن کا چھا جائے تو دیکھ کے جی گھبرائے
چاند بنے انگارا سا اور سُرخ بھیانک ہوتا جائے
ویسے ہی رُوح کو ظلمت مرتے وقت گناہ کی آ کے ڈرائے

جیسے کوئی مرگھٹ کا راہی ڈرے کہ بھوت نہ آن دبائے
اُٹھے بونڈلا دبی راکھ کا، بھوت کی پرچھائیں بن جائے
ویسے ہی اپنا بھیانک سایہ مرتے وقت گناہ دکھائے

جیسے کسی مُردار پہ اِک دَم جھنڈ گدھوں کا جھپٹ کے آئے
بولے کوّا گلا پڑی بولی اور چیل اُڑے چلّائے
ویسے ہی غول گناہوں کا مرتے دَم روح پہ اُمنڈ لائے

جیسے جُواری ہار کے اپنی پونجی ہاتھ ملے پچھتائے
جان سے اپنی رُوٹھ کے اپنے گھر والوں سے آنکھ چُرائے
ویسے ہی کرنی اَن کرنی کی مرتے دَم یاد آ کے رُلائے

سانس اُکھڑتے دَم جب مشعل روح کی بھڑک کے اور بجھ جائے
کوئی پکارے اَبّا اماں اور کوئی بیرن کہہ چلائے
کھڑا گناہ تماشا دیکھے، بدل پینترا آگے آئے

روح نکل کر جسم سے تن کی لوتھ کو دیکھ کے جب ٹھکرائے
پھیر کے مُنہ نفرت سے، یاد کرے کچھ، روئے اور اُڑ جائے
بھوت گناہ کا گھبرا ڈالے پھاڑ کے مُنہ آنکھیں ہکلائے[1]

مُنہ سے سیاہی چھوڑ کے جب یہ موذی روح کو اس میں پھنسائے
آئے فرشتہ نیکی کا تب اس عفریت کا زور گھٹائے
پھر بھی گناہ نہ پیچھا چھوڑے، دانت دلے گرجے غرّائے

برق کی تیزی سے یہ فرشتہ جنّت تک جب روح کو لائے
کھول کے در فردوس کا اس کو اُن کی منزل تک پہونچائے

[1] یعنی خوفناک طریقے سے ہکلائے

فرحت .... کوئی شخص ثروت .... اُس کی بیوی

شریف .... ان کا نوکر لطیف .... ان کے دوست کا نوکر

کھانا کھانے کا کمرہ وقت صبح نو بج کر دس منٹ

ایک نو فٹ مربع کمرہ جس کے درمیان ایک میز پر رومال سے کچھ ڈھکا پڑا ہے میز کے چاروں طرف کرسیاں سجی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ کھانا چنا گیا ہے مگر کھانے والے ابھی تک نہیں آئے۔ کمرے کے شمال میں ایک دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا ہے اور دوسرا مشرق کی طرف صحن میں۔ مغربی دیوار میں ایک کھڑکی ہے جس کے پہلو میں پڑی الماری میں چینی کے برتن ترتیب سے سجے نظر آ رہے ہیں۔ دروازوں اور کھڑکی کے سامنے پھولدار پردے لٹک رہے ہیں۔

شریف بلور کے جگ میں پانی لیے مشرقی دروازے سے داخل ہوتا ہے ثروت اور فرحت کو کمرے میں نہ دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے اور دیوار پہ لگی کلاک کو دیکھتا ہے اور خود بخود کہنے لگتا ہے۔ آج صاحب کھانا کھانے کیوں نہیں آئے شاید میں گھنٹی بجانی بھول گیا ہوں مگر اب تو دس منٹ دیر بھی ہو گئی ہے...... میرے اللہ اب کیا بنے گا بیگم صاحبہ کا پارہ خدا جانے کس درجہ پر پہنچ جائے۔ آج ضرور کچھ نہ کچھ گل کھلیں گے۔ میرے پروردگار تیرا ہی آسرا ہے تو ہی۔ ہاں تو ہی سب کو روزی دینے والا ہے

(گھنٹی کا بٹن دباتا ہے)

ایک ہی لمحے بعد میاں بیوی مسکراتے ہوئے شمالی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وُہ گھنٹی کے انتظار ہی میں تھے۔ ثروت اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے شریف کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہے۔

شریف۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) بیگم صاحب معافی کا خواستگار ہوں۔ گھر کے ایک معاملے میں اس قدر اُلجھ گیا تھا کہ گھنٹی بجانے کی سُدھ بدھ نہ رہی بیگم صاحبہ پہلی بار تو ضرور معاف کر دیجئے آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا میں غریب آدمی ہوں۔ آپ کے طفیل خدا مجھے بھی روزی دے رہا ہے۔

ثروت۔ اوہو شریف اتنا کیوں گھبراتے ہو (مسکراتے ہوئے) اب ذرا احتیاط سے کام کرنا غلطی آخر انسان ہی سے سرزد ہوتی ہے نا۔ چلو اب کے معاف کر دیا۔

(باہر کی گھنٹی بجتی ہے شریف باہر جاتا ہے اور دل میں کہتا ہے بڑی آئی ہے معافی دینے والی جیسے یہ ہی میری خدا ہے)

مُوا آج کل بہت سست ہو گیا ہے ان غریبوں کو اگر پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے تو اپنی اوقات ہی بھول جاتے ہیں چار دن کھانے کو نہ ملے تو ساری سُدھ بُدھ ٹھیک ہو جائے۔

فرحت۔ [illegible]

میں کھانا کھانے کا خاک مزہ آئے گا اگر کبھی پھر ایسا کرے تو نوکری سے جواب دے دینا نہ معلوم ۔۔۔۔۔۔۔۔

(شریف اور لطیف داخل ہوتے ہیں ثانی الذکر کے داہنے ہاتھ میں ٹفن باکس ہے)

سناؤ لطیف کیسے آئے عقیل صاحب تو اچھے ہیں

لطیف۔ (ٹفن باکس دیتے ہوئے) اسلام حضور عقیل صاحب نے مچھلی بھیجی ہے ان کی بیگم صاحبہ نے خود تلی ہے۔
جیب سے ایک رقعہ نکال کر فرحت کو دیتا ہے)

فرحت۔ بڑی تکلیف کی عقیل بھائی نے

(رقعہ پڑھتا ہے اور جیب سے قلم نکال کر اس پر کچھ لکھ کر لطیف کو واپس کر دیتا ہے)

ان سے کہنا کہ مچھلی نہایت ہی لذیذ ہے ساری عمر میں ایسی تلی ہوئی کبھی نہیں کھائی۔ دیکھو نا ثروت پیازی پیازی رنگ کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے

(لطیف سلام کر کے چلا جاتا ہے)

ثروت۔ (خاوند کی زبانی کسی دوسری عورت کی تلی ہوئی چیز کی تعریف سن کر اُس کا رنگ غصے سے سرخ ہو رہا ہے مچھلی کو چھوتے ہوئے) آپ بھی تو کمال کرتے ہیں خواہ مخواہ تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں۔ دیکھیں تو ذرا۔ مجھے تو پھیکی ہی معلوم ہوتی ہے اور آپ کی زبان سوکھ گئی پیازی رنگ کے قصیدے کہتے کہتے۔

فرحت۔ (جو اپنی بیوی کی فطرت سے واقف ہے جھک کر) واللہ ثروت تم نے تو کمال کر دیا۔ ابھی اس سے تو واقعی بساندھ اُٹھ رہی ہے عقیل بھائی بھی کمال کرتے ہیں جو ایسی مچھلی بھیج دی۔

ثروت (طنزاً) شوق تو سب کو آتا ہے کہ طرح طرح کے کھانے پکائیں مگر ڈھنگ تو کسی کسی کو آتا ہے۔ کیوں جی کیسی تھی وُہ جو پچھلے ہفتے میں نے آپ کے لئے تلی تھی۔

فرحت (اپنے گناہ کی تلافی کا موقع پاتے ہوئے) واقعی وُہ تو ایسی عمدہ تھی کہ دل چاہتا تھا کھاتا ہی جاؤں۔ یہ پکانا بھی کوئی آسان کام نہیں اس میں تو ایک خاص ملکہ ہونا چاہیئے (زبان کو چٹخارتے ہوئے) مجھے تو اُس مچھلی کا مزا ابھی سے آنے لگا۔

ثروت (فاتحانہ انداز میں) رشیدہ بھی کہتی ہوگی کہ میں نے آج کدو میں تیر مار لیا ہے۔ ابھی کل یہاں تھی مجھ سے ذکر کیا ہوتا تو ایسا طریقہ بتاتی کہ دنگ رہ جاتی۔ بھلا آپ کیوں اتنی خراب مچھلی کھائیں میں خود اس کو ٹھیک کر کے لاتی ہوں۔ آپ کو دیر تو جائے گی مگر میری خاطر ذرا دیر ہی سہی۔

فرحت۔ نہ بھئی تم پہلے کھانا تو کھا لو۔ شریف کو دو۔ وُہ اِس کو ٹھیک کر کے لے آئے۔ یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ آپ جیسی پکانے والی تو ہندوستان میں کوئی عورت ہی ہوگی۔

ثروت۔ نہیں نہیں میں خود ہی جلد ٹھیک کر کے لاتی ہوں دیکھنا تو اسی میں جان پڑی ہوئی معلوم ہوگی۔

(پلیٹ لے کر باہر چلی جاتی ہے)

فرحت۔ شریف مہمانوں کو مدد دینا۔ ایسا نہ ہو کہ ہاتھ ہی جلا بیٹھیں۔

(شریف چلا جاتا ہے)

یہ عورت ذات بھی عجیب ہے ذرا سی تعریف کر دو تو مرنے مارنے کو تیار۔ لاکھ کہوں کبھی کام کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ آج ذرا دوسری کو کوس دیا ہے اور ان کی تعریف کر دی ہے تو کھانا تک بھی بھول گئی ہیں جیسے روز ہی مجھے پکا پکا کر کھلاتی ہیں اور پچھلے ہفتے جو کالی سیاہ مچھلی مجھے کھلائی تھی وہ بھی کبھی بھول سکتی ہے۔ مفت میں گھی ضائع کر دیا تھا اور آج ہی خیر گزرے اچھی بھلی کا ستیاناس کرنے لگی ہیں۔

(گھڑی دس بجاتی ہے فرحت گھبرا کر اُٹھتا ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے وہ کچھ کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر سمجھ میں کچھ نہیں آتا)

جابر عجمی

قطعات

شمیم اختر

مجھے رہ رہ کے کیوں تکتی ہے تُو نھی شمیم اختر
نہیں جاتی تری آنکھوں کی حیرانی نہیں جاتی
ترے خاموش لب بے تاب ہیں شاید یہ کہنے کو
یہ پہچانی ہوئی صورت ہے پہچانی نہیں جاتی

مجید لاہوری

آنسو

آہ کیا آج یہ نیرنگیٔ عالم دیکھی
اُن کی آنکھوں سے عیاں کیفیتِ غم دیکھی
عارضوں پر وہ ڈھلکتے ہوئے آنسو توبہ!
میں نے شعلوں پہ مچلتی ہوئی شبنم دیکھی

ضیا ہلالی

خوشی

زندگانی کا یہ مقصد ہے کہ انسان خوش رہے
سچ تو یہ ہے ناخوشی کی زندگی اچھی نہیں
ہاں خوشی اچھی ہے وہ جو ہو میسر غم کے بعد
جس خوشی کے بعد غم ہو وہ خوشی اچھی نہیں

ضیا ہلالی

خامُشی سے آنسوؤں کے درمیاں!

خامُشی سے آنسوؤں کے درمیاں
جب ہوئے تھے ہم جُدا
دلِ شکستہ اور برسوں تک نہ ملنے کے لئے،
تیرا چہرہ زرد تھا،
تیرے عارض سرد تھے،
سرد تر بوسہ ترا،
اور اُس لمحے کی پیشانی پہ تھے
دائمی غم کے نشاں!
صُبح کی شبنم مرے ابرو کے پاس
سرد ہو کر جم گئی؛
اور مجھ کو ہو گیا اُس دُکھ کی آمد کا یقیں
آج میں محسوس کرتا ہوں جسے

توڑ کر سب عہد و پیماں، کھو دیا تُو نے وقار،
تذکرہ تیرا جب آتا ہے کہیں
شرم سے گردن جُھکا لیتا ہوں میں۔

اِس طرح میں نام سُنتا ہوں ترا،
موت کا ناقوس ہو جیسے کہیں؛
کانپنے لگتا ہوں میں ——
کس لئے تُو اتنی پیاری تھی مجھے؟
کس کو یہ معلوم تجھ سے آشنا تھا میں کبھی
آشنا تھا خوب تجھ سے آشنا؛
ایک عرصے تک پشیمانی میں روؤں گا تجھے
وُہ پشیمانی کہ ممکن ہی نہیں جس کا بیاں۔
ہم ملے تھے گوشۂ تنہائی میں؛
کُنجِ خاموشی میں روتا ہوں میں آج،
بُھول بیٹھا تیرا دل کیوں کر مجھے؟
رُوح تیری دے سکی کیوں کر فریب؟
گر کبھی برسوں کے بعد ——
مِل سکے ہم تم کہیں
خیر مقدم تیرا ہو گا کس طرح؟ ——
خامُشی سے آنسوؤں کے درمیاں!

(ماخوذ)

سعید احمد اعجاز

تتلیاں

آج بر خود غلط گلستاں کے — پھول کچھ اس طرح سے اترائے
جیسے زہرہ کے ہاتھ کی چوڑی — ٹوٹ کر آسماں سے گر جائے

رنگ و بو کے حسین جھرمٹ میں — کوئی نازک سی چیز لرزاں ہے
گر کے دوبارہ پھول کی پتّی — شاخِ گُل کی طرف خراماں ہے

جیسے قوسِ قزح کا اِک ٹکڑا — آسماں کی فضاؤں سے آئے
اور پھر چوم کر گلستاں کو — آسماں ہی کی سمت اُڑ جائے

آسماں کی فضاؤں میں پریاں — جیسے بن ٹھن کے سیر کو آئیں
اور ماتھے سے ٹکلیاں سب کی — چھوٹ کر گلستاں میں گر جائیں

ایک حسینہ سے صاف پانی میں — جیسے مٹی کا تیل پڑ جائے
اور پھر سطح کا کوئی گوشہ — بس یونہی اپنے آپ اُبھر جائے

باغ میں جیسے ایک دوشیزہ — کوئی رنگین خط پڑا پا لے
اور پھر پڑھ کے ایک دو جملے — غصے میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے

دور، جمنا ندی کی لہروں میں — کرشن کی بانسری غزل خواں ہے
اور یہاں گوپیوں کا اک جھرمٹ — روپ میں تتلیوں کے رقصاں ہے

دوست! تم کہہ رہے ہو "ہم اور وہ" — پھر انہیں الفتوں میں کھو جائیں
ہاں — اگر دوسرے جنم میں ہم — تتلیاں، گلستاں کی ہو جائیں!!

سلام

رکابی کیونکر ٹوٹی؟

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افرادِ ڈراما

اعجاز ——— ایک اُنیس برس کا نوجوان جو کالج میں پڑھتا ہے

راشد ——— اعجاز کا باپ - ایک پولیس افسر

نجمہ ——— اعجاز کی سوتیلی ماں

اور گھر کے دوسرے افراد بچے۔ نوکر وغیرہ

موقع۔ راشد بڑے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹا ہوا ایک انگریزی ناول پڑھ رہا ہے — حقہ ساتھ دھرا ہے — نجمہ باورچی خانے میں مصروف ہے۔ اعجاز صبح سے کالج میں ہے۔

نجمہ۔ (باورچی خانے میں چیختی ہے) کہاں سو رہے ہیں آپ؟ چیخ چیخ کر گلا آگیا ہے جو ذرا اپنے کانوں میں سے روئی نکالیں!

راشد۔ (لیٹے لیٹے حقے کا ایک لمبا کش لگا کر) کیوں کیا ہوا۔ ؟ سن تو رہا ہوں (نجمہ آگ بھبوکا بنی باورچی خانے سے کمرے میں آجاتی ہے)

راشد۔ (کتاب بند کر کے) کیوں کیا ہوا —؟

نجمہ۔ چولہے میں جائیں ایسے چونچلے — ایسا لاڈ پیار جو اولاد کو کوڑی بھر کا نہ چھوڑے۔ جو کہیں کوئی بات کہہ بیٹھتی ہوں تو گھنٹوں کٹی کٹی سی رہتی ہوں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہائے سوتیلی ماں ہے بچے کی جان کی لاگو ہو رہی ہے۔ مگر پھر بھی کوئی حد ہوتی ہے کوئی —

راشد۔ (بات کاٹ کر) مگر میرا مطلب یہ ہے کہ بات کیا ہے؟ (نجمہ کے جوشِ غضب میں ہلتے ہوئے ہاتھوں کو بغور دیکھتا ہے)

نجمہ۔ اور جو تنگ آکر موٹی زبان سے نقطہ بھر لفظ نکال بھی دوں تو "کس پر برس رہی ہو — بات کیا ہے — یہ ہے وُہ ہے —"

راشد۔ (قدرے جھنجلا کر) ہاں اب بتا بھی تو دو کہ یہ تمہیدی لیکچر کس موضوع پر ہے؟

نجمہ۔ لیکچر کاہے کا۔ سچی بات کہوں تو وہ لیکچر بن جاتا ہے۔ واہ رے میں کی موج گھر تہ و بالا ہو رہا ہو۔ بھنگیوں کا تکیہ بن رہا ہو اور یہ پوچھے جاتے ہیں یہ لیکچر کس پہ ہو رہا ہے۔

راشد۔ (تنگ آکر کتاب دوبارہ کھول لیتا ہے) بھئی بتانا ہے تو بتاؤ ورنہ ——

نجمہ۔ ورنہ — ورنہ یہی تو کہہ رہی ہوں کہ رات کو کورٹ انسپکٹر کے ہاں سے زردے کی ایک پلیٹ آئی تھی میں نے کہا اتنی رات گئے کون کھائے گا۔ صبح دوپہر کو گرم کر کے کھالیں گے (ناک پر انگلی رکھ کر اور طنز سے) آپ کے فرزندِ رشید چپکے سے رات ہی رات کو سب کچھ اکیلے ہضم کر گئے اور یہی نہیں بلکہ کھانے کے بعد پلیٹ کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کرتے گئے۔

راشد۔ کیا سچ وہی کھا گیا؟

نجمہ۔ اور نہیں تو کیا جنات کھا گئے۔ آسمان کھا گیا۔ زمین نگل گئی میرے فرشتے کھا گئے ـــــ وہی تو کھا گیا ہے ـــــ آدھی رات گئے اٹھا۔ "پیٹ میں درد ہوتا ہے امی جان چٹکی بھر سونف ہو تو دو مجھے کیا معلوم یہ زردے کا درد ہے ورنہ کھلاتی اُسے سونف۔ پھر کچھ کہتی ہوں تو سو سو باتیں کرتے ہیں۔

راشد۔ (قدرے مسکرا کر سر کھجاتا ہے)

نجمہ۔ کیا مجھے پاگل سمجھتے ہیں آپ۔

راشد۔ (سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کسی گہرے سوچ میں متغرق ہے)

نجمہ۔ یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ ان مہمانوں کے لئے رکھی ہوئی ساری کی ساری پیسٹری نکال کر کھا گیا۔ میں کسی کی دشمن تو نہیں ہوں آخر ماں ہوں۔ میرے بھی بچے ہیں۔ مگر ان روز روز کی شرارتوں پر کب تک آنکھیں میچے رکھوں گی ـــــ

راشد۔ (کتاب بند کر کے اُسے انگلیوں سے ٹھونکتے ہوئے) مگر ـ مگر ـ مگر ـــــ میرا مطلب تم سمجھتی ہو گی کہ اگر زردہ کھا ہی گیا تھا تو پلیٹ کو کیوں توڑ دیا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔

نجمہ۔ ابھی کیونکر سمجھ میں آئے بس خرمستی سمجھ لو۔ جوانی کا خمار جانو۔ نہ دیدوں میں ڈر نہ آنکھوں میں حیا۔ مُرغے کی طرح اکڑتا پھرتا ہے اور پھر کوئی ذرا نصیحت کر کے تو دیکھے بھئی مجھ سے نہیں سنبھالی جاتی اولاد آپ کی۔ اگر آپ اسی اولاد پہ پھولے پھرتے ہیں تو عاجز آئی ہیں بندی خدا کی ننھے کو سنبھالئے اور ان دو کے نامرادوں کو بھی میرا سلام ہے۔ (آواز بھرائی بنا کر) امی جان خدا جانے کتنی بیمار ہیں خط پر خط آ رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ یا اللہ میں ہی بدقسمت آپ لوگوں کی باندی بننے کے لئے رہ گئی تھی۔ سارا دن چولھا ہے اور ـــــ

راشد۔ خیر اُس شریر کو آ لینے دو۔ باز پرس کریں گے!

نجمہ۔ ہاں ہاں شوق سے کیجئے باز پرس (طنز سے قہقہہ لگا کر) کیوں بیٹا وُہ شرارت کیوں کی۔ کیوں بیٹا آئندہ تو ایسا نہ کرو گے نا۔ بچے یہ ہے بچے وُہ ہے"۔ آپ اُسے نصیحت دیتے ہیں یا پیار کرتے ہیں

راشد۔ نجمہ تم تو نری باولی ہی ہو۔ اوّل تو اعجاز کوئی بچہ نہیں کہ چھڑی لے کر اُس کے سر ہو جاؤں دوسرے ـ (رُک جاتا ہے)

نجمہ۔ ہاں ہاں دوسرے ـــــ یہی نا کہ دوسرے ـ بولئے بولئے رُک کیوں گئے ـــــ

راشد۔ کچھ یقین نہیں آتا کہ وُہ اتنا خود سر ہو۔

نجمہ۔ (گہری آواز سے) خود سر ـ خود سر ـ اخاہ! امی جان میرے بوٹ کا ٹانکا ادھڑ گیا ہے ابا جان کا لوٹا بنسوں گا۔ امی جان کوٹ میلا ہو رہا ہے ابا جان کا پہن لوں گا"۔ لاکھ سر پٹکتی ہوں کہ اُن کے وردی کے جوڑے ہیں مگر وہ ہیں کہ (ذرا سانس لے کر بات بھول جاتی ہے) مگر وُہ ہیں کہ ـــــ مگر وُہ ہیں کہ ـ کیا ـ آخر دوسروں کے بھی بچے ہوتے ہیں کیا سدھرے ہوئے من موہنی عادات میٹھی مسکراہٹیں۔ باادب نظریں نہ کہ چوبیس گھنٹے تنبورے کی طرح تنے رہیں ـــــ ابا جان کا ڈرائینگ روم ہے کہ ریڈیو گھر بن رہا ہے کہیں سے وہ کیا ہنجو سیکھ آئے ہیں۔ سارا دن کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی (تقریر بے معنی ہوئی جاتی ہے) آخر پوچھو اس ہنجو کا بھی بھلا کوئی سر ہے تان ہے ـ تن تن ـ تن تن ـــــ

راشد۔ (چھیڑنے کے لئے) آخر بچہ ہے۔ ہارمونیم تریس روپے خرچ نہ کئے دو ڈھائی کا سستا سا دل بہلاوا خرید لیا۔ ہنجو تو کوئی بیہودہ تقریب نہیں مطلب یہ کہ کوئی بیہودہ چیز نہیں ـ چیز نہیں۔

نجمہ ـــــ (خاموش ہو جاتی ہے ـــــ خدا جانے غصے سے یا ویسے

کوئی جواب نہیں سوجھتا)

راشد۔ (بات شروع کرنے کے لئے) مطلب یہ کہ زردہ کھا گیا اور پلیٹ توڑ گیا۔

نجمہ۔ (طنز سے سر جھٹک) ہوں۔!

راشد۔ مگر اتنی دیدہ دلیری کی کوئی معقول وجہ بھی تو ہونی چاہیئے نا؟

نجمہ۔ (جوش سے پھر شروع ہو جاتی) وجہ۔۔۔ وجہ۔۔۔ میں تو ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ آج کل زمانہ ہی ایسا ہے ذرا کچھ پڑھ لکھ گئے تو خدا معلوم کیا تیس مار خاں بن جاتے ہیں۔ وُہ پُرانے زمانے گئے جب چار چار بچوں کے باپ بن جانے کے بعد بھی لڑکے ماں باپ کے سامنے اُف تک نہ کہتے تھے۔ آج کل ماں باپ کا پیسہ ہے سکول کیا سینما گھر بن رہے ہیں ڈرامے ہوتے ہیں فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ روزانہ ورزش کے بہانے ایک آدھ گھنٹہ ٹٹوں میراثیوں کے کرتب سکھائے جاتے ہیں۔ اللہ جب سارا دن فضول باتوں پر مغز مارتے مارتے باہر نکلتے ہیں تو کبھی رومال سے بوٹ کی گرد جھاڑتے ہیں۔ کبھی ٹائی سیدھی کرتے ہیں۔۔۔ ماں باپ کے گاڑھے پسینے کی کمائی کی انہیں قدر ہو تو کیونکر ہو۔۔۔ جب تک کہ۔۔۔

راشد۔۔۔ تو پھر کیا پڑھائی چھڑا دوں۔۔۔؟

نجمہ۔۔۔ (قدرے اطمینان سے) پڑھائی چھڑانے کی تو بات نہیں بات تو فقط یہ ہے کہ ان خود سر لڑکوں کو احساس ہی تو ہو کہ یہ پیسہ کدھر سے اور کیونکر آتا ہے۔

راشد۔ یعنی کہیں نوکر کرا دوں؟

نجمہ۔۔ ہاں ہاں کہہ تو رہی ہوں کہ آج کل قسمت سے سرکاری بھرتی بھی کھلی ہے۔

راشد۔ (قدرے ناک بھوں چڑھاتا ہے)

نجمہ۔۔ (سانس لے کر قدرے آہستہ سے) آخر تو نوکری کرنی ہے۔ کیوں رہ گیا نا میرا لال جیسے کہیں کا کمشنر اسی کو ہونا ہے۔ سنتے ہیں (قدرے آہستہ سے) آخر وُہ امجد بھائی کا بیٹا احمد بھی تو وہیں کہیں گیا ہے نا۔۔۔ کیا نام ہے اُس جگہ کا۔۔۔ اوہ! یہی کچھ تو ہے۔۔۔ جل پور۔۔۔ جل پور۔۔۔

راشد۔ جبل پور۔۔۔؟

نجمہ۔۔۔ ہاں ہاں وہیں جبل پور ہی تو گیا ہے۔۔۔ وُہ چلا گیا تو اس میں کونسا سرخاب کا پَر لگا ہے

راشد۔۔۔ مگر ایسے بھولے بھالے بچے کو ایسی گندی نوکری؟

نجمہ۔۔۔ (بات کاٹ کر اور لمبا سا ٹھنڈا سانس لے کر) اوہ اہو! بھولا بھالا۔۔۔ خُدا ایسا بھولا بھالا کاش ہمیں بھی بنا دیتا۔۔۔ یہ بھولا پن میکے ہی سے سیکھ آتے تو کا ہے کو جوتیاں کھاتے پھرتے۔۔۔ ابھی وہ تو بہروپیا ہے۔ پکا بہروپیا۔ آپ کو دیکھا تو بس بن گئے لگا بھگت۔ مُنہ لٹکا لیا۔۔۔ آنکھیں نیچی کر لیں اور آواز گلے میں گم کر لی اور اندر سے کھول کر دیکھو تو۔۔۔

راشد۔۔۔ (بات بدلنے کیلئے) نوکر بازار سے سبزی اچھی لایا تھا یا کل ہی کی طرح ناقص ہے؟

نجمہ۔۔۔ (اپنی ہی دُھن) ہاں ہاں سبزی سبزی۔ اجی سبزی چھوڑو وہ تو چھلاوا ہے۔۔۔ سبزی سبزی۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔ کونسی سبزی۔۔۔ کدھر سبزی؟

راشد۔۔۔ نجمہ! پاگل تو نہیں ہو رہی ہو۔۔۔؟

نجمہ۔۔۔ ہاں! اب پاگل بننا ہی رہ گیا تھا۔ سو بن گئی۔ گھر کیا ہے پاگل خانہ بنا ہوا ہے۔ بھنگیوں کا تکیہ بن رہا ہے۔ وُہ شور۔۔۔ وُہ شور۔۔۔ وُہ دھما چوکڑی۔۔۔

راشد۔۔۔ (سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے) اچھا آ لینے دو شیطان کو۔

نجمہ۔ (بات دہرا کر) آ اپنے دو شیطان کو ـــ (طنز سے قہقہہ لگا کر) ذرا دو چار دن بھی پل لئے ہوتے ـــ کیسے بیسے آتے ہی اُسے کھا ہی تو جائیں گے ـــ اور اور جب آمنے سامنے ہوں گے تو آؤ بیٹا ـــ کھاؤ بیٹا ـــ چلو بیٹا ـــ سنو بیٹا ـــ بیٹا ـــ بیٹا ـــ بیٹا ہی بیٹا ـــ بیٹے کے لئے بچھے بچھے جاتے ہیں۔ بیٹے کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں ـــ

(اعجاز ہانپتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے۔ پسینے میں شرابور اور بوٹ پر گرد جمی ہوئی۔ بغل میں کتابوں کا بنڈل ہے)

اعجاز ـــ امی جان سلام عرض کرتا ہوں ـــ

نجمہ ـــ (آہستہ سے) جیتے رہو بیٹا ـــ!

اعجاز ـــ ابا جان سلام عرض ہے ـــ!

راشد ـــ خاموشی ـــ

(اعجاز قدرے جھجک کر کچھ خوف اور شک سے ـــ کنکھیوں سے والد کی طرف دیکھتے ہوئے دوسرے کمرے میں گھس جاتا ہے)

نجمہ دوپٹے سے منہ پونچھتی ہوئی باورچی خانے میں میں چلی جاتی ہے۔

راشد ـــ (آواز دیتا ہے) اعجاز ـــ!

اعجاز ـــ جی ابا ـــ آیا ـــ

(اعجاز کمرے میں داخل ہوتا ہے)

راشد ـــ (ماتھے پہ تیوری ڈال کر اور بلند آواز سے جو باورچی خانے تک بخوبی سنی جائے)۔ کیوں رے بہرو پئے ـــ وہ زردہ تو نے کھایا ہے؟

اعجاز ـــ (حیران نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) زردہ ـــ؟

راشد ـــ (بلند آواز میں) ہاں ہاں زردہ کھا لیا اور رکابی توڑ ڈالی ـــ!

اعجاز ـــ اور رکابی توڑ ڈالی ـــ

راشد ـــ ہاں رکابی توڑ دی!

اعجاز ـــ رکابی توڑ دی ـــ یعنی میں نے ـــ اور (آہستہ سے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) ـــ مگر کون کہتا ہے ـــ؟

راشد ـــ (بلند آواز میں) کھڑے ہو جاؤ ـــ (اور زیادہ بلند آواز میں) تمہاری امی کہتی ہیں۔ بتاؤ یہ روز روز کی شرارتیں کب بند ہوں گی؟

اعجاز ـــ ابا جان ایمان سے کہتا ہوں مجھے تو زردے کی خبر ہی نہیں۔ کونسا زردہ اور کیسا زردہ اور کیسی رکابی۔ یہ کیا اسرار ہے۔ کونسا زردہ کونسی رکابی۔ کہاں پڑی تھی اور یہ کیا معاملہ ہے ـــ؟

(نجمہ چک اُٹھا کر اندر داخل ہوتی ہے)

نجمہ ـــ زردہ تو خیر معمولی بات تھی۔ چیزیں کھانے پینے کے لئے ہی ہوتی ہیں۔ مگر پلیٹ اور وہ بھی پرائی توڑ دینا تو تمت ہے ـــ۔

اعجاز ـــ مگر امی جان میں تو سمجھ ہی نہیں رہا کہ بات کیا ہے ـــ؟

راشد ـــ (رعب سے مونچھوں کو تاؤ دے کر) ہوں ـــ کیسا زردہ اور کیسی رکابی ـــ (بلند آواز سے) جرم کا اقبال کرتا ہے کہ نہیں ـــ؟

اعجاز ـــ کیسا جرم ابا جان ـــ؟

راشد ـــ رکابی اور زردے والا ـــ

اعجاز ـــ (انگلی دانتوں تلے دبا کر سوچتا ہے) زردے اور رکابی والا جرم؟

راشد۔ اور فاطمی تیسرا جرم ۔۔۔

(نجمہ خاموشی اور اطمینان سے دوسرے پلنگ پر بیٹھ کر سوئے ہوئے ننھے کو پنکھا کرنے لگتی ہے)

راشد۔ (زمین پر زور زور سے پاؤں مارتا ہے) آج تمہیں ہرگز معاف نہیں کیا جاسکتا بولو ۔۔۔ ! ۔۔۔ جرم کا اقبال کرتے ہو نا؟

(اعجاز کی چھوٹی سوتیلی بہن صبیحہ دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی ہے اور اس عدالتی کارروائی کو دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے۔ کبھی اعجاز کے چہرے کو دیکھتی ہے اور کبھی اپنے ابا کے منہ کو۔)

راشد۔ کیوں اقبال ہے نا ۔۔۔ !

صبیحہ ۔۔۔ اقبال ۔۔۔ ہاں اقبال ۔۔۔ (صبیحہ ہاتھ اٹھا کر اور منہ بنا بنا کر کہتی ہے) ۔۔۔ اقبال تو روز مدرسے آتی ہے ۔ میری بڑی اچھی سہیلی ہے۔ ہم دونوں اکٹھے بیٹھتے ہیں دیکھو نا ابا جی ہماری استانی بڑی خراب ہے ۔۔۔

راشد۔ (صبیحہ کو گود میں اٹھا لیتا ہے اور اسے پیار کرنے لگتا ہے ۔۔۔ ادھر اعجاز کو بیٹھ جانے کا اشارہ کرتا ہے اور وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

صبیحہ ۔ ابا کے پیٹ پر اچھلتے ہوئے) کیوں ابا کھایا نا زردہ ۔۔۔ آج پھر کھائیں گے۔

نجمہ ۔۔۔ (چونکتی ہو کر) کیسا زردہ ری لڑکی ۔۔۔ ؟

صبیحہ ۔ (شوخی سے اچھل اچھل کر) رات ابا نے اور میں نے چوری چھپے پلیٹ میں رکھا ہوا سارا زردہ کھا لیا ۔۔۔

راشد ۔۔۔ (سنجیدہ سی شکل بنا کر) اور پلیٹ اِس نٹ کھٹ کے ہاتھوں سے چھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔

(اعجاز حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے ۔۔۔ نجمہ کھسیانی ہو کر قدرے مسکراتی ہے)

راشد ۔ کیوں سمجھ گئے بیٹا ۔ ! معاملہ کیا تھا ۔ !

نجمہ ۔ (کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے) رہنے بھی دیجئے ۔۔۔ یہ شرارتیں کیا مجھ موئی کا دماغ چاٹنے کے لئے ہوا کرتی ہیں (پھر قدرے متین چہرہ بنا کر بات بدلتے ہوئے)

امی جان خدا جانے کتنی بیمار ہیں ۔۔۔ بس اگلے پیر کو میں راولپنڈی چلی جاؤں گی۔

شمس الرحمٰن فرانی

تصحیح۔ حضرت ادیب کڈپوی نے اطلاع دی ہے کہ حضرت سیماب کی نظم مطبوعہ "ہمایوں" بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۱ء کا مطلع جس کے متعلق ہم نے کچھ شک ظاہر کیا تھا خود انہوں نے بدل دیا تھا ورنہ سیماب صاحب کا مطلع یہ تھا۔

روتے ہو بابار رات دن ناحق مجھے دفنا کے تم ۔۔۔ کرتے ہو کیوں آہ و فغاں میری لحد پر آ کے تم

غالب کا ایک خط۔ اکتوبر کے پرچے میں سید آغا حسین صاحب کے مضمون غالب کا ایک خط میں دو تین جگہ مرزا نوشتہ کا ذکر آتا ہے۔ ایک صاحب نے ہم سے مرزا نوشتہ کی حقیقت دریافت فرمائی ہے۔ اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ ہمارے طباع خوش نویس صاحب نے اِس مضمون میں غالب کے عُرف مرزا نوشہ کے بجائے جگہ جگہ محض اپنا عرف لکھ دیا ہے اور کوئی بات نہیں۔ ۔۔۔ "ہمایوں"

کوہسار کی رنگیں وادی میں

تصویر گزشتہ دور کی اک آنکھوں میں سمائی جاتی ہے
کہسار کی رنگیں وادی میں اُف تیری یاد ستاتی ہے

چشموں کے دہانوں پر اب بھی وُہ کیف کا عالم ہوتا ہے
کہسار کے سبزہ زاروں میں پھولوں کا مُنہ کوئی دھوتا ہے
کچھ اُونچے درختوں کا سایہ پانی میں مزے سے سوتا ہے
اِس حُسن کے رنگیں منظر میں دن رات مرا دل روتا ہے

تصویر گزشتہ دور کی اک آنکھوں میں سمائی جاتی ہے
کہسار کی رنگیں وادی میں اُف تیری یاد ستاتی ہے

ندی کے بے خود نغموں کا ہے اب بھی پُرانا ساز وہی
پانی کے مچلتے دھاروں کا مخمور خرامِ ناز وہی
مدہوش فضاؤں میں اب تک الفت کے نہاں ہیں راز وہی
اور ڈھونڈتا ہے۔ دل میرا یہاں سجدے وہی، ذوقِ نیاز وہی

تصویر گزشتہ دور کی اک آنکھوں میں سمائی جاتی ہے
کہسار کی رنگیں وادی میں اُف تیری یاد ستاتی ہے

ہاں چاندنی راتوں میں اب بھی دلدوز نظارے ہوتے ہیں
آکاش کے تارے شبنم کے نورانی ہار پروتے ہیں
مسحور ہواؤں کے جھونکے بے ہوش کی دنیا کھوتے ہیں
اُف میری جان پہ بنتی ہے جب دونوں عالم سوتے ہیں

تصویر گزشتہ دور کی اک آنکھوں میں سمائی جاتی ہے
کہسار کی رنگیں وادی میں اُف تیری یاد ستاتی ہے

ش۔ا۔شمیم جالندھری

بہ حضورِ اقبالؒ

(۱)

ابھی اس راہ سے واقف نہیں دل ‏ ‏ خودی کی چاہ سے واقف نہیں دل

کہ تیری آہ سے واقف نہیں دل ‏ ‏ ابھی دل میں ہے خاشاکِ من و تو

(۲)

ترے نکاتِ خودی ہیں بہت جلیل و جمیل ‏ ‏ ترے حقائقِ روشن ہیں بے نیازِ دلیل

تری نوا سے رواں تر فرات و دجلہ و نیل ‏ ‏ تری نظر سے حسیں تر چمن میں لالہ و گل

ہو جس طرح سے بیاباں میں ہجومِ نخیل ‏ ‏ فضائے عالمِ اُردو میں یوں ہیں شعر ترے

ترا کلام مرے وہم کو پیامِ رحیل۔ ‏ ‏ ترا کلام مری جانِ مضطرب کا قرار

کثیر جس کے معانی ہیں اور لفظ قلیل ‏ ‏ ترے کلام کو دل معجزہ سمجھتا ہے

اندھیری رات میں گم کردہ راہ راہی کو

یہ تیری شعلہ نوائی ہے واقعی قندیل

جگن ناتھ آزاد

سلہ اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
تیرے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل ‏ ‏ اقبالؒ

اصغر کی یاد

تقریباً ستّر مہینے ہوئے کہ اُس کی دائمی جدائی کا المناک واقعہ ہوا۔ میں کبھی کبھی اُس کی چیزوں سے اور اُس کے کاغذات سے دل دُکھاتا رہا، اُس کے حالات یاد کرکے یا جمع کرکے دل بہلاتا رہا۔ ایک سال ہُوا جب ہم پہاڑ سے لاہور واپس آئے تو میں نے اِرادہ کیا کہ اب کی سردیاں حیاتِ اصغر لکھنے میں صرف کروں گا۔ چنانچہ اَور سب کاموں کو تہ کرکے رکھ دیا، کاغذات ایک جگہ جمع کرلئے اُس کی چیزوں کو ترتیب دی، اِنہیں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ چند دوستوں عزیزوں کو اُس کے مزید حالات کے لئے لکھا، ولایت اَور خطوط لکھے جن میں سے بعض کا حال ہی میں جواب آیا ہے اَور اکثر کا اب تک جواب نہیں ملا، وہاں والے اپنی مصیبتوں میں گرفتار ہیں کیا کریں،

یہ اکتوبر ۴۰ء کا واقعہ ہے لیکن جلد اس کام کو چھوڑنا پڑا، چھوڑ کیسے سکتا ہوں ملتوی کرنا پڑا۔ ہر ہفتے صاحبِ فراش ہو جاتا، سمجھ میں نہ آتا کیا بات ہے، آخر ایک دوست نے سمجھایا اَور اصرار کیا کہ فی الحال اس محبوب کام کو چھوڑ دو۔ میں نے بھی جی سے کہا کہ جینا ہے اپنے لئے دوسروں کے لئے محض جینے کیلئے بھی۔ لیکن نِرا فلسفہ کام نہ آیا۔ آخر اپنے آپ کو چند ایسی باتوں میں ڈال دیا جن سے مجھے انتہائی دلچسپی تھی، اپنے خلاف سازش کی۔ اُردو زبان کے مسائل اور موجودہ حالات پر غور کیا، ایک طویل تبصرہ لکھ مارا، پنجاب میں ہندی والوں نے شورش بپا کی تھی، سو اُردو کی حمایت کا بیڑا اٹھایا کہ مجھے اسی میں سارے ہندوستان کی اَور مسلمانوں کی بہتری نظر آئی۔ پنجاب کے مسلم طلباء کی تنظیم ذمے لے کر اُنہیں بعض تعمیری کاموں میں لگانے کی کوشش کی۔ اس طرح اپنے آپ کو غم سے چھڑا کر کچھ ہوش سنبھالا گو ابھی یہ معلوم نہیں کہ چھوڑے ہوئے کام کو پھر شروع کرنے کے قابل ہوا ہوں کہ نہیں۔ بہرحال اِرادہ ہے کہ اب اصغر کی چند انگریزی نظموں کو ایک ننھے سے مجموعے کی صورت میں پیش کر دیا جائے۔

جانے والا چلا گیا لیکن رہنے والے بھی اب وُہ پہلے سے نہیں رہے۔ اَور نہیں تو اُسے یاد ہی کرتے ہیں اُس کے لئے نہیں اپنے لئے۔ زندگی کے ہزاروں پہلو ہیں کوئی شخص چند کو بھی دیکھ سکے اَور سمجھ سکے اَور اُن پر غور کر سکے تو غنیمت ہے۔ اس عرصے میں کئی لوگوں کے دُکھ درد سے واقفیت ہوئی اَور جدھر کبھی نگاہ بھی نہ اُٹھتی تھی اُٹھی۔ نوعِ انسان کے دُکھ سُکھ کس قدر ملتے جلتے ہیں۔ ابھی پچھلے روز میں اپنے ادیب دوست اسد ملتانی صاحب کا وُہ نوحہ پڑھ رہا تھا جو اُنہوں نے اپنے ننھے بیٹے امجد کی یاد میں لکھا، اِس لاجواب مصرع کی تکرار نے عزیز ترین اصغر کو پھر سامنے لا کر کھڑا کر دیا، اُس کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔

"وُہ جی گیا بہت کچھ تھوڑی سی زندگی میں"

بشیر احمد

محفلِ ادب

سُلطان واجد علی شاہ اَور فنِّ موسیقی

ہندوستان میں موسیقی کو ترقی دینے میں سب سے زیادہ ہندو فرمانرواؤں نے حصہ لیا ہے۔ کیونکہ موسیقی ہندو مذہب کا بہت بڑا جزو ہے۔ لیکن ہندوؤں کے عہدِ حکومت کے بعد مسلمان بادشاہوں نے بھی کس طرح ہندوستان کے فنِ موسیقی کو چار چاند لگائے ہیں اس کا اندازہ سُلطان واجد علی شاہ کے مندرجۂ ذیل واقعات اور حالات سے ہو سکتا ہے۔

سُلطان واجد علی شاہ کو موسیقی کا نہایت درجہ ذوق تھا۔ اس میں ترقی کرتے کرتے بہت بڑے نائک بن گئے تھے بڑے بڑے استاد گویئے ان کی استادی کے قائل تھے اور ان کے سامنے کان پکڑتے تھے، اَور بڑے مشہور گویئے بھی ان کے سامنے استادی میں پورے نہیں اُترتے تھے۔ موسیقی میں تو بادشاہ کا جواب ہی نہ تھا۔ ایسا کمال تھا کہ سینکڑوں کلاونتوں کے ہاتھ میں ناڑے بندھوا دیئے۔ دُتّی خاں جس نے کلکتہ میں بڑی شہرت حاصل کی تھی، اُس کی آواز اس بلا کی دلفریب تھی کہ کسی طوائف کا رنگ بھی اُس کے سامنے نہ جم سکتا تھا۔ وُہ مٹیا برج میں آدھی رات کو کسی کے یہاں گا رہا تھا۔ بادشاہ نے آواز سُنی تو بیتاب ہوگئے اَور بڑے ذوق و شوق سے بلوایا۔ وُہ سمجھا کہ میری قسمت کھل گئی مگر بادشاہ نے اس کا گانا سنا تو کہا کہ اس کی آواز ہی آواز ہے گانا نہیں جانتا۔ اپنے عہد میں انہوں نے اس علم کو بہت ترقی دی۔ خود ستار ایسا بجاتے کہ روتے لوگ ہنس پڑتے اور ہنستے رو دیتے۔ لَے اِس قدر رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی کہ پاؤں کا انگوٹھا سوتے میں بھی لَے پر چلنے لگتا۔ اسی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ فنِ رقص میں بھی کامل مانے جاتے سے داری میں کوئی اعلیٰ درجہ کا گویّا بھی بادشاہ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس کو قدرت کی دین کہنا چاہیئے۔ ناچ میں بادشاہ کا اُستاد دُرگا پرشاد کتھک اَور شاگرد بِندادین بتایا جاتا ہے، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ کو ناچ میں صرف اتنی بصیرت حاصل تھی کہ اگر کوئی شخص ناچ میں اَور اس کی گت میں غلطی کرتا، تو خود ہاتھ اُٹھا کے بتا دیتے کہ یوں نہیں، یوں ناچو۔ یہ جو مشہور ہے کہ بادشاہ خود ناچا کرتے تھے، بالکل غلط ہے۔ وُہ نہ کبھی لکھنؤ میں ناچے اَور نہ مٹیا برج میں۔ معتبر ڈھاڑیوں سے جو سالہا سال بادشاہ کے ساتھ رہے اس کی تصدیق ہوتی رہی جس کی صحت میں مطلق شبہ نہیں ہو سکتا۔ اور بادشاہ کے ناچنے کی جتنی تصویریں دکھائی جاتی ہیں اور لندن تک پہنچ گئی ہیں سب فرضی، مصنوعی اور جھوٹی ہیں۔ یہ منجملہ ان کارستانیوں کے ہیں جو رزیڈنٹ نے بادشاہ کے بدنام کرنے کے لئے اختیار کی تھیں۔ انتزاعِ سلطنت کے وقت جہاں اکثر شاہزادے اور خاندانِ شاہی کے نامور افراد ان کے مخالف بنائے گئے، اور اُن کی واقعی اور غیر واقعی بُرائیاں طشت از بام کی گئیں، وہاں ناچنے کا الزام بھی اُن کے سر تھوپ دیا گیا۔ جو کچھ قیصر باغ کے میلوں کے موقع پر مشہور ہے اس کی اصلیت یہ ہے کہ بادشاہ ناچتے نہ تھے بلکہ کھیلتے تھے۔ تاریخوں میں ہندوستان میں کئی مسلمان بادشاہ موسیقی کے کامل استاد بتائے گئے

ہیں، مگر میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کسی کو بھی اتنی اعلیٰ معلومات حاصل ہوں جتنی واجد علی شاہ کو حاصل تھیں۔ جن ڈھاڑیوں کی بادشاہ تک رسائی تھی وُہ وہی تھے جو موسیقی میں پورا کمال رکھتے تھے۔ ہاں گانے میں البتہ انہماک اور ناچ دیکھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ مگر اس میں بھی کبھی کلکتہ کی کسی بازاری طوائف کا مجرا نہیں دیکھا۔ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے متوعات کے مختلف گروہ اور طائفے بنا لئے تھے ہر طائفے کو خاص انداز اور خاص قسم کا ناچ سکھایا جاتا۔ ایسے متعدد طائفے تھے، مثلاً نتھ والیاں، جھومر والیاں، لٹکن والیاں، نقل والیاں، رادھا منزل والیاں وغیرہ۔ ان سب کی تعلیم پر ڈھاڑی مقرر تھے، جو دونوں وقت تعلیم دیتے۔ بادشاہ کو جب ناچ دیکھنے کا شوق ہوتا، انہیں طائفوں کو جن میں سے اکثر بڑی خوبصورت، بانکی اور پری جمال عورتیں تھیں بلوا لیتے۔

ایک مرتبہ کوٹھی اسد منزل میں بادشاہ نے پندرہ روز کا جشن کیا تھا۔ کوٹھی کے ہال میں چاندی کے پلنگ پر تکیے پر جھکے بیٹھے رہتے۔ گرد ناز آفرین متوعات کا جھرمٹ ہوتا، جو فرش پر بیٹھی رہتیں۔ اور سامنے متوعات کے طائفے باری باری آ کر مجرے کرتے۔ کسی سے جاؤ یا گت میں کوئی غلطی ہو جاتی تو اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بتا دیتے۔ غضب کا طبلہ بجاتے تھے۔ اور بھاؤ غضب کا بتاتے تھے، جب کسی سے غلطی ہوتی اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے آنکھ سے بتا دیتے۔ ٹھمری ایسی لکھی کہ ہندوستان میں کسی نے نہ کہی تھی۔ بادشاہ نے نئی راگنیاں ایجاد کیں، جن کے نام اپنی طبیعت داری سے جوگیا، کنتر، جوہی، بادشاہ پسند وغیرہ رکھے۔ آواز اچھی نہ تھی، اور کسی قدر گراں گوش بھی تھے۔ موسیقی پر کتابیں تصنیف کیں۔ مثلاً ناجو، بنی، دُلھن وغیرہ۔ محرم کی ساتویں تاریخ آسمانی کوٹھی سے بادشاہی مہندی اُٹھتی۔ اس میں معمول تھا کہ تقریباً ایک گھنٹہ تک خود گلے میں تاشہ ڈال کے بجاتے، بڑے بڑے نامور اور مشہور گویئے گلوں میں ڈھول ڈال کر ساتھ دیتے۔ بادشاہ ایسی صفائی، سُبکی اور خوش اسلوبی سے اور ایسی خوشگواری کے انداز سے تاشہ بجاتے کہ ڈھاڑی واہ واہ کے نعرے بلند کرتے اور نہ جاننے والے بھی حیران و ششدر رہ جاتے۔

سب سے پہلا اُردو ڈراما اندر سبھا ہے، جس کو امانت نے عہدِ واجدی میں تصنیف کیا تھا۔ یہ ڈراما موسیقی وار کامیڈی ہے۔ اندر سبھا نہ تو واجد علی شاہ کے حکم سے لکھی گئی، نہ اس کا کھیل کبھی قیصر باغ میں ہوا اور نہ کبھی بادشاہ اس میں شریک ہوئے۔ بادشاہ کا راجہ اندر بننا بالکل بے اصل ہے۔ البتہ وہ مختلف پارٹ مختلف لوگوں کو تقسیم کر دیتے تھے۔ چونکہ قیصر باغ کا ذکر آ گیا ہے۔ اس لئے ہم کسی قدر اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اس عالیشان اور یادگارِ زمانہ عمارت کو سلطانِ عالم نے اسّی لاکھ روپے میں تیار کروایا تھا جو پہلے کے مقابلہ میں اب ایک کھنڈر کی سی حالت میں ہے۔ اِسی قیصر باغ میں واجد علی شاہ نے نہایت پُرلطف میلہ کیا تھا جس میں تین روز تک مسلسل اسّی ہزار وابستگانِ دامنِ دولت کو طعامِ خوشگوار عطا ہوا۔ بنیاد اس میلہ کی یہ تھی، کہ واجد علی شاہ کی چھٹی کی آرزو پر ان کی ماں نے لڑکپن میں جوگیا لباس پہنایا تھا، اس کی سالگرہ اسی لباس میں ہوتی تھی۔ بادشاہ نے اپنے عہدِ سلطنت میں میلہ قرار دے دیا۔ قیصر باغ کے قریب ایک بڑا بھاری سایہ دار درخت تھا، اس کے نیچے گرداگرد سنگِ مرمر کا ایک نفیس گول چبوترہ بنایا گیا تھا جس پر قیصر باغ کے میلوں کے زمانے میں جہاں پناہ جوگی بن کے اُور گیروے کپڑے پہن کے آتے اور دھونی رما کے بیٹھتے۔ اِس

میلہ میں پبلک کو بھی قیصر باغ میں آنے اور جہاں پناہ کی عشرت پرستیوں کی بہار دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس دیکھا تھا اور سری کرشن جی کی معشوقانہ وش عاشقی اس قدر پسند آگئی تھی کہ اُس رہس سے خود اپنا کھیل ڈراما کے طور پر ایجاد کیا تھا۔ اُس میں ناچ رنگ کی محفلیں گرم ہوتیں، موتیوں کو جلا کے بھبوت رمائی جاتی، اور فقیری میں بھی شاہی کے کرشمے نظر آتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی ہوگئی تھی میلہ میں شریک ہونے کی عام اہلِ شہر کو اجازت ہوجاتی مگر اس شرط سے کہ گیروے کپڑے پہن کے آئیں۔

اسرار حسن خاں طباطبائی ——— "معین دنیا"

ملاقاتی

کھٹ، کھٹ، کھٹ!

جنّت کا دروازہ کھولو!

مولانا!

دیکھنے والا کوئی نہیں

آدھی رات ہے مولانا

کھٹ، کھٹ، کھٹ!

ہاں ہاں میں شیطان ہوں بے شک

آپ کا خدمت گار پُرانا

مولانا!

کھٹ، کھٹ، کھٹ!

چوری چوری

آپ کے پاؤں

رات کو دابنے آیا ہوں۔

جنّت کا دروازہ کھولو ——— مولانا!

مہدی علی خاں ——— "ادبی دنیا"

مطبوعات

دیس کی لیلا:- از میاں عبدالمجید بھٹی یہ مختصر سی کتاب میاں عبدالمجید بھٹی کے گیتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام گیت حبِ وطن کے موضوع سے متعلق ہیں۔ زبان ہندی آمیز اور شیریں ہے لیکن بعض مقامات پر ہندی کے الفاظ بہت ناگوار معلوم ہوتے ہیں البتہ جہاں بھرتی کی کوشش نہیں کی گئی وہاں ہندی اور اُردو کا یہ امتزاج مزا دے گیا ہے۔ قیمت ۴ر پتہ:- ہونہار بُک ڈپو لاہور

متاعِ حرم:- از محترمہ زیب عثمانیہ۔ متاعِ حرم میں ادبی نظموں کے علاوہ اصلاحی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں محترمہ زیب عثمانیہ نے اقبالؒ کا تتبع کرنے کی کوشش کی ہے مگر وُہ اس میں زیادہ کامیاب نہیں رہیں۔ اقبالؒ کی سی وسعتِ نظر اور پختگیٔ فکر حاصل کرنا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں اصلاح کو پیشِ نظر رکھا ہے اور مقصد کو آرٹ پر ترجیح دی ہے مگر اقبالؒ محض خشک پیغام بر ہی نہ تھے بلکہ آرٹ اور شعریت کے لحاظ سے بھی اُردو شاعری میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ اس مجموعہ کی ادبی نظمیں خوب ہیں۔ غزلیں بھی پاکیزہ ہیں۔ تغزّل میں بھی شاعرہ نے اقبالؒ کا تتبع کیا ہے۔ اور بعض غزلیں تو ایسی ہیں جو بالِ جبریل کی غزلیات کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہیں۔ ہماری رائے میں یہ روش کچھ پسندیدہ نہیں۔ زیب عثمانیہ کی بعض نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں شاعرانہ صلاحتیں بخشنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ انہیں چاہیئے کہ وُہ اپنے اس جوہر کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں۔ قیمت عہ ر پتہ:- کریمی دواخانہ بازار شیخوپورہ لدھیانہ

زہریلی مکھی:- از سید محمود مورخ بی۔ اے۔ یہ کتاب جناب مورخ کے مختصر افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے "گذارشِ احوالِ واقعی" کے عنوان سے جناب مصنف نے اپنے افسانوں کے پہلے مجموعہ "شہرِ خموشاں" کے متعلق "جامعہ" دہلی کی تنقید پر یوں تبصرہ فرمایا ہے ـــ اس جاہل کو یہ بھی معلوم نہیں کہ طلسمِ ہوشربا اور سائنٹفک افسانوں میں کیا فرق ہے..... جاہل مُبصر نے لکھا ہے کہ..... مُبصر کو چاہیئے کہ آئندہ کسی کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے مختصر افسانوں کے اصول اور ان کے اجزائے ترکیبی سے پوری واقفیت حاصل کر لے۔ مجھے حیرت اور سخت حیرت ہے کہ ماہنامہ "جامعہ" کے فاضل مدیر نے اِس قدر جاہلانہ تبصرہ شائع کرنا کس طرح گوارا کر لیا"

اِن سطور کے پڑھنے کے بعد اس کتاب پر تنقید کی ہمت نہیں پڑتی۔ کیونکہ مورخ صاحب کا "نقشِ ثالث"، "نقشِ اوّل" سے کسی صورت میں بھی بہتر نہیں۔ اور "زہریلی مکھی" بھی "جاہلانہ تبصرہ" سے زیادہ کسی چیز کی مستحق نہیں۔ چونکہ راقم الحروف نہیں چاہتا کہ مصنف کو اپنے افسانوں کے چوتھے مجموعے میں "ہماوں" کے فاضل مدیر کے متعلق "حیرت اور سخت حیرت" کا اظہار کرنا پڑے ـــ اِس لئے اِس کتاب کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ کاغذ معمولی قیمت عہ۔ پتہ۔ گلفروش پبلشنگ ہاؤس دہلی

ذکر و فکر:- از مقصود زاہدی۔ یہ کتاب مختصر افسانوں۔ خاکوں اور متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ مقصود صاحب ایک نوجوان اور نومشق ادیب ہیں۔ قیمت ۸ر پتہ:- زاہدی برادرز ـــ ۱۶ ـــ زاہدیاں میرٹھ

باغِ دلکشا:- از ملکہ آفاق زمانی بیگم۔ یہ کتاب آفاق زمانی بیگم صاحبہ کا دیوان ہے۔ محترمہ پُرانے رنگ میں غزل کہتی ہیں۔ قیمت ۱ر پتہ:- ملکہ آفاق زمانی بیگم۔ کٹرہ غلام علی امروہہ ضلع مراد آباد۔

جغرافیۂ دنیا از سید شرف الدین قادری۔ یہ ایک درسی کتاب ہے۔ اور مڈل سکولوں کے طلباء کے لئے لکھی گئی ہے پنجاب کے مڈل سکولوں میں جغرافیہ کی جو کتابیں رائج ہیں ان کے مقابلے میں یہ کتاب بہت مفید نظر آتی ہے۔ فاضل مؤلف کی محنت قابلِ داد ہے۔ قیمت ۔عہ۔ پتہ۔ سید عبدالقادر اینڈ سنز حیدرآباد دکن۔

کارنامۂ پہلوی از سید محمد حسن بلگرامی۔ یہ کتاب ایران کی بیداری کی تاریخ ہے۔ فاضل مؤلف نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے ایران کے دورِ انحطاط، رضا شاہ کے عروج، اور ایران کی اصلاح کے لئے ان کی جدوجہد کی سرگزشت بیان کی ہے۔ اندازِ بیان سلجھا ہوا اور زبان سلیس ہے۔ واقعات کی چھان بین میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا کہ کس طرح رضا شاہ پہلوی نے جاں بلب ایران کو نئی زندگی بخشی۔ اس کٹھن کام میں ان کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں تھیں اور کس طرح وُہ اپنے عزم و استقلال کی بدولت ان سب پر غالب آئے۔ ملاؤں کے اقتدار اور اس کے خاتمہ کے متعلق ابواب خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ فاضل مؤلف نے رضا شاہ کے عہد میں حکومتِ ایران کے تمام شعبوں کے متعلق بھی لکھا ہے ——— رضا شاہ اس وقت موریشیس میں ایک نظر بند کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فرنگ کے دار الافتا سے اُن پر غداری کا فتویٰ لگ چکا ہے اور ہندوستان و ایران کے بعض مجتہدین نے بھی اس فتویٰ پر اپنی مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے ——— ممکن ہے ان امور کی روشنی میں "کارنامۂ پہلوی" محض عسکری صاحب کا دروغ بے فروغ معلوم ہو۔ لیکن بہرحال یہ کتاب پڑھنے کی چیز ہے۔ خصوصاً اُس ڈرامے کے بعد جو انہیں دنوں سرزمین ایران میں کھیلا گیا ہے اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ قیمت ؎ پتہ نظامی پریس لکھنؤ

"ح نظامی"

نویدِ مشرق، سوہن لال ساحر ایڈیٹر۔ کپورتھلہ سے نکلتا ہے۔ پہلا پرچہ جون ۱۹۴۱ء کا ہے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔ فی پرچہ ۶ر۔ سر عبدالقادر نے نویدِ مشرق کا خیر مقدم لکھا ہے۔ فلک پیمانے "ہمارا ہندوستان" لکھا ہے۔ تاج سرشار لدھیانوی نظیر لدھیانوی اختر شیرانی تاجور دغیرہ بھی جلوہ گر ہیں۔

فردوس:۔ ہمارے دوست بزمِ اُردو جموں و کشمیر والوں کا دوسرا پرچہ جولائی ۱۹۴۱ء کا ہے۔ چندہ سالانہ ۴ روپے۔ دو چار کشمیر کی تصویریں بھی ہیں۔ جموں سے شائع ہوتا ہے۔

ب

کیا خوب آدمی تھا" آل انڈیا ریڈیو" نے ملکی ادب کی بعض بہت قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کوششیں خاص طور پر لائقِ تحسین ہیں جن کے طفیل ہماری بعض قدیم روایات، غیر مروج کتابیں اور بھولی بسری شخصیتیں از سرِ نو نظروں کے سامنے آئی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل دہلی سے "کیا خوب آدمی تھا" کے سلسلے میں متعدد تقریریں نشر ہوئی تھیں جن میں چند اصحاب نے بعض مشہور ادبی و سیاسی شخصیتوں کا تعارف کرایا تھا۔ اب یہ تقریریں حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی نے ایک مجموعے کی صورت میں شائع کر دی ہیں جس کا حجم سوا سو صفحات کے قریب ہے اور قیمت ۱ر مقرر کی گئی ہے۔

لکھنے والوں میں ملا واحدی، علامہ کیفی دہلوی، خواجہ غلام السیدین اور مولانا عبدالماجد شامل ہیں۔ جن کے متعلق لکھا گیا ہے اُن میں سے چند یہ ہیں چند، اقبال، اجمل خاں، راس مسعود داغ، چکبست، نذیر احمد

ح ع غ

سید عبدالطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

R. L. No. 1363.

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب [illegible] اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں [illegible]۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ا ر کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور [illegible] سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی [illegible] تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چا[illegible]

اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو [illegible] قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ا ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ ر

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

Title Printed at the Half-Tone Press, Ram Nagar, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(بہار)

بیادگار علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

جلد ۱۴

نمبر ۶

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ دسمبر ۱۹۴۱ء

تصاویر (۱) ایڈورڈ ہنری پامر (۲) ڈاکٹر ٹیگور اور دیوندر ستیارتھی

ضروری اطلاع:- جواب طلب امور کے لئے پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بہ صورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے۔ مینجر

قیمت فی پرچہ

بزمِ ہمایوں

اِس اشاعت کے ساتھ "ہمایوں" کی زندگی کا بیسواں سال ختم ہوتا ہے۔ آئندہ پرچہ حسبِ معمول سالگرہ نمبر ہوگا۔

یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ "ہمایوں" جن اصول و قواعد کو پیشِ نظر رکھ کر جاری کیا گیا تھا گزشتہ بیس سال میں اِس نے اُن سے کبھی انحراف نہیں کیا اور اپنی انفرادیت کو حتی الامکان ہمیشہ قائم رکھا ہے۔

بیس سال کچھ بڑی عمر نہیں مگر ہندوستانی صحافت کی دُنیا میں اتنی عمر کو بھی بہت کم رسائل و جرائد پہنچتے ہیں۔ اس لحاظ سے "ہمایوں" شاید طویل العمری کا مدّعی بھی ہوسکتا ہے۔

گزشتہ بیس سال میں "ترقی پسندی" "اخلاقیت" اور "باقاعدگی" "ہمایوں" کی نمایاں خصوصیات رہی ہیں۔ اگر "ہمایوں" کی طویل العمری کا دعویٰ تسلیم کرلیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ "بچپن سے لے کر" بڑھاپے" تک اس نے اپنی اشاعت میں کبھی ایک دن کی تاخیر بھی نہیں کی اور باقاعدگی اس کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔

"ہمایوں" اپنے بلند مطمحِ نظر تک پہنچنے کی کوشش آئندہ بھی جاری رکھے گا مگر اِس سلسلے میں جنگ کی پیدا کردہ مشکلات کے پیشِ نظر وُہ اپنے معاونین سے بیش از پیش امداد و اعانت کا متوقع ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ موجودہ قارئین آئندہ سال بھی اپنی معاونت کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ ہم اُن حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو اپنی خریداری کے ساتھ کبھی کبھی "ہمایوں" کے لئے مزید خریدار بھی بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ "ہمایوں" کے مقاصد کی تبلیغ کے لئے ضروری ہے کہ اِس کا حلقۂ اشاعت وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے۔

گزشتہ سال جن ادباء و شعراء کی قلمی اعانت ہمارے شاملِ حال رہی، ہم اُن سب کے شکر گزار ہیں۔ درحقیقت انہیں حضرات کی کوششوں سے "ہمایوں" "ہمایوں" بنا ہے۔ حضراتِ ذیل ہمارے خاص شکریے کے مستحق ہیں:-

والاشان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیع، میاں عبدالعزیز صاحب فلک پیما، حضرتِ جوش ملیح آبادی، حضرتِ کیفی، حضرتِ آزاد انصاری، مرزا محبوب بیگ صاحب، حضرتِ حمید نظامی، سید نذیر حسین صاحب ناشاد، پرنسپل رام پرشاد صاحب ناشاد، خواجہ غلام السیدین، حضرتِ اثر صہبائی، حضرتِ ذوقی، مسٹر حسن عزیز جاوید، ناکام آرزو، حضرتِ اختر حیدر آبادی، حضرتِ نظر، ڈاکٹر محمد باقر، پروفیسر عبدالحمید، مسٹر سعادت حسن، مسٹر ہادی حسین، سر عبدالقادر، مسٹر منوہر لال ہادی، حضرتِ تاجور سامری، سید جمیل واسطی، جناب دیوندر ستیارتھی، پیرزادہ احمد ندیم قاسمی، سید علی منظور، حضرتِ مقبول احمد پوری، حضرتِ ابر احسنی، حضرتِ صدق جائسی، حضرتِ رحمٰن مذنب، سید ظفر واسطی، حضرتِ شاد عارفی، حضرتِ عدم، ابن مریم، حضرتِ صادق قریشی، حضرتِ روش صدیقی، میاں عبدالحی، حضرتِ وجد، مسٹر محمد سمیع، ناصر الدین صاحب شمسی، ولی الرحمٰن صاحب، مرزا فہیم بیگ چغتائی، حضرتِ سلام مچھلی شہری، حضرتِ جگر قریشی، اجی ایم خاں صاحب، مجید امجد صاحب، عبدالقادر صاحب فاروقی، سید احسن صاحب، عبدالرزاق صاحب قریشی، خواجہ احمد فاروقی، سید آغا حسین، منشی شام موہن لال جگر، امرچند صاحب قیس، حضرتِ امجد حیدر آبادی، مسعود پرویز صاحب، سعید احمد صاحب اعجاز، سید رضا صاحب گیلانی، شفیق الرحمٰن صاحب، شیر محمد صاحب اختر، حضرتِ طالب صفوی، حضرتِ سالم صدیقی، حضرتِ یوسف ظفر، عباس درویش صاحب، حضرتِ ماہر القادری، اسعد صاحب، فضل احمد صاحب صدیقی، پروفیسر الشن کمار، عبادت صاحب بریلوی، حضرتِ جابر عمی، شمس الرحمٰن صاحب قدوائی، جگن ناتھ صاحب آزاد، حضرتِ طالب شیرازی، حضرتِ سجّاد، حضرتِ تبسم، حضرتِ مسعود یزدانی، حضرتِ جوہر فریادی، حضرتِ حرماں، محترمہ انیس بدن شروانیہ، محترمہ صفیہ شمیم، محترمہ نجمہ رحمت اللہ، محترمہ سیدہ اختر، محترمہ سکینہ محمود، محترمہ نجمہ تصدق، محترمہ سیدہ طیرین نقوی، محترمہ صالحہ بیگم مخفی، محترمہ شمیم جالندھری، محترمہ کنور کول کنور۔

حامد علی خاں

جہاں نما

ٹیگور کی مصوّری

رابندر ناتھ ٹیگور کی گوناگوں قابلیتوں نے جہاں شاعری، افسانہ نویسی، ڈرامانگاری اور موسیقی وغیرہ کے فن میں اپنا جوہر دکھایا وہاں اُنہوں نے مصوّری کو بھی نہ بھلایا۔ اگرچہ ٹیگور کے دماغ کی ہر تخلیق میں اُن کی انفرادیت نمایاں طور پر جھلکتی ہے لیکن مصوری میں یہ انفرادیت بلاشبہ انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی مصورانہ تخلیقات کو سمجھنا بے حد دشوار ہے۔ یہ تصاویر کسی دیکھی بھالی چیز کو متشکل نہیں کرتیں، نہ غالباً کوئی سوچا سمجھا ہوا موضوع مصوّر کے دماغ سے اِن تصاویر میں منتقل ہُوا ہے۔ فن کا ایک جدید نظریہ یہ ہے کہ فن کار کو قدرت کا نقّال بننے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً ایک مصوّر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ صرف قدرتی اشیاء کا چربہ اتارا کرے۔ فن کار کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وُہ تخلیق کے کام میں قدرت سے مقابلہ کر کے خود اپنی تخلیقات کی ایک نئی دنیا پیدا کرے۔ ٹیگور نے اپنے اس فن کارانہ اختیار سے مصوّری میں پورا فائدہ اُٹھایا اور اپنے مُوقلم کو اپنے عجیب و غریب تصوّرات کی ترجمانی کیلئے کھلے بندوں کاغذ پر حرکت کرنے کی اجازت دے دی۔ اگر ہم ٹیگور کی تصاویر میں حقیقی اشیاء کا سُراغ لگانے کی کوشش کریں تو ہم کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ تصویریں اُن "خیالی اجسام" کی ہیں جو مصوّر کے دماغ کے پردوں کے سوا اَور کہیں نظر نہیں آسکتے۔ اگر اِن میں سے بعض تصاویر کسی قدرتی چیز سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتی ہیں تو یہ محض اتّفاقی بات ہے۔ مثلاً اگر کسی تصویر میں کسی عجیب و غریب درخت یا جانور یا انسان کی کوئی خفیف سی جھلک ہے تو یہ بھی مصوّر نے ارادۃً پیدا نہیں کی، بلکہ اتفاقاً اُس کے مُوقلم کی آزادانہ حرکت سے ایک ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے مگر قدرتی چیزوں سے یہ مشابہت تصویر کو سمجھنے میں ہمیں کوئی مدد نہیں دیتی۔ بلکہ اس کی وجہ سے اُس میں ہمارے لئے اَور زیادہ حیران کن بجھارت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید یہ کہنا بجا ہو کہ یہ تصویریں کسی چیز کی عکّاسی یا کسی خیال کی ترجمانی کے لئے بنائی ہی نہیں گئیں۔ اِن کی حیثیت بچوں کی لوریوں یا اُن بے معنی نظموں کی سی ہے جو کوئی قابلِ ادراک مفہوم نہ رکھنے کے باوجود ہماری توجہ کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح ہم ایک نئی زبان کو محنت کے بغیر نہیں سمجھ سکتے یا جس طرح ہم کسی نئے فن کی خوبیوں کا اُسے پورے استغراق سے سیکھنے کے بغیر اندازہ نہیں کر سکتے اُسی طرح ہم ٹیگور کی تصاویر سے بھی اُس وقت تک پوری طرح مستفید نہ ہو سکتے ہوں جب تک ہم انہیں سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہ کر لیں مگر فی الحال ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ٹیگور کی "خود رنگ" مصوّری نے اِس خیال پر ایک ضربِ کاری لگائی ہے کہ فن کا مقصد صرف مظاہرِ قدرت کی نقّالی یا ترجمانی ہے۔ اُنہوں نے اپنی تصاویر سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ فن کار محض نقّال نہیں بلکہ خالق بھی ہوتا ہے۔

دُنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں

بعض چھوٹے چھوٹے ملکوں نے دُنیا کے بہت وسیع رقبوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ مثلاً فرانس کے مقبوضات کا رقبہ فرانس سے بائیس گنا زیادہ ہے۔ ہالینڈ کے مقبوضات کا رقبہ ہالینڈ سے ساٹھ گنا۔ بلجیم سے بلجیم کانگو کا رقبہ اسّی گنا اور برطانوی مقبوضات کا رقبہ برطانیہ سے ایک سو چالیس گنا زیادہ ہے۔

ذیل میں بعض بڑی بڑی سلطنتوں کا رقبہ درج کیا جاتا ہے:-

سلطنت	رقبہ میلوں میں
جاپان اور اس کی نوآبادیاں	۲۶۵،۱۲۹
ہالینڈ اور اس کی نوآبادیاں	۸۰۰،۹۳۸
اٹلی اور اس کی نوآبادیاں	۹۳۵،۴۴۰
بلجیم اور اس کی نوآبادیاں	۹۵۱،۷۵۵
پرتگال اور اس کی نوآبادیاں	۹۸۱،۰۰۵
ممالکِ متحدۂ امریکا اور نوآبادیاں	۳۷۳۸،۳۹۳
جمہوریہ چین	۴۲۷۹،۱۷۰
فرانس اور نوآبادیاں	۴۴۵۰،۰۰۰
سوویٹ روس	۹۲۵۱،۷۹۶
سلطنتِ برطانیہ	۱۳،۳۵۵،۴۲۶

ٹالنے کا فن

نیویارک میں ایک ایکٹریس کسی مقدمے میں بطورِ گواہ پیش ہوئی۔ ایکٹریس کی عمر ۵۲ سال کی تھی مگر وہ چاہتی تھی کہ لوگ اسے چالیس سال سے زاید عمر کا نہ سمجھیں۔ مخالف وکیل نے اُس کی شہادت کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرانے کے لئے یہ کوشش کی کہ اس کی عمر کے متعلق اُس پر جرح کر کے اُسے جھوٹا ثابت کرے۔ ایکٹریس سچ بولنے کی قسم کھانے کے بعد جھوٹ سے بچنا چاہتی تھی۔

جرح کرنے والے وکیل نے دریافت کیا: "آپ کی عمر کتنی ہے؟"

اُس نے فوراً جواب دیا "میں کچھ کہہ نہیں سکتی"

"کیا آپ کو معلوم نہیں؟"

"میں نے کبھی اپنی پیدائش کا سرٹیفکیٹ نہیں لیا اور نہ اپنی پیدائش کا رجسٹر دیکھا ہے"

جرح کرنے والے وکیل نے کہا "لیکن مس۔ آپ کے والدین نے یقیناً آپ کو آپ کی عمر بتائی ہوگی۔ اُنہوں نے آپ کی تاریخ پیدائش کیا بیان کی تھی"

ایکٹریس نے کہا "یہ تو سُنی سنائی بات کی شہادت ہوگی۔ مجھے امید نہیں کہ آپ اسے قابلِ قبول سمجھنے پر مُصر ہوں گے۔

وکیل گھبرا کر کچھ کہنے کو تھا "لیکن . . . لیکن" بلکہ اتنے میں ایکٹریس جج سے مخاطب ہوئی "حضور کیا میرا خیال درست نہیں؛

جج نے ہنس کر کہا "آپ درست کہتی ہیں"

مطالعۂ کتب

ایک غیر مشاق پڑھنے والا آدمی ایک مشاق کتب بین شخص کے مقابلے میں کسی کتاب کے پڑھنے پر بہت زیادہ وقت صرف کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ عموماً کسی کتاب کے قابلِ مطالعہ اور ناقابلِ مطالعہ حصّوں میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ حالانکہ بہت ہی کم مصنّف یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اُن کی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے قابل ہے۔ یہ پڑھنے والے کا فرض ہے کہ وُہ اپنی قوتِ تمیزی سے صرف قابلِ مطالعہ باتوں کی طرف توجہ کرے اور غیر ضروری اور سطحی باتوں کو چھوڑ دے۔

میکالے اس تیزی سے پڑھا کرتا تھا کہ اُسے مطالعہ کرتے دیکھ کر لوگ خیال کرتے تھے کہ وُہ محض ورق اُلٹ رہا ہے۔ بات یہ تھی کہ وہ ایک ہی نظر میں یہ دیکھ سکتا تھا کہ پیشِ نظر صفحے میں کونسی خاص بات ہے۔ اور پھر اُس بات کو یاد بھی رکھ سکتا تھا۔ مشق کرنے سے ہر ذہین آدمی یہ بات حاصل کر سکتا ہے۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہر صفحے کو جلد سے جلد پڑھنے کی کوشش کی جائے اور پڑھنے میں آرام پسندی کا خیال ترک کر دیا جائے۔ پہلے یہ اندازہ کرنا چاہئے کہ کسی کتاب کا ایک صفحہ پڑھنے میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے۔ پھر اِس وقت کو ہر بار گھٹاتے جانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مشق کے دوران میں آسان افسانے اور ناول پڑھنے چاہئیں۔ شروع میں اپنی مقرّرہ رفتار سے تیز پڑھنا کچھ اُلجھن پیدا کرتا ہے مگر اس کی پروا نہ کرنی چاہئے۔ کچھ عرصے کی مشق کے بعد یہ کیفیت جاتی رہے گی۔ تیز پڑھنے کی مشق کے لئے واٹسن اور نیوکومب نے جو دو مشہور ماہرینِ نفس ہیں یہ چند مفید طریقے سجھائے ہیں:۔

"پڑھتے وقت بڑبڑانے اور ہاتھوں اور ہونٹوں کو حرکت دینے سے پرہیز کرو۔ اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دو۔ جملوں، فقروں اور پیراگرافوں تک کو ایک اچٹتی نظر میں دیکھ لینے کی کوشش کرو۔ خیالات کو اِدھر اُدھر آوارہ نہ پھرنے دو۔ اگر پڑھتے وقت کوئی ایسا خیال آجائے جو غیر متعلق ہو تو مناسب وقت میں اُس پر غور کرنے کے لئے اُسے الگ لکھ لو۔ مصنّف کا عندیہ شروع ہی میں معلوم کر لینے کی کوشش کرو اور دیکھتے رہو کہ کیا وُہ تمہارے خیال کے مطابق چل رہا ہے۔

اگر اِن باتوں کی مشق ہو جائے تو پھر کسی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑ سکتی۔

دُنیا کی بدترین کتابیں

امریکا کے ایک رسالے نے حال ہی میں وہاں کے بعض نامور ادیبوں سے فرداً فرداً اُس کتاب کا نام بتانے کی درخواست کی جو اُن کی رائے میں دُنیا کی بدترین کتاب ہے (یعنی وُہ کتاب جس کی قدر و قیمت کے اندازے میں سب سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے) اس شاندار عزت افزائی کے مقابلے میں دُنیا کی صرف وہی قدیم و جدید کتابیں شامل ہو سکتی تھیں جو عالمگیر شہرت حاصل کر چکی ہیں۔

مذکورۂ بالا ادباء کی رائے میں دنیا کی "بدترین" کتابیں یہ تھیں:-

(۱) "ڈینٹے کی" ڈیوائن کامیڈی"
(۲) گبن کی "ڈیکلائن اینڈ فال آف دا رومن ایمپائر"
(۳) ملٹن کی "پیراڈائس لوسٹ"
(۴) ملٹن کی "پیراڈائس ریگینڈ"
(۵) جیمز جائس کی "یولی سیز"
(۶) پراؤسٹ کی "سوانز وے"
(۷) ٹامس کارلائیل کی "سارٹر ریزارٹس"
(۸) گوئٹے کی "فاؤسٹ"
(۹) ہٹلر کی "مائن کامف"

ہوائی حملے سے بچنے کے لئے شیشہ گھر

کسی زمانے میں خود شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسرے کو پتھر مارنا پرلے درجے کی حماقت سمجھی جاتی تھی مگر سائنس نے اب یہ ممکن کر دیا ہے کہ شیشے کا گھر اس کام کے لئے سب سے موزوں سمجھا جائے۔ برطانی سائنس دان یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہوائی حملے سے بچنے کے لئے ایسی اعلےٰ درجے کی پناہ گاہیں بنائیں جو بموں کی سیدھی بوچھاڑ کے نیچے بھی محفوظ رہیں۔ ان سائنس دانوں کا خیال ہے کہ وُہ عنقریب ایسی پناہ گاہیں بنا لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لطف یہ ہے کہ یہ پناہ گاہیں شیشے سے بنیں گی۔

یہ شیشہ جو ان پناہ گاہوں کی تعمیر میں صرف ہو گا اُس عام شکستنی شیشے سے مختلف ہو گا جس سے ہم اچھی طرح آشنا ہیں یہ شیشہ تہ در تہ جمائے اور مضبوط کئے ہوئے شیشے سے بنایا جائے گا۔ اس عمل میں یہ بہت مضبوط اور عام شیشے سے بہت زیادہ لچکیلا بن جائے گا۔ موجودہ شیشوں میں اس شیشے سے قریب ترین مشابہت رکھنے والا موٹر کاروں کا ہوا روک شیشہ ہے۔

مضبوط کردہ شیشہ اتنا مضبوط ابھی سے ہو چکا ہے کہ وُہ ایک ریلوے انجن کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے، شدید ترین حرارت برداشت کر سکتا ہے،

اگر اُس پر بم گرے تو ریزہ ریزہ ہوجانے کے بجائے اُس میں صرف بال آ جاتے ہیں۔ اگر یہ شیشہ اَور زیادہ مضبوط بن سکا جس کا سائنس دانوں کے نزدیک پورا امکان ہے) اَور اگر اسے بنانے کا گرانبار خرچ کسی طریقے سے گھٹ سکا تو شیشے کی پناہ گاہیں عام ہوجائیں گی۔

سیاسیات اَور عمر

ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ وُہ لوگ جو گزشتہ سو سال کے عرصے میں انگلستان کی وزارتِ عظمٰی کے عہدے پر فائز ہوئے کس کس عمر میں پارلیمنٹ کی رُکنیت حاصل کرتے رہے۔

نام	پارلیمنٹ میں داخلے کے وقت عمر
سر رابرٹ پیل	۲۱ سال
لارڈ جان رسل	۲۱ سال
لارڈ ڈربی	۲۱ سال
لارڈ ایبرڈین	۲۱ سال
لارڈ پالمرسٹن	۲۳ سال
مسٹر ڈزرائیلی	۳۳ سال
مسٹر گلیڈسٹون	۲۶ سال
لارڈ سیلزبری	۲۳ سال
لارڈ روزبری	۲۱ سال
مسٹر بالفور	۲۶ سال
سر ایچ کیمپبل بینر مین	۳۲ سال
مسٹر ایسکوئتھ	۳۴ سال
مسٹر لائڈ جارج	۲۷ سال
مسٹر بونر لا	۴۲ سال
مسٹر بالڈون	۴۱ سال
مسٹر میکڈانلڈ	۴۰ سال
مسٹر چیمبرلین	۴۹ سال
مسٹر چرچل	۲۶ سال

پیل سے لے کر بالفور تک ۷۴ سال کے عرصے میں صرف ایک وزیرِ اعظم ۲۶ سال سے زاید عمر میں پارلیمنٹ کا رکن بنا۔ بعد کے آٹھ وزراء میں سے لائڈ جارج اور چرچل کو چھوڑ کر ہر وزیرِ اعظم تیس اور چالیس سال سے زائد عمر میں پارلیمنٹ کی رکنیت حاصل کرتا رہا ہے۔

حامد علی خاں

ایڈورڈ ہنری پامر

ایڈورڈ ہنری پامر[ف۱] مشہور و معروف انگریز مستشرق ۷ راگست ۱۸۴۰ء کو بمقام کیمبرج پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک پرائیویٹ سکول میں مدرس تھا۔ پامر نے پرس[ف۲] کی مشہور درسگاہ میں تعلیم پائی۔ بچپن ہی میں اُس نے صحرائی اقوام کے حالات، زبان اور عادات و خصائل کا مطالعہ نہایت گہری نظر سے کرنا شروع کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُس نے لنڈن میں بطور کلرک کے کام شروع کیا۔ لیکن ہونہار مستشرق کو اس دفتری زندگی میں خاک لُطف نہ آیا۔ اِس لئے اس نے بہت جلد ملازمت کو خیرباد کہہ کر فرانسوی و اطالوی زبانوں کا مطالعہ شروع کیا۔ اِن زبانوں کے سیکھنے کے لئے اُس نے نہایت آسان طریقہ اختیار کیا۔ یعنی جس ملک کی زبان سیکھنی مطلوب ہو اُس ملک کے عوام سے میل جول کیا جائے۔ اسی لئے وہ عموماً غیر ملکی لوگوں کی تلاش میں رہتا۔ اور یوں اُس نے مختلف زبانیں حاصل کیں۔ ۱۸۵۹ء میں وُہ کیمبرج واپس آگیا۔ اِن دنوں وُہ تپ دِق میں مبتلا تھا اور بظاہر بچنے کی کوئی اُمید بھی نہ تھی۔ لیکن کیمبرج واپس پہنچ کر ۱۸۶۰ء میں اُس کو اِس خوفناک مرض سے شفائے کامل حاصل ہوگئی۔

اِس معجزانہ شفایابی کے بعد وُہ اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مولوی سیّد عبداللہ پروفیسر اُردو و فارسی دارالعلوم کیمبرج سے ملاقات ہوگئی۔ سیّد عبداللہ کے زیرِ اثر اُس نے مشرقی علوم کا مطالعہ شروع کیا۔ نومبر ۱۸۶۳ء میں اس نے سینٹ جان کالج سے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۶۷ء میں مشرقی زبانوں میں عموماً اور فارسی۔ عربی اور اُردو میں خصوصاً غیر معمولی قابلیّت کی وجہ سے وُہ یونیورسٹی کا فیلو مقرر کیا گیا۔ اُس نے سینٹ جان کالج کی طالب علمی کے زمانے میں عربی۔ فارسی۔ ترکی زبانوں کی قلمی کتب کی ایک نہایت بلند پایہ فہرست مرتب کی۔ اِس فہرست میں کنگ کالج اور ٹرنٹی کالج کی کتب کی فہرست بھی شامل ہے۔ (یہ فہرست میرے پردادا ارسطو جاہ بہادر کی خدمت میں بطورِ تحفہ بھیجی گئی تھی)

۱۸۶۷ء میں اُس نے ایک مبسوط رسالہ "تصوفِ مشرق" کے عنوان سے تحریر کیا۔ جس کی تکمیل میں عزیز بن محمد نفسی کی مشہور کتاب "مقاصد اقصیٰ" سے استفادہ کیا ہے۔ ۱۸۶۹ء میں صحرائے سیناء کے سروے کے لئے اُس کا تقرر ہوا۔ اِس مہم کو پیلسٹائین ایکسپلوریشن[ف۳]

ف۱ Edward Henry Palmer ف۲ Perse School

ف۳ Palestine Exploration

نوٹ۔ میں اپنے اِس مضمون کو اپنے بڑے بیٹے سید خلیل حسین سلمہ تعالےٰ متعلم جماعت دہم گورنمنٹ ہائی سکول فیروزپور کے نام معنون کرتا ہوں جس نے ترتیب و تکمیلِ مضمون کے سلسلے میں پُرانے مسودات۔ ارسطو جاہ بہادر کی بیاضوں۔ زمانۂ سفر (دکن۔ بھوپال۔ گوالیار۔ ہوشنگ آباد) وغیرہ کی یادداشتوں اور ہزارہا خطوط کے پڑھنے میں میری امداد کی ہے +

آغا حسین

ایڈورڈ ہنری پامر کی دستخطی تصویر

دیوندر ستیارتھی

ڈاکٹر ٹیگور
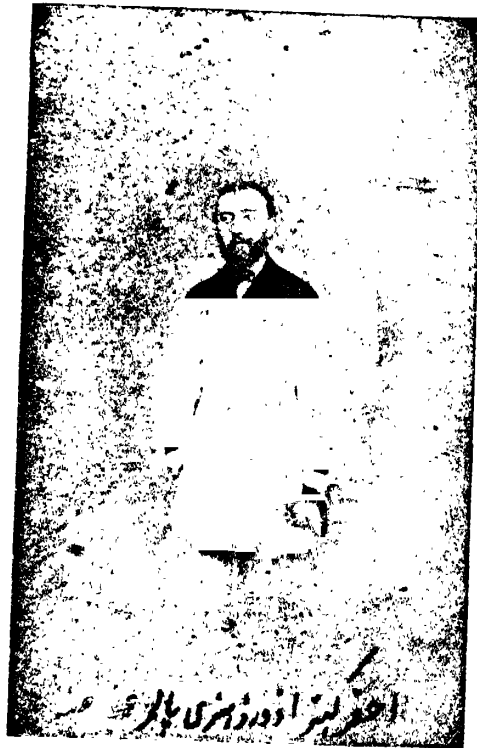
نے سرانجام دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اگلے سال اُس نے چارلس ڈریک کے ساتھ صحرائے التیہ[1] کے حالات دریافت کرنے شروع کئے۔ اُس نے ڈریک کی معیت میں اِس سفر کی صعوبات کو پا پیادہ اور بغیر رہبر کے برداشت کیا اور اِس خطرناک صحراء کو عبور کیا۔ دورانِ سفر میں پامر نے عرب کے بدّو شیوخ سے گہرے روابط پیدا کئے۔ وُہ اس کو عبداللہ آفندی کہہ کر پکارتے تھے۔ گویا اُس نے اپنے شفیق استاد مولوی سید عبداللہ کی یاد اِس صحراء نوردی میں بھی تازہ رکھی۔

لبنان وغیرہ سے گذرتا ہُوا ۱۸۷۰ء میں براہِ قسطنطنیہ اور ویئنا وُہ واپس لنڈن چلا گیا۔ ویئنا میں اُس کی ملاقات مشہور سیاح آرمی نیوس ویمبرے سے ہوئی۔ اِس مہم کا نتیجہ ۱۸۷۱ء میں "ڈیزرٹ آف دی ایکسوڈس[2]" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں اُس نے ایک مضمون "شام کے پُراسرار مذاہب" کے عنوان سے کوارٹرلی ریویو میں شائع کرایا۔ ۱۸۷۱ء کے اخیر میں وُہ کیمبرج میں لارڈ المونرز پروفیسر[3] آف عربک مقرر کیا گیا۔ اسی سال اُس نے شادی کر لی۔ اُس کی تنخواہ قلیل تھی۔ اس لئے حالات نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی۔ اس کی بیوی کو بھی بیماری نے آگھیرا۔ آخر ۱۸۷۸ء میں اس کی بیوی کا انتقال اسی بیماری سے ہوگیا۔ ۱۸۸۱ء میں اپنی دوسری شادی کے دو سال بعد وُہ اخبار "سٹینڈرڈ" کے سٹاف میں شامل ہوگیا۔

۱۸۷۴ء میں اس نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۸۲ء کے اوائل میں گورمنٹ نے اُس سے دریافت کیا کہ کیا وُہ مشرق کی طرف سرزمینِ مصر کے قبائل کی امداد کے لئے جانا چاہتا ہے؟ مقصد یہ تھا کہ اُس کے غیر معمولی رسُوخ کی وجہ سے جو اُس کو صحرائے التیہ کے قبائل میں حاصل ہے۔ قبائل کے شیوخ کو دوست بنایا جاسکے۔ گورمنٹ کا منشاء تھا کہ وُہ عرب شیوخ کو مصری باغیوں کے ساتھ شامل ہونے سے باز رکھے۔ تاکہ وہ نہر سویز کی تیاری میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرسکیں۔ وُہ بغیر رہبر کی امداد کے غازہ چلا گیا اور اس صحراء کو عبور کر کے سویز کے کناروں پر پہنچ گیا۔ یہ ایک نہایت ہی دلیرانہ کارنامہ تھا، بدّوؤں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں وُہ بڑی حد تک کامیاب ہُوا۔ اِس کے بعد وُہ افواجِ مصر کا ترجمانِ خصوصی مقرر کیا گیا۔ سویز سے وُہ پھر صحراء کی طرف بھیجا گیا۔ اس کے ہمراہ کپتان ولیم جان گل[4] اور لیفٹننٹ ہیرلڈ چیرنگٹن[5] بھی تھے۔ اُس کا مقصد قبائل اور شیوخ سے ملاقات کر کے امداد حاصل کرنے کا تھا، علاوہ ازیں یہ بھی خواہش تھی کہ شیوخ سے اونٹ خرید کر افواج کے لئے باربرداری کا ذریعہ مہیّا کیا جائے۔ اِس سفر میں اُس کا اور اُس کے ساتھیوں کا مقابلہ ایک مخالف قبیلے سے ہوگیا جس سے لڑتے ہوئے وُہ بھی اپنے دیگر شرکاء کے ساتھ کام آیا۔ یہ واقعہ ۱۸۸۲ء میں پیش آیا۔ اس کی نعش جنگ کے بعد سر چارلس وارن کی کوشش سے دستیاب ہوئی۔ اور وُہ سینٹ پال کے مشہور کلیسا میں سپردِ خاک کیا گیا۔

۱:۔ Eltih ۲:۔ Desert of the Exodus

۳:۔ Lord Almoners' Professor of Arabic at Cambridge

۴:۔ Captain William John Gill

۵:۔ Flag Lieut Harold Charrington

پامر کی مشہور تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) ڈیزرٹ آف دی ایکسوڈس (۲) نظمِ بہار (۳) تاریخ یروشلم (۴) لغتِ فارسی (۵) انگریزی فارسی ڈکشنری (۶) ترجمۂ قرانِ مجید۔ انگریزی۔

ممکن ہے کہ اُس کا دیوانِ غزلیات چھپ گیا ہو لیکن ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ بعض تذکروں میں البتہ مختلف اشعار ملتے ہیں پامر کے شفیق استاد مولوی سید عبداللہ کیمبرج میں السنۂ شرقیہ کے مدرس تھے۔ پروفیسر مرحوم حضرت ارسطو جاہ بہادر کے شاگرد تھے۔ اُن کے پاس لاہور۔ دہلی اَور جگراؤں میں تحصیلِ علم کرتے رہے تکمیلِ تعلیم کے بعد ارسطو جاہ بہادر مرحوم نے اپنے قابل شاگرد کو کیمبرج میں بھجوا دیا۔ سر جارج کلارک گورنر صوبۂ بمبئی اُس زمانے میں ہندوستان سے واپس جا چکے تھے اَور وُہ ارسطو جاہ بہادر کے نہایت گہرے دوست تھے۔ ان کی سفارش سے سید عبداللہ کو کیمبرج میں جگہ ملی۔

ایڈورڈ ہنری پامر نے جو خطوط اپنے شفیق استاد کے نام تحریر کئے ہیں۔ وہ بھی مولوی سیّد عبداللہ مرحوم نے ارسطو جاہ بہادر کی خدمت میں بھیج دیئے تھے۔ ایک خط میں جو سید عبداللہ کے نام ہے پامر لکھتا ہے :-

مولوی سید اولاد علی صاحب ہنوز جواب نہ نوشتند۔ و نہ طرحِ غزل فرستادند۔ اصلاح اوشاں را برائے مطالعہ فرستادہ بودم۔ وحالا فرصتِ غزل گفتن ندارم۔ از کپتان آر[1] ملاقات شد۔ زبانِ ہندی مثلِ ہندیاں می زنند۔ چرا نہ باشد۔ در ہند نشوونما یافتہ خصوصاً در ملازمتِ سرکارِ اودھ۔ از ہزار زبان ثناخوانِ آں برادر بودہ بنام گارساں دی تاسی چٹھی برائے ملاقات دادہ ام

ذیل کا خط حضرت ارسطو جاہ بہادر کے نام لکھا ہے :-

مورخہ ۲۴ مئی ۱۸۶۷ء

جنابِ فیض مآب خداوندِ نعمت با مروت ارسطو فطرت لقمان طینت مولوی سیّد رجب علی خاں بہادر سلامت!

بعد ادائے لوازمِ تلثیم عتبۂ تکریم و تمنّائے ملازمتِ کیمیا خاصیّت کے گذارش یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر بہ عروض تعلقات جسمانی نہیں ہوں۔

در ظاہر اگر وصالِ جسمانی نیست   غم نیست چو اتصالِ روحانی ہست

مدتِ مدید اَور عرصۂ بعید کہ بہ زبانیٔ استاذی معظمی واخی المکرّمی سیّد عبداللہ صاحب اوصاف شمائلِ حمیدہ واذکارِ اخلاق حسنہ سناکرتا ہوں اور اب غایتِ استیلائے شوق سے نقدِ صبر وقرار زیادہ نہ تھا تھم نہ سکا۔ بے اختیار عرض رساں ہوں ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

---

[1] کپتان آر سے غالباً وہی آر صاحب مراد ہیں جن کا ذکر "ہمایوں" اگست ۱۹۴۰ء میں بہ عنوان "شاہ اودھ یورپینوں کے بے صدگرویدہ تھے" مسٹر بلٹن نے کیا ہے۔

کے باشد و کے کہ دولت آپ کی ملازمت کی حاصل کروں ؎

عشقت اندر پس صد پردہ مرا مفتوں کرد

آں کہ دیدارِ ترا دید نہ دانم چوں کرد

تر صد کہ فدوی کو یکے از خیر خواہانِ صمیمی تصور فرماویں۔ اب تھوڑا سا احوال اپنا گذارش کرتا ہوں کہ دار العلم کیمبرج میں بیس برس تک تربیت پائی۔ عہدہ سول سروس ہند کا سات برس ہوئے کہ کمترین کو ہونا تھا۔ وہاں کا احوال اور خرد ماغیٔ حکام سن کر لعنت کی کہ رزاقِ مطلق نے ڈال روٹی گھر بیٹھے بٹھلائے دی ہے۔ ماہِ فروری میں بعدِ امتحان سہ ماہِ ہر سال آخر کو امتحانِ خاتمہ سے فراغت پائی۔ اور خطابِ فضیلت بہ جلسہ عالمانِ مدارس و رئوسایاں اِس دار العلم و گرد و نواح کے بمعہ جاگیر عطا ہوا۔ علوم لاطینی۔ یونانی۔ فلاسفی منطق۔ ریاضی۔ انگریزی جس طرح حاصل ہُوا۔ پرچۂ ملفوفہ مطبوعہ اخبارِ نامدار ٹائمس مورخہ ۵ رمئی سے واضح رائے زریں ہوگا ؎

ثنائے خود بہ خود گفتن نمے زیبد الخ

بندہ نے جب سید عبد اللہ صاحب اِس دار العلم میں درس عربی۔ فارسی۔ بنگالی۔ گجراتی دینے کے لئے آتے تھے، پڑھا اَور کبھی لنڈن جاکر سبق لیا۔ مگر اب اس جگہ صورتِ قیام ہے اَور سید صاحب سے کوسوں کا فاصلہ ہے۔

کمترین در نیولا ترتیبِ فہرستِ کتب عربی و فارسی میں دن رات مشغول ہے۔ عجیب و غریب کتابیں ہیں۔ بعدِ اختتامِ فہرست ایک فرد حضور کے ملاحظے کو روانہ کروں گا۔ کمترین کا قصد سیر و سیاحتِ سرزمینِ عرب کا ہے تاکہ وہاں سے سندِ فضیلت کی دستیاب کروں۔ اَور جو خامی ہے پختہ ہو جاوے جتنی کتب درسیہ عربی ہیں۔ خام پڑھی ہیں۔ اَور کلام اللہ بخوبی یاد کیا ہے۔ علاوہ بریں ترتیبِ فہرست کا بڑا اجنجال ہے۔ بارہ گھنٹے تک دم مارنے کی مہلت نہیں ملتی۔ عرب میں بہ صحبت علماء و فضلاء کے خوب دل لگاکر پڑھوں گا۔ امیدوار ہوں کہ اِس نالائق خاک نشین کو اپنا تابعدار اَور دام ناخریدہ تصور فرماکر گوشۂ خاطر سے نہ بھلادیں گے۔ اَور مثل دیگر فرنگیوں کے جو مارے فاقوں کڑاکوں کے وہاں گئے ہیں۔ تصور نہ فرمادیں گے۔ حضور نے مجھے نہیں دیکھا ہے۔ مگر منشی بذل الرحیم صاحب زمیندار سیالدہ کلکتہ نواب اقبال الدولہ بہادر وغیرہ بخوبی واقف ہیں۔ اَور نسخہ مسمّٰی بہ "لالہ رُخ" دیوان مسٹر مُور مبرور کو انگریزی سے عربی نظم کیا ہے۔ اکثر فضلائے عرب نے جو یہاں آئے۔ پسند کیا اَور اسناد عنایت کی ہیں۔ بعدہٗ آپ کو بھی عرضی لکھوں گا۔ ڈاکٹر لائٹنر صاحب جو اب لاہور میں پرنسپل مدرسہ ہیں اگرچہ ظاہری ملاقات کی نوبت نہیں پہنچی۔ الا وہ میرے نام اور تصنیفات انگریزی اَور لاطینی سے واقف ہیں۔ اپنی تصویر بھی ملفوف کرتا ہوں۔ زیادہ بندگی اور آداب۔ فدوی کا نشان ذیل میں درج ہے۔ اِس پتے سے بخوبی آپ کا پروانہ مجھے ملے گا۔ فقط (اپنا نام اور پتہ انگریزی میں تحریر کیا ہے جو حسب ذیل ہے)

E. H. Palmer Esq. B.A. M.R.A.S. M.S.A.P
St. Johns College Cambridge
England

رقیمہ نیاز ایڈورڈ ہنری پامر عفی عنہٗ
مقام دار العلم کیمبرج مورخہ ۲۴ رمئی ۱۸۶۷ء

پامرسادہ اور سلیس اردو میں شعر کہتا تھا۔ پامر تخلص تھا۔ اپنے خطوط میں اکثر غزلیات لکھی ہیں۔ اُردو اَور فارسی دونوں زبانوں پر کافی مہارت تھی بمعلوم ہوتا ہے۔ کہ غزل میں میرؔ کا رنگ خاص طور پر پسند تھا۔ کلام میں مشرقیت بہت نمایاں ہے۔ جو ایک مغربی شاعر کے لئے نہایت درجے آورد سے پیدا کی ہوئی چیز ہونی چاہئے۔ لیکن کلام پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر نے مہینوں نہیں بلکہ برسوں دہلی اور لکھنؤ کی گلیوں میں سیر کی ہے مختلف زبانوں کے شوق میں اہلِ زبان سے عموماً ملنے کے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ اُردو اَور فارسی۔ ہندوستانی اور ایرانی شعراء کی طرح لکھتے ہیں۔ بعض قصائد میں عُرفی کا تتبع کیا گیا ہے۔ اُردو کے خطوط نہایت دل چسپ ہیں۔ فارسی کے بعض خطوط بھی ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ اُردو کی غزلوں میں عجیب سوز و گداز ہے۔ عموماً اُردو غزلیں نہایت سلیس اور سادہ زبان میں لکھی ہیں۔ ایک خط میں جو سیّد عبداللہ کے نام لکھا گیا ہے۔ آخر میں لکھا ہے۔ دریں وِلا اتفاقِ گفتنِ غزل ہزل در اُردو کہ محاورۂ اُو راگزاشتہ ام۔ حسبِ طرح نواب صاحب از پار بزافتاد بطورِ اصلاح مے فرستم ؎

جاں لب پہ آن پہنچی دلدار گھر نہ آیا	ہم جا چکے جہاں سے پر وُہ اِدھر نہ آیا
دعوے مقابلے کا تھا سب بتوں کو لیکن	جب سامنے ہُوا وہ کوئی نظر نہ آیا
تب تک نہ باز آیا رونے سے دل ہمارا	آنسو کے ساتھ جب تک خونِ جگر نہ آیا
بتیابیوں سے عاشق لاکھوں موئے گلی میں	لیکن وُہ حور پیشہ بیرونِ در نہ آیا
اُس چشم خوں فشاں سے کس دم لہو نہ برسا	سیلابِ خُون ہمدم کب تا کمر نہ آیا
پامر سا اک نصاریٰ تھا بے گناہ مارا	اے بُت خُدا کا تجھ کو ذرّہ بھی ڈر نہ آیا

دیگر

فغاں اُس در پہ تک تُو اے دلِ رنجور مت کیجو

بتوں کے شہر میں عاشق مجھے مشہور مت کیجو!!!

قسم ہے تجھ کو اپنے دین اَور ایمان کی محرم

ہماری اُن کی صحبت کا کہیں مذکور مت کیجو!

ہزاروں آئینے تو توڑنا پتھر سے اے ظالم

پر اک سنگِ جفا سے شیشۂ دل چور مت کیجو!

لگی ہے آنکھ اِس محزون پامر کی سحر ہوتے

دلِ نالاں خدا کے واسطے تک ہُو (شور) مت کیجو۔

غزل فارسی

یارے کہ ندارد خبر از حالِ دلِ ما	ہر جا کہ بُوَد سلمہ اللہ تعالیٰ
یا رب کہ گماں داشت کہ آں دلبرِ بے رحم	زینگونہ فراموش کند اہلِ وفارا
شمعیم کہ ہر جا بہ ہماں سوز و گدازیم	مارا کہ چہ میخانہ چہ مسجد چہ کلیسا۔
از دوستیٔ سرو قدانم چہ کُنی منع	زاہد کہ نداری خبر از عالمِ بالا۔
پامرِ من و صوفی ہمہ شوریدۂ عشق ایم	عشق است کہ نگذاشت چہ دیوانہ چہ دانا

اسی خط میں مولوی سید عبد اللہ کے نام لکھا ہے :۔

آن برادر از احقر خواستہ اند کہ قصیدۂ بر طرح حضرت سودا "عجب ناداں ہیں وہ جن کو ہے عجب تاجِ سلطانی،" نقش نویسم۔ ایں فراموش می فرمائید کہ از عرصہ اُردو را بالکل ترک کردہ ام۔ بر طرح حضرت مولانا عرفی مثل نامۂ اعمالِ خود سیاہ کردہ بودم۔ مطلعِ حضرتِ مغفور ؎

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ	گوہرِ ہر سُود در جیبِ زیاں انداختہ

ایں ہیچ مدان کج مج بیاں براں نوشتہ ؎

عشق اُو چوں اشکِ ما را از جہاں انداختہ	وانگہ از طاقِ دلِ من ایں و آں انداختہ
روزگارے شد کہ سودائے سرِ زلفِ بتاں	از دلم اندیشۂ سود و زیاں انداختہ
آہ !از بیدردیٔ یارے کہ با آں معرفت	زہر در کام از لبِ شکر فشاں انداختہ
عقل از شوقِ سجودِ خاکیانِ در گہش۔	بارہا خود را ز اوجِ آسماں انداختہ
فکرِ تنگِ من کجا و ذرۂ قدسش کجا	شہسوارِ عقل در راہش عناں انداختہ
شوقِ دامِ او کزاں ہرگز گرفتاری نرست	مرغِ جاں را آتش اندر آشیاں انداختہ

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں (احتیاطاً اُردو میں اصل فارسی عبارت کا خلاصہ درج کرتا ہوں) اِس قسم کے اشعار سے زیادہ زحمت نہیں دینا چاہتا۔ آپ نے ہندوستان کے جرائد و اخبارات میں میرے اشعار ملاحظہ کئے ہوں گے۔ دنیا کے تفکّرات سے ایک لمحہ کی فرصت نہیں کہ کسی اور کام کی طرف توجہ کروں۔ ہر ہندوستانی ڈاک سے شعراء اور ادباء اور اخبارات کے ایڈیٹروں کے خطوط میری عدم تحریر کے متعلق موصول ہو رہے ہیں۔ اور میں خجالت سے سر در گریباں ہوں حتیٰ کہ نجی اور خانگی معاملات میں بھی توجہ نہیں کر سکتا۔ آپ نے جو تعریف و ثنا میرے ترجمۂ اشعارِ حافظ کی فرمائی ہے اور خصوصیت سے میری نظم و نثر کی تعریف کی ہے اس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ حالانکہ من آنم کہ من دانم۔ انگریزی میری اصل زبان ہے۔ اِس میں عبارت درست لکھوں تو یہ کوئی تعریف نہیں۔ مسٹر ڈیون پورٹ نے میرے رسالے

ہمایوں دسمبر ۱۹۴۱ء

پامر سادہ اور سلیس اردو میں شعر کہتا تھا۔ پامر تخلص تھا۔ اپنے خط
مہارت تھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ غزل میں میر کا رنگ خاص طور پر پسند تھا۔ کلا
درجے آورد سے پیدا کی ہوئی چیز ہونی چاہیئے۔ لیکن کلام پڑھ کر معلوم ہوتا
میں سیر کی ہے۔ مختلف زبانوں کے شوق میں اہلِ زبان سے عموماً ملنے
شعراء کی طرح لکھتے ہیں۔ بعض قصائد میں عُرفی کا تتبع کیا گیا ہے۔ ا
ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ اُردو کی غزلوں میں عجیب سوز و گداز ہے۔ م
ایک خط میں جو سیّد عبداللہ کے نام لکھا گیا ہے۔ آخر میں لکھا ہے۔ دریں
ام حسبِ طرح نواب صاحب از پاریزا افتاد بطورِ اصلاح مے فرستم ؎

جاں لب پہ آن پہنچی دلدار گھر نہ آیا — ہم جا چکے جہاں
دعوے مقابلے کا تھا سب بتوں کو لیکن — جب سامنے ہو
تب تک نہ باز آیا رونے سے دل ہمارا — آنسو کے ساتھ جب
بیتابیوں سے عاشق لاکھوں موئے گلی میں — لیکن وہ جور پیشہ
اُس چشمِ خوں فشاں سے کس دم لہو نہ برسا — سیلابِ خون ہمدم کب
پامر سا اِک نصاریٰ تھا بے گناہ مارا — اے بُت خُدا کا تجھ کو ذرّہ بر

دیگر

فغاں اُس در پہ تک تو اے دلِ رنجور مت کیجو
بتوں کے شہر میں عاشق مجھے مشہور مت کیجو!!!
قسم ہے تجھ کو اپنے دین اور ایمان کی محرم
ہماری اُن کی صحبت کا کہیں مذکور مت کیجوا
ہزاروں آئینے تو توڑنا پتھر سے اے ظالم
پر اِک سنگِ جفا سے شیشۂ دل چُور مت کیجوا
لگی ہے آنکھ اِس محزون پامر کی سحر ہوتے
دلِ نالاں خدا کے واسطے تک (شور؟) ہو رمت کیجو۔

من دانم۔ انگریزی میری اصل زبان ہے۔

"سورنگ اور تماشا" کو پسند کیا ہے۔ اُن کی مہربانی اور عنایت ہے۔ انگریزی میں ان کا طرزِ نگارش نہایت خوب ہے۔ اِس وقت گرجا کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ اِس لئے اِس عبارت کو ختم کرتا ہوں۔ اپنی بیگم صاحبہ کو میری طرف سے آداب کہئے گا۔ فقط

رقیمہ نیاز اڈورڈ ہنری پامر عفی عنہ

مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۸۶۶ء

ایک خط میں ارسطو جاہ بہادر مرحوم کو اس طرح خطاب کرتے ہیں:۔

جنابِ مستطاب معلیٰ القاب خداوندِ نعمت ارسطو جاہ سیّد رجب علی خاں دام اقبالہٗ۔

بعد سلامِ بغایت و نیازِ لانہایت واضح رائے بیضا می گرداند کہ بروسیلۂ جمیلۂ اخِ مشفق خود سیّد عبداللہ صاحب عنایت نامۂ آں جناب بر مطالعۂ احقر افتاد ...... جرأت دارم کہ عرضِ دیگر بہ حضورِ پُر نور گذارم۔ و آں این است کہ بندہ از صحبتِ تعلیم برادرِ موصوف در السنۂ شرقیہ اندک دخل کردہ۔ کتاب شاہنامۂ فردوسی قدّس اللہ تعالیٰ سرہٗ را خواندن آغاز کردہ۔ امّا در ہجوے کہ بر شاہ محمود غزنوی نوشتہ یک بیت حائل شد کہ مطلبِ آں در فہم ناقص این ہیچ مداں بالکل نمے آید۔ و ہیچ یکے از زباں دانانِ این جا طاقتِ حلّ این عقدہ ندارد۔ و نہ از کدامی کتاب شرحِ آں دریافت مے شود۔ لہٰذا رجوع بآں واقفِ اسرارِ حقیقی و عالمِ رموزِ دقیقی مے کنم۔ بیت مذکور در ذیل رقم می شود ؎

کفِ شاہِ محمود عالی تبار
نُہ اندر نُہ است و سہ اندر چہار

اگر عندالفرصت از جوابِ این عریضہ سرفراز و ممتاز خواہید فرمود۔ بعید از لطف و عنایت نخواہد شد۔ باقی دعائے دولت ابدمدت و بقائے عمر باد۔

ایڈورڈ ہنری پامر عفی عنہ

بمقام سینٹ جان کالج دارالعلم کیمبرج انگلستان

مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۶۷ء

۲۷ مئی ۱۸۶۷ء کو ارسطو جاہ بہادر مرحوم نے ایک یادداشت آپ کے متعلق اپنی بیاض میں تحریر فرمائی ہے۔ (یہ یادداشت مع دیگر تصاویر وغیرہ کے میں نے بقول علامہ اقبال مرحوم کے اپنے بعض دیگر نوادر[1]" کے ساتھ آل انڈیا ہسٹاریکل کانگریس لاہو

---

[1]: علامہ اقبال مرحوم نے میرے Collection کے بعض نوادر کے متعلق میرے والد ماجد میر سیّد مصطفٰے احسن صاحب قبلہ جاگیردار جگراؤں کو تحریر فرمایا تھا "افسوس کہ جگراؤں آنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا۔ ورنہ آپ کے نوادر دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوتی"

آغا حسین

کی نمائش میں بھیجی تھیں۔ یہ تاریخی نمائش ایامِ کرسمس میں ڈاکٹر بروس کی زیرِ قیادت میو سکول آف آرٹ لاہور میں منعقد ہوئی تھی، اِس یادداشت کا ماحصل یہ ہے:۔

"ایڈورڈ ہنری پامر علومِ مشرقیہ میں دسترس رکھتے ہیں۔ عمر ۲۸ سال ہے۔ مشکلات بذریعۂ خطوط دریافت کرتے رہتے ہیں۔ اُردو عبارت خوب تحریر کرتے ہیں۔ ہندوستان میں کبھی نہیں آئے۔ جملہ زبانیں دارالعلم کیمبرج میں حاصل کی ہیں۔ زیادہ اتفاق شہرِ لنڈن میں رہنے کا ہوتا ہے۔ اپنی تصویر بطورِ تحفہ بھیجی ہے۔"

اِس تاریخی یادگار تصویر کا عکس اِس مہینے "ہمایوں" میں شائع کیا جا رہا ہے۔ سید عبداللہ کے ایک خط میں ایڈورڈ ہنری پامر کا ذکر اور سر سید احمد خاں کے دورانِ قیامِ انگلستان کا ذکر آگیا ہے۔ یہ خط ۲۴ ستمبر ۱۸۶۹ء کو لنڈن سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں نواب مرشد آباد۔ سر سید احمد خاں اور سید محمود خلف سر سید مرحوم کے حالات و واقعات سرزمینِ انگلستان پر بیان کئے گئے ہیں۔ اِس خط میں مولوی سید عبداللہ مرحوم ارسطو جاہ بہادر کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔" آپ کا ذکر اکثر آتا ہے۔ کل آپ کی عطیہ مہر پامر نے نواب صاحب کو دکھلائی بہت ہی عمدہ انگوٹھی طلائی پر نصب کی ہے۔ مولوی سر سید احمد خاں بہادر فرماتے تھے کہ حضور سے دہلی میں ملاقات کی تھی اور آپ کے نہایت مداح اور ثناخواں ہیں اور کہا کہ خطۂ پنجاب میں آپ کا ثانی نہیں۔ بڑے فاضل اور زبردست مجتہد ہیں۔ اسی سبب سے میرے اور ان کے درمیان محبت ہے"

یہ بلند پایہ مستشرق عربی اُردو اور فارسی ادیب اور شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہنے کا مستحق ہے اس کے خطوط کے مطالعہ سے یہ امر ظاہر ہے کہ وُہ سختی کے ساتھ حکومت کرنے کو ناپسند کرتا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ حکومت خلوص اور محبت کے ساتھ کی جائے۔ ایسی ہی حکومت کی بنیادیں مستحکم اور پائدار بھی ہوتی ہیں بقولِ پامر ؎

شمیم کہ ہر جا بہمہ سوز گدازیم
ما را کہ چہ میخانہ چہ مسجد چہ کلیسا

سید آغا حسین

ضمیمہ

حال ہی میں شعبۂ اطلاعاتِ حکومتِ ہند نے نئی دہلی سے ایک مختصر رسالہ "انگلستان اور عربی علوم و فنون" شائع کیا ہے۔ یہ فاضل مستشرق ڈاکٹر برنارڈ لویس کی اُن چھ تقریروں پر مشتمل ہے جو بی۔ بی۔ سی لنڈن سے عربی پروگرام کے سلسلے میں نشر کی گئی ہیں۔ اُس کا ایک پرچہ اتفاقاً مجھے مل گیا۔ اُس کے مطالعہ سے دو چار باتیں ایڈورڈ ہنری پامر کے متعلق اور معلوم ہوئی ہیں۔ جو ذیل میں درج ہیں:۔

پامر کا سنہ وفات ۱۸۸۲ء وہی سال ہے جس میں عرابی پاشا کی تحریک اُٹھی تھی۔ پامر نے بیک وقت عربی۔ فارسی اور اُردو زبانوں کو سیکھنا شروع کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں یہی نہیں کہ انگریزی اشعار کا اپنی محبوب عربی زبان میں ترجمہ کرنے لگا بلکہ خود بھی عربی زبان میں شعر کہنے لگا۔ اُس نے اُن عربوں کے ساتھ تعلقات پیدا کئے جو اُس وقت انگلستان میں موجود تھے۔ اُن میں سے ایک شخص حلب کا رہنے والا تھا جس کا نام رزق اللہ حلبی تھا۔ اُس کے ساتھ پامر کے مراسم بہت بڑھ گئے۔ اور پامر کی شخصیت اور تحریر پر اُس کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ پامر نے رزق اللہ سے بہت کچھ تعلیم حاصل کی۔ وُہ اُس کا بہت مدّاح تھا۔

۱۸۶۹ء میں اُس کو یہ موقع مل گیا کہ عربی زبان اور عربوں کے تمدن کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کرے اور اُس قوم سے بذاتِ خود تعارف حاصل کرے جس کی زبان اور ادبی سرمائے کو وُہ اتنا پسند کرتا تھا۔ اُس نے دو مرتبہ فلسطین کے آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کرنے والی ایک انجمن کی جانب سے مشرقِ قریب کا سفر کیا۔

اُس کا شمار یورپ کے اُن چند اہلِ علوم میں ہے جو مشرقی زبانوں میں نہایت صحت اور روانی کے ساتھ لکھ سکتے تھے۔ اُس کی اُردو کی کچھ تحریریں شائع ہو کر ہندوستان میں بہت مقبول ہوئیں۔ اُس نے انگلستان میں جو مضمون شاہِ ایران کی سیاحت پر اُردو زبان میں لکھا وُہ اُردو ادب میں یادگار خیال کیا جاتا ہے۔ پامر عربی۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہتا تھا۔ بعض وقت وُہ انگریزی میں اظہارِ خیال کے لئے دقّت محسوس کرتا تھا اور یک بیک عربی میں لکھنے لگتا تھا۔ اُس کے ایک دوست اور رفیقِ کار جی۔ ایف۔ نکل (G. F. NICHOLL) نے جو آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر تھا اُس کے متعلق لکھا ہے۔ اُس کے اُن خطوط سے جو اُس نے مجھے انگریزی میں لکھے' اکثر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُسے انگریزی میں اظہارِ خیال کرنے میں کچھ اُلجھن سی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وُہ فوری جذبات سے متاثر ہو کر یا نقد و تبصرہ کے وقت یک بیک عربی یا فارسی نظم و نثر شروع کر دیتا تھا۔ مثال کے طور پر پامر کے حسبِ ذیل عربی اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) لیت شعری ھل کفی ماقد جری — مذجری ماقد کفی من مقلتی

(۲) قد بری اعظم حزن اعظمی — دفنی جسمی حاشا اصغری

ترجمہ:-

(۱) کاش مجھے یہ معلوم ہوتا۔ کہ وُہ آنسو جو اب تک بہہ چکے ہیں نیز جن کی اس وقت تک جھڑی لگی ہوئی ہے۔ اب کافی ہوں گے۔

(۲) اس بھاری غم نے میری ہڈیاں گلا دی ہیں اور میرے جسم کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔ ہاں ایک چھوٹی سی شے دل (یا زبان؟) باقی رہ گئی ہے۔

اُس نے اپنی موت سے پہلے بہاء الدین زہیر مصری شاعر کا پورا کلام عربی متن اور انگریزی منظوم ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ اور اُس میں حواشی اور مقدمے کا اضافہ کیا۔

بیس برس کی عمر میں اُس کی ملاقات ایک ہندوستانی مسلمان سید عبداللہ سے ہوئی جو کیمبرج یونیورسٹی میں ہندوستانی زبان کا لکچرر تھا۔ اُسے سید عبداللہ ہی کی وجہ سے علوم مشرقیہ سے پہلے پہلے دلچسپی پیدا ہوئی۔

ـــــــــــــــ

سید آغا حسین

بزمِ طرب

ایک چینی نظم کا ترجمہ

صُراحی میں شراب بھر کر میں گلستاں کو جاتا ہوں، تاکہ پھولوں میں بیٹھ کر شغلِ مے نوشی کروں۔

ہماری بزمِ طرب تین افراد پر مشتمل ہوتی ہے ــــــــ مَیں، میرا سایہ اور چاند۔

خوش قسمتی سے چاند پینا نہیں جانتا اور میرے سائے کو پیاس نہیں لگتی۔

جب میں گاتا ہوں تو چاند خاموشی سے سُنتا رہتا ہے اور جب میں ناچتا ہوں تو میرا سایہ بھی ناچنے لگتا ہے۔

ہر بزمِ طرب کے خاتمے پر ساتھی جُدا ہو جاتے ہیں مگر میرے ساتھی کبھی نہیں بچھڑتے۔

جب مَیں گھر جاتا ہوں تو چاند بھی میرا ساتھ دیتا ہے اور میرا سایہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔

ـــــــــــــــ

میرزا طالب شیرازی

"جانے نہیں دیں گے۔
یہ کتنی ناسمجھی کی بات ہے۔
دھرتی گنگا کو اپنی چھاتی سے لپٹا کر رکھنا چاہتی ہے،
آسمان گائے کے بچھڑے جیسے سفید بادل کو اپنی آنکھ کا آنسو بنائے رکھنا چاہتا ہے۔
سب کہتے ہیں، جانے نہیں دیں گے، جانے نہیں دیں گے،
پھر بھی جانے دینا پڑتا ہے،
پھر بھی لوگ چل دیتے ہیں!"

وُہ خود بھی چل دیا ــــ رابندر ناتھ ٹیگور، ہندوستان کا شاعرِ اعظم خود بھی چل دیا۔ کئی صدیوں کے بعد ایسا جوہر کمال پیدا ہوتو ہو۔ روز روز تو ایسی شخصیت نمودار نہیں ہوتی جس کی تخلیق میں شاعری، ناول، افسانہ، ڈراما، تنقید، فلسفے اور سیاست نے یکساں طور پر ہاتھ بٹایا ہو۔ ۷ اگست کی شام کو گھر سے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اخبار فروش چلا چلا کر ضمیمہ بیچ رہے ہیں ــــ ڈاکٹر ٹیگور چل بسے ..... آج دوپہر کے بارہ بج کر تیرہ منٹ پر ..... کلکتہ میں ..... ڈاکٹر ٹیگور ....." اپنے کانوں کو جھٹلاتا ہُوا میں تیزی سے قدم اُٹھانے لگا میو ہسپتال سے جو سڑک نیلے گنبد کی طرف جاتی ہے، اُس پر پہنچ کر میں رُک گیا۔ قریب ہی ایک تانگہ آ کھڑا ہُوا جس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب تازہ ضمیمہ پڑھ رہے تھے ...... میں نے ضمیمہ نہ خریدا۔ کانوں کے علاوہ آنکھوں کو جھٹلانا اور بھی مشکل میں ڈال دیتا۔ پھر اگلی صبح اخبار اُٹھایا تو دلِ پر غم کی بھاری سی سِل آ پڑی۔

شاعر ٹیگور کے الفاظ میرے ذہن کی گہرائیوں میں گونج اُٹھتے ہیں "پُن ہو یا پاپ، ذِلّت ملے یا عزّت، ہر حالت میں، اے ماں، میں تیری گودی میں جنم لُوں، بار بار جنم لوں"۔ جغرافیائی حدود سے قطعِ نظر وُہ اِنسانی مساوات اور اخوّت کے حامی تھے۔ وطن کی غلامی بھی انہیں ہمیشہ یاد رہتی تھی۔ اور حق تو یہ ہے کہ بلند پایہ ادب کی تخلیق سے کہیں بڑھ کر اُن کا کارنامہ ہے جذبۂ حبّ الوطنی۔ روح کی آزادی کا نغمہ چھیڑتے ہوئے اُنھوں نے بار بار دیس کو ذِلّت اور بے چارگی سے چھٹکارا پانے کا پیغام دیا تھا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کی خبر ہے کہ موت سے تین دن پہلے ہی شاعرِ اعظم پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی ...... موت سے پہلے آخری رات کو بارہ بجے سانس بہت دشواری سے چلنے لگا۔ صبح ہوتے ہوتے صورت اور بھی نازک ہو گئی۔ سب نے جان لیا کہ وُہ دو چار ہی گھنٹوں کے مہمان ہیں ...... شاعر کے بچپن کے دوست رامانند چیٹرجی نے اُن کی صحت کے لئے دعا کی۔ مگر موت کو کون روک سکتا ہے؟ ..... شاعر کی ارتھی کے ہمراہ کوئی ایک لا

لوگ ہوں گے سینکڑوں عقیدت مند دھیں، جن میں ہر عمر کے مرد اور عورتیں شامل تھیں، ننگے پاؤں چل رہی تھیں . . . . . شام کے سات بجے، دریائے ہگلی کے پانیوں پر اندھیرا چھا رہا تھا، شاعرِ اعظم کی لاش چتا پر لٹا دی گئی۔ بندے ماترم کے نعرے بلند ہوئے اور ٹیگور کی جے، کا جے جے کار برابر گونج رہا تھا . . . . . کلکتہ کے نمتلہ گھاٹ سے جہاں شاعر کا جسمِ خاکی جلایا گیا تھا، اُن کی راکھ شانتی نکتین میں بھیج دی گئی ہے اور وہاں اِس راکھ کو ایک کورے گھڑے میں ڈال کر اُس گھڑے کے قریب ہی، جس میں اُن کے والد مہرشی دیوندرناتھ ٹیگور کی راکھ محفوظ ہے، دفنا دیا گیا ہے۔

شاعر کے صاحبزادے کے نام اپنے خط میں مَیں نے لکھا ہے:-

". . . . . مجھے تو یقین نہیں آتا کہ گوردیو اِس دنیا سے چل بسے ہیں۔ مجھے تو وُہ اب بھی جگن ناتھ پوری میں سمندر کی طرف منہ کئے اُڑیسہ گورنمنٹ ہاؤس کی چھت پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں جہاں میں آخری مرتبہ اُن سے ملا تھا۔ میں نے اُن کو متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا سمندر کی لہریں دیو داسیوں کی طرح ناچ رہی ہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹ ناچ اُٹھی تھی۔ یہ مسکراہٹ اُن کی فطانت کا نچوڑ تھی اور وہ میرے ذہن میں اپنے پورے مفہوم اور مقصد کے ساتھ سدا زندہ رہے گی، سدا نکھرتی رہے گی . . . . ."

شاعر کی صحبت میں ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ تازہ پہاڑی شہد نصیب ہو رہا ہے۔ جم کر اُن کے نزدیک رہنے کا تو کبھی سوال ہی نہ اُٹھا۔ شروع ہی سے مَیں ایک خانہ بدوش کی صورت میں اُن سے ملتا تھا۔ مگر ہر بار میں نے اِس شہد کو خلوص میں بسا ہوا پایا۔ یہ پریم کا شہد تھا۔ ہر نیا تجربہ اور مشاہدہ ہمارے ذہن پر ایسے نقش بناتا رہتا ہے جن کا تعلق براہِ راست ہماری آپ بیتی سے ہو جاتا ہے۔ ہر آپ بیتی ایک دعوتِ فکر ہوتی ہے اور ہر دعوتِ فکر اِس شہد کے بغیر ادھوری ہی رہتی ہے۔

وُہ بولتے تو اُن کے الفاظ کھولنے سے معلوم ہوتے۔ اِن سے مانوس ہوتے دیر نہ لگتی کبھی کبھی بات چیت کے دوران میں اُن کی آنکھیں مِچ جاتی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ غوّاص نے موتی کی تلاش میں ڈبکی لگا دی ہے پھر جب آنکھیں کھولتے تو اُن میں تصوف کی جھلکیاں نظر آنے لگتیں۔ اُن کا ہاتھ سیدھا سیپ تک پہنچتا تھا۔

اور باتیں پیچھے، اُن کے لطیف ذوقِ ظرافت کا ذکر مقدم۔ ایک بار اُنہوں نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا تھا۔

"جنوبی افریقہ سے لوٹ کر گاندھی جی شانتی نکتین تشریف لائے تھے۔ اُن دنوں اُنہوں نے دودھ پینا ترک کر رکھا تھا۔ کسی طرح انہیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ دودھ میں کسی قدر زہر ملا رہتا ہے۔ ایک دن وہ میرے پاس بیٹھے تھے۔ میرے لئے دودھ آیا تو میں نے کہا — لیجئے آپ بھی ایک پیالی!

"گاندھی جی مسکرا کر بولے — اِس میں تو زہر ہے۔

"میں نے فوراً ہی جواب دیا۔ سچ تو ہے۔ زہر تو اِس میں ہے ہی۔ پر یہ زہر اتنا کم ہے کہ نصف صدی کی عمر میں یہ مجھے نصف بھی نہیں

مار پایا ...."

ایک بار میں نے یہ واقعہ اپنے گاؤں میں ایک کسان کو سنایا۔ وُہ بیچارہ اسے سمجھ ہی نہ سکا۔ پھر جب میں نے شاعر سے اس کا ذکر کیا تو وُہ بولے۔ "تم نہیں ہارے یہ میری ہار ہے۔ گاندھی جی سے بازی لے جانے کے باوجود میں ایک کسان کے سامنے چاروں شانے چت گر پڑا ہوں۔"

شاعر کا ذوقِ ظرافت دھیمے دھیمے بہنے والے دریا کی طرح تھا۔ کوئی راجکماری اُن کا درشن کرنے آئی معلوم ہوتا تھا کہ اجنتا کے کسی غار سے کوئی تصویر شاعر کے پاس آنکلی ہے۔ شاعر کے بال ابھی سفید نہ ہوئے تھے۔ راجکماری بولی "آپ بہت سندر ہیں۔" شاعر کو یوں محسوس ہُوا کہ کہیں پاس ہی گھنگرو بج اُٹھے ہیں۔ راجکماری کی بات سُنی اَن سُنی کر دی گئی۔ اُس نے اپنی بات دُہرائی۔ اس بار شاعر نے بڑے دھیان سے راجکماری کے روپ کا ملاحظہ کیا اور کہا "راجکماری بھی تو سندر ہے۔" اس واقعہ کی تصدیق ضروری تھی۔ مَیں نے خود شاعر سے پوچھا تو وُہ مُسکرانے لگے۔

"میں نے ضرور یہ بات کہہ دی ہوگی۔"

"پر مجھے تو یہ بات یوں ہی بنائی ہوئی معلوم ہوئی تھی۔"

"کہہ جو دیا۔ میری زندگی کی ایسی بیسیوں باتیں اَور بھی سُننے کو ملیں گی ..... آخر مَیں بھی آدمی ہوں۔"

شاعری بڑی چیز ہے، فلسفہ بھی اور تصوف بھی۔ مگر لطیف ظرافت کی جھلکیوں میں بھی ہمیں زندگی کا جوہر نصیب ہو جاتا ہے۔ ایک بار کسی نوابی گھرانے کے ایک رُکن نے شاعر کو دیکھتے ہی کہا "واللہ کیا نُورانی چہرہ ہے۔" شاعر کے سکرٹری نے اِس جملے کا ترجمہ کر کے سُنایا تو شاعر نے مُسکرا کر کہا "کون جانے ان کی کیا رائے ہوتی اگر مجھے میری جوانی میں دیکھ لیتے!" وُہ صاحب پھر کچھ نہ بولے۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ جوانی میں شاعر کا چہرہ زیادہ نورانی ہوگا۔ اُن کے سفید بال نورانی چہرے کے معاون بن گئے تھے۔

چند برس پہلے وشوبھارتی نے شاعر کی بہترین نظموں کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔ "چینیکا"۔ اس انتخاب کا فیصلہ ووٹوں کے ذریعہ سے کیا گیا تھا۔ ووٹ دینے والے اصحاب میں شاعر کے بڑے بڑے مداح شامل تھے۔ مگر یہ انتخاب شاعر کو بہت پسند نہ آیا۔ کیونکہ اس میں کئی ایسی نظمیں بھی شامل ہونے سے رہ گئیں جو شاعر کو بے حد پسند تھیں۔ اُنہوں نے خود ایک انتخاب تیار کیا۔ "سنچیتا"۔ جب وشوبھارتی نے اسے شائع کیا تو شاعر کے دوستوں نے دیکھا کہ اس میں کچھ ایسی نظمیں بھی شامل کر لی گئی ہیں جو اُن کے خیال کے مطابق اتنی بڑھیا نہ تھیں۔ ایک صاحب تو بہت خفا ہوئے۔ ایک نظم کی اہمیّت دریافت کرنے کے لئے وہ شاعر کے پاس آپہنچے۔ شاعر نے جواب دیا "یہ سب باتیں مَیں نہیں جانتا۔ آپ سر رادھا کرشنن سے ملئے۔ اپنی شاعری مَیں خود بھی شاید اتنی نہیں سمجھتا۔ اِس کے فلسفہ پر اُنہوں نے ایک بڑی سی کتاب ہی لکھ ڈالی ہے۔"

"خان! ذرا دیکھوں تمہارا ہاتھ"۔ شاعر کی زبان سے یہ بات سُن کر خان عبدالغفار خاں کے لڑکے نے اپنا ہاتھ اُن کی طرف بڑھا دیا۔

۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے جب یہ نوجوان پٹھان شانتی نکیتن میں نندلال بوس سے مصوّری کی تعلیم پانے آیا تھا۔ بڑے غور سے شاعر اِس نوجوان کا ہاتھ دیکھا کئے اور بولے "پر یہ ہاتھ برش اُٹھانے کیلئے تو نہیں بنے' خان !" نوجوان پٹھان بولا "جناب ! ایسی تصویر بناؤں گا جسے دیکھ کر ہر پٹھان بچہ اپنی بندوق سنبھال لےگا!" اور شاعر نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

شاعر کی زندگی کی یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے زیادہ رس دے جاتی تھیں۔ فنّی لحاظ سے شاعر کا ذوقِ ظرافت بہت بلند واقع ہُوا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ ظرافت کے بغیر زندگی کی تصویر ادھوری رہتی ہے۔ ہنسی کی لہریں تو زندگی کی جھیل میں اُٹھنی ہی چاہئیں۔ کوئی غم انہیں ہمیشہ کے لئے نڈھال کیوں کر دے ؛ لطیف ظرافت ہنسی کی لہروں کو اُبھارتی رہتی ہے۔ مبارک ہے وُہ شخصیت جسے انسانی کردار کا یہ جوہر نصیب ہُوا ہو۔

۱۹۳۶ء کا ذکر ہے۔ شاعر لاہور آئے تھے۔ ایک بنگالن اُن کے لئے اپنے صوبے کے ایک پکوان کی پلیٹ لے کر آئی۔ شاعر پکوان سے اُٹھتی ہوئی خوشبو کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس کی تعریف میں اُنھوں نے کچھ کہا بھی۔ وہ عورت بولی "مہاراج ! اب کچھ مُنہ میں ڈالئے" شاعر نے جھٹ جواب دیا "یہ تعریف تبھی تک ہے جب تک مَیں اسے کھا نہیں لیتا ــــ" وہ عورت ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ وُہ سمجھ گئی کہ جب شاعر یہ پکوان کھالیں گے۔ اُن کی طبیعت اتنی محظوظ ہو جائے گی کہ پھر اِس بارے میں مُنہ سے کچھ بھی کہنا بیکار ہوگا۔

اُس جواہر ریزے کی طرح جس کے ہر کونے سے ایک دلکش کرن پھوٹ پڑے، ظرافت کی جھلکیاں زندگی کے خام مواد میں بھی ایک نئی روح بیدار کر دیتی ہیں۔ مگر ہر زندہ ظرافت جدّت مانگتی ہے، جدّت ہی نہیں، ایک تخلیقی توانائی بھی۔ ٹیگور جو خود تخلیقی توانائی کا مجسمہ نظر آتے تھے، ظرافت میں جدّت پسندی کے پورے پورے قائل تھے۔

پچھلی بار جب مَیں نے شاعر کے جنم دِن کی خوشی میں جگن ناتھ پوری کے گورمنٹ ہاؤس میں اُن کی ایک تصویر اُنہیں پیش کی تو وہ اِسے دیکھتے ہی بول اُٹھے "یہ کیا کر ڈالا؟ مَیں تو یہاں کوئی ہٹلر یا مسولینی نظر آتا ہوں" یہ بات اُنھوں نے اپنی رُعب دار آنکھوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہی تھی۔ اِس تصویر کی ایک کہانی ہے :۔

اِسی واقعہ سے چند ماہ پیشتر کا ذکر ہے کہ خود اپنے کیمرے سے میں نے یہ تصویر تیار کی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ ایک دن میں شانتی نکیتن میں شاعر کو اپنے لئے ہوئے فوٹو دکھا رہا تھا۔ اُنہیں ایک سنتھال دوشیزہ کی تصویر بہت پسند آئی۔ میں نے کہا کہ وہ چاہیں تو یہ تصویر اپنے پاس رکھ لیں۔ اُن کے خیال کے مطابق یہ لڑکی دھرتی کی بیٹی تھی کیونکہ اُس نے اپنی باحیا آنکھیں دھرتی کی طرف جُھکا رکھی تھیں اور یوں نظر آتا تھا کہ اُس کی لالہ کھیتوں کی لاج تھی جو دھان کی طرح اُگ آئی تھی . . . . . . پھر مَیں نے اگلی صبح اُن کا ایک فوٹو لینے کی اجازت مانگی تو وہ بولے۔

"اپنا کیمرہ لیتے آنا پر مجھے کمرے سے باہر نکلنے کے لئے نہ کہنا۔ یہیں اپنا کام کر لینا۔"

مَیں نے یہ شرط مان لی۔ مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ شاعر کے ایک انگریز دوست اُن سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ اُن سے میرا تعارف کراتے ہوئے شاعر نے میری شوقیہ فوٹو گرافی کا ذکر چھیڑ دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے :۔

"ایک فوٹو اِن کا بھی لینا"۔

میں نے خوش ہو کر کہا: "اِس سے نہ چُوکوں گا میں"۔

پھر میں نے شاعر کے دوست سے کہا "میں تو بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ آپ کا فوٹو شاعر کے ساتھ لیا جائے"۔

اُن کے دوست نے جھٹ ہاں میں سر ہلا دیا۔ خود شاعر نے چپ سادھ لی۔ میں نے بات بڑھائی "لیکن میں چاہتا ہوں فوٹو باہر دھوپ میں لیا جائے، کاٹھ چمپا کے پیڑ کے قریب"۔

اتنے میں ہم نے دیکھا کہ نوکر باہر کرسیاں لگا رہے ہیں۔ شاعر نے گھوم کر اُدھر دیکھا اور کہا۔

"معلوم ہوتا ہے ستیارتھی نے سازش کر رکھی ہے مجھے باہر لے جانے کے لئے"۔

اَور پھر لطیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے "لیکن باہر فوٹو لیا جائے گا ضرور۔۔۔۔۔۔"

کاٹھ چمپا کے قریب کھینچی ہوئی اِسی تصویر کے ایک حصّے کو انیلارج کر کے شاعر کی وہ بڑی تصویر تیار کی گئی تھی۔

پروفیسر ہمایوں کبیر نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

"ابھی وُہ وقت نہیں آیا جب ہم ٹیگور کی فطانت اَور اُس کے کاموں کی ستائش کر سکیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ ہم جس بنگال میں رہتے ہیں وہ ٹیگور کا تعمیر کردہ بنگال ہے۔ بنگال جو سوچتا ہے، جس زبان میں سوچتا ہے اَور جن خیالات کو پیش کرتا ہے وُہ سب کے سب ٹیگور کے عطا کردہ ہیں۔ ہماری سرزمین دریاؤں کی سرزمین ہے جسے صدیوں سے دو بڑے دریا سیراب کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک لحاظ سے ٹیگور بھی بہت بڑا دریا تھا۔ جس نے بنگال کی ذہنی اَور تمدنی سرزمین کو سیراب کیا۔ کسی فردِ واحد کو یہ افتخار کم نصیب ہوتا ہے کہ وہ ایک صوبے کی زبان کو جہاں گیر زبان کا رُتبہ بخش دے۔ میرے خیال میں ڈینٹے سے زیادہ ٹیگور کو اس مسئلہ میں کامیابی ہوئی۔ ٹیگور کو اُن مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا جو ڈینٹے کو درپیش نہیں تھے۔ لیکن اِس کے باوجود ٹیگور نے بنگالی زبان اور بنگالی ادب کو اِس کی موجودہ شکل و صورت دی۔۔۔۔ آج اِس بات کی طرف اِشارہ کیا جاتا ہے کہ اُس کا تعلق اشرافیہ سے تھا لیکن وُہ اشرافیہ کا گرویدہ نہیں تھا۔ اِس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے۔ اُس کے لئے مقام اَور پیدائش اتفاقی حوادث تھے۔ اُس کا اشرافیہ سے تعلق رکھنا ایک لحاظ سے خوش قسمتی تھی۔ کیونکہ اِس طرح اُس کے لئے وسطی اور قدیم ہندوستان کی تمدنی روایات کو اپنے اندر جذب کر لینا آسان ہو گیا تھا۔ جس زمانے میں ٹیگور پیدا ہوا تھا اُس زمانے میں دوسرے طبقات کے لوگوں کے لئے ایسا کرنا مشکل تھا۔ ٹیگور ایسے زمانے میں پیدا ہوا تھا جب ہندوستان پر بحرانی کیفیت طاری تھی اور نئے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ یورپی تہذیب اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ اِس زمانے میں ہر وہ شور و غل موجود تھا جس کا تعلق انقلابی تغیر سے ہوتا ہے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہندوستانی زندگی دو غیر متعلق اجزا میں بٹ رہی تھی۔ اَور یہ دو اجزا اکثر متصادم ہوتے رہتے تھے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جنہوں

نے مغرب کی شے کو قبول کر لیا تھا...... دوسری طرف وہ لوگ تھے جن کا مغرب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ٹیگور کے خاندان نے مغرب کے چیلنج کو قبول کیا اور بلا خوف و خطر ہندوستانی زندگی کے لئے بعض یورپی اقدار تسلیم کر لیں۔ حالات کے اِس اتحاد نے ٹیگور کی ذہنی کاوشوں کے لئے راہ نکالی....."

مگر شروع سے بنگال میں ایک ایسا حلقہ موجود رہا ہے جو ٹیگور کے کارناموں کو مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اِس حلقے میں ایسے لوگ بھی نظر آجاتے تھے جن کی تعلیم مغربی طرز پر ہوئی تھی۔ بہت کم اختلافاتِ رائے ایمانداری پر مبنی ہوتے ہیں۔ رقیب کے زُمرے میں شامل ہو کر پھر دوستی کا دم بھرنا کٹھن ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اندرونی طور پر کسی کے مدّاح بن جانے پر بھی اِس بات کا اقرار کرنے سے ہم بچتے رہتے ہیں۔ مسٹر مجومدار کی بات مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ وہ ایم۔ اے پاس کر چکے تھے۔ ایک بار اُن کی خواب گاہ میں ٹیگور کا فوٹو دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہوئی۔ "ٹیگور نے بُری طرح پُرانے کلاسیکل ہندوستانی سنگیت کا ناک منہ توڑ ڈالا ہے!" اپنا یہ خیال وہ اکثر دُہرایا کرتے تھے۔ پھر جب اُس فوٹو کا راز کھل گیا تو وہ جھینپ کر بولے "ٹیگور کی یہ تصویر پہلے میرے ڈرائینگ روم میں ہوتی تھی۔ چلتی چلتی یہ یہاں خواب گاہ کے اُس کونے میں آ پہنچی ہے۔ جلد ہی میں اسے یہاں سے بھی اُتار دوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا "مسٹر مجومدار! دیوار سے آپ شاعر کی تصویر اُتار سکتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی تصویر آپ کے دل میں بھی لٹک رہی اور اُسے آپ خود بھی نہ اُتار سکیں گے۔"

یہ نہیں کہ ٹیگور نے پُرانے ہندوستانی سنگیت کی مشق نہ کی تھی۔ لیکن اپنے گیتوں میں اُنہوں نے ایک نئے سنگیت کو جنم دیا۔ مشرقی اور مغربی تانوں کا یہ ملاپ ہندوستانی سنگیت کی تاریخ میں ایک ترقی پسند باب کھول چکا ہے۔ ٹیگور کے خود ساختہ وزن، جو اُن کی نظموں کا خاصہ تھے، قدیم وضع کے حامیوں کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتے ہیں۔ اُن کے گیتوں کی اجنبی چال ڈھال بھی پُرانے لوگوں کو کھٹکتی رہی۔

شاعر نے ایک بار بتایا تھا کہ جب کبھی کوئی نیا گیت جنم لینے لگتا ہے وہ جھٹ اپنے بھتیجے دینیندر ناتھ[1] ٹیگور کو بلا بھیجتے ہیں اور وہ اپنے علمِ موسیقی پر اتنی دسترس رکھتے ہیں کہ خواہ یہ گیت جانے پہچانے راستے پر چلتا ہو خواہ نئے اجنبی راستے پر، وہ اسے سُن کر جھٹ "سُرلپی" میں باندھ لیتے ہیں۔ کئی بار تو یوں بھی ہُوا کہ آدھی رات کے وقت شاعر کی آنکھ کھل گئی، کوئی تاثر پیدا ہوا، کوئی نیا سُر جاگ اُٹھا اور گیت باہر آنے لگا۔ اِس وقت دینیندر ناتھ کو بلا بھیجنا ضروری ہو جاتا تھا۔ کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ گیتوں کے نئے سُر بہت چھل جاتے ہیں اور ایک بار ہاتھ سے نکل جانے پر اُن کا قابو میں آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شاعر کے نئے گیتوں کا استقبال کرنے کے لئے — یہ گیت دِن کو پیدا ہوں چاہے رات کو، دینیندر ناتھ سدا تیار رہتے تھے۔

راما نند چیٹرجی، ایڈیٹر "موڈرن ریویو" نے لکھا ہے کہ ٹیگور کے گیت کل ملا کر دو ہزار سے بھی اوپر پہنچ جاتے ہیں[2]۔

---

[1] آپ شانتی نکیتن میں سنگیت بھون کے پرنسپل تھے۔ چند سال پیشتر آپ اِس دنیا سے کوچ کر گئے۔

[2] "انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا" (گیارھوں ایڈیشن) کے ایڈیٹر نے شوبرٹ کو دنیا کو سب سے بڑا کلاونت مانا ہے حالانکہ اُس کے گیت چھ سو سے زیادہ نہیں ہیں۔

شاعری اور موسیقی کے علاوہ ناٹک اور رقص کے میدان میں بھی شاعر کی تخلیقی قوت آگے بڑھتی رہی تھی۔ "چترانگدا" اُن کا کامیاب اور اہم ناٹک ہے۔ اپنے ناٹکوں کی کارگزاری میں وُہ خود بھی کسی نہ کسی کردار کا روپ دھار کر سٹیج پر آجاتے تھے۔ اپنے ناٹکوں میں شاعر نے کتنے ہی خود ساختہ رقص پیش کئے ہیں۔ اِدھر بڑھاپے میں وُہ شانتی نکیتن کے طالب علموں کو رقص کی نئی تحلیق میں جسمانی مدد دینے سے معذور ہو گئے تھے تاہم اُن کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ کسی ناچنے والی کو ہاتھ یا آنکھ کے کسی اشارے سے یا کوئی کہانی سی سناتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ وُہ کسی نئے رقص کی راہ دکھا دیتے تھے۔

کسی تماشائی نے ٹیگور سکول کا رقص دیکھ کر اپنے تاثرات یوں بیان کئے ہیں۔

"۱۹۳۶ء اپنی تین چوتھائی زندگی ختم کر چکا تھا۔ اِس وقت رابندر ناتھ ٹیگور اپنی ڈراما پارٹی لے کر کلکتہ آئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے پروفیسر، اخباروں کے ایڈیٹر، مصنّفین، فلم کمپنیوں کے مشہور سے مشہور ایکٹر اور ایکٹرسیں، سیاسی اور سماجی انجمنوں کے اراکین سب اپنی اپنی شان کے ساتھ جمع تھے اور پردے کی طرف اِس طرح تک رہے تھے گویا ہر ایک کی روح اُس کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔"

"گھنٹی بجی۔ پردہ اُٹھا۔ سامنے ایک دیوار سی تھی جس کے آگے چھ نوجوان لڑکے اور دوسری طرف چھ نوجوان لڑکیاں ستار لئے بیٹھی تھیں۔ دونوں طرف کے چہرے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ بیچ میں ایک لڑکی تھی جس کا رنگ گرمیوں کی شام کی طرح سانولا تھا اِس پس منظر میں سٹیج کے سامنے ایک کورچ پر ایشیا کا عظیم الشان شاعر، جس کی روح کائنات کے ذرّے ذرّے سے ہم کلام تھی، زرد ریشمی لباس پہنے بیٹھا تھا۔ موسیقی کے باریک تار کی طرح لہرائی ہوئی ایک لہر شاعر کے سر کے بالوں، چہرے کی جھرّیوں، ڈاڑھی کی جھالر اور ریشمی عبا کی شکنوں میں ہوتی ہوئی پاؤں تک آ پہنچی تھی۔

"ڈھولک بولی، گڑ گڑ تار۔ ستار بولے، دردردا، دردردا، سانولی لڑکی نے ہلکی سی سانس لی۔ معلوم ہُوا جل پری نے کسی آبشار کے پاس سسکی بھری۔

"شاعر کے منہ سے حمد کے بول پھوٹے۔ جوان آواز، بڑھاپے کے تقدس اور سنجیدگی کی لے جو اُٹھی تو فوراً پس منظر کے گنگا جمنی روپ میں لپٹ کر فضا میں تیرنے لگی۔ یہ آواز جس اُتار چڑھاؤ پر چل رہی تھی اُس میں نہ کوئی گت تھی اور نہ اُس پر کوئی ساز بج سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی وُہ موسیقی تھی۔

"ایک طرف سے نیلے، زرد، سُرخ اور سنہرے رنگ کو اُڑاتی ہوئی ایک حسین لڑکی ناچتی نکل آئی۔ چند سیکنڈ گزرے تھے کہ معلوم ہُوا کہ وُہ ناچ نہیں رہی ہے بلکہ شاعر کے نغمے نے انسانی روپ دھارن کر لیا ہے۔

شاعر حمد گاتا رہا۔ لڑکی ناچتی رہی۔ سانولی کوئل سانسیں بھرتی رہی۔ حسین ستاریئے ستار چھیڑتے رہے۔ کہنے کو تو یہ اتنی چیزیں تھیں مگر حقیقت صرف ایک تھی ـــ ٹیگور۔"[1]

---

[1] "ہندوستان" ہفتہ وار (لکھنؤ) ۷ راگست ۱۹۴۱ء

یک فیتے کی مانند ہے جسے کسی کنواری لڑکی نے کاڑھا ہو۔ پہلے زمانے میں اِس قسم کی لڑکیاں موجود تھیں۔ وُہ اپنی زندگی، سین خواب کسی رنگین نقش کی صورت میں فیتے پر کاڑھ دیتی تھیں۔"

لور کی اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ یہ بات ٹالسٹائی نے اُس وقت کہی تھی جب وُہ چیخوف کے ایک افسانہ "دوشیشکا" کا ذکر کر رہا تھا یہ بات ٹیگور کے کرداروں پر بھی صادق آتی ہے۔ ایک بار میں نے شاعر کو بتایا تھا کہ اُن کا کوئی ناول پڑھنے سے بہت پہلے گیتانجلی کا اردو ترجمہ لگ گیا تھا مگر اُن کی طرف میری کشش اُن کا افسانہ "کابلی والا" پڑھنے کے بعد شروع ہوئی۔

وں نے پوچھا "کابلی والا بھی اُردو میں پڑھا تھا؟"

یں۔ انگریزی میں۔"

تانجلی کا اُردو ترجمہ — ترجمے کا ترجمہ — کافی خُشک ہو گیا ہوگا۔ شاعری ترجمے کی چوٹ نہیں سہ سکتی، نثر سہ جاتی ہے۔"

ے افسانوں میں آپ کو کونسا بہت پسند ہے، گورودیو؟"

ٹھن سوال ہے . . . . 'ہارجیت' مجھے کافی اچھا لگتا ہے۔ یہ میرے فلسفے کا نچوڑ ہے۔ زندگی کے امن و سکون میں اُداس سُر بج . . . . خوشی کتنی بھی کیوں نہ ہو، یہ اُداس سُر تو بجیں گے ہی۔"

جیت" ہے تو افسانہ مگر اس میں نظم کی خوبی بھی بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے ہی کسی افسانے کو پڑھ کر ایک نقاد نے رائے دی تھی کہ 'معیاری افسانہ ا ہے جو اُس اشرفی کا ہم پلہ ہو جو سانچے کی ایک ہی داب میں تیار ہو جاتی ہے۔ اِس کی ٹکسال کبھی کھوٹی نہیں ہوتی کیونکہ اس کی تیاری ھات استعمال کی جاتی ہے'۔ امرپور کے راجہ اُدے نارائن کا درباری شاعر شیکھر، جس نے راجکماری اپراجیتا کو کبھی دیکھا نہیں، دربار ں نظم پڑھتا ہُوا اپنی آواز بلند کر لیتا ہے تاکہ پرے رنواس میں بیٹھی اپراجیتا بھی اُس کے تاثرات سمجھ لے۔ وُہ راجکماری کے سندر ے سپنے دیکھنے لگتا ہے جن پر پہنی ہوئی پازیب ہر قدم پر کوئی راگ الاپتی رہتی ہے۔ اِسی پازیب کے تال پر وُہ اپنی نظم سنایا کرتا یک دن باہر سے کوئی شاعر شیکھر کا مقابلہ کرنے کے لئے آنکلتا ہے۔ بھری سبھا میں دونوں شاعر راجہ کے سامنے اپنا اپنا کلام ں شیکھر کے سادہ شعر پنڈارک کے چٹپٹے کلام کے روبرو پھیکے پڑ جاتے ہیں اور وہ ہار مان کر اپنے گھر کی راہ لیتا ہے۔ اپنی نظموں ے مسودے آگ کی نذر کر دیتا ہے اور شہد میں کسی پیڑ کا زہریلا رس ملا کر کھا لیتا ہے اور پھر راجکماری اپراجیتا آ پہنچتی ہے۔ وُہ کہ ہار پنڈارک کی ہوئی ہے نہ کہ راج کوی شیکھر کی۔ مگر راجکماری کے یہ الفاظ شیکھر کی موت کو نہیں روک سکتے۔

زندگی کی تلخ حقیقت شاید یہی ہو کہ اپراجیتا کبھی شاعر کے روبرو نہ ہوئی مگر ٹیگور نے اپنے خاص اختیار سے افسانے کو ایک ایسے مقام ہے جو اپنی ذاتی اہمیت کی اونچی سطح پر واقع ہے۔

فن کے ماتحت ہونے کی بجائے ٹیگور نے حقیقتاً فن کو اپنے ماتحت کر لیا تھا۔ بہت سے افسانوں میں بنگالی دیہات کی منہ بولتی تصویریں دھرتی کے بیٹوں کے داعیہ کو شاعر نے اپنا بنا لیا تھا۔ بار بار انہوں نے دھرتی کو بالکل قریب سے دیکھ کر تخلیقی توانائی حاصل کی تھی۔ اتا کی پکار انہوں نے کبھی ان سنی نہ رہنے دی تھی۔ قدرت کی کھلی گود میں سانس لینا اُن کا نصب العین بنا رہا۔

ٹیگور کے افسانوں میں رنگا رنگ کے جذبات سموئے پڑے ہیں "ماشی" ایک بے نظیر چیز ہے۔ اس میں کہیں قدرت آدمی پر چھائی نظر آتی ہے، کہیں آدمی قدرت پر "ایک ٹھاراجہ" جو ایک پرانے دیہاتی افسانے کے گرد گھومتا ہے، کبھی پرانا ہونے کا نہیں "کابلی والا" پدرانہ شفقت کا علمبردار ہے "پوسٹ ماسٹر" پڑھ لینے کے بعد یہ سوال اُٹھتا رہتا ہے کہ رتن ـــــ وہ یتیم کنواری ـ کب تک اپنے دلدا کا انتظار کرتی رہے گی؟ "ڈاک خانے کے قریب بیٹھی وُہ کب تک یوں روتی رہے گی؟" "سُبھا" کا غمناک ماحول بھی بھولنے کی چیز نہیں۔ بنگال کی یہ گونگی لڑکی قدرت سے کہیں زیادہ سماج کے ظلم کا شکار بنی ہوئی اپنی سسرال میں بیٹھی رو رہی ہے۔ کوئی اس کا ہمدرد نہیں۔

جیسا کہ منصور احمد مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا "ٹیگور کا سب سے بڑا کارنامہ نہ اُس کے نغمے ہیں نہ ڈرامے بلکہ مختصر افسانے ہیں یہ افسانے سنگین و سخت حقیقت پر مبنی نہیں۔ بلکہ اُن میں انسانی زندگی کی حقیقتیں رومان کے ساتھ ہم آہنگ کر دی گئی ہیں اور جہاں ٹیگور نے حد درجے کی رمیدگی بھی دکھائی ہے وہاں بھی فطرت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹیگور ایک جادوگر ہے جو اپنے سحر کار قلم کی جنبش سے ہر غیر ذی روح چیز کو زندہ کر دیتا ہے۔ خاموش فضا اُس کے اِشاروں پر ایک ساز کے تاروں کی طرح اہتزاز کرنے لگتی ہے بسنسان اور ویران کھنڈر صدیوں کے افسانے سنانے لگتے ہیں اور اُن کے ذرّے ذرّے میں ایک دل دھڑکتا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔"

پروفیسر ہمایوں کبیر نے ٹھیک ہی لکھا ہے "گذشتہ چند سال میں ٹیگور کے ذہن میں ادب کے متعلق نئے نئے تصورات پیدا ہو رہے تھے" خود شاعر کے اُس بیان سے بھی، جو انہوں نے ترقی پسند مصنّفین کے نام دیا تھا، یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے ـــ "میں نے غلطی کی جو اپنے ادب کے لئے زندگی سے ہٹ کر میدان ڈھونڈا۔ زندگی اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اِن دونوں کو الگ نہ ہونا چاہئے ادب کے نئے زاوئے زندگی کی بہت بڑی ضرورت ہیں، اِس خیال نے اُن سے خراجِ تحسین پا لیا تھا۔

شاعر کی عمر ستّر برس کی تھی جب اُن کی گوناگوں تخلیقی قوتوں نے مصوّری کا رُخ کیا۔ ۱۹۳۰ء میں، جب وُہ اپنے گیارھویں سفرِ یورپ کے دوران میں روس گئے تھے، اُن کی تصویریں ماسکو کی نمائش میں رکھی گئی تھیں۔ اِس کے علاوہ برلن، پیرس اور نیویارک کی نمائشوں میں بھی شاعر کے مدّاحوں نے اُن کی نئی قابلیت کو شوق سے دیکھا۔ کسی نے اِن تصویروں کو شعر اور نقش کا امتزاج بتایا تو کسی نے انہیں "بے معنی چیزیں" قرار دینے کے باوجود اِن کی ذاتی اہمیت کو قبول کیا۔ جس شخص نے کبھی یہ لکھا تھا "او شرمیلے خیال! مجھ سے ڈر مت میں شاعر ہوں" وہی اپنے خیالات کے رنگ اور روپ سے بھی ہمارا تعارف کرانے لگا۔ کسی کسی تصویر میں یہ روپ بہت بھیانک ہوا جاتا ہے اور کہیں کہیں اسے عظیم نطانت کی طفلانہ بے دقعتی کہنے کو جی چاہتا ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ بھانڈپن کی ترجمانی کہا جا سکتا ہے۔ یہ مصوّری اپنی قسم آپ ہے۔ مشرق اور مغرب دونوں کی رسوم میں بندھی ہوئی مصوّری سے پرے کی چیز۔

ایک بار شاعر نے کہا تھا "میں کہاں کا مصوّر ہوں؟ یوں ہی اپنا شوق پورا کر لیتا ہوں۔"

میں نے سوچا کہ کِس طرح ۱۴ نومبر ۱۹۱۳ء سے پہلے جب شاعر کو گیتا نجلی پر نوبل پرائز ملنے کی خبر آئی تھی، باقی ہندوستا

الگ رہا خود بنگال میں بھی کسی نے انہیں شاعرِ اعظم کے روپ میں نہ پہچانا تھا۔ مصوّر کے روپ میں بھی ہمارا دیس انہیں تبھی مانے گا جب کوئی بدیسی اعزاز انہیں مل جائے گا۔ یہ ہماری غلامی کا نتیجہ ہے۔ ہم خود فیصلہ کرنے کی قوت کھو بیٹھے ہیں۔

ایک دن میں صبح صبح اُن کے پاس گیا تو وہ اپنی ایک تصویر کو تکمیلی آب ورنگ دے رہے تھے۔ میں بڑے دھیان سے تصویر دیکھنے لگا۔ وُہ بولے "کچھ پتہ چلا، یہ کیا تصویر ہے؟" میں کچھ جواب نہ دے پایا تھا کہ وُہ پھر بولے" میں پہلے ہی جانتا تھا میں کوئی مصوّر نہیں یہ تو یوں ہی کھیل سا ہے۔"

اُس دن کا انتظار کرتا ہُوا جب یہ تصویریں اپنے پورے مفہوم اور مقصد کے ساتھ میرے روبرو اُجاگر ہو جائیں گی، میں لوٹ آیا۔

ایک دن کچھ لوگ کلا بھون میں تصویریں دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے نندلال بوس سے سوال جواب کرنا شروع کر دیا۔ وُہ نئی ہندوستانی مصوّری کے کارناموں کے احترام کو تیار تھے پر وُہ اِسے ٹھیک ٹھیک سمجھ نہ سکتے تھے۔ ابھی نندلال بوس اپنی بات سمجھا ہی رہے تھے کہ جاتریوں میں سے ایک صاحب نے شاعر کی بنائی ہوئی ایک تصویر کی طرف اُنگلی سے اشارہ کر کے کہا "اور نہیں تو اس تصویر کے متعلق ہی کچھ سمجھا دیجئے" اِس کے جواب میں نندلال بوس نے کہا کہ یہ بات تو خود شاعر سے پوچھی جا سکتی ہے مگر اُس جاتری نے ضد کی "کم سے کم اِس تصویر کا عنوان ہی بتا دیجئے۔"

"مجھے اِس کا عنوان معلوم نہیں" نندلال بوس نے مسکرا کر کہا "عنوان کے بارے میں کچھ جانتا ہوتا تو سب کچھ بتا دیتا۔"

ٹیگور کو دیکھ کر عام طور پر ایسا احساس ہوتا تھا جیسے برف پوش ہمالہ پربت کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اُن کے سفید بالوں کا جائزہ لیتے ہوئے میرے جسم کا ہر ذرہ بیدار ہو جاتا تھا اور پھر جب آنکھیں آنکھوں کی طرف یا ہونٹوں کے کونوں کی طرف مُڑ جاتیں جہاں کوئی کہانی سی سناتی ہوئی مسکراہٹ لہلہانے لگتی تھی، تو ایسا احساس ہوتا تھا کہ ایک اچوک آشیرباد نصیب ہو رہا ہے —— ایک انمول آشیرباد۔ پہاڑوں پر سورج کے چڑھنے اور ڈوبنے کا نظارہ کتنا پرسکون ہوتا ہے، جب اندر سے یہی آواز آتی ہے کہ اب ہماری آزادی میں کوئی بگھن نہیں پڑ سکتا، کیونکہ دنیا بہت وسیع ہے۔ ٹیگور کی آنکھیں جو سورج کی پہلی اور آخری کرنوں سے ہمکنار ہونے کے لئے سدا للچائی رہتی تھیں، یہ پیغام دیتی نظر آتی تھیں —— زندگی تو بہت وسیع ہے، پریم بھی اور سُندرتا بھی۔ مگر اِن کا آنند تبھی ملتا ہے جب آدمی آزاد ہو جاتا ہے۔

ایک دن میں نے ہنستے ہنستے کہا "میں تو ایک طرح سے مزدور ادیب ہوں، گورو دیو!"

"تو کیا بُرا ہے؟" وُہ بولے "بلکہ حق تو یہ ہے کہ آئندہ مزدور ادیب ہی دیس کی رہنمائی کیا کریں گے۔ دھرتی کی جیتی جاگتی شاعری، جس کی تلاش میں تمہیں گاؤں گاؤں گھروں اور کھیتوں میں جانا پڑتا ہے، ہماری بیش بہا دولت ہے۔ ایک وقت تھا کہ

خود میں نے بھی بنگال کے کچھ پرانے زبان زدِ عام گیت جمع کئے تھے۔ زندگی اور ادب کی آبیاری میں یہ گیت بہت مدد دیں گے۔ یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے تو بیچ ہی میں نہ چھوڑ دینا۔"

"اسے ہاتھ میں نہ لیا ہوتا تو شانتی نکیتن میں جم کر رہ پاتا۔"

"پریم اور سُندرتا کے میل سے تو آدمی جہاں چاہے نئے شانتی نکیتن کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔"

"اس وقت مجھے وہ واقعہ یاد آیا جب (جیسا کہ میں نے شاعر کے ایک دوست سے سنا تھا) یورپ میں کسی نے شاعر سے پوچھا تھا کہ کیا ہندوستان میں کوئی اور بڑا شاعر بھی ہے تو شاعر نے جواب دیا تھا "بڑا شاعر تو خود میں بھی نہیں ہوں، ہاں شاعروں کا ہمارے دیس میں کوئی کال نہیں ہے . . . . . چرخہ کاتتی ہوئی عورتیں بھی کچھ نہ کچھ گاتی رہتی ہیں۔ کسانوں کے گیت الگ ہیں۔ ہمارے ملاحوں کے اُداس بھٹیالی گیت اور باؤل بیراگیوں کے صوفیانہ گیت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ اِن سب گیتوں میں ہماری شاعری کا زندہ لہو بہتا رہتا ہے۔"

اور وہ واقعہ مجھے کبھی نہ بھولے گا جب میں نے شاعر کو بتایا تھا کہ میں نے اپنی بیٹی کا نام کویتا رکھا ہے۔ انہوں نے ہنس کر کہا تھا "کوی[1] ہونے سے کویتا[2] کا باپ ہونا کچھ کم تو نہیں ہے!" میں نے جھینپ کر جواب دیا تھا "اب اِس جنم میں تو کوی بننے سے رہا" فوراً ہی اُنہوں نے میری بات کاٹ دی تھی "کویتا خود اپنے باپ کو کوی بنا دے گی ایک دن۔"

ٹیگور کی روح کیمرے کی بے صدا اثر پذیر فلم کی طرح تھی۔ آج سے بائیس برس پہلے جب امرتسر میں مارشل لا کی حکومت نے ظلم ڈھایا تھا تو اِس پر جلیانوالہ کے مظلوموں کا ہو بہو فوٹو کھنچ گیا تھا اور اُنہوں نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے ۳۰ مئی ۱۹۱۹ء کے دن وائسرائے ہند کے نام ایک خط لکھ کر اپنا سر کا خطاب واپس کر دیا تھا۔ ابھی ابھی جب برٹش پارلیمنٹ کی ایک ممبر مس راتھبون نے آزادی پسند ہندوستانیوں پر غداری کا الزام لگایا تو ہندوستان کے اِس بوڑھے شاعر نے بسترِ مرگ سے وہ جواب دیا جو رہتی دنیا تک ہمارے دیس کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔ اِسے پڑھ کر یقیناً مس راتھبون کو اپنا بیان ایسے "فٹ پاتھ" کے روپ میں نظر آنے لگا ہوگا جس کی بجری اکھڑ گئی ہو۔

ٹیگور صرف ایک عظیم فن کار ہی نہ تھے۔ اُن کی شخصیت آزاد ہندوستان کی ایک بڑی دلیل بن گئی تھی جیسا کہ وِل ڈیورنٹ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "ہندوستان میں تمہاری ہستی ہی اُس کے حقِ آزادی کی دلیل ہے۔" اُن کی موت غریب ہندوستان کے لئے بہت بڑا صدمہ ہے۔

---

[1] شاعر

[2] شاعری

مہاتما گاندھی نے اپنے بیان میں کہا ہے:

"ٹیگور کے انتقال نے اِس دور کے سب سے بڑے شاعر ہی سے نہیں بلکہ ایک سچے دیس بھگت اور انسانیت پرست شخص سے بھی ہمیں محروم کر دیا ہے مفادِ عامہ کا کوئی ایسا کام بمشکل نکلے گا جس پر اُن کی زبردست شخصیت کا نقش نہ ثبت ہو چکا ہو۔ انہوں نے شانتی نکیتن اَور شری نکیتن کو قوم کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے ترکے میں چھوڑا ہے۔ ایشور اُن کی پوتر آتما کو شانتی دے اَور شانتی نکیتن کے منتظمین کو صلاحیّت دے کہ وُہ اِس ذمّہ داری کے اہل ثابت ہوں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈیرہ دون جیل سے یہ تار بھیجا ہے:

"گورودیو کے انتقال نے ہم سب کو جنہوں نے اُن کی عالی شان ذہانت اور زبردست شخصیت کے سائے میں پرورش پائی ہے اور ان کی اعلیٰ تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے رہے ہیں، تنہائی اور تاریکی میں ڈال دیا ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا ستارہ جو صرف ہمارے ہی ملک کو نہیں بلکہ سارے عالم کو ماضی اور حال کے بیش بہا علوم کے نور سے روشن کر رہا تھا غروب ہو گیا ہے اَور ہمارے دل خالی ہو گئے ہیں تاہم اُن کی آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے اور اُن کے تازہ فرمودات کی روشنی ہماری رہنمائی کرے گی۔ ہندوستان کے پُرانے رشیوں کی طرح اُنہوں نے ہمارے لئے ایک لازوال ترکہ چھوڑا ہے۔ اَور اُن کے انتقال کے موقع پر بھی ہم فخر، تشکر، محبّت اَور احترام کے ساتھ اِس عالی شان زندگی اَور اُس کے عظیم الشان کارناموں کو دیکھتے ہیں۔ اِس بیش بہا ترکہ کو ہم محفوظ رکھیں گے۔ اَور مجھے پورا بھروسا ہے کہ ہر ہندوستانی شانتی نکیتن اور وشو بھارتی کی ترقی کے لئے جو گورودیو کے بلند مطمحِ نظر کی نشانیاں ہیں، مدد دینا اپنا فرضِ منصبی سمجھے گا۔"

مسز سروجنی نائیڈو نے لکھا ہے:

"اپنی فطانت، اپنے حُسن، اپنی حکمت، لطیف ظرافت اور اپنی خوش خلق شخصیت کی دلکشی اور ناموری کے لحاظ سے وُہ اپنی زندگی میں رومان کی ایک یکتا اَور دلربا مورت تھا۔ اب جبکہ وہ چل بسا ہے وہ ایک بلند پایہ مشہورِ عام داستان بن جائے گا —— ہمیشہ کے لئے پریوں کی کہانی۔ مگر اُس کے گیت نسل در نسل بہار کے پہلے پھولوں کی طرح تازہ اور چاندنی رات کی ندی کے سنگیت کی طرح جادو بھرے رہیں گے۔ ایک ممتاز باغبان چل بسا مگر حُسن کی شاعری جسے اُس نے بویا تھا، ابد تک کھلتی رہے گی۔"

شاعر کی وُہ تصویر جس کی کاپی مَیں نے جگن ناتھ پوری میں اُن کی نذر کی تھی میرے سامنے پڑی ہے۔ پھولوں سے لدی کاٹھ چمپا کی ٹہنیوں نے اُن کے سر کے گرد ہالہ سا بنا رکھا ہے۔ اُن کے بال بدستور ہمالہ کی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ پیش کر رہے ہیں...... تصویر کی طرف دیکھتے دیکھتے میرے ذہن میں ان گنت چھوٹی چھوٹی چیزیں جن کو اُن کا مقدس لمس نصیب ہوتا رہا تھا، جاگ رہی ہیں۔

".... سب کہتے ہیں، جانے نہیں دیں گے، جانے نہیں دیں گے۔ پھر بھی جانے دینا پڑتا ہے۔ پھر بھی لوگ چل دیتے ہیں!"

—— آخر شاعر بھی چل دیا!

دیوندر ستیارتھی

لاہور:
۱۳ / اگست ۱۹۴۱ء

صدائے آوارہ

دُور تک رات کا افسردہ فسُوں طاری ہے
چار سُو ٹھنڈے ستونوں سے نکل کر کرنیں
کس کی بیداری کی تصویر بنی بیٹھی ہیں؟
اور میں بیٹھا ہوں اک پیڑ کے نیچے خاموش،
کہنیاں ٹیکے ہوئے، چہرہ ہتھیلی پہ دھرے
محو ہُوں اپنے خیالات کے اُلجھاؤ میں
یعنی اُس طائرِ زخمی کی طرح جو خاموش
آشیاں سے ہو بہت دُور کہیں بے چارہ،
بے پر و بال، دل آزردہ، اکیلا، تنہا ——
پاس دو را ہے پہ بجری کی صدا — اُف توبہ!
لوہے کی جالی سے چھنتی ہوئی بجری کی صدا،
اس پہ جھنجلاتا ہوں رہ رہ کے، مگر کیا حاصل
بار بار ایک ہی انداز میں دہراتی ہے
لوہے کی جالی سے چھنتی ہوئی بجری کی صدا،
"چھیڑ! ہاں چھیڑ اُسے چھیڑ" کا مبہم نغمہ
چپکے چپکے مرے کانوں میں ہوا لاتی ہے۔

(۲)

لیکن اس طرفہ ترنّم کی غرض کیا مجھ سے،
بار یابی کی توقع ہی کہاں ہے مجھ کو،
میرے ہاتھوں میں کہاں جرأتِ رندانہ کی تاب
میں تو ہوں طائرِ زخمی کی طرح جو خاموش
آشیاں سے ہو بہت دُور کہیں بے چارہ،

بے پروبال، دل آزردہ، اکیلا، تنہا،
پھر صدا آتی ہے، پھر آتی ہے، پھر آتی ہے
"چھیڑ ہاں چھیڑ اُسے چھیڑ" کا مبہم نغمہ
چپکے چپکے مرے کانوں میں ہوا لاتی ہے ——
ریت باریک ہے چھن چھن کے گری جاتی ہے
ٹوکری سے بھی گری ہوگی، چھنی ہوگی ضرور
لیکن اُس کی تو صدا تک نہیں آئی مجھ کو،
اور اس بجری کا اندازِ ترنّم! —— توبہ
کان سننے سے جھجکتے ہیں، مگر سُنتا ہوں،
میری ہر رگ میں کوئی گاتا چلا جاتا ہے
"چھیڑ ہاں چھیڑ اُسے چھیڑ" کا مبہم نغمہ ——

(۳)

مجھ کو اُلجھاتا ہے آوارہ صداؤں میں خیال،
کتنا بے معنی و بیکار ہے یہ سوچ مرا ——
روز سنتا ہوں اسی طور سے صدا بجری کی
لیکن اِن معنوں میں کب میں نے سُنا ہے اِس کو،
"چھیڑ ہاں چھیڑ اُسے چھیڑ" یہ کیا نغمہ ہے؟
یہ تو ہے لوہے کی جالی پہ صدا بجری کی
ایک بے معنی سی آواز ہے —— لیکن اے دل
آج اِس چھنتی ہوئی بجری کو کیا سُوجھی ہے ——
خیر چھوڑو بھی اِسے، جانے بھی دو، میں اِس وقت
محو ہوں اپنے خیالات کے اُلجھاؤ میں
کہنیاں ٹیکے ہوئے، چہرہ ہتھیلی پہ دھرے۔

یوسف ظفر بی۔اے

تصویریں

نصرت چند دن سے گھر میں کچھ کھُسر پھُسر سُن رہی تھی۔ اِن دنوں میں اُس نے کتنی بار اپنی امّی اَور بھائی جان کو سرگوشیاں کرتے دیکھا تھا۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ اِن سرگوشیوں کے دوران میں جب وُہ اِن کے پاس سے گزرتی، یا اِن کے قریب آ کر بیٹھ جانا چاہتی تو وُہ دونوں اِس طرح خاموش ہو جاتے جیسے اُس کے خلاف سازش کر رہے ہوں۔ نصرت اِس قدر غبی نہ تھی کہ اِن سرگوشیوں کا مطلب نہ سمجھ سکتی۔ وُہ جانتی تھی کہ جب کسی درمیانے طبقے کی نوجوان ہندوستانی لڑکی کے بزرگ گھر میں اِس سے علیحدہ ہو کر کانا پھوسی شروع کر دیں تو اُن کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی ہم عمر لڑکیوں کے خلاف اُن کے والدین اور دوسرے اقارب اسی طرح سازش کرتے ہیں اور عام طور پر اِن سے مشورہ لئے بغیر انہیں چپ چپاتے ایک ایسے آدمی کے حوالے کر دیتے ہیں جو ان کے نزدیک اِتنا ہی ناقابلِ فہم ہوتا ہے جتنا روایتی اندھوں کے نزدیک ہاتھی۔ پھر اگر نصرت دل ہی دل میں اپنی امّاں اور بھائی جان کے طرزِ عمل پر جھنجلا رہی تھی تو اِس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ قدرتی طور پر اُس کے دل میں یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وُہ کس آدمی کے پلّے باندھی جائے گی۔ لیکن یہ بات اُسے معلوم کہاں سے ہو۔ گھر میں امّی اور بھائی جان کے علاوہ ایک بوڑھی کھوسٹ نوکرانی رحمت تھی جس نے اِسے گودی کھلایا تھا اور جو اُس کی سہیلیوں کے کپڑوں کی تراش خراش میں مین میخ نکالنا اپنا حق سمجھتی تھی اَور جسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نصرت کا دوپٹہ کہیں اُس کے سر سے سرک تو نہیں گیا؛ نصرت کے والد ایران کی ایک انگریزی کمپنی میں ملازم تھے اور کئی کئی سال بعد وطن آتے تھے۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ نصرت نے اپنے والد کے بجائے ان کی تصویریں زیادہ دیکھی تھیں تو اس میں مبالغے کا کوئی دخل نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نصرت کی چچا زاد بہن رشیدہ ہر سال بڑے دن کی چھٹیوں میں اُن کے ہاں آ جاتی تھی، اَور پھر وہ سردیوں کی طویل راتوں میں ایک ہی چارپائی پر لیٹ کر دنیا جہان کی تمام باتیں کر ڈالتی تھیں۔ لیکن رشیدہ کے آنے میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا۔ پورا ایک مہینہ۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے ایک چھوٹی بہن کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی۔ اِسے اپنی اُن تمام سہیلیوں پر رشک آ رہا تھا جن کے چھوٹی بہنیں تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ چھوٹی بہنیں جاسوسی کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ وُہ اِس تاک میں رہتی ہیں کہ کب اُن کے کانوں میں اپنی بڑی بہن کے شادی بیاہ کی بات کی بھنک پڑے اَور وہ جا کر اُسے سنائیں اور ستائیں۔ یوں تو نصرت کے بھائی جان ایسے کل کھرے یا سٹریل نہیں تھے بلکہ اُنہوں نے اپنی محبت سے اسے ایک دوسری بہن کی کمی کا احساس بہت کم ہونے دیا تھا، لیکن اِس بارے میں تو وہ بھی بڑے پُرانے خیال کے نکلے۔ کہنے کو تو وہ شادی بیاہ کے معاملے میں آزادیٔ رائے کے بڑے قائل تھے لیکن غالباً آزادیٔ رائے کا یہ حق وہ صرف مردوں کے لئے مخصوص سمجھتے تھے۔ ایک دو بار تو نصرت کے دل میں بھی خیال آیا کہ بھائی جان سے پوچھ ہی

لے لیکیوں صاحب. آخر آپ نے گھر کے ماحول کو اِس قدر پُراسرار کیوں بنا رکھا ہے؟ کیا مجھے یہ جاننے کا حق نہیں کہ آپ میری آئندہ زندگی کے بارے میں کیا فیصلہ کر رہے ہیں؟ کیا آپ کی روشن خیالی صرف الفاظ تک محدود ہے؟ لیکن یہ سوال کرنے کے لئے وُہ زبان کس سے مانگ کر لائے. پھر اپنی شادی کے معاملے میں تو ہر ہندوستانی لڑکی کا شرمانا رواجاً ضروری سمجھا جاتا ہے اور نصرت کا اپنا حال تو یہ تھا کہ جب وہ کسی اخبار میں ایک نئے بیاہے ہوئے جوڑے کی تصویر دیکھتی تو خود بخود لجا جاتی اور حیران ہوتی کہ کس طرح اِن لڑکیوں کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے. یہ اِس ڈھٹائی سے مُنہ کھولے دنیا کے سامنے اپنی شادی کا ڈھنڈورا پیٹتی پھرتی ہیں. ایک بار اسے خیال آیا کہ لکھ کر ہی پوچھ لے لیکن دل کی نامحکمی کا کیا علاج؟ اُسے اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا کہ وُہ حضرت منصوبے باندھنا جانتی ہے عمل کرنا کیوں نہیں جانتی. اِس سوچ اور دبدا کی حالت میں ایک شام وہ باورچی خانے میں چُولھے کے پاس بیٹھی سویٹر بُن رہی تھی اور اُس کی امّی اور بھائی جان صحن میں کچھ باتیں کر رہے تھے. نصرت اُن کی طرف پشت کئے بظاہر بے پروائی کے انداز میں بیٹھی تھی. لیکن اُس کے جسم کا ہر مسام کان بنا ہُوا تھا. امّی کہہ رہی تھیں.

"بیٹا تم نے سرفراز اور اُس کے گھر والوں کا عندیہ تو معلوم کر لیا؟"

سرفراز! نصرت کو معلوم ہو گیا کہ اُس کی زندگی کا ساتھی کون ہوگا. اس وقت اُس نے اور کچھ سننے کی پروانہ کی. اُس کی مثال اُس صاحب ضمیر چور کی سی تھی جو نقدی کے صندوق میں سے صرف اپنی فوری ضرورت کے مطابق روپے چرا لیتا ہے. اُس سرفراز کو ایک بار دیکھا تو ضرور تھا لیکن اِس طرح تو اُس نے خوانچے والے کو بھی گلی میں سے گزرتے دیکھا تھا. سرفراز اُس کے بھائی جان کا دوست تھا اور بارہا ان کے مکان پر آیا ہوگا. لیکن نصرت اپنے بھائی جان کے ہر دوست کو جھانکتی تھوڑا ہی رہتی تھی. البتہ اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ جب کبھی سرفراز اُن کے ہاں آتا. تو مردانے سے خوب خوب قہقہے بلند ہوتے. نصرت کے بھائی جان کو سرفراز کی دوستی پر بہت فخر تھا اور وُہ گھر میں کئی بار اِس بات کا ذکر کر چکے تھے کہ سرفراز ہندوستان کی معاشرت پر ایک شاندار کتاب لکھ رہا تھا. نصرت نے سرفراز کے مشاغل پر غور کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی. اُس کے خیال کی دنیا میں اُس کے باپ اور بھائی کے سوا اور کوئی مرد داخل نہیں ہوا تھا. رات کو سوتے وقت اُس نے کئی بار دل ہی دل میں اپنے بھائی کی گوناگوں دلچسپیوں، آئندہ زندگی اور شادی کے متعلق کتنے ہی منصوبے باندھے تھے. کئی بار اُس نے تصور میں دیکھا کہ اُس کا باپ ہزاروں میل کے فاصلے پر ایک تنہا اور اُداس کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے بال بچوں کی یاد میں محو ہے. لیکن اُس کے خیالات کی پُرشفقت چاردیواری میں ابھی تک کوئی تیسرا مرد داخل نہیں ہو سکا تھا. اُس دن جب وہ بستر پر لیٹی تو وُہ سرفراز کے متعلق سوچ رہی تھی. ایک اجنبی نے باپ اور بھائی کو اُس کے خیال کی دنیا سے باہر نکال دیا تھا. وُہ اپنے ذہن میں سرفراز کے نقوش اُجاگر کرنے کی کوشش کر رہی تھی. آنکھیں؟ شاید بہت بڑی نہیں لیکن اچھی تھیں. ناک؟ ستواں! رنگ گندمی نہیں گندمی سے یقیناً کُھلتا ہُوا. اور قد تو بہت ہی اچھا ہے. بالوں کے متعلق تو وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ جب

اُس نے سرفراز کو دیکھا تھا تو اُس کے سر پر ٹوپی تھی۔ پھر جب نصرت کو یہ خیال آیا کہ سرفراز مصنّف بھی ہے۔ یا بننے والا ہے تو اُس کے دل میں ایک گدگدی سی ہوئی۔ اُس کی واقفکار عورتوں میں متعدد ایسی تھیں جو اپنے نام کے ساتھ اپنے خاوند کی ڈگریوں کو استعمال کر کے اپنی کم علمی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اُس کے اپنے محلے ہی میں مسز رفیع الدین مڈل فیل ہونے کے باوجود اپنے نام کے ساتھ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ لکھتی تھیں۔ حالانکہ یہ ڈگری خود اُن کے خاوند نے دو سال فیل ہونے کے بعد بڑی مشکلوں کے ساتھ حاصل کی تھی۔ نصرت نے سوچا، اگر سرفراز اپنی کتاب کو اُس کے نام معنون کر دے تو کیا ہی اچھا ہو اور اُس کے ساتھ وُہ انتساب کے الفاظ سوچنے لگی۔

"نصرت کے نام"

محبت اَور شیفتگی کے ساتھ

یہ خیال اُس کے لئے کتنا روح پرور تھا۔ اُس کی روح مسرت کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ اَور اس احساسِ مسرت کے نشے نے اُسے سُلا دیا۔ دوسرے دن اُٹھی تو اس کے دل میں ایک بالیدگی تھی۔ ایک اُٹھان۔ اُس نے سب سے پہلے رشیدہ کو خط لکھا کہ وُہ بڑے دنوں کی چھٹیوں کا ایک دن ضائع کئے بغیر فوراً اس کے پاس چلی آئے۔ خط لکھنے کے بعد اپنے خیالوں میں سرشار وُہ بے خیالی میں قلم کے ساتھ کھیلنے لگی۔ دفعۃً وُہ چونک پڑی۔ جیسے کسی نے اُس کے چٹکی لے لی ہو۔ اُس نے بے سوچے سمجھے پیڈ پر سرفراز کا نام لکھ دیا تھا! اَور پھر بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا کہ بھائی جان کے کمرے کو آج اُسے خود ہی صاف کرنا چاہئے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بھائی جان نے تو اپنے کمرے کو کباڑیئے کی دُکان بنا رکھا ہے۔ جب دیکھو کتابیں ادھر اُدھر بے ترتیب پڑی ہیں۔ تولیہ کُرسی پر لٹک رہا ہے۔ حجامت کا سامان تپائی پر بکھرا پڑا ہے اَور میلے کپڑوں کا انبار ایک کونے میں پڑا ہے۔ توبہ توبہ ایسی بھی کیا بے پروائی ہے۔ بھائی جان کے کمرے میں پہنچ کر اُس نے محسوس کیا کہ اُن کے کمرے کی ابتری کے متعلق اس کا اندازہ ذرا مبالغہ آمیز تھا۔

اُس نے سب سے پہلے دیواروں پر لٹکی ہوئی تصویروں کو جھاڑا پونچھا۔ ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ وہی کشمیر کے دو ایک نظارے اور مونا لیزا کی تصویر۔ لکھنے کی میز پر کتابوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد اس کے ہاتھ خود بخود درازوں کی طرف چلے گئے اَور وہاں ایک دراز میں بہت سے خطوں کے علاوہ تصویروں کا ایک البم بھی پڑا تھا۔ نصرت نے وہ البم اُٹھا لیا اور ورق گردانی کرنے لگی۔ ایک تصویر پر اُس کا حافظہ کچھ ٹھٹکا اور پھر حاشیہ کی عبارت پر اس کی نظر پڑی۔ لکھا تھا

"مبادا تم بھول جاؤ"

سرفراز

نصرت کے چہرے پر ایک محویت، ایک انہماک کی کیفیت طاری ہو گئی۔ لیکن چند لمحوں کے بعد یہ کیفیتِ انہماک

ایک شریر تبسّم میں تبدیل ہو گئی۔ جیسے کہہ رہی ہو "کیوں؟ کیسے قابو میں آئے؟ تم بالکل میرے بس میں ہو۔ جب چاہوں اور جتنا عرصہ چاہوں تمہیں دیکھوں۔ مجھ سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ ہمارے مکان کی سنگین دیواریں، پردے کا رواج، دنیا کے آہنی قانون میں نے سب کو شکست دے دی ہے، اور ایک یہ مزے کی بات نہیں کہ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں اور تم میرے دامن تک کی جھلک نہیں پا سکتے؟" پھر خدا جانے تصویر دیکھتے دیکھتے اُس کے جی میں کیا آئی کہ اُس نے تصویر کا مُنہ چڑایا اَور اپنی زبان باہر نکال دی۔ اپنی اس حرکت پر نصرت کو خود بخود بہت زیادہ ہنسی آئی۔ اَور اس ہنسی ہی نے اُسے اپنی محویت سے چونکا دیا۔ اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور البم کو دراز میں جلدی سے رکھ دیا۔

بڑے دنوں کی چھٹیوں میں رشیدہ کے آجانے سے نصرت کو بہت زیادہ سہارا مل گیا تھا۔ اب وہ رشیدہ کے ساتھ مل کر سرفراز کی تصویر بڑی بے فکری کے ساتھ دیکھا کرتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر بھائی جان کو یہ معلوم ہو بھی گیا کہ اُن کی میز کی درازوں کی ہر روز تلاشی لی جاتی ہے تو رشیدہ تمام ذمہ داری اپنے سر لے لے گی اور نصرت کو اس بات کا یقین تھا کہ اُس کے بھائی جان، رشیدہ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ نصرت کو رشیدہ سے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اُس کی والدہ اور بھائی جان نے اُس کے والد کو اپنی تجویز سے مطلع کر کے منگنی کے لئے ان کی منظوری چاہی ہے۔ رشیدہ اور نصرت ہر روز ایران سے خط کا انتظار کرتیں۔ رشیدہ نسبتہً زیادہ بے تاب تھی۔ وُہ ہر روز کہتی "آپا! آج بھی چچا جان کا کوئی خط نہیں آیا" اور ایک دن جب نصرت نے اُسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"تجھے کیا جلدی پڑی ہے۔ منگنی تیری ہو رہی ہے۔ یا میری؟" تو رشیدہ بگڑ گئی۔ آخر کار ایران سے خط آیا۔ اِس سے پہلے جب کبھی اُس کے باپ کا خط آتا تو نصرت دوڑ کر اپنے بھائی جان کے پاس جا کھڑی ہوتی تھی۔ اُس کے بھائی جان امّاں کو خط کا مضمون بلند آواز سے سُناتے اَور وُہ اُن کی پُشت پر کھڑی ہو کر اُن کے ساتھ ساتھ خاموشی سے پڑھتی رہتی۔ لیکن آج وہ بدستور اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ اُس کے بے تاب اظہارِ مسرت کی جگہ ایک گلا گھونٹنے والے اضطراب نے لے لی تھی۔

بہت دیر کے بعد رشیدہ آئی اور کہنے لگی "آپا! چچا جان کا خط آیا ہے۔" نصرت نے اپنی روح کی ساری بے تابی سے اُس کی طرف دیکھا ..... "اُنہوں نے لکھا ہے کہ یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔ اَور یہ کہ اس سے بہتر رشتے اُن کی نظر میں ہیں۔"

نصرت نے محسوس کیا۔ کہ چھت کا شہتیر اُس کے سر پر آ گرا ہے۔ وُہ اپنی کرسی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ رشیدہ کے آنسو بھی اِسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔ کچھ عرصے بعد جب بوڑھی رحمت اسے بلانے آئی تو اُس نے سر اُٹھا کر صحن کی طرف دیکھا۔ باورچی خانے کی انگیٹھی سے دھوئیں کے دبیز حلقے نکل نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔

ان مٹیلے حلقوں میں اسے سرفراز کی تصویر کے نقوش بکھرتے ہوئے معلوم ہوئے ...... زندگی کی چاہت ..... زندگی کے خواب اَور تصویریں ..... یکایک اسے احساس ہوا کہ اسے خوابوں اور تصویروں سے ہمیشہ کے لئے نفرت ہو گئی ہے۔

عطاء اللہ سجاد

(بہ اجازتِ نشرگاہِ دہلی)

راز و نیاز

اُڑا دی خاک پروانوں کی اے شمعِ حرم کس نے؟ میانِ انجمن چھیڑی حدیثِ درد و غم کس نے؟

ترے بس میں نہ تھا ساقی! تُو نے مجھ کو تشنہ لب رکھا مگر تیری صلائے عام کا کھولا بھرم کس نے؟

تعجب ہے کہ تُو برہم ہو کیوں سجدہ کیا اِن کو ترشوائے تھے مجھ سے آرزوؤں کے صنم کس نے؟

مَیں ناداں تھا گنوا دی عشرتِ جنت۔ بہت اچھا جہانِ آب و گِل کو کر دیا پابندِ غم کس نے؟

مِری دُنیا ہوئی آباد تیرے دم سے۔ یہ سچ ہے بسائی جان دے کر تیری اقلیمِ عدم کس نے؟

بجا ہے مَیں نے تیرا حُسن افسانہ بنا ڈالا کیا میرے لہو سے اِس فسانے کو رقم کس نے؟

ترا احساں مسلّم۔ مجھ کو دم بھر زندگی بخشی مگر رکھّی گلے پر موت کی تیغِ دو دم کس نے؟

فرات و دجلہ تیرے۔ سرزمینِ کربلا تیری لہو سے اپنے پیدا کی تھی اِس مٹّی میں نم کس نے؟

ترے گلشن کی بربادی کا باعث مَیں ہوں یا تُو ہے؟
میں گلچیں ہوں تو گلچیں کو دیا اذنِ ستم کس نے؟

عبدالرشید تبسّم

تمنّا

اک شرابِ تیز، بے خمیازہ، بے کیف و سرور
ایک رنگیں لفظ لیکن معنی و مطلب سے دُور

ایک زخمِ روح فرسا، ایک دردِ جانگسل
اِک خلش صد حشر بر کف، اک عذابِ مُستقل

ظلمتوں کی گود میں پوشیدہ جس کی روشنی
ایک گتّھی ہے امید و بیم کی اُلجھی ہوئی

ہے ہلاکت ہی ہلاکت جس کی اُفتاد ہیں
دب کے لاکھوں رہ گئے جس قصرِ بے بنیاد میں

ہستیٔ انساں میں کر دے جو بپا لاکھ انقلاب
روحِ انساں کو بنا دے جو مجسّم اضطراب

ہے وُہ سورج روشنی جس سے کوئی پاتا نہیں
ہے وُہ اک مہماں، جو آ کر عمر بھر جاتا نہیں

ایک بے آواز نغمہ، بے ترنّم ساز ہے
جس کا ہو انجام ناکامی وُہ اک آغاز ہے

ہے وُہ صرصر جو کچل دے عیشِ انسانی کا باغ
ہے وُہ غنچہ جو کھلے اور کھلتے ہی بن جائے داغ

جو نہیں شرمندۂ ساحل وہ دریائے رواں
ایک اُٹھتا سا بگولا ایک گھٹتا سا دھواں

ایک بحرِ غم بظاہر چشمۂ آبِ حیات
بحرِ غم بھی وُہ کہ جس میں ڈوب جائے کائنات

جس کے سر بربادیٔ دنیا کا سب الزام ہے
اصطلاحِ عشق میں اُس کا "تمنّا" نام ہے

آبرا حسنی گنّوری

برٹش میوزیم کا کتب خانہ

برٹش میوزیم کے کتب خانہ کی بناء اٹھارھویں صدی کے وسط میں پڑی۔ اس کی تعمیر نہ تو فلورنس کے اطالوی کتب خانہ (Biblioteca Medico Laurenziana) کی طرح کسی انقلاب کا نتیجہ تھی اور نہ اس نے پیرس کی نیشنل لائبریری (Bibliotheque Nationale) کی مانند شاہی سرپرستی میں نشوونما پائی۔ انگلستان کے اس مشہور کتب خانہ کا قیام دراصل ملک کے ایک دولتمند اور نامور طبیب سرہینز سلون (Sir Hans Sloan) کے ادبی ذوق اور علمی شغف کا رہینِ منت ہے۔ سلون کو کتابوں سے عشق تھا۔ ان کا کتب خانہ نادرِ روزگار سمجھا جاتا تھا۔ تقریباً پچاس ہزار کتابیں اور ساڑھے تین ہزار رسالے اس میں موجود تھے۔ سرہینز جس قدر علم کے دلدادہ تھے۔ اُسی قدر حبِ وطن کا جذبہ بھی ان میں موجود تھا۔ چنانچہ اپنے مرنے سے پہلے یہ وصیت کی تھی کہ ان کے بعد کتابوں کا یہ نایاب ذخیرہ اگر حکومت چاہے تو بیس ہزار پونڈ میں ان کے ورثاء سے خرید سکتی ہے۔ قیمت کے مقرر کرنے میں سلون نے بڑے ایثار سے کام لیا۔ سچ پوچھئے تو بیس ہزار پونڈ کی یہ مقرر کردہ رقم کتابوں کی اصل لاگت یا ان کی اُس وقت کی قیمت کی چوتھائی بھی نہ تھی۔ پھر بھی ان کی اس شرط کو حکومت نے بہت پس وپیش کے بعد قبول کیا۔ پارلیمنٹ نے کتب خانہ کو خریدنے کے لئے ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے ایک لاکھ پونڈ کی رقم بذریعہ لاٹری جمع کی گئی۔ ساتھ ہی ہارلین (Harlein) کے مخطوطات اور کوٹن (Cotton) کے مجموعہ کو بھی دس ہزار پونڈ میں اس ذخیرے میں شامل کرنے کے لئے خرید لیا گیا۔ مزید برآں کتب خانہ کے آئندہ مصارف کے لئے تیس ہزار پونڈ کی رقم بطور ایک فنڈ کے محفوظ کی گئی جس کے منافع کے علاوہ پارلیمنٹ کی جانب سے بھی ایک معقول سالانہ امداد ملنے لگی۔ اس تمام آمدنی کے دخل وخرچ کا کلّی اختیار ٹرسٹیز یا نظماء کتب خانہ کو حاصل ہے۔

کتب خانہ کی انتظامی کمیٹی میں آرچ بشپ آف کنٹربری لارڈ چانسلر اور دارالعوام کے اسپیکر بحیثیتِ نظماء خصوصی نامزد کئے گئے۔ ان کے علاوہ اسقفِ لندن، رائل سوسائٹی اور رائل کالج لندن کے صدر۔ نیز سلون (Sloan) ہارلی (Harley) اور کوٹن (Cotton) خاندانوں کا ایک ایک رکن بھی مجلسِ انتظامی کے لئے منتخب کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس مجلس کے اراکین میں رائل اکیڈمی آف آرٹس اور سوسائٹی آف اینٹی کیوریز (Society of Antiquaries) کے صدر کے ساتھ ٹونلی (Townley) پین (Payne) اور نائٹ (Knight) خاندانوں کے افراد اور نمائندہ تاج کا مزید اضافہ ہوا اور پندرہ ایسے ذی علم اصحاب بھی جو اعلیٰ ادبی اور علمی خدمات کے لئے مشہورِ زمانہ تھے بطورِ مشیرانِ خاص

کمیٹی میں شامل کر لئے گئے۔ مذکورہ اراکین کی تعداد چونکہ بہت زیادہ ہوگئی تھی اور بیک وقت ان سب کا یکجا ہو کر کسی معاملے کو طے کرنا خالی از دقت نہ تھا' اس لئے فوری کارروائیوں کے لئے ان لوگوں میں سے بیس منتخب افراد کی ایک مجلس بنائی گئی۔ اس کا اجلاس ماہانہ اب بھی ایک بار نیچرل ہسٹری میوزیم میں اور ایک دفعہ خود برٹش میوزیم میں منعقد ہوتا ہے۔ یورپ کے اور قومی کتب خانوں کی طرح برٹش میوزیم کے کتب خانہ کا محکمۂ تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نظمائے کتب خانہ اور حکومت کے کاروباری تعلقات وزیر مالیات کے توسط سے طے پاتے ہیں اور محکمۂ مالیات ہی کا پارلیمنٹری سکرٹری دارالعوام میں میوزیم کے کتب خانہ کے متعلق سوالات کا جواب دیتا ہے۔

سرہینز سلون کی وصیت میں یہ تجویز بھی شامل تھی کہ حکومت کی طرف سے کتابوں کے رکھنے کے لئے کسی معقول عمارت کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ۱۷۵۵ء میں لارڈ مانٹیگو (Lord Montague) کے محل میں کتب خانہ کو منتقل کر دیا گیا۔ یہ عمارت مشہور فرانسیسی آرکیٹک پائرے پیوجے (Pierre Puget) کے نفیس ذوق کا بہترین نمونہ تھی۔ ۱۸۲۷ء تک ضروریات کے لحاظ سے اس میں متواتر اضافے ہوتے رہے۔ مگر انیسویں صدی کے اوائل میں جب شاہ جارج سوم نے اپنا شاہی کتب خانہ میوزیم کو عطا فرمایا تو کتابوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی کہ عمارت اس کے لئے بالکل ناکافی نظر آنے لگی۔ علاوہ ازیں مصری عجائبات' یونان کے قدیم مرمری مجسمے (Elgin Marbles) مشہور اداکار و ڈراما نویس گیرک (Garrick) کے ڈرامے۔ برنی (Burney) کے جمع کئے ہوئے انگریزی اخبارات اور پرانی کتابوں کے بیش بہا مجموعوں کے اضافہ نے نظمائے میوزیم کو مجبور کر دیا کہ ایک اور عمارت جو بلحاظ وسعت موجودہ عمارت سے دوگنی ہو فوراً تیار کرائی جائے۔ مانٹیگو ہاؤس (Montague House) میں گو اتنی گنجائش ابھی اور موجود تھی کہ ایک آدھ شعبہ کا اور اضافہ کیا جا سکے لیکن نظماء کی جدت پسند طبیعتوں نے ایک نئی عالیشان عمارت بنوانے کا فیصلہ کیا۔ اور عمارت کا نقشہ تیار کرنے کے لئے سر رابرٹ سمرک (Sir Robert Smirk) سے فرمائش کی گئی۔ سر رابرٹ کو یونان سے نئے نئے آئے ہوئے سنگ مرمر کے مجسموں نے کچھ ایسا متاثر کر دیا تھا کہ عمارت کا نقشہ بھی انہوں نے قدیم یونانی طرز پر بنایا۔ یہ چار متوازی حصوں پر منقسم تھا۔ اور وسط میں ایک وسیع مربع صحن چھوڑ دیا گیا تھا۔ بعد میں بلحاظ ضرورت اس میں بھی مختلف تبدیلیاں اور اضافے ہوئے۔

موجودہ دارالمطالعہ کا نقشہ انٹونیو پنیزی (Antonio Panizzi) نے ۱۸۵۴ء میں تیار کیا۔ جو ہیئت کے لحاظ سے مدوّر ہے۔ یہ دارالمطالعہ اب تک دنیا کے تمام کتب خانوں میں سب سے اعلیٰ اور عدیم المثال مانا جاتا ہے۔ میں نے فرانس اور جرمنی میں بعض مشہور ماہرین کو برٹش میوزیم کے دارالمطالعہ کی عظمت اور شان کے متعلق یہ بیان کرتے سنا ہے کہ "جب کبھی ہم نے اس دارالمطالعہ میں قدم رکھا چند لمحات کے لئے تو بالکل مرعوب اور مسحور ہو کر رہ گئے" اور حقیقت

میں خود میں نے بھی اکثر سیاحوں اور خاص لندن کے رہنے والوں کی دارالمطالعہ میں داخلے کے وقت بعینہ یہی حالت دیکھی ہے۔

دارالمطالعہ میں حوالے کے کتابوں کی مجموعی تعداد (۶۵۰۰۰) پینسٹھ ہزار کے قریب ہے۔ قارئین کے لئے ساڑھے چارسو (۴۵۰) نشستوں کا انتظام ہے۔ نگراں کار اور لائبریری اسسٹنٹس کی نشست گاہ ہال کے عین وسط میں ہے۔ تاکہ پڑھنے والوں پر نظر رکھنے میں سہولت ہو۔ یہ نگراں کار اپنے فن کے اعلیٰ ماہر۔ بڑے مزاج دان، رہبر معلومات اور علم دوست ہوتے ہیں۔

اس امر کا تذکرہ بھی غالباً بے محل نہ ہوگا کہ کتب خانہ کی تعلیم کے لئے گو خود لندن یونیورسٹی میں ایک خاص مدرسہ قائم ہے اور اس مدرسہ کے تعلیم یافتہ طلبہ کا تجربہ اور قابلیت تمام یورپ اور دُنیا کے دیگر ممالک میں مستند مانی جاتی ہے لیکن برٹش میوزیم کے اربابِ اقتدار اپنے کتب خانہ کے ارکان کو بطورِ خود تعلیم دیتے ہیں اور عملی کام بھی سکھاتے ہیں۔ البتہ تعلیم کے لئے اُن لوگوں کو جو غیر ملکی زبانوں سے واقف ہیں زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔

میوزیم کے ریڈنگ روم میں صرف انہیں لوگوں کو مطالعہ کی اجازت مل سکتی ہے جن کی عمر کم از کم اکیس سال ہو، جو کوئی خاص تحقیقاتی کام کر رہے ہوں اور اس بات کا یقین دلائیں کہ یونیورسٹی یا کالج کے اور دوسرے مقامی کتب خانے ان کی مطلوبہ امداد پہنچانے سے قاصر ہیں اور ان کے لئے میوزیم کے دارالمطالعہ سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ انہیں پابندیوں کی وجہ سے دارالمطالعہ میں بیشتر علماء اور علمی تحقیقات کرنے والوں کا مجمع رہتا ہے۔ دارالمطالعہ میں آنے والوں کی روزانہ تعداد کا اوسط ۸ سو افراد (۸۰۰) پر مشتمل ہے اور اندازہ کیا گیا ہے کہ سال بھر میں تقریباً دو لاکھ چالیس ہزار افراد صرف میوزیم کے دارالمطالعہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ مزید برآں اخبارات کے کمروں میں تقریباً اٹھارہ ہزار، مخطوطات کے حصہ میں بارہ ہزار اور شعبۂ مشرقی میں پانچ ہزار افراد سالانہ آمد و رفت رکھتے ہیں۔

کسی کتاب کو دارالمطالعہ سے باہر لے جانے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ نایاب کتابیں اور نادر مخطوطات لائبریری کے کسی مددگار کی موجودگی میں دکھائے جاتے ہیں۔ کتابوں کی جلد بندی، بوسیدہ مخطوطات اور قدیم کاغذات کی مرمت اور درستی بھی خود میوزیم میں ہوتی ہے۔ اس کے لئے کتب خانے کے تہ خانہ میں ایک خاص شعبہ قائم ہے۔ جس کے تمام دروازے ہمیشہ مقفل رہتے ہیں۔ میوزیم کے ملازمین کے علاوہ تمام غیر اشخاص کو اندر جانے کی سخت ممانعت ہے اور خود ملازمین کو بھی آمد و رفت کے وقت اپنے پاس کا دکھانا ضروری ہے۔ اس شعبے میں ماہرینِ فن اور اُن کے مددگاروں کے علاوہ تقریباً سو آدمیوں کا عملہ کام کرتا ہے۔

شعبۂ جلد بندی کے ساتھ ہی عکاسی کا بھی ایک خاص شعبہ ۱۹۲۶ء سے قائم ہے جس میں کاغذات اور دستاویزات کی عام تصاویر کے علاوہ فوٹوسٹیٹس (Photostats) تصاویر کی مانگ روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور لوگ گراں بہا کاغذات اور مخطوطات کے یہ عکس بہت کم داموں میں بآسانی خرید سکتے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر جے۔ ایم مینلی (J. M. Manly) نے ایک ایسا بجلی کا لیمپ کتب خانہ کی نذر کیا جس کی ہلکی نیلی اور سبز روشنی میں کاغذات و مخطوطات کے مدّھم حروف بآسانی پڑھے جا سکتے ہیں۔ اس لیمپ سے شعبۂ عکاسی کے کاموں میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اس کتب خانہ کو کتابوں کی خرید اور دیگر انتظامی امور کے لئے حکومت کی طرف سے اب تقریباً ایک لاکھ تینتیس ہزار پونڈ کی سالانہ امداد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں کاپی رائٹ یعنی حقِ تصنیف کے متعدد قوانین کی بنا پر سلطنتِ برطانیہ میں جہاں کہیں بھی کوئی اعلیٰ، مستند اور معیاری کتاب شائع ہوتی ہے، ناشر کو اس کا کم از کم ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ کو لازماً بھیجنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں دنیا کے ہر ملک اور ہر زبان کی بہترین کتابیں موجود ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو کتابوں کے خریدنے سے اور دوسری طرف قوانینِ حقِ تصنیف کی بنا پر فراہمیٔ کتب اور بعض شاہانِ انگلستان اور بے شمار علم دوست اصحاب کے عطایا م سے یہ کتب خانہ اتنا مالا مال ہوا کہ اس کی کتابوں کی مجموعی تعداد چالیس لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔

اب میں چند خاص ذخیروں اور عطایاء کا حال مختصراً عرض کرتا ہوں۔ ان میں سب سے اہم اور دلچسپ وہ مجموعہ ہے جو ہنری ہشتم شاہِ انگلستان نے سولھویں صدی کے وسط میں خانقاہوں کی تباہی کے بعد جمع کیا تھا۔ اور جس میں ولی عہد جیمز اوّل یعنی شہزادہ ہنری ٹامس کرینمر اور ارل ارنڈل کے کتب خانے بھی شامل ہیں۔ یہ تمام کتابیں جارج دوم نے میوزیم کے افتتاح سے قبل ہی اس کی لائبریری کے سپرد کر دی تھیں۔

جارج دوم کے بعد ان کے جانشین جارج سوم نے بھی اپنا نایاب ذاتی کتب خانہ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے میوزیم کے تفویض کر دیا تھا۔ اس ذخیرے میں کثیر کتابوں کی تعداد ایسی موجود ہے جن کے دیکھنے سے جرمنی، فرانس، ہالینڈ، اسپین اور انگلستان میں پندرھویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی عیسوی تک چھاپے کی ایجاد و اختراع کی تاریخ پر بہترین اور تفصیلی روشنی پڑتی ہے علاوہ ازیں اُن تمام قدیم کتابوں کے نسخے بھی موجود ہیں جو اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور نوآبادیاتی ممالک میں انگلستان کے بعض صاحبِ ذوق اشخاص کی سعی سے طبع ہوئے تھے۔ چند پُرانے نقشے اور انگریزی موسیقی کے متعلق قدیم کتابیں بھی قابل دید ہیں۔

۱۹۱۰ء میں شاہ جارج پنجم نے بھی اپنے نامور اجداد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے موسیقی سے متعلق اپنا سارا لٹریچر بکمالِ سرپرستی میوزیم کے شاہی شعبہ کو عطا فرما دیا جس کی وجہ سے موسیقی کے مجموعہ میں قابلِ قدر اضافہ ہو گیا ہے۔

آنریبل ٹامس گرینول کا ذخیرہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس میں بعض قدیم ادبی قصّے اور انگریزی تاریخ پر نایاب کتابیں ہیں۔ اکثر کتابوں کے ایک سے زائد نسخے ہیں۔ ان کو بھی بڑی احتیاط سے محفوظ کر لیا گیا ہے اور یہ عام طور پر پڑھنے والوں کو نہیں دئے جاتے۔

انقلابِ فرانس کے متعلق کورکر کا مجموعہ بھی ۱۸۵۶ء میں خرید لیا گیا تھا۔ اس میں بے شمار نادر کاغذات ہیں۔ میوزیم کے مشہور محافظ جی۔ کے فاٹیسکیو نے ان کی ایک فہرست بھی مرتب کی تھی۔ جو اب تک کتب خانہ میں قیمتہً مل سکتی ہے۔

انگلستان کے مشہور پادری کریکروڈ نے بھی اپنی محنت اور کاوش سے جمع کی ہوئی تمام کتابیں آخری وقت بطورِ یادگار کتب خانہ کی نذر کر دی تھی۔ ان میں قدیم جلد سازی کے بعض اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔ جو قابلِ دید ہیں۔

شعبۂ مشرقی کا ذخیرہ بھی بڑا جامع اور وسیع ہے۔ یہ ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب مطبوعہ کتابوں اور تقریباً ۱۶ ہزار مخطوطات پر مشتمل ہے۔ عبرانی۔ فارسی، عربی، سنسکرت، پالی، تامل، تلنگی، چینی اور جاپانی وغیرہ غرض کوئی مشرقی زبان ایسی نہ ہوگی جس کی قدیم و مستند کتابیں اس کتب خانہ میں موجود نہ ہوں۔

مذکورہ ذخائر کے علاوہ اور بے شمار مجموعے اور نوادر یہاں ایسے پائے جاتے ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن فی الحال میں انہیں پر اکتفاء کرتا ہوں۔

آخر میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ برٹش میوزیم کے کتب خانے کی شہرت اور ترقی کا راز اُسی جذبۂ حب الوطنی میں مضمر ہے جو اس کے آغاز میں کارفرما تھا۔ اور گو اب اسے سلطنتِ برطانیہ کی امداد بھی حاصل ہے لیکن اس کے باوجود وہ درحقیقت قوم کی اخوت و یکجہتی کا علمبردار ہے۔ مثلاً یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ چند سال ہوئے جب روسی حکومت نے انجیلِ مقدس کا ایک قدیم عبرانی نسخہ ایک لاکھ پونڈ میں فروخت کرنا چاہا تو نہ صرف نظمائے برٹش میوزیم بلکہ تمام انگریز قوم نے متفقہ طور پر یہ محسوس کیا کہ یہ انمول نسخہ کتب خانۂ برطانیہ کی زینت بننے کے لائق ہے۔ قیمت اس قدر گراں تھی کہ تنہا لائبریری فنڈ سے اس کا ادا کیا جانا محال تھا۔ مگر سب کو اس کے خریدنے کی لو لگی ہوئی تھی اور قوم کے بچے بچے نے اس مقصد کے لئے چندہ فراہم کرنے میں اپنے انتہائی جوش و خروش کا اظہار کیا اور آخرکار اس نادرِ روزگار نسخے کو کتب خانۂ برطانیہ کے لئے خرید ہی لیا۔

(بہ اجازتِ لاسکی نشرگاہِ حیدرآباد دکن) **مسعود یزدانی**

اقوالِ زریں

۱:۔ جو انسان جاہلوں کو اپنی نیک ہدایت سے راہِ راست پر لانا چاہتا ہے وہ گویا شاخِ گل سے ہاتھی کو باندھنے اور برگِ گل کی نوک سے ہیرے میں سوراخ کرنے اور کھارے سمندر کو ایک بوند رس سے شیریں کرنے کی بیکار کوشش کرتا ہے۔

۲:۔ خاموشی کو خدا نے ظرفِ کم عقلی کا سرپوش بنایا ہے۔ یہ داناؤں کی مجلس میں بیوقوفوں کے لئے زیور ہے۔

۳:۔ جو انسان لطفِ شعر و موسیقی سے بے بہرہ ہے بلاشبہ وہ بے دُم اور بے سینگ کا جانور ہے۔ گھاس نہیں کھاتا اور جیتا ہے یہ اُس کی خوش قسمتی ہے۔

۴:۔ داناؤں اور عارفوں کو حقیر مت جانو کیونکہ ان کو تمہاری زوال پذیر دولت قابو میں نہ لا سکے گی۔ اسی طرح جیسے ہاتھی کنول کی شاخ سے نہیں ہانکا جا سکتا۔

۵:۔ قوتِ برداشت ہو تو زرہ بکتر، غصہ ہو تو مخالف، برادری ہو تو آگ، صاف دل دوست ہوں تو دوا، بدخواہ ہوں تو سانپ، علم ہو تو دولت، حیا ہو تو زیور اور شاعری میں کمال حاصل ہو تو بادشاہت کی کیا ضرورت ہے۔

(بھرتری ہری) **ترجمہ عاشق ہوشیارپوری**

عابدِ شب زندہ دار سے

آ اس طرف بھی عابدِ شب زندہ دار دیکھ
موجِ ہوا میں سلسلۂ زُلفِ یار دیکھ

بے بادہ کس نے پائے ہیں اسرارِ کائنات
آمیکدے میں رقصِ مئے خوشگوار دیکھ

کب تک رہیں جلوہ گہِ حور و سلسبیل
جنگل کی دیویوں کو لبِ جوئبار دیکھ

جن کی ہر ایک بوند میں غلطاں ہے خلدِ عیش
اُن بادلوں کا رقص سرِ کوہسار دیکھ

بے کیفیوں میں رُوح کی تابندگی کہاں
آ چاندنی میں بہتے ہوئے آبشار دیکھ

ہر پھول میں ہے دفترِ عرفاں کھلا ہوا
رنگینیٔ بہار بقدرِ بہار دیکھ

تا چند صومعے میں یہ رحمت کی جستجو
آمیکدے میں رحمتِ پروردگار دیکھ

کب تک اسیرِ سلسلۂ مصحف و نماز
ساغر اُٹھا تجلّیٔ روئے نگار دیکھ

جوہر کی مے پرستیٔ ظاہر میں گم نہ ہو
پائی ہے آنکھ اگر تو دلِ بادہ خوار دیکھ

جوہر فریادی حیدرآباد دکن

سوشلسٹ

صبح نو بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بے طرح بجنے لگی۔ میں نے اپنے کان زور سے لحاف میں لپیٹ لئے۔ لیکن شاید ٹیلیفون کرنے والے نے بھی سوچ رکھا تھا کہ جواب لئے بغیر وہ بھی نہ ٹلے گا۔

آخر میں نے اپنے بستر سے اُچھل کر ریسیور اُٹھا لیا "ہیلو۔ او۔ او ــــ"
کسی نے شائستگی سے پوچھا "آپ کہاں سے بول رہی ہیں؟"
"مُنہ سے بول رہی ہوں" میں نے بالکل سچ سچ عرض کر دیا۔
انہوں نے کچھ پریشان ہو کر کہا "میرا مطلب ہے کہ .... یعنی آپ کس جگہ سے بول رہی ہیں"

میں نے جواب دیا "اپنے کمرے میں سے بول رہی ہوں"

"لاحول ولاقوۃ" کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

میں نے ایک انگڑائی لی اور تکیئے پر سر رکھ کر مسکرانے لگی۔

میری خادمہ نے پردے میں سے اپنا بھولا بھالا مُنہ اندر نکال کر کہا "غُسل کا پانی تیار ہے"

میں نے سست آواز میں کہا "ہوں۔ ادں ......" اور پھر لحاف میں لپٹی لپٹائی پلنگ سے نیچے آ رہی۔"

میں نے لحاف میں سے اپنے آپ کو آزاد کر کے اُٹھتے ہوئے کہا۔ صوفیہ تم چائے منگواؤ میں ابھی دس منٹ میں غُسل کر کے آتی ہوں"

صوفیہ "بہت بہتر" کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں غُسل سے واپس آ کر سنگار میز کے سامنے سٹول پر بیٹھ کر اپنے بالوں میں سے گھنگر ڈالنے والی پنیں نکالنے لگی۔

صوفیہ الماری کے سامنے کھڑے ہو کر میرے کپڑے نکال رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

"آج آپ کس رنگ کا لباس پہنیں گی؟"

میں اپنے بالوں پر او۔ ڈی۔ کولون چھڑکتے ہوئے بولی "سبز"

لیکن کل اور پرسوں بھی آپ نے سبز لباس ہی پہنا تھا۔

میں نے پلٹ کر آتشیں لہجے میں کہا "تم میرے حکم کی خلاف ورزی مت کیا کرو۔ میں جو دل چاہے پہنوں گی"

وہ سر جھکا کر عاجزی سے بولی "بہت اچھا"

میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا اور میرے دل کو کچھ دکھ سا ہُوا۔ وہ غریب ہے اور پھر میری ملازمہ شاید اسی لئے

میں اُس سے دُرشت کلامی سے پیش آئی ہوں۔

صوفیہ میرا لباس تبدیل کرانے میں مصروف تھی میں نے ایک ناقدانہ نظر اپنے پلنگ کے قریب رکھی ہوئی میز پر ڈالی جس پر چائے کا سامان رکھا تھا۔ دفعتہً میں چونک کر بولی۔ "ہائیں! آج میرا مارملیڈ کیا ہُوا؟"

صوفیہ ڈرتے ڈرتے بولی "جمال کہہ رہا تھا مارملیڈ رات پڈنگ میں ڈال دیا گیا تھا۔ صبح دُکانیں بند تھیں اسلئے مل نہیں سکا۔"

میں غصے سے بولی "میں یہ نہیں جاننا چاہتی کہ مارملیڈ ملا یا نہیں۔ میں مارملیڈ چاہتی ہوں۔ سُنا؟ مارملیڈ۔ میں صبح کی چائے مارملیڈ کے بغیر نہیں پی سکتی۔ میں مارملیڈ کے بغیر یہ ٹوسٹ کیسے کھا سکوں گی۔" میں غیظ و غضب سے کمرے میں چکر لگا رہی تھی۔ آدھی ساڑھی میرے گرد لپٹی ہوئی تھی اور آدھی صوفیہ کے ہاتھ میں تھی جو اُسے تھامے میرے پیچھے پیچھے پھر رہی تھی۔

"ٹوسٹ پر سیب کا مُربّہ لگا لیجئے۔ لے آؤں جا کر؟"

"بکواس مت، اگر تم سیب کا مُربّہ لائیں تو میں وہ تمہارے مُنہ پر مل دوں گی۔"

"تو جو آپ حکم دیں وہ تیار کر دیا جائے۔"

"تم جا کر دیکھو کہ بیگم صاحبہ بیدار ہوئی ہیں یا نہیں۔ اور مجھے فوراً آ کر اطلاع دو۔" میں بیڈ رُوم سلیپرز اُتارتے ہوئے بولی۔ آج میں امّی سے کہہ کر جمال کو نکلوا دینا چاہتی تھی۔ ملازم ہو کر اُس کی اتنی جرأت کہ صبح میری پسند کے مطابق مجھے چائے بھی نہ بھیجوائے۔

صوفیہ چند ہی لمحوں میں واپس آ کر بولی۔ "بیگم صاحبہ اپنے کمرے ہی میں تشریف رکھتی ہیں"

میں امّی کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ آرام کرسی پر لیٹی صبح کا اخبار دیکھ رہی تھیں۔

مَیں ان پر جھکتے ہوئے بولی۔ "آداب عرض امّی"، انہوں نے جواب میں میری پیشانی کو چُوم لیا۔

میں رِقّت آمیز لہجے میں بولی "آج مجھے چائے کے ساتھ مارملیڈ نہیں ملا۔"

امّی نے خشمگیں ہو کر کہا کیوں نہیں ملا۔ کیا وجہ ہے؟ بلاؤ جمال کو "حضور میں حاضر ہوں" (وہ پہلے ہی دروازے میں کھڑا تھا)

"آج چھوٹی خانم کو ٹوسٹوں کے ساتھ مارملیڈ کیوں نہیں بھیجا گیا۔"

"حضور مارملیڈ رات ختم ہو گیا تھا۔ صبح دُکان بند ہونے کی وجہ سے مل نہیں سکا۔ آج شام کی چائے پر ضرور حاضر ہو گا" وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جھپکا رہا تھا اور اُس کی لمبی لمبی ہیبت ناک مونچھیں کانوں کے قریب پہنچی ہوئی تھیں۔

میں نے اُس کی مونچھوں کو حقارت سے دیکھتے ہوئے تنک کر کہا۔ "اور اگر شام کو بھی نہ ہُوا تو؟"

"تو حضور جو دل چاہے سزا دیجئے گا" وہ پھر معصومیت سے آنکھیں جھپکنے لگا۔

"سزا یہ ہوگی کہ تمہیں اپنی مونچھوں سے میرے کمرے میں جھاڑو دینی ہوگی"

وُہ گھبرا کر بولا "مونچھوں سے جھاڑو حضور ؟"

میں نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا "بالکل"

صوفیہ دیوار کی طرف مُنہ کر کے ہنسنے لگی۔ وُہ اپنی مونچھوں سمیت کمرے سے باہر چلا گیا اور امّی چیں بجبیں ہو کر بولیں "بیٹی نوکر سے تہذیب سے بات کیا کرو"

کمرے میں واپس آئی تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ رسیور اُٹھا لیا "جی! میں خُود زرمینا ہی بول رہی ہوں .... اوہ ہیلو نلنی .... آج شام کو ؟ .... ہاں ہاں مجھے بھی انویٹیشن آیا ہُوا ہے ..... میرا تو ارادہ نہیں جانے کا ..... کیا ؟ ...... بات یہ ہے کہ میری کنور صاحب سے بالکل سرسری ملاقات ہے .... کیا ؟ ہاں وُہ غالباً مجھے اچھی طرح جانتے ہوں گے ... بھائی جان ایک ہفتہ سے بمبئی گئے ہوئے ہیں۔ وُہ یہاں ہوتے تو اُن کے ساتھ چلی جاتی ...... اُن کے تو گہرے دوست ہیں۔ آہا تو آج تم لوگوں کو مل کر وُہ پارٹی بنانی ہے .... بھئی مجھے تو معاف ہی رکھو .... بات یہ ہے کہ میں ذرا بچپن ہی سے نازک مزاج واقع ہوئی ہوں اور یہ پابندیاں میں نہیں برداشت کر سکتی .... بھئی کون کہتا ہے کہ میں اب تمام پُرانے ساتھیوں سے الگ رہنا چاہتی ہوں .... ہائیں کیا کہا ؛ ریحانہ بھی تم لوگوں میں شامل ہونے لگی ہے .... اور جمیلی ..... اچھا ہُوا دہی میرے ہم خیال نکلے ..... اچھا بھئی آجاؤں گی .... کنور صاحب سے تو میں نے معذرت کر دی تھی۔ خیر اب اُنہیں ٹیلیفون کئے دیتی ہوں کہ آجاؤں گی ...... جمیلی کا تم فکر مت کرو میں جو کہوں گی وُہ مان لے گا ... چچا جان آج کل کارلے کر شکار کے لئے گئے ہوئے ہیں اس لئے جمیلی اور ریحانہ کو میں ساتھ لیتی آؤں گی راستے میں سے انہیں "پک آپ" کر لوں گی .... وقت کیا ہے .... آٹھ بجے شام ؟ ...ہوں .. .. (جھنجھلا کر) کہہ تو دیا ہے آجاؤں گی اب فون بند بھی کرو گی یا نہیں .... بھائی جان غالباً چھ سات روز تک آئیں گے .... چیریو"

میں ٹیلیفون بند کر کے صوفے پر لیٹ کر ایک نظموں کی کتاب پڑھنے لگی۔ مگر پڑھنے میں دل نہ لگا۔ ستار بجانی چاہی مگر دو دن سے مضراب ہی گم تھی۔ اس لئے یہ ارادہ بھی ترک کر کے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی تو کھڑکی میں کھڑی ہو کر سیٹی بجانے لگی۔ پھر خیال آیا چلو جمیلی کو ٹیلیفون کر دیں۔

"کون بول رہا ہے ...... دیکھو جمیلی صاحب سے ہم بات کریں گے انہیں بلا دو ...... اوہ ! ہیلو جمیلی .... میں زرمینا بول رہی ہوں ...... شکریہ ! ..... موسم تو واقعی بہت دلفریب ہے ..... شام کو کنور صاحب

کے ہاں ڈنر پر جاؤ گے یا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں میں تو جا رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ضرور چلنا پڑے گا تمہیں جمیلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس حکم ہی سمجھ لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنو میں اکیلی ہوں اس لئے اکٹھے چلیں گے ۔ میں تمہیں اور ریحانہ کو راستے میں سے لیتی چلوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ کیا چچا جان شکار سے واپس آ گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو اس وقت بالکل فارغ بیٹھی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوں ہوں کوئی خاص کام نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا تو میں آدھ گھنٹے تک آتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ امی اب بخیریت ہیں معمولی زکام کی تکلیف تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا تو ریحانہ کو بھی بتا دو کہ میں آ رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

فون سے فراغت پا کر میں نے صوفیہ سے کہا کہ شوفر سے کار باہر نکالنے کے لئے کہے اور خود امی سے اجازت لینے چلی گئی۔ ایک دفعہ پھر کمرے میں واپس آ کر میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا لباس اور بال درست کئے اور پھر روانہ ہو گئی۔ کار سے اترتے ہی سیدھی میں ریحانہ کے کمرے کی طرف گئی۔ اور دروازہ کھٹکھٹایا "آ جاؤ" ریحانہ کی آواز آئی۔

میں نے پردہ اٹھایا تو سامنے جمیلی صاحب نظر آئے جو ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے قالین پر لیٹے فلوٹ بجا رہے تھے۔ ریحانہ بیٹھی کسی کو خط لکھنے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی جمیلی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں بھی دیوار کا سہارا لگا کر قالین پر بیٹھ گئی۔ "تو آج شام آپ لوگ دعوت اڑائیں گے" جمیلی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا"

ریحانہ قلم نیچے رکھتے ہوئے بولی" اور آپ کو بھی چلنا ہو گا"

"جناب میں تو دست بستہ معافی چاہتا ہوں بندے کو پہلے ہی بہت کام اور فکر گھیرے رہتے ہیں۔"

میں نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا" تمہیں کام اور فکر گھیرے رہتے ہیں۔ کسی ایک فکر اور کام کا نام تو لو۔ شاید آج کل کوئی نئی شرارت نہ سوجھتی ہو گی۔"

جمیلی آہ بھر کر بولا نام لینے سے کیا فائدہ؛ آج کل لڑائی خوب زوروں پر ہے۔ نہ معلوم کیا انجام ہو گا یہی کیا کم فکر ہے"

ریحانہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا" اور کام کیا کیا ہیں آپ کو؟"

"کوئی ایک ہو تو کہوں"

میں نے کہا" مثلاً"؟

ریحانہ ہنستے ہوئے بولی" مثلاً یہی کہ روز صبح اٹھ کر شیو کرنا اور رات کو سوتے وقت پاجامے میں ازار بند ڈالنا" میں بھی ہنسنے لگی۔

میں فیصلہ کن لہجے میں بولی" خیر ان کاموں کو تو چھوڑو۔ اب تمہیں میرے کہنے کا تو ضرور احترام کرنا پڑے گا"

"خیر اگر یہی حکم ہے تو بندہ سر تسلیم خم کرتا ہے۔ مگر بی زرمینا یہ سب ان لوگوں کے خالی ڈھکوسلے ہیں۔ عمل کرنے کا جذبہ کسی میں موجود نہیں۔"

"اچھا اب تم دونوں پونے آٹھ بجے تیار رہنا۔ میں وقت پر پہنچ جاؤں گی۔ میں اب اجازت چاہتی ہوں امّی نے کہا تھا کہ کھانے کے وقت پر ضرور گھر پہنچ جانا۔"

پورے آٹھ بجے شام جمیلی۔ ریحانہ اور میں کنور صاحب کے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے۔ کمرے میں بڑے بڑے شیشے کے فانوسوں میں سے روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ صوفوں کے پاس چھوٹی چھوٹی تپائیاں پڑی تھیں جن پر چوکلیٹ اور خشک میوے وغیرہ رکھے تھے۔ سنگ مرمر کے بڑے سے لیمپ کے نیچے مصباح اپنے آپ میں مگن بیٹھی تھی آتشدان کے قریب۔ نلنی۔ کامران اور کنور صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نلنی نے خلافِ معمول آج کھدر کی ساری پہن رکھی تھی اور کامران صاحب ایک نہایت قیمتی اور اعلیٰ سوٹ میں ملبوس سر پر گاندھی کیپ رکھے عجب مضحکہ خیز معلوم ہو رہے تھے اُن کا یہ حُلیہ دیکھ کر ریحانہ کو اور مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور جمیلی تو انہیں ٹکٹکی باندھ کر ایسے دیکھنے لگا گویا چڑیا گھر سے کوئی جانور بھاگ کر کنور صاحب کے ڈرائینگ روم میں آبیٹھا ہے۔ صباح آرام کرسی پر بیٹھا اپنی ڈائری میں غالباً اپنی موٹر کے پٹرول کا خرچ دیکھ رہا تھا۔ منصور اور بیگم منصور ایک ہی صوفے پر جلوہ افروز تھے۔ منصور صاحب تو حسبِ معمول اپنا سر کھجانے میں مصروف تھے اور بیگم منصور اپنے جُوڑے کی پنیں درست کر رہی تھیں۔ سبز روشنی کے نیچے اُن کے رسٹ شیڈ میں رنگے ہوئے ناخن ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ کنور رانی ایک ڈھیلی ڈھالی نیلی پتلون اور سفید جیکٹ پہنے مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھیں۔

ہم تینوں نے بلند آواز سے کہا "آداب عرض"

کنور صاحب چونک کر بوکھلائے ہوئے بولے "آیئے آیئے۔ آداب عرض" "آپ اِدھر بیٹھئے ریحانہ خانم" کنور صاحب نے کامران کی ساتھ والی کُرسی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ (ریحانہ ناک بھوں چڑھاتی ہوئی کامران کے پاس جا بیٹھی۔

"زرمینا خانم آپ اِدھر تشریف رکھیئے۔ مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے میرے ہاں آنے کے لئے وقت نکال لیا"

مجھے صباح کے پاس جگہ ملی جو مجھے دیکھ کر فوراً اپنی ڈائری بند کرتے ہوئے بہت زیادہ مہذب بننے کی کوشش کرنے لگا۔

جمیلی اپنے دونوں ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے باندھ کر منصور صاحب کے قریب ایک سٹول پر بیٹھ گیا اور شرارت بھری نظروں سے کامران کو دیکھنے لگا۔

ہمارے بیٹھتے ہی مہذب ملازموں نے چاندی کی تشتریوں میں رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے شیشے کے گلاسوں میں انار اور سنگترے کا رس پیش کیا۔

کنور صاحب ہمیں مخاطب کر کے کہنے لگے۔

"میرا ارادہ ایک سوشلسٹ پارٹی بنانے کا ہے۔ اُن سرمایہ داروں کے خلاف جو غریبوں کا خون چوس کر اُن ہی

ے گاڑھے پسینے کی کمائی سے عیش کرتے ہیں"

جمیلی سنجیدہ انداز میں بولا "جیل جانے کے لئے شاید تمہاری طبیعت مچل رہی ہے"

کنور صاحب بگڑ کر بولے "تم نے عمر بھر کبھی کوئی سیدھی بات کی ہے؟ اُلو کہیں کا"

صباح نے آہستہ سے کہا "ہش۔ لیڈیز بیٹھی ہیں"

کنور صاحب جھینپ کر بولے "اوہو۔ معاف کیجئے" تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ سرمایہ داری کے خلاف بغاوت کر کے ہمیں تمام لوگوں میں مساوات قائم کرنی چاہئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کے سب لوگ درجے میں برابر ہو جائیں اور ہم سب نوجوانوں کو چاہیئے کہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک غریبوں اور مزدوروں کی حالت بہتر کرنے کی کوشش میں بہانے سے دریغ نہ کریں۔ (جوش سے) کس قدر ظلم کی بات ہے کہ ایک ہی جیسے انسان ہو کر کچھ لوگ تو عالیشان کوٹھیوں اور محلوں میں رہیں اور اُن کے بھائیوں کو ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی تو کیا تن ڈھانکنے کو کپڑا بھی نصیب نہ ہو"

کنور صاحب نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو گئے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "کتنے زرّیں خیالات ہیں"۔ جمیلی نے کامران کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری۔

مصباح نے بھی اپنی ریشمی ساڑھی سنبھالتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر میں کنور صاحب کی بہت زور و شور سے تائید کی پھر کھانے کی اطلاع پاتے ہی سب کھانے کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ میں غریبوں کے طرفدار اور سوشلسٹوں کے لیڈر کے کھانے کے کمرے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کھانے کی سیاہ پولشڈ میز، چاندی کے بیش قیمت سامان سے لدی ہوئی تھی تقریباً نصف درجن ملازم صاف ستھرے لباس میں خدمت کے لئے کھڑے تھے کھانے کی میز پر کامران کے پاس اپنی سیٹ دیکھ کر میرا دل ڈوب سا گیا۔ ریحانہ فتح مندانہ انداز سے میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی کنور صاحب کے پاس جا بیٹھی۔ مصباح جو ایک پُرغرور انداز سے منصور صاحب کے ساتھ آ کر بیٹھی تو اُس بیچارے نے گھبرا کر اپنا سر کھجانا بند کر دیا۔ جمیلی کنور رانی اور نلنی کے درمیان بیٹھا اور دونوں کو اپنی پُر مذاق سنجیدگی سے خوش کرنے لگا۔ کامران میرے قریب بیٹھا بہ آواز بلند چمچے سے سُوپ پی رہا تھا۔ میرے لئے اُس کی بدتمیزی کو برداشت کرنا مُشکل ہو گیا۔ میں اپنا چمچہ مُنہ تک لے جاتی مگر کامران کی "سُر سُر" سن کر دل خراب ہو جاتا۔ ٹھنڈی سانس لے کر جمیلی کی طرف دیکھا۔ جس نے جواب میں مُسکرا کر شرارت سے اپنی بائیں آنکھ کا کونہ دبا دیا اور ریحانہ کو تو اپنی بےبسی پر ہنستے دیکھ کر میرا دل جل کر خاک ہو گیا۔

کھانے کی میز پر بھی وہی سوشلزم پر بحث ہوتی رہی۔

جمیلی نے ایک دم طنزیہ لہجے میں کنور صاحب سے سوال کیا "لیکن آپ اور مسٹر کامران کی جو ذاتی تین تین۔ چار چار کاریں ہیں وُہ کب غریبوں کے کام آئیں گی"

"اچھا اب تم دونوں پونے آٹھ بجے تیار رہنا۔ میں وقت پر پہنچ جاؤں گی۔ میں اب اجازت چاہتی ہوں اُمّی نے کہا تھا کہ کھانے کے وقت پر ضرور گھر پہنچ جانا۔"

پورے آٹھ بجے شام جمیلی۔ ریحانہ اور میں کنور صاحب کے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے۔ کمرے میں بڑے بڑے شیشے کے فانوسوں میں سے روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ صوفوں کے پاس چھوٹی چھوٹی تپائیاں پڑی تھیں جن پر چوکلیٹ اور خشک میوے وغیرہ رکھے تھے۔ سنگ مرمر کے بڑے سے لیمپ کے نیچے مصباح اپنے آپ میں مگن بیٹھی تھی آتشدان کے قریب۔ نلنی۔ کامران اور کنور صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نلنی نے خلافِ معمول آج کھدر کی ساری پہن رکھی تھی اور کامران صاحب ایک نہایت قیمتی اور اعلیٰ سوٹ میں ملبوس سر پر گاندھی کیپ رکھے عجب مضحکہ خیز معلوم ہو رہے تھے اُن کا یہ حلیہ دیکھ کر ریحانہ کو اور مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور جمیلی تو اُنہیں ٹکٹکی باندھ کر ایسے دیکھنے لگا گویا چڑیا گھر سے کوئی جانور بھاگ کر کنور صاحب کے ڈرائینگ روم میں آبیٹھا ہے۔ صباح آرام کرسی پر بیٹھا اپنی ڈائری میں غالباً اپنی موٹر کے پٹرول کا خرچ دیکھ رہا تھا۔ منصور اور بیگم منصور ایک ہی صوفے پر جلوہ افروز تھے۔ منصور صاحب تو حسبِ معمول اپنا سر کھجانے میں مصروف تھے اور بیگم منصور اپنے جُوڑے کی پنیں درست کر رہی تھیں۔ سبز روشنی کے نیچے اُن کے رسٹ شیڈ میں رنگے ہوئے ناخن ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ کنور رانی ایک ڈھیلی ڈھالی نیلی پتلون اور سفید جیکٹ پہنے مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھیں۔

ہم تینوں نے بلند آواز سے کہا "آداب عرض"

کنور صاحب چونک کر بوکھلائے ہوئے بولے "آیئے آیئے۔ آداب عرض" "آپ اِدھر بیٹھیئے ریحانہ خانم" کنور صاحب نے کامران کی ساتھ والی کُرسی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ریحانہ ناک بھوں چڑھاتی ہوئی کامران کے پاس جا بیٹھی۔

"زرمینا خانم آپ اِدھر تشریف رکھیئے۔ مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے میرے ہاں آنے کے لئے وقت نکال لیا"

مجھے صباح کے پاس جگہ ملی جو مجھے دیکھ کر فوراً اپنی ڈائری بند کرتے ہوئے بہت زیادہ مہذب بننے کی کوشش کرنے لگا۔

جمیلی اپنے دونوں ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے باندھ کر منصور صاحب کے قریب ایک سٹول پر بیٹھ گیا اور شرارت بھری نظروں سے کامران کو دیکھنے لگا۔

ہمارے بیٹھتے ہی مہذب ملازموں نے چاندی کی تشتریوں میں رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے شیشے کے گلاسوں میں انار اور سنگترے کا رس پیش کیا۔

کنور صاحب ہمیں مخاطب کر کے کہنے لگے۔

"میرا ارادہ ایک سوشلسٹ پارٹی بنانے کا ہے۔ اُن سرمایہ داروں کے خلاف جو غریبوں کا خون چوس کر اُن ہی

کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے عیش کرتے ہیں"

جمیلی سنجیدہ انداز میں بولا "جیل جانے کے لئے شاید تمہاری طبیعت مچل رہی ہے"

کنور صاحب بگڑ کر بولے "تم نے عمر بھر کبھی کوئی سیدھی بات کی ہے؟ اُلو کہیں کا"

صباح نے آہستہ سے کہا "ہش۔ لیڈیز بیٹھی ہیں"

کنور صاحب جھینپ کر بولے "اوہو۔ معاف کیجئے" تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ سرمایہ داری کے خلاف بغاوت کر کے ہمیں تمام لوگوں میں مساوات قائم کرنی چاہئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کے سب لوگ درجے میں برابر ہو جائیں اور ہم سب نوجوانوں کو چاہیئے کہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک غریبوں اور مزدوروں کی حالت بہتر کرنے کی کوشش میں بہانے سے دریغ نہ کریں۔ (جوش سے) کس قدر ظلم کی بات ہے کہ ایک ہی جیسے انسان ہو کر کچھ لوگ تو عالیشان کوٹھیوں اور محلوں میں رہیں اور اُن کے بھائیوں کو ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی تو کیا تن ڈھانکنے کو کپڑا بھی نصیب نہ ہو"

کنور صاحب نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو گئے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "کتنے زرّیں خیالات ہیں"۔ جمیلی نے کامران کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری۔

مصباح نے بھی اپنی ریشمی ساڑھی سنبھالتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر میں کنور صاحب کی بہت زور و شور سے تائید کی پھر کھانے کی اطلاع پاتے ہی سب کھانے کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ میں غریبوں کے طرفدار اور سوشلسٹوں کے لیڈر کے کھانے کے کمرے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کھانے کی سیاہ پولشڈ میز، چاندی کے بیش قیمت سامان سے لدی ہوئی تھی تقریباً نصف درجن ملازم صاف ستھرے لباس میں خدمت کے لئے کھڑے تھے کھانے کی میز پر کامران کے ساتھ اپنی سیٹ دیکھ کر میرا دل ڈوب سا گیا۔ ریحانہ فتح مندانہ انداز سے میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی کنور صاحب کے پاس جا بیٹھی۔ مصباح جو ایک پُر غرور انداز سے منصور صاحب کے ساتھ آ کر بیٹھی تو اُس بیچارے نے گھبرا کر اپنا سر کھجانا بند کر دیا۔ جمیلی کنور رانی اور نلنی کے درمیان بیٹھا اور دونوں کو اپنی پُر مذاق سنجیدگی سے خوش کرنے لگا۔ کامران میرے قریب بیٹھا بہ آواز بلند چمچے سے سُوپ پی رہا تھا۔ میرے لئے اُس کی بدتمیزی کو برداشت کرنا مُشکل ہو گیا۔ میں اپنا چمچہ مُنہ تک لے جاتی مگر کامران کی "سُر سُر" سن کر دل خراب ہو جاتا۔ ٹھنڈی سانس لے کر جمیلی کی طرف دیکھا۔ جس نے جواب میں مُسکرا کر شرارت سے اپنی بائیں آنکھ کا کونہ دبا دیا اور ریحانہ کو تو اپنی بے بسی پر ہنستے دیکھ کر میرا دل جل کر خاک ہو گیا۔

کھانے کی میز پر بھی وہی سوشلزم پر بحث ہوتی رہی۔

جمیلی نے ایک دم طنزیہ لہجے میں کنور صاحب سے سوال کیا "لیکن آپ اور مسٹر کامران کی جو ذاتی تین تین۔ چار چار کاریں ہیں وُہ کب غریبوں کے کام آئیں گی"

"میں کل ۔۔۔۔۔۔ کل انہیں ایک دم بیچ دوں گا"

کامران نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے تیزی سے بولا "میں آئندہ عام لوگوں کی طرح بائیسکل کی سواری کیا کروں گا۔"

جمیلی پھر مسکراتے ہوا بولا "لیکن آپ کے لباسوں، آپ کے پُرتکلف کھانے اور ان کمروں کی پُرتکلف آرائش سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ واقعی غریبوں اور مزدوروں کے حامی ہیں۔ اور اپنی سکیموں پر ضرور ہی عمل کریں گے۔"

کنور صاحب چڑ کر بولے "جمیلی تم تو غریبوں سے بالکل باغی معلوم ہوتے ہو۔ کیا غریبوں کو بھوکا اور ننگا دیکھ کر تمہارا دل نہیں کڑھتا کڑاکے کی دھوپ اور تیز سردی ہیں وہ دن رات محنت کر کے بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکتے۔ غربت نے اُن کے لطیف احساسات کو بُری طرح کچل دیا ہے۔ اور بہت سے شریف النفس انسانوں کو اسی غربت نے بھیک مانگنے پر مجبور کر کے سوسائٹی میں ذلیل کر دیا ہے۔ امیر لوگ تو روپے کے انباروں میں بیٹھ کر ایسی باتوں کو معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ اگر ہم آج کل کے نوجوان ان باتوں پر غور کرنے کی کوشش نہ کریں گے تو اور کون کرے گا۔ ہم سب کو مل کر اب عملی قدم اُٹھانے چاہئیں ہمیں اب بغاوت کرنی چاہیئے۔ حکومت کے خلاف، سرمایہ داروں کے خلاف۔ ہم خوشی سے قید ہونا قبول کریں گے لیکن اپنے اس بلند ارادے سے ہرگز نہ پھریں گے۔ (جوش سے) بتائیے کون میرا ساتھ دے گا"

جمیلی اور میرے سوا سب چیخ اُٹھے "ہم خوشی سے تمہارا ساتھ دیں گے" جمیلی کے لبوں پر ایک لطیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

کنور صاحب کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو رہا تھا۔ کمرہ تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ ایک منٹ۔ دو منٹ۔ تین منٹ مگر تالیوں کا شور ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ کامران کو دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے تالی بجانا کوئی مہلک بیماری ہے اور اُس بیماری نے یک دم کامران پر حملہ کر دیا ہے میں نے دل میں کہا۔ کاش ریل کے ڈبوں کی طرح اس کمرے میں بھی خطرے کی کوئی زنجیر ہوتی تو میں کھینچ لیتی۔

تالیوں کا شور بند ہو گیا اور میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ کھانے کے بعد سب ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ اور ہنسی مذاق کی باتیں ہونے لگیں۔ سوشلزم کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کے متعلق عملی تدابیر اگلے اجلاس کے لئے ملتوی کر دی گئیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے جانے کی اجازت چاہی۔ کنور اور کنورانی ہمیں باہر کار تک پہنچانے آئے۔

"اوہ ۔۔۔۔۔۔" باہر اندھیرے میں مجھے کسی کا دھکا لگا اور جمیلی کے بازوؤں میں گر پڑی۔

جمیلی گھبراہٹ سے مجھے سنبھالتے ہوئے بولا "کیا ہوا زرمینا؟" کنورانی نے فوراً پورچ کی بجلی جلا دی۔ ہمارے قریب ہی ایک بھکاری کھڑا تھا۔ پھٹے پُرانے کپڑے۔ تھکی ہوئی سُرخ آنکھیں تیز سردی میں اُس کا کمزور جسم کانپ رہا

تھا۔ اُس کے ہاتھ میں وہ سیب کے چھلکے تھے جو ملازموں نے باہر پھینک دے تھے اور وہ انہیں کھا رہا تھا۔

کنور صاحب اُس کی دُبلی پتلی ٹانگوں پر اپنے پاؤں سے ٹھوکر مارتے ہوئے بولے "تم اندھے ہو گئے ہو۔ دیکھ کر کھڑا نہیں ہُوا جاتا۔ اور یہاں تم اس وقت کیا کرنے آئے ہو"

میں کانپ کر بولی۔ اُف کنور صاحب "ایسا نہ کیجئے۔"

اُس نے نحیف آواز میں کہا "میں بھوکا ہوں" تین دن سے بُھوکا ہوں۔ غربت اَور بے چارگی سے مجبور ہو کر آج میں بھیک مانگنے آیا ہوں۔ میں نے بھی اچھے دن دیکھے ہیں۔ مگر گردشِ فلک نے اس حالت پر پہنچا دیا ہے۔ میں کچھ نہیں چاہتا صرف ایک وقت کا کھانا دے دیجئے"

کنور صاحب غصے سے دیوانے ہو رہے۔ انہوں نے ملازم کو بُلا کر حکم دیا کہ اُسے دھکّے دے کر باہر نکال دیا جائے۔ ایسے بھک منگوں کا کوٹھی میں کیا کام۔

جمیلی نے خشمگیں لہجے میں ملازم سے کہا "ٹھہر جاؤ"، اور پھر ایک روپیہ اور اپنا کوٹ اُتار کر اُس کی طرف پھینکتے ہوئے بولا "جاؤ اس کا جاکر کھانا کھالو۔ اَور یہ کوٹ پہن لو۔ بہت سردی ہے۔"

اُس نے جھک کر وہ کوٹ اُٹھایا اور روپیہ اپنی مُٹھی میں دبا لیا۔ اُس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سُرخ ہو گئیں اور لب کانپنے لگے۔ اُس نے ہم سب کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کوئی خوفناک ارادہ کر رہا ہو۔ اُس نے اپنی مُٹھی میں دبائے ہوئے روپے کو غور سے دیکھا۔ معاً اُس کی نظریں جمیلی کی طرف اُٹھیں۔ دو آنسو ڈھلک کر نیچے گر گئے اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

جمیلی نے کنور سے ہاتھ ملا کر مسکراتے ہوئے کہا "بہت بہت شکریہ کنور صاحب! اب اجازت دیجئے خدا آپ کو اپنے بلند ارادوں میں کامیاب کرے" وہ نظریں جھکائے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔

میں کار کا شیشہ اوپر چڑھاتے ہوئے بولی "تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی ہے جمیلی"

جمیلی میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے دباتے ہوئے بولا "بالکل نہیں"، تم نے دیکھ لیا زرمینا سوشلسٹوں کے لیڈر کو۔ یہ سب باتیں نام پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔ غریبوں کی مدد کرنے کا صحیح جذبہ کبھی ان لوگوں میں نہیں ہوتا۔ اور آج کل کے رئیس زادوں کو جب تعلیم سے فارغ ہو کر مقابلے کے امتحانوں میں بھی پے بہ پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ سوشلسٹ بن کر نام پیدا کرنا اپنے لئے فخر سمجھتے ہیں۔ سوشلزم کی آڑ میں ڈنر، لنچ اور ڈرنک پارٹیز دے کر اپنا دل بہلانا اِن کا شیوہ ہے۔ میں دیکھوں گا جب یہ نلنی، مصباح، بیگم منصور اور ہماری بہن ریحانہ صاحبہ اپنے قیمتی لباس،

زیور، ٹوئیلٹ اور میک اپ" کے قیمتی سامان کا استعمال کرنا بند کردیں گی اور ہمارے کنور صاحب اور اُن کے ساتھی اپنے عیش و عشرت کے سب سامان چھوڑ دیں گے۔

ریحانہ موٹر کی کھڑکی سے مُنہ نکال کر خاموش بیٹھی رہی۔ میں کار سے اُترتے ہی سیدھی اپنے کمرے میں گئی۔ کمرے میں رات کی ہلکی سبز روشنی جل رہی تھی۔ میرے پلنگ کے قریب نیچے فرش پر صوفیہ لیٹی ہوئی تھی۔

میں نرمی سے بولی "صوفیہ تم ابھی تک سونے کے لئے کیوں نہیں گئیں۔ تمہیں معلوم ہے گیارہ بجنے والے ہیں!"

وُہ میرا کوٹ اُتارتے ہوئے بولی "آپ کا لباس تبدیل کرانا تھا۔ اسی انتظار میں بیٹھی تھی" اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل معلوم ہو رہی تھیں۔ پھر وہ جھک کر میرا جوتا اتارنے لگی۔ اُس کی ٹھنڈی اور نازک اُنگلیاں میرے ننگے پاؤں سے چھو گئیں۔ میں کانپ اُٹھی۔

"میں خود اپنے کپڑے تبدیل کرلوں گی۔ جاؤ تم جاکر سو جاؤ"

"جی نہیں ..... آپ کو تکلیف ہو گی" وہ سر جُھکا کر بولی۔

"صوفیہ میری بہن۔ میں اپنا کام خود کرلوں گی۔ جاؤ اب جاکر سو جاؤ۔ پھر میں اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر بولی جاؤ!"

بے چاری لڑکی! اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ خاموشی سے باہر چلی گئی۔

میرا جسم تھکان سے چُور ہو رہا تھا میں صوفے پر گر گئی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ بارہ، ایک، دو، رات کے تین بج گئے۔ میری بے خواب آنکھیں چھت پر گڑی ہوئی تھیں مجھے صبح اپنے مارلیڈ نہ ملنے پر مچل جانے کا قصہ یاد آگیا اور پھر میں نے کتنی بری طرح جمال اور صوفیہ کو جھڑکا تھا۔ اس لئے کہ مجھے ایک دن مارلیڈ کھانے کو نہ ملا اور اُن غریبوں نے شاید کبھی چکھا بھی نہ ہو اور پھر صوفیہ کتنی پیاری اور غریب لڑکی ہے لیکن میں سارا دن اُسے جھڑکتی رہتی ہوں۔ اس لئے کہ وہ غریب ہے اور میری خادمہ ہے۔ ہم دونوں ایک ہی جیسی لڑکیاں ہیں مگر ہمارے درجوں میں اتنا فرق کیوں ہے؟ معاً مجھے اُس بھکاری کی انگاروں کی طرح سُرخ آنکھیں یاد آگئیں۔ وہ ہمیں اس قدر خوفناک نظروں سے گھُور رہا تھا۔ وہ کیا سوچ کر ایک دم باہر بھاگ گیا تھا۔ ہمیں جیسا اِنسان ہو کر وُہ کیوں اس قدر مفلوک الحال تھا۔ اُس نے کیا گُناہ کیا ہے جو وہ اس قدر سردی میں بھوکا ٹھٹھرتا پھرتا ہے اور ہم گرم کپڑوں اور گرم لحافوں میں آتش دانوں کے قریب دبکے پڑے رہتے ہیں۔

آہ اس بھکاری کے دل میں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ وُہ اِس دنیا کو آگ لگادے ..... ایسی آگ جس سے یہ ساری دُنیا جل کر بھسم ہو جائے!

"اے خُدا تو کہاں ہے؟" میں نے ایک سسکی لے کر کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

نجمہ رحمت اللہ بی-اے
(لاہور)

ساقی سے

(سانیٹ)

اُٹھا ساغر، کہ دل ہر بیم سے ہو پاک، اے ساقی
کہ میں ٹکر "سماجِ" خوگرِ بیداد سے لے لوں
عُدوئے عدل سے، جلّاد سے، صیّاد سے نپٹوں۔
پلا وُہ مے کہ دل ہو طاہر و بیباک، اے ساقی!

ہر اِک جرعے میں جرأت ہو ہر اک قطرے میں قدرت ہو
کہ حرصِ مخفیٔ مُلّا و پنڈت کو کروں عُریاں
اور اِن کے مُنہ پہ کہہ دوں، سانپ ہو تم صورتِ اِنساں،
شرابِ معرفت میں وُہ طہارت ہو، وُہ ہمّت ہو۔

فضائے دہر میں اُٹھا کریں گو سینکڑوں طوفاں،
نہ چھوڑوں میں کسی صورت میں بھی اِخلاص کا دامن
بچوں اُن سے ہے جن کو زور و ریا و مکر و فن کا فن،
مجھے دے جوہرِ انسانیت، اے ساقیٔ عرفاں!
جہاں میں پرچمِ اِنسانیت لہرا سکوں ساقی!
جہاں کو عظمتِ اِنسانیت دکھلا سکوں ساقی!

منوہر لال ہادی

اصغر کی یاد میں

اصغر کی کتنی چیزیں میرے پاس پڑی ہیں۔ معمولی بھی ہیں تو مجھے غیر معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ چیزوں کو دیکھتا ہوں کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوں، خطوں کو پڑھتا ہوں۔ اُس کے موتی بھرے خطوں پر پھر نظر ڈالوں گا اس وقت کاغذات میں سے ایک خط حفیظ ہوشیارپوری کا نکل آیا ہے جو اُنھوں نے ۲۴ مارچ ۱۹۳۸ء کو اصغر کے ولایت جانے سے آٹھ نو روز پہلے مجھے لکھا۔ لکھتے ہیں: "اس موقع پر مجھے صرف میاں اصغر کے متعلق کچھ ذکر کرنا ہے، آج سے کچھ روز پہلے میں نے جب اُن کے عزمِ انگلستان" کی خبر سُنی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور آپ کے ارشاد کی تعمیل کے طور پر میں نے پڑھانا بھی شروع کر دیا، میں پہلے ہی اُن کے اخلاق سے کافی متاثر ہو چکا تھا، اب اُن سے ملنے کا زیادہ موقع ملا۔ تعلیم دینے کے سلسلے میں مجھے بڑے بڑے خاندانوں کے اکثر نوجوانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے اصغر سا کسی کو نہ پایا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اُن کا ذاتی وصف ہے یا آپ کی تربیت کا اثر غالباً دونوں باتیں ہوں گی۔ بعض دفعہ فرصت کے اوقات میں وہ میرے ساتھ بے انتہا ہمدردی کا اظہار کرتے اور مستقبل کے متعلق مجھے مفید مشورے دیتے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اُنھوں نے مجھ سے کیا کچھ سیکھا، البتہ میں اس بات کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے اُن سے بہت کچھ حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ساتھ اُن کے "شاگردانہ تعلقات" تقریباً "دوستانہ تعلقات" کی حد تک جا ملے تھے۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ "میں انگلستان جا رہا ہوں۔ آپ میرے اُستاد ہیں، کچھ نصیحت کیجئے"۔ اس فقرے کے جواب میں فارسی کی ایک نظم ارسال کر رہا ہوں جو خوشی اور افسوس کے اُن متضاد جذبات کی آئینہ دار ہے جو اُن کی روانگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ میں نے آج تک کسی کی ذات کی تعریف میں کوئی نظم نہیں لکھی ..... آپ اسے جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ میں اسے کاتب سے لکھوا کر فریم میں لگوا کر اصغر کو دُوں گا تاکہ وہ اسے میری یادگار کے طور پر اپنے ساتھ لے چلیں۔ نظم فارسی میں اس لئے کہی کہ کچھ تو جذبات نے خود بخود فارسی الفاظ مہیّا کر دیئے اور کچھ اس لئے بھی کہ میں اصغر کو فارسی پڑھایا کرتا تھا۔ اس موقع پر مجھے نظم لکھنا اس لئے بھی ضروری معلوم ہوا کہ اصغر صاحب تین سال کے لئے جا رہے ہیں۔ میں خدا جانے اُس وقت کہاں ہوں گا۔ میرا یہ فرض تھا کہ اُن کی روانگی سے پیشتر اُن کی موجودگی میں اپنے جذبات کا اظہار کر دوں ..... آپ کے ساتھ کام کرنے میں مجھے بے حد مسرت حاصل ہوتی رہی اور آپ کے تمام بچے بھی اس خلوص اور محبت سے پیش آتے رہے کہ میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ یہ ماحول جس میں میں رہتا اور کام کرتا ہوں میرا اپنا گھر ہے ..... آپ میرا خط اور یہ نظم دونوں چیزیں اُنھیں دکھا سکتے ہیں"۔

خط موجود ہے۔ فریم کی ہوئی نظم ایک ٹوٹے ہوئے فریم میں لگی ہوئی انگلستان سے اصغر کی واپس آئی ہوئی چیزوں میں

سے نکلی۔ "اُستاد" لاہور میں ہیں ماں باپ بھی بہن بھائی بھی لیکن خود اصغر کہاں؟ وہ فریم ٹوٹ گیا اب صرف کچھ تصویریں باقی ہیں کچھ دیواروں پر کچھ دل میں۔ اب اِس نظم کی خوبی اور قیمت یہ ہے کہ وطن سے ہزاروں کوس دُور آکسفورڈ کی علمی فضا میں اصغر کی نظریں گاہے گاہے اِس خوبصورتی سے لکھی ہوئی "نذرِ محبت" پہ پڑتی ہوں گی! یہ نظم اُس کے جیتے جی شائع نہ ہوئی اب شائع ہوتی ہے کہ اب اس کے معنی کچھ اور ہیں:-

نذرِ محبت

عزیزِ محترم میاں اصغر بشیر صاحب (عازم انگلستان) کے نام

شادم از رفتنِ تو سُوئے فرنگ اے اصغر ۔۔۔ گرچہ ایں رسم وفانیست کہ بے ما باشی

فرصتم دہ کہ دو سہ حرفِ دُعا می گویم ۔۔۔ کاش ازیں ہا تو ہم آغوشِ تمنّا باشی

زندگی نیست بجز "حُسنِ یقیں" "ذوقِ عمل" ۔۔۔ زیں صفت ہا تو سرافراز بہ دُنیا باشی

پست گردد بہ نگاہِ تو ہر آں اوج کہ ہست ۔۔۔ ہمسرِ اوجِ مہ و مہر و ثریّا باشی

حُسنِ خُلقِ تو بود دامِ وفا بہرِ عدو ۔۔۔ دوست را روشنئ دیدۂ بینا باشی

چارہ سازی زنظر قلبِ جگر ریشاں را ۔۔۔ خستگاں را بہ جہاں راحتِ دلہا باشی

گرمئ صحبتِ یاراں نہ فراموش کنی ۔۔۔ چوں در آں شہرِ خنک انجمن آرا باشی

یادِ احبابِ وطن یادِ انیسِ تو مدام ۔۔۔ کہ تو در غربتِ افرنگ نہ تنہا باشی

یادِ شیرینِ تو از دل نرود تا باشم ۔۔۔ تو نہ غافل شوی یک لمحہ زمن تا باشی

نغمۂ حافظ و خیام شنیدی از من
نیست ایں شرطِ مروّت کہ رمیدی از من

آخری شعر کے متعلق نیچے ایک نوٹ لکھا ہے کہ "اصغر مجھ سے فارسی پڑھا کرتے تھے۔" اس سے بھی نیچے ہاتھ سے یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

صفحۂ دل پہ جو مقصود تھا گہرا نقشہ ۔۔۔ دیر تک شکل تمہاری دمِ رُخصت دیکھی (جوش)

وُہ جنہوں نے اصغر کو دیکھا وُہ جو اُس سے ملے اور وہ جو جانتے ہیں کہ اُنتیس برس کی عمر میں اس نے کیا کچھ سیکھا کیا کچھ کیا اور پھر کس طرح وُہ چل دیا شاید صرف وہی اِس "حُسنِ خُلق"، اور "روشنئ دیدہ" اس "ذوقِ عمل" اور "راحتِ دل" اس "غربتِ افرنگ" و "شرطِ مروت"، اور اِس "ہمسرِ اوجِ مہ و مہر و ثریا" کے پورے معنی سمجھ سکتے ہیں!

بشیر احمد

چند غزلیں اور چند نظمیں

غزل

وُہ آئے اس طرح شانِ خودی سے بے خبر ہو کر
چمن کا ذرّہ ذرّہ جھوم اُٹھا برگ و بر ہو کر

خدا جانے شعاعِ حُسن و برقِ طور کیا شے ہے
وُہ آتے ہیں مگر اِک جلوۂ شام و سحر ہو کر

اگر اے جذبۂ مشتاق! منزل تک رسائی ہو
یہ کہنا "رہ گیا ہوں راہ میں گردِ سفر ہو کر"

عنایت گر یہی ہے اُس نگاہِ شعلہ ساماں کی
بھڑک اُٹھے نہ اِک دن ہر نفس برق و شرر ہو کر

نکل سکتا ہے سینے سے کہیں تیرِ خلش حرماںؔ
یہ مدت سے نہاں ہے مرہمِ زخمِ جگر ہو کر

حرماں خیرآبادی

بہشتِ بریں

غریبوں کی دُنیا نشاط آفریں ہے
یہ دُنیا کدُورت کی دُنیا نہیں ہے

یہ دُنیا نہیں ہے عداوت کی دُنیا
یہ دُنیا ہے یکسر محبّت کی دُنیا

یہ دُنیا پراؤں کا غم کھانے والی
یہ دُنیا ہے دُنیا کے کام آنے والی

یہ دُنیا ہے خالی فریب و دغا سے
یہ دُنیا ہے معمور صدق و صفا سے

یہ دُنیا ہے وُہ جس میں مہر و وفا ہے
یہ دُنیا ہے وُہ جس میں خوفِ خدا ہے

یہ دُنیا ہے لاریب کینوں سے خالی
یہ دُنیا رذیلوں، کمینوں سے خالی

یہ ایماں ہے میرا، یہ میرا یقیں ہے
غریبوں کی دُنیا بہشتِ بریں ہے

امر چند قیس

غزل

مرتے ہیں تو کچھ موت کی پروا نہیں کرتے
جب تو نے دیا درد مداوا نہیں کرتے

[illegible] باد صبا سامنے میرے
مرغانِ قفس کو تو ستایا نہیں کرتے

صیاد غضب تجھ کو نہ آئے تو کروں کیا
ہم اب گل و گلشن کی تمنا نہیں کرتے

ہاں کاتب تقدیر سے یک گونہ شکایت
ہم [illegible] شکوہ نہیں کرتے

گو ملتے ہے [illegible]

بیٹھے ہیں کنورؔ گوشۂ تنہائی میں خاموش
ہم اُس کی جفاؤں کو بھی رسوا نہیں کرتے
کنور کول کنورؔ

مسائلِ لطیف

مے میں ڈوبے ہوئے جذبات کی بُو آتی ہے
میرے شعروں سے خرابات کی بُو آتی ہے

رہبروں کو مرے رستے سے ہٹا دو یک لخت
اِن سے فرسودہ روایات کی بُو آتی ہے

شمع کی لَو پہ گرا ہو گا پتنگا کوئی
بزم سے گرمیٔ جذبات کی بُو آتی ہے

ابر اُفق سے ابھی اُٹھا بھی نہیں اے ساقی
یہ کہاں سے مجھے برسات کی بُو آتی ہے

تیری مہکی ہوئی زلفوں کے سہانے پن سے
ایک افسانہ سرارات کی بُو آتی ہے

عشق سے جتنا برستا ہے محبت کا سرُور
عقل سے اُتنی فسادات کی بُو آتی ہے

یہ نہیں علمِ محبت کسے کہتے عدمؔ!
ہاں مگر دل سے کسی بات کی بُو آتی ہے
عبدالحمید عدمؔ

غزل

ابتدا ہوتی ہے دل کی ایک ٹھنڈی آہ سے
مبتدی لیتا ہے پہلے درس بسم اللہ سے

روشنی آتی ہے سیدھی مرکزِ انوار سے
شمع سے دل اخذ کرتا ہے نہ مہر و ماہ سے

راہ کے جھگڑے ہیں ورنہ ایک ہی مقصود تک
سب پہنچنا چاہتے ہیں اپنی اپنی راہ سے

راہِ الفت میں امیدِ رہبری احباب سے!
یہ بھی اِک سر پھوڑنا ہے سنگ ہائے راہ سے

راہ اپنی سب بنا لیتے ہیں حاجیؔ عشق میں
شمع تک جاتا ہے پروانہ خود اپنی راہ سے
عبدالکریم حاجیؔ

علامہ اقبالؒ

اے کہ تیرے دم سے تھی آرائشِ بزمِ سخن
گرم تھا تیرے سبب سے عرصۂ رزمِ سخن

تُو نے کھولے دہر پر اسرارِ آئینِ حیات
ملک و ملت کے لئے تھی ابرِ رحمت تیری ذات

شاعری میں تو نے برپا کر دیا اِک انقلاب
تیرا اِک اِک شعر ہے اسرارِ فطرت کی کتاب

تیری شمعِ شعر کو دُنیا بجھا سکتی نہیں
اے مسیحِ وقت تجھ کو موت آ سکتی نہیں

تجھ کو قدرت کی طرف سے دی گئی فکرِ جمیل
شاعری تیری حقیقت میں تھی پیغامِ خلیل

مشرقی انداز بھی ہے مغربی انداز بھی
شاعری میں تیری پنہاں سوز بھی ہے ساز بھی

ہے رجائیت کا حامل تیرا پاکیزہ کلام
شاعری اور فلسفے کا واقعی تو ہے امام

ہائے اے اقبال! تیری ذات تھی فخرِ وطن
تجھ سے زندہ تھا گلستانِ ادب باغِ سخن

نقشِ عظمت کو ترے دُنیا مٹا سکتی نہیں
بھُولنے پر بھی تجھے ملت بھُلا سکتی نہیں

عظیم حیدرآبادی

غزل

ترے جلووں کی محویت کا راز افشا کرے کوئی
جدھر دیکھے تو، پھر وں کیوں اُدھر دیکھا کرے کوئی

نجات اب عمر بھر قیدِ قفس سے مل نہیں سکتی
تصوّر ہی میں شاخِ آشیاں دیکھا کرے کوئی

حجاب اندر حجاب اُن کی تجلّی دیکھ سکتا ہے
مگر اُس وقت جب اپنی نظر پیدا کرے کوئی

نہ جینا اپنے بس کا ہے۔ نہ مرنا اپنے بس کا ہے
تمہیں بتلاؤ، ان مجبوریوں میں کیا کرے کوئی

مجھے کرنا پڑے گا خون جذباتِ محبّت کا
وُہ نظریں کہہ رہی ہیں کیوں ہمیں رسوا کرے کوئی

یہی جوہر وفا کے ہیں۔ یہی شانِ جوانمردی
زمانے کے ستم ہنستے ہوئے جھیلا کرے کوئی

میں بندہ ہوں جنونِ بندگی کم ہو نہیں سکتا
مرے سجدوں کو اِستغنا سے ٹھکرایا کرے کوئی

میں دیوانہ نہیں کمتر میں دیوانہ نہیں کمتر
سمجھتا ہے تو دیوانہ مجھے سمجھا کرے کوئی

کمتر صدیقی اوجینی

سپاہی

سو گیا بانکا سپاہی سو گیا۔ نیند کی مدہوشیوں میں کھو گیا
روحِ پژمردہ کو بہلاتا ہُوا
زندگی کی راگنی گاتا ہُوا
اِک سرورِ دائمی پاتا ہُوا
سو گیا بانکا سپاہی سو گیا۔ نیند کی مدہوشیوں میں کھو گیا
دیکھ کر یہ لہلہاتے سبزہ زار
زعفراں زاروں کی بہت [illegible] کنار
دیکھ کر بادِ صبا کو نغمہ بار

ملگجی شب میں چمکتی کہکشاں
چاند تاروں کا فلک پر کارواں
دیکھ کر دنیا کو پھر سے نوجواں
سوگیا بانکا سپاہی سوگیا - نیند کی مدہوشیوں میں کھوگیا

ساقیٔ فطرت کی تقسیمِ خودی
میکدہ بردوش بکھری چاندنی
دیکھ کر یوں زندگی میں زندگی
سوگیا بانکا سپاہی سوگیا - نیند کی مدہوشیوں میں کھوگیا

خواب کی پریوں سے ہم مجلس ہُوا
خُلد کی حُوروں سے ہنستا بولتا
ہو کے اختر بے خود و مدہوش سا
سوگیا بانکا سپاہی سوگیا - نیند کی مدہوشیوں میں کھوگیا

عزیز اختر سرحدی (کوہاٹی)

غزل

چشمِ سحر آمیز کی باتیں کریں — ساغرِ لبریز کی باتیں کریں
مُشک سے وارفتہ گیسو کو کیا! — زلفِ عنبر بیز کی باتیں کریں
دل سے جو گذرے جگر کے پار ہو — اُس نگاہِ تیز کی باتیں کریں
چاہتا ہے پھر دلِ ایذا طلب — دردِ غم انگیز کی باتیں کریں

آؤ پی کر مئے کہنہ ظہیر
شاہدِ نوخیز کی باتیں کریں

ظہیر الدین حمید

قطعات

کبھی مایوسیاں بڑھ کر یہ مجھ کو رائے دیتی ہیں — کہ ایسے حال میں تو خودکشی کرنا ہی اچھا ہے
یہ دھڑکا ہے کہ میرے بعد تجھ پر حرف آئے گا — وگرنہ اس طرح جینے سے تو مرنا ہی اچھا ہے

گھٹا چھائی ہوئی ہے آسماں پر — صدا رم جھم کی بڑھتی جا رہی ہے
مجھے رہ رہ کے یہ ہوتا ہے محسوس — [illegible]

[illegible]

محفلِ ادب

شاہجہاں بادشاہ کا "کافر" بیٹا داراشکوہ

اورنگ زیب بے شک ایک پُرجوش مسلم' ایک عظیم فرمانروا' اور ایک بہادر سپہ سالار تھا، لیکن جو کچھ اس نے اپنے ضعیف باپ اور نیک بھائیوں کے ساتھ کیا۔ اسے انصاف پسند اور دُور از تعصب نگاہ کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ اس نے اسلام کے نام پر تلوار اُٹھائی اور اخلاق کو قتل کر ڈالا۔ اسلام کی حقیقی تعلیم کے مطابق دولت کو ٹھکرانا چاہا مگر سلطنت کی ہوس کا شکار ہوگیا۔

بوڑھا باپ قید خانے میں زندہ تھا۔ اس کے سامنے اس کے پیارے بیٹے داراشکوہ کا سر اتار لیا گیا۔ اس لئے کہ عوام کو اس سے محبت تھی۔ اس الزام پر کہ وُہ کافر تھا مگر کس کی نگاہوں میں؟ اس کے حق میں کفر کا فتویٰ دینے والے کون تھے؟ "وہی علمائے دین" تھے جو ہر زمانے میں اسلام کے لئے سانپ کے زہر سے زیادہ مہلک ثابت ہوتے رہے ہیں۔ اور آج بھی اپنی طویل داڑھیوں کی طرح حرام وحلال کی فہرست کو طویل کرتے جا رہے ہیں۔

مگر دارا کی خطا کیا تھی؟ کیا اس نے اللہ کے پیغمبر کو پیغمبر نہیں مانا؟ کیا اس نے تعلیم نبوی پر حرف بحرف عمل نہیں کیا؟ کیا وہ اسلام سے منحرف ہوگیا تھا؟ یا اُس نے اسلام کی خدائی تعلیم کو چھوڑ کر دنیا کا اَور کوئی مذہب اختیار کیا تھا؟ اگر یہ نہیں تو اس کا جرم کیا تھا؟ ——صرف یہی کہ وُہ مذہب وحقیقت کو اپنے طور پر سمجھنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس سے اپنی زندگی کا فلسفہ تعمیر کرے۔

داراشکوہ زبانِ سنسکرت کا عالم اور علومِ اسلامی کا ماہر تھا۔ اس نے فلسفۂ ہنود کو دقیق نگاہوں سے دیکھا "اپنشد" پڑھے۔ پھر انہیں فارسی میں ترجمہ کر ڈالا۔ وُہ حقیقت کا شیدائی تھا۔ وہ ہر مذہب کا عمیق نظروں سے مطالعہ کرتا تاکہ اسلام اور دیگر مذاہب کا فرق آئینہ ہوجائے۔ وُہ جنگل جنگل پھرتا گوشہ نشین صوفیوں اور سادھوؤں کے سامنے اپنے خیالات ظاہر کرتا۔ ان کے اقوال پر آزادی سے نکتہ چینی کرتا۔ پھر دونوں فرقوں کی تعلیم اسلامی کسوٹی پر کستا۔ اس کی بے چین روح اسے لئے لئے پھرتی۔ وُہ مذاہب کے رنگین پردوں میں اپنا دلی اطمینان ڈھونڈتا۔ یہاں تک کہ مذہب کی حقیقت اس پر ظاہر ہوگئی اَور اب شاید وہ مطمئن تھا۔ لیکن اس کا یہ اطمینان اوروں کے لئے راس نہ تھا۔ اس کی گفتگو راس نہ تھی، اس کے خیالات راس نہ تھے۔ اپنے وقت کے علمائے مذہب کے ساتھ وہ گھنٹوں بحث کرتا۔ انجام یہ ہوتا کہ وہ سب اپنا منہ پھلائے اور اسے بُرا بھلا کہتے ہوئے واپس جاتے۔ وُہ اپنی رائے میں انتہا درجہ کا آزاد تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ کے نام نہاد صوفی اور مُلّا اس سے متنفر تھے۔

درحقیقت وُہ اسلام کا شیدائی تھا۔ عوام گمراہ کردیے گئے تھے۔ مفتی فتویٰ فروخت کرتے تھے۔ علما، خود غرض تھے اُن کی تعلیم وعبادت اسے اطمینان پہنچانے سے قاصر تھی۔ وہ اسلام کو خدا کی آخری تعلیم سمجھتا تھا۔ اور اس لئے وہ اسے رنگ برنگ نقابوں میں مستور دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

اسے اور مذہبوں سے نفرت نہ تھی۔ اس کی رائے میں ہر مذہب کا مقصدِ اصلاح ایک تھا۔ کیونکہ دنیا کا کوئی مذہب نہیں کہتا "تم جھوٹ بولو یا چوری کرو یا معصوم لڑکیوں کی زندگی خراب کرو۔ تمام مذاہب کی نیکیاں اور بدیاں ایک ہیں۔ اچھائیاں جو ہم میں ہیں وہ اوروں میں بھی ہیں۔" (دارا شکوہ)

کافر و مومن کے الفاظ اس کے لئے بے اہمیت تھے۔ وہ ملّاؤں کی عام تعلیم کے خلاف پُرزور آواز میں کہتا ہے

"یہ ضروری نہیں کہ ہر کلمہ پڑھنے والا مومن ہو یا ہر غیر مذہب کا پیرو کافر۔ وہ کافر یقیناً مومن ہے جس نے خدا کو سمجھا ہے اس کی خدمت کی ہے۔ اسے دیکھا ہے یا دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ مومن یقیناً کافر ہے جس نے خدا کو نہیں سمجھا۔ اس کی خدمت نہیں کی اسے نہیں دیکھا یا دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔" (دارا شکوہ پیرچویل ہسٹری)

اسے تعجب تھا کہ کوئی غیر مسلم اس لئے کیونکر کافر ہو سکتا ہے کہ صرف اس نے کلمہ شہادت نہیں پڑھا۔ حالانکہ اس میں وہ کل اوصاف ہیں جو ایک حقیقی پیروِ اسلام میں موجود ہونے چاہئیں؟ کیا وہ کلمہ پڑھنے والا جو شراب پیتا ہے اور جوا کھیلتا ہے اور بدی کرتا ہے۔ اس غیر مسلم کے برابر ہے جو شراب نہیں پیتا اور جوا نہیں کھیلتا اور بدی نہیں کرتا۔ بلکہ غریبوں کی مدد کرنے کے ساتھ قناعت سے بسر کرتا ہے؟

محبت کرنے والے باپ کا سب سے لاڈلا بیٹا ہوتے ہوئے بھی اس کی نگاہوں میں دنیوی تکالیف بے حقیقت تھیں۔ اس کے لئے وہ زندگی بے کار تھی جس میں کوئی غم نہ ہوا اور وہ غم بے حقیقت تھے جو بے حقیقت خوشیوں کے بعد پیدا ہوئے ہوں ایک واقعہ مثال ہے:۔

"باپ کے ساتھ قید تھا۔ جانتا تھا بے بسی سے قتل کیا جائے گا۔ جسونت سنگھ سپہ سالار اورنگ زیب سے شکست کھانے کے بعد قید خانے میں آیا اور بولا "اے جانِ عالم! قسمت ہمارے خلاف ہے۔ آپ اور بادشاہ قید ہیں جس سے عوام میں بے چینی پھیل گئی ہے چند پٹھان افسر باغی ہوگئے ہیں حالات نازک ہوگئے ہیں" اس پر دارا نے کہا "لیکن جسونت اگر اس قسم کے حادثے نہ ہوں تو زندگی بے لطف ہو جائیگی۔" مغل پیریڈ سمتھ)

خود بہت بڑا عالم تھا۔ کئی کتابیں لکھیں جو اس کے زرّیں خیالات سے معمور ہیں۔ ایک جگہ لکھتا ہے:۔

خدا اور حقیقت' بے سود سجدوں اور بے روح نمازوں میں نہیں ملتے۔ اس قسم کی عبادتیں سب سے بڑا گناہ ہیں گناہگار ان نمازیوں سے بدرجہا بہتر ہیں جو صرف اس لئے نمازیں پڑھتے ہیں کہ اس کی عادت پڑ گئی ہے۔ یا اس لئے کہ دنیا پر اپنے تقدس کا سکہ جما سکیں کیونکہ ایک گناہگار اپنے گناہوں کے چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔ مگر یہ نمازی اپنی تاریک فطرت پر عبادت کی چادر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی تلاش میں اگر خدا کو ڈھونڈ لیا تو عبادت کامیاب ہے۔" یہ تھا دارا شکوہ کا فلسفہ!

"دین دنیا" سالک لکھنوی

پرتگالی کا اثر اردو پر

یورپ میں پرتگال ایک جمہوری سلطنت ہے جس کے شمال و مشرق میں ہسپانیہ اور جنوب و مغرب میں بحرِ اطلانتک ہے اس کا دارالسلطنت لزبن ہے پرتگالیوں کو قومی انفرادیت گیارھویں صدی کے بعد حاصل ہوئی۔ بارھویں صدی میں یہ اہلِ مراکش سے برسرِ پیکار رہے

ہندوستان سے اہلِ پرتگال کے تعلقات پندرھویں صدی میں قائم ہوئے۔ یہ وُہ زمانہ ہے جب ان کا بحری اقتدار عروج پر تھا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما عربوں کی رہنمائی میں مالابار آیا، اور کالی کٹ پہنچا جہاں وہ زمورن سے ملا یہاں سے اُنہوں نے تجارت کا سلسلہ شروع کیا اور جواہر اور مسالے[۱] لے جانے لگے آہستہ آہستہ اُنہوں نے اپنے قدم ہندوستان میں جمالئے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں اُنہوں نے ایک صلح نامہ کیا اور حاجیوں کے جہاز لے جانے لگے۔ عہد جہانگیری میں بھی ان کے حقوق قائم رہے اور دربار میں رسوخ بھی رہا۔ "بنگال کے حکمرانوں کی اجازت سے پرتگال والے ہگلی میں آباد ہو گئے تھے[۲]"۔ یہاں ان کے فوجی اقتدار میں بہت اضافہ ہوا وُہ تجارتی مال پر چنگی لگانے لگے اور لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانے لگے۔ ان کی زیادتیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ اُنہوں نے ایک مرتبہ دو شاہی کنیزوں کو گرفتار کر لیا آخر شاہجہاں نے ان کو سخت سزا دی اور ان کی نوآبادی برباد کر دی گئی۔

باشندگانِ پرتگال کی مادری زبان پرتگالی ہے جو "رومانس" کے لسانی خاندان کی ایک شاخ سے نکلی ہے[۳] لیکن بعد میں عربی حملہ آوروں کے زیرِ اثر بہت سے عربی عناصر اِس میں شامل ہو گئے۔ اس زبان کا سب سے بڑا ادیب کیموَس (Camoens) ۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۴ء تھا۔

اس مختصر تاریخی خاکے کو پیشِ نظر رکھ کر اگر ہم غور کریں تو یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ پرتگالیوں کو اپنے دورانِ اقتدار میں ہندوستانیوں سے تجارتی، مذہبی اور سیاسی حیثیت سے برابر سابقہ پڑتا رہا ایسی صورتوں میں لامحالہ ان کو اسی ملک کی زبان بولنی پڑتی ہوگی اور وہ پرتگالی الفاظ ملا جُلا کر اپنا مفہوم ادا کرتے ہوں گے۔

آج اُردو زبان میں جو پرتگالی الفاظ مستعمل ہیں وُہ اسی دَور کی یادگار ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی کے بعد پرتگالی الفاظ کی تعداد اُردو میں خاصی ہے حالانکہ ہماری زبان نے اپنے دامن میں دیگر یورپین زبانوں کے الفاظ کو بھی جگہ دی مثلاً فرانسیسی، اطالوی روسی وغیرہ[۴]

آزاد مرحوم آبِ حیات میں فرماتے ہیں "دو قوموں کے ارتباط سے ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے اور اس کے کئی سبب ہیں۔ اکثر نئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں۔" پرتگالی بعض پھلوں کے پودے یا بیج اپنے ساتھ لائے۔ ان کے پرتگالی نام کچھ تغیر کے ساتھ رائج ہو گئے اور آج بھی عام ہیں۔ مثلاً

اُردو	پرتگالی
اننّاس	Anannas

---

[۱] پانیرس ان انڈیا صفحہ ۱۱۸

[۲] مسلم رول ان انڈیا صفحہ ۵۴۸

[۳] چیمبرز انسائیکلوپیڈیا

[۴] سماوار Samovaru (روسی) قرابین Carabine (فرانسیسی)

اردو	پرتگالی
سنترہ	Cintra[1]
مُوسمبی	Mozambique

ایک مورخ کہتا ہے کہ "اکبر کی وفات کے بعد زراعت میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ تمباکو کی کاشت شروع ہو گئی جس کا علم ہندوستان کو پرتگالیوں سے ہوا" [2] تمباکو اور ساگو دانہ دونوں الفاظ پرتگالی ہیں۔

تمباکو Tobaccoo, ساگو دانہ Sago,

لباس اور اس کی ضروریات کے لحاظ سے بھی چند پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں داخل ہو گئے۔

سایا Saia ٹبن Boutam فیتہ Fita

بعض ایسی اشیاء بھی ہیں جو عموماً ہندوستانی گھروں میں ہوتی ہیں لیکن ان کے نام پرتگالی ہیں۔

بالٹی Baldi, بوتل Bottle

الماری Almario. میز Meza.

پرتگالی الفاظ ہماری زبان کا جزوِ لاینفک بن گئے ہیں ہم اگر ان کے بجائے عربی، فارسی یا سنسکرت کے الفاظ استعمال کریں تو صرف فصاحت ہی کا خون نہ ہوگا بلکہ سمجھنا بھی مشکل ہو جائے گا

اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں جو پرتگالی الفاظ مستعمل ہیں ان کا تلفظ بہت کچھ بدل گیا ہے اور بدل جانا لازمی بھی تھا ورنہ ان کی غرابت و اجنبیت نہ زائل ہوتی۔ یہی سبب ہے کہ ہم ان کو اپنے الفاظ سمجھتے ہیں۔

یہ فہرست ملاحظہ ہو

اُردو	پرتگالی	اردو	پرتگالی	اُردو	پرتگالی
مارتول	Martel	کارتوس	Cartoucho	نیلام	Lelam
پادری	Padre	غنڈا	Gandaia	انگریز	Ingrez

یہ الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اُردو نے بحیثیت ایک زندہ زبان کے مشرق ہی نہیں بلکہ مغرب کی زبانوں کے الفاظ بھی کس حسن و خوبی سے اپنا لئے اس کی یہ بلند نظری بتا رہی ہے کہ اس میں بین الاقوامی زبان بننے کی کتنی صلاحیت پوشیدہ ہے۔

مرزا احمد بشیر ایم۔اے

"عالمگیر"

---

[1] پرتگال کے شہر سنٹرے Cintra سے اس کا بیج لایا گیا تھا

[2] "ہند کے مغل راج" از ایڈورڈز اینڈ گیرٹ صفحہ ۲۹۲

مطبوعات

ہماری زبان۔ یہ چھوٹی سی کتاب "سلسلۂ اُردو لائبریری" میں چھپی ہے اور ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب کی تصنیف ہے۔ کتاب کی دلچسپی سودمندی اور خوبی کے لئے مولوی صاحب کا نام کافی ضمانت ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۸۰ صفحات پر کتاب ختم ہوتی ہے اور صرف ایک گھنٹے میں پڑھی جاسکتی ہے۔ ہر اُردو دان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ قیمت صرف ۸ ر ہے۔ جیسا کہ ناشرین نے سرورق پر لکھا ہے اس "سلسلۂ اُردو لائبریری" میں مختلف موضوع ادب، آرٹ، فلسفہ، سائنس، تاریخ، سوانح، بین الاقوامی سیاست، ممالکِ اسلامی قصے کہانیاں وغیرہ پُرمفید پُراز معلومات دلچسپ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ہر کتاب مکمل مختصر مستند اور سلیس زبان میں لکھی ہوئی ہوتی ہے۔" فی الحال صرف دو کتابیں چھپی ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ مفید سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ ملنے کا پتہ۔ نیا سنسار، کتاب گھر، بانکی پور، پٹنہ

معارف القرآن: یعنی تفسیر قرآن مجید مصنفہ چودھری غلام احمد صاحب پرویز شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی۔ یہ تفسیر اس اصول پر مرتب کی گئی ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اس تفسیر کی جلد اوّل جو اب شائع کی گئی ہے "اللہ" سے متعلق ہے۔ بقیہ جلدیں "رسالت" "کتب" "کائنات" اور "آخرت" سے متعلق ہوں گی۔

کتاب کا دیباچہ مولانا محمد اسلم جیراج پوری نے لکھا ہے۔ شروع میں ایک مفصل فہرستِ مطالب ہے۔

اس تفسیر میں یہ کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کے مفہوم کو عقل و بصیرت کے نقطۂ نظر سے سمجھا جائے۔ اندازِ بیان سادہ اور لطیف ہے اور کتاب کی ظاہری صورت بھی دلفریب ہے۔ جا بجا جدید عقل پرستوں سے تخاطب کیا ہے اسی لئے انگریزی الفاظ کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ ہم چودھری صاحب کو اس تصنیف پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ہر اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ قیمت چھ روپے آٹھ آنے مجلد۔ پانچ روپے غیر مجلد۔

ب

کمپنی کی حکومت۔ اُردو دنیا حضرت باری علیگ کی ممنون ہے کہ انہوں نے یہ مختصر لیکن جامع کتاب لکھ کر ہماری زبان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارناموں اور ہندوستان کی تباہی کی داستان سے مناسب پیرایہ میں آشنا کیا۔ حجم ۲۸۴ صفحات کاغذ کتابت طباعت نفیس قیمت مجلد دو روپے۔ پتہ مکتبۂ اُردو لاہور

کلیاتِ میر ۔ نولکشور پریس لکھنؤ کے اُردو زبان و ادب پر اس قدر احسانات ہیں کہ اُن کے تذکرے کے لئے ایک مبسوط کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ پریس سالہا سال سے اُردو کتابوں کے ارزاں ایڈیشن شائع کر رہا ہے اور اس کی مطبوعات کے طفیل ہمارے بہت سے قدیم ادبی نوادر ضائع ہونے سے بچ گئے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ منشی نولکشور مرحوم کے بعد اُن کے جانشینوں نے نہ صرف اُن کی یادگار کو قائم رکھا بلکہ اُس ادبی ذوق کے طفیل جو انہیں ورثے میں ملا ہے خدمتِ زبان کی نئی راہیں بھی پیدا کیں۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر کلیاتِ میر ہے جسے نولکشور پریس نے بڑی تقطیع کے ایک ہزار سے زاید صفحات پر نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس نسخے کے مرتب عبد الباری صاحب آسی ہیں جو ایک صحیح الذوق شاعر اور نقاد ہیں۔ آسی صاحب نے موجودہ نسخے کی تصحیح میں بہت اہتمام کیا ہے یعنی اس غرض سے کلامِ میر کے متعدد نسخوں کو کھنگالا ہے اور مقابلہ کر کے اشعار کی تصحیح کی ہے۔ شروع میں آسی صاحب نے میر کے متعلق تقریباً ساٹھ صفحات کا ایک دلچسپ اور پُراز معلومات مقدمہ لکھا ہے۔ آخری ۲۷ صفحات میں کلامِ میر کے بعض الفاظ کے معنی درج کئے گئے ہیں۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا ہے اور جلد خوبصورت ہے۔ قیمت درج نہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اہلِ ذوق اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ خرید کر مطبع نولکشور کی خدمتِ ادب کی قدر افزائی کریں گے۔ پتہ ۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔

ص

قواعد

۱۔"ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کیے جاتے ہیں

۳۔دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے۔

۶۔[illegible] کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی [illegible] [illegible]یمت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔جواب طلب [illegible] کے لیے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے۔

۹۔قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے۔

۱۱۔خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھیے

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔لارنس روڈ۔لاہور

Title Printed at the Half-Tone Press, Ram Nagar, Lahore.